ہزاروں مسائل شرعیہ کا
بیش بہا خزانہ

فتاویٰ اجملیہ

بدر الفقہاء حضرت علامہ مفتی شاہ
مولانا محمد اجمل قادری رضوی علیہ الرحمۃ

مَن یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیرًا یُّفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ (الحدیث)

اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اُسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔

ہزاروں فتاوی پر مشتمل مسائل شرعیہ کا بیش بہا خزانہ

اَجمَلُ الفَتاوٰی

المعروف بہ

فتاوٰی اجملیہ

جلد دوم

عمدۃ المحققین سلطان المناظرین اجمل العلماء بدر الفضلاء

حضرت علامہ مفتی الشاہ محمد اجمل صاحب قادری رضوی اشرفی نعیمی علیہ الرحمۃ والرضوان

شبیر برادرز

۴۰۔ اردو بازار۔ زبیدہ سنٹر ○ لاہور

نام کتاب	•=•=•	اجمل الفتاوٰی المعروف بہ فتاوٰی اجملیہ (جلد دوم)
مصنف	•=•=•	اجمل العلماء حضرت علامہ مفتی الشاہ محمد اجمل صاحب سنبھلی
تبییض وترتیب	•=•=•	محمد حنیف خاں رضوی بریلوی صدر المدرسین جامعہ نور بریلی شریف
محرک	•=•=•	حضرت علامہ مولانا محمد منشاء تابش قصوری (صدر ادارہ ریاض المصنفین پاکستان)
مؤید	•=•=•	مولانا صاحبزادہ سید وجاہت رسول قادری (چیئرمین ادارہ تحقیقات رضا انٹرنیشنل کراچی)
پروف ریڈنگ	•=•=•	محمد عبدالسلام رضوی - محمد حنیف خاں رضوی
کمپوزنگ	•=•=•	محمد غلام مجتبٰی بہاری - محمد زاہد علی بریلوی - محمد منیف رضا خاں بریلوی
	•=•=•	زین العابدین بہاری - محمد عفیف رضا خاں بریلوی
سن اشاعت	•=•=•	فروری ۲۰۰۵ء
تعداد	•=•=•	۵۰۰
ناشر	•=•=•	شبیر برادرز اُردو بازار لاہور
مطبع	•=•=•	اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز لاہور
قیمت	•=•=•	فی جلد 250 روپے (مکمل سیٹ 1000 روپے 4 جلد)

ملنے کے پتے

ادارہ تحقیقات رضا انٹرنیشنل رضا چوک ریگل (صدر) کراچی

ادارہ پیغام القرآن زبیدہ سنٹر 40 اُردو بازار لاہور

مکتبہ اشرفیہ مرید کے (ضلع شیخوپورہ)

احمد بک کارپوریشن کمیٹی چوک راولپنڈی

مکتبہ ضیائیہ بوہڑ بازار راولپنڈی

مکتبہ قادریہ عطاریہ موتی بازار راولپنڈی

مکتبہ غوثیہ ہول سیل پرانی سبزی منڈی کراچی

ضیاء القرآن پبلی کیشنز اُردو بازار کراچی

مکتبہ رضویہ آرام باغ روڈ کراچی

مکتبہ رحیمیہ گوالی لین اُردو بازار کراچی

فہرست مسائل جلد دوم

کتاب الصلوۃ

باب الامامت

رسالہ مکبر الصوت ـــــ ۲۶۴

باب الجمعہ

باب العیدین

باب النوافل

باب التہجد ۳۶۲

باب قضاء الفوائت

باب المساجد

باب الدعا

باب القرآن والتفسیر

کتاب الجنائز

باب الوصیت

باب صلوۃ جنائز

باب تلقین میت

باب حرمۃ قبور

باب صدقات میت

کتاب الزکوۃ

باب مصارف زکوۃ

کتاب الصوم

رسالہ اجمل المقال

باب مسائل الصوم

کتاب الحج

کتاب الطھارۃ

۱۴

باب المیاہ

مسئلہ (۲۱۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک کنواں ناپاک ہوگیا ہے۔ اگر اس کنویں سے پانی پاک کرنیکی نیت سے نہ نکالا جائے مگر پانی برابر بھرتے رہیں۔ مثلاً پانی نکالنے کی تین سوڈول مقدار ہے اگر اس ناپاک کنویں سے اسقدر پانی نکل گیا ہو تو کنواں پاک ہو جائے گا یا نہیں؟۔ یا چوہا گل سڑ گیا اور پانی بھرنے والے برابر بھرتے رہیں اگر کل پانی کی مقدار پر پانی بھر لیا گیا ہو۔ یا اس سے زیادہ تو پانی پاک ہوگا یا نہیں؟۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

کنویں کے جس وقت ناپاک ہونے کا حکم کیا گیا اس میں جس قدر اس وقت پانی تھا ناپاک قرار پایا، پھر اس نجاست کو نکال کر اس کل مقدار پانی کا کنوں سے بیک وقت نکالنا ضروری نہیں، بلکہ اگر مختلف وقتوں یا چند مدتوں میں وہ پانی کنویں سے نکالا گیا یہاں تک کہ وہ کل مقدار متفرق اوقات کو جمع کر کے نکالی گئی تو وہ کنواں بلاشبہ پاک ہوگیا۔

قاضی خاں میں ہے: بیر وجب فیھا نزح اربعین دلوا فنزح یوما عشرین ویوما عشرین جاز ولا یشترط النزح متوالیا۔ (قاضی خان ص ۷) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۱۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

وضو کے استعمال کی پانی کی چھینٹیں اگر کنوئیں میں واقع ہو جائیں تو کنواں مذکور پاک ہے یا نہیں؟۔ اگر ناپاک ہے تو کتنے ڈول نکالے جائیں، اسکا جواب بحوالہ کتب فقہی عطا کیا جائے،

بینوا توجروا۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

کنوئیں میں جب ماء مستعمل کی چھنٹیں واقع ہوجائیں تو وہ کنواں پاک ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: الماء المستعمل اذا وقع فی البیر لا یفسدہ الا اذا غلب وھو الصحیح۔ (عالمگیری)

یہ ظاہر ہے کہ چند چھینٹیں کنوئیں کے پانی پر غالب نہیں آسکتیں۔ لہذا کنوئیں میں ماء مستعمل کی چند چھینٹوں کے گرجانے سے کنواں ناپاک نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسئلہ (۲۱۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متیں اس مسئلہ میں کہ

کنوئیں میں استعمالی جوتا گرجائے اور اس پرنجاست کا لگنا یقینی نہیں تو کنواں مذکور پاک ہے یا نہیں؟۔ اس کا جواب بحوالہ کتب فقہ عطا فرمایا جائے، بینوا توجروا۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

جب استعمالی جوتا کنوئیں میں گرجائے اور اس پرنجاست کا یقین نہ ہو تو محض تسکین قلب کیلئے احتیاطا بیس ڈول نکالے جائیں۔

شامی میں ہے۔ فینزح ادنی ما ورد بہ الشرع وذلک عشرون دلوا احتیاطا کذا قال فی الفتاوی العالمگیریہ: لووقعت الشاۃ وخرجت منہ ینزح عشرون دلوا لتسکین القلب لا للتطھیر حتی لو لم ینزح وتوضا جاز کذا فی فتاوی قاضی خان۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۱۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

اگر ایک مٹکا یا گھڑا پانی ناپاک ہوجائے تو شریعت نے اس کے پاک کرنے کے کیا طریقے لکھے

ہیں؟۔ المستفتی جمال الدین وعبدالرحمن چتوڑ گڑھی

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

جب ایک مٹکا یا ایک لوٹا یا پیالا بھر پانی ناپاک ہو جائے اور اس کے رنگ یا بو یا ذائقہ کسی ایک میں کچھ تغیر نہ ہو تو اس کے پاک کرنے کا ایک نہایت سہل اور آسان طریقہ یہ ہے۔ کہ اس میں پاک پانی اس قدر پہنچائیں کہ وہ کناروں سے ابل کر خوب بہہ جائے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: حوض صغیر متنجس ماؤه فدخل الماء الطاهر فيه من جانب وسال ماء الحوض من جانب آخر كان الفقيه ابو جعفريقول لما سال ماء الحوض من الجانب الآخر يحكم بطهارة الحوض وهو اختيار الصدر الشهيد وفى النوازل وبه نا خذ كذافى التا تارخانيه " (عالمگیری قیومی ص ۹)

منیہ اور اس کی شرح کبیری غنیۃ میں ہے: فان دخل الماء من جانب حوض صغير كان قد تنجس ماؤه وخرج من جانب قال ابو بكربن سعيد الاعمش لا يطهر مالم يخرج مثل ماكان فيه ثلث مرات فيكون ذلك غسلاله كالقصعة۔ وقال غيره لا يطهر مالم يخرج مثل ماكان فيه مرةواحدة۔ وقال ابو جعفرالهندوانى يطهر بمجرد الدخول من جانب والخروج من جانب وان لم يخرج مثل ماكان فى الحوض وهواى قول ابو جعفر اختيار الصدر الشهيد حسام الدين لانه حينئذ يصير جاريا والجارى لا يتنجس مالم يتغير بالنجاسة والكلام فى غير المتغير " (کبیری ص ۹۹) واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

مسئلہ (۲۱۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان شرع عظام دامت برکاتہم النوری اس مسئلہ میں بہار شریعت جلد چار صفحہ ۵۷ میں ہے کہ پانی کے رہنے والے جانور کا جوٹھا ناپاک ہے خواہ ان کی پیدائش پانی میں ہو یا نہیں۔

یہ مسئلہ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر جانور پانی کے رہنے والے ہیں تو انکا جوٹھا ناپاک کیوں ہے؟۔ اس کی وجہ کیا ہے؟۔

الجواب

اللھم ھدایة الحق والصواب

سائل کو یا اس مسئلہ کو دیکھنے میں دھوکہ ہوگیا ہے۔ یا کتاب ہی میں غلط چھپ گیا ہے۔ باوجودیکہ بہار شریعت جلد دوم صفحہ ۵۷ میں ہے: مسئلہ پانی کے رہنے والے جانور کا جوٹھا پاک ہے خواہ اسکی پیدائش پانی میں ہو یا نہیں۔ اور یہی حکم تصریحات کتب فقہ کے موافق ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

باب الوضو

مسئلہ (۲۲۰)

جناب مفتی جی صاحب ہادی دین وجامع علوم ظاہری ومنبع فیوض باطنی بعد مسنون السلام علیکم کے واضح ہو کہ آپ برائے مہربانی مسائل ذیل کے جواب باقاعدہ مہر کے تحریر فرمادی جائے گا عین مہربانی ہوگی۔ بندہ کو ممنون ومشکور فرمائیگا (نوٹ) خط صاف ہوتا کہ پڑھنے میں مشکو کی نہ ہو۔

جمعہ کی نماز کو خطبہ سے پہلے جس طرح آدمی جمع ہوتے ہیں اس وقت ایک شخص کو نیند آئی اور وہ نیند میں بیٹھا ہوا جھٹکا کھا گیا، گرا نہیں، اور نہ کسی چیز کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، جیسے دیوار وغیرہ، تو اس کا وضو ساقط ہوا یا نہیں؟۔ اور اگر وہ شخص گر گیا تو وضو ساقط ہوا یا نہیں؟۔ حل کر دیجئے گا۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

باوضو شخص کو جب بیٹھے ہوئے نیند آجائے اور بغیر کسی چیز کے سہارے کے بیٹھا تھا تو اگر وہ نیند میں زمین پر گر گیا تو اس کا وضو ساقط ہو گیا اور اگر اس کو فقط نیند کا جھٹکا ہی لگا اور گرنے نہ پایا تو وضو ساقط نہ ہوگا۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

کتاب الصلوٰۃ

﴿۱۶﴾

اوقات الصلوٰۃ

مسئلہ (۲۲۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرع متین اس مسئلہ میں کہ

مخالفین نماز عصر کا وقت ہونے کا ایک مثل سایہ ہونا بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ حدیث سے ثابت ہے۔اس کے بارے میں جو حدیث شریف وفقہ حنفی کا معتبر فیصلہ ہو مطلع فرمائیں۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

مخالفین جب نماز عصر کا اول وقت سایہ کے ایک مثل کے بعد بتاتے ہیں تو انہیں ماننا پڑے گا کہ وقت عصر ظہر کے وقت ختم ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے کہ مسلم شریف کی حدیث میں بھی یہ ہے کہ

اول وقت الظھر اذا زالت الشمس وکان ظل الرجل کطولہ ما لم یحضر العصر۔ یعنی ظہر کا اول وقت جب سے سورج کا زوال ہو یہاں تک کہ آدمی کا سایہ اس کے طول کی مثل ہوجائے جب تک کہ عصر کا وقت نہ آئے۔

اور اوقات نماز کی اصل بنیادی حدیث امامت جبرئیل والی حدیث میں ہے۔دوسرے دن کی نماز ظہر ایک مثل کے بعد پڑھنا مذکور ہے۔چنانچہ اس میں یہ ہے: وصلی لی الظھر حین کان الظل مثلہ۔

یعنی حضور نے فرمایا کہ جبرئیل نے ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جب سایہ ایک مثل ہوگیا تھا۔

تو اب مخالفین یہ بتائیں کہ جب ایک مثل کے بعد عصر شروع ہوجاتا ہے تو حضرت جبرئیل نے یہ ظہر وقت عصر میں پڑھائی۔تو ادا ہوئی یا قضا ہوئی؟۔تو ظہر کا آخر وقت کس چیز سے معلوم ہوا۔اور معلوم ہوا کہ ادا ہوئی تو ثابت ہوگیا کہ ایک مثل کے بعد ظہر کا وقت ہے۔عصر کا وقت دو مثل پر شروع ہوتا ہے اور دو مثل کی مثبت چند احادیث ہیں۔صرف ایک حدیث پیش کرتا ہوں۔

حضرت امام احمد امام مالک سے بسند خود راوی کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت رافع سے فرمایا:

انا اخبرك و صل الظهر اذا كان ظلك مثلك والعصر اذا كان ظلك مثليك والحديث ـ

یعنی میں تجھ کو خبر دیتا ہوں کہ ظہر جب کہ تیرا سایہ ایک مثل ہو جائے پڑھ اور عصر جب تیرا سایہ دو مثل ہو جائے۔ مذہب حنفی کی یہ ایک دلیل ہے۔ مختصر جواب روانہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۲۲)

حدیث شریف میں سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورج اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوتا ہے، یا عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو طلوع کا حکم فرماتا ہے۔ تو مشرق سے طلوع کرتا ہے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے، بلکہ حقیقت ہے، کہ بلغار اور لندن میں عشا کا وقت ہی نہیں ہوتا ہے۔ شفق ڈوبتے ہی فجر طلوع کرتی ہے، اس کے متعلق قرآن وحدیث میں کہیں ہو تو بتایا جائے۔ جب ایسا ہے کہ سورج غروب ہوتے ہی طلوع کرنے لگتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج ڈوبتا ہی نہیں ہے۔ اور بعض لوگ یوں بھی کہتے ہیں کہ کسی مقام پر چھ مہینے دن رہتا ہے اور چھ مہینے رات رہتی ہے۔ جب ایسا ہوگا تب ہی تو کہا جاتا ہے، ان مقامات پر طلوع وغروب کے متعلق شرع کا کیا حکم ہے؟۔ مقام کے لحاظ سے نماز کا حکم کیا جاتا تو مناسب تھا کہ جہاں جتنے وقت ہوں اتنے وقت کی نماز فرض ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ بعض مقام ایسے ہیں کہ عشا کا وقت ہی نہیں ہوتا۔ بعض مقام ایسے ہیں کہ چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات رہتی ہے۔ جب چھ چھ مہینے کا رات دن ہو تو وہاں کتنی نمازیں فرض ہونی چاہیں۔ اس کا ذکر قرآن وحدیث میں کہیں نہ کہیں اشارۃ کنایۃ ہوگا تو ضرور۔ واضح ثبوت سے جواب دیا جائے۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

قرآن وحدیث سے ہر چیز کا تفصیلی ثبوت ضروری ہو تو بہت سے احکام شرع کا محض اسی نظریہ کی بنا پر انکار کر دیا جائے گا۔ اور یہی گمراہی اور لامذہبی کا اصل دروازہ ہے۔ یہاں قابل غور امر یہ ہے کہ قرآن کریم اور حدیث میں اکثر اجمالی احکام اور اصول بیان کئے گئے ہیں۔ جن کی تفصیل کے لئے ہم

ائمہ ومجتہدین کے محتاج ہیں ۔ چنانچہ جیسے واقعات وحوادث ظہور میں آتے ہیں مجتہدین اسکا تفصیلی حکم قرآن وحدیث ہی سے مستنبط کر کے بیان فرمادیتے ہیں کہ اس تفصیل تک ہم عوام کے ذہن کی رسائی نہیں ہوتی ۔ جیسے کون نہیں جانتا ہے کہ قرآن وحدیث سے وضو کے چار فرائض ثابت ہیں ۔ لیکن جس شخص کے ہاتھ کہنیوں تک کاٹ دیئے جائیں اس کے حق میں وضو میں صرف تین فرائض ہی ہوئے کہ ایک فرض ہاتھ کا دھونا اس کے لئے ساقط ہوگیا ۔ یا قرآن وحدیث سے دن رات میں پانچ نمازیں ہر مسلمان پر فرض ہیں لیکن حیض والی عورت جب حیض سے وقت عصر میں پاک ہو تو اس پر اس دن رات میں صرف تین نمازیں عصر، مغرب، عشا فرض ہوئیں ۔

اور دو نمازیں فجر، ظہر فرض ہی نہیں ہوئیں ۔ تو ایسے حوادثات کا قرآن وحدیث سے واضح طور پر تفصیلی ثبوت کا مطالبہ وہی کیا کرتا جو گمراہ و بیدین ہے ۔ یا بالکل جاہل و ناواقف ہے ۔ لہذا ایسے حوادثات کے سوالات یوں کئے جاتے ہیں کہ ایسے مقطوع الید کے لئے وضو میں ہاتھ دھونے کے فریضے کے ساقط ہوجانے کی شرع نے کیا وجہ بیان فرمائی ہے ۔ تو اس کا صاف جواب یہ ہے کہ ایسے مقطوع الید کے جب چوتھے فرض کا فعل یعنی ہاتھ ہی نہیں ہے تو چوتھا فرض یعنی ہاتھوں کا دھونا اس سے ساقط ہوگیا اور اس کے حق میں قرآن وحدیث کے بیان کئے ہوئے تین فرائض ہی وضو میں ثابت ہوئے ۔ اسی طرح اس حیض والی عورت پر اس دن رات میں دو نمازوں فجر وظہر کے فریضوں کے ساقط ہوجانے کی شرع نے کیا وجہ بیان فرمائی ہے ۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان دو اوقات میں وہ عورت حیض سے پاک نہیں تھی، تو شرط نماز ہی اس کے حق میں نہیں پائی گئی، تو اس عورت پر سے ان دو وقتوں فجر وظہر کا فریضہ ساقط ہوگیا ۔ تو اس کے حق میں قرآن وحدیث ہی کے بیان سے اس دن رات میں صرف تین نمازیں عصر، مغرب، عشاء ہی فرض ثابت ہوئے ۔

یہی حال بلغار اور لندن کے مسلمانوں کا ہے کہ وجوب نماز کے لئے وقت شرط اور سبب ہے تو جب وقت عشا ہی انکو نہ مل سکا تو ان پر فرض وقت یعنی نماز عشا واجب ہی نہیں ہوئی ۔ لہذا قرآن و حدیث ہی کے طرف سے ان کے سروں سے فرض عشا کا فریضہ ساقط ہوگیا ۔ تو چالیس راتوں میں بلغار اور لندن والوں پر قرآن وحدیث ہی سے صرف چار نمازیں فجر، ظہر، عصر اور مغرب فرض ہوئیں اگرچہ انہیں عشا و وتر کی قضا بھی پڑھ لینی چاہیے ۔

اب باقی رہا یہ امر کہ ان مقامات پر طلوع وغروب کا کیا حکم ہے ۔ تو یہ ظاہر ہے کہ طلوع وغروب تو

ان مقامات کے طلوع وغروب کے بعد فرض وقت نماز مغرب ان پر فرض ہے، اور طلوع سے قبل فرض وقت نماز فجر ان پر واجب ہے۔ تو اس سے صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ شریعت نے ان مقامات کے طلوع وغروب پر حکم مرتب کیا۔ تو اب یہ نتیجہ نکالنا غلط ہو گیا کہ ان مقامات میں سورج ڈوبتا ہی نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بھی غلط معلوم ہوتا ہے کہ بعض مقامات جن میں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات رہتی ہے۔ اگر ایسے مقامات ہوتے تو فقہا کرام بلغار اور لندن کی طرح انکا ذکر کرتے اور وہاں کے احکام بیان کرتے۔ لیکن میری نظر سے کتب فقہ میں انکا ذکر نہیں گزرا۔ حدیث شریف کا مضمون حق ہے ان مقامات کا حال مضمون حدیث کے خلاف نہیں کہ آفتاب کا طلوع وغروب سب حکم الہی سے ہوتا ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

﴿۱۷﴾
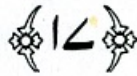
باب الاذان

مسئلہ (۲۲۳_۲۲۴_۲۲۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

اس زمانہ میں جو یہ نئی بات رائج ہوگئی ہے کہ علاوہ مغرب کے باقی چار نمازوں کیلئے اور جمعہ کے وقت میں بھی اذان اور تکبیر کے درمیان باواز بلند صلوۃ پکاری جاتی ہے۔ دریافت طلب یہ امور ہیں۔

(۱) آیا اس اعلان کا ثبوت فقہ حنفی کی کسی معتبر کتاب میں ہے یا نہیں؟۔

(۲) اس اعلان کیلئے صلاۃ کے الفاظ کس زمانہ میں رائج ہوئے، اس کا بھی کسی فقہ کی معتبر کتاب میں ذکر ہے یا نہیں؟۔

(۳) الصلاۃ والسلام علیک یا رسول اللہ۔ اور اس کے مثل الفاظ ہیں۔ ان کلمات میں ایک تو لفظ ۔یا۔ ہے جو ندائے قریب کے لئے ہے اور جس سے قریب کے شخص کو پکارا جاتا ہے۔ دوسرا لفظ ۔ک۔ ہے جو خطاب کے لئے ہے اور اس سے شخص حاضر کے لئے خطاب کیا جاتا ہے۔ تیسری چیز یہ ہے کہ لفظ ۔یا۔ اور ۔ک۔ سے زندہ شخص کے ساتھ خطاب کیا جاتا ہے نہ کہ مردہ سے۔ تو کیا باوجود ان امور کے یہ الفاظ صلاۃ جائز ہیں یا نہیں؟۔ اگر جائز ہیں تو اسکا پورا ثبوت پیش کیا جائے۔ بینوا توجروا۔

المستفتی مولوی محمد اشفاق صاحب

بمقام محلہ مراثی ٹولہ متصل مسجد اونٹ والان بریلی شریف۔

۱۱ محرم الحرام ۱۳۶۲ھ۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

(۱) اذان وتکبیر کے درمیان جس اعلان کے متعلق سوال ہے وہ بلا شک جائز ہے، اس کا جواز بکثرت کتب وفقہ میں موجود ہے، بلکہ فقہائے متاخرین نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے اور اسکا نام تثویب رکھا ہے۔

چنانچہ نور الایضاح اور اس کی شرح مراقی الفلاح میں ہے:

(ویثوب) بعد الاذان فی جمیع الاوقات لظهور التوانی فی الامور الدینیة فی الاصح وتثویب کل بلدة بحسب ما تعارفه اهله۔ (طحطاوی مصری ص ۱۱۴)

اور صحیح مذہب میں تمام وقتوں میں اذان کے بعد تثویب کہے، کیونکہ دینی باتوں میں سستی ظاہر ہے، اور ہر شہر کی تثویب وہ ہے جو اس کے رہنے والے سمجھیں۔

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

(قوله یثوب) هو لغة مطلق العود الی الاعلام بعد الاعلام وشرعا هو العود الی الاعلام المخصوص (وقوله بعدالاذان) الاذان علی الاصح لا بعد الاقامة کما هو اختیار علماء الکوفة۔ (قوله فی جمیع الاوقات) استحسنه المتاخرون وقد روی احمد فی السنن والبزاروغیرهما باسناد حسن موقوفا علی ابن مسعود ما راه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن۔ (طحطاوی مصری ص ۱۱۴)

تثویب لغت میں پہلے اعلان کے بعد دوسرے اعلان کی طرف مطلق لوٹنے کو کہتے ہیں اور شریعت میں وہ مخصوص اعلان کی طرف لوٹنا مراد ہوتا ہے۔ صحیح تر مذہب میں تثویب اذان کے بعد ہے نہ کہ تکبیر کے بعد جیسا کہ یہ علماء کوفہ کا مختار قول ہے۔

تثویب کو اذان کے بعد تمام اوقات میں متاخرین نے مستحسن جانا، اور استحسان کا ثبوت اس حدیث سے ثابت ہے جسے امام احمد نے مسند میں اور بزار وغیرہ نے بسند حسن حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوفا روایت کیا کہ جسے مسلمان اچھا جانیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔

کنز الدقائق اور اس کی شرح عینی میں ہے:

(ویثوب) من التثویب وهو العود الی الاعلام بعد الاعلام وانما اطلقه تنبیها علی ما استحسنه المتاخرون من التثویب فی کل الصلوات لظهور التوانی فی الامور الدینیة۔

(عینی مصری ص ۲۷ ج ۱)

تثویب پہلے اعلان کے بعد دوسرے اعلان کی طرف لوٹنے کا نام ہے۔ صاحب کنز نے اسے مطلق بیان کرنے میں اس بات پر تنبیہ کی کہ متاخرین نے اس تثویب کو تمام نمازوں میں مستحسن جانا۔ اس لئے کہ دینی امور میں سستی ظاہر ہو چکی ہے۔

جوہرہ نیرہ شرح مختصر قدوری میں ہے:

المتاخرون استحسنوه فی الصلوات کلھا لظھور التونی فی الامور الدینیة وصفته فی کل بلد علی ما یتعارفونه۔ (ص۴۵ جوہرہ)

متاخرین نے سب نمازوں میں تثویب کو مستحسن جانا کہ امور دینیہ میں سستی ظاہر ہے اور تثویب کے الفاظ ہر شہر کیلئے وہ ہیں جنہیں وہاں کے رہنے والے سمجھیں۔

تنویر الابصار ودرمختار میں ہے:

(ویثوب) بین الاذان والاقامة فی الکل للکل بما تعارفوه۔

(ردالمحتار مصری ص۲۶۲ ج۱)

اذان اور تکبیر کے درمیان تمام اوقات نماز میں سب لوگوں کے لئے اس لفظ سے تثویب کہیں جسے لوگ جانتے ہوں۔

علامہ شامی ردالمحتار میں عنایہ سے ناقل ہیں:

احدث المتاخرون التثویب بین الاذان والاقامة علی حسب ما تعارفوه فی جمیع الصلوات سوی المغرب۔ (ردالمحتار ص۲۷۲ ج۱)

متاخرین نے سوائے مغرب کے تمام نمازوں میں اذان وتکبیر کے مابین ہر اس لفظ کے ساتھ جسے لوگ سمجھتے ہوں تثویب کہنا ایجاد کیا ہے۔

خود مانعین کے پیشوا مولوی خرم علی صاحب نے غایۃ الاوطار ترجمہ درمختار میں صاف طور پر اقرار کیا:

تثویب یعنی اعلام بعد الاذان کا طریقہ یہ ہے کہ بعد اذان بقدر بیس آیت پڑھنے کے ٹھر جائے پھر بلاوے اس طرح کہ ''الصلوۃ الصلوۃ'' یا کہے: چلو نماز تیار ہے، یا جس طرح کا رواج ہو۔ پھر اس کے بعد بیس آیت کا توقف کرے پھر اقامت کہے۔ کذا فی البحر۔

(غایۃ الاوطار (ص۱۸۱ کشوری)

بخیال اقتصار یہ چند عبارات پیش کی گئیں ہیں۔ ورنہ تثویب کے جواز کی تصریح قنیہ، ملتقط، ہدایہ، بحرالرائق، فتاوی قاضی خاں، نہر، مجتبی، درر، غرر، نہایہ، خزائن، حسن المحاضرہ، القول البدیع وغیرہ کتب فقہ میں ہے۔

بالجملہ ان عبارات سے ظاہر ہوگیا کہ تثویب یعنی اعلان بعد الاذن نہ فقط جائز بلکہ مستحسن ہے اور نیز یہ بھی روشن ہوگیا کہ فقہائے کرام نے اس تثویب کے لئے کوئی خاص الفاظ مقرر نہیں فرمائے ہیں بلکہ اسے عرف ورواج پر چھوڑ دیا ہے اور یہ اجازت دی ہے کہ ہر جگہ جن الفاظ سے لوگ تثویب کو سمجھتے ہوں وہی الفاظ مقرر کر لئے جائیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) جب یہ ثابت ہوگیا کہ تثویب کیلئے کوئی الفاظ خاص مقرر نہیں بلکہ اختیار ہے کہ اسے جن الفاظ میں چاہیں ادا کر سکتے ہیں تو لفظ ''صلاۃ وسلام'' کہنے کا جواز خود ان ہی عبارت سے ثابت ہوگیا۔ لیکن سائل کے اطمینان خاطر کیلئے فقہ کی معتمد ومستند اور مشہور کتاب درمختار کا حوالہ پیش کیا جاتا ہے۔

التسليم بعد الاذان حدث في ربيع الآخر سنة سبعمائة واحدى وثمانين في عشاء ليلة الاثنين ثم يوم الجمعة ثم بعد عشر سنين حدث في الكل الا المغرب ثم فيها مرتين۔ وهو بدعة حسنة۔ (ردالمحتار مصری ص ۲۷۳ ج ۱)

اس عبارت کا ترجمہ خود مانعین صلاۃ کے پیشوا مولوی خرم علی صاحب نے غایۃ الاوطار میں یہ کیا ہے:

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر سلام کہنا پیدا ہوا ربیع الآخر (۷۸۱ھ) میں عشا کی نماز میں دوشنبہ کی رات۔ پھر جمعہ کے دن۔ پھر دس برس کے بعد پیدا ہوا سب نمازوں میں سوائے مغرب کے پھر مغرب میں بھی دوبار سلام کہنا ہوگیا اور یہ امر بدعت حسنہ ہے۔ (غایۃ الاوطار ص ۱۸۱ ج ۱)

علامہ شامی ردالمحتار میں فرماتے ہیں:

قوله سنة ۷۸۱۔ كذا في النهر عن المحاضرة للسيوطي ثم نقل عن القول البديع للسخاوي انه في سنه ۷۹۱ وان ابتداءه كان في ايام السلطان الناصر صلاح الدين بامره (ردالمحتار مصری ص ۲۷۳۔ ج ۱)

یہی مولوی صاحب اس کا ترجمہ غایۃ الاوطار میں کرتے ہیں:

یہ فائدہ شارح نے جلال الدین سیوطی شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے حسن المحاضرہ سے نقل کیا۔ اور سخاوی کی قول بدیع میں ہے کہ اس کی ابتدائے حدوث سلطان صلاح الدین بن المظفر بن ایوب کے حکم سے ہوئی ۷۹۱ھ میں۔

طحطاوی نے کہا کہ مغرب کا سلام ہمارے وقت میں رائج نہیں اور نہ سیوطی کی اس عبارت

میں ہے جو بحر الرائق میں منقول ہے انتہی ۔ بدعت حسنہ وہ ہے جو قواعد شریعت کے مخالف نہ ہو۔

(غایۃ الاوطار ۔ص ۱۸۱ ج ۱)

ان عبارات اور ترجمہ سے ظاہر ہو گیا کہ حضور اکرم ﷺ پر بآواز بلند اذان اور تکبیر کے درمیان میں صلاۃ وسلام بآواز بلند کہنا چودہویں صدی کے کسی عالم کا ایجاد کردہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کی ابتدا ۷۸۱ھ میں ہوئی اور سلطان صلاح الدین بن مظفر کے حکم سے اس کو شروع کیا گیا اور اس کے بعد ہر زمانہ اور ہر صدی میں اسکا رواج فقہائے کرام وعلمائے عظام نے باقی رکھا اور اس پر انکار نہیں فرمایا۔ بلکہ ان حضرات نے اپنی اپنی تصنیف میں ذکر فرما کر اس صلاۃ کو بدعت حسنہ قرار دیا اور مستحسن ومستحب ہونیکا حکم دیا جو ان عبارات میں مذکور ہے۔ لہذا اب اس سے زیادہ روشن ثبوت اور صاف تصریح اور کیا ہو سکتی ہے۔ انصاف پسند طبیعتوں کے لئے یہ بات بہت کافی ہے کہ جو فعل تخمیناً چھ سو سال سے رائج ہے اور فقہاء وعلمائے امت کا معمول بہا ہے، آج کسی نام نہاد مولوی صورت کا بلا کسی دلیل وثبوت کے اسے ناجائز وبدعت قرار دیدینا کتنی بڑی دلیری وجرات ہے اور چھ صدی کے فقہا وعلما ومشائخ بلکہ تمام مسلمین کو بدعتی وگمراہ ٹھرانا ہے۔ العیاذ باللہ تعالی ۔ اور چھ صدی کے مسلمین تو بدعتی وگمراہ ہو نہیں سکتے کہ اسی مسئلہ کے ثبوت میں طحطاوی کی عبارت گزری: ما راہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن۔ یعنی جس چیز کو مسلمان اچھا جانیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔ تو جب چھ صدی کے مسلمانوں نے اس صلوۃ کو اچھا جانا تو بلاشبہ یہ فعل اچھا ہے۔ اب آج جس شخص نے اس صلاۃ کو چھ صدی کے فقہا وعلما کی تصریحات کے خلاف محض اپنی رائے سے بدعت وناجائز قرار دیا اور جائز کہنے والے تمام علما وفقہا کو بدعتی وگمراہ ٹھرایا تو وہ خود بدعتی وگمراہ بیدین وضال ہے۔ مولی تعالی ایسے منکروں کو قبول حق کی توفیق دے ۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۳) بحمد اللہ صلوۃ کا ثبوت تو جواب نمبر (۲) میں گذر چکا، تو اب صلاۃ تو قابل بحث نہیں رہی، اب باقی رہا سائل کا یہ قول کہ ''یارسول اللہ'' میں لفظ ''یا'' ندائے قریب کیلئے ہے جس سے قریب کے شخص کو پکارا جاتا ہے۔ تو اول سائل کی یہ بات ہی بالکل غلط ہے کہ لفظ ''یا'' صرف ندائے قریب کے لئے آتا ہے۔ سائل اگر ذی علم ہوتا تو کبھی ایسی بات نہ کہتا۔ نحو کی کتابوں میں یہ تصریح موجود ہے کہ لفظ ''یا'' ندائے قریب وبعید دونوں کیلئے مستعمل ہوتا ہے۔

(اولا) شرح جامی میں ہے۔ ''یا اعمھا استعمالا لانھا تستعمل لنداء القریب والبعید ۔

'یا' باعتبار استعمال کے عام ہے کہ وہ ندائے قریب وبعید دونوں کے لئے مستعمل ہے۔ تو اب لفظ 'یا' کو ندائے قریب کے لئے خاص کر دینا کیسی سخت غلطی ہے۔

(ثانیا) حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہم سے بعید کب ہیں بلکہ وہ ہم سے اتنے زیادہ قریب ہیں کہ ہماری جانوں کو ہم سے وہ قرب حاصل نہیں۔ اس مضمون پر بکثرت ثبوت پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن بخوف طوالت صرف ایک ہی حوالہ پر اکتفا کیا جاتا ہے جس کے بعد مانعین کو جائے سخن ومجال دمزدن باقی نہ رہے۔

مانعین کے پیشوا مولوی قاسم نانوتوی بانی مدرسہ دیوبند اپنی کتاب تحذیر الناس میں لکھتے ہیں:

النبي اولى بالمومنين من انفسهم ، کو بعد لحاظ صلہ من انفسهم کے دیکھتے ہوئے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنی امت کے ساتھ وہ قرب حاصل ہے کہ ان کی جانوں کو بھی ان کے ساتھ حاصل نہیں۔ کیونکہ اولی بمعنی اقرب ہے۔

(تحذیر الناس مطبوعہ خیر خواہ سرکار پریس سہارن پور)

لہذا جب حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اتنے قریب تر ہیں تو اب سائل کو لفظ ''یا'' کے استعمال کرنے میں کیا عذر باقی رہ گیا۔

سائل کی دوسری بات یہ ہے کہ ''ک'' حاضر مخاطب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تو اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ خود نماز میں۔ السلام عليك ايها النبي ۔ پڑھا جاتا ہے۔ اس میں صلوۃ وسلام بھیجنا بھی ہے اور ک خطاب بھی ہے اور۔ ایها النبی۔ سے قبل لفظ ''یا'' بھی ہے جو لفظا محذوف اور معنی مراد ہے۔

لہذا اگر یہ چیزیں ناجائز ہوتیں تو ان الفاظ کو تشہد سے علیحدہ کر دیا جاتا، مگر ساڑھے تیرہ سو برس سے آج تک کسی نے اس کاف خطاب اور یا ندا پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ فقہا وعلما نے خطاب وندا کے صحت معنی کی تائید فرمائی اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حاضر جان کر مصلی کو خطاب وندا کرنے کا حکم دیا۔

حضرت عارف صمدانی قطب ربانی سیدی عبد الوہاب شعرانی نے میزان الشریعۃ میں فرمایا:

انما امر الشارع المصلى بالصلوة والسلام على رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم فى التشهد لينبه الغافلين فى جلوسهم بين يدى الله عز وجل على شهود نبيهم فى تلك الحضرة فانه لا يفارق حضرة الله تعالى ابدا فيخاطبو نه با لسلام مشافهة۔

(میزان الشریعۃ مصری ج۱ص ۱۵۴)

شارع نے نمازی کو تشھد میں نبی ﷺ پر درود و سلام عرض کرنے کا حکم اس لئے دیا کہ جو لوگ اللہ عزوجل کے دربار میں غفلت کے ساتھ بیٹھتے ہیں انھیں آگاہ فرمادیں کہ اس حاضری میں اپنے نبی صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کو دیکھیں، اسلئے کہ حضور کبھی اللہ تعالی کے دربار سے جدا نہیں ہوتے تو بالمشافہ حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم پر سلام عرض کرے اور آپ سے خطاب کرے؛

خاتم المحدثین حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات ترجمہ مشکوۃ شریف میں فرماتے ہیں:

نیز آنحضرت ہمیشہ نصب العین موموناں وقرۃ العین عابدان است در جمیع احوال واوقات خصوصا درحالت عبادت وآخرآں کہ وجود نورانیت وانکشاف دریں محل بیشتر وقوی تر است وبعضے عرفا گفتہ اند کہ ایں خطاب بجہت سریان حقیقت محمدیہ است در ذرات موجودات وافراد ممکنات پس آں حضرت در ذوات مصلیاں موجود وحاضر است، پس مصلی باید کہ ازیں معنی آگاہ باشد تا بانوار قرب واسرار معرفت متنور وفائض گردد۔ (اشعۃ اللمعات ص ۱۰۴ کشوری)

حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم ہمیشہ ایمانداروں کے پیش نظر اور عبادت کرنے والوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں تمام احوال واوقات میں خاص کر عبادت کی حالت میں اور اس کے اخیر میں کہ نورانیت وانکشاف زیادہ قوی تر ہوتا ہے۔ بعض عرفاء نے فرمایا ہے ایھا النبی کا خطاب اس جہت سے ہے کہ حقیقت محمدیہ موجودات کے ذروں اور ممکنات کے افراد میں سرایت کئے ہوئے ہے، تو حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نمازیوں کی ذاتوں میں موجود اور حاضر ہیں، نمازی کو چاہئے کہ اس سے باخبر رہے اور اس شہود سے غافل نہ ہوتا کہ انوار قرب واسرار معرفت کے ساتھ متنور وفائض ہو؛

حاصل کلام یہ ہے کہ جب نماز جیسی عبادت مخصوصہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم پر صلوۃ وسلام بھیجنا ندا وخطاب کرنا جائز وداخل عبادت ہے تو یہ صلوۃ جو اذان وتکبیر کے درمیان کہی جاتی ہے اس میں خطاب وندا کس طرح ناجائز وبدعت ہوسکتا ہے۔ اب جو کوئی اس کو ناجائز کہے تو وہ ان کلمات کو تشہد سے نکال دے اور ساری امت کو گمراہ قرار دیکر خود گمراہ وبیدین بنے۔

سائل کی تیسری بات یہ ہے کہ لفظ۔ یا اور ک۔ خطاب سے زندہ کو خطاب کیا جاتا ہے نہ مردہ سے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم زندہ ہیں بحیات دنیوی جسمانی جو خود حدیث شریف

سے ثابت ہے۔

علامہ قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں بیہقی سے بروایت حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ یہ حدیث نقل فرمائی:

ان رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم قال: الانبياء احياء فى قبو رهم يصلون۔

(مواہب لدنیہ مصری ج ۲ ص ۳۸۹)

رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا کہ انبیائے کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔

تو حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کو زندہ نہ جاننا اور مردہ سمجھنا حدیث شریف کے مخالف ہے۔ العیاذ باللہ تعالی۔ نیز حرف خطاب اور یا ندا سے مردہ کو بھی خطاب کیا جاتا ہے۔ زیارت قبور کی دعاؤں میں بکثرت حرف خطاب و یا ندا وارد ہے۔

ترمذی شریف میں حضرت عباس رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے کہ

مر النبى صلى الله تعالىٰ عليه وسلم بقبور بالمدينةفاقبل عليهم بوجهه فقال السلام عليكم يا اهل القبور فغفر الله لنا ولكم۔ (الحدیث)

حضور نبی کریم ﷺ مدینہ شریف کے قبرستان میں گذرے تو حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے ان کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ السلام علیکم یا اهل القبور یعنی تم پر سلامتی ہوا ے قبر والو، اللہ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے۔

تو اگر حرف خطاب اور یا ندا مردہ کے لئے ناجائز ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کبھی خود استعمال نہ فرماتے۔ لہذا ظاہر ہو گیا کہ سائل کی یہ تمام باتیں قرآن وحدیث اور تصریحات مذہب کے خلاف ہیں۔ مولی تعالی منکر کو قبول حق کی توفیق دے؛

حاصل جواب یہ ہے کہ اذان و تکبیر کے درمیان میں صلوۃ کہنا جائز بلکہ مستحسن ہے اور الصلوۃ والسلام علیك یا رسول الله۔ یا اس کے مثل ایسے کلمات جن میں حرف خطاب و حرف ندا ہوں بالکل صحیح و درست ہیں اور شریعت کے موافق ہیں واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۲۶۔۲۲۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ

(۱) جمعہ میں خطبہ سے پہلے اذان ثانی مسجد سے باہر ہونا سنت ہے یا مسجد کے اندر؟۔

(۲) اذان کہنے کے بعد جماعت کھڑے ہونے کے وقت صلوٰۃ کہنا کیا ہے؟۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

(۱) جمعہ میں اذان کا مسجد کے باہر ہونا سنت ہے۔ ابوداؤد شریف میں ہے جس کے سائب بن یزید رضی اللہ عنہ راوی ہیں:

قال كان يؤذن بين يدى رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم اذا جلس على المنبر يوم الجمعة على باب المسجد و ابى بكر و عمر فلما كان فى خلافة عثمان و كثر الناس امر عثمان يوم الجمعة بالاذان الثالث فاذن به على الزوراء فثبت الامر على ذالك ۔ (ابوداؤد مجتبائی ج ۱ ص ۱۶۳)

اس حدیث کا خلاصۂ مضمون یہ ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بروز جمعہ منبر پر تشریف فرما ہوتے تو دروازۂ مسجد پر حضور کے سامنے اذان دی جاتی تھی اور اسی طرح خلافت اول اور دوم میں ہوتا رہا۔ پھر جب خلافت سوم ہوئی اور لوگ زیادہ ہو گئے تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہلی اذان کا اور اضافہ کیا تو یہ اذان مقام زوراء (جو بازار میں ایک گھر تھا اس کی چھت) پر کہی جاتی پھر عمل اسی طرح ہوتا رہا) ۔

اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوئیں۔ ایک بات یہ ہے کہ جمعہ کی اذان اول کا تو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ پاک اور خلافت اول و دوم میں وجود ہی نہ تھا۔ اس کا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اضافہ فرمایا ہے اور یہ اذان بازار کے ایک گھر زوراء کی چھت پر ہوتی تھی۔ تو یہ اذان مسجد سے کچھ فاصلہ پر ہوتی تھی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ خطبہ والی اذان دوم زمانہ اقدس سے برابر خطبہ سے پہلے دروازۂ مسجد پر منبر کے مقابل ہوتی رہی۔ کسی خلافت میں اس کے اندر کسی طرح کا کوئی تغیر نہیں ہوا اور ظاہر ہے کہ دروازۂ مسجد خارج مسجد ہوتا ہے تو اس اذان کا بھی مسجد سے باہر ہونا سنت قرار پایا۔ اسی

بنا پر فقہاء نے مسجد کے اندر اذان کہنا ممنوع ٹھہرایا۔

فتاویٰ قاضی خاں اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

و ینبغی ان یؤ ذ ن علی المنارۃ او خارج المسجد و لا یو ذ ن فی المسجد کذا فی فتاوی قاضی خان ۔ (عالمگیری مجیدی ص ۲۹)

یعنی منارہ یا خارج مسجد میں اذان کہنا مستحب ہے اور مسجد میں اذان نہ کہی جائے۔

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ اذان مسجد میں کہنا ممنوع ہے اور حکم تمام اذانوں کو عام ہے تو جمعہ کی یہ اذان دوم بھی اسی حکم میں داخل ہے۔ پھر جو اس کو اس میں داخل نہ مانے اور اس کو مسجد میں بلا کراہت جائز جانے وہ دلیل خصوص اپنے دعویٰ پر قائم کرے۔ اب رہا رواج کو دلیل ٹھہرانا تو ایسا رواج حجت شرعی نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) اذان کے کچھ دیر بعد دوسرے اعلان کو تثویب کہتے ہیں۔ فقہاء کرام نے اس تثویب کو جائز قرار دیا جس کی تصریح اکثر کتب فقہ میں موجود ہے۔ لیکن اس کے لئے کوئی خاص الفاظ مقرر نہیں۔ بلکہ اس کو ہر مقام کے عرف پر موقوف کیا گیا ہے۔ اور تثویب میں صلاۃ وسلام کے الفاظ ۷۸۱ھ میں جاری ہوئے۔ فقہاء نے انہیں بہتر و مستحسن قرار دیا ہے۔

فقہ کی مشہور کتاب درمختار میں ہے:

التسلیم بعد الاذان حدث فی ربیع الاخر سنة سبعمائة و احدی و ثمانین فی عشاء لیلة الاثنین ثم یوم الجمعة ثم بعد عشر سنین حدث فی الکل الا المغرب ثم فیها مرتین و هو بدعة حسنة ۔ (ردالمحتار مصری ج ۱ ص ۲۷۳)

یعنی اذان کے بعد صلوٰۃ وسلام کی بنا ربیع الاخر ۷۸۱ھ کی شب دوشنبہ کی نماز میں شروع ہوئی۔ پھر جمعہ کے دن میں۔ پھر دس سال بعد سوائے مغرب کے سب نمازوں میں شروع ہوا۔ پھر مغرب میں بھی دوبار۔ تو یہ صلوٰۃ وسلام بدعت حسنہ یعنی امر مستحسن ہے۔ لہٰذا اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ اذان کے بعد جماعت کے کھڑے ہونے سے کچھ دیر پہلے صلوٰۃ وسلام کہنا نہ فقط جائز بلکہ مستحسن ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۲۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ اذان کے کلمات کا جواب دینا کیسا ہے؟۔ موذن کے حی علی الصلوۃ، حی علی الفلاح۔ الصلاۃ خیر من النوم کے عوض کیا کہنا چاہئے؟۔ اور تکبیر کے کلمات کا جواب دینا بھی چاہئے؟۔ اگر جواب دیا جائے تب قد قامت الصلوۃ کے جواب میں کیا کہنا چاہئے؟۔ ہاں اذان کے بعد دعا پڑھنے سے پہلے درود شریف پڑھنا بھی آیا ضروری ہے یا اختیاری یا کیسا ہے؟۔

ح۔م۔ اشرفی ۲۵/ اکتوبر

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

اذان کے کلمات کا جواب مستحب بلکہ سنت ہے اور حی علی الصلوۃ وحی علی الفلاح کے جواب میں لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہنا چاہئے۔ تکبیر کے کلمات کا جواب دینا مسنون نہیں۔ دے سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

﴿۱۸﴾

باب ارکان الصلوۃ

مسئلہ (۲۲۹)
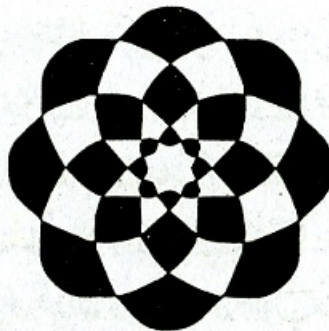
جناب مفتی جی صاحب ہادی دین وجامع علوم ظاہری ومنبع فیوض باطنی بعد مسنون السلام علیکم کے واضح ہو کہ آپ برائے مہربانی مسائل ذیل کے جواب باقاعدہ مہر کے تحریر فرمادیئے جائیں عین مہربانی ہوگی۔ بندہ کو ممنون ومشکور فرمائیگا (نوٹ) خط صاف ہوتا کہ پڑھنے میں مشکوکی نہ ہو۔

اگر نمازی کے نماز پڑھنے میں کوئی دوسرا شخص آگے ہو کے گذر جائے تو وہ گنہگار ہوا یا نہیں اور نماز نماز پڑھنے والے کی باطل ہوئی یا نہیں؟۔ اگر قصداً گذر جائے تو اور سہواً گذر جائے ہر طرح کی تفصیل کر دیجئے گا۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

نمازی کے سامنے سے سہواً گذرنے والے تو گنہگار ہی نہیں۔ ہاں قصداً گذرنے والا سخت گنہگار ہے بہرصورت اس سے نمازی کی نماز باطل نہیں ہوئی۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۳۰)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

امام نے نماز پڑھائی مقتدی نے اپنے غلط خیال سے یا بھول سے لقمہ دیا لیکن امام نے اپنے صحیح خیال کے مطابق مقتدی کا لقمہ رد کرتے ہوئے نماز ختم کی۔ تو اس لقمہ دینے سے مقتدی کی نماز میں نقص ہوا یا نہیں؟۔ اگر نقص ہو تو نماز کے اعادہ کی ضرورت ہے یا نہیں؟۔ بینوا توجروا۔

مستفتی، مولوی محمد عبد اللہ خان نگینہ مسجد تالاب محلہ اون ضلع ایوب محل

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

اپنے امام کو بوقت حاجت لقمہ دینے سے مقتدی کی نماز میں کوئی نقص نہیں آتا اگرچہ لقمہ دینے میں اس سے سہواً غلطی ہوگئی ہو اس کو نماز کے اعادے کی بھی حاجت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

۱۵ شوال ۱۳۷۷ھ

مسئلہ (۲۳۱-۲۳۲-۲۳۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ان تین مسئلوں میں

(۱) رمضان المبارک میں قرآن کریم کی اجرت دیکر سننا کیسا ہے؟۔

(۲) زید کہتا ہے کہ نماز پڑھانے کی اجرت نہیں لینی چاہئے اگرچہ امام کا ذریعہ معاش یہی ہو تو امام کو کیا کرنا چاہئے؟۔

(۳) اگر حافظ درکار ہو تو جانے آنے کا خرچ ودیگر خرچ طے کرسکتا ہے یا نہیں؟۔

حسن پور دوئم

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

(۱) رمضان المبارک میں قرآن کریم کا اجرت دیکر سننا ممنوع ہے۔ اس کے جواز کے لئے وقت کی اجرت مقرر کی جائے اور اس وقت میں قرآن شریف پڑھوایا جاسکتا ہے تو یہ اجرت قرآن کریم کی نہیں بلکہ وقت کی ہوئی فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) نماز پڑھانے کی اجرت دینا اور لینا بلاشبہ جائز ہے۔ ہدایہ وغیرہ کتب فقہ میں یہ مسئلہ موجود ہے اور متاخرین فقہاء نے امامت کی اجرت کے جواز کا فتوی دیا ہے فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) جو حافظ دور کا رہنے والا ہو وہ اپنے جانے اور آنے کے اخراجات یقیناً طے کرسکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۳۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله الذی ارشدنا الی الملة الحنفية والصلوة والسلام علی خير الانبياء سيدنا محمد النبی الامی وعلی آله وصحبه اجمعين

لو فرغ الامام من الصلوة وتذكر ان ما صلاه خمسة ركعات فی ذوات الاربع وتشهد فی القعدة الاولی وسهاعن القعده الاخيرةفهل يفسد صلاته ويجب عليه اعادةالصلوة ام لا ؟۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

الحمد لله الذی اوضح علينا الملة البيضاء وسهل لنا طريقنا بالارشاد والاهتداء وجعل لنشرها رجالا بالافتاء واوجب علی طالبيهاالاستفتاء ۔والصلوة والسلام علی صاحب الجود والعطاء ،ماحی الذنوب والخطاء ،سيد الاولياء ،نبی الانبياء ، سيدنامحمد الذی هو باعث تخليق الكون بلاامتراء،وعلی آله الذين هم كالسفينةعلی وجه الماء ،وعلی اصحابه الذين هم كالنجوم علی افق السماء،وعلی جميع الاصفياء والاتقياء ،وعلی سائر الفقهاء ،وعلينامعهم الی يوم الجزاء ۔

امابعد فاجيب عن السوال ان سها عن القعدة الاخيرةفی ذوات الاربع وزاد الركعةالخامسةبطل فرضه وتحول فرضه نفلا وعليه اعادةالفرض كذا فی الدر المختار والغنيةوالطحطاوی ورد المحتار وغيرها ۔والله تعالیٰ اعلم بالصوابؐ ۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۳۵)

ھل للمصلی ان یفرج بین قدمیه اکثر من اربع اصابع و کم من مقدار یکون بین القدمیں ؟۔

الجواب

اللھم ھدایة الحق والصواب

یسن فی القیام تفریج القدمیں قدر اربع اصابع الید لانه اقرب الی الخشوع ھکذا فی الطحطاوی وروی عن ابی نصر الدبوسی انه کان فعله کذا فی الکبری صرح به العلامة الشامی فی رد المحتار والله تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبه : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۳۶)

لو رفع المصلی رجلیه فی السجود بعد الطمانیة فھل تفسد به الصلوه ام لا ؟۔

الجواب

اللھم ھدایة الحق والصواب

رفع الرجلین فی السجود بعد الطمانیة غیر مفسد الصلوة لانه وضع اصابعهما علی الارض قدر تسبیحة واستقر کل عضو فی محله بقدر الفرض والمفروض من الرکن ادنی ما یطلق علیه اسم الفرض فیحصل بھذا القدر فرضیة السجود ووجوبه لکنه مکروه لان التسبیح فیه سنة لقوله علیه السلام اذا سجد احدکم فلیقل سبحان ربی الاعلی ثلاث مرات وذالک ادناه فترکه او نقصه مکروه کماھو مصرح فی کتب الفقه: والله اعلم بالصواب۔

کتبه : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

(۱) لا يجب عليه التشهد بعد فراغ امامه لان المسبوق متفرد بعد سلام الامام فلا يبقى عليه متابعة الامام فيقضي ما فات من صلوته والله تعالى اعلم بالصوب۔

(۲) يستانف الصلوة لترك الواجب ولا يجبر النقصان بسجدة السهو والله تعالى اعلم۔

(۳) نعم يجب عليه استيناف الصلوة لترك الواجب وهو تعقيب التشهد للقيام بلا فاصل حتى لو سكت يلزمه السهو صرح به في رد المحتار والله تعالى اعلم بالصوب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۴۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع ان مسائل میں کہ
بیٹھ کرنماز پڑھنے میں ایڑی کو رکوع میں سرین سے علیحدہ کرنا چاہیے یا نہیں؟۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

رکوع میں بیٹھ کرنماز پڑھنے کی حالت میں جھکنے کی انتہا تصریحات کتب فقہ سے اس قدر ثابت ہے:

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

فان ركع جالسا ينبغي ان تحاذى جبهته ركبتيه ليحصل الركوع ولعل مراده انحناء الظهر عملا بالحقيقة لا انه يبالغ فيه حتى يكون قريبا من السجود له۔

(طحطاوی مصری ص۱۳۳ ج۱)

اگر بیٹھ کر رکوع کیا تو لائق یہ ہے کہ اپنی پیشانی کو اپنے دونوں گھٹنوں کے مقابل کرے تا کہ رکوع حاصل ہو۔ اس سے مراد پشت کا جھکانا ہے حقیقت پر عمل کرتے ہوئے نہ یہ بات کہ رکوع میں اتنا مبالغہ کر

ے کہ سجدہ کے قریب ہو جائے۔

علامہ ابن عابدین برجندی سے ردالمحتار میں ناقل ہیں:

لو کان یصلی قاعدا ینبغی ان یحاذی جبهته قدام رکبتیه فیحصل الرکوع اه۔ قلت ولعله محمول علی تمام الرکوع والا فقدعلمت حصوله باصل طأطأة الراس ای مع انحناء الظهر۔ (ردالمحتار مصری ص ۳۱۳۔ ج ۱)

اگر بیٹھ کر رکوع کیا تو لائق یہ ہے کہ اپنی پیشانی کو اپنے دونوں گھٹنوں کے مقابل کرے تاکہ رکوع حاصل ہو۔ میں کہتا ہوں شاید کہ اسے تمام رکوع پر حمل کیا جائے ورنہ تو نے جان لیا کہ رکوع کا حصول پشت کے جھکانے اور سر کے نیچے کرنے سے ہو جاتا ہے۔

میری نظر میں ایڑی کو سرین سے جدا کرنیکی کوئی تصریح نہیں ہے۔ لیکن ان عبارات پر غور کرنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیٹھنے کی حالت میں رکوع کی فرضیت تو صرف پشت کے جھکا دینے سے ادا ہو جائیگی اور اس جھکنے کی انتہا یہ ہے کہ پیشانی کو گھٹنوں کے مقابل کر دیا جائے اور یہ تقابل سرین کو ایڑی سے جدا کئے ہوئے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ تو پھر سرین کو ایڑی سے علیحدہ کرنیکی کونسی ضرورت داعی ہے۔ نیز اگر سرین کو ایڑی سے جدا کر کے پیشانی کو گھٹنے کے مقابل کیا جاتا ہے تو اقرب من السجود ہو جاتا ہے اور اس کی ممانعت عبارت طحطاوی سے گزری۔ اور سرین کو ایڑی سے بغیر جدا کئے ہوئے جب پیشانی کو گھٹنوں کے مقابل کیا جاتا ہے تو ہیئت سجدہ سے بالکل امتیاز ہو جاتا ہے اور رکوع سجود کا امتیاز شرعا مطلوب ہے۔

طحطاوی میں ہے: وجعل ایمائه للسجود اخفض من ایمائه للرکوع تمیزا بینهما۔

تو مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرین کو ایڑی سے جدا نہ کیا جائے۔ معہذا اس میں کسی حکم شرعی کی مخالفت بھی لازم نہیں آتی ہے تو بلا کسی تصریح کے کس طرح سرین کو ایڑی سے جدا کرنے کا حکم دیا جائے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

الجواب

اللھم ھدایة الحق والصواب

(۱) لا یجب علیه التشهد بعد فراغ اما مه لا ن المسبو ق متفر دبعد سلام الامام فلا یبقی علیه متابعة الاما م فیقضی ما فات من صلوته والله تعالی اعلم بالصوب ۔

(۲) یستانف الصلوۃ لترک الواجب ولا یجبر النقصان بسجدة السهو والله تعالی اعلم ۔

(۳) نعم یجب علیه استینا ف الصلوۃ لترک الواجب وهو تعقیب التشهد للقیا م بلا فاصل حتی لو سکت یلزمه السهو صرح به فی رد المحتار والله تعالی اعلم بالصوب ۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۴۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع ان مسائل میں کہ
بیٹھ کرنماز پڑھنے میں ایڑی کو رکوع میں سرین سے علیحدہ کرنا چاہیے یانہیں؟۔

الجواب

اللھم ھدایة الحق والصواب

رکوع میں بیٹھ کرنماز پڑھنے کی حالت میں جھکنے کی انتہا تصریحات کتب فقہ سے اس قدر ثابت ہے:

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

فان رکع جا لسا ینبغی ان تحاذی جبهته رکبتیں لیحصل الرکو ع ولعل مراده انحناء الظهرعملا با لحقیقة لا انه یبا لغ فیه حتی یکو ن قریبا من السجود له۔

(طحطاوی مصری ص ۱۳۳ ج ۱)

اگر بیٹھ کر رکوع کیا تو لائق یہ ہے کہ اپنی پیشانی کو اپنے دونوں گھٹنوں کے مقابل کرے تا کہ رکوع حاصل ہو۔اس سے مراد پشت کا جھکانا ہے حقیقت پرعمل کرتے ہوئے نہ یہ بات کہ رکوع میں اتنا مبالغہ کر

ے کہ سجدہ کے قریب ہو جائے۔

علامہ ابن عابدین برجندی سے ردالمحتار میں ناقل ہیں:

لو کان یصلی قاعدا ینبغی ان یحاذی جبهته قدام رکبتیه فیحصل الرکوع اه۔ قلت ولعله محمول علی تمام الرکوع والا فقدعلمت حصوله باصل طأطأة الرأس ای مع انحناء الظهر۔ (ردالمحتار مصری ص۳۱۲۔ج۱)

اگر بیٹھ کر رکوع کیا تو لائق یہ ہے کہ اپنی پیشانی کو اپنے دونوں گھٹنوں کے مقابل کرے تا کہ رکوع حاصل ہو۔ میں کہتا ہوں شاید کہ اسے تمام رکوع پر حمل کیا جائے ورنہ تو نے جان لیا کہ رکوع کا حصول پشت کے جھکانے اور سر کے نیچے کرنے سے ہو جاتا ہے۔

میری نظر میں ایڑی کو سرین سے جدا کرنیکی کوئی تصریح نہیں ہے۔ لیکن ان عبارات پر غور کرنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیٹھنے کی حالت میں رکوع کی فرضیت تو صرف پشت کے جھکا دینے سے ادا ہو جائیگی اور اس جھکنے کی انتہا یہ ہے کہ پیشانی کو گھٹنوں کے مقابل کر دیا جائے اور یہ تقابل سرین کو ایڑی سے جدا کئے ہوئے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ تو پھر سرین کو ایڑی سے علیحدہ کرنیکی کونسی ضرورت داعی ہے۔ نیز اگر سرین کو ایڑی سے جدا کر کے پیشانی کو گھٹنے کے مقابل کیا جاتا ہے تو اقرب من السجود ہو جاتا ہے اور اس کی ممانعت عبارت طحطاوی سے گزری۔ اور سرین کو ایڑی سے بغیر جدا کئے ہوئے جب پیشانی کو گھٹنوں کے مقابل کیا جاتا ہے تو ہیت سجدہ سے بالکل امتیاز ہو جاتا ہے اور رکوع سجود کا امتیاز شرعا مطلوب ہے۔

طحطاوی میں ہے: وجعل ایمائه للسجود اخفض من ایمائه للرکوع تمیزا بینهما۔

تو مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرین کو ایڑی سے جدا نہ کیا جائے۔ معہذا اس میں کسی حکم شرعی کی مخالفت بھی لازم نہیں آتی ہے تو بلا کسی تصریح کے کس طرح سرین کو ایڑی سے جدا کرنے کا حکم دیا جائے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۴۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

امام مغرب کی پہلی دو رکعات میں سے ایک میں بعد سورۃ فاتحہ کے سورۃ فیل "طیرا ابابیل" تک پڑھا اور اس کے بعد رکوع کر لیا تو یہ نماز صحیح ادا ہوگئی یا اس میں کوئی نقصان باقی رہ گیا؟۔ بینوا توجروا

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

سورۃ فاتحہ کے بعد تین چھوٹی آیتوں یا ایک ایسی آیت جو تین چھوٹی آیات کے برابر ہو اس قدر قراۃ کا پڑھنا صحت نماز کے لئے کافی ہے۔ فقہ کی مشور کتاب درمختار میں ہے:

وضم سورة الكوثر او ما قام مقامها وهو ثلث آيات قصا ر نحو ثم نظر، ثم عبس وبسر، ثم ادبر واستكبر۔ وكذا لو كانت آيات او الآيتان تعدل ثلث قصار۔

شامی میں ہے: وان قرأ ثلث آيات قصا را و كانت الآيات او الا يتا ن تعدل ثلث آيات قصا ر خرج عن حد الكراهة المذكورة يعني كراهة التحريم"

اور صورت مسئولہ میں جب امام نے سورۃ فیل کو "طیرا ابابیل" تک پڑھ لیا ہے تو تین آیتیں پوری ہوگئیں۔ تو نماز کے صحیح ادا ہونے میں کوئی شک ہی باقی نہیں۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

۲۶ رشوال المکرم ۱۳۷۰ھ

مسئلہ (۲۴۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

نماز پڑھتے وقت خیال کس طرف ہونا چاہئے اور نگاہ کس مقام پر ہونا چاہئے اور آنکھیں بند کر کے نماز پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ اور اگر چاہئے تو بھی کس طریقے سے اور آنکھیں کھول کر پڑھنے سے کیا تصور کریں؟۔ صاف صاف تحریر کیجئے۔ بینوا توجروا۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

نماز میں آنکھیں کھلی ہوئی رکھی جائیں۔ اور نگاہ قیام میں سجدہ کی جگہ کی طرف۔ اور رکوع میں قدم کی پشت کی طرف۔ اور سجدہ میں ناک کی طرف اور قاعدہ میں گود کی طرف۔ اور پہلے سلام میں داہنے کندھے کی طرف اور دوسرے سلام میں بائیں کندھے کی طرف رکھے۔ اور آنکھوں کو بند رکھنا مکروہ ہے۔ مگر جب آنکھیں کھلی ہوئی رکھنے میں خیالات منتشر ہوتے ہوں اور خشوع نہ ہوتا ہو تو انہیں بند رکھ سکتا ہے بلکہ ایسے شخص کے لئے اولی یہ ہے کہ انہیں بند ہی رکھے۔ ھذا کلہ فی رد المحتار"

اب باقی رہا خیال تو اس کی پوری توجہ اللہ تعالی ہی کی طرف رہے۔ اور ارکان نماز ادا کرنے میں حضور ﷺ کے افعال کی مطابقت کا پورا خیال رکھے اور قرأت وتشہد اور درود شریف میں حضور ﷺ کی جانب توجہ کرے کہ وہ درگاہ میں واسطہ ہیں۔ اور حضور کی طرف خیال کا لے جانا اللہ تعالی کی طرف خیال لے جانے کے منافی نہیں ہے۔ جیسے حضور کی اطاعت اور اللہ تعالی کی اطاعت کا ذکر قرآن کریم میں ہے :" ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ "

حدیث قدسی میں ہے:

" جعلت ذکرا من ذکری فمن ذکرک ذکرنی " نقلہ القاضی فی شفائہ ۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۴۶)

یہاں اصل میں استفتاء اور جواب نہیں بلکہ صرف جواب الجواب ہی لکھا ہے۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے دیوبندیوں سے چلتی ریل میں نماز پڑھنے کے بارے میں سوال کیا تو جواب میں مولوی مظفر حسین مظاہری نے صرف اتنا لکھ دیا کہ اس میں اختلاف ہے، اور اسی طرح کی لایعنی چیزیں تھیں جن کی جانب اس فتوی میں اشارہ ہے اور ساتھ ہی ان کا رد بھی۔

جواب الجواب:

الحمد لله و کفی ۔ والصلوۃ علی من اصطفی ۔ ان مفتیان سہارنپور کے جواب کو دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ ان کو نہ فقہ سے کوئی علاقہ ۔ نہ احکام رسم المفتی سے کچھ واسطہ ۔ اور ان میں نہ مسئلہ سمجھنے کی لیاقت ۔ نہ سوال کے جواب دینے کی صلاحیت ۔ ہر اردو خواں جانتا ہے کہ سائل یہ دریافت کر رہا ہے کہ چلتی ریل گاڑی میں فرض نماز ادا ہوگی یا نہیں ۔ مجیب اس کے جواب میں لکھتا کہ فرض نماز ادا ہو جائے گی یا ادا نہ ہوگی ۔ یعنی کسی ایک صورت پر حکم قطعی دیتا ۔ اور اس پر کوئی حوالہ کتاب نقل کر دیتا ۔ لیکن وہ اپنی قابلیت کا اس طرح اظہار کرتا ہے ۔

اس مسئلہ پر جب ریل جاری ہوئی تھی علماء میں اختلاف تھا کہ اس میں نماز جائز ہے یا نہیں ۔

اولا: اس عبارت میں ریل میں نماز پڑھنے کا اگر یہ مطلب ہے کہ ٹھہری ہوئی ریل میں تو اس کے لئے یہ کہنا جھوٹ اور غلط ہے ۔ کہ اس مسئلہ پر علماء میں اختلاف تھا ۔ اس کے آگے مجیب خود یہ اقرار کرتا ہے ۔

اگر ریل گاڑی ٹھہری ہوئی ہے تب تو بالاتفاق سب کے نزدیک نماز درست ہے ۔

تو مجیب کی کون سی بات صحیح ہے اور کونسی باطل ۔

ثانیاً: اگر ریل میں نماز پڑھنے کا یہ مطلب ہے کہ چلتی ریل میں نماز پڑھنے پر علما کا اختلاف تھا تو اس میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ علماء سے علمائے اہل سنت و علمائے وہابیہ کے مابین کا اختلاف مراد ہے؟ ۔ یا صرف علمائے اہلسنت کے مابین کا اختلاف ہے؟ ۔ یا فقط علمائے وہابیہ کے مابین کا اختلاف؟ ۔

ثالثاً: اگر صرف علمائے اہلسنت کے مابین کا اختلاف مراد ہے تو مجیب اس کا ثبوت پیش کرے اور یہ بتائے کہ علمائے اہلسنت کا اس میں کیا اختلاف ہے اور اس اختلاف کو کس نے لکھا اور کس کتاب میں کہاں لکھا ہے؟ ۔ اور اگر صرف علمائے وہابیہ کے مابین کا اختلاف مراد ہے تو ان میں کیا اختلاف ہے؟ ۔ اور موافقین کے کیا کیا اسماء ہیں؟ ۔ اور مخالفین کے کیا نام ہیں؟

رابعاً: اگر علمائے اہلسنت و علمائے وہابیہ کے مابین کا اختلاف مراد ہے تو چلتی ریل میں جواز فرائض و واجبات کے مخالف علمائے اہلسنت ہی قرار پاتے ہیں کہ مجیب کا یہ قول

ہمارے مشائخ کی تحقیق یہ ہے الخ ۔ اس کی کافی دلیل ہے یا نہیں ۔

پھر مجیب صاحب تحریر فرماتے ہیں:

اگر ریل گاڑی ٹھہری ہوئی ہے تب تو بالاتفاق سب کے نزدیک نماز درست ہے۔

اولاً: سائل اس صورت کا سوال ہی نہیں کر رہا ہے تو مجیب کا جواب میں یہ لکھنا سوال از آسمان و جواب از ریسمان جیسا جواب ہے۔

ثانیاً: اگر اس عبارت میں الفاظ (بالاتفاق سب کے نزدیک) سے صرف علمائے وہابیہ ہی مراد لیے جاتے ہیں تو پھر آگے کے یہ الفاظ۔ ہمارے مشائخ۔ آخر کس لئے ہیں۔

ثالثاً: اور اگر اس میں صرف علمائے اہل سنت کا اتفاق مراد لیا جاتا ہے تو علمائے وہابیہ کا مسلک اس کے خلاف ثابت ہوا جاتا ہے۔

رابعاً: جب ٹھری ہوئی ریل میں نماز جائز ہے تو وہ اسی بنا پر تو ہے کہ وہ مثل سریر موضوع علی الارض ہے۔ لہذا ٹھہری ہوئی گاڑی میں نماز پڑھنا گویا زمین پر ہی نماز پڑھنے کے حکم میں ہوا۔ تو یہ تعلیل صرف ٹھہری ہوئی گاڑی کی ہوئی یا نہیں؟۔ پھر مجیب اس کے بعد لکھتا ہے۔

البتہ چلتی ریل میں نماز پڑھنے میں اختلاف ہے بعض علماء ایسی صورت میں نماز جائز نہیں کہتے۔

اولاً:۔ ان بعض علماء سے اگر صرف علمائے اہلسنت مراد ہیں تو وہ بعض علمائے اہلسنت کون کون ہیں جو ایسی صورت میں فرائض و واجبات کو جائز نہیں کہتے ہوں؟۔ ورنہ اس کو یوں لکھنا تھا کہ کل علمائے اہلسنت ایسی صورت میں نماز جائز نہیں کہتے۔ تو کل کو بعض کہنا مغالطہ نہیں تو اور کیا ہے۔

ثانیاً: اور اگر بعض علماء سے بعض علمائے وہابیہ مراد ہیں تو وہ بعض آیا مشائخ وہابیہ میں داخل ہیں یا نہیں۔

ثالثاً: اگر وہ بعض مشائخ وہابیہ سے نہیں تو ان کا یہ قول باقرار مجیب غیر محقق اور مرجوح قرار پایا یا نہیں؟۔

رابعاً: قول مرجوح کا فتوی میں پیش کرنا بحکم رسم المفتی جہالت ہے یا نہیں؟۔

خامساً: اور اگر وہ بعض مشائخ وہابیہ میں داخل ہیں تو پھر مجیب کا یہ لکھنا

ہمارے مشائخ کی تحقیق یہ ہی ہے کہ نماز دونوں صورتوں میں درست ہے۔ جھوٹ اور غلط ہوا یا نہیں۔۔ پھر مجیب اس کے بعد لکھتا ہے:

ہمارے مشائخ کی تحقیق یہ ہی ہے کہ نماز دونوں صورتوں میں جائز ہے۔

اولاً: اس عبارت میں ہمارے مشائخ سے نہ فقہائے کرام و مصنفین کتب مشہورہ مراد ہو سکتے ہیں

۔اس لئے کہ ان کے زمانہ سابقہ میں ریل جاری نہ ہوئی تھی تو وہ اس کی تحقیق ہی کیوں فرماتے۔اور نہ ان مشائخ سے علمائے اہلسنت مراد ہو سکتے ہیں کہ علمائے اہلسنت جب دیوبندیوں کو گمراہ و بے دین کہتے ہیں اور دیوبندی انہیں اہل بدعت و شرک لکھتے ہیں۔تو دیوبندی ان علمائے اہلسنت کو اپنا مشائخ کس طرح قرار دے سکتے ہیں۔لہذا اب ان مشائخ سے اکابر دیوبند ہی مراد ہوتے ہیں۔تو یہ ثابت ہو گیا کہ تمام دیوبندیوں کا یہی مسلک ہے کہ اگر فرائض وواجبات چلتی ہوئی اور ٹھہری ہوئی گاڑی کی دونوں صورتوں میں نماز درست ہے۔مجیب نے اس کو پردۂ اجمال میں کیوں ذکر کیا۔

ثانیا: جب سوال میں یہ اشارہ تھا کہ یہ مسئلہ بریلوی حضرات نے طلب کیا ہے تو مجیب پر لازم تھا کہ اپنے ان مشائخ کی تحقیق کو نقل کرتا۔اور مخالفین کے سامنے اپنے مشائخ کے دلائل کو پیش کرتا۔پھر یہ مجیب اپنے اس دعوی یہ دلیل قائم کرتا ہے۔

کیوں کہ اگر ریل مثل سریر موضوع علی الارض ہے تو ظاہر ہے کہ نماز درست ہی ہے۔

اولا: مجیب کا دعوی تو یہ ہے کہ چلتی ہوئی ریل میں نماز درست ہے اور دلیل یہ ہے کہ جو تخت زمین پر ایک جگہ رکھا ہوا ہے اس پر نماز درست ہے۔تو اس دلیل سے دعوی کس طرح ثابت ہوا؟۔

ثانیا: اگر مجیب یہ کہتا کہ ہے کہ چلتی ہوئی ریل اس چلتے ہوئے تخت کی مثل ہے جس کو رسی سے باندھ کر کھینچا جا رہا ہے تو ممانعت بھی پائی جاتی۔اور دلیل دعوی کو ثابت کر دیتی۔لیکن مجیب کو یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ جس تخت کو رسی سے باندھ کر کھینچا جائے اور برابر جگہ بدلتی رہے جب بھی اس چلتے ہوئے تخت پر نماز فرض وواجب درست ہے۔

ثالثا: مجیب کا یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے زمین پر چلتے ہوئے نماز پڑھنا درست ہے۔کیونکہ زمین پر بھی پڑھنا درست ہے۔تو بتائیے کہ یہ استدلال صحیح ہے یا نہیں؟۔

رابعا: ردالمحتار میں ہے۔" اختلاف المکان مبطل العذر "تو نمازی کے لئے اتحاد مکان شرط ہوا یا نہیں۔اور چلتی ریل میں اختلاف مکان ہوتا ہے یا نہیں۔

خامسا: ردالمحتار میں ہے:" اتحاد المکان واستقبال القبلۃ شرط فی صلاۃ غیر النافلۃ عند الامکان لا یسقط الابعذر۔اسی میں ہے:" فالتحویل مفسد اذا کان قدر اداء رکن ولو کان فی مکانہ "اور چلتی ہوئی ریل میں کبھی فرض نماز میں قبلہ سے انحراف ہو جاتا ہے تو یہ انحراف مفسد نماز ہے یا نہیں؟۔اور مجیب اپنی اس دلیل کی تائید میں درمختار کی یہ عبارت پیش کرتا ہے۔وان لم

یکن طرف العجلة علی الدابة جاز لو واقفة لتعلیلھم انھا کالسریر۔

اولا: مجیب نے نقل عبارت میں اتنی غلطی کی کہ ''بانھا کالسریر'' کے بجائے ''انھا کالسریر'' لکھا۔یعنی باء جارہ کو چھوڑ کر عبارت کو بے ربط کردیا۔

ثانیا: مجیب نے عبارت نقل کردی لیکن کاش اگر اس عبارت کو سمجھ بھی لیا ہوتا تو ایسی شرمناک غلطی نہ ہوتی۔مگر بہت ممکن ہے کہ غیر زبان کی عربی عبارت ہے۔مجیب کی سمجھ میں نہ آئی ہو تو اسکی تفہیم کے لئے پہلے میں اردو میں ترجمہ لکھ دوں اور وہ بھی مجیب ہی کے پیشوا مولوی احسن نانوتوی کا ترجمہ۔

چنانچہ غایۃ الاوطار ترجمہ درمختار میں اس کا ترجمہ یہ ہے۔

اور اگر گاڑی کا سر بیل وغیرہ پر نہ ہو تو نماز اس میں جائز ہے اگر وہ کھڑی ہو چلتی نہ ہو بہ سبب علت بیان کرنے فقہا کے کہ زمین پر کھڑی ہوئی گاڑی مثل تخت کے ہے۔

(غایۃ الاوطار کشوری ص ۳۲۳ ج ۱)

کہیے مجیب صاحب اب یہ اردو ترجمہ دیکھ کر تو آپ کی سمجھ میں بھی آ گیا ہوگا کہ یہ عبارت در مختار کھڑی گاڑی کے لئے ہے نہ کہ چلتی گاڑی کے لئے۔اب آپ خود ہی بتائیں کہ اس عبارت کو اپنے دعوے کے ثبوت میں نقل کرنا جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔

ثالثا: اس عبارت سے ثابت ہوا کہ فقہاء کرام نے تو زمین پر کھڑی ہوئی گاڑی کو مثل تخت قرار دیا ہے اور مجیب نے اس کے مقابلہ میں چلتی ریل گاڑی کو مثل تخت ٹھیرا کر اپنے مجتہد ہونے کا اعلان کیا ہے۔

رابعا: اس عبارت میں ''جاز لو واقفة'' کی جب تصریح موجود ہے تو چلتی ریل گاڑی میں جواز صلوۃ کا حکم اس عبارت کے کونسے لفظ سے ثابت ہو رہا ہے۔

خامسا: فقہائے کرام نے جس گاڑی کو مثل تخت کے قرار دیا ہے تو وہ اسی بنا پر تو ہے کہ تخت چار پایوں پر زمین پر قائم ہے اسی طرح گاڑی بھی چار پہیوں پر زمین پر قائم ہے۔اب باقی رہا گاڑی کا چلنا اس کی تخت سے مماثلت کس بنا پر ہے۔پھر اس عبارت کے بعد مجیب نے شامی کی یہ عبارت پیش کی۔

قوله لو واقفة كذا قيده فی شرح المنية ولم اره لغيره يعنی اذا كانت العجلة على الارض ولم يكن شئ منها على الدابة وانمابها حبل مثلا تجرها الدابة تصح الصلوة عليها لانه حينئذ كالسرير الموضوع على الارض ومقتضى هذا التعليل انها لو كانت سائرة فی هذه الحالة لا تصح الصلوة عليها بلا عذروفيه تا مل لان جرها بالحبل وهی على الارض

لا یخرج به عن کونها علی الارض ویفیده عبارة التتار خانیة ۔شامی ۔

اقول: اولا: مجیب سے نقل عبارت میں دو غلطیاں ہوئیں ۔ایک تو" تجرها الدابة" کے بعد لفظ" به" کو چھوڑ گیا۔ دوسرے اسی سطر میں "لانها" کے بجائے" لانه" لکھ دیا ہے۔ تو مجیب نے یہ غلطیاں قصدا کیں ہیں یا سہوا؟۔

ثانیا: چار پہیے والی گاڑی کو اگر کھینچا جائے تو اس میں شک نہیں کہ وہ زمین ہی پر رہی لیکن جب وہ چل رہی ہے تو اس سے اختلاف مکان برابر ہوتا چلا جارہا ہے اور اتحاد مکان شرائط نماز سے ہے۔ شامی میں مجیب کی پیش کردہ عبارت کے بعد ہی اسی بحث میں ہے۔

اتحاد المکان واستقبال القبلة شرط فی صلاة غیر النافلة عند الامکان لا یسقط الا بعذر فلو امکنه ایقافها مستقبلا فعل۔

تو چلتی ہوئی ریل میں شرط صلاۃ یعنی اتحاد مکان کا فوت ہونا فرائض و واجبات کو مجیب کی پیش کردہ عبارت سے کس طرح جائز و درست کردیگا۔

ثالثا: اسی طرح چلتی ریل میں دوسری شرط صلاۃ استقبال قبلہ کا بدل جانا انہیں کس بنا پر درست وصحیح گردیگا۔

رابعا: علامہ شامی نے عدم قید کی بنا پر ایک احتمال کا استفادہ کیا لیکن اس کو فتامل کہہ کر اس پر جزم نہ فرمایا تو جواز کے لئے حکم قطعی کس طرح حاصل ہوا۔

خامسا: علامہ شامی نے عبارت مذکورہ جواب کے چند سطر بعد فرمایا: "قلت بقی لو امکنه الایقاف دون الاستقبال فلا کلام فی لزومه" تو یہ عبارت چلتی ریل میں واجب و فرض نماز کی صحت ثابت کرتی ہے یا عدم صحت ۔

سادسا: علامہ شامی کا آخر بحث میں یہ فرمانا۔ والظاهر ان الاول اولی لان الضرورة تتقدر بقدرها فتامل اسکا کیا مطلب ہے۔ اور یہ چلتی ریل میں نماز کے مجوزین کے لئے مفید ہے یا مانعین کے لئے۔ پھر مجیب اپنا فتوی اس عبارت پر ختم کرتے ہیں۔

اور اگر مثل عجلہ محمولہ علی الدابہ مانی جائے تو تب بھی بوجہ عذر کے چلتی ریل میں اتر نہیں سکتا اسی میں نماز پڑھنا درست ہے۔ اما الصلاة علی العجلة ان کانت طرف العجلة علی الدابة وهی تسیر اولا تسیر فتجوز فی حالة العذر الخ شامی واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ مظفر حسین مظاہری دار الافتا مدرسہ مظاہر علوم۔ سہارن پور

الجواب صحیح سعید احمد غفرلہ مفتی مظاہر العلوم ۱۱-۲۲-۳ے ھ

اولا: شامی میں یہ عبارت بلفظہ کہاں ہے ہاں درمختار کی یہ عبارت ہوسکتی ہے۔

ثانیا: اور اگر یہ درمختار ہی کی عبارت ہے تو اس میں ایک غلطی یہ ہے کہ 'ان کانت' کے بجائے 'ان کان' ہے اور دوسری غلطی یہ ہے کہ 'لا تسیر' کے بعد 'فتجوز فی حالۃ العذر' کو لکھ دیا اور درمیان میں 'فھی صلاۃ علی الدابۃ' کو مجیب نے کیوں چھوڑ دیا۔ تو یہ نقل عبارت میں تحریف ہے یا نہیں۔

ثالثا: ریل گاڑی کی بعض بوگی چار پہیوں پر اور بعض آٹھ پہیوں پر زمین پر قائم ہے اسی بنا پر وہ مثل سریر موضوع علی الارض کے حکم میں ہے تو وہ مثل عجلہ محمولہ علی الدابہ کس طرح ہوسکتی ہے۔

رابعاً: عجلہ محمولہ علی الدابہ وہ گاڑی ہے جو خود زمین پر قائم ہو۔ اگر اس میں دو پہیے ہوں تو اس کا جوا وغیرہ جانور پر ہو۔ تو ریل کی بوگی کو اس کی مثل کس نے مانا ہے۔ غالباً مجیب کے مشائخ ہی اس کے ماننے والے ہوں گے۔

خامساً: جب ریل عقلاً ونقلاً کسی طرح عجلہ محمولہ علی الدابہ کے مثل نہیں ہوسکتی تو اس شق کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے اور مجیب کے مسلک کو اس سے کیا قوت پہنچتی ہے۔

سادساً: جس جانور کا ٹھیرنا ممکن ہو اور وہ چل رہا ہے تو بوجہ اس کے چلنے کے عذر کے کیا اس پر نماز واجب وفرض درست ہے۔ تو اس عبارت کا کیا جواب ہے۔ واذا کانت تسیر لا تجوز الصلوٰۃ علیھا اذا قدر علی ایقافھا۔ (شامی)

سابعاً: جو حکم جانور پر نماز کا ہے وہی عجلہ محملہ علی الارض کا ہے اور جب بقول مجیب ریل گاڑی عجلہ محمولہ علی الدابہ کے مثل ہے تو ٹھہری ہوئی ریل گاڑی پر بھی بلا اترے ہوئے بغیر عذر کے واجب وفرض نماز درست نہ ہوگی تو مجیب نے خود اپنے آپ کو جھٹلا دیا۔

ثامناً: جب ریل گاڑی ہر نماز کے وقت میں کسی اسٹیشن پر ضرور ٹھہرتی ہے اور معین وقت پر پہنچ جاتی ہے اور کم از کم اتنی دیر ٹھہرتی ہے کہ مسافر چھوٹی سورتوں سے ٹھہری گاڑی میں فرض کی دو رکعتیں پڑھ سکتا ہے اور گاڑی سے اترنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ لہذا مجیب یہ بتائے کہ عذر شرعی کون کون ہے۔

تاسعاً: جب ریل گاڑی کو مثل عجلہ محمولہ علی الدابہ کے مانا جائے تو چلتی ہوئی اور ٹھہری ہوئی دونوں کا الگ حکم ہوگا کہ نماز حالت عذر میں درست ہوگی اور بلا عذر درست نہ ہوگی تو ٹھہری ہوئی ریل

میں بھی نماز بلا عذر درست نہ ہوئی اور مجیب نے ابتدائے فتوئی میں لکھا: اگر ریل گاڑی ٹھہری ہوئی ہے تب تو باتفاق سب کے نزدیک نماز درست ہے۔ تو مجیب کا کونسا حکم حق وصحیح اور کونسا غلط و باطل۔

عاشراً: مولوی احسن نانوتوی لکھتے ہیں۔ اگر وقت باقی رہنے تک توقف کرے اور ریل کے ٹھہرنے پر نماز پڑھے تو یہ صورت احتیاط کی ہے۔ اب مجیب بتائے کہ یہ اس کے مشائخ سے ہیں یا نہیں اور انکا یہ حکم کیسا ہے؟۔

بالجملہ اس فتوئی سہارنپور پر اس وقت اپنی عدیم الفرصتی اور لڑکے کی شدید علالت کے باوجود ایک سرسری نظر کر کے تقریباً وتخمیناً پچاس مطالبات پیش کر دئے ہیں۔ اگر مفتی سہارنپور کو اپنے علم وقابلیت کا کچھ زعم بھی ہو اور اپنے فتوے کی صحت کا ادنی خیال بھی ہو اور اپنی غلطیوں کا ذرہ بھر احساس بھی ہو تو ان میرے مطالبات کے معقول اور مدلل جواب دیں تو پھر انشاء اللہ تعالیٰ اس مسئلہ پر کافی ابحاث پیش کر دی جائیں گی اور اگر ان مفتی صاحب نے میرے مطالبات کے جوابات ہی نہ دئے۔ یا دئے تو بغیر مدلل اور نامعقول جوابات دئے تو ان کی غلطی اور عجز کا اعتراف خود انکے فعل سے ظاہر ہو جائے گا۔ مولیٰ تعالیٰ انہیں قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۲۲ محرم الحرام ۱۳۷۳ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۴۷-۲۴۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

(۱) مکبر تکبیر کس جگہ کھڑے ہو کر پڑھے امام کے بالکل پیچھے یا داہنے بائیں کھڑے ہو کر تکبیر کہے کیا حکم شرع ہے؟۔

(۲) تکبیر ہوتے وقت امام کا مصلے پر ہونا ضروری ہے یا نہیں؟۔ اگر امام مصلے پر نہ ہو اور مکبر تکبیر پڑھے تو کیا حکم شرعی ہے؟۔ بینوا توجروا۔

المستفتی اعجاز احمد پیلی بھیتی عفی عنہ ۱۹ رذی الحجہ ۱۳۷۱ھ

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

(۱) مکبر کو بہتر یہ ہے کہ امام کے پیچھے کھڑے ہو کر تکبیر کہے اور اگر وہاں موقع نہ ہو تو امام کے داہنی طرف تکبیر کہنی چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) بوقت تکبیر امام کا مصلے پر ہونا ضروری نہیں ہے یہاں تک کہ اگر امام بعد تکبیر کے آیا تو اس تکبیر کو دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں۔

طحطاوی میں ہے: لو حضر الا مام بعد ھا بساعة لا يعيد ھا ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۵ ربیع الآخر ۵۳ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۴۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

ایک شخص پنج وقتہ فرض نماز کے بعد بآواز بلند کلمہ طیبہ کہتا ہے تین بار بآواز بلند کلمہ طیبہ ادا کرتا ہے۔ چند اشخاص اس کے اس عمل سے اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کلمہ طیبہ بلند آواز سے کہنا کسی جگہ نہیں آیا۔ صرف دل میں کہنا چاہئے اور اگر کسی جگہ آیا ہے تو ہمیں بتلا دیا جائے تا کہ ہم بھی پڑھیں۔ اس پر کافی اختلاف ہے از روئے شریعت مطہرہ کیا حکم ہے واضح طور پر سپرد جواب سے روشناس کرائیں نیز معتبر کتب، احادیث سے حوالہ جات بھی نقل فرما کر مہر تصدیق ثبت فرمائیں ممنون ومشکور ہوں گا عین نوازش ہوگی۔

(نوٹ) جواب جلد از جلد ارسال فرما کر مشکور فرمائیں کیونکہ یہ وجہ اختلاف شدت سے زور پکڑ رہا ہے زیادہ حد ادب۔ اگر میرے پتہ پر جواب ارسال فرما سکیں تو قبلہ جناب منشی خلیل احمد صاحب بلاری ارسال فرما دیا جائے وہاں سے حاصل کر لیا جائے گا۔

نیاز مند عاقل حسین نائب مدرس مدرسہ کھوٹی قصبہ بلاری ضلع مراد آباد یوپی

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

پنج وقتہ فرض نمازوں کے بعد بآواز بلند نمازیوں کا ذکر کرنا حدیث شریف سے ثابت ہے۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت ابو معبد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

ان ابن عباس اخبره ان رفع الصوت بالذکر حین ینصرف الناس من المکتوبة کان علی عهد النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم و قال کنت اعلم اذا انصرفوا بتلك اذا سمعته۔ (مسلم شریف ج ۱ رص ۲۱۷)

کہ انہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ لوگوں کا فرض سے فراغت کے وقت ذکر بآواز بلند کرنا نبی علیہ السلام کے زمانہ میں بھی تھا۔ اور فرمایا میں ذکر سے ان کے نماز ختم کر لینے کو جان لیتا جب ذکر کی آواز سن لیتا۔

اور طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

و یستفاد من الحدیث الاخیر جواز رفع الصوت بالذکر و التکبیر عقیب المکتوبة بل من السلف من قال باستحبابه و جزم به ابن حزم من المتاخرین۔

اور اخیر حدیث سے فرض نمازوں کے بعد ذکر اور تکبیر بآواز بلند کہنے کا جائز ہونا ثابت ہوا۔ بلکہ بعض سلف سے اسکا مستحب ہونا مروی ہے اور متاخرین میں سے حضرت علامہ ابن حزم نے اسی پر جزم کیا ہے۔

اس حدیث شریف اور عبارت فقہ سے ثابت ہو گیا کہ فرض نمازوں کے بعد بآواز بلند ذکر کرنا نہ فقط جائز بلکہ سلف کے نزدیک مستحب ہے بلکہ عمل صحابہ کرام کی بنا پر سنت ہے۔ اور کون نہیں جانتا کہ کلمہ طیبہ افضل الذکر ہے۔ لہٰذا کلمہ طیبہ کا بھی فرض نمازوں کے بعد بآواز بلند کہنا اسی حدیث شریف اور عبارت فقہ سے ثابت ہو گیا۔ تو جو اب اس کو منع کرے وہ حدیث کا منکر حکم فقہ کا مخالف۔ سنت صحابہ کا دشمن ہے۔ مولیٰ تعالیٰ ایسے شخص کو ہدایت دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۳۰ ر جمادی الاول ۱۳۷۳ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۵۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان شرع عظام دامت برکاتہم مسئلہ ذیل کی بابت

نماز میں سیدھے پاؤں کا انگوٹھا اپنی جگہ قائم رہے، رکوع سجدہ وغیرہ میں بالکل نہ ہٹے۔ کیا یہ شرعا حکم ہے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ سمجھ لیا جائے کہ سیدھے پاؤں کے انگوٹھے میں کیل ٹھونک دی گئی ہے اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتا۔ کیا یہ صحیح ہے؟۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

نماز میں ہر دو پاؤں کے انگوٹھوں اور انگلیوں کو زمین پر نوک سے لے کر جڑ تک لگا رہنا ضروری ہے۔ قعدہ میں بایاں پاؤں جسے بچھالیا جاتا ہے تو یہ حالت تو مستثنی ہے لیکن صرف سیدھے پاؤں کے انگوٹھے کے زمین پر قائم رہنے کی خصوصیت یہ عوام میں مشہور ہے۔ جس کی کوئی سند نظر سے نہیں گزری۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔ **کتبہ** : الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

﴿۱۹﴾

باب القرأت

مسئلہ (۲۵۱)
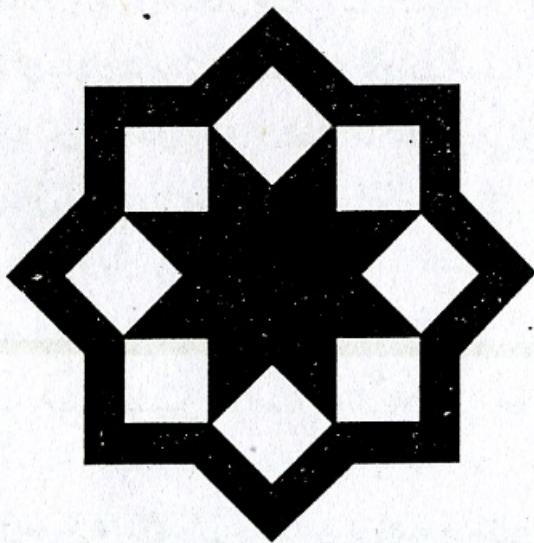
کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ

جس طرح الحمد پڑھنے والے لوگ امام کے پیچھے اپنے دلائل صریح صاف صاف حضور ﷺ کی احادیث کے الفاظ سناتے ہیں اور معتبر معتبر احادیث کی کتابوں کے حوالے مستند علماء کے یہاں سے دیتے ہیں جن سے یقین کامل ہوجاتا ہے کہ الحمد پڑھنا مقتدی کو ضرور چاہئے،۔ مثلاً یہ حدیث پیش کرتے ہیں:

قال رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم: لا صلوة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب خلف الامام ۔ رواه البيهقي فى كتاب القرأت صفحه ٤٧ وقال هذا اسناد صحيح ۔

ترجمہ: یعنی فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے: کہ نہیں نماز ہوئی اس شخص کی جس نے امام کے پیچھے سورہ الحمد نہیں پڑھی۔ روایت کیا اس حدیث کو امام بیہقی نے کتاب القرأۃ میں اور کہا اسناد اس کی صحیح ہے۔ لہذا مذہب حنفیہ میں جو مقتدی کو الحمد پڑھنے کی ممانعت ہے یہ کس قاعدہ اور دلیل کی رو سے ہے؟ امید کہ جواب کافی وافی ہونا چاہئے ورنہ لوگوں کے کہنے سے اور بتانے سے چند آدمی اس طرف متوجہ ہوئے جاتے ہیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب

الحمد لله رب العلمين ۔ والصلاة والسلام على افضل المرسلين وعلى اله واصحابه اجمعين

ہندوستان میں امام کے پیچھے بھی الحمد پڑھنے والے بالعموم غیر مقلد ہیں، انھیں احادیث شریفہ سے استدلال کرنے کی کیا لیاقت۔ ائمہ دین جن کے سینے علوم کے بحر مواج تھے انہوں نے کیسی کیسی عرق ریزیاں کیں اور محنتیں اٹھائیں تب اس مرتبہ کو پہنچے کہ آیات کریمہ اور احادیث سے استنباط احکام کرسکیں۔ ان بے خردان زمانہ کو تو ہنوز غالب اور داغ کے اردو کلام سمجھنے کا سلیقہ نہیں، وہ معدن علوم تک کیونکر رسائی

کر سکتے ہیں۔ قرأت خلف الامام ہی کا مسئلہ لیجئے اس میں جس قدر احادیث وارد ہیں اور جو حکم قرآنی ہے سب پر نظر رکھ کر فیصلہ کرنا آج تک نہ کسی غیر مقلد کو میسر آسکا، نہ آسکے الی یوم القیامۃ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ مجبوراً وہی کرتے ہیں کہ جو حدیث ان کے سامنے پیش کر دی جائے تو اس کے ماننے ہی میں طرح طرح کے حیلہ حوالے نکالیں خواہ وہ مسلم و بخاری کی حدیث کیوں نہ ہو۔ اور اپنے آپ بیہقی کی روایت لے آئیں اور اس کو معتبر جانیں۔ مجھے یہاں بیہقی پر جرح مدنظر نہیں ہے بلکہ ان کی خود مطلبی ونفسانیت کا ایک نمونہ پیش کرنا ہے کہ جو شخص اپنے مطلب کے موافق سمجھ کر کسی حدیث کو بیہقی سے اخذ کرتا ہے اور بیہقی کی کتاب کو حدیث کی معتبر کتاب مانتا ہے اس کے مخالف مدعیٰ کوئی حدیث کسی دوسری کتاب کی پیش کر دی جائے تو اس میں کلام کرنے لگتا ہے، کس قدر نفسانیت ہے۔ العیاذ باللہ من شرور انفسنا۔

بیہقی کی یہی روایت جس سے استفتاء میں استناد کیا ہے غیر مقلدین جو روایت میں مفہوم مخالف کے قائل ہیں، کیا سمجھ کر پیش کر سکتے ہیں۔ فصحاء کے کلام میں زیادت افادت سے خالی نہیں ہوتی۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے تمام عالم کے فصحاء کو کیا نسبت۔ اب بتائے کہ جس حدیث کو یہ اپنے مدعیٰ کے لئے دلیل صریح صاف بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ اس میں کیا اتنے ہی الفاظ اس مطلب کے لئے کافی نہ تھے کہ ”لا صلوۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب“ کیا اس سے مستدل کے نزدیک فرضیت قرأت فاتحہ مستفاد نہیں ہوتی تھی۔ اگر نہیں ہوتی تھی تو کیا لفظ خلف الامام افادہ فرضیت کرتا ہے؟ یہ شاید کوئی مسلوب الحواس کہے تو کہے کوئی عقل وہوش رکھنے والا نہ کہہ سکے گا۔ اگر کہیں کہ ”لا صلوۃ لمن لم تقر بفاتحۃ الکتاب“ سے فرضیت قرأت فاتحہ ہوتی تھی تو پھر خلف الامام کس فائدہ کے لئے آیا۔ آیا یہ مطلب ہے کہ امام کے پیچھے پڑھنے والے کی نماز تو بغیر فاتحہ پڑھے نہ ہوگی مگر خود امام کی اور منفردوں کی نمازیں بغیر فاتحہ کے ہی ہو جاتی ہیں۔ حدیث نقل کر دینا تو آسان تھا مگر ذرا اسے سمجھ کر بھی دکھایئے۔ یا یہ بات ہے کہ حدیث سمجھے یا نہ سمجھے مسائل دین میں دخل دینا اور ائمہ کی مخالفت کرنا روا ہو گیا۔ پھر یہ بتائیں کہ ”لا صلوۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب“ کا مطلب کیا ہے۔ آیا یہ کہ جس نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھی صرف وہ ہی نماز ناجائز ہے، جب تو یہ بتائیں کہ ”لا“ کیسا ہے، اور کس چیز کی نفی کرتا ہے۔ اور دلیل خصوص کیا ہے؟ یا مطلب یہ ہے کہ جس نے کبھی امام کے پیچھے فاتحہ ترک کی اس کی عمر بھر کی کوئی نماز ہی صحیح نہ رہی، سب باطل ہو گئیں، عمل ہی حبط ہوئے۔ اگر ایسا کہیں تو کیا ان سے پہلے دنیا میں اور کوئی اس کا قائل ہوا ہے اور جن صحابہ نے امام کے پیچھے قرأت نہ کی ان کی عمر بھر کی نمازیں کیا ہوئیں؟ اور کیا

پچھلی نمازیں جو تمام شرائط وآداب کے ساتھ ادا کی گئی تھیں، ان کی صحت موقوف تھی ؟یا ترک فاتحہ خلف الامام کفر موجب حبط عمل ہے؟ ہر بات دلیل معتبر سے کہیں۔ یہ اور بتاتے چلئے کہ "لا صلوۃ" میں نفی حقیقت کی ہے یا صفت کی یا فضیلت کی۔

برتقدیر اول ثبوت فرضیت خبر واحد محتمل المراد سے لازم "فالـلازم باطل فالملزوم مثله" اور یہی مذہب ہے غیر مقلدین کا جیسا کہ الفاظ مندرجہ استفتاء سے ظاہر ہے۔ اور الحمد پڑھنا مقتدی کو ضرور چاہئے بلا پڑھے نماز نہیں ہوتی۔

برتقدیر ثانی فرضیت خلف الامام کس کے گھر سے آئیگی؟ پھر یہ بھی بتائیں کہ فرضیت قرأت خلف الامام میں یہ حدیث مطلق ہے یا مقید، عام ہے یا خاص، اگر خاص یا مقید ہے تو دلیل تقید وتخصیص کیا ہے؟ نیز یہ کہ اس حدیث کی صحت محض بیہقی کی تصحیح سے بطور تقلید شخصی کافی ہے یا اس کی تحقیق کا اور کوئی ذریعہ ہے؟ ہے تو کیا؟

دریافت کرنے کی باتیں تو اور بھی بہت تھیں مگر ائمہ کی تقلید سے بھاگنے والوں کی قلعی انھیں دو چار باتوں میں کھل جائے گی اور پتہ چل جائے گا۔ کہ کلام رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سمجھنے کے لئے ائمہ دین کی تقلید ضروری ہے۔ ورنہ وہ حدیث جس کو غیر مقلد صاف صریح کہتا ہے عمر بھر کی عرق ریزی میں بھی نہ سمجھا سکے گا جب تک کہ ائمہ دین کی تقلید نہ کرے، یا مقلدین سے دریوزہ گری نہ کرے۔ ان سب سے گذر کر میں یہ کہتا ہوں کہ جب قرآن پاک میں رب العزہ عزوجل تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

آیت۔ فاذا قری القرآن فاستمعوا له وانصتوا۔

یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور ساکت رہو۔ خاص مسئلہ قرأت خلف الامام میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اور نہ بھی ہوتی تو اس کا عموم حجت ہے۔ یا کسی صاف صریح آیت کو آپ حدیث سے منسوخ کرنا چاہتے ہیں؟ کیا تمہارے نزدیک آیت حدیث سے منسوخ ہوسکتی ہے اور حدیث بھی خبر واحد، وہ بھی ایسی جس کا مطلب غیر مقلدین کو سمجھنا دشوار۔ اب سنئے اس آیت سے قرأۃ کے وقت سکوت کا وجوب صاف ثابت ہے۔ پہلے تو میں آپ کو اسی بیہقی سے سنواؤں کہ یہ آیت کس معاملہ میں نازل ہوئی ہے۔

امام بیہقی امام احمد سے نقل کرتے ہیں "قال اجمع الناس علی ان هذه الآية فی الصلوة" یعنی امام احمد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ آیت نماز کے باب

میں ہے۔

پھر انھیں بیہقی کی روایت سنئے:

حدیث۔عن مجاهد قال: کا ن علیه الصلاة والسلام یقرأفی الصلوة فسمع قرأة فتی فنزل واذا قری القرآن فاستمعواله وانصتوا ۔ (جلد۲صفحہ۱۵۵)

مجاہد سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز میں قرأت فرماتے تھے تو ایک جوان انصاری کا پڑھنا سنا تو نازل ہوئی یہ آیت۔

واذا قری القرآن فاستمعوا له وانصتوا۔

ملاحظہ ہو کہ قرآن پاک کی آیت قرأت خلف الامام کے روکنے کے لئے نازل ہو رہی ہے۔

ابن مردویہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں "عن معاوية بن قرۃ قال: سألت بعض اشیاخنا من اصحاب رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم قال المسروق: احسبه قال عبدالله بن مغفل قلت له کل من سمع القرآن وجب علیه الاستماع والانصات قال: انما نزلت هذه الآیه واذا قری القرآن فاستمعوا له وانصتوا فی القرآن خلف الامام"

یعنی معاویہ ابن قرہ نے کہا: میں نے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں سے اپنے بعض بزرگوں سے دریافت کیا راوی کہتا ہے: مجھے خیال ہے کہ معاویہ نے عبداللہ ابن مغفل کا نام لیا۔ان سے دریافت کیا کہ ہر کوئی جو قرآن سنے اس پر سننا اور خاموش رہنا واجب ہے۔فرمایا: یہ آیت نازل ہی ہوئی ہے قرأت خلف الامام میں۔

امام ابوالبرکات عبداللہ بن محمود نسفی اپنی تفسیر مدارک التنزیل میں فرماتے ہیں:

" جمهور الصحابة رضی الله عنهم علی انه فی استماع الموتم "یعنی جمہور صحابہ اس پر ہیں کہ یہ آیت مقتدی کے قرأت سننے اور خاموش رہنے کے لئے نازل ہوئی۔

ابن مردویہ اور بیہقی نے روایت کیا "عن ابن عباس صلی النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم فقرأ خلفه قوم فخلطو اعلیه فنزلت هذه الآیه"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی، قوم نے آپ کے پیچھے قرأت کی۔اس سے آپ پر قرأت میں خلط واقع ہوا، تو یہ آیت نازل ہوئی۔

عبداللہ بن حمید اور ابوراسخ اور بیہقی ابوالعالیہ سے روایت کرتے ہیں " ان النبی صلی الله

تعالیٰ علیه وسلم کان اذا صلی باصحابه فقرأ من اصحابه فنزلت " یعنی حضور نے جب اپنے اصحاب کونماز پڑھائی اور قرأت کی تو آپ کے اصحاب نے بھی قرأت کی۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

الحمد للہ عاقل منصف کے لئے مسئلہ تو فیصل ہو گیا کہ جب قرأت خلف الامام کی ممانعت میں ایت نازل ہوئی اور آیت نے مقتدی پر خاموش رہنا واجب کیا اور اس پر جمہور صحابہ نے اجماع فرمایا تو اب مقتدی کے لئے قرأت ثابت کرنے کی ہر کوشش بے کار ہے۔کہ حدیث خبر واحد حکم قرآنی کو ہرگز نہ منسوخ کر سکے گی۔مقتدی کا امام کے پیچھے خاموش رہنا آیت سے ثابت ہو گیا تو اس سے بڑھ کر اور کونسی دلیل ہوگی جس سے غیر مقلدوں کی تسکین ہو سکے۔ضرورت تو نہیں ہے کہ مسئلہ میں تطویل کی جائے مگر چند تائیدات صاف صریح احادیث سے پیش کرتا ہوں۔اللہ تعالیٰ ہدایت فرمائے۔

موطا امام محمد رحمۃ اللہ علیہ میں ہے " اخبرنا مالك وحدثنا وهب بن كيسان انه سمع جابر بن عبداله يقول :من صلی رکعة لم يقرأ فيها بام القرآن لم يصل الاوراء الام

(صفحہ ۷۵)

وہب بن کیسان حدیث بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے جابر بن عبداللہ سے سنا فرماتے تھے: کہ جس شخص نے ایک رکعت پڑھی اس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی تو اس نے نماز ہی نہ پڑھی مگر امام کے پیچھے۔

مشکوۃ شریف میں بروایت مسلم لائے ہیں:

عن ابی هريره وقتادة قالا: قال رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم : واذا قرأ فانصتوا " یعنی ابو ہریرہ وقتادہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حضرت شیخ محقق اس کی شرح میں فرماتے ہیں " هذا دليل على مذهب ابی حنيفة في منع قرأة الفاتحة عليه سواء كانت الصلوة جهرية او سرية " یعنی یہ حدیث دلیل ہے مذہب ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت سے منع کرنے اور اس پر فاتحہ کی قرأت کے واجب نہ ہونے میں۔

ابوداؤد،نسائی،ابن ماجہ،احمد،بزار،ابن عدی وغیرہ محدثین روایت کرتے ہیں " عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم انما جعل الامام ليوتم به فاذا اكبر فكبر وافاذا قرأفانصتوا " (نسائی جلد اول صفحہ ۱۴۶)

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے تو وہ جب تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو اور جب قرأت کرے تم خاموش رہو۔

مرقات المفاتیح میں اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں " یعنی الائتمام فی القرأة " یعنی اقتدا اور امام کی پیروی قرأت میں خاموش رہنے سے ہوسکتی ہے، نہ کہ پڑھنے میں۔

مؤطا امام محمد رحمۃ اللہ علیہ میں ہے:

عن جابر بن عبدالله قال قال رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم من صلىٰ خلف امام فان قراء الامام له قرأة۔

جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ فرمایا حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے: جس شخص نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو بیشک امام کا قرأت کرنا اس کا قرأت کرنا ہے۔

وفيه ايضا عن وائل قال: سئل عبدالله ابن مسعود عن القرأة خلف الامام قال: انصت فان فى الصلوة شغلا سيكفيك ذالك الامام۔

ابووائل سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود سے قرأۃ خلف الامام کا مسئلہ پوچھا گیا فرمایا: خاموش رہو (یعنی امام کے پیچھے قرأۃ نہ کر) بیشک نماز میں ایک شغل ہے امام کا قرأۃ کرنا تیرے لئے کافی وافی ہے۔

ایضاً: حديث: ان عبدالله ابن مسعود كان لا يقرأ خلف الامام فى ما يجهر فيه وفيما يخافت فيه فى الاولين ولا فى الاخرين۔

یعنی عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے جہری نماز میں نہ سری نماز میں، نہ پہلی دو رکعتوں میں نہ پچھلی دو رکعتوں میں۔

طحاوی نے بروایت علقمہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا:

قال ليت الذى يقرأ خلف الامام ملئى فوه ترابا ۔یعنی جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرے کاش کے اس کا منہ خاک سے بھر دیا جاتا۔

حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال ليت فى فم الذى يقرأ خلف الامام حجر۔ یعنی کاش کے امام کے پیچھے پڑھنے والے

زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

انه قال من قرأ خلف الامام فلا صلوة له۔

اس قدر احادیث و آثار اور قرآن پاک کی آیت دیکھنے کے بعد کسی منصف کو ذرا بھی تردد نہیں ہوسکتا اور کیونکر ہوسکتا ہے کہ اس سے صاف اور زیادہ صریح اور انتہائی واضح باوجود اجمال کے اور مسئلہ کا کیا انکشاف ہوگا، شریعت میں جو دلائل اصول تسلیم کر لئے گئے ہیں ان سے بالصراحت ثابت ہوگیا۔ اگر میں اس مطلب میں بسط کروں تو اس کے علاوہ بہت سی احادیث پیش کرسکتا ہوں مگر اس وقت اسی قدر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ معاندین کو ہدایت فرمائے "واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۵۲)

از مراد آباد محلہ گنج

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

حرف "ض" معجمہ مشابہ دال ہے یا "ظ" کے۔ اور جس وقت اس کے مخرج اور جمیع صفات کے ساتھ ادا کیا جائے تو اس کی آواز کسی حرف کے مشابہ ہوگی یا نہیں؟ اگر کسی سے مشابہ ہو تو کس حرف کے مشابہ ہوگی؟ اور جو شخص اس کو صحیح صحیح ادا کرسکتا ہے تو اس کو عوام جہال کے کہنے سے غلط کسی حرف سے بدل کر پڑھنا درست ہے یا نہیں؟۔ دریں صورت عمداً غلط پڑھنے والا خاطی فی الدین اور محرف فی القرآن کہلائے گا یا نہیں؟ نیز ایسے شخص کی اقتدا کرنا درست ہے یا نہیں؟ سوال کی ہر صورت کو مفصل کتب فقہیہ و تجوید کے تحت فرمایا جاوے۔ بینوا وتوجروا۔

الجواب

نحمده ونستعينه ونتوكل عليه ونصلي ونسلم على حبيبه وافضل رسوله سيد الانبياء وعلى اله واصحابه اجمعين ۔

اس زمانہ میں ایک شرذمہ قلیلہ اور فرقہ متفرقہ ہے کہ فساد کی راہیں چلتا اور مسلمانوں میں تفرقہ اندازی کی بنیادیں ڈالتا رہتا ہے۔ دن رات ایسے ہی تراش خراش اس کا پیشہ و شیوہ ہے۔ یہ فرقہ وہابیہ کے

نام سے پکارا جاتا ہے اور اس کوئی بات نکالنے میں مزہ آتا ہے۔ یہ فرقہ ''ض'' کو ''ظ'' پڑھتا اور اسی پر اصرار کرتا ہے۔ باوجودیکہ ایسے شخص کی امامت ناجائز اور قصداً ''ض'' کو ''ظ'' پڑھنا کفر ہے۔ محیط برہانی میں ہے ''سئل الامام الفضلی عمن یقرأ الظاء المعجمة مکان الضاد المعجمة او علی العکس فقال لا تجوز امامته ولو تعمد یکفر''۔ (شرح فقہ اکبر مصری ص ۱۵۳)

یعنی امام فضلی رحمۃ اللہ علیہ سے اس شخص کا حکم دریافت کیا گیا جو ''ض'' کی جگہ ''ظ'' یا ''ظ'' کی جگہ ''ض'' پڑھتا ہے۔ فرمایا: اس کی امامت جائز نہیں۔ اور اگر قصداً کیا تو کافر ہو جائے گا۔

منح الروض الازہر میں ہے ''کون تعمده کفرا لا کلام فیه'' اس کے اس قصد کا کفر ہونا محل کلام نہیں۔

عالمگیری میں ''ض'' کے عمداً ''ز'' پڑھنے کو کفر لکھا ہے ''سئل عمن یقرأ الزاء مقام الضاد وقرأ اصحاب الجنة مقام اصحاب النار قال لا تجوز امامته ولو تعمد یکفر''

(فتاوی عالمگیری۔ ج ۲ ص ۲۸۵)

یعنی اس شخص کا حکم پوچھا گیا جو ''ض'' کی جگہ ''ز'' پڑھے اور ''اصحاب الجنة'' کی جگہ ''اصحاب النار'' فرمایا اس کی امامت جائز نہیں اور قصداً کیا تو کافر ہو جائے گا۔

لہٰذا وہ فرقہ جو ''ض'' کو قصداً ''ظ'' پڑھتا ہے ان عبارات میں اپنا حکم تلاش کر لے اور خدا سے ڈرے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ''ض'' کا مخرج ''احد الحافتین'' کا اتصال ایک جانب کے اضراس سے ہے۔ اور ''ظا'' کا ثنایا علیا۔

چنانچہ جزریہ میں ہے

والضاد من حافته اذ ولیا الاضراس من الیسر او یمنا ھا

(منح فکریہ شرح جزریہ ص ۱۲)

وفیه ایضا والظاء والذال ولیا للعلیا'' (منح فکریہ شرح جزریہ مصری صفحہ ۱۴)

تو معلوم ہوا کہ ''ظا'' کا مخرج جدا ہے اور ''ض'' کا جدا۔ پھر ''ض'' مستطیلہ ہے اور ''ظ'' مستطیلہ نہیں۔ باوجود اس کے فرق نہ کرنا جہل ہے۔

جزریہ میں ہے

والضاد باستطالة ومخرج ☆ میز من الظاء وکلھا تجی''

(شرح جزری ہندی مطبع مجیدی صفحہ ۳۹)

اس شعر کی شرح یوں کرتے ہیں۔ اور ضاد معجمہ کو ساتھ صفت استطالت کے مخرج یعنی ضاد واستطالت کی صفت میں اور مخرج میں اکیلا ہے۔ اس صفت اور اس مخرج کا کوئی حرف نہیں تو اس ضاد کو ہمیشہ تمیز یعنی فرق کر اور جدا کر ظاء معجمہ سے تا کہ مشابہ ظا کے نہ ہو جائے۔

بالجملہ اشتباہ صوت کی بحث اس کو مفید نہیں کہ اس کا ایک حیلہ ہے جس سے عوام جہال کو دھوکہ دینا چاہتا ہے۔ سامعہ کا ادراک اور چیز اور حرف کا کسی انداز پر ادا ہونا اور بات۔ حائے حطی ہائے ہوز سے مشتبہ الصوت ہے مگر عوام کا سامعہ اس میں فرق ظاہر پاتا ہے تو اشتباہ صوت کا حیلہ کر کے الحمد للہ کی جگہ الھمد اللہ پڑھنا تحریف قرآن ہے۔ ایسے ہی غیر المغضوب کو غیر المغظوب پڑھنا اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب فرمائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل.
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۵۳_۲۵۴_۲۵۵_۲۵۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں کہ

(۱) سورہ ہود میں ''مجریھا'' امالہ کے ساتھ پڑھنا یعنی یائے مجہول پڑھنا صحیح اور موافق سنت ہے اور اس کلمہ کو بیائے معروف پڑھنا صحیح اور سنت ہے یا نہیں؟ حنفیہ کی قرأت کے موافق جواب طلب ہے۔

(۲) تجوید کا سیکھنا واجب ہے یا نہیں؟۔

(۳) کلمہ مذکورہ ''مجریھا'' کو امالہ کیساتھ پڑھنے والے پر اعتراض کرنا اور اس کلمہ کی ہنسی اڑانا شریعت مقدسہ میں کیسا ہے؟۔

(۴) یائے مجہول عربی میں کسی موقع پر آتی ہے یا نہیں؟۔ فقط السائل عبد الغفار

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

(۱) واقعی کلمہ ''مجریھا'' کو امالہ کے ساتھ پڑھنا ہماری قرأت ہے۔

(۲) تجوید کا سیکھنا ضروری اور لازمی ہے۔ چنانچہ علامہ محمد جزری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

والاخذ بالتجوید حتم لازم من لم یجود القرآن آثم

یعنی تجوید کا سیکھنا ایسی حتمی ولازمی چیز ہے کہ جس نے تجوید نہیں سیکھی وہ گنہگار رہے۔

(۳) کلمہ مذکورہ کو امالہ کے ساتھ پڑھنے والے کی ہنسی اڑانا قرآن کریم کے ساتھ ایک نوع کی گستاخی ہے۔

(۴) یائے مجہول کی اصطلاح عجمی ہے اور اہل عرب کے محاورہ میں یائے مجہول بحیثیت اس اصطلاح کے مستعمل نہیں۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۵۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ

کیا حکم ہے شریعت مطہرہ کا اس مسئلہ میں کہ بجائے تسبیح رکوع مشہور "سبحان ربی العظیم" کے "سبحان ربی الکریم" پڑھا جائے۔ کہ عوام الناس مخرج "ظا" کا صحیح تلفظ نہیں کر سکتے اور بجائے "ظاء" کے "زا" ادا ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "زا" کی ادائیگی سے معنی "عزیم" کے دشمن کے بن جاتے ہیں اور اس کے ثبوت کے لئے شامی پیش کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایسی صورت میں "ربی الکریم" پڑھنا اولی ہے؟ یا "ربی العظیم"۔ دوسری بات یہ کہ وہ اشخاص قرآن مجید کی تلاوت میں جہاں لفظ "عظیم" آتا ہے کیا کریں۔ آیا وہاں بھی "کریم" ہی پڑھ لیا کریں۔ یا "عظیم" ہی پڑھیں۔ بیان فرما کر عند اللہ ثواب کے حق دار ہوں۔

المستفتی ذکاوت حسین محلہ دیپا سرائے سنبھل

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

سنت یہی ہے کہ رکوع میں "سبحان ربی العظیم" کہا جائے اور "عظیم" میں "ظا" کو مخرج سے ادا کیا جائے۔ لیکن چونکہ عوام الناس "ظا" کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر ہیں اور وہ اپنی اسی لاعلمی میں بجائے "ظا" کے "زائے معجمہ" ادا کرتے ہیں۔ تو وہ کلمہ بجائے "عظیم" کے "عزیم" ہو جاتا ہے اور یہ حضرت حق سبحانہ تعالی کی شان میں سخت گستاخی کا کلمہ بن جاتا ہے اگرچہ بلاقصد ہی سہی۔ لہذا ایسے عوام

کے لئے ''ظا'' کا صحیح طور مخرج سے ادا کرنا ضروری ہے ورنہ ان کے لئے رکوع میں بجائے 'سبحان ربی العظیم'' کے ''سبحان ربی الکریم''کہنا یقیناً اولیٰ ہے۔

چنانچہ شامی جلد اول میں ہے:

السنة فی تسبیح الرکوع سبحان ربی العظیم الا ان کان لایحسن الظاء فیبدل به الکریم لئلایجری علی لسانه العزیم فتفسد به الصلوة کذا فی شرح دررالبحار فلیحفظ فان العامة عنه غافلون حیث یاتون بدل الظاء بزاء المعجمة۔

یعنی رکوع کی تسبیح میں ''سبحان ربی العظیم'' کہنا سنت ہے مگر جب ''ظا'' اچھی طریقہ سے ادانہ کر سکے تو اس کی جگہ لفظ ''کریم'' بدلے تاکہ اس کی زبان پر ''عزیم'' جاری نہ ہو کہ اسکے ساتھ نماز فاسد ہو جائے گی ایسے ہی شرح دررالبحار میں ہے۔

لہذا اس کو یاد کرو کہ آدمی اس سے غافل ہیں کہ وہ ''ظا'' کی جگہ ''زا'' ادا کرتے ہیں۔لہذا اس عبارت سے موکد طور پر ''عزیم'' یا ''زاء'' پڑھنے کی ممانعت ثابت ہوئی۔اور وجہ ممانعت یہ ہے کہ ''عزیم'' کے معنی قاموس میں ''العزیم العدو الشدید'' کے ہیں۔یعنی سخت دشمن۔اور ''سبحان ربی العظیم'' کے یہ معنی ہیں کہ۔پاک ہے میرا رب جو عظمت والا ہے۔اور ''سبحان ربی العزیم'' کے یہ معنی ہو گئے کہ۔پاک ہے میرا رب جو سخت دشمن ہے۔(العیاذ باللہ منہ)

لہذا اس تغیر معنی کی وجہ سے علمائے کرام نے اس کی ممانعت فرما کر فساد نماز کا حکم دیا۔اسی لئے کبیری نے تغیر معنی کی یوں تصریح کی ہے:

والقاعدة عند المتقدمین ان ماغیر تغیرا یکون اعتقاده کفر یفسد۔

چند سطر بعد فرماتے ہیں:

والمعتبر فی عدم الفسادتغیرالمعنی کثیراً۔

یعنی فساد اور عدم فساد نماز کا حکم معنی کے متغیر ہونے اور نہ ہونے پر ہے۔اب رہا باقی قرآن پاک کے مقامات میں تبدیل کرنا اس کے لئے شریعت سے کوئی سند ثابت نہیں ہوئی۔مگر ایسے مقامات ودیگر تغیر معنی کے کلمات کے لئے علم تجوید سیکھنے کو علماء کرام نے فرض قرار دیا ہے۔لہذا اگر کہیں ایسی ہی تغیر معنی کی قرآن پاک میں غلطی ہو جائے تو وہ اس کی خطا ہے کہ اس نے اس قدر تجوید نہیں سیکھی۔ہاں قرآن پاک کے علاوہ دیگر ادعیہ مین بجائے ''عظیم'' کے اگر ''کریم'' کہے تو اس میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۵۸_۲۵۹_۲۶۰_۲۶۱_۲۶۲_۲۶۳_۲۶۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں کہ

(۱) کہ لحن کس کو کہتے ہیں اور اس کی کتنی قسمیں ہیں۔

(۲) ضاد، ظا، ز، ذال، تا، سین، صاد، دال۔ ان حرفوں کا کیا مخرج ہے۔

(۳) لفظ ''ضاد'' مثل ''ظاء'' کے پڑھا جائے گا۔ یا۔ ''دال'' کے مثل۔

(۴) اگر کوئی شخص اندر نماز کے ''سبحان ربی العظیم '' کی ''ظاء'' کی جگہ ''زا'' پڑھتے ہیں۔ یا ''سبحان ربی الاعلیٰ'' کے جگہ ''سبحان ربی الالیٰ'' پڑھے۔ یا سورہ فاتحہ میں ''وایاك '' کی جگہ ''ویاك'' پڑھے۔ یا اسی سورہ میں ''المغضوب '' کی ''ضاد'' کی جگہ ''ظاء'' یا ''دال'' مفخم پڑھے۔ یا۔ ''الضالین '' کے ''ضاد'' کی جگہ ''ظاء'' یا ''دال'' مفخم پڑھے۔ یا ''والصیف '' کی جگہ ''سین'' پڑھے یا ''فائزون'' کی جگہ ''ذال'' پڑھے۔ یا ''نصراللہ'' کے ''صاد'' کی جگہ ''سین'' پڑھے۔ یا ''حطب'' کی جگہ ''ت'' پڑھے۔ یا ''یکذب'' کی ''ذال'' کی جگہ ''زا'' پڑھے۔ تو ایسے شخص کے پیچھے کسی صورت میں بھی نماز ہو جاتی ہے یا کہ نہیں؟ یا ایسی صورت میں اس اکیلے شخص کی بھی نماز ہو جاتی ہے یا کہ نہیں؟۔

(۵) ''لاالی اللہ تحشرون'' سورہ آل عمران میں۔ ''ولا اوضعوا'' سورہ توبہ میں۔ اور ''لا اذبحنہ'' سورہ نحل میں۔ ''لالی الجحیم'' سورہ والصٰفٰت میں۔ ''لا انتم'' سورہ حشر میں۔ اگر کوئی شخص اندر نماز کے ''لا'' کو ساتھ الف کے ملائے تو نماز ہو جائے گی یا نہیں؟۔

(۶) اگر کوئی شخص درمیان سورہ سے پڑھنا شروع کرے اور ''اعوذ'' کو اللہ کے کسی صفتی نام سے وصل کر دے تو اس حالت میں پڑھنے والا گنہگار ہوگا یا نہیں؟۔

(۷) مجود کی نماز غیر مجود کے پیچھے ہو جاتی ہے یا کہ نہیں؟۔ فقط

السائل عبدالحق

نوٹ۔ تمام سوالات کے جوابات کتب تجوید وکتب فقہ معہ حوالہ کتاب معہ عبارت کے حنفیہ کی قرأت کے موافق مطلوب ہیں۔

الجواب

الحمد لله الذی نزل علینا القرآن فهو یهدی الی سبیل الرشاد ـ فافضل العبادة قرائته ترتیلا بغیر تغیر المراد ـ ومیز الحروف بمخارجها وصفاتها واصواتها مع السداد فادعاء وحدة الصوت باطل فی الظاء والضاد ـ ومن تعمد بالتبدیل حرفا من حروفه فله بئس المهاد والصلوة والسلام علی فردا لافراد مصلح البلاد دافع الفساد واهب المراد سیدنا ومولنا محمد افضل العباد وعلی آله واصحابه الاوتاد وعلی من تبعهم الی یوم التناد ـ

امابعد

اس زمانہ پرآشوب میں احکام مذہبی سے مسلمانوں کی بے توجہی نہایت ہی قابل افسوس ہے۔ عوام تو عوام بلکہ اہل علم کی بھی یہ حالت زار ہے کہ ان کو تجوید کا سیکھنا، حروف کا مخارج سے ادا کرنا، صفات کا اس وقت لحاظ رکھنا، مشتبہ الاصوات میں بین تمیز کردینا، ایسا غیر ضروری کام ہوگیا ہے جس کی طرف بعد تنبیہ بھی ان کی توجہ منعطف نہیں ہوتی ـ معلوم ہوتا ہے کہ شاید ان کے نزدیک تبدیل حرف سے معنی میں فساد ہی نہیں آتا ـ تعجب ہے کہ باوجود اس زبوں حالت کے امام بننے کا بھی شوق ـ اپنی نماز تو فاسد ہوتی ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مقتدیوں کے حال پر بھی یہ کرم کریم ہے کہ ان کی نماز بھی برباد کی جاتی ہے ـ اب ان سے زیادہ قابل افسوس وہ لوگ ہیں جو چند قواعد تجوید دیکھ کر قاری بن گئے ہیں اور دیدہ ودانستہ "ضاد" کو "ظا" پڑھتے ہیں اور مشتبہ الصوت کی آڑ لے کر قرآن عظیم میں تحریف کرتے ہیں ـ لہذا ان چند سطور میں ان سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں ، اگرچہ مسائل زلۃ القاری کے مختلف فیہ ہیں ، متقدمین اور متاخرین دونوں میں بہت اختلافات ہیں اور باوجود ان اختلافات کے مجھ جیسے کم علم کا قلم اٹھانا نہایت دشوار ہے لیکن محض توکلا علی اللہ تعالیٰ ثم علی رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ چند جملے لکھتا ہوں، اگرچہ مسائل فقہیہ کے سمجھنے کے لئے لیاقت علمی درکار ہے مگر حتی الامکان عام فہم کرنے کی کوشش بلیغ کرونگا ـ

اقول وباللہ التوفیق ـ جوابات سے قبل ان چند مقدمات کا سمجھنا بہت ضروری ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ یہ مقدمات نہ فقط ان مسائل بلکہ بہت سے مسائل زلۃ القاری کو کافی ہوں گے ـ

مقدمہ اول: ان جوابات میں جو احکام بیان کئے جائیں گے وہ تمام متقدمین کے قواعد پر مبنی ہوں گے ـ اقوال متاخرین میں اول تو اختلافات بہت زیادہ ہیں معہذا وہ باعتبار قواعد کے غیر منضبط ہیں،

علاوہ بریں اقوال متقدمین میں احتیاط زیادہ ہے۔

چنانچہ ابراہیم حلبی غنیہ میں قواعد متقدمین کو کہہ کر فرماتے ہیں:

ھذا ملخص قاعدة المتقدمين وهو الذی صححه المحققون من اهل الفتاوی كقاضی خان وغيره وفرعوا عليه الفروع فافهم ترشد۔

پھر یہی علامہ اسی میں دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

فالاولیٰ الاخذ فيه بقول المتقدمين لانضباط قواعدهم و كون قولهم احوط واكثر الفروع المذكورة فی كتب الفتاوی منزلة عليه۔

مقدمہ دوم: قرات کی تمام غلطیوں کے احکام کی بنا بلکہ سارے مسائل زلۃ القاری کی جان اور اصل الاصول معنی کا تغیر ہے کہ اسی تغیر معنی کیوجہ سے نماز کے فساد کا حکم دیا جاتا ہے۔

چنانچہ غنیہ میں ہے: والقاعدة عند المتقدمين ان ماغير تغييرا يكون اعتقاده كفرا يفسد ۔ چند سطر بعد فرماتے ہیں: فالمعتبر فی عدم الفساد عند عدم تغير المعنی كثيرا۔

اسی طرح عامہ کتب فقہ میں ہے۔ اے عزیز قرآن کریم اللہ تبارک وتعالیٰ نے جیسا نازل فرمایا ہے ویسا ہی ہم کو ادا کرنا چاہئے اور اگر اس کے حرف بدل گئے تو کہیں بے معنی مہمل الفاظ بن جائیں گے، کہیں معنی زیادہ متغیر ہو جائیں گے، کہیں معنی ایسے بگڑ جائیں گے جس کا اعتقاد کفر ہو۔ لہذا اس تغیر کے بعد وہ خدا کا کلام کس طرح باقی رہ سکتا ہے بلکہ حرف کی آواز بدلنے کی وجہ سے بھی بعض جگہ بجائے حمد کے حضرت حق سبحانہ کی شان میں گستاخی کا کلمہ بن جائے گا۔ العیاذ باللہ تعالیٰ

اب باقی رہا یہ عذر کہ ہمارا قصد تو تعریف وحمد ہی کا ہے۔ لہذا یہ نہایت خام خیال ہے، اگر کوئی شخص کسی کی تعریف کا قصد کرے لیکن الفاظ ایسے کہے جن میں اس کی کھلی ہوئی برائی اور مذمت ہو تو کیا کوئی ایسا عاقل ہے کہ اس کے ان گستاخانہ الفاظ کو چھوڑ کر اس کا قصد دریافت کرتا پھریگا۔ لہذا پھر شان رب تبارک وتعالیٰ میں ایسے گستاخانہ الفاظ اگرچہ بلا قصد ہی سہی کس طرح گوارا کئے جاسکتے ہیں۔ دیکھئے میں قرآن کریم ہی سے اس کا حکم سنادوں۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی یہ عادت تھی کہ وہ سرکار رسالت میں لفظ "راعنا" کہا کرتے تھے یعنی حضور ہماری جانب نظر فرمائیے۔ یا ہماری رعایت کیجئے۔ یہود نے جب اس کلمہ کو سنا انہوں نے اسی کلمہ میں گستاخی کے معنی قصد کر کے سرکار رسالت علی صاحبھا الصلوۃ والسلام میں اس کو بولنا

شروع کیا۔ لہذا یہ آیت نازل ہوئی۔

یاایھاالذین آمنوا لاتقولوا راعنا وقولواانظرنا۔

یعنی اے ایمان والو! تم لفظ'' راعنا ''مت کہا کرو بلکہ اس کے بجائے لفظ'' انظرنا'' کہا کرو۔

اب غور کیجئے کہ صحابہ کرام کا گستاخی کے معنی کا قصد تو کس طرح متصور بلکہ ان کے وہم وگمان میں بھی یہ گستاخی کے معنی آجانے ممکن نہیں تھے مگر باوجود اس بات کے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں ایسے موہم الفاظ بولنے سے ممانعت فرمادی۔ لہذا شان حق جل جلالہ تو بہت ہی ارفع واعلیٰ ہے۔ نیز حدیث قدسی میں ہے:

عن ابی ہریرۃ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم قال تعالیٰ: یوذینی ابن آدم یسب الدھر واناالدھر بیدی الامر اقلب اللیل والنھار متفق علیہ (مشکوۃ شریف)

یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی، حضور شافع یوم النشور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بنی آدم مجھکو ایذا دیتا ہے کہ وہ زمانہ کو گالی دیتا ہے باوجودیکہ زمانے کا پیدا کرنے والا میں ہوں، امر میرے قبضہ قدرت میں ہے میں ہی رات اور دن کو پلٹتا ہوں۔

غنیہ میں ہے: ولو ادخل المد فی الف لفظۃ اللّٰہ کمایدخل فی قولہ تعالیٰ اذن لکم وشبھہ تفسد صلوتہ ان حصل فی اثنائھا عند اکثر المشائخ ولایصیر شارعابہ فی ابتدائھا ویکفر لو تعمد لانہ استفھام ومقتضاہ الشک فی کبریائہ تعالیٰ وقال محمد بن مقاتل ان کان لایمیز بینھما ای بین المد وعدمہ لاتفسد صلاتہ و الاستفھام یحتمل ان یکون للتقریر لکن الاول اصح لان مثل ھذا الجھل لایصلح عذرا۔

منیہ میں ہے: وان قال اللّٰہ اکبار لایصیر شارعا وان قال فی خلال الصلاۃ تفسد صلوتہ لانہ اسم الشیطان۔

خلاصہ ان دونوں عبارتوں کا یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے اللہ اکبر تکبیر میں لفظ اللہ کے الف کو مد کے ساتھ بڑھا کے آللہ اکبار کہا۔ اگر نماز کی درمیانی تکبیروں میں کہا تو اکثر مشائخ کے نزدیک اس کی نماز فاسد ہوجائے گی اور یہی اصح قول ہے۔ اور اگر ابتدائے نماز میں آللہ اکبر کہا تو اس سے نماز کا شروع کرنا صحیح نہیں ہے۔ اور اگر معنی پر مطلع ہونے کے بعد بالقصد کہا تو کافر ہوجائے گا۔ اس لئے کہ آللہ اکبر کے یہ

معنی ہوئے (کیا اللہ بہت بڑا ہے) تو اس سے اللہ عزوجل کی کبریائی میں شک واقع ہوگیا اور اس جیسا جہل عذر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اسی طرح آللہ اکبار کا حکم ہے کہ اول میں کہنے سے نماز کا شروع صحیح نہیں اور درمیان میں کہنے سے نماز فاسد کہ اکبار شیطان کے ناموں سے ایک نام ہے۔

الحاصل اس آیت اور حدیث اور قول فقہ سے نہایت روشن طور پر ثابت ہوگیا کہ گستاخی کے الفاظ میں عدم قصد کا حیلہ اور اپنی نادانی کا اقرار کمزور عذر ہے پھر یہ غلطی بھی ہو تو حالت نماز میں جس میں بندہ کو اپنے مولا تبارک وتعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہو اور سارے حجابات اٹھکر اس کو حضوری کی عزت سے نوازا جائے اور یہ بندہ اس وقت ایسی گستاخی کے کلمات اپنی زبان سے نکالے، اگر یہ ان کا قصد نہ رکھتا ہو اور پھر ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ بیسوں مرتبہ مثلا رکوع میں اس نے پانچ بار تسبیح کہی اور عظیم کی ''ظا '' اس سے ادا نہیں ہوئی اور اسکی بجائے ''عزیم'' زا۔ سے کہا جس کے معنی سخت دشمن کے ہیں تو اس نے چار رکعت میں بیس مرتبہ اللہ تعالیٰ کو اپنا دشمن کہہ کر پکارا۔

خلاصہ یہ ہے کہ کیا ایسی نماز تمہارے کچھ کام آسکتی ہے اور کیا باوجود اتنی تجوید سیکھنے کی قدرت کے تمہاری یہ غلط خوانی کچھ عذر بن سکتی ہے۔ نماز وہ چیز ہے جس کے بارے میں سرکار مدینہ سید الانبیاء محبوب کبریا حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اذا نعس احدکم وهو يصلی فليرقد حتی يذهب عنه النوم فان احدکم اذا صلی وهو ناعس لايدری لعله يذهب يستغفر فيسب نفسه ۔ بخاری وغیرہ

یعنی جب تم میں سے کسی کو غنودگی آئے تو سو رہے یہاں تک کہ نیند چلی جائے کہ غنودگی میں پڑھے گا تو کیا معلوم شاید اپنے لئے دعائے مغفرت کرنے چلے اور بجائے دعا کے بددعا نکلے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غنودگی کی حالت میں نماز سے اس لئے منع کیا گیا کہ شاید وہ بجائے دعا کے بددعا کرنے لگے باوجودیکہ اس کا قصد بددعا کا ہرگز نہ ہوگا۔ اب کہاں ہیں وہ لوگ جو یہ کہدیا کرتے ہیں کہ ہمارا تو اس کا قصد نہیں تھا۔ وہ اپنے عذر کو اس ترازو میں لاکر تولیں اور غور کریں کہ جب غنودگی میں اتنی احتیاط کی تعلیم دیجا رہی ہے اور ہم تو جاگتے ہوئے ہوش میں ایسے قبیح الفاظ کہہ رہے ہیں اور پھر ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ مکرر بار بار کہتے ہی رہتے ہیں۔ لہذا قصد نہ ہونے کا عذر کہاں تک بچا سکے گا۔

الحاصل نماز مسلمانوں کے لئے ایک بڑی دولت ہے اس میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے۔

غنیہ میں مسائل زلۃ القاری کے اختتام پر لکھتے ہیں:

والاحتیاط اولیٰ سیمافی امرالصلوۃ التی ھی اول مایحاسب العبد علیھا۔

یعنی احتیاط ہر حال میں اولیٰ ہے خاص کر حالت نماز میں کہ یہ نماز وہ چیز ہے کہ سب سے پہلے بندہ کا حساب اسی سے شروع ہوگا۔

مقدمہ سوم: قرآن کریم کے حروف کا مخارج سے صحیح طور پر نکالنا، ہر حرف کو دوسرے سے ممتاز کرنا، ہر ایک کی آواز کو دوسرے کی آواز سے بچانا، ہر مسلمان کے لئے فرض عین ہے، بلکہ بعض اقوال کی بنا پر وقفوں اور حرکتوں کا لحاظ بھی ضروری ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ورتل القرآن ترتیلا۔ یعنی قرآن خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔

تفسیر خازن میں ہے:

الترتیل ھو التوقف والترسل والتمھل والافھام وتبیین القرأۃ حرفا اثرہ فی اثر بعض بالمد والاشباع والتحقیق و (ترتیلا) تاکید فی الامر بہ لانہ لابد للقاری منہ۔

تفسیر مدارک میں اسی آیت کے تحت میں فرماتے ہیں:

اقرأ علی قواعدہ بتبیین الحروف وحفظ الوقوف واشباع الحرکات (ترتیلا) ھو تاکید لایجاب الامر بہ وانہ لابد منہ للقاری۔

تفسیر احمدی میں اسی آیت کے تحت میں فرماتے ہیں:

امرھم بترتیل القرآن واوجبہ علیھم وھو علی مانقل عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ رعایۃ الوقوف واداء المخارج۔

خلاصہ مضمون ان تفسیروں کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ترتیل واجب کی اور ترتیل سے مراد قرآن کریم کا ٹھہر ٹھہر کر اور آہستہ دیر کر کے اور سمجھا کر پڑھنا اور ہر ہر حرف کو دوسرے سے ممتاز کرنا، مد اور اشباع حرکات کا ظاہر کرنا، وقفوں کی حفاظت کرنا کہ قاری کو ان سے چارہ کار نہیں۔ اسی طرح تفسیر بیضاوی اور حسینی وغیر میں ہے۔ اس آیت اور تفسیروں سے تجوید کا سیکھنا ضروری اور لازمی ثابت ہوا۔

علامہ جزری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی مختصر نظم جزریہ میں فرماتے ہیں۔

یعنی تجوید سیکھنا واجب ہے اور جو تجوید کے ساتھ قرآن نہ پڑھے وہ گنہگار ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو تجوید کے ساتھ اتارا اور اسی طرح اس سے ہمارے پاس پہنچا۔ اور نیز وہ تجوید تلاوت کا زیور اور قرأت کی زینت ہے۔ اور وہ تجوید حروف کو ان کی صفت لازمہ کے حق دینے کا نام ہے۔ اور ہر

حرف کواس کی اصل کی طرف پھیرنے اور اسکی نظیر میں اس کے مثل تلفظ کرنے کا نام ہے۔قاری بلا تکلف اور بغیر دشواری کے پڑھنے میں کمال درجہ کی پاکیزگی پیدا کرے۔

اعلیٰ حضرت امام اہلسنت مجدد دین وملت فاضل بریلوی قدس سرہ اپنی کتاب ''الجام الصاد'' میں اتقان سے ناقل ہیں:

من المهمات تجويد القرآن وهو اعطاء الحروف حقوقها ورد الحروف الىٰ مخرجه واصله ولاشك ان الامة كماهم متعبدون بفهم معانى القرآن واقامة حدوده هم متعبدون بتصحيح الفاظه واقامة حروفه على الصفة الملتقاة من ائمة القرأة المتصلة بالحضرة النبوية۔

یعنی قرآن کا تجوید سے پڑھنا ضروریات سے ہے اور تجوید حروف کوان کے حقوق دینے اور ہر حرف کواس کے مخرج اور اصل کی طرف پھیرنے کا نام ہے اور بلاشک جس طرح امت کے لئے قرآن کے معنی سمجھنے اور اسکے حدود قائم کرنے داخل عبادت ہیں اسی طرح قرآن کے الفاظ کی تصحیح اور حروف کے صفات کا قائم کرنا بھی ہے، جس طرح ان کوان ائمہ قرأت نے ظاہر کیا جن کی سند سرکار رسالت تک پہنچتی ہے۔

نیز اسی میں فرماتے ہیں:

لہذا ائمہ دین تصریح فرماتے ہیں کہ آدمی سے کوئی حرف غلط ادا ہوتا ہو تو اس کی تصحیح و تعلم میں اس پر انتہائی کوشش واجب۔اگر کوشش میں قصور کرے گا معذور نہ ہوگا، نماز کھوئے گا۔بلکہ جمہور علماء نے اس سعی کی کوئی حد مقدر نہیں کی اور حکم دیا کہ عمر بھر شبانہ روز ہمیشہ جہد کئے جائے، کہیں اس کے ترک میں معذور نہ رکھیں گے۔یہی قول امام ابراہیم بن یوسف، امام حسین بن مطیع کا ہے۔محیط میں اسی کو مختار للفتوی فرمایا۔خانیہ وخلاصہ وفتح القدیر ومراقی الفلاح وفتاوی الحجہ وجامع الرموز ودر مختار وغیرہا میں اس پر جزم فرمایا۔علامہ ابن شحنہ نے اسی کو محرر بتایا۔علامہ ابراہیم حلبی نے غنیہ میں اسی کو معتمد فرمایا اگرچہ امام برہان محمود نے ذخیرہ میں بصورت عجز خلقی اسے مشکل بتایا۔امام ابن امیر الحاج نے اسی پر تعویل کی اور عذر عارض نا قابل زوال بڑھایا۔علامہ طحطاوی نے حاشیہ مراقی الفلاح میں اسی طرف میل کیا اور اسے مقتضائے کلام اکثر ائمہ اعلام قرار دیا۔اور یہی فتاوی امام فقیہ ابو اللیث وخزانۃ الاکمل وغیرہا کا مفاد۔

كمابينا كل ذلك فى فتاونا حققناه انه كأنه هو المراد۔انتهىٰ

اب اتنی تصریحات کے ہوتے ہوئے مزید تفصیل کی ضرورت تو نہیں معلوم ہوتی مگر ممکن ہے کہ بعض شریر طبیعتیں ابھی اس میں کچھ کلام کریں۔ لہذا میں انہیں کے پیشواؤں کے کلام پیش کردوں۔

مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی فتاوی رشیدیہ حصہ دوم کے ص ۶۸ میں کہتے ہیں:

مسئلہ ۹۔ علم تجوید فرض عین ہے یا کفایہ اور کہاں تک مستحب ہے؟۔

الجواب:۔ علم تجوید جس سے کہ تصحیح حروف کی ہوجائے کہ جس سے معانی قرآن شریف کے نہ بگڑیں یہ فرض عین ہے مگر عاجز معذور ہے اور اس سے زیادہ علم قرأۃ وتجوید فرض کفایہ ہے۔

اور مولوی اشرفعلی تھانوی فتاوی امدادیہ جلد اول کے ص ۱۱۱ میں لکھتے ہیں:

اور تجوید کی مقدار واجب صرف تصحیح حروف اور رعایت وقوف ہے اس طرح کہ تغیر مراد نہ ہوجاوے باقی مستحسن۔

اس وقت مجھے ان دونوں فتووں پر تنقیدی نظر کر کے ان کی کمزوریاں دکھانی منظور نہیں ہیں بلکہ صرف اپنے مدعا کا اثبات مقصود ہے لہذا اب کسی منصف ہی کو نہیں بلکہ کسی ہٹ دھرم کو بھی مجال سخن باقی نہیں رہی۔

مقدمہ چہارم: قرآن کریم میں غلطی ہونے کی چار صورتیں ہیں۔ عمد۔ خطا۔ عجز۔ عذر۔

قسم اول: قصدا ایک حرف کو دوسرے حرف سے یا ایک کلمہ کو دوسرے کلمہ سے بدلنا۔ یا حروف میں تقدیم وتاخیر یا زیادتی وکمی کرنا۔ یا کلمات اور جملوں میں تغیر کرنا۔ یا اعراب وغیرہ میں کچھ تغیر کرنا جس سے معنی میں تغیر ہوجائے۔ اس کو عمد کہتے ہیں۔ لہذا قرآن کریم میں عمدا ایسا کرنا حرام ہے اور اس سے یقیناً نماز فاسد ہوجائے گی۔

چنانچہ شامی میں ہے: ان تعمد ذلك تفسد ۔

طحطاوی میں ہے: اما فی العمد فتفسد به مطلقا بالاتفاق۔

اور اگر نعوذ باللہ کوئی ہٹ دھرم ازراہ عناد قرآنی حرف کی جگہ کوئی دوسرا حرف قصدا بدلے اور پھر اس پر اس قدر اڑے کہ اپنے اس بدلے ہوئے حرف کو ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتری ہوئی وحی ٹھہرائے تو اس پر حکم کفر ہے۔

چنانچہ غنیہ میں قاضی خاں سے ناقل ہیں:

قال قاضی خان وماقاله المتاخرون اوسع وما قاله المتقدمون احوط لانه لو تعمده

یکون کفرا لایکون من القرآن قال ابن الھمام فیکون متکلما بکلام الناس الکفار وھو مفسد کما لو تکلم بکلام الناس ساھیا مالیس بکفر فکیف وھو کفر ۔

شرح فقہ اکبر میں محیط سے ناقل ہیں:

سئل الامام الفضلی ممن یقرأ الظاء المعجمة مکان الضاد المعجمة اویقرأ اصحاب الجنة مکان اصحاب النار اوبالعکس فقال لاتجوز امامته ولو تعمد یکفر قلت اما کون تعمده کفرا فلا کلام فیه۔

شرح فقہ اکبر والی عبارت کا ترجمہ یہ ہے کہ امام فضلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے اس شخص کے متعلق دریافت کیا گیا جو ''ضاد معجمہ'' کی جگہ ''ظاء معجمہ'' پڑھتا ہے۔ یا ''اصحاب النار'' کی جگہ ''اصحاب الجنۃ'' یا اس کا خلاف پڑھتا ہے تو جواب دیا کہ اس کی امامت جائز نہیں اور اگر قصدا کہے تو کافر ہو جائے گا۔

علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: کہ اس کے قصدا پڑھنے کے کفر ہونے میں کوئی کلام ہی نہیں۔ لہذا جو لوگ ''ضاد'' کو قصدا ''ظا'' پڑھتے ہیں وہ اپنا حکم ان عبارتوں میں تلاش کر کے تائب ہوں۔

قسم دوم: باوجود صحیح ادا کرنے کی قدرت کے زبان کی لغزش سے بلا قصد ان میں سے کوئی غلطی خطا ہوگئی اور معنی صحیح رہے تو نماز فاسد نہیں ہوگی اور اگر اس کے معنی متغیر ہو گئے اور بنا بر اصل امام یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے یہ بدلا ہوا کلمہ قرآن کریم میں بھی کہیں نہیں ہے تو باجماع متقدمین اس کی نماز باطل اور جب یہ امام ہو تو سارے مقتدیوں کی نمازیں فاسد۔

چنانچہ غنیۃ میں ہے:

وان لم یکن التغیر کذلک (ای مایکون اعتقاده کفرا) فان الاصل فیه ای فی الذلل والخطاء انه ان لم یکن مثله ای مثل ذلك اللفظ فی القرآن والمعنی ای والحال فی ان معنی ذلك اللفظ بعید من معنی لفظ القرآن متغیر معنی لفظ القرآن به تغیرا فاحشاقویا بحیث لامناسبة بین المعنیین اصلا تفسد صلاته ایضا کما اذا قرأ ھذا الغبار مکان قوله ھذا الغراب وکذا ان لم یکن مثله فی القرآن ولامعنی له حتی یحکم علیه بالبعدمن المعنی القرآنی اوبعدمه کما اذا قرأ یوم تبلی السرایل باللام فی آخره مکان الراء فی السرایر وان

کان مثله فی القرآن والمعنی ای معنی اللفظ الذی قرأه بعید من معنی اللفظ المراد ولم یکن معنی اللفظ المراد متغیرا باللفظ المقر وتغیرا فاحشا تفسد ایضا عند ابی حنیفة ومحمد رحمة اللّٰہ تعالیٰ علیهما وهو الاحوط۔

اسی کے دوسرے مقام پر ہے:

واذا تاملت فیما ذکرنا من اول الفصل الی آخره علمت انه اذا خطأ بما یتغیر تغیرا یلزم من اعتقاده کفر تفسد صلوته مطلقا وان لم یکن التغیر کذلك فان فی هیئات الحروف من الاعراب والتشدید والتخفیف والمد والقصر لاتفسد الا ان یکون التغیر فاحشا وکذا اذا کان فی نفس الحروف فان بقیت الکلمة سببه لامعنی لها اولها معنی بعید جدا عن المراد تفسد والا فلا،سواء کان فی حرف او اکثر وسواء کان فی القرآن او لا عندهما وعند ابی یوسف رحمة اللّٰہ تعالیٰ علیه لاتفسد اذا کانت الکلمة المغیرة فی القرآن۔

طحطاوی میں ہے:

فالاصل فیها عند الامام ومحمد رحمهما اللّٰہ تعالیٰ تغیر المعنی تغیراً فاحشا وعدمه للفساد عدمه مطلقاسواء کان اللفظ موجودا فی القرآن ولم یکن وعند ابی یوسف رحمه اللّٰہ تعالیٰ علیه ان کان اللفظ نظیره موجودا فی القرآن لاتفسد مطلقا تغیر المعنی تغیرا فاحشا اولا وان لم یکن موجودا فی القرآن تفسد مطلقا ولا یعتبر الاعراب اصلا ومحل الاختلاف فی الخطا والنسیان۔

لہذا اگر بحالت خطا معنی متغیر ہو گئے تو بنا بر مذہب مفتی بہ کے نماز فاسد ہو جائے گی۔

قسم سوم: باوجود صلاحیت تصحیح حروف ورعایت وقوف کے زبان پر غلطی کا بلا قصد جاری ہو جانا اور مشاغل دنیوی کے انہماک میں صحیح تلفظ کے سیکھنے سے قاصر رہ جانے کی وجہ سے اس غلط تلفظ کو ہی اپنے خیال میں صحیح سمجھنا مفہوم عجز کا ہے۔

لہذا ایسے عاجز پر جتنی تجوید مقدمہ سوم میں گذری سیکھنا واجب ہے کہ جس سے تغیر مراد نہ ہونے پائے مگر اس کی اپنی نماز درست ہے اور یہ عاجز امامت صحیح خوانوں کی نہیں کرسکتا۔ہاں اپنے جیسے کی امامت کرسکتا ہے۔اور اگر اس نے تجوید ہی نہیں سیکھی یا کچھ سیکھی اور پھر چھوڑ دی یہاں تک کہ وجوب کا

مطالبہ اس کے ذمہ پر باقی رہا تو خود اس کی نماز کی صحت بھی محل کلام ہے۔

غنیہ میں ہے:

كان القاضي الامام الشهيد المحسن يقول الاحسن فيه اى فى الجواب فى هذه الابدال المذكور ان يقول المفتى ان جرى ذلك على لسانه ولم يكن مميزا بين بعض هذه الحروف وبعض وكان فى زعمه انه ادى الكلمة على وجهها لاتفسد صلوته وكذا اى مثل ماذكر فى فتاوى الحجة انه يفتى فى حق الفقهاء باعادة الصلوة بالجواز كقول محمد بن سلمة اختيار اًللاحتياط فى موضعه والرخصة فى موضعها۔

اسی میں محیط سے ناقل ہیں:

ومايجرى على السنة النساء والارقاء من الخطاء الكثير من اول الصلوة الى آخرها كالشيتان والألمين واياك نابد واياك نستئين السرات انامت فعلى جواب الفتاوى والحسامية ماداموا فى التصحيح والتعليم والاصلاح بالليل والنهار ولا يطاوعهم لسانهم جازت صلوتهم كسائر الشروط اذا عجز عنها من الوضو وتطهير الثوب والقيام والقرأة والركوع والسجود والقعود والتوجه اذا حصل العجز عنها جازت صلوته فكذا هنا اما اذا تركوا التصحيح والجهد فسدت صلوتهم كما اذا تركوا سائر الشروط وانما جوزت صلوتهم لعجزهم عن الاصلاح فصار تلك الالفاظ لغتهم ولسانهم فكانهم قرأوا القرآن بلغتهم۔

اسی میں قاضی خاں سے ناقل ہیں:

وان كان الرجل ممن لايحسن بعض الحروف ينبغى ان يجتهد ولا يعذرفى ذلك فان كان لاينطق لسانه ان لم يجد آية ليس فيها تلك الحروف تجوز صلوته ولايؤم غيره ۔

شامی میں خزانۃ الاکمل سے ناقل ہیں:

ان جرى على لسانه (اى حرفا مكان حرف) اولا يعرف التميز لاتفسد وهو المختار حليه وفى البزازية وهو اعدل الا قاويل وهو المختار ۔

اس میں تاتارخانیہ سے ناقل ہیں:

اذا لم يكن بين الحرفين اتحاد المخرج ولاقربة الا ان فيه بلوى العامة كالذال

مكان الضاد او الزائ المحض مكان الذال والظاء مكان الضاد لاتفسد عند بعض المشائخ ۔

علامہ شامی فرماتے ہیں:

فينبغي على هذا عدم الفساد فى ابدال الثاء سينا والقاف همزة كماهو عوام زماننا فانهم لايميزون بينهما ويصعب عليهم جدا كالذال مع الزائ ولاسيما على قول القاضى ابى عاصم وقول الصفار۔

اسی طرح عالمگیری وحلیہ وفتح القدیر وغیرہا کتب میں ہے۔لہذا بنابر مذہب مفتی بہ کے عاجز کی خود اپنی نماز درست اور مقدار وجوب تجوید سیکھنا واجب اور بحالت عدم سعی خود اس کے ذمہ سے فریضہ کا سقوط موہومی بلکہ بنابر قول بعض فقہائے کرام کے اس پر باقی۔

قسم چہارم: تصحیح حروف کی خلقۃ زبان میں بالکلیہ صلاحیت ہی نہ ہونا عذر سے تعبیر ہے۔لہذا ایسے معذور کی خود اپنی نماز صحیح ہے لیکن وہ امامت نہیں کرسکتا ہے اور بقول بعض فقہاء کے اس پر بھی تصحیح حروف کی کوشش ضروری یہ حتی الامکان کسی صحیح خواں کی اقتدا کرے بمجبوری تنہا نماز پڑھے۔

منیہ میں ہے:لو قرأ الالثغ لب (العالمين باللام)مكان رب لاتفسد ۔

غنیۃ میں ہے:

الحاصل ان الثغ يجب عليه الجهد دائما وصلوتهم جائزة ماداموا على الجهد لكنهم بمنزلة الاميين فى حق من يصحح الحروف الذى عجزوا عنه لايجوز اقتداؤه بهم ولايجوز صلوتهم اذا تركوا الاقتداء به مع قدرتهم وانما يجوز صلوتهم مع قرأة تلك الحروف اذا لم يقدروا على قرأة مايجوز به الصلوه مماليس فيه تلك الحروف واما لوقدروا مع هذا اقراؤ اتلك الحروف فصلوتهم فاسدة ايضا لان جواز صلوتهم مع التلفظ بتلك الحروف ضرورى فينعدم بانعدام الضرورة هذا هوالذى عليه الاعتماد ۔

اسی میں ملتقط سے ناقل ہیں:

لو قرأ فى الصلوة الحمد لله بالهاء مكان الحاء اوقرأ كل هو الله احد بالكاف مكان القاف والحال انه لايقدر على غيره كما فى الاتراك ونحوهم تجوز صلوته ولاتفسد وكذا لو قال الخمد لله بالخاء المعجمة ۔

اسی میں محیط سے ناقل ہیں:

والمختار للفتوی فی جنس هذه المسائل انه ان كان يجتهد آناء الليل واطراف النهار فی التصحيح ولا يقدر عليه فصلوته جائزة۔

درمختار وتنویر الابصار میں ہے:

ولا (يصح اقتداء) غير الالثغ به ای بالالثغ علی الاصح كما فی البحر عن المجتبی وحرر الحلبی وابن الشحنة انه بعد بذل جهده دائما حتما كالامی فلايؤم الامثله ولاتصح صلوته لذا امكنه الاقتداء بمن يحسنه او ترك جهده او وجد قدر الفرض ممالا لثغ فيه هذا هو الصحيح المختار فی حكم الالثغ۔

الحاصل چونکہ ان مقدمات سے جوابات کو زیادہ تعلق تھا اس لئے وہ قدرے تفصیل سے تحریر کئے گئے۔ جوابات کا ہر پہلو انہیں مقدمات پر مبنی ہوگا۔ لہذا اب ہر ہر سوال کا جواب باختصار دیا جاتا ہے۔ واللہ الموفق للا تمام۔

جواب سوال اول: لحن اور اس کی دونوں قسمیں جلی وخفی اپنے مقام پر نہایت مشرح ہیں یہاں تک کہ علمائے قرأت بے تجوید کو بھی لحن کہہ دیتے ہیں۔

چنانچہ اتقان شریف میں ہے: وقد عدالعلماء القرأة بغير تجويد لحنا۔

لیکن اس کے احکام شرعیہ کا اظہار بہت ضروری ہے۔ لہذا تصریحات فقہا میں مجھے لحن کی تین قسمیں ثابت ہوئیں۔

قسم اول: لحن بمعنی تغنی یعنی جس میں حروف وکلمات متغیر ہوجائیں۔

چنانچہ شامی درمختار کے قول۔ تغنی بغير كلماته کے تحت میں فرماتے ہیں:

ای بزيادة حركة او حرف او مد او غيرها فی الاوائل والاواخر۔

یعنی تغنی جو کلمات کو متغیر کردیتی ہے وہ کلمات کے اول یا آخر میں حرکت یا حرف یا مد وغیرہ کی زیادتی سے حاصل ہوتی ہے۔

لہذا یہ لحن حرام ہے اور اگر معنی میں تغیر کردے تو اس سے نماز فاسد ہوجائے گی۔

چنانچہ غنیۃ میں ہے:

اما اللحن المغير فحرام بلاخلاف۔

درمختار میں اذان کے لحن کے متعلق فرماتے ہیں:

ولالحن فیه ای تغنی یغیر کلماته فانه لایحل فعله وسماعه کالتغنی بالقرآن۔

احسن الفتاوی وفتاوی بزازیہ میں ہے: ان اللحن حرام بلاخلاف۔

لہذا ایسا لحن باتفاق حرام ہے۔

قسم دوم: وہ لحن جس میں حروف تو متغیر نہ ہوں لیکن اعراب میں خطاواقع ہوجائے جیسا کہ۔

طحطاوی میں ہے: والخطاء فی الاعراب یقال له لحن۔

یعنی خطافی الاعراب کو بھی لحن کہا جاتا ہے۔

لہذا یہ لحن مکروہ ہے اور اگر معنی بگڑ جائیں تو نماز فاسد ہوجائے گی۔

چنانچہ غنیہ میں ہے: ویکره الترجیح والتلحین بقراءة القرآن عند عامة المشائخ لانه تشبه بفعل الفسقة هذا اذا کان لایغیر الحروف۔

نورالایضاح ومراقی الفلاح میں ہے:

ویکره التلحین و التطریب والخطاء فی الاعراب۔

درمختار میں مفسدات صلوۃ کے بیان میں ہے:

منها القرأة بالالحان ان غیر المعنی والا لا۔

قسم سوم: لحن بمعنی تحسین صوت جس میں قسم اول ودوم کی کوئی خرابی نہ ہو۔ لہذا یہ لحن نماز وغیر نماز دونوں میں مستحب ومطلوب ہے۔

مراقی الفلاح میں ہے: اما تحسین الصوت بدونه فهو مطلوب۔

شامی میں ہے:

ان القرأة بالالحان اذا لم تغیرا الکلمة عن وضعها ولم یحصل بها تطویل الحروف حتی لایغیر الحرف حرفین بل مجرد تحسین الصوت وتزیین القراة لایضر بل یستحب عندنا فی الصلوة وخارجها کذا فی التتار خانیة۔ **واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب**

جواب سوال دوم: زبان کی داہنی یا بائیں کروٹ جب بالائی داڑھوں سے متصل ہو وہ مخرج ضاد ہے، اب چاہے داہنی جانب سے اس کو نکالا جائے یا بائیں طرف سے۔

چنانچہ جزری میں ہے:

والضاد من حافته اذ ولیا لاضراس من ایسر او یمناها

لہذا زبان کا اگلے دانتوں سے لگنا۔ یا فقط زبان کی نوک سے کام لینا۔ یا زبان کا تالو کی جانب نہ اٹھنا۔ یا اعتماد ضعیف ہو جانا۔ یا مخرج لام کے قریب تک استطالت کا نہ ہونا۔ یہ ہر ایک ضاد کو مخرج سے ادا ہونے کے موانع ہیں۔ ''ظا معجمہ'' کا مخرج ثنایا علیا اس طرح ہیں کہ جب زبان کی نوک ثنایا علیا کے کنارے سے متصل ہو جائے۔ ذ معجمہ اور س مہملہ اور ص مہملہ یہ تینوں زبان کے کنارے اور ثنایا سفلی کی جڑ کے مابین سے نکلتے ہیں یہی ان کا مخرج ہے۔ ت فوقانیہ اور ط مہملہ اور د مہملہ یہ تینوں زبان کے کنارے اور ثنایا علیا کی جڑ کے مابین سے نکلتے ہیں یہی ان کا مخرج ہے۔

جزری میں ہے:

والطاء والدال وقامته ومن۔ علیا الثنایا والصفیر مستکن منه ومن فوق الثنایا السفلی۔ والظاء والذال وثا للعلیا۔ من طرفیها۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

جواب سوال سوم: ''ضاد معجمہ'' اور ''ذ معجمہ'' اور ''دال مہملہ'' کے مخارج تو جواب دوم میں گذر چکے کہ ان میں سے ہر ایک کا مخرج جداگانہ ہے۔ لہذا پہلا فرق تو ان میں من حیث المخارج ہوا۔ پھر ''ضاد معجمہ'' مجہورہ۔ رخوہ۔ مستعلیہ۔ مطبقہ۔ مصمتہ۔ مستطیلہ۔ اور ''ظا معجمہ'' مجہورہ۔ رخوہ۔ مستعلیہ۔ مطبقہ۔ مصمتہ۔ اور ''دال مہملہ'' مجہورہ۔ شدیدہ۔ مستفلہ۔ منفتحہ۔ مصمتہ۔ قلقلہ ہے۔ لہذا ''ضاد معجمہ'' کو ''ظا معجمہ'' سے صرف ایک صفت استطالت کا فرق ہے کہ ''ضاد معجمہ'' مستطیلہ ہے۔ اور ''ظا معجمہ'' مستطیلہ نہیں۔ اور ''ضاد معجمہ'' کو ''دال مہملہ'' سے چند صفات کا فرق ہے کہ ''ضاد معجمہ'' رخوہ ہے اور ''دال مہملہ'' اس کی ضد شدیدہ۔ اور ''ضاد معجمہ'' مستعلیہ ہے۔ اور ''دال مہملہ'' اس کی ضد مستفلہ۔ اور ''ضاد معجمہ'' مطبقہ ہے اور ''دال مہملہ'' اس کی ضد منفتحہ۔ اور ''ضاد معجمہ'' مستطیلہ ہے اور ''دال مہملہ'' اس کی ضد قصیرہ۔ اور ''دال مہملہ'' قلقلہ ہے اور ''ضاد معجمہ'' غیر قلقلہ۔

بالجملہ یہ تینوں حروف متبائنہ متغائرہ من حیث المخارج والصفات ہوئے۔ اب تلاوت قرآن کریم میں ایک کو دوسرے سے قصدا بدلنا حرام اور گناہ عظیم و تحریف قرآن کریم ہے۔ اب باقی رہی مشتبہ الصوت کی بحث۔ لہذا اشتباہ صوت کے اسباب یا تو ایک کا دوسرے حرف کے ساتھ مخرج میں اتحاد یا قرب ہوگا۔ یا مشارکت فی الصفات۔ یا قصور زبان۔

قسم اول: یعنی اتحاد مخرج یا قرب کی وجہ سے مشتبہ ہونا۔ لہذا اس اشتباہ کو زائل کرنے والی چند

چیزیں ہیں۔ ہر حرف کا تغایر و تباین وضعی بلکہ ہر ایک کی صحت طبعی امتیاز شبہات کے لئے بہت کافی ہے۔ معہذا صفات عامہ یا خاصہ کا فرق بلکہ ایک کی ادائیگی کی مخصوص کیفیات مشتبہ الاصوات میں ایسا بین فرق پیدا کر دے گی کہ ہر سامع عام ازیں کہ وہ فن تجوید سے مس رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو مگر تغایر مشتبہات کو بآسانی معلوم کر لیتا ہے اور مغایر المخارج حروف میں ان تمام امور کے باوجود خود تغایر بین المخارج ایک بڑی امتیاز پیدا کرنے والی چیز ہے۔

الحاصل اس قسم اول کے مشتبہ الصوت حروف کا فرق سیکھنا نہایت ضروری کہ اکثر اس میں امتیاز نہ ہونے کی وجہ سے کلمہ بدل کر معنی متغیر ہو جاتے ہیں۔

قسم دوم: یعنی حروف کا مشارکت فی الصفات کیوجہ سے مشتبہ الصوت ہونا۔ لہذا اس اشتباہ کو زائل کرنے والی بھی چند چیزیں ہیں۔

(۱) ہر حرف کا تغایر و تباین وضعی۔

(۲) ہر ایک کی صوت طبعی۔

(۳) ہر ایک حرف کے ادا کی مخصوص رعایات۔

(۴) بعض میں اس کی خاص صفات۔ کہ ان میں سے ہر ایک ایسے مشتبہ الاصوات حروف میں بین فرق پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ پھر سب کا اجماع تو کمال کا امتیاز پیدا کر دے گا۔ اور اگر ان متشارک فی الصفات حروف میں تغایر بین المخارج بھی ہے تو یہ ایک خود زبردست فرق کرنے والی چیز ہے۔ لہذا اس قسم دوم کے مشتبہ الاصوات کا فرق سیکھنا بھی حتمی اور لازمی ہے کہ اس فرق کے نہ ہونے کی وجہ سے بھی کلمہ متغیر ہو کر معنی اکثر بگڑ جاتے ہیں مگر اس وقت چند مجتہدو اور نئے مدعیان علم تجوید نے مشارکت فی بعض الصفات کا نام اتحاد ذات سمجھ رکھا ہے۔ کہ "ضاد معجمہ" کو بالقصد "ظا معجمہ" پڑھنا شروع کر دیا ہے اور جب کوئی شخص اعتراض کر دیتا ہے تو نہایت جرأت و دلیری سے کہہ دیتے ہیں کہ "ضاد معجمہ" کو چونکہ "ظا معجمہ" سے اکثر صفات میں مشارکت ہے اس لئے اس کو "ظا معجمہ" کی آواز میں ادا کیا جاتا ہے لہذا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس جیسے مغالطوں کی حقیقت سے آگاہ کروں۔

چنانچہ اگر بقول ان کے مشارکت فی بعض الصفات ایک حرف کی آواز کو دوسرے کی آواز میں فنا کر دیتی ہے تو ملاحظہ ہو کہ "حا مہملہ" اور "شین معجمہ" میں پانچ صفات میں مشارکت ہے۔ صرف "شین

معجمہ'' میں ایک صفت تفشی زائد ہے۔ ''دال مہملہ'' اور ''با موحدہ'' میں پانچ صفات میں مشارکت ہے ۔صرف ایک صفت میں فرق ہے کہ ''دال مہملہ'' مصمتہ ہے اور ''با موحدہ'' مذلقہ ہے۔ یہ دو مثالیں تھیں کہ جن میں ایک ایک صفت کا فرق تھا۔اب دو مثالیں وہ لیجئے جن میں ایک صفت کا بھی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ ''ہا'' اور ''ثا مثلثہ'' کہ ان دونوں میں ایک صفت کا بھی فرق نہیں ہے۔ کہ یہ دونوں مہموسہ۔ رخوہ۔ مستفلہ ۔ منفتحہ ۔ مصمتہ ۔ ہونے میں برابر ہیں ۔ اسی طرح ''کاف وتا فوقانیہ'' کہ یہ دونوں بھی پانچوں صفت مہموسہ۔ شدیدہ۔ مستفلہ۔ منفتحہ۔ مصمتہ میں برابر ہیں۔ لہذا اب ان نئے قاریوں کو چاہئے کہ پہلی دونوں مثالوں میں چونکہ اکثر صفات میں مشارکت ہے صرف ایک ایک صفت کا فرق ہے۔ جیسے ''ضاد معجمہ'' اور ''ظا معجمہ'' میں ایک صفت کا فرق ہے ۔تو جب باوجود ایک صفت کا فرق ہوتے ہوئے ''ضاد معجمہ'' ہم آواز ''ظا معجمہ'' کا ہی نہیں ہوگیا بلکہ ذات ''ظا معجمہ'' بن گیا۔ لہذا اس قاعدہ کی بنا پر ''ش معجمہ'' ہم آواز ''جیم'' اور ''زا'' اور ''دال مہملہ'' ہم آواز ''با موحدہ'' کا ہی نہیں ہوجائے بلکہ ''ش معجمہ'' ذات ''حا مہملہ'' اور ''دال مہملہ'' اور ذات ''با موحدہ'' بن جائے۔

اب باقی رہیں آخر کی دو مثالیں تو ان میں مشارکت فی بعض الصفات ہی نہیں بلکہ مشارکت فی کل الصفات ہے۔اور ''ضاد معجمہ'' اور ''ظا معجمہ'' میں تو ایک صفت کا فرق بھی تھا اور یہاں تو فرق کا نام ہی نہیں ۔لہذا ایک کو دوسرے کی ہم آواز ہونے کا تو کیا ذکر بلکہ ''ہا'' کو ''ث مثلثہ'' اور ''ک'' کو ''ت فوقانیہ پڑھنا چاہئے باوجودیکہ ہر ناخواندہ بھی ''ح مہملہ'' اور ''شین معجمہ'' میں اور ''دال مہملہ'' اور ''ب موحدہ'' میں اور ''ہا'' اور ''ثا مثلثہ'' میں اور ''ک'' اور ''ت فوقانیہ'' میں بین فرق سمجھتا ہے۔

بالجملہ مشتبہ الصوت ہونے کا مدار یہ متجودین کیا اب بھی مشارکت فی الصفات ہی قرار دینگے۔اور سنئے کہ ''ط مہملہ'' اور ''ت فوقانیہ'' مشتبہ الصوت ہیں باوجودیکہ چار صفات میں متغایر ہیں کہ ''ط مہملہ ''مجہورہ۔ مستعلیہ۔ مطبقہ۔ قلقلہ ہے اور ''ت فوقانیہ'' میں اس کی اضداد صفات ہیں یعنی مہموسہ۔ مستفلہ ۔منفتحہ۔ غیر قلقلہ ۔لہذا اگر مشتبہ الصوت ہونے کا مدار صرف مشارکت فی الصفات ہوتا تو باوجود چار صفات کے فرق ہوتے ہوئے یہ دونوں مشتبہ الصوت نہ ہوتے حالانکہ ان کو مشتبہ الصوت تسلیم کیا گیا ہے ۔علاوہ بریں ان متجودین نے مشتبہ الصوت ہونے کا یہ مطلب کہاں سے تراشا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ایسے ہم آواز ہوجائیں کہ جس میں سامع کو کوئی امتیاز ہی نہ ہوسکے۔ ملاحظہ ہو کہ یہی ''ت فوقانیہ'' اور ''ط مہملہ'' مشتبہ الصوت ہیں باوجودیکہ ہر سامع ان کی ادئیگی کے وقت ان میں بین فرق بآسانی معلوم

کرلیتا ہے۔ لہذا ''ض معجمہ'' کو ''ظ معجمہ'' پڑھنا اور گلوخلاصی کے لئے مشتبہ الصوت کو آڑ بنالینا ان متجودین کا قرآن کریم میں تحریف کرنا ہے ورنہ ان متجودین کے ان قاعدہ کی بناپر کیا ہر مشتبہ الصوت کا یہ طریقہ تلاوت ہے۔ پھر لطف کی ایک یہ بات ہے کہ مشابہت جانبین سے مساوات چاہتی ہے۔ لہذا اس کی کیا وجہ ہے کہ ''ض معجمہ'' کو ہم آواز ''ظ معجمہ'' کیا جاتا ہے اور ''ظ معجمہ'' کو ہم آواز ''ض معجمہ'' کے نہیں کیا جاتا کیونکہ ''ض معجمہ'' میں ایک صفت استطالت ''ظ معجمہ'' سے زائد ہے۔ لہذا باوجود اس کے اس کے خلاف پر کونسی دلیل ترجیح قائم ہوگئی ہے۔ اب باقی رہا یہ عذر کہ ''ض معجمہ'' کی ادائیگی میں نہایت دشواری اور اشکال ہے تو کیا یہ عذر تبدیل حرف کو جائز کردے گا۔ علاوہ بریں جس شخص کو جس حرف کے ادا کرنے میں دشواری ہو تو کیا اس کے لئے یہی قاعدہ ہے کہ وہ اس طرح تبدیل حرف کرلیا کرے۔ لہذا پھر تو ہر شخص کا نیا ہی قرآن ہوجائے گا۔ نعوذ باللہ من ھذہ الخرافات۔

قسم سوم: یعنی زبان کے قصور کی وجہ سے مشتبہ الصوت ہونا۔ لہذا اس کی دوصورتیں ہیں۔

(۱) عجز۔ (۲) عذر۔ ان دونوں کی تعریف اور حکم مقدمہ چہارم کی قسم سوم و چہارم میں مفصل گذر چکا۔

بالجملہ خلاصہ جواب یہ ہے کہ ''ض معجمہ'' ان دونوں حرف ''ظ معجمہ'' اور ''د مہملہ'' سے ایک بالکل علیحدہ اور ممتاز حرف ہے۔ لہذا ''ض معجمہ'' نہ ''ظ معجمہ'' پڑھا جائے گا نہ ''د مہملہ''۔ اور ''د مہملہ'' مفخم نہیں ہوتی۔ اس کو مفخم لکھنا غلطی ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

جواب سوال چہارم: سنت یہی ہے کہ رکوع میں 'سبحان ربی العظیم'' ہی کہا جائے اور عظیم میں ''ظا'' کو مخرج سے ادا کیا جائے اور بصورت عجز یا عذر اگر ''زا'' سے کہا اور وہ بجائے عظیم کے عزیم بن گیا تو یہ حضرت حق سبحانہ تعالی کی شان اعلیٰ میں سخت گستاخی کا حکم ہوگیا کہ عزیم کے معنی قاموس میں۔ العدو الشدید کے ہیں۔ لہذا شامی نے ایسے عوام کے لئے جو ''ظ'' ادا نہ کرسکتے ہوں یہ حکم نقل کیا کہ وہ بجائے 'سبحان ربی العظیم'' کے 'سبحان ربی الکریم'' کہا کریں۔

عبارت یہ ہے:

السنة فی تسبیح الرکوع سبحان ربی العظیم الا ان کان لایحسن الظاء فیبدل به الکریم لئلا یجری علی لسانه العزیم فتفسد به الصلوة کذا فی شرح درر البحار فلیحفظ فان العامة عنه غافلون حیث یاتون بدل الظاء بزای مفخمة ۔

اورصورت خطا میں بسبب تغیر معنی کے نماز فاسد ہو جائے گی۔

اقول قولہ تفسد اشارة الی هذه واما فی العجز فالمختار عدم الفساد کما بینا فی المقدمة الرابعة۔

(۲) " سبحان ربی الاعلیٰ " کی عین کو بھی صحیح طور پر ادا کیا جائے کہ عین کا مخرج سے ادا کرنا عوام کو زیادہ دشوار نہیں ہے بخلاف " ظا " کے کہ اس کی ادا مشکل ہے۔اب چونکہ " آلیٰ " میں دوسرے غیر مناسب شان حق جل جلالہ معانی بھی ممکن ہیں۔لہذا " اعلیٰ " کو " آلیٰ " ادا ہونے سے بچانا ضروری ہے اور صورت خطا میں احتیاط اسی میں ہے کہ نماز کے فساد کا حکم دیا جائے۔کہ " آلیٰ " کے معنی صراح میں بزرگ سرین کے بھی ہیں اور صورت عجز اور عذر میں نماز فاسد نہ ہوگی۔کما فصلنا فی المقدمہ الرابعۃ۔

(۳) " ویاك " میں ایک حرف یعنی ہمزہ حذف کیا۔لہذا صورت خطا میں بقاعدہ متقدمین بوجہ تغیر معنی کے فساد نماز کا حکم ہے۔اب باقی رہی۔

طحطاوی کی یہ عبارت:

وکثیرا مایقع فی قراة بعض القرویین والاتراك والسودان ویاك نعبد بواو مکان الهمزة والصراط الذین بزیادة الالف واللام وصرحوا فی الصورتین بعدم الفساد وان غیر المعنی۔

لہذا اس میں یا عجز کی بنا پر عدم فساد کا حکم ہے۔یا باعتبار اقوال متاخرین کے وسعت ملحوظ ہے۔

فالاولیٰ الاخذ فیه بقول المتقدمین لانضباط قواعدهم وکون قولهم احوط وهوالذی صححه المحققون من اهل الفتاوی۔

(۴-۵) " ض معجمہ " کی جگہ اگر عمداً " ظ معجمہ " یا " د مہملہ " پڑھی تو اس کی نماز یقیناً فاسد۔اور اگر وہ اس کی عادت بھی مقرر کرے تو اس کی امامت ہرگز درست نہیں۔اس وقت جو نئے قاری " ض معجمہ " کو بالقصد " ظ معجمہ " پڑھتے ہیں وہ اپنا حکم مقدمہ چہارم کی بحث میں تلاش کرلیں۔اب رہے " د مہملہ " پڑھنے والے چونکہ مدعی تجوید نہیں اس لئے ان کا حکم ظائیوں کا سا نہیں ہے اگرچہ " ض " کو " د " پڑھنا بھی غلط ہے۔اور اگر خطا " ض " کی جگہ " ظ " یا " د " پڑھی تو اس کا حکم ہر جگہ ایک نہیں جہاں معنی متغیر ہو جائیں نماز فاسد ہو جائے گی اور جہاں معنی متغیر نہ ہوں وہاں نماز فاسد نہیں ہوگی۔" غیر المغضوب " میں " ض " کو " ظ " پڑھنے میں چونکہ معنی متغیر ہو گئے۔لہذا نماز فاسد اور " ولا الضالین " میں " ض " کی جگہ " ظ " یا " د " پڑھنے

میں چونکہ معنی متغیر نہیں ہوئے۔ لہذا نماز فاسد نہیں ہوگی۔

چنانچہ غنیہ میں قاضی خان سے ناقل ہیں:

ولیس فی القرآن غیر المغضوب بالظاء والذال المعجمتین تفسد اذ لیس لهما معنی ولا الضالین بالظاء المعجمه او الدال المهملة لاتفسد لوجود لفظهما فی القرآن وقرب المعنی۔

لہذا نماز تو "غیر المغضوب" پر ہی فاسد ہوجائے گی "ولا الضالین" تو نماز کے باہر کرے گا۔ اور بحالت عجز وعذر "ض" کی "ظ" یا "ذ" ہی نہیں بلکہ اگر کوئی اور حرف بھی بدلا تو خود اس کی نماز درست ہے۔ کمامر فی مباحث العجز والعذر۔

(۶) رحلة الشتاء والصیف کے "ص" کی جگہ اگر "س" ادا کیا تو نماز فاسد ہوجائے گی۔

غنیۃ میں ہے۔

رحلة الشتاء والسیف بالسین مکان الصاد تفسد للبعد الفاحش۔

اور عجز کی حالت میں بنابر اتحاد مخرج یا فرق بمشقۃ یا عموم بلوی وغیرہ کے خود اس کی نماز درست۔ کماهو مشرح فی کتب الفقه۔

(۷) فائزون "ذ" سے پڑھنے میں بحالت خطا غالبا نماز فاسد ہوجائے گی کہ صراح اور قاموس ومنتخب وتاج المصادر وغیاث میں اس کے کوئی معنی نہیں لکھے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بے معنی اور مہمل لفظ ہے۔ اسی بنا پر فساد کا حکم ہے اور حالت عجز میں نماز درست۔

(۸) اذا جاء نصر الله میں "صاد" کی جگہ "س" پڑھنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

چنانچہ غنیۃ میں ہے۔

قرأ اذا جاء نسر الله بالسین لاتفسد لان من جملة معانية القطعة من الجیش وبتقدیره یصح المعنی فان جیش الله هم الملائكة مستلزم للنصر۔

(۹) حمالة الحطب کی "ط" کی جگہ اگر "ت" بصورت خطا ادا کی تو نماز فاسد ہوجائے گی۔

غنیۃ میں ہے۔

ولو قرا حمالة الحتب بالتاء مکان الطاء تفسد۔

اور بحالت عجز درست۔

(۱۰) یکزب "زا" سے پڑھنے کی صورت میں اغلب یہی ہے کہ بحالت خطانماز فاسد ہوجائے کیونکہ یہ معنی بہت بعید ہوئے جاتے ہیں اور بصورت عجز درست۔ لہذا اگر ایک حرف کا دوسرے حرف سے بدلنا بالعمد ہے تو اس کی نماز فاسد اور امامت درست نہیں اور اگر بالخطا ہے تو بصورت تغیر معنی نماز فاسد اور بصورت صحت درست اور بصورت فساد اس کے مقتدیوں کی بھی نماز فاسد اور عجز کی حالت میں خود اس کی نماز درست لیکن وہ صحیح خوانوں کی امامت نہیں کرسکتا۔ وھکذا حکم المعذور یہ خلاصہ جواب چہام ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

جواب سوال پنجم: ان مقامات میں الف کی زیادتی سے "لا" نفی بن جائے گا اور اس میں بجائے اثبات کے نفی کے معنی پیدا ہوجائیں گے تو اس میں معنی بہت زیادہ بگڑ جائینگے۔ لہذا بنا بر قول احوط حضرت امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے فساد نماز کا حکم ہے۔

چنانچہ شامی سے ناقل ہیں:

ولو زاد حرفا لایغیر المعنی لاتفسد عندھما وعن الثانی روایتان کمالو قرأوانھی عن المنکر بزیادۃ الیاء ویتعد حدودہ یدخلھم نارا وان غیر یفسد۔

اور بحالت عجز بھی اس میں حکم فساد ہی زیادہ احوط ہے۔ کہ اس کے امتیاز میں زیادہ دشواری نہیں ہے۔ فلیتأمل۔

جواب سوال ششم: تعوذ کے آخر میں چونکہ شیطان کا نام ہے اور اس کے بعد اس کی صفت رجیم ہے۔ لہذا اس کا کسی اسم الہی سے وصل مناسب نہیں ہے اگرچہ وصل ووقف سے علمائے کرام نے معنی کا تغیر تسلیم نہیں کیا ہے۔ ہاں اگر معنی پر نظر رکھتے ہوئے اور اس اتصال کو اچھا سمجھتے ہوئے اس نے عمدا وصل کو اختیار کیا تو یہ گنہگار ہوگا، جیسا کہ شامی کی عبارت سے مصرح ہے:

والاولیٰ الاخذ بھذا فی العمد۔

ہاں بسم اللہ شریف کو اسمائے الہی سے وصل کرسکتے ہیں۔ کماھو مصرح فی کتب التجوید۔

جواب سوال ہفتم: مقدمہ چہارم سے معلوم ہوچکا کہ عاجز اور معذور پر یہ واجب ہے کہ تصحیح حروف میں رات دن پوری کوشش کریں اور اگر صحیح خواں کی اقتدا کرسکتے ہوں تو جہاں تک ممکن ہو اس کی

اقتدا کریں۔یا وہ آیتیں پڑھیں جس کے حروف صحیح ادا کر سکتے ہوں اور اگر یہ صورتیں ممکن نہ ہوں تو اس زمانۂ کوشش میں خود انکی نماز ہوجائے گی۔باقی رہی امامت تو یہ دونوں اپنے اپنے مثل کی امامت بھی کر سکتے ہیں۔لہذا ایسا مجود کہ جو حروف کو صحیح طور پر ادا کرلیتا ہے یہ دونوں اس کے امام نہیں بن سکتے ہیں۔

چنانچہ غنیہ میں ہے:

والذی ینبغی ان یکون الحکم فیه کالحکم فی الثغ انه یجتهد فی اصلاح لفظه ولاتفسد صلوته مادام علی الاجتهاد ولکن لایجوز لغیره الاقتداء به فاعلموا هذا الحکم فی کل من لایمکنه النطق بحرف وفصلنا فی المقدمة الرابعة۔ والله تعالیٰ اعلم بالصواب وصلی الله علیٰ خیر خلقه سیدنا محمد وآله واصحابه اجمعین۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۶۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ رمضان المبارک میں تراویح کے اندر ختم کلام اللہ کے وقت تین مرتبہ سورۂ اخلاص جو پڑھی جاتی ہے تو آیا یہ تین مرتبہ پڑھنا شرع شریف سے ثابت ہے یا محض حفاظ کا طریقہ؟۔اگر یہ ثابت ہے تو برائے کرم بالدلائل اظہار فرمادیجئے۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

قل ھو اللہ شریف کا ختم تراویح میں تین مرتبہ پڑھنا محض حفاظ کا طریقہ نہیں بلکہ متاخرین نے امر مستحب قرار دیا ہے۔

چنانچہ فقہ کی مشہور کتاب غنیہ میں ہے:

وقرأة قل هو الله احد ثلث مرات لم یستحسنها بعض المشائخ وقال الفقیه ابو اللیث هذا شئ استحسنه اهل القرآن وائمة الامصار فلاباس به۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ : الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۲۶۶۔۲۶۷۔۲۶۸۔۲۶۹)

حضرت ضیغم سنیت حامی سنیت ماحی بدعت عالم اہل سنت والجماعۃ مولٰینا المکرّم ذوالمجد والکرم مولٰینا مولوی مفتی شاہ محمد اجمل صاحب زید مجدھم مفتی سنبھل ضلع مرادآباد۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ۔

حضور والا فقیر یہ چند سوالات بغرض حضور جوابات خدمت بابرکت بالا درجت میں روانہ کرتا ہے جوابات سے سرفرازی بخشی جائے۔

سوال اول: حفاظ وقراء حضرات قرآن پاک کی کوئی سورۃ یا رکوع لہجے کے ساتھ قرأت سے پڑھتے ہیں تو بڑی آیت ایک سانس میں نہ پڑھنے کی بنا پر درمیان آیۃ پروقف کردیتے ہیں۔ اور پھر جہاں سے وقف کرتے ہیں وہاں سے یا اس کے اوپر سے دوسری سانس سے پڑھتے ہیں۔ اس طرح بعض بعض لفظ تکرار سے پڑھے جاتے ہیں جیسے "وقال الذین کفروا ربنا ارنا الذین اضلنامن الجن والانس "پروقف کرکے پھر سے دوسری سانس میں "تتنزل علیهم الملئکة" سے پڑھا۔ یا "لو انزلنا هذا القرآن علی جبل لرئیته" پروقف کیا اور" المهیمن العزیز الجبار المتکبر" پڑھا۔ یا سورۂ بقرہ کا پہلا ہی رکوع شروع کیا اور بالغیب پروقف کرکے پھر بالغیب سے پڑھنا شروع کیا۔ یا "وقال الذین کفروا لا تسمعوا لهذا لقرآن والغوافیه" پروقف کردیا کچھ ٹھہرا پھر "والغوافیه لعلکم تغلبون "پڑھا۔ علی هذا القیاس۔ اس طرح تکرار سے قرآن شریف پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟۔ اگر نہیں تو کس بنا پر مفصل مدلل ارشاد فرمائیں۔ زید یہ کہتا ہے کہ تکرار الفاظ کے ساتھ قرآن شریف پڑھنا صحیح نہیں ہے جیسا کہ قراء اور حفاظ پڑھتے ہیں کہ "تتنزل" پروقف کرکے یا "من الجن والانس" پروقف کرکے یا" علی جبل لرائیته" پروقف کرکے۔ یا "بالغیب" پر وقف کرکے دوبارہ پھر تنزل پرسے۔ یا من الجن والانس۔ یا علی جبل لرأیته۔ یا بالغیب سے پڑھنا صحیح نہیں۔ یا ایسا ہی ہے جیسا کہ "اذابطشتم بطشتم جبارین" یا۔ یعلمون یاقواریر قواریر یہ جو لفظ بتکرار آئے ہیں۔ لہٰذا ان کے علاوہ جہاں تکرار سے الفاظ نہ ہوں وہاں تکرار سے پڑھنا غلط ہے زید کا قول صحیح ہے یا نہیں کیا حکم شرعی ہے؟۔

سوال دوم: گول آیۃ پر لا بنا ہو تو وہاں ٹھہرنا وقف کرنا جیسے سور فاتحہ میں رب العالمین پر وقف کردیا۔ پھر الرحمٰن الرحیم پڑھا ی۔ا مستقیم پروقف کرکے صراط الذین انعمت علیهم پڑھا۔ یا سورۂ ناس میں الخناس پروقف کرکے الذی یوسوس پڑھا۔ یا سورہ فلق میں اذا وقب پر وقف کردیا پھر و من شر النفثت پڑھا۔ یا سورۂ بقرہ شریف میں لعلکم تتقون پروقف کرکے الذین

جعل لکم الارض فراشا والسماء بناء پڑھا۔یا سورہ ماعون میں ساھون پر وقف کیا پھر الذین ھم یراؤن ویمنعون الماعون پڑھا۔اس طرح جہاں گول آیۃ پر لا ہو تو وہاں پر وقف کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔

زید کہتا ہے کہ گول آیت پر لا ہو تو وہاں پر وقف کرنا جائز نہیں۔سابقہ قراء کے خلاف اپنی طرف سے جدت ہے جو قواعد حجاج ابن یوسف کے زمانہ میں قراء نے مقرر کئے ہیں ان کے خلاف ہے۔لہٰذا رب العٰلمین پر وقف کر کے الرحمٰن الرحیم پڑھنا۔یا مستقیم پر وقف کرنا۔یا لعلکم تتقون پر وقف کرنا علی ھذا القیاس۔جہاں پر گول آیۃ لا ہو وہاں پر وقف کرنا صحیح نہیں ہے۔وقف کر کے الرحمٰن الرحیم۔یا۔صراط الذین۔یا۔الذی جعل لکم الارض پڑھنا صحیح نہیں ہے۔نیز یہ بھی کہتا ہے کہ الخناس پر وقف کر کے الذی یوسوس پڑھنا غلط کہ الخناس موصوف ہے، الذین اسم موصول یوسوس صلہ،صلہ موصول سے مل کر صفت ہوگی۔لہٰذا اسم موصول کی ضمیر کس طرف پھیری جائیگی جب الخناس پر وقف کر دیا۔زید کا قول صحیح ہے یا غلط شرعاً کیا حکم ہے؟۔

سوال سوم: سورۂ اخلاص اس طرح پڑھنا کہ قل ھو اللہ احدن اللہ الصمد یعنی احد پر نہ ٹھہرنا وقف نہ کرنا بلکہ احد کی دال پر پیش پڑھ کر نون قطنی اللہ الصمد میں اللہ سے پہلے بڑھا کر احدن اللہ الصمد پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟۔زید کا قول ہے نون قطنی بڑھا کر احدن اللہ الصمد پڑھنا صحیح نہیں ہے کہ احد پر وقف مطلق پر ہے، وقف مطلق پر وقف نہ کرنا اپنی جدت ہے، قرائے سابقہ کے خلاف۔

سوال چہارم: سورۂ لہب میں تب کی ب مشدد ہے، وتب کو اس طرح پڑھنا کہ ب دو بار ادا ہو ضروری ہے یا نہیں؟ بعض حفاظ اس طرح پڑھتے ہیں کہ وتب پر وقف نہیں کرتے بلکہ وتب کی ب دو مرتبہ پڑھتے ہیں، ایک بار وتب کے ساتھ، دوسری ب ما اغنیٰ عنہ کے ساتھ، یعنی وتبّ ما اغنیٰ عنہ اس طرح پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟۔بینوا وتوجروا

المستفتی،فقیر محمد عمران قادری رضوی مصطفوی غفرلہ ربہ محلّہ منیر خاں پیلی بھیت شریف

۹ محرم الحرام ۱۳۷۶ھ

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

(۱) جب کلام تام نہ ہو اور کلمات کے درمیان معنوی تعلق بھی ہو اور لفظ کے اعتبار سے بھی ایسا تعلق ہو کہ ایک کلمہ مبتدا ہو اور دوسرا خبر ہو۔ یا ایک معطوف علیہ ہو دوسرا معطوف ہو۔ یا ایک موصوف ہو دوسرا صفت ہو۔ یا ایک مضاف ہو دوسرا مضاف الیہ ہو۔ یا ایک رافع ہو دوسرا مرفوع ہو۔ یا ایک ناصب ہو اور دوسرا منصوب ہو۔ یا ایک ذوالحال ہو دوسرا حال ہو۔ یا ایک مستثنیٰ ہو دوسرا مستثنیٰ منہ ہو۔ یا ایک مفسر ہو دوسرا مفسِر ہو۔ یا ایک ممیز ہو دوسرا تمیز ہو۔ یا ایک موصول ہو دوسرا صلہ ہو۔ یا ایک شرط ہو دوسرا جزا ہو۔ یا ایک عامل ہو دوسرا معمول ہو۔ یا اور لفظی تعلقات ہوں تو ایسے کلمات کے درمیان باختیار وقف نہ کیا جائے۔ اور اگر بحالت اضطرار ان کے درمیان سانس ہی ٹوٹ گیا یا کھانسی آگئی۔ یا سہو ہو گیا اور ان مجبوریوں کی بنا پر وقف کرنا پڑ گیا۔ تو جس کلمہ پر وقف کیا ہے اس کو دوہرایا جائیگا۔ یعنی پھر اسی سے سانس کی ابتدا کرنی ضروری ہے۔

چنانچہ علامہ علی قاری منح فکریہ شرح جزریہ میں فرماتے ہیں:

وکذا لووقف علی المضاف دون المضاف الیہ والصفة دون الموصوف والرافع دون المرفوع والناصب دون المنصوب والمنصوب دون الناصب وکذا الوقف علی المعطوف دون المعطوف علیہ وعلی ان واخواتها دون اسمها واسمها دون خبرها وعلی کان واخواتها دون اسمها واسمها دون خبرها وعلی ظننت واخواتها دون منصوباتها وعلی صاحب الحال دونها وعلی المستثنیٰ منہ دون الاستثناء وعلی المفسر دون المفسر وعلی الذی وما ومن دون صلاتهن وعلی صلاتهن دون معمولاتهن وعلی الفعل دون مصدره والتہ وعلی حرف الاستفهام دون ما استفهم بها عنہ وعلی حروف الشرط دون المشروط وعلی المشروط دون الجزاء وعلی الامر دون جوابہ الا ان یکون القاری مضطرافانہ یجوز الوقف حال اضطرارہ کا نقطاع ونحوہ لکن اذاوقف یبتدئی من الکلمة التی وقف علیها۔ (منح فکریہ مصری صفحہ ۶۰)

تو سائل نے جن آیات کے متعلق سوال کیا ہے تو ان میں وقف نہ کلام تام پر ہوا نہ آیت پر۔ بلکہ وہ ایسے کلمات کے درمیان ہوا جن میں تعلق معنوی بھی ہے اور تعلق لفظی بھی ہے۔ تو جس کلمہ پر وقف ہو اسی کو دوہرایا جائیگا اور اسی سے ابتدا کی جائیگی۔ لیکن اگر قال الذین کفروا ربنا ارنا الذین اضلنا من الجن والانس سے نہ کی جائے کہ اس میں فعل و معمول فعل میں فصل ہو جائیگا۔ بلکہ الذین اضلنا سے

ابتدا کی جائے۔ اسی طرح "لو انزلنا هذا القرآن علی جبل لرأیته" پر سانس ٹوٹی تو علی جبل سے ابتدا نہ کی جائے کہ اس کے فعل اور معمول میں فصل ہو جائگا، بلکہ لرأیته سے ابتدا کی جائے۔ اسی طرح سورۂ بقرہ میں جب بالغیب پر سانس ٹوٹی تو ابتدا بالغیب سے نہ کریں بلکہ یومنون سے ابتدا کریں تا کہ فعل اور اس کے معمول میں فصل نہ ہو۔ بالجملہ ایسی تکرار کرنا اور دوہرانا متعلقات اتصال معنوی اور لفظی کے اظہار کے لئے ہے تو قرآن کریم میں ایسی تکرار نہ فقط جائز بلکہ حسن ہے بلکہ بعض مقامات میں تو واجب ہے۔ اسی منح فکریہ شرح جزریہ میں ہے:

ومن انقطع نفسه علی ذلك وجب علیه ان یرجع الی ما قبله ویصل الکلام بعضه ببعض فان لم یفعل اثم انما یستقیم فی الامثلة الاولیٰ واما فی الامثلة الثانیة فینبغی ان یعود فالعو داحمد۔

زید چونکہ مسائل قرأت سے ناواقف ہے تو اس کا قول نہ فقط غلط ہے بلکہ نہایت جہالت پر مبنی ہے۔ اس کو اتنی جرأت نہ کرنی چاہیے کہ اس کے قول سے امت کا غلطی پر مجتمع ہونا لازم ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) جب گول آیت پر لا ہو تو وہاں پر وقف کرنا جائز ہے اگرچہ اس پر وقف کا نہ کرنا ہی اولیٰ ہے جامع العلوم میں ہے (لا) "فالوجهان الوصل والوقف لکن الاول افضل" ہاں جب آیت لا پر سانس ٹوٹ جائے تو اس کو دہرائے نہیں بلکہ ابتداء اس کلمہ سے کرے جو بعد آیت کے ہے کہ حقیقۃً آیت ہی تو وقف کا محل ہے۔

منح فکریہ میں ہے:

ان رؤس الآی وغیرها فی حکم واحد من جهة تعلق ما بعده بما قبله وعدم تعلقه ولذا جعلوا رمزلا ونحوه فوق الفواصل کما کتبوها فوق غیرها مع اتفاقهم علی جواز الابتداء بعد رؤس الآی۔

لہٰذا زید کا قول غلط ہے۔ خود حدیث شریف میں ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے آیت لا پر وقف کیا اور ابتدا ما بعد آیت کے کلمہ سے کی۔

کان النبی ﷺ اذا قرأ آیة فیقول بسم الله الرحمٰن الرحیم ثم یقف الحمد لله رب

العلمیں ۔ثم یقف الرحمٰن الرحیم ثم یقف مالك یوم الدین ثم یقف الح (رواہ ام سلمہ رضی اللہ عنہما) (منح فکریہ صفحہ ۵۹)

تو اس حدیث شریف سے ثابت ہوگیا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے العلمیں پر وقف کیا پھر الرحمٰن سے ابتدا کی اور الرحیم پر وقف کیا تو یہ دونوں آیات لا کی ہیں تو اس حدیث شریف سے ثابت ہوگیا کہ حضور نے آیت لا پر وقف کیا اور مابعد آیت کے کلمہ سے ابتدا فرمائی۔ تو زید کا قول حدیث شریف کے خلاف ہوا۔ اور فعل شارع علیہ السلام کے مخالف ثابت ہوا تو زید کو ایسی دلیری پر توبہ واستغفار کرنی چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۳) جس کلمہ پر تنوین ہو اور اس کے بعد معرف باللام کلمہ ہو تو ان میں وصل کا یہ طریقہ ہے کہ ہمزہ کی حرکت نقل کر کے ماقبل کو دی جائیگی۔ اور جب پہلے کلمہ کے آخر میں تنوین تھی اور تنوین نون ساکن ہوتا ہے اور ساکن کو حرکت صرف کسرہ ہی دیا جاتا ہے تو خفی قلم سے نون کو لکھ کر اس کے نیچے کسرہ دیدیا جاتا ہے جیسے سورہ شعراء میں ہے کذبت عادُن المرسلین اور سورہ النجم میں ہے اہلك عاد ن الاولیٰ۔ ان آیات معرف باللام المرسلین اور الاولیٰ کی ہمزہ کی حرکت نقل کر کے عاد کی تنوین یعنی نون ساکن کو کسرہ دیا گیا۔

چنانچہ سراج القاری شرح قصیدہ شاطبی میں ہے " ان ابن کثیر وابن عامر والکوفیین یقرؤن فی الوصل عاد نِ الاولیٰ " بکسر التنوین وسکون اللام وبعدها همزة مضمومة۔

لہٰذا یہی قاعدہ قل ھو اللہ احد نِ اللہ الصمد میں ہے کہ احد پر تنوین ہے اور اس کے بعد لفظ اللہ معرف باللام ہے تو ہمزہ کی حرکت نون ساکن کو بصورت کسرہ دی۔ یہ جب ہے کہ احد اور اللہ کے درمیان وصل مقصود ہو اگرچہ احد پر آیت ہے اور اس پر (ج) ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اس پر وقف ووصل دونوں جائز ہیں۔

حضرت مفتی عنایت صاحب البیان الجزیل میں فرماتے ہیں۔ ج علامت جائز کی ہے وہاں ٹھہرنا نہ ٹھہرنا برابر ہے۔ تو جب اس میں وصل بھی جائز ہے تو قل ھو اللہ احد نِ اللہ الصمد پڑھنا بھی بلاشبہ جائز ثابت ہوا۔ تو زید کا اس کو صحیح نہ کہنا بھی غلط ہے۔ اور احد پر آیت مطلق کہنا بھی غلط ہے اس کو چاہئے کہ وہ اپنی غلط بات سے رجوع کرے اور قول حق کو قبول کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۴) رسالہ وقف میں یہ قاعدہ موجود ہے۔ " اگر حرف موقوف علیہ مشدد ہو خواہ حرف علت

ہو یا حرف صحیح تشدید پر وقف کیا جائیگا تشدید میں کسی قسم کا نقصان نہ ہوگا۔ پس اگر مفتوح ہے تو سکون محض ہوگا جیسے تب۔ فاتھن۔ التی۔ صواف''۔ تو اس سے ثابت ہوگیا کہ تب کی ب کو مشدد پڑھا جائیگا اور اس پر وقف ہی کیا جائگا۔ کہ اس کے بعد آیت مطلق ہے تو اس کے مابعد سے وصل نہیں کر سکتے اور جب اس پر وقف ہے تو اس پر زبر نہیں پڑھ سکتے بلکہ اس پر وہی وقف کا سکون ہوگا۔ تو بعض حفاظ کا اس کے خلاف پڑھنا خلاف قاعدۂ قرات ہے جس کے غلط ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۶ صفر المظفر ۱۳۷۶ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۷۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین حسب ذیل مسئلہ میں اللہ تعالیٰ اجر عظیم عطا فرمائے کچھ لوگ و لا الضالین کو و لا الظالین بالقصد پڑھتے ہیں اور منع کرنے پر نہیں مانتے، کہتے ہیں یہی صحیح ہے۔ استدعا ہے کہ اس میں چند باتوں کا اظہار فرمایا جاوے۔

اول: ض وظ کا بطریق تجوید صحیح پڑھنے کا طریقہ کیا ہے اور و لا الظالین کے معنی کیا ہیں مفسد نماز ہے یا نہیں؟ اور تبدیل حرف کر کے قصدا پڑھنے والا کیسا ہے اور جوابات مدلل تحریر فرمائے جائیں دوسرے کتب عربیہ شریف کا اردو ترجمہ فرمایا جائے۔

شرح فقہ اکبر ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (ص ۱۵۳) میں فرماتے ہیں :

''وفی المحیط سئل الامام الفضلی عمن یقرأ الظاء المعجمة مکان الضاد المعجمة او یقرأ اصحاب الجنة مکان اصحاب النارا وعلی انعکس فقال لا تجوز امامته ولو تعمد یکفر قلت اما کون تعمده کفراً فلا کلام فیه اذالم یکن فیه لغتان ففی ضنین الخلاف سامی اما تبدیل الظاء مکان الضاد ففیه تفصیل و کذا تبدیل اصحاب الجنة فی موضع اصحاب النار وعکسه ففیه خلاف وبحث طویل''

محیط میں ہے: امام فضلی سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو ضاد کی جگہ ظاء معجمہ پڑھتا

ہے اور اصحاب النار کی جگہ اصحاب الجنۃ یا اس کے خلاف الٹا پڑھتا ہے تو فرمایا اس کی امامت جائز نہیں اور اگر قصداً پڑھا تو کافر ہو گیا۔ میں کہتا ہوں قصداً پڑھنے والے کے کفر میں تو خلاف ہی نہیں جب اس میں دو لغت نہ ہوں تو ضنین میں اختلاف ہے لیکن ضاد کی جگہ ظا کا بدل دینا تو اس میں بھی تفصیل ہے اسی طرح اصحاب النار کی جگہ اصحاب الجنۃ یا اس کے خلاف بدل دینے میں اختلاف ہے اور لمبی بحث ہے

" خزینة الاسرار الکبری صفحه ۲۵ لو قرء الظاء مکان الضاد باعتماد راس اللسان الی الاطراف الثنایا العلیا او الضاد مکان الظاء باعتماد حافة اللسان الی الاضراس "اگر ضاد کی جگہ ظا نوک زبان ثنایا علیا کے کنارے پر رکھ کر پڑھی یا ظا کی جگہ ضاد زبان کی کروٹیں داڑھوں پر لگا کر پڑھا۔ یہی صفحہ دوسری جگہ " لا تجوز الصلاۃ بدون التجوید "تو نماز جائز نہیں بہ سبب خلاف تجوید کے۔

تفسیر حقانی جلد آٹھ صفحہ ۵۴ کے حاشیہ میں فرماتے ہیں: صاحب کشاف کہتے ہیں:" واتقان الفصل بین الظاء والضاد واجب الخ " کہ ان دونوں حرفوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔

''ض'' اور ''ظ'' میں اکثر عجم فرق نہیں کرتے حالانکہ ان کے مخرج جدا جدا ہیں۔ 'ظ' کنارے زبان اور اگلے دانتوں کی جڑ سے نکلتی ہے اور 'ضاد' دائیں یا بائیں ڈاڑھ سے اور زبان کی جڑ سے۔ ایک کی جگہ دوسرا پڑھنا ایسا ہے کہ جیسا دال کی جگہ جیم اور ث کی جگہ شین۔ اس میں مولینا عبدالحق صاحب نے صاف تبدیل حروف لکھا ہے۔

المستفتی، محمد عبداللہ نعیمی رضوی کھیری محلہ بیدہ پور یوم دوشنبہ عید الفطر ۷۱۳ھ

الجواب

اللھم ھدایة الحق والصواب

زبان کی داہنی یا بائیں کروٹ جب بالائی داڑھوں سے متصل ہو یہ تو مخرج ضاد ہے اور ض کے ادا کرتے وقت زبان کی کروٹ کا تالو کی طرف اٹھنا۔ اور مخرج پر قوی اعتماد کرنا۔ اور مخرج لام تک استطالت کرنا ضروری ہے۔ نیز اس کے ادا کے وقت یہ بھی ضروری ہے کہ زبان اگلے دانتوں پر ہرگز نہ لگے اور نوک زبان سے کام نہ لیا جائے۔ اور شان شدت پیدا نہ ہو جائے۔ اور اس کے اطباق میں کوئی کمی اور قصور نہ ہونے پائے۔ اور زبان کی نوک جب ثنایا علیا کے کنارے سے متصل ہو جائے تو مخرج ظ ہے۔ اس کے ادا کرتے وقت صرف نوک زبان سے کام لینا اور نوک زبان کا ثنایا علیا کے کنارے پر لگنا۔ اور

اس کا زبان کی کروٹ اور تالو سے بے تعلق ہونا اور استطالت سے دور رکھنا ضروری ہے تو یہ بطرق تجوید ظ کے صحیح پڑھنے کا طریقہ ہے۔ پھر قرآن میں بالعمد تبدیل حرف کر دینے۔ اور بالقصد ضاد کو ظا پڑھنے سے نماز فاسد ہو جائیگی۔

ردالمحتار میں ہے "وان تعمد ذلك تفسد" یعنی اگر بالقصد تبدیل حرف کی تو نماز فاسد ہو جائیگی۔ کبیری میں ہے "قرء الظاء المعجمة مكان الضاد المعجمة او على القلب مثال المظغوب مكان المغضوب وظعف الحياة مكان ضعف الحيوٰة تفسد صلاته وعلى القول بالفساد اكثر الائمة" یعنی اگر ضاد کی جگہ ظا پڑھی یا ظا کی جگہ ضاد پڑھا جیسے مغضوب کی جگہ مغظوب پڑھا اور ضعف الحیٰوۃ کی جگہ ظعف الحیاۃ پڑھا تو نماز تو اس کی فاسد ہو جائیگی اور اکثر ائمہ اسی حکم فساد کے قائل ہیں۔

اسی کبیری میں ہے "وليسا فى القرآن غير المغضوب بالضاء والذال المعجمتين تفسد اذ ليسا لهما معنىٰ"

یعنی قرآن میں غیر المغضوب ظا اور ذال سے نہیں، اس سے نماز فاسد ہو جائیگی کہ ان کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔

فتاوی قاضی خاں میں ہے "ولو قرأ والعاديات ظبحا بالظاء تفسد صلاته وكذا ولسوف يعطيك ربك فترضى قرأ فترظى بالظاء تفسد صلاته وكذا لو قرأ غير المغضوب بالظاء او بالذال تفسد صلاته"

یعنی اگر والعادیات ظبحا ظاء سے پڑھا تو اس کی نماز فاسد ہوگئی۔ اور ولسوف يعطيك ربك فترضى میں فترظی ظا سے پڑھا تو اس کی نماز فاسد ہوگئی۔ اور اسی طرح اگر غیر المغضوب کو ظا یا ذال سے پڑھا تو اس کی نماز فاسد ہو جائیگی۔ پھر جس نے بالقصد تبدیل حرف کی اور عمداً ضاد کو ظا سے بدلا تو وہ کافر ہو جائیگا۔ چنانچہ محیط کی عبارت سوال میں فقہ اکبر سے منقول ہے۔

نیز فتاوی عالمگیری میں ہے "سئل الامام الفضلى عمن يقرأ الزاء مقام الضاد او قرأ اصحاب الجنة مقام اصحاب النار قال لا تجوز امامته ولو تعمد يكفر"

یعنی امام فضلی سے سوال کیا گیا کہ جس نے زاء کو ضاد کی جگہ پڑھا یا اصحاب النار کی جگہ اصحاب الجنۃ پڑھا تو فرمایا اس کی امامت جائز نہیں اور اگر عمداً ایسا کیا تو وہ کافر ہو گیا۔ تو ان کثیر عبارات سے یہ

ثابت ہوگیا کہ حرف کا قصداً بدلنا نماز کو فاسد کردیتا ہے اور عمداً بدلنے والا کافر ہوجاتا ہے۔ تو جس نے عمداً بالقصد ضاد کو ظاء سے بدلا۔ اور اس پر یہ ڈھٹائی کہ منع کرنے پر بھی اس نے نہیں مانا۔ یہاں تک کہ اس بدلے ہوئے کو ہی صحیح جانا تو بلاشک اس کی نماز فاسد ہوجائیگی بلکہ اس کی نماز تو غیر المغضوب ہی پر فاسد ہوجائیگی۔ اب وہ ولا الظالین تو نماز سے باہر ہوکر پڑھیگا پھر جب وہ اس قدر دلیر ہے کہ منع کرنے پر بھی باز نہیں آتا۔ اور غلط کو صحیح جانتا ہے تو وہ کافر بھی ہوگیا اس پر توبہ واستغفار واجب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ۱۴ ذیقعدہ ۷۷ ۱۳ھ

استفتاء

(۲۷۱)

احمدہ واصلی علی حبیبہ الکریم علیہ الصلوۃ التسلیم۔

کیا ارشاد فرماتے ہیں حضرات حاکمان شریعت مطہرہ مندرجہ مسئلہ میں کہ

ان آیات میں الف تثنیہ ظاہر کر کے پڑھنا چاہیے یا حذف کر کے؟ برتقدیر اول خلاف قواعد کا لزوم عارض" بینوا بالدلیل مع حوالۃ الکتب المعتبرۃ اللتی کانت الحجۃ للموافق وللمخالف خصوصا۔

آیات یہ ہیں:

(۱) فلما ذا قا الشجرہ۔ سورہ اعراف ح ۸ ع ۴۔

(۲) دعوا اللہ۔ سورہ اعراف ح ۹ ع ۲۴۔

(۳) واستبقا الباب۔ سورۃ یوسف ح ۱۴ ع ۳۔

(۴) وقالا الحمد للہ۔ سورہ نمل ح ۱۹ ع ۲۔

ہندوستان میں اکثر جگہ حذف کر کے پڑھتے ہیں بیرون ہند کا حال معلوم نہیں ہاں بعض حافظ الف ظاہر کر کے پڑھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اعلحضرت رضی اللہ تعالی عنہ کے وقت میں بھی ہم لوگ الف ظاہر کر کے پڑھتے تھے اور حضرت نے منع وانکار نہ فرمایا کہ کس طرح پڑھنا چاہیے۔ مفصل ومدلل فتوے ارقام فرما کر تسلی خاطر فاتر فرمائیں۔ ایک عالم کا فتوی بھی نقل کر کے ملاحظہ کیلئے نقل کر رہا ہوں، اگر اس میں کچھ خامی ہو تو اس کو واضح فرمادیں۔

مسئلہ (۲۷۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارے میں کہ

آیت کریمہ ''فلما ذا قاالشجرۃ'' کے پڑھنے کا کیا طریقہ ہے، یعنی جب ''ذاقا کوالشجرۃ'' کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو ذاقا کا الف پڑھا جائے گا یا نہیں؟۔ زید یہ کہتا ہے۔ کہ اس میں الف پڑھنا ضروری ہے۔ اور ترک کرنا غلط۔ اسلئے کہ تثنیہ کا صیغہ ہے۔ اگر الف ترک کیا جائے گا تو واحد کا صیغہ ہو جائیگا اور معنی بدل جائے گا، تو کیا زید کا قول اور استدلال صحیح ہے۔ اسی طرح واستبقاالباب۔ قالا الحمد للہ اور دعوااللہ میں تثنیہ کا الف پڑھا جائیگا یا نہیں؟۔

الجواب

اللھم ھدایۃ الحق والصواب

قاعدہ ہے کہ جب دو ساکن دو کلموں میں جمع ہوں اور دوسرا حرف مشدد ہو اور پہلا حرف مدہ ہو تو اول کو حذف کر دیتے ہیں جیسے ''یخشی اللہ، دعواللہ، دعی اللہ'' البتہ اگر ایک کلمہ میں ایسی صورت ہو تو حذف نہیں کرتے ہیں۔ جیسے ضالین، حاج، وغیرہ۔ نیز جب دوسرا ساکن وحرف مشدد نہ ہو اور پہلا حرف مدہ ہو تو اس صورت میں بھی ساکن اول حذف کیا جاتا ہے، جیسے ''فی الاخرۃ، علی الھدی۔ الی اللہ'' وغیرہ میں حروف علت حذف کر دیئے گئے ہیں۔

علم الصیغہ میں ہے: اجتماع ساکنین کہ دراں ساکن اول مدہ باشد وساکن دوم حرف مشدد اگر در یک کلمہ باشد جائز است ومدہ را حذف نہ کنند چوں ضالین واتحاجونی واین راجتماع ساکنین علی حدہ می گویند واگر در دو کلمہ باشند اول را کہ مدہ ست حذف کنند چوں ''یخشی اللہ، دعوللہ، ادعی اللہ۔

نیز اسی میں ہے: چین اجتماع ساکنین اگر اول مدہ باشد آں را حذف کنند۔

زبدہ میں ہے: ہر جا کہ اجتماع ساکنین شود اگر اول حرف مدہ زائدہ یا غیر مدہ باشد ودوم مدغم باشد در یک کلمہ حذف نہ کنند وایں اجتماع ساکنین روا باشد ''دابۃ، خواصہ'' ہمچنیں درحال وقف چوں زید وعمر، واگر نہ مدہ حذف کردہ شود۔ اغزو الحید وقولی الحق۔ لہذا قواعد مذکورہ بالا کے مطابق الف تثنیہ گرا دیا جائے گا اور الف کے ساتھ پڑھنا خلاف قاعدہ ہوگا اور زید کا استدلال قواعد فن سے ناواقفی پر مبنی ہے، مقام تعلیل میں التباس کا لحاظ نہیں ہوتا۔

صاحب علم الصیغہ فرماتے ہیں: وحدیث التباس سخنے است کہ طفلان را بآں فریب تواں داد ورنہ

از التباس تا کجا خواہند گریخت، ہزار جا التباس بسبب اعلال گردیدہ است مثلاً تدعین واحد مونث حاضر بسبب اعلال با جمع مونث حاضر ملتبس شدہ و در جمیع ابواب ناقص مکسور العین و مفتوح العین چہ مجرد و چہ مزید این التباس موجودست۔

اور اگر اسی طرح التباس کا لحاظ ہے تو ان چار مقامات کی کیا تخصیص ہے، قرآن کریم میں ایسے التباس بہت سی جگہ لازم آتے ہیں۔ مثلاً جمع متکلم کا التباس جمع مونث غائب کیساتھ حسب ذیل آیات میں:

(۱) ولقد خلقنا الانسان فی اجسن تقویم۔

(۲) وقد فصلنا الآیا ت لقوم یعلمون۔

(۳) ووصینا الانسان بوالدیه۔

(۴) ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا ہ۔

اور جمع مذکر حاضر کا التباس واحد مذکر حاضر کیساتھ حسب ذیل آیات میں:

قل ادعو الذین زعمتم من دون اللہ فا دعو اللہ مخلصین۔

اور جمع مذکر حاضر کا التباس واحد مذکر غائب کے ساتھ یا واحد مونث غائب کے ساتھ اس آیت میں:

ولا تسبوا الذین ید عون من دون اللہ ۔

اور جمع مذکر غائب کیساتھ اس آیت میں:

فیسبو اللہ عدوا بغیر علم۔

تو کیا ان آیات میں الف جمع اور واو جمع اور واحد مذکر ظاہر کر کے پڑھے جائنگے ؟ ہرگز نہیں، بلکہ الف جمع متکلم اور واو جمع مذکر حذف کر کے پڑھتے ہیں اور التباس کا لحاظ نہیں رکھتے۔

بالجملہ صورت مسئولہ میں الف تثنیہ حذف کر کے پڑھنا ہی مقتضائے قواعد ہے اور الف کا ظاہر کرنا قواعد کے خلاف۔ نیز زید الف ظاہر کرنے کی جو وجہ ذکر کی وہ دعو اللہ میں پائی نہیں جاتی کہ اس میں الف تثنیہ حذف کرنے سے واحد کیساتھ التباس نہیں ہوتا کہ واحد دعا ہے تو اسکا استدلال یوں بھی ناقص ہے واللہ تعالی اعلم انتہی بالفاظہ۔

المستفتی محمد احمد المدعو بہ جہانگیر غفر لہ القدیر متعلم مدرسہ مظہر اسلام بریلی اعظمی مولد ارضوی مسلکا

جواب صحیح ہے:

اور تفصیل مقام یہ ہے کہ ان کلمات آیات میں۔ ذاقا ۔دعوا۔ استبقا ۔قالا۔ میں حرف اخیر الف تثنیہ ہے اور الف حرف مدہ ہے جو ہمیشہ ساکن رہتا ہے۔

منح فکریہ شرح جزریہ میں ہے: حروف المدثلا ثة الا لف ولا تکو ن الا ساکنة"

اور یہ الف معرف باللام کلمات سے ملا اور لام تعریف بھی ساکن ہے تو یہ اجتماع ساکنین ہوگیا۔ اور جواز اجتماع ساکنین کی ایک صورت تو وقف ہے۔

منح فکریہ میں ہے: الوقف یجو زفیه التقاء الساکنین مطلقا۔

سراج القاری شرح اشعار شاطبی میں ہے: ان التقاء الساکنین یغتفرفی الوقف۔

اور یہ ظاہر ہے کہ آیات کے یہ کلمات مقام وصل میں ہیں نہ کہ مقام وقف میں۔ دوسری صورت مدلازم ہے، اور یہ مدان کلمات پر ہوتا ہے جن میں حروف مد کے بعد کوئی حرف ساکن ہو، اب وہ مدمدغم ہو، جیسے ضالین ،دابۃ میں، یامدمظہر ہو جیسے، جیسے ص ،ق ،حروف مقطعات میں، اور الآن و آلله میں۔

جزری میں ہے:

فلازم ان جاء بعد حرف مد ساکن حالین وبالطول یمد

علامہ علی قاری منح فکریہ میں فرماتے ہیں:

ذهب الجمهو ر الی التسویة بین مد المد غم والمظهر فی ذلك كله اذا الموجب للمد هو التقاء الساکنین والتقاؤ هما مو جود فی كل لا حاجة للتفصیل فی ذلك كله هذا هو التحقیق۔

ان آیات میں الف تثنیہ حرف مدبھی ہے اور اسکے بعد حرف ساکن لام تعریف بھی ہے، لیکن یہ ساکن نہ حرف مشدد ہے نہ حروف مقطعات میں سے کوئی حرف، تو ظاہر ہے کہ ان کلمات آیات میں نہ مدغم ہوا نہ مدمظہر۔ لہذا جواز اجتماع ساکنین کی یہی دوصورتیں وقف اور مدلازم ہیں اور یہ ہر دوصورت کلمات آیات میں متصور نہیں۔ تو اب ان میں الف تثنیہ کے ظاہر کر کے پڑھنے میں اجتماع ساکنین لازم آتا ہے۔ اور علاوہ ان دوصور کے اجتماع ساکنین ناجائز ہے۔

چنانچہ نوادرالوصول میں ہے۔ درغیر صور مذکورہ اجتماع ساکنین جائز نیست (نوادرص ۱۹۱)

لہذا اب مقام وصل میں اجتماع ساکنین سے بچنے کے لئے ان تین باتوں میں سے ایک بات ضروری ہے۔ یا تو ہر دو ساکنوں کو باقی رکھ کر مد کے ساتھ ادا کیا جائے۔ یا احد الساکنین کو حرکت دیجائے۔ یا ایک ساکن کو حذف کر دیا جائے۔

علامہ علی قاری منح فکریہ میں فرماتے ہیں: تقرر فی علم التصریف انه لا یجمع فی الوصل بین الساکنین فا ذا ادی الکلام الیه حرك او حذف او زید فی المد لیقد ر فحر کا۔

تو مد کا بیان تو ابھی گزرا کہ ان کلمات آیات پر مد نہیں کر سکتے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مد میں گویا اجتماع ساکنین ہی باقی نہیں رہتا۔

نوادر الوصول میں ہے: ہر دو جا گویا اجتماع ساکنین حقیقۃ نیست۔

منح فکریہ میں ہے:

مددن لان الساکنین تلا فیا فصارا کحریك كذا قال ذوالخبر

حرکت ایسے اجتماع ساکنین میں دی جاتی ہے جہاں پہلا ساکن مدہ نہ ہو، تو کہیں ساکن اول کو حرکت دیتے ہیں جیسے: انتم الفقراء، میں۔ کہیں ساکن دوم کو حرکت دیتے ہیں جیسے: ردو ذب، میں۔

شافیہ میں ہے: فان لم یکن (ای اول الساکن) مدة حرك نحو اذهب الا فی نحورد فحرك الثانی ملخصا۔ (ص ۱۵۸)

جامع العلوم میں ہے: وان لم یکن مدة حرك تحوا خشوالله۔

اور یہ ظاہر ہے کہ ان کلمات آیات میں حرکت بھی نہیں دی جا سکتی کہ ان میں ساکن اول حرف مدہ ہے۔ نیز ان میں ساکن اول الف ہے اور ساکن دوم لام تعریف ہے، اور یہ دونوں حرکت کو قبول نہیں کرتے۔

اب باقی رہا حذف تو یہ اس اجتماع ساکنین میں ہوتا ہے جن میں ساکن اول حرف مد ہو، تو اس میں ساکن اول ہی کو حذف کر دیا جاتا ہے۔

شافیہ میں ہے: فان کا ن غیر ذلك واولهما مدة حذفت نحو خف وقل۔

جامع العلوم میں ہے: فان کا ن (ای اول الساکن مدة حذفت سواء کان الساکنا ن فی کلمة او فی کلمتین مستقلتین مثل یخشو ن اغزوا الجیش۔

فصول اکبری اور اس کی شرح میں ہے: پس ساکن اول اگر مدہ است در یک کلمہ یا دو کلمہ

آں ساں رابیفگنند نحو قل وبع۔

حاشیہ شافیہ میں ہے: ویلتقی الساکنا ن المدة ولا التعریف فیجب حذف المدة۔

ان کلمات آیات میں بھی ساکن اول مدہ یعنی الف ہے اور ساکن دوم لام تعریف ہے۔ لہذا الف کا حذف واجب اور ضروری ہے۔

بعض نے حلقتا البطان میں الف تثنیہ کو ثابت رکھا تو یہ دلیل نہیں بن سکتا کہ یہ استعمال شاذ ہے۔

شافیہ میں ہے: وحلقتاالبطان شاذ۔

فصول اکبری اور اس کی شرح نوادر الوصول میں ہے:

وحلقتا البطا ن باثبات الف تثنیة وسکون لام در قولهم التقت حلقتا البطان شاذ، چہ کدام وجہ قیاسی در جواز آن یافتہ نمی شود۔ (نوادر ص ۱۹۰)

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ ان کلمات آیات میں الف تثنیہ کو حذف نہ کرنا اجتماع ساکنین علی حدہ کرتا ہے جو ناجائز ہے، بلکہ یہ ظن جلی ہے جو عند القراء ممنوع ہے۔ تو اب الف تثنیہ کو ثابت رکھنا نہ قواعد صرف کے موافق، نہ اصول تجوید کے مطابق۔ مخالف کو الف تثنیہ کی قرآن کریم میں صرف یہ چار مثالیں ملیں۔ ہم دس مثالیں اور پیش کرتے ہیں.

(۱) فازلهما الشیطن۔ (سورہ بقرہ ع ۴)

(۲) فوسوس لهما الشیطان۔

(۳) عن تلکما الشجرة۔ (اعراف ع ۴)

(۴) منهما اذکرنی۔ (یوسف ع ۵)

(۵) کلتا الجنتین۔ (کہف ع ۵)

(۶) من اتبعکما الغلبون۔ (قصص ع ۴)

(۷) واتینهما الکتب۔

(۸) وهدیناهما الصراط المستقیم۔ (والصّٰفّٰت ع ۴)

(۹) یخرج منهما اللؤلؤ۔ (الرحمٰن ع ۱)

(۱۰) قیل ادخلا النار (تحریم ع ۱)

ان سب آیات میں الف تثنیہ کو حذف کیا جاتا ہے، اور قرآن کریم میں اس کی کثیر مثالیں اور بھی ہیں۔ اور الف تثنیہ کی طرح جب معرف باللام کے ساتھ واو جمع ہو تو واو کو بھی حذف کیا جائیگا۔ قرآن کریم میں واو جمع کی مثالیں الف تثنیہ سے بہت زائد ہیں۔ صرف سورہ اعراف میں ہے:

اتخذ واالشیطین ع ۳۔

عملوا الصٰلحت۔ ع ۵۔

قالوا الحمد۔ ع ۵۔

ادخلوا الجنة۔ ع ۶۔

فعقروا الناقه۔ ع ۱۰۔

فا وفواالکیل۔ ع ۱۱۔

فا وفوا لکیل۔ ع ۱۱۔

ذروا الذین۔ ع ۲۲۔

ان سب آیات میں واو جمع کو حذف کر کے پڑھا جائے گا۔ حاصل جواب یہ ہے کہ الف تثنیہ اور واو جمع جب معرف باللام سے متصل ہو تو ہر دو کا حذف ضروری ہے اور انکا ثابت رکھ کر پڑھنا ناجائز وممنوع ہے۔ مولیٰ تعالی قبول حق کی توفیق دے واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبه: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۷۳)

حضرات علمائے کرام وقرائے عظام کیا فرماتے ہیں کہ

''ولا الضالین'' کو مخرج بالدال سے ''دالین'' یا ''دوالین'' پر کے ساتھ یا ''ظالین'' یا ''زالین'' یا ''ذالین'' پڑھنا چاہئے؟۔ اس کا صحیح مخرج کیا ہے؟۔ ''ض'' کس کے مشابہ ہے؟ کیا اختلاف ہے؟ ترجیح کس کو ہے؟ کن صورتوں میں نماز فاسد ہوتی ہے کن صورتوں میں نہیں؟۔ مفصل تحریر فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

سید اطہر حسن موضع مرزا پور چوہاری ضلع پرتاپ گڑھ

xxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxx

الجواب

اللھم ھدایة الحق والصواب

ضاد۔ کا مخرج زبان کی بائیں جانب جب بالائی داڑھوں سے متصل ہو کر دراز ہو یہ آسان ہے۔ یا داہنی جانب سے اس طرح یہ دشوار ہے۔ شرح جزری میں ہے:

تخرج الضاد من طرف اللسان مستطیلة الی مایلی الاضراس من الجانب الایسر وھو الایسر والاکثر ومن الایمن وھو الیسیر العسیر۔

اور دال، ذال، ظا، زا، کے مخارج جدا جدا ہیں۔ تو ضاد کو ان میں سے کسی مخرج سے نکالنا سخت غلطی اور تحریف القرآن ہے۔ ضاد۔ بقول بعض مشابہ بہ ظا ہے۔ لیکن مشابہت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ضاد کو عین ظا پڑھا جائے اور ان کے تغائر وضعی تباین صوت طبعی اور امتیاز صفت خاص اور مخصوص کیفیات ادا سب کو میٹ دیا جائے اور ''ضاد'' کو بالکل ہم آواز ''ظا'' پڑھا جائے جیسا کہ اب چند منحوس زمانہ کی عادت ہے بلکہ جب ضاد کو اس کے مخرج اور تمام صفات کی رعایت کے ساتھ ادا کیا جائے گا تو اس کی۔ دال، ذال، ظا، زا، کی آوازوں سے ممتاز آواز ہے۔ ''کما حققناہ فی فتاوانا الاجملیہ'' اب باقی رہا اس کا حکم تو اگر یہ بدلنا جان بوجھ کر بقصد اختیار ہے تو کفر ہے۔

چنانچہ علی قاری شرح فقہ اکبر میں محیط سے ناقل ہیں:" سئل الامام الفضلی عمن یقرء الظاء المعجمة مکان الضاد المعجمة او علی العکس فقال لا تجوز امامته ولو تعمد یکفر۔

(شرح فقہ اکبر مصری ص ۴۵۳)

امام فضلی سے اس شخص کا حکم دریافت کیا گیا جو ضاد کی جگہ، ظا، یا ، ظ، کی جگہ، ضاد، پڑھتا ہے فرمایا اس کی امامت جائز نہیں اور اگر قصداً پڑھا تو کافر ہو جائے گا۔

اور اگر ناواقفی سے ہو بالقصد نہ ہو یا بر بنائے لغزش ہو تو جہاں معنی متغیر ہو جائیں گے نماز فاسد ہو جائے گی ورنہ نہیں۔

چنانچہ یہی علامہ علی قاری فتاوی قاضی خاں سے ناقل ہیں:

ان قرء غیر المغضوب بظاء المعجمة وبالدال تفسد صلاته ولا الضالین بالظاء المعجمة والدال النھملة لا تفسد ولو بالذال المعجمة تفسد۔

(منح فکریہ شرح جزریہ مصری ص ۴۳)

غیر المغضوب کو ظ یا دال سے پڑھا تو نماز فاسد ہوگئی اور ولا الضالین کو ظ یا دال سے پڑھا تو نماز فاسد نہ ہوگی اور اگر ذال سے پڑھا تو نماز فاسد ہوگئی۔ لھٰذا نماز تو غیر المغضوب ہی پر اگر اس کو ظ یا دال سے پڑھا فاسد ہوجائے گی ولا الضالین تو نماز کے باہر پڑھے گا۔

ھذا ملخص رسالتنا الذی صنفت فی تحقیق الضا د فمن اراد التحقیق فلیرجع الیھا فیجد فیھا ابحا ثاً نفیسة" واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

۱۵/ جمادی الآخرہ ۱۳۷۹ھ

مسئلہ (۲۷۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین کہ

صاحب فوائد مکیہ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت امام عاصم کوفی علیہ الرحمۃ بین السورتین تسمیہ پڑھتے ہیں تو اس لحاظ سے جس سورۃ کو قاری بلا تسمیہ پڑھیگا وہ سورت امام کے نزدیک ناقص ہوگی۔

و عن ابی خزیمة ان رسو ل اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و سلم قرأ بسم اللہ الرحمن الرحیم فی او ل الفاتحة فی الصلوة و عدھا آیة ایضا، الح۔

پھر علامہ جزری فرماتے ہیں: کہ بسم اللہ اس کو پڑھنا چاہئے۔ چنانچہ باسناد اسحاق نقل کرتے ہیں، ہم سورہ فاتحہ اور ہر سورۃ کے شروع پر ہر حالت و خارج از صلوۃ قرآن سناتے ہوں خواہ نماز میں بسم اللہ پڑھا ہی کرتے تھے، اور قرا مدینہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

ان روایات سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ بین السورتین بسم اللہ نہ پڑھنے کا اختلاف ایسا ہے کہ جیسے اور اختلافات قرأت سبعہ کہ جس طرح انکا پڑھنا جائز ہے اسی طرح اس کا نہ پڑھنا بھی درست ہے۔ پس مبسملین کی روایت میں بسم اللہ بین السورتین جہرا پڑھنا چاہئے۔ کیونکہ فقہا کو اگر چہ اپنی ذاتی تحقیق اس مسئلہ میں کچھ ہی ہوتی تھی مگر روایت کے موقعہ پر آ کر اس مسئلہ کو مسئلہ فن قرائت ہوجانے کی وجہ سے وہ قراء ہی کا اتباع کرتے تھے۔ حضرت امام مالک علیہ الرحمۃ باوجود اس کے کہ انکے مذہب میں بسم اللہ ہر ہر سورۃ کا جز نہیں۔ مگر امام نافع سے مسئلہ پوچھ کر یوں ہی فرمایا کہ ہر علم کا مسئلہ اس کے اہل سے پوچھنا چاہیے، مدار علم قراءت نقل اور صحت روایت پر ہے، قیاس و عقل کو اس میں دخل ہی نہیں، اور علم فقہ

منصوصات و مجتہدات دونوں سے مرکب ہے۔ مسائل منصوصہ میں شارع علیہ السلام کے مجتہدات کسی اور کا اتباع نہیں اور ائمہ کی تقلید مسائل اجتہاد پر ہے۔

لہذا ہر مسئلہ قرائت میں نقل وصحت روایت کے علاوہ اور سند کی ضرورت مسئلہ قراءت کی سند فقہاء کے اقوال سے تلاش کرنا غلطی ہے بلکہ اس کی سند ائمہ قراءت سے دریافت کرنی چاہیے۔ پس تصحیح روایات کے بعد اس پر عمل کرنا چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو کچھ بین الدفتین ہو، رسم عثمانی اس کی متحمل ہو اور قواعد نحویہ کے موافق ہو، نقل متواترہ کے ساتھ ہم تک پہونچا ہو وہ قرآن ہے اور تسمیہ پر یہ باتیں صادق آتی ہیں، نیز باجماع مذاہب اربعہ ہر حال میں قرأت سبعہ کے ساتھ قرآن پڑھنا جائز ہے۔ اختلاف قراءت خواہ بحرکت ہوں یا بکلمہ یا تبدیل و زیادتی کلمہ خواہ ان میں سے کسی طرح کا اختلاف ہو سب جائز پھر تسمیہ کو خاص نماز میں ناجائز کہنا کس طرح قبول کیا جاسکتا ہے۔ جب تک کہ دلیل نقلی قرآن یا حدیث سے نہ ہو۔ کیوں کہ مبسملین و غیر مبسملین سب دلایل نقلیہ متواترہ رکھتے ہیں، باوجود ان تمامی امور کے کہیں امام اعظم قدس سرہ سے اسکی تصریح بھی نہیں آئی، کہ تمامی قراء کے اختلاف تمام قرآن میں پڑھنے جائز ہوں ۔ اور مبسملین کے قول کے موافق تسمیہ بین السورتین جائز نہ ہو۔ پھر یہ مسئلہ اجتہادی ہی نہیں، کیوں کہ منصوصات میں اجتہاد جائز ہی نہیں۔ اور ہم مسائل اجتہادیہ میں امام صاحب کے مقلد ہیں نہ کہ مسائل منصوصہ میں۔ لہذا فقہ میں تو مقلد ہیں کہ وہ مجتہد مطلق ہیں۔

اور مسائل قراءت میں ائمہ و راویان قرآن حکیم کے ہیں اور علم قراءت میں امام صاحب بھی راویان قرآن کے مقلد تھے و نیز علم قراءت میں شاگرد امام عاصم کے ہیں اور یہ بات کہیں ثابت نہیں ہوئی کہ امام صاحب نے قرآن کریم میں اجتہاد فرمایا ہے۔ کیونکہ سمعیات میں تو اجتہاد کی گنجائش ہی نہیں۔ اگر اجتہاد کی کہیں بھی گنجائش ہے تو جہاں سے ہے مبسملین کیلئے تسمیہ کی ممانعت مستنبط ہو بتائیں ورنہ احتمال اجتہاد اس مسئلہ میں محض بے سود ہے جو پزیرائی نہیں ہوسکتا ہے۔

پس جو لوگ بسم اللہ بالجہر تراویح میں پڑھنے کی بابت مبسملین کیلئے نزع کرتے ہیں وہ قرأت سبعہ کی حقیقت سے واقفیت نہیں رکھتے۔ لہذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ تراویح میں ہر سورۃ پر بسم اللہ پڑھنی چاہئے یا ایک سورۃ پر۔ نیز بالجہر یا بالسر اور سورۃ فاتحہ و دیگر سور پر بھی بالجہر یا بالسر پڑھے یا نہیں؟۔ اور کیا احکام و دلائل ہیں معہ حوالہ کتب جواب مرحمت فرمائیں۔

(۲) حرف ضاد معجمہ مشابہ بالدال ہے یا بالظاء اور جس وقت اس کو اس کے مخرج سے مع جمیع

صفات ادا کیا جائے تو اس کی صورت کسی حرف سے مشابہ ہوگی یا نہیں۔ اگر ہوگی تو کس حرف کے ساتھ نیز جو شخص اس کو صحیح ادا کرتا ہے تو اس کو عوام کے کہنے پر کسی اور حرف کیساتھ بدل کر پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ (دواد۔ذواد۔زواد۔ظاوغیرہ) دریں صورت عمداً غلط پڑھنے والا خاطی ومحرف کہلائے گا یا نہیں؟۔ نیز اس کی اقتدا درست ہوگی یا نہیں؟۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ''ضاد وظا'' میں فرق کرنا دشوار ہے۔ و هما متشابهان في الصوت و السمع۔

امام غزالی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: فرق درمیان ضاء وظا بجا آوردو اگر نتواند روا باشد۔

تفسیر عزیزی میں ہے: فرق درمیان ضاد وظا بسیار مشکل است خوانندگان ایں دیار ہر دورا یکساں می برانند نہ در مقام ضاد ظا میشود در مقام ضاد ظا۔

قاضی خاں میں ہے:

و لو قراء الظالين با لظا او با لذال لا تفسد صلوته و لو قرء الدالين تفسد۔

سوال کی صورت کو مدنظر رکھتے ہوئے مع دلائل کتب فقہیہ وتجوید سے جواب مفصل تحریر فرمایا جائے

المستفتی محمد حسن عثمانی قادری غفرلہ

الجواب

الحمد لله و كفى و الصلوة والسلام على من اصطفى و على آله و صحبه و على كل من اجتبى اما بعد۔

فہم جواب کیلئے چونکہ چند مقدمات پر اطلاع بہت ضروری ہے۔ لہٰذا پہلے ان مقدمات ہی کو پیش کیا جاتا ہے۔

مقدمہ اولیٰ: تمام اہل اسلام کے نزدیک بلاشک بسم اللہ شریف قرآن کریم کی ایک آیت ہے۔ سورتوں کے درمیان فصل اور علیحدگی کیلئے نازل ہوئی ہے یہی امام اعظم اور احناف کرام کا بھی مذہب ہے۔

درمختار میں ہے: و هی آية واحدة من القرآن كله انزلت للفصل بين السور۔

(درمختار ج ۱ ص ۳۴۴)

کبیری میں ہے: و انها من القرآن و به نقول انها آية منه نزلت للفصل بين السور و كتابتها بقلم عليحدة يويد ذالك۔ (کبیری مطبوعہ المطابع لکھنؤ ص ۳۰۰)

حجۃ الاسلام امام ابوبکر رازی احکام القرآن میں فرماتے ہیں:

لا خلاف بین المسلین ان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم من القران ۔

(احکام القرآن مصری ج ۱ ص ۶)

حاشیہ عبدالحکیم علی البیضاوی میں ہے: والصحیح ما ذھب الیہ المتاخرون انھا من القرآن انزلت للفصل بین السور ۔ (حاشیہ مطبوعہ لکھنو ص ۲۴)

اسی میں ہے: ان الاجماع انعقد علی ان ما ثبت بین الدفتین بالاتفاق من جمیع الصحابۃ فھو کلام اللہ قطعا والبسملۃ فی اوائل السور کذالک ۔

(حاشیہ مذکور ص ۲۵)

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ بالاجماع بسم اللہ کلام اللہ ہے اور قرآن کی ایک آیت ہے جو مابین سورتوں کے فصل کیلئے نازل ہوئی ۔ یہی اصحاب امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صحیح مذہب ہے اور یہی مسلمانوں کا اتفاقی مسئلہ ہے ۔

مقدمہ ثانیہ: تسمیہ آیت قرآنی تو ہے لیکن سورۃ فاتحہ یا اور سورتوں کا جز نہیں یعنی ان کی پہلی آیت نہیں ہے ۔ بلکہ وہ تسمیہ فاتحہ میں تو ابتداء کتاب اللہ کیلئے ہے اور سورتوں میں فصل کیلئے ہے ۔

غیث النفع فی القرأت السبع میں ہے:

ان البسملۃ لیست بآیۃ ولا بعض آیۃ من اول الفاتحۃ ولا من اول غیرھا وانما کتبت فی المصاحف للتیمن والتبرک او انھا فی اول الفاتحۃ لابتداء الکتاب علی عادۃ اللہ عزوجل فی ابتداء کتبہ وفی غیر الفاتحۃ للفصل بین السور ۔

درمختار میں ہے: لیست من الفاتحۃ ولا من کل سورۃ فی الاصح ۔

(ردالمحتار ج ۱ ص ۳۲۴)

کبیری میں ہے: بان من ھھنا مذھب الجمھور علی انھا لیست آیۃ من الفاتحۃ ولا من کل سورۃ ۔ (کبیری ص ۹۹)

احکام القرآن میں ہے: مذھب اصحابنا انھا لیست بآیۃ من اوائل السور لترک الجھر بھا ۔ (احکام القرآن مصری ج ۱ ص ۷)

ان عبارات میں جو مذکور ہے وہ حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ کا مذہب ہے ۔

امام شافعی کا مذہب ان کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ وہ تسمیہ کو سورہ فاتحہ اور ہر سورت کی پہلی آیت مانتے ہیں۔ ان کی دلیلیں یہ ہیں۔ حدیث شریف میں ہے جس کو دار قطنی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی:

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اذا قرأتم الحمد للہ فاقرءوا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم انھا ام القرآن و ام الکتاب و سبع مثانی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم احدی آیاتھا۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم الحمد شریف پڑھو تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی پڑھو، بیشک الحمد ام القرآن اور ام الکتاب اور سبع مثانی ہے، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس کی آیات میں سے ایک آیت ہے۔

اور ان کی دلیل اجماع امت سے یہ ہے جس کو علامہ حلبی نے نقل کیا ہے: لانھا اثبت فی المصحف باجماع الصحابۃ مع الامر بتجریدہ عما لیس القرآن۔

(کبیری ص ۲۹۹)

حنفیہ کی طرف سے ان ہر دو استدلالوں کے بہترین جواب دئے گئے۔ علامہ حلبی نے اس حدیث دار قطنی پر یہ جرح کی اور جواب دیا کہ:

انہ روی موقوفا و لو سلم صحتہ فغایتہ التعارض المورث للشبھۃ و لو سلم عدم التعارض فخبر الواحد غیر قاطع لشبھۃ والقرآن لا یثبت مع الشبھۃ لان طریقہ طریق الیقین لانہ اصل الدین و بہ تثبت الرسالۃ و اقامۃ الحجۃ علی الضلالۃ فلا یثبت کونھا آیۃ من السورۃ من السور بلا دلیل قطعی کما فی سائر الآیات۔

(کبیری ص ۳۰۰)

وہ حدیث موقوف روایت کی گئی اور اگر اس کی صحت مان لی جائے تو اس کی غایت تعارض احادیث ہے جو شبہ کو پیدا کرنے والا ہے اور اگر عدم تعارض بھی مان لیا جائے تو خبر واحد شبہ کیلئے غیر قاطع ہے اور قرآن شبہ کیساتھ ثابت نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لئے کہ اسکا طریقہ یقین کا طریقہ ہے کیونکہ یہی دین اسلام ہے اور اسی سے رسالت ثابت ہوئی اور ضلالت پر حجۃ قائم کی تو تسمیہ کا سورت میں سے کسی سورۃ کی آیت ہونا بغیر دلیل قطعی ثابت نہیں ہوسکتا ہے جیسا کہ اور آیات کا حکم ہے۔

اور علامہ حلبی نے اس دلیل کے مقابل اپنے دعوی پر اس حدیث کو پیش کیا جس کو صحیح مسلم وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی:

قا ل سمعت رسو ل اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یقو ل :قا ل اللہ قسمت الصلوۃ بینی و بین عبد ی نصفین ولعبدی ما سأ ل فاذا قا ل العبد الحمد للہ رب العالمین قا ل اللہ تعا لیٰ حمد نی عبد ی و اذا قا ل الر حمٰن الر حیم قا ل اللہ اثنی علی عبد ی و اذا قا ل ملك یو م الدین قا ل اللہ تعا لیٰ مجدنی عبدی واذاقال ایاك نعبد وایاك نستعین قال اللہ تعالی ھذا بینی و بین عبد ی و لعبد ی ما سأ ل واذا قا ل اھد نا الصرا ط المستقیم صراط الذ ین انعمت علیھم غیر المغضو ب علیھم ولا الضا لین قا ل اللہ تعا لیٰ ھذا لعبد ی ولعبدی ما سا ل ۔ (مسلم شریف مع شرح نووی ج ا ص ۱۶۹)

انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے نماز کو اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دیا اور میرے بندے کیلئے وہ ہے جو سوال کرے۔ تو جب بندہ کہتا ہے" الحمد للہ رب العالمین "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد کی۔ اور جب اس نے کہا "الر حمٰن الر حیم "تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثنا کی۔ اور جب اس نے کہا "مالك یو م الد ین" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری تمجید کی اور جب اس نے کہا "ایا ك نعبد و ایا ك نستعین" اللہ فرماتا ہے یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کیلئے وہ ہے جو سوال کرے۔ اور جب اس نے کہا "اھد نا الصرا ط المستقیم صرا ط الذ ین انعمت علیھم غیر المغضو ب علیھم ولا الضا لین" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے بندے کیلئے اور میرے بندے کیلئے وہ ہے جو سوال کرے۔

علامہ حلبی نے کبیری میں اس حدیث شریف سے اپنے مسلک کی تائید میں اس طرح استدلال کیا: و لا شك ان المرا د با لصلوۃ ھنا الفا تحۃ لا ن المقسو م بھا فسر فھو کقو لہ تعا لیٰ و لا تجھر بصلو تك ای بقراء تك فی الصلو ۃ فالبدا یۃ با لحمدللہ دلیل علی ان التسمیۃ لیست من الفا تحۃ و انھا سبع آ یا ت بد و نھا حیث جعل الوسطی و ھی ایا ك نعبد و ایا ك نستعین بینہ سبحنہ و بین عبد ہ و الثلث قبلھا لہ تعا لیٰ خا صہ و الثلث بعد ھا لعبد ہ فقط و اذا لم تکن آ یۃ من الفا تحۃ لم تکن آ یۃ من غیر ھا لعد م القا ئل بہ و لا شك ان ھذا

الحدیث اصح من روایۃ الدار قطنی ۔ (کبیری ص ۳۰۰)

اوراس امر میں کوئی شک نہیں کہ حدیث میں صلوۃ سے مراد سورۃ فاتحہ ہے۔اس لئے کہ جو چیز تقسیم ہوئی اسی نے یہ تفسیر کردی اوراس کا مثل "لا تجھر بصلوتك" میں لفظ صلوۃ ہے کہ جس میں قرأۃ فی الصلوۃ مراد ہے تو سورۃ فاتحہ کوالحمد للہ سے شروع کرنااس کی دلیل ہے کہ تسمیہ فاتحہ کی آیت نہیں اور فاتحہ کی بغیر تسمیہ کے سات آیات ہیں۔اس لئے کہ خدانے "ایاك نعبد و ایاك نستعین" کواپنے اوراپنے بندے کے درمیان آیت قراردیا۔اس سے پہلے کی تین آیات کواپنے لئے خاص کیااوراس کے بعد کی تین آیات کواپنے بندے کیلئے مختص کیا۔توجب تسمیہ فاتحہ کی آیت نہیں تو وہ اور سورتوں کی بھی آیت نہیں کہ اس کا کوئی قائل نہیں۔اوراس حدیث کی روایت دارقطنی سے زیادہ صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں۔

حضرت حجۃ الاسلام امام ابوبکر رازی تفسیر احکام القرآن میں اپنے مسلک کیلئے اس طرح استدلال کرتے ہیں:

و یدل ایضا علی انها لیست من اوائل السورۃ ما حدثنا محمد بن جعفر بن ابان قال حدثنا محمد بن ایوب قال حدثنا سعد و قال حدثنی یحی بن سعید عن شعبة عن قتادۃ عن عباس الجشمی عن ابی هریرۃ عن النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم قال: سورۃ فی القرآن ثلاثون آیة شفعت لصاحبها حتی غفرله تبارك الذی بیده الملك واتفق القراء وغیرهم انها ثلاثون آیة سوی بسم الله الرحمٰن الرحیم فلو كانت منها كانت احدی و ثلاثون آیة و ذلك خلاف قول النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم و یدل علیه ایضا اتفاق جمیع قراء وفقهاء هم علی ان سورۃ الكوثر ثلاث آیات و سورۃ الاخلاص اربع آیات فلو كانت منها لكانت اكثر ما عدوا ۔

(احکام القرآن مصری ج ۱ ص ۹)

اوراس پر کہ تسمیہ اوائل سور سے ہے یا نہیں یہ حدیث دلالت کرتی ہے جس کی ہمیں روایت کی محمد بن جعفر بن ابان نے انھوں نے کہا کہ ہمیں حدیث بیان کی محمد بن ابوایوب نے انہوں نے کہا کہ ہمیں حدیث بیان کی سعد نے انھوں نے کہا مجھے روایت بیان کی یحیی بن سعد نے وہ روایت کرتے ہین شعبہ سے وہ قتادہ سے وہ عباس حشمی سے وہ ابوہریرہ سے وہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہ حضور نے فرمایا: قرآن مین تیس آیات کی ایک سورۃ ہے جو اپنے پڑھنے والے کی شفاعت کرے گی یہاں تک کہ اس کی

مغفرت کردیجائے گی وہ سورۃ ملک ہے۔اور قراء وغیر قراء سب نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اس کی تیس آیات سوائے بسم اللہ کے ہیں۔تو اگر تسمیہ اس کا جز ہوتی تو اس میں اکیس آیات ہوتیں اور قول نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مخالف ہوجاتا۔

اور نیز اس پر تمام شہروں کے قراء اور فقہاء کا اتفاق کرنا کہ سورۃ کوثر میں تین آیات ہیں اور سورۃ اخلاص میں چار آیات ہیں یہ دلالت کرتے ہیں کہ اگر تسمیہ سورتوں کا جز ہوتی تو ان سورتوں کی آیات زیادہ ہوجاتیں۔

تو ان احادیث سے ثابت ہوگیا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورتوں کا جز نہیں اور ان کی پہلی آیت نہیں۔اب رہا شافعیہ کے استدلال اجماع کا جواب تو علامہ حلبی کبیری میں اس استدلال کے جواب میں فرماتے ہیں:

وا جماع الصحابة علی اثباتها فی المصاحف لا یلزم منه انها آیة من کل سورة بل اللازم منه مع الامر بالتجرید عن غیر القران انها من القرآن و به نقول انها اية منه نزلت للفصل بين السور۔

اور صحابہ کے مصاحف میں تسمیہ کے ثابت رکھنے پر اجماع سے یہ لازم نہیں آتا کہ تسمیہ ہر سورۃ کی پہلی آیت ہو بلکہ مع اس حکم کے کہ مصحف کو غیر قرآن سے خالی کیا جائے یہ لازم آیا کہ تسمیہ قرآن کی آیت ہو اور ہم یہی کہتے ہین کہ تسمیہ قرآن کی آیت ہے سورتوں میں فصل کیلئے وہ نازل ہوئی۔

بالجملہ اس بحث سے ثابت ہوگیا کہ کہ جولوگ تسمیہ کو سورہ فاتحہ کی پہلی آیت قرار دیتے ہیں ان کا مذہب روایۃ ودرایۃ ہر طرح ضعیف ہے اور ہمارے لئے ناقابل عمل ہے اور مذہب حنفی ہر لحاظ سے قوی اور مدلل ہے۔

مقدمہ ثالثہ: نماز کی ہر رکعت مین تسمیہ کا سورہ فاتحہ سے قبل پڑھنا سنت ہے۔اور اس کا بعد فاتحہ کے سورہ سے پہلے پڑھنا مسنون نہیں اور قول مفتی بہ یہی ہے کہ فاتحہ اور سورۃ کے درمیان تسمیہ نہ پڑھی جائے۔

طحطاوی سے مراقی الفلاح میں ہے:

و تسن التسمية اول كل ركعة قبل الفاتحة لانه صلى الله تعالىٰ عليه وسلم كان يفتح صلاته ببسم الله الرحمٰن الرحيم ۔

اسی میں ہے: لا یسمی بین الفاتحۃ و السورۃ فی قولھا قال فی المضمرات والفتوی علی قولھا۔

درمختار میں ہے: و لا تسن بین الفاتحۃ والسورۃ مطلقا و لو سریۃ و لا تکرہ اتفاقا۔

احکام القرآن میں ہے:

روی ابو یوسف عن ابی حنیفۃ انہ یقرأ ھا فی کل رکعۃ مرۃ واحدۃ عند ابتداء قرأۃ فاتحۃ الکتاب و لا یعیدھا مع السورۃ عند ابی یوسف۔

(احکام القرآن مصری ج ۱ ص ۱۲)

اسی میں ہے: و اما من قرأھا فی کل رکعۃ فوجہ قولہ ان کل رکعۃ لھا قرأۃ مبتداۃ لا ینوب عنھا القرأۃ فی اللتی قبلھا کان کذالک حکم الثانیۃ اذا کان فیھا ابتداء قرأۃ و لا یحتاج الی اعادتھا عند کل سورۃ لانھا فرض واحد و کان حکم السورۃ فی الرکعۃ الواحدۃ حکم ما قبلھا لانھا دوام علی فعل قد ابتدأہ حکم الدوام و حکم الابتداء کالرکوع۔

یہ مذہب حنفیہ ہوا اور اس مذہب کی تائید دارقطنی کی یہ حدیث کرتی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اذا قمت فی الصلوہ فقل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الحمد للہ رب العالمین حتی تجمعھا و قل ھو اللہ احد الی آخرھا۔

(صحیح البخاری ج ۱ ص ۳۶۶)

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم نماز میں کھڑے ہو تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھو یہاں کہ ان کو ختم کر دینا اور قل ھو اللہ احد آخر سورۃ تک پڑھو۔

علامہ حلبی کبیری میں نہایت صاف طور پر تصریح فرماتے ہیں:

اما تسمیۃ عند ابتداء السورۃ بعد الفاتحۃ عند ابی حنیفۃ لا یاتی بھا لا فی حال الجھر ولافی حال المخافۃ و کذا عند ابی یوسف لما تقدم انھا لیست بآیۃ من اول السورۃ و الاتیان بھا فی اول کل رکعۃ لما تقدم من الاحادیث الدلالۃ علی انہ علیہ السلام کان یاتی بھا سرا و کذا الخلفاء الراشدون و لم یرو شئی فی الاتیان بھا اول

السورۃ۔ (کبیری ص ۳۰۱)

لیکن فاتحہ کے بعد سورۃ کے ابتداء میں بسم اللہ پڑھنا تو امام اعظم کے نزدیک اس کو نہ پڑھے نہ جہر کی حالت میں نہ آہستہ پڑھنے میں اور اسی طرح امام ابو یوسف کے نزدیک پہلے گذر چکا کہ تسمیہ سورۃ کی پہلی آیت نہیں اور تسمیہ کا ہر رکعت کے اول میں لانا تو اس پر دلالت کرنے والی حدیثیں منقول ہوئیں کہ حضور علیہ السلام تسمیہ کو آہستہ پڑھتے اور اسی طرح خلفائے راشدین کرتے اور تسمیہ کے اول سورۃ پڑھنے میں کوئی حدیث مروی نہیں۔

مخالف کے پاس کوئی ایسی روایت نہیں جس سے تسمیہ کا فاتحہ کے درمیان پڑھنا مسنون ثابت کر سکے تو مذہب مخالف روایت ودرایت کسی طرح ثابت نہ ہوسکا اور مذہب حنفیہ ہر طرح ثابت کر دیا گیا۔

مقدمہ رابعہ: نماز میں تسمیہ کے بالجہر پڑھنے میں سوائے ترمذی کے صحاح نے کوئی حدیث روایت نہیں کی اور ترمذی نے جو یہ حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی:

کان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یفتح صلوتہ ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

تو اس کا ضعف خود ہی اس طرح بیان کیا: قال ابو عیسیٰ ولیس اسنادہ بذلک۔

پھر اس کے حاشیہ میں ہے: قال بعض الحفاظ لیس حدیث صریح فی الجہر الا فی اسنادہ مقال عند اہل الحدیث ولذا اعرض ارباب المسانید المشہورۃ الاربعۃ واحمد لم یخرجوا منہا شیئا مع اشتمال کتبہم علی آحادیث ضعیفۃ۔

علامہ حلبی کبیری میں فرماتے ہیں:

قال ابن التیمیۃ وروینا عن الدارقطنی انہ قال لم یصح عن النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی الجہر حدیث وقال الحازمی احادیث الجہر وان کانت ماثورۃ عن نفر من الصحابۃ غیر ان اکثرہا لم یسلم من الشوائب۔ (کبیری ص ۳۰۱)

علامہ عینی عمدۃ القاری میں فرماتے ہیں:

احادیث الجہر وان کثرت رواتہا فکلہا ضعیفۃ ولیست مخرجۃ فی الصحاح ولا فی المسانید المشہورۃ۔ (حاشیہ بخاری مجتبائی ج ۱ ص ۱۰۳)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں:

وبہ تحقیق ثابت شدہ است از آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم واز خلفاء راشدین وصحابہ رضوان

اللہ علیہم اجمعین کہ جہر می کردند بسملہ اگر نماز جہری می بود۔ وشیخ ابن الہمام از بعض حفاظ نقل کردہ کہ ہیچ حدیث ثابت نشد کہ صریح باشد در جہر بہ تسمیہ مگر آنکہ در اسناد دوی سخن است وہیچ یکے از ارباب مسانید اربعہ مشہورہ اخراج نہ کرد وحدیثے دراں باوجود آنکہ کتب ایشاں مشتمل ست بر احادیث ضعیف وچندیں از صحابہ وتابعین وتبع تابعین وغیرہم از ائمہ لاتعد ولاتحصی ذکر کردہ اند کہ جہر نمی کردند واحیانا اگر بعض جہر روایت کردہ اند برائے تعلیم بود یا بجہت کمال قرب بعضے از مقتدیاں آنرا۔

(اشعۃ اللمعات کشوری ج ۱ ص ۳۷۳)

ان عبارات سے ظاہر ہوگیا کہ مدعیان تسمیہ بالجہر کے پاس غیر مجروح صحیح مرفوع حدیث اپنے اثبات مدعی کیلئے نہیں ہے۔ جب مشہور صحابہ نے تسمیہ بالجہر میں کسی صحیح مرفوع حدیث کی تخریج نہین کی تو خود ہی ثابت ہوگیا کہ تسمیہ بالجہر کا مذہب ضعیف ہے۔ اور تسمیہ بالسر کا مذہب اصح ہے۔ چنانچہ روایات بکثرت اسی کی تائید کرتی ہیں۔

حدیث: (۱) بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و ابا بکر و عمر کانوا یفتحون الصلوۃ بالحمد للہ رب العلمین ۔ (ج ۱ ص ۱۰۳)

بیشک نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور عمر نماز کو الحمد للہ رب العلمین سے شروع کیا کرتے تھے۔

مسلم شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

حدیث: (۲)۔ قال صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و ابی وبکر و عمر و عثمان فلم اسمع احدا منہم یقرء بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔

(مسلم مع شرح نووی ج ۱ ص ۱۷۴)

انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور خلیفہ اول حضرت ابوبکر اور خلیفہ ثانی عمر اور خلیفہ سوم حضرت عثمان کے ساتھ نماز پڑھی تو میں نے ان سے کسی کو بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتا ہوا نہیں سنا۔

اسی مسلم شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

حدیث: (۳) ان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و ابا بکر و عمر و عثمان کانوا

یفتتحو ن با لقرا ٔ ۃ با لحمد للہ رب العالمین ۔ (ابوداؤد مجتبائی)

بیشک نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور عمر وعثمان الحمد للہ رب العلمین سے قرأت شروع کرتے تھے۔

ابوداؤد شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا سے مروی:

حدیث:(۵) قالت کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یفتتح الصلوۃ بالتکبیر والقرأۃ با لحمد للہ رب العلمین۔

انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز کو اللہ اکبر سے اور قرأۃ کو الحمد للہ رب العلمین سے شروع کرتے تھے۔

حدیث:(۶۔۷) عن عبد اللہ بن مغفل قال: سمعنی ابی و انا فی الصلوۃ اقول بسم اللہ الرحمٰن الرحیم فقال یابنی محدث ایاک و الحدث و قال لم ار ھذا من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کان ابغض الیہ الحدث فی الاسلام قال و قد صلیت مع النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و مع ابی بکر و عمر و عثمان فلم اسمع احدا منھم یقولھا فلم تقلھا اذا انت صلیت فقل الحمد للہ رب العالمین ۔

(ترمذی علیمی دہلی ج ۱ ص ۳۳)

ترمذی شریف میاں حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے مروی انھوں نے کہا مجھے میرے باپ نے نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتا ہوا سنا تو انھوں نے مجھ سے کہا اے بیٹے یہ نئی بات ہے اور تو نئی بات سے بچ اور کہا میں نے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں سے کسی کو نہ دیکھا کہ وہ انہیں سخت ناپسند تھی اور فرمایا کہ میں نے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر وعمر وعثمان کے ساتھ نماز پڑھی تو میں نے ان میں سے کسی کو تسمیہ کہتے ہوئے نہ سنا تو اس کو تو بھی اب مت کہہ تو نماز پڑھ تو الحمد للہ رب العلمین کہنا۔

ترمذی شریف میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی:

حدیث:(۸) کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و ابو بکر و عمر و عثمان یفتتحو ن القرأۃ با لحمد للہ رب العلمین ۔ (ص ۳۴)

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور حضرت عثمان قرأۃ کو الحمد للہ

رب العلمین سے شروع کرتے تھے۔

نسائی شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث: (۱۰) صلیت مع النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و مع ابو بکر و عمر وعثمان رضی اللہ عنهما فیفتحون بالحمدللہ رب العالمین ۔ (نسائی انصاری ص ۹۱)

کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ اور حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ساتھ نماز پڑھی تو انہوں نے الحمدللہ رب العالمین سے نماز شروع کی۔

حدیث: (۱۱) قال صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فلم یسمعنا قرأة بسم اللہ الرحمٰن الرحیم و صلی بنا ابو بکر و عمر و عثمان فلم نسمعها منهما ۔

(نسائی ج ا ر ص ۹۲)

انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی تو ہم نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا پڑھنا نہیں سنا اور ہمیں حضرت ابوبکر وعمر نے نماز پڑھائی تو ہم نے تسمیہ کو ان دونوں سے نہیں سنا۔

نسائی شریف میں انہیں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث: (۱۲) قال صلیت خلف رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و ابی بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنهم فلم اسمع احدا منهم یجهر ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔

(نسائی ص ۹۲)

انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی تو ان میں سے کسی کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بالجہر کیساتھ پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔

نسائی شریف میں حضرت مغفل بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث: (۱۳) اذا سمع احدنا یقرأ بسم اللہ الرحمن الرحیم یقول صلیت خلف رسول للہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وابی بکر و عمر رضی اللہ عنهما فما سمعت احدا منهم قرأ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ (نسائی مطبوعہ انصای ص ۹۲)

اور جب ہم میں سے کسی کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے ہوئے سنتے تو کہتے میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پیچھے نماز پڑھی تو میں نے ان میں سے کسی کو نہیں سنا کہ اس نے بسم الرحمٰن الرحیم پڑھی ہو۔

ابن ماجہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی:

حدیث: (۱۴) کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یفتتح القرأۃ بالحمد للہ رب العالمین ۔ (ابن ماجہ نظامی دہلی ج ۱ ص ۵۹)

انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قرأۃ کو الحمد للہ رب العالمین سے شروع فرماتے تھے۔

ابن ماجہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث: (۱۵) کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و ابو بکر و عمر یفتتحون القرأۃ بالحمد للہ رب العلمین ۔ (ابن ماجہ ص ۵۹)

بیشک نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قرأت کو الحمد للہ رب العلمین سے شروع فرماتے تھے۔

ابن ماجہ میں حضرت عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث: (۱۷) قال صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و مع ابی بکر و عمر و عثمان فلم اسمع رجلا یقوله فاذا قرأت فقل الحمد للہ رب العلمین ۔

(ابن ماجہ ص ۵۹)

انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ اور حضرت ابوبکر کے اور عمر کے ساتھ اور عثمان کیساتھ نماز پڑھی تو میں نے کسی شخص کو تسمیہ پڑھتا ہوا نہیں سنا۔ پس جب تو قرأت کرے تو الحمد للہ رب العلمین پڑھنا۔

موطا امام مالک میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث: (۱۸) قال: قمت وراء ابی بکر و عمر و عثمان فکلهم کان لا یقرأ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اذا افتتحون الصلاۃ ۔ (مؤطا ص ۱۰)

انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت ابوبکر اور عمر اور عثمان کی اقتدا کی تو یہ سب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں پڑھتے تھے جب نماز شروع کرتے۔

بیہقی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث: (۱۹) کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و ابو بکر و عمر یقرأن یعنی لا یجهرون ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ (بیہقی ج ۲ ص ۵۲۰)

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ابو بکر اور عمر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو با لجہر نہیں پڑھتے تھے۔

امام طبرانی تہذیب الآثار میں حضرت ابو وائل رضی اللہ عنہ سے راوی:

حدیث:(۲۰) قال لم یکن عمر و علی یجہران بسم الرحمٰن الرحیم و لا بامین،

(الجوہر النقی ج ۲ ص ۴۸)

انہوں نے کہا کہ حضرت عمر اور حضرت علی بسم الرحمٰن الرحیم اور آمین جہر سے نہیں کہتے تھے۔

امام طبرانی معجم کبیر میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے راوی:

حدیث:(۲۱) ان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وابا بکر و عمر کانوا یسرون ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ (صحیح البخاری ج ۱ ص ۳۸۹)

بیشک نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر اور عمر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بالسر یعنی پوشیدہ طور پر پڑھتے تھے۔

حدیث:(۲۲) لم یجہر النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بالبسملۃ حتی مات ۔

(کبیری ص ۳۰۱)

کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تسمیہ کو بالجہر نہ پڑھا یہاں تک کہ وفات پائی۔

امام طبرانی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے راوی:

حدیث:(۲۳) ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کان یسر ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم و ابا بکر و عثمان و علیا۔ (کبیری ص ۳۰۱)

بیشک رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر و عثمان اور علی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بالسر آہستہ پڑھتے۔

حدیث:(۲۴) قال الجہر ببسم الرحمٰن الرحیم قرأۃ الاعراب ۔

(الجوہر النقی ج ۲ ص ۴۷)

انہوں نے فرمایا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بالجہر پڑھنا اہل قریہ کی قرأت ہے۔

ابو بکر رازی احکام القران میں حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی:

قال جہر الامام ببسم اللہ الرحمن الرحیم فی الصلاۃ بدعۃ۔

(احکام القرآن، ج ۱۔ص ۱۵)

انہوں نے کہا کہ امام کا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو نماز میں بالجہر پڑھنا بدعت ہے۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۃ فاتحہ سے پہلے پڑھی جاتی تھی۔ لیکن جہری نمازوں میں بالجہر نہیں پڑھی جاتی تھی، بلکہ بالسر آہستہ پڑھی جاتی تھی، خود نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین اور اجلہ صحابہ وتابعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جہر کے ساتھ بسم اللہ نہیں پڑھتے اور الحمد لله رب العالمين سے جہر سے شروع کرتے۔ انہیں احادیث سے استدلال کرتے ہوئے مذہب امام اعظم کا واضح وراجح ہونا ظاہر ہو گیا۔ لہذا نماز میں بسم اللہ کا آہستہ پڑھنا مسنون ہوا۔

ردالمحتار میں ہے: والسر لانها سنة۔ اور بالجہر پڑھنا مکروہ ہوا۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: ويكره الجهر بالستمية والتامين۔

یہ حنفی مذہب کے دلائل کا ایک نمونہ پیش کر دیا گیا ہے۔ ان مقدمات کے بعد سوال کا جواب خود ہی واضح ہو گیا مگر چونکہ سوال مذہب حنفیت کے خلاف بعض مغالطوں اور غلط استدلالوں پر مشتمل ہے اس لئے اس کے ہر ہر جملے کا جواب دے دیا جاتا ہے۔ پھر اختصار ملحوظ ہے۔

صاحب فوائد مکیہ تحریر فرماتے ہیں: کہ حضرت امام عاصم کوفی رحمۃ اللہ علیہ بین السورتین تسمیہ پڑھتے ہیں تو اس لحاظ سے جس سورۃ کو قاری بلاتسمیہ پڑھے گا وہ سورۃ امام کے نزدیک ناقص ہوگی۔

اقول: حضرت امام عاصم کا فعل غیر نماز میں قابل لحاظ لائق عمل ہو سکتا ہے، لہذا خارج نماز میں جب تلاوت کرے تو سورۃ کو بلاتسمیہ کے نہ پڑھے۔

ردالمحتار میں ہے: وفي خارج الصلوة اختلاف الروايات والمشائخ في التعوذ و التسمية قيل يخفي التعوذ دون التسميه والصحيح انه يتخير فيهما ولكن يتبع امامه من القراء وهم يجهرون بهما الاحمزة فانه يخفيهما۔ (ردالمحتار۔ ج ۱۔ ص ۳۴۴)

باقی رہا نماز میں تو اس میں ائمہ اربعہ کا اتباع کیا جائے گا۔ کہ احکام صلوۃ کا تعلق ائمہ اربعہ سے ہے نہ کہ ائمہ قراۃ سے، جسکی تفصیل آگے آتی ہے اس کے بعد کہا۔

وعن ابي خزيمة ان رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم قرء بسم الله الرحمن الرحيم في اول الفاتحة في الصلوة و عدها آية ايضا الخ۔

اقول: اس حدیث پر علامہ علاء الدین بن علی نے الجوہر النقی میں یہ جرح لکھی ہے:

ليس في الحديث عدها آية الامن وجه ضعيف۔

نیز اس حدیث میں ابن ملیکہ کی سماعت حضرات ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

وقال الطحاوی فی کتاب الرد علی الکرابیسی لم یسمع ابن ابی ملیکة هذا الحدیث من ام سلمة۔ (الجوہر النقی، ج ۲۔ ص ۲۴)

ان کے درمیان میں ایک راوی یعلی بن مملک متروک ہے تو اس حدیث ضعیف و مجروح پر حدیث صحیح کے بالمقابل بناء مذہب قرار دینا نا قابل اعتماد و استدلال ہے۔ اسکے بعد لکھا۔

پھر علامہ جزری فرماتے ہیں کہ بسم اللہ منزل من اللہ ہے اسکو پڑھنا چاہیے۔

اقول: بسم اللہ کے منزل من اللہ ہونے کا کون انکار کرتا ہے، احناف کے نزدیک بھی وہ منزل من اللہ ہے جیسا کہ مقدمہ اولی سے ظاہر ہو چکا ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ اسکو پڑھنا چاہیے تو اس کے نماز و غیر نماز میں ابتدائے قراءۃ میں پڑھنے کو کون منع کرتا ہے احناف اس کو کہیں سنت کہیں مستحب کہتے ہیں جیسا کہ اوپر مفصل مذکور ہوا۔

پھر کہا: چنانچہ باسناد اسحاق نقل کرتے ہیں۔ ہم سورۃ فاتحہ اور ہر سورۃ کے شروع ہر حالت و خارج از صلوہ قرآن سناتے ہوں خواہ نماز میں بسم اللہ پڑھا ہی کرتے تھے۔

اقول: اسحاق بن مسیبی کو علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں فرماتے ہیں: کہ وہ ضعیف ہیں۔ علاوہ بریں وہ کسی حدیث کی روایت نہیں کر رہے بلکہ محض اپنے عمل کا ذکر کر رہے ہیں، اور انکا عمل سب کے لئے حجت نہیں۔ اور اگر اس سے بھی قطع نظر کیجئے تو اسے سورۃ فاتحہ اور ہر سورۃ سے پہلے نماز میں کون نا جائز قرار دیتا ہے۔ مقدمہ ثالثہ سے ظاہر ہو چکا کہ تسمیہ کا قبل سورۃ فاتحہ کے پڑھنا مسنون ہے اور سورۃ سے پہلے پڑھنا بھی جائز ہے۔ تو انکا کلام ہمارے خلاف نہیں۔

پھر کہا: اور قراء مدینہ کا بھی یہی مذہب تھا۔

اقول: قراء مدینہ کا مذہب اس تسمیہ کے جزء سورۃ ہونے میں امام عاصم وغیرہ قراء کوفہ کے بالکل مخالف ہے۔

تفسیر بیضاوی میں ہے: بسم الله الرحمن الرحیم من الفاتحة وعلیه قراء مکة والکوفة و فقهائها و ابن المبارك والشافعی وخالفهم قراء المدینة و البصرة و فقهائها و مالك۔

تو اس عبارت سے ظاہر ہو گیا کہ قراء مدینہ کا مذہب حضرت امام عاصم وغیرہ قراء کوفہ کے خلاف ہے تو ان کو انکا ہم مذہب کہنا کس قدر غلط بات ہے۔ اس کے بعد کہ ان روایات سے یہ امر ثابت ہوتا ہے

کہ بین السورتین بسم اللہ نہ پڑھنے کا اختلاف ایسا ہے کہ جیسے اور اختلافات قراءت سبعہ کہ جس طرح اس کا پڑھنا جائز ہے اسی طرح اس کا نہ پڑھنا بھی درست ہے۔

اقول: نتیجہ تو معلوم ہے لیکن ان رویات سے اس امر کا ثابت ہونا محل نظر ہے جیسا کہ اوپر کی تفسیر سے ظاہر ہے۔ پھر ان روایات کا بجنسہ حجت ہونا بھی محل کلام ہے۔

اسکے بعد کہا؛ پس مبسملین کی روایات میں بسم اللہ بین السورتین و جہرا پڑھنی چاہیے۔

اقول: خارج نماز میں تو تسمیہ کا بین السورتین جہر سے پڑھنا محل نزاع نہیں۔ رہا نماز میں تسمیہ کا جہرا پڑھنا تو وہ بین السورتین ہی کیا بلکہ قبل سورۃ کے بھی کسی غیر مجروح صحیح حدیث سے ثابت نہیں، بلکہ صحیح حدیثوں کے خلاف ہے جیسا کہ مقدمہ رابعہ سے ظاہر ہے۔ تو اب ان صحیح حدیثوں کے خلاف یہ استدلال کرنا کہ تسمیہ کو جہرا پڑھنا چاہیے جہالت نہیں ہے تو اور کیا ہے بلکہ دین میں اپنی رائے ناقص سے دخل دینا ہے۔

اس کے بعد کہا: کیوں کہ فقہا کو اگر چہ اپنی ذاتی تحقیق اس مسئلہ میں کچھ ہی ہوتی تھی مگر روایت کے موقع پر آ کر اس مسئلہ کو فن قراءت ہو جانے کی وجہ سے وہ قراء ہی کا اتباع کرتے تھے۔

اقول: اوپر مذکور ہوا کہ نماز میں تسمیہ کا پڑھنا، پھر ہر رکعت میں پڑھنا اور ایک رکعت میں بھی ایک بار پڑھنا یا چند بار پڑھنا بالجہر پڑھنا یا بالسر پڑھنا یہ سب فقہ کے احکام ہیں نہ کہ فن قرائت کے۔ تو جب یہ فقہ کے احکام ہوئے تو ان میں اتباع فقہا کا ہوگا یا قراء کا۔ قراء کا اتباع ہر اس بات میں ہوگا جو بات فن قراءت کی ہو، اور جو بات ان کے فن ہی کی نہ ہو تو اس میں قراء کا اتباع کس طرح کیا جا سکتا ہے۔

صاحب فوائد نے نہ تو تجوید کے امتیاز کو سمجھا، نہ فقہا و قراء کے مذہب کے فرقوں کی جانا، نہ انکے طریقہ استدلال سے واقفیت حاصل کی، نہ انکے دلائل پر مطلع ہونے کی سعی کی۔ پھر اس نے فقہا کی ذاتی تحقیق سے اگر یہ مراد لی ہے کہ انہوں نے نص صریح کے خلاف جو استدلال کیا ہے وہ انکی ذاتی تحقیق ہے تو ہمارے فقہا کرام کی ایسی تحقیق کوئی نہیں پیش کی جا سکتی ہے۔ اور اگر یہ مراد ہے کہ انہوں نے نص کے خلاف تو نہیں کیا لیکن نص سے علت کو اخذ کر کے کسی غیر منصوص کیلئے قیاس کیا تو یہ خلاف روایت ہی کب قرار پایا۔ اس کو خلاف روایت کہنا ہی سخت نادانی ہے۔ اس مسئلہ تسمیہ میں ہمارے فقہا احناف نے جو احکام بتائے وہ بالکل موافق روایات ہیں جیسا کہ اوپر کے مقدمات سے ظاہر ہو چکا۔ صاحب فوائد نے فقہا کا تسمیہ میں وہ کون سا حکم دیکھا جو صحیح روایت کے خلاف ہو اور قراء اسکے مقابل صحیح روایت پر عامل

ہوں۔ اور جو بات پیش کی گئی اس میں تو صحیح روایات فقہا کی موافقت کر رہی ہیں جیسا کہ مقدمات میں گذرا۔

اس کے بعد کہا: حضرت امام مالک علیہ الرحمۃ نے باوجود اسکے کہ انکے مذہب میں بسم اللہ ہر سورۃ کا جز نہیں مگر امام نافع سے مسئلہ پوچھ کر یوں ہی فرمایا کہ ہر علم کا مسئلہ اس کے اہل سے پوچھنا چاہیے

اقول: یہ قاعدہ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہر علم کا مسئلہ اس کے اہل سے پوچھنا چاہیے۔ لیکن صاحب فوائد اپنے اس دعوے کو تو کسی دلیل سے ثابت کر دے کہ نماز سے تسمیہ کا فاتحہ وسورۃ سے پہلے ہر رکعت میں پڑھنا اور اس کا بالجہر پڑھنا علم قراءۃ کا مسئلہ ہے پھر ہم سے مطالبہ کرے۔

رہا امام مالک کا یہ واقعہ۔ اول تو کسی معتبر کتاب کے حوالہ سے نہیں، علاوہ بریں حضرت امام مالک نے اپنے قول پر خود عمل نہیں کیا۔ اور اپنے مذہب سے کیوں رجوع نہیں فرمایا، مصنف کو اپنے استدلال میں کسی کا قول سوچ سمجھ کر پیش کرنا تھا۔ لہٰذا قول حضرت امام مالک نے اسکو کیا فائدہ پہنچایا۔

پھر اس کے بعد کہا: مدار علم قرائت نقل وصحت روایت پر ہے۔ قیاس وعقل کو اس میں دخل نہیں۔

اقول: نہ تو تمام قواعد علم تجوید نقل وصحت روایت پر موقوف ہیں جو قواعد عربیہ اس میں جاری ہیں ان میں صحت روایت کیسے متصور ہوگی۔ نہ اس کے سارے مسائل تجوید قیاس وعقل کے بالکل خلاف ہیں، کہ بعض مسائل تجوید موافق قیاس وعقل بھی ہیں جو فن تجوید کے واقف کار پر بھی مخفی نہیں۔

اسکے بعد کہا: علم فقہ منصوصات ومجتہدات دونوں سے مرکب ہیں۔

اقول: اگر مجتہد کو منصوص کا مقابل ٹھہرا کر مجتہدات سے خلاف منصوصات مراد لیا گیا ہے تو یہ غلط ہے اور حقیقۃ وہ مجتہد ہی نہیں ہے۔

توضیح میں ہے: فمعنی القیاس ان النص الوارد فی المقیس علیه وارد فی المقیس معنی و ان لم یکن واردا صریحا۔

ردالمحتار میں ہے: المراد بالمجتهد فیه ما کان مبنیا علی دلیل معتبر شرعا بحیث یسوغ للمجتهد بسببه مخالفة غیره بخلاف ما اذا کان قولا مخالفا للکتاب کحل متروك التسمیة عمدا فانه لا یسمی مجتهدا فیه۔ (ردالمحتار۔ص ۳۳۱)

تو مجتہدات بمعنی منصوصات ہی ہوتے ہیں ان کو خلاف منصوص نہیں کہا جا سکتا۔

پھر اس کے بعد کہا۔ مسائل منصوص میں شارع علیہ السلام کے سوا کسی کا اتباع نہیں اور ائمہ کی

تقلید مسائل اجتہادیہ میں ہے۔

اقول: نہ تو مطلقا یہ صحیح ہے کہ شارع علیہ السلام کے سوا کسی اور کا اتباع مسائل منصوصہ میں نہیں کہ مسائل منصوصہ میں ائمہ اور فقہا کا بھی اتباع کیا جاتا ہے۔

درمختار میں ہے: و اما نحن فعلینا اتباع ما رجحوہ و ما صححوہ۔

اور نہ حقیقۃ یہی صحیح ہے کہ مسائل اجتہادیہ میں صرف ائمہ ہی کی تقلید کی جاتی ہے۔ بلکہ اس تقلید ائمہ میں اتباع رسول علیہ السلام بھی حاصل ہے۔

علامہ شعرانی میزان الشریعۃ میں فرماتے ہیں: ما من قول من اقوال المجتہدین و مقلدیھم الا و ینتھی سندہ برسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ثم بجرئیل ثم بحضرۃ اللہ تعالیٰ۔ (میزان مصری ج۱ ص۴۴)

تو جب مسائل اجتہادیہ کی سند حضرت شارع علیہ السلام تک پہنچتی ہے تو تقلید ائمہ میں اتباع رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی حاصل ہوگیا اور مصنف کا دعویٰ ہر پہلو پر باطل ثابت ہوا۔

اس کے بعد کہا: لہٰذا ہر مسئلہ قرأۃ میں نقل وصحت روایت کے علاوہ اور سند کی ضرورت نہیں۔

اقول: جب ہر مسئلہ قرأۃ نقل وصحت روایت پر موقوف نہیں ہے تو سرے سے یہ دعویٰ ہی صحیح قرار نہیں پایا۔ پھر باوجود اس کے یہ کہنا بے جا ہے۔ کہ جس کا مدار روایت پر ہو اس میں سند کی ضرورت نہیں،

اسکے بعد کہا: مسئلہ قرأت کی سند فقہاء کے اقوال سے تلاش کرنا غلطی ہے بلکہ اس کی سند ائمہ قرأۃ سے دریافت کرنی چاہئے۔ پس تصحیح روایت کے بعد اس پر عمل کرنا چاہئے۔

اقول: جس طرح مسئلہ قرأۃ کی سند اقوال فقہاء سے تلاش کرنا غلطی ہے۔ اسی طرح فقہی مسئلہ کی اقوال قراء سے تلاش کرنا بھی سخت غلطی بلکہ انتہائی جہالت ہے کہ فقہی مسئلہ اقوال فقہاء سے ہی لیا جاتا ہے ،تو نماز میں ہر سورۃ پر بسم اللہ پڑھنا یا نہ پڑھنا اور بالجہر پڑھنا یا بالسر پڑھنا یہ فقہی مسئلہ ہے اس کو اقوال فقہاء سے ہی اخذ کر کے عمل کیا جائے گا۔

اس کے بعد کہا:

دوسری بات یہ ہے کہ جو کچھ بین الدفتین ہو رسم عثمانی اس کی متحمل ہو اور قواعد تجوید کے موافق ہو نقل متواتر کیساتھ ہم تک پہنچا ہو وہ قرآن ہے اور تسمیہ پر یہ سب باتیں صادق آتی ہیں۔

اقول: لاریب تسمیہ قرآن کی آیت ہے۔ فقہاء کا یہی مسلک ہے۔ مقدمہ اولیٰ میں اس کو بدلائل

ثابت کردیا ہے۔

اس کے بعد کہا: نیز باجماع مذاہب اربعہ ہر حال میں قرأۃ سبعہ کیساتھ قرآن پڑھنا جائز ہے۔

اقول: نماز میں قرآن کا قرأت سبعہ کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔لیکن عوام کے انکار کرنے یا فتنہ میں پڑجانے کا خوف ہو تو اپنی اس قرأت کے سوا جس سے عوام واقف ہیں کسی دوسری قرأت میں نہ پڑھنا چاہئے۔

درمختار میں ہے: و یجوز بالروایات السبع لکن الاولیٰ ان لا یقرأ بالغریبة عند العوام صیانة لد بینهم ۔

اس کے بعد کہا: اختلاف قرأۃ بحرکت ہوں یا بکلمہ یا تبدیلی وزیادتی کلمہ خواہ ان میں سے کسی طرح کا اختلاف ہو سب جائز ہے۔

اقول: جو اختلاف قرأۃ سبعہ بلکہ عشرہ کے موافق ہوگا وہ تو بلاشک جائز ہے۔اور جو اختلاف عشرہ سے بھی متجاوز ہو اس مین تغیر معنی بھی ہوتا ہو تو وہ کیسے جائز ہوسکتا ہے۔اور اس کو نماز میں کیسے روا رکھا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد کہا: پھر تسمیہ کو نماز میں ناجائز کہنا کس طرح قبول کیا جاسکتا ہے جب تک کہ وہ دلیل نقلی قرآن یا حدیث سے نہ ہو۔

اقول: تسمیہ کو نماز میں ناجائز کس نے کہا ہے۔فقہاء حنفیہ تو نماز میں تسمیہ کو قبل سورۃ فاتحہ کے تو مسنون کہتے ہیں۔اور بین السورتین کو جائز لکھتے ہیں جیسا کہ مقدمہ ثالثہ سے کہ وہ تو اس کو جائز لکھتے ہیں،

پھر اس کے بعد کہا: باوجود ان تمام امور کے کہیں امام اعظم قدس سرہ سے اس کی تصریح بھی نہیں آئی کہ تمامی قراء کے اختلاف تمام قرآن میں پڑھنے جائز ہوں اور مبسملین کے قول کے موافق تسمیہ بین السورتین جائز نہ ہو۔

اقول: مذہب امام اعظم کا اتفاقی مسئلہ یہی ہے کہ ائمہ سبعہ بلکہ عشرہ کی روایت سے جتنی قرأتین ہوچکیں اس کا نماز میں پڑھنا جائز ہے۔

ردالمحتار میں ہے: القرآن الذی تجوز به الصلوٰة بالاتفاق هو المضبوط فی مصاحف الأئمة التی بعث بها عثمان رضی الله عنه الی الامصار و هو الذی اجمع علیه الائمة العشرة و هذا هو المتواتر جملة و تفصیلا فما فوق السبعة الی العشرة غیر

شا ذ وانما الشا ذ ما وراء العشرۃ و ھو الصحیح ۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۳۴۱)

رہا خود امام اعظم کا قول تو وہ اگر اس کے خلاف ہوتا تو مذہب حنفی کا یہ متفقہ مسئلہ نہ ہوتا اور حضرت امام کی تسمیہ بین السورتین کے متعلق یہ تصریح موجود ہے۔

احکام القرآن میں ہے: روی ھشام عن ابی یوسف قال ابو حنیفۃ عن قراءۃ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قبل الفاتحۃ الکتاب وتحدیدھا قبل السورۃ التی بعد فاتحۃ الکتاب فقال ابو حنیفۃ یجزیہ قرأتھا قبل الحمد۔ (احکام القرآن مصری ص ۱۲ ج ۱)

نیز اسی میں ہے: روی ابو یوسف عن ابی حنیفۃ انہ یقرأھا فی کل رکعۃ مرۃ واحدۃ عند ابتداء قرأۃ فاتحۃ الکتاب ولا یعیدھا مع السورۃ عند ابی حنیفۃ ۔

اور اختلاف قراء کا جواز اور تسمیہ بین السورتین کے جواز کا قول ان کے خلاف اولی ہونے کے منافی نہیں۔

ردالمحتار میں ہے: الجواز المشروعیۃ بمعنی عدم الحرمۃ فلا ینافی کونہ خلاف اولیٰ ۔ (ج ۱ ص ۳۳۴)

لہذا یہ دونوں جائز ہیں۔ لیکن خلاف اولیٰ ہیں۔

اس کے بعد کہا: پھر یہ مسئلہ اجتہادی بھی نہیں کیونکہ منصوصات میں اجتہاد جائز نہیں۔

اقول: مصنف نے نماز میں تسمیہ بین السورتین کے مسئلہ اجتہادی ہونے کا انکار کیا ہے اور اسکو منصوص مانا لیکن اس کے منصوص ہونے پر کوئی روایت پیش نہیں کی بلکہ وہ کوئی صریح حدیث پیش کر بھی نہیں سکتا کہ اس میں کوئی حدیث مروی ہی نہیں۔

چنانچہ علامہ حلبی کبیری میں تصریح کرتے ہیں: والاتیان بھا فی اول کل رکعۃ کما تقدم من الاحادیث الدالۃ علی انہ علیہ السلام کان یاتی بھا سرا وکذا الخلفاء الراشدون ولم یرو شئی فی الاتیان بھا اول السورۃ ۔ (کبیری ص ۳۰۱)

تو اس کے منصوص ہونے کا دعویٰ تو غلط ثابت ہوا اور جب یہ غلط ہوا تو وہ مسئلہ اجتہادی قرار پایا۔

اس کے بعد کہا: ہم مسائل اجتہادیہ میں امام صاحب کے مقلد ہیں نہ کہ مسائل منصوصہ میں۔ لہذا مسائل فقہیہ میں تو مقلد ہیں کہ وہ مجتہد ہیں۔

اقول: جب اسکا مسئلہ اجتہادی ہونا ثابت ہو چکا تو مصنف اس میں باقرار خود امام صاحب کی

تقلید پر مجبور ہوئے اور خود ہی اس نے اپنی سعی کو ملیامیٹ کر ڈالا۔ اور قول امام صاحب کی تصریح ابھی گزری کہ تسمیہ صرف سورۃ فاتحہ سے قبل پڑھا جائے اور پوشیدہ پڑھا جائے اور اسی رکعت میں بعد فاتحہ نہ پڑھا جائے۔

اس کے بعد کہا: اور مسائل قرأۃ میں ائمہ اور روایان قرآن حکیم کے ہیں۔

اقول: یہ تو صحیح ہے کہ مسئلہ قراءۃ میں ائمہ قرأت میں سے اپنے اپنے امام کے قول پر عمل کیا جائے گا۔ تو یہ جملہ ہی لغو قرار پایا۔

اس کے بعد کہا: اور علم قراءت میں امام صاحب بھی راویان قرآن کے مقلد تھے۔ نیز علم قرآن میں شاگرد امام عاصم کے ہیں۔

اقول: امام اعظم صاحب سے ان مشہور راویان قرآن کے موافق قرآتیں اور دیگر راویوں کی ہر طرح قراتیں ثابت و مروی ہیں اور حضرت امام عاصم کی قراءۃ کے متعلق حضرت امام اعظم کا یہ قول علامہ ابن حجر مکی نے مناقب امام اعظم میں نقل کیا ہے۔ قرأۃ عاصم قرأۃ مستقیمہ۔ لیکن آپ کی ان میں سے کسی امام خاص کی تقلید کرنا کسی معتبر کتاب میں نظر سے نہیں گذرا۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت امام اعظم صاحب حضرت امام عاصم کے شاگرد ہیں لیکن امام کردری صاحب فتاویٰ بزازیہ نے مناقب میں حضرت امام عاصم کو حضرت امام کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ (دیکھو مناقب امام ج ۲ رص ۲۲۱)

اس کے بعد کہا: اور یہ بات کہیں ثابت نہیں ہوئی کہ امام صاحب نے قرآن کریم میں اجتہاد فرمایا ہے کیونکہ سمعیات میں تو اجتہاد کی گنجائش ہی نہیں۔

اقول: جس واقعہ میں نص موجود ہو اس میں اجتہاد و قیاس کیا ہی نہیں جاتا کہ اجتہاد و قیاس کی حاجت وہاں ہوتی ہے جہاں نص وارد نہ ہو۔ باقی رہا آیات میں اجتہاد کرنا تو استدلال بہ عبارت النص۔ اشارۃ النص۔ واقتضاء النص کیا ہیں۔ فعل مجتہد ہی تو ہے۔ تو یہ کہنا کہ سمعیات میں اجتہاد کی گنجائش ہی نہیں جہالت نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

اس کے بعد کہا: اگر اجتہاد کی کہیں گنجائش ہے تو جہاں سے مبسملین کیلئے تسمیہ کی ممانعت مستنبط ہو بتائیں ورنہ احتمال اجتہاد اس مسئلہ میں محض بے سود جو پزیرائی نہیں ہوسکتا۔

اقول: یہ اوپر تفصیل سے گذر چکا کہ نماز میں تسمیہ کا ہر رکعت میں پڑھنا ایک بار پڑھنا یا چند بار پڑھنا اور بالجہر پڑھنا یا بالسر پڑھنا فقہی مسائل ہیں جو یقیناً اجتہاد سے مستنبط ہیں تو اس میں احتمال اجتہاد

کیسا۔اور جب مسائل اجتہادیہ سے ہیں تو اس میں مقلد کو دلیل دریافت کرنے کا کب استحقاق حاصل ہوسکتا ہے۔تو قول امام کے معلوم ہوجانے کے بعد محل استدلال کے دریافت کرنے کا کیا حق ہے۔علاوہ بریں ہم نے اوپر کافی دلائل جمع کردیئے ہیں۔

اس کے بعد کہا: پس جو کچھ لوگ بسم اللہ بالجہر تراویح میں پڑھنے کی بات مبسملین کیلئے نزاع کرتے ہیں وہ قراۃ سبعہ کی حقیقت سے واقفیت نہیں رکھتے۔

اقول: احناف نماز میں تسمیہ بالجہر کو مکروہ کہتے ہیں۔اب چاہے کہ وہ نماز فرض ہو یا تراویح یا نفل ۔اور جب وہ مکروہ کہتے ہین تو مبسملین بالجہر سے نزاع ہی متحقق ہوگیا۔علاوہ بریں نماز میں تسمیہ بالجہر کو قرأت سبعہ کی حقیقت سے کیا علاقہ کہ یہ فقہی مسئلہ ہے۔اس کا مسئلہ قرأۃ سے کب مقابلہ۔پھر جب ان فقہاء حنفیہ کو قرأت سبعہ کی حقیقیت سے ناواقفیت نہ ہوگی۔تو اس صاحب فوائد مکیہ کو کہاں سے واقفیت حاصل ہوسکتی ہے۔یہ نادار خود تو قرأت سبعہ کی حقیقت سے ناواقف واقف کاروں کو کس طرح دلیری سے ناواقف کہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ خود ہی اس کے ناواقف وجاہل ہونے کی بین دلیل ہے۔

پھر حاصل سوال یہ ہے۔لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ تراویح میں ہر سورۃ پر بسم اللہ پڑھنی چاہئے یا ایک سورۃ پر۔نیز بالجہر یا بالسر اور سورہ فاتحہ ودیگر سور پر بھی بالجہر یا بالسر پڑھے یا نہیں؟ اور کیا احکام ودلائل ہیں؟۔بحوالہ کتب جواب مرحمت فرمائیں۔

اقول: یہ تو ظاہر ہے کہ تراویح بھی نماز ہی ہے اور اس کے شرائط اور احکام بھی وہی ہیں جو فرائض کے ہیں۔تو اس تراویح میں بھی ہر سورۃ پر بسم اللہ نہ پڑھے بلکہ ہر رکعت میں وہی سورۃ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھ لے اور تسمیہ بالجہر نہ پڑھے بلکہ بالسر ہی پڑھے۔عبارت کتب فقہ اور دلائل شرعیہ مقدمات میں ان کے بعد سلسلہ میں کافی منقول ہوچکے ہیں۔اس سلسلہ میں مسئلہ مجوثہ پر کافی روشنی ڈالی گئی۔طالب تحقیق کیلئے مسئلہ کا ایسا حاصل موجود ہے کہ جس کے بعد مزید بحث کی حاجت باقی نہیں رہتی اور منکر ومعاندین کیلئے دفتر کے دفتر ناکافی ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

جواب سوال دوم:۔ض۔ظ۔دال ان میں ہر ایک کا مخرج علیحدہ وجداگانہ ہے۔تو ان میں پہلا فرق امتیاز من حیث المخرج ہوا جو ہر ایک کے امتیاز صوت طبعی کو مستلزم ہے۔دوسرا فرق من حیث الصفات ہے۔تو ض اور دال میں تو پانچ صفات کا فرق ہے یعنی ض۔رخوہ۔مستعلیہ۔مطبقہ۔مستطیلہ۔

غیر قلقلہ ہے۔اوردال ان کی اضداد شدیدہ۔مستفلہ۔مفتحہ۔قصیرہ۔قلقلہ ہے۔اورض وظ مین چارصفات میں شرکت ہے۔وہ رخوہ۔مستعلیہ۔مطبقہ۔مصمتہ ہیں۔اور ایک صفت استطالت کی بنا پرض،ظ سے ممتاز وجدا ہے۔توض کوان ہر دودال،اورظا سے من حیث المخرج اور من حیث الصفات ہر طرح کا امتیاز اور فرق حاصل ہوا۔ لہٰذاان حروف میں تباین ذاتی بھی ہوااور تغایر صفاتی بھی ہوا۔اور جب ان میں تباین ذاتی وصفاتی دونوں ہیں تو یہ ان کے درمیان افتراق فی الصوت کو یقینا مستلزم ہے کہ مشابہت فی الصوت یا تو اتحاد مخرج کی بنا پر ہوتا ہے جیسے۔ط۔ت۔میں۔یا تقارب فی المخرج کی بنا پر۔جیسے ظ۔ز۔میں۔یامشارکت فی الصفات کی بنا پر جیسے۔س۔ث۔میں۔اورض وظ۔ میں نہ تو اتحاد مخرج ہی ہے نہ تقارب مخارج نہ مشارکت فی الصفات۔توان میں مشابہت تامہ فی الصوت کہاں سے آئیگی۔

لہٰذاان کے درمیان مشابہت تامہ کے تو اسباب ہی نہیں پائے گئے۔اب رہی مشابہت ناقصہ تو وہ اگرض۔ظ۔سے مشارکت فی بعض الصفات ہونے کی بنا پر ہے توض کودال سے باعتبار مخرج ظا سے زیادہ قرب اور مشارکت فی بعض الصفات کی بنا پر بھی ہے کہ ج اور دال مجہورہ،مصمتہ ہونے میں شریک ہیں توجس طرح ض۔کوظ۔سے مشابہت ناقصہ ہے اسی طرح ض۔کود۔سے بھی مشابہت ناقصہ ہے۔اسی بنا پر قاضی خاں کی یہ عبارت ہے:

لو قرأ یلبسو ن ثیا با خضرا با لذا ل او با لدا ل تفسد صلا تہ ۔

اسی میں ہے:

لو قرأ غیر المغظو ب ب ظا او با لذال المعجمة تفسد صلا تہ ولا الضا لین با لظاء المعجمة و الدا ل المهملة لا تفسد صلا تہ و لو با لذا ل المعجمة تفسد ۔ ولو قرأو نخل طلعها هضیم قرأ با لظا ء او با لدا ل تفسد صلا تہ ۔

(فتاویٰ قاضی خاں مطبوعہ مصطفائی ص ۶۹۔۷۰)

ان عبارات سے ظاہر ہے کہ کہ ض۔کی ظ یادال سے تبدیل کا باعث وہی ان کی ض سے مشابہت ناقصہ ہی تو ہے توض۔کیلئے جیسے مشابہۃ ناقصہ ظ سے ہے ایسی ہی اس کو مشابہت ناقصہ دال سے بھی ہے۔

اور جب ض۔کواس کے مخرج سے مع جمیع صفات وشرائط کے ادا کیا جائیگا تو اس کی صوت طبعی ان ہردو،ظا اور دال کی آوازوں سے ممتاز اور جدا ہوگی۔ظ۔یادال کی مشابہت ناقصہ سے ض کی اصل آوا

زمٹ نہیں جائے گی۔ اور ض، عین، ظ۔ یا عین دال نہیں بن جائے گا۔ اور ض کا ان دونوں سے تباین ذاتی اور تغایر فی بعض الصفات فنا ہو کر اتحاد ذات ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتا۔ مشتبہ الصوت حروف کی ادائیگی میں جس طرح ہر سامع ان کے درمیان بین فرق و امتیاز کر لیتا ہے۔ اسی طرح ض۔ اور ظ۔ اور دال میں ممتاز فرق کا ہونا ضروری ہے۔ جو شخص ض کو صحیح ادا کرنے پر قادر ہو اس کو صحیح ادا کرنا ضروری ہے۔ عوام کی طرح کسی حرف کا بدلنا ہرگز جائز نہیں۔ اور جو ایسا کرے گا یقیناً محرف اور مغیر کہلائے گا۔

شرح جزری میں ہے: فلوابدل ضاد بظاء عامدا ابطلت صلاته علی الاصح۔

(شرح جزری ص ۴۳)

اور جب اس کی نماز ہی باطل ہے تو اس کی اقتدا کیسے صحیح ہوسکتی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ ض اور ظ میں فرق کرنا نہایت دشوار ہے تو کیا دشوار ہونیکی بنا پر ان کے ذاتی فرق کو میٹ دیا جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ علامہ جزری اسے تمیز کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

جزریہ میں ہے:

والضاد باستطالة و مخرج میز من الظاء و کلها تجی

شرح جزری ہندی اس شعر کا ترجمہ و شرح اس طرح کرتے ہیں:

اور ضاد معجمہ کو ساتھ صفت استطالت کے اور ساتھ مخرج کے یعنی ضاد استطالت کی صفت میں اور مخرج میں اکیلا ہے اس صفت اور اس مخرج کا کوئی حرف نہیں۔ سو اس ضاد کو ہمیشہ تمیز یعنی فرق کرو اور جدا کرو ظا معجمہ سے تاکہ مشابہ ظا کے نہ ہوجاوے۔ (شرح ہندی ص ۳۹)

اسی بنا پر علامہ علی قاری نے اس کی شرح میں فرمایا: ما کان تمیزه عن الظاء مشکلا بالنسبة الی غیره امر الناظم بتمیزه عنه نطقا۔ (شرح جزری مصری ص ۳۸)

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ ان کے فرق کا دشوار ہونا ہی ان کے درمیان فرق اور تمیز کا سبب بنا اور اس کے لئے خصوصیت سے حکم دیا گیا۔ اور ض کو ظ کی مشابہت صوتی سے بچایا گیا۔

عبارت "هما متشابهان فی الصوت و السمع ۔ نہ اس کا کوئی حوالہ دیا نہ قائل کا نام بتایا۔ تو اس پر کیا توجہ کی جائے۔ مع ہذا اس مشابہت سے مراد مشابہت ناقصہ ہے نہ کہ مشابہت تامہ۔ اور قول امام غزالی کا یہ مطلب ہے کہ ان کے درمیان فرق کرنے میں اس کی سعی کی جائے۔ اگر کسی مجبوری یا لغزش لسانی سے فرق نہ ہوسکا تو اس کی صحت نماز کا حکم دیدیا جائے۔

عبارت تفسیر عزیزی کا جواب یہ ہے کہ شاہ صاحب لوگوں کی غلطی بیان فرمارہے ہیں کہ انہوں نے ضاد اور ظاء کو یکساں کرلیا ہے اوران کے ذاتی فرق اور طبعی امتیاز صوت کو میٹ دیا ہے۔ نہ یہ کہ شاہ صاحب ان ہر دو کو یکساں پڑھنے کا حکم دے رہے ہیں اوران کے شرعی و ذاتی فرق اور طبعی امتیاز صوت کو ملیا میٹ کررہے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب کی طرف سے ایسے خلاف شرع حکم کیسے نسبت کی جاسکتی ہے۔

عبارت قاضی خاں کا جواب یہ ہے کہ ضالین کو ظ یا ذال سے بدل کر پڑھنے مین تغیر نہیں ہوا اس لئے نماز فاسد نہیں اور ضالین کو دسے پڑھنے میں تغیر معنی لازم آتا ہے اس بناپر نماز فاسد ہوگئی۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ض کو ظ یا ذال تو پڑھ سکتے ہیں اور دال نہیں پڑھ سکتے۔ ورنہ اس سے پہلا مسئلہ غلط ہوجائے گا کہ اس میں غیر المغضوب میں ض کو ظ یا د ہر ایک سے بدلنے پر فساد نماز کا حکم دیا ہے۔ بات وہی ہے کہ چونکہ اس میں ہر ایک کے بدلنے مین تغیر معنی ہوتا ہے تو فساد نماز کا حکم دیا گیا ہے اور ظا و دال کا ایک ہی حکم ہو گیا۔ بحمدہ تعالیٰ ہر دو سوالات کے مکمل جوابات دیدئے گئے۔ مولیٰ تعالیٰ قبول حق کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

۲۵ رذی الحجہ ۱۳۷۴ھ

مسئلہ (۲۷۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین دامت برکاتہم النوری مسائل حسب ذیل میں کہ

قرآن پاک میں ان آیتوں کو جو آیت پر ختم ہوئے یا وقف وغیرہ ہے کہ وہاں پر نہ ٹہرنا ہے مگر وہاں پر مد نہیں جیسے: ایاك نعبد وایاك نستعین ۔ من الجنة والناس۔ لکم دینکم ولی دین۔ عذاب عظیم۔ ان الله علی کل شئی قدیر۔ للناس لعلهم یتفکرون۔ وهو العزیز الحکیم۔ علی مثله کہ ان پر مد نہیں ہے۔ مگران کو اس طرح پڑھنا کہ مد ہوجائے۔ مثلا نستعین، حکیم، عذاب عظیم۔ علی کل شئ قدیر۔ وغیرہ وغیرہ کہ ان پر مد نہیں ہے اور یہاں پر آیت ختم ہے یا وقف ہے کہ سانس توڑنا ہے، ٹھہرنا ہے، تو ختم آیت پر زیادہ کھینچنا کہ جہاں مد ہوجائے جس طریقہ سے اس آیت میں جہاں پر مد ہوتا ہے تو اس کو زیادہ قریب پانچ الف کے برابر کھینچا جاتا ہے۔ ایسے ہی یہ آیتیں

کہ مدنہیں ہے چونکہ ٹھہرنا ہے یا آیت ختم ہے یا وقف ہے ان کو تین چار الف کے برار کھینچنا کہ مد ہو جائے جائز ہے یا نہیں۔اور اسی طرح پڑھنے میں کوئی حرج شرعی ہے یا نہیں۔نیز اس کی کیا شناخت کیا پہچان ہے۔کہ یہ تین یا پانچ الف کے برابر مقید پڑھنے پڑھانے کی کیا شناخت و پہچان ہے۔

الجواب

اللھم ھدایة الحق والصواب

ختم آیت جیسے ایاك نستعین ۔ عذاب عظیم۔ لعلھم یتفکرون۔ وغیرہ پر وقف میں مدکر لینے میں کوئی حرج نہیں۔کہ یہ مد جائز ہے اس مد کو مد متصل و منفصل کی طرح لکھا نہیں جاتا۔یہ مد دو الف یا تین الف کے برابر کھینچا جا سکتا ہے۔لیکن اس کو چار یا پانچ الف کی مقدار کھینچنا غلط ہے۔الف دو زبرسے حاصل ہوتا ہے،جس کی مقدار انگلی کا اٹھانا یا لفظ الف کا کہنا ہے جس کو فن تجوید سے ذوق ہے دو یا تین یا چار الف کے کھینچنے کی مقدار کا صحیح اندازہ کر لیا کرتے ہیں۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۷۶)

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مسائل مندرجہ ذیل میں

زید کہتا ہے کہ نماز میں ولا الضالین وغیرہ موقعوں پر ضاد پڑھے اور ظا نہ پڑھے،تو نماز باطل ہو جائے گی اور پڑھنے والا گمراہ ہے،لہذا از روئے شرع یہ بتایا جائے کہ زید کا یہ قول صحیح ہے، یا غلط اور زید کے بارے میں کیا حکم ہے؟۔

الجواب

اللھم ھدایة الحق والصواب

زید کا قول غلط و باطل ہے اور اپنی لاعلمی سے اس نے یہ مسئلہ بالکل الٹ دیا ہے۔شرعی مسئلہ تو یہ ہے کہ جس نے عمداً ض کو ظ سے بدل دیا تو صحیح مذہب کی بنا پر اسکی نماز باطل ہو جائے گی۔

چنانچہ ملا علی قاری بحر سے ناقل ہے: لوابدل ضا دبظاء عمدا بطلت صلوته علی الاصح لفساد المعنی۔ (منح فکریہ مصری ص ۴۳)

بلکہ اس کو عمداً بدلنے والا نہ فقط خاطی بلکہ کافر ہے۔محیط میں ہے۔سئل الامام الفضلی عمن

یقرأ الظاء المعجمة مکان الضاد المعجمة او علی العکس قال لا تجوز امامته ولو تعمد یکفر۔ (فقہ اکبر،۱۵۳)

ان عبارات سے زید کے قول کا غلط و باطل ہونا ظاہر ہوگیا۔ نیز زید کا مخالف تصریحات فقہ و منکر حکم شرع ہونا بھی ثابت ہوگیا واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل
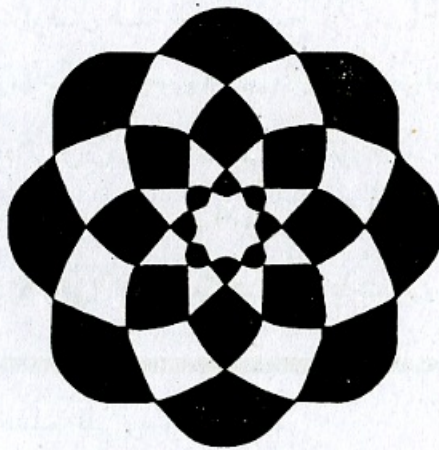
اجمل الکلام فی عدم القرأت خلف الامام

مسئلہ (۲۷۷)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

جس طرح الحمد پڑھنے والے لوگ امام کے پیچھے اپنے دلائل صریح وصاف حضرت ﷺ کی احادیث کے الفاظ سناتے ہیں اور معتبر معتبر احادیث کی کتابوں کے حوالے مستند علماء یہاں سے دیتے ہیں جن سے یقین کامل ہوجاتا ہے کہ الحمد پڑھنا مقتدی کو ضرور چاہئے بلا پڑھے نماز درست نہ ہوگی مثلا یہ حدیث پیش کرتے ہیں قال رسو الله ﷺ لا صلوة لمن لم يقراء بفاتة الكتاب خلف الامام رواہ البیہقی کتاب القرأۃ ص ۴۷ وقال هذا اسناد صيح (ترجمہ) یعنی فرمایا رسو اللہ ﷺ نے کہ نہیں نماز ہوتی اس شخص کی جس نے امام کے پیچھے سورہ الحمد نہیں پڑھی روات یا اس حدیث کو امام بیہقی نے کتاب القرأت میں اور کہا سنا داس کی صحیح ہے لہٰذا مذہب حنفیہ میں جو متقدمین کو الحمد پڑھنے کی ممانعت ہے کس قاعدہ اور دلیل کی رو سے ہے امید ہے کہ جواب کافی ووافی ہونا چاہئے ورنہ ان لوگوں کے کہنے اور بتانے سے چند آدمی اس طرف متوجہ ہوئے جات ہیں۔ بینوا وتوجروا

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

ہندوستان میں امام کے الحمد پڑھنے والے بالعموم غیر مقلدین ہیں حضرات شافعیہ سے خطاب نہیں کہ وہ تو ایک امام کے مقلد ہیں بلکہ سارا خطاب غیر مقلدین ہی سے ہے ائمہ دین جن کے سینے میں علوم کے بحر مواج تھے انہوں نے کیسی کیسی عرق ریزیاں کیں اور محنتیں اٹھائیں تو اس مرتبہ کو پہنچے کہ آیت کریمہ اور احادیث شریفہ سے استنباط احکام کرسکیں غیر مقلدین کو آیات واحادیث سے استدلال کرنے کی کیا لیاقت ان بے خبران زمانہ کو تو ہنوز غالب وداغ کی اردو سمجھنے کا سلیقہ بھی نہیں۔ یہ معدن علوم تک کیونکر رسائی کرسکتے ہیں قرأت خلف امام ہی کا مسئلہ لیجئے اس میں جس قدر احادیث وارد ہیں اور جو حکم قرآنی ہے سب پر نظر رکھ کر فیصلہ کرنا آج تک نہ کسی غیر مقلد کو میسر ہونہ انشاء اللہ آئندہ اس کے مجبورا

وہ یہی کرتے ہیں کہ جو حدیث اس کے سامنے پیش کردی جائے اس کی ماننے ہی میں طرح طرح کے حیلے حوالے نکالیں خواہ وہ مسلم و بخاری ہی کی حدیث یوں نہ ہو اور اپنے آپ بیہقی کی روات لے آئیں اور اس کو معتبر مانیں مجھ یہاں بیہقی پر جرح مقصود نہیں ہے۔ بلکہ ان کی خود مطلبی اور نفسیانیت کا ایک نمونہ پیش کرتا ہے کہ جو شخص اپنے مطلب کے موافق سمجھ کر کسی حدیث کو بیہقی سے اخذ کرتا ہے اور بیہقی کی کتاب کو حدیث کی ایسی معتبر و مستند کتاب مانتا ہے کہ اگر اس کے مخالف کوئی حدیث کسی دوسری کتاب کی پیش کردی جائے تو اس میں کلام کرنے لگتا ہے یہ ہے غیر مقلدین کی نفسانیت العیاذ باللہ من شرور الانفس ۔ بیہقی ی یہی روایت جس سے سوال میں استنباط کیا غیر مقلدین جو روایت میں مفہوم مخالف کے قائل ہیں وہ اس کو کیا سمجھ کر پیش کر سکتے ہیں فصحاء کے کلام میں زیادت افادیت سے خالی نہیں ہوتی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فصحاء کو کیا نسبت اب غیر مقلد بتائے کہ جس حدیث کو اپنے مدعی کے لے دلیل صاف وصریح بتا کر پیش کرتا ہے اس میں یا اتنے ہی الفاظ اس مطلب کے لئے کافی نہ تھے لا صلوۃ لمن یقراء بفاتہ الکتاب کیا اس سے متدل کے نزدیک فرضیت قرأت فاتحہ مستفاد نہ ہوتی تھی اور نہیں ہوتی تھی تو کیا لفظ خلف امام افادہ فرضیت کرتا ہے شائد یہ کوئی مسلوب الحواس کہے تو کہے کوئی عقل وہوش رکھنے والا نہ کہہ سکے گا اور اگر کہیں کہ لا صلوۃ لمن یقراء بفاتہ الکتاب سے ہی فرضیت ثابت ہوگئی تو سوال یہ ہے کہ لفظ خلف الامام کس فائدہ کے لئے آیا آیا مطلب ہے کہ امام کے پیچھے پڑھنے والے کی نماز تو بغیر فاتحہ پڑھے نہ ہوگی مگر خود امام اور منفردوں کی نمازیں بغیر فاتحہ کے بھی ہوجاتی ہیں حدیث نقل کردینا تو اسان مگر ذرا اس سمجھ کو بھی دیکھا یا یہ بات ہے کہ حدیث سمجھے یا نہ سمجھے لکن مسائل دین میں داخل کردینا اور ائمہ کی مخالفت کرنا روا ہوگیا پھر یہ بھی بتاؤ کہ لاصلوۃ لمن لم یقراء عبقا بفاتحہ الکتاب کا مطلب کیا ہے آیا یہ کہ جس نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھی صرف وہی نماز ناجاز ہے جب تو بتاؤ کہ ایسا ہے اور اس چیز کی نفی کرتا ہے اور دلیل خصوص ہی یہ مطلب ہے کہ جس نے کبھی امام کے پیچھے فاتحہ ترک اسی عمر کی کوئی نماز ہی صحیح نہ رہی سب باطل ہوگئیں عمل ہی حبط ہوگئے اگر یہ کہو تو یا تم سے پہلے دنیا میں اور کوئی بھی اس کا قائل ہوا ہے اور پھر جن صحابہ نے امام کے پیچھے قرأۃ نہیں کی ان کی عمر بھر کی نمازیں یا ہوئیں اور پچھلی نمازیں جو تمام شرائط وادب کے ساتھ ادا کی گئیں تھیں ان کی صحت پہلی پر موقوف تھی یا ترک فاتحہ خلف الامام کفر موجب حبط عمل ہے ہر بات دلیل معتبر سے کہو یہ اور بتادو کہ لاصلوۃ میں نفی حقیقت کی ہے یا صفت کی صحت کی ہے یا فضیلت کی بر تقدیر اول ثبوت فرضیت خبر واد محتمل المراد سے لازم فالازم باطل

فالمزلوم ثلثہ اور یہی غیر مقلدین کا مذہب ہے جیسا کہ الفاظ مندرجہ استفتاء سے ظاہر ہے اور الحمد پڑھنا مقتدی کو ضرور چاہے بلا پڑھے نماز درست نہ ہوگی۔

برتقدیر ثانی فرضیت خلف الامام کس کے گھر سے آئیگی۔ پھر یہ بھی بتاؤ کہ فرضیت قرأۃ خلف الامام میں یہ حدیث مطلق ہے یا مقید خاص ہے یا عام۔ اگر خاص یا مقید ہے تو ولیل تقیید وتخصیص کیا ہے؟۔ نیز یہ کہ اس حدیث کی صحت محض بیہقی کی تصحیح سے بطور تقلید شخصی کافی ہے یا اس کی تحقیق کا اور کوئی ذریعہ ہے اور اگر ہے تو یادریافت کرنے کی باتیں تو اور بھی بہت ہیں مگر ائمہ دین کی تقلید سے بھاگنے والوں کی قلعی انھیں دو چار باتوں میں کھل جائیگی اور پتہ چل جائیگا کہ کلام رسول اللہ ﷺ کے سمجھنے کے لے ائمہ دین کی تقلید ضروری ہے۔ ورنہ حدیث جس کو غیر مقلد صریح کہتا ہے۔ عمر بھر کی غریبی میں بھی نہیں سمجھا جاسکے گا جب تک کہ ائمہ دین کی تقلید نہ کرے یا مقلدین سے دریوزہ گری نہ کرے۔ ان سب سے گذر کر میں یہ کہتا ہوں کہ جب کہ قرآن پاک میں رب العزت تبارک وتعالی نے فرمایا: فاذا قرء القرآن فا ستمعو اله وانصتوا یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور ساکت رہو۔

یہ آیت خاص اسی مسئلہ قرأت خلف الامام میں نازل ہوئی، تو اس کا عموم ہی حجت ہے۔ ایسی صاف وصریح آیت کو غیر مقلدین کیا حدیث سے منسوخ کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تمہارے نزدیک آیت حدیث سے منسوخ ہوسکتی ہے۔ اور حدیث بھی خبر واحد اور وہ بھی ایسی جس کا مطلب غیر مقلدین کو سمجھنا دشوار۔ اب سنیئے کہ اس آیت سے قرأت کہ وقت سکوت کا وجوب صاف طور پر ثابت ہورہا ہے۔ پہلے تو میں آپ کو اسی بیہقی سے سنواؤں کہ یہ آیت کس معاملہ میں نازل ہوئی۔

امام بیہقی امام احمد سے نقل کرتے ہیں۔ قال اجمع الناس علی ان ھٰذہ الآیۃ فی الصلوۃ ۔ یعنی امام احمد نے فرمایا کہ لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ آیت نماز کے باب مین نازل ہوئی۔ پھرا نہیں بہقی کی روایت سنو:

عن مجاھد قال کان علیہ الصلوۃ والسلام یقرأ فی الصلوۃ فسمع قرأۃ فتی فنزل فاذا قرئ القرآن فا ستمعو اله وانصتوا۔

یعنی مجاہد سے مروی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نماز میں قرأت فرماتے تھے تو ایک جوان انصاری کا پڑھا سنا تو یہ آیت نازل ہوئی، فاذاقری القرآن (الآیۃ)

ملاحظہ ہو کہ قرآن پاک کی آیت قرأت خلف الامام کے روکنے کیلئے نازل ہورہی ہے۔

ابن مردویہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں :

عن معاوية بن قوت قالت سالت بعض اشيا خنامن اصحاب رسول ﷺ احسبه قال عبد الله بن مغفل اكل من سمع القرآن وجب عليه الاستماع والانصات قال انما نزلت هذه الآية و اذا قرى القرآن فاستمعوا وانصتوا فى القراة خلف الامام۔

یعنی معاویہ ابن قرہ نے کہا میں نے اصحاب رسول اللہ ﷺ میں سے اپنے بعض بزرگوں سے دریافت کیا، راوی کہتا ہے مجھے خیال ہے کہ معاویہ نے عبداللہ بن مغفل کا نام لیا، ان سے دریافت کیا کہ ہر کوئی جو قرآن سنے اسپر سننا اور خاموش رہنا واجب ہے۔ فرمایا یہ آیت نازل ہی ہوئی ہے قرآت خلف الامام میں۔

امام ابوالبرکات عبداللہ بن محمود نسفی اپنی تفسیر مدارک التنزیل میں فرماتے ہیں:

جمهور الصحابه رضى الله عنه عنهم على انه فى استماع الموتم۔

یعنی جمہور صحابہ کرام اس پر ہیں کہ یہ آیت مقتدی کے قرأت سننے اور خاموش رہنے کے باب میں نازل ہوئی۔

ابن مردویہ اور بیہقی نے روایت کیا ہے:

عن ابن عباس صلى النبى ﷺ فقراء خلفه قوم فخلطوا عليه فنزلت هذه الاية۔

یعنی ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور انور ﷺ نے نماز پڑھائی قوم نے آپ کے پیچھے قرات کی اس سے آپ پر قرات میں خلط واقع ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

عبداللہ بن حمید اور ابوراسخ اور بیہقی ابوالعالیہ سے روایت کرتے ہیں۔ ان النبى ﷺ كان اذا صلى باصحابه قرأ فقرأمن اصحابه فنزلت۔

یعنی جب حضور انور ﷺ نے اپنے اصحاب کو نماز پڑھائی اور قرات کی تو آپ کے اصحاب نے بھی قرات کی اسپر یہ آیت نازل ہوئی۔

الحمد اللہ عاقل منصف کیلئے مسئلہ تو فیصل ہوگیا کہ جب قرات خلف الامام کی ممانعت میں آیت نازل ہوئی اور آیت نے مقتدی پر خاموش رہنا واجب کیا اور اس پر جمہور صحابہ نے اجماع کیا تو اب مقتدی کیلئے قرأت ثابت کرنے کی ہر کوشش بیکار رہے کہ حدیث خبر واحد حکم قرآنی کو ہرگز ہرگز منسوخ نہیں کرسکتی، مقتدی کا امام کے پیچھے خاموش رہنا آیت کریمہ سے ثابت ہوگیا تو اس سے بڑھ کر اور کونسی دلیل

ہوگی جس سے غیر مقلدین کی تسکین ہو سکے۔ ضرورت تو نہیں ہے کہ مسئلہ میں طول کیا جائے مگر غیر مقلدین کے لئے احادیث سے بھی چند صاف وصریح تائیدات پیش کر دیجائیں مولیٰ تعالیٰ انکو ہدایت فرمائے۔

چھ احادیث تو آیت کے ذیل میں مذکور ہوئیں اب مزید اور سنئے۔

حدیث (۷) مسلم شریف میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: صلیٰ بنا رسول الله ﷺ صلوة الظهر او العصر فقال ايكم قرأخلفي بسبح اسم ربك الاعلىٰ فقال رجل: انا ولم اردبها الاالخير، قال: قد علمت ان بعضكم خالجنيها۔

(مسلم شریف مع شرح مطبوعہ مجتبائی دہلی باب نہی الماموم عن جہرہ بالقراۃ خلف امامہ صفحہ ۱۷۲۔ ج ۱)

یعنی ہم کو نبی ﷺ نے ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی، فرمایا تم میں سے کسی نے میرے پیچھے سبح اسم ربك الاعلى پڑھا، ایک شخص نے عرض کیا: میں نے، اور میں نے سوائے خیر کے اور کچھ ارادہ نہیں کیا۔ فرمایا بیشک میں نے جانا کہ تمہارے بعض لوگ مجھ سے اس میں جھگڑا کرتے ہیں یعنی تم امام کے پیچھے قرأت نہ کرو۔

حدیث (۸) اسی مسلم شریف میں ایک طویل حدیث میں یہ الفاظ ہیں: واذا قرأفانصتوا،

(مسلم شریف، باب التشہد فی الصلوۃ ص ۱۷۴ ج ۱)

یعنی حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۹) ترمذی شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ان رسول الله ﷺ انصرف من صلوة جهر فيها بالقرأة فقال هل قرأ معي احد منكم انفا؟ فقال رجل: نعم يارسول الله! قال: انی اقول مالی انازع القرآن قال فانتهى الناس عن القرأة مع رسول الله ﷺ فيما يجهر فيه رسول الله ﷺ من الصلوات بالقرأة حين سمعوا ذلك من رسول الله ﷺ۔ (ترمذی شریف مطبوعہ مجیدی کانپور باب ماجاء فی ترک القرأۃ خلف الامام ص ۵۰ ج ۱)

یعنی رسول اللہ ﷺ اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں قرأت بالجہر پڑھی، فرمایا: کیا میرے ساتھ تم میں سے کسی نے ابھی قرأت کی؟ ایک شخص نے عرض کی ہاں یارسول اللہ! فرمایا میں کہتا ہوں مجھے کیا ہوا کہ مجھ سے قرآن میں جھگڑا کیا جاتا ہے، راوی نے کہا کہ لوگ حضور کے ساتھ قرأت کرنے سے

ان نمازوں میں باز رہے جن میں حضور جہر کے ساتھ قرأت فرماتے تھے جب سے یہ بات انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی۔

حدیث (۱۰) اسی ترمذی شریف میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: من صلی رکعة لم یقرأ فیها بام القرآن فلم یصل الا ان یکون وراء الامام۔

(ترمذی شریف ص ۵ ج ۱)

یعنی جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی تو اس نے نماز ہی نہیں پڑھی مگر جب امام کے پیچھے ہو۔ کہ اس میں سورۃ نہیں پڑھی جاتی۔

حدیث (۱۱) ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انما جعل الامام لیؤتم به فاذا کبر فکبروا واذا قرأفانصتوا۔

(ابوداؤد شریف ض امطبوعہ مجتبائی دہلی، باب الامام یصلی من قعود ص ۹۶)

یعنی امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، تو جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۱۲) اسی ابوداؤد شریف میں حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم خطبنا فعلمنا وبین لنا سنتنا وعلمنا صلوتنا فقال اذا صليتم فاقيموا صفوفكم ثم ليؤمكم احدكم فاذا كبر فكبروا واذا قرأفانصتوا۔

(ابوداؤد شریف ج ا ص ۱۴۶ باب التشہد مطبوعہ مذکور)

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ پڑھا تو ہمیں سکھایا اور سنت کا بیان کیا اور ہمیں نماز کا طریقہ تعلیم کیا اور فرمایا: جب تم نماز پڑھو تو اپنی صفوں کو سیدھا کرو، پھر تم میں سے ایک امامت کرے، پس جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۱۳) ابوداؤد شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم انصرف من صلوة جهر فيها بالقرأة فقال هل قرأ معی احد منكم انفا فقال رجل: نعم يا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم، قال انی اقول مالی انازع القرآن، قال فانتهى الناس عن القرأة مع رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم فيما فيه يجهر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالقرأة من الصلوات حين سمعوا ذلك من رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم۔ (ابوداؤد شریف ض اباب من کرہ القرأۃ بفاتحۃ الکتاب اذا جہر الامام ص ۱۷۷)

یعنی حضور اقدس ﷺ اس نماز میں جس میں قرأت بالجہر پڑھی جاتی ہے، فراغت کی تو فرمایا: کیا ابھی تم میں سے کسی نے میرے ساتھ قرأت کی؟ ایک شخص نے عرض کیا: ہاں یارسول اللہ ﷺ، حضور نے فرمایا: میں کہتا ہوں مجھے کیا ہو کہ میں قرأت میں منازعت کیا جاؤں، راوی نے کہا کہ لوگ حضور ﷺ کے ساتھ قرأت کرنے سے ان نمازوں میں باز رہے جن میں حضور ﷺ بالجہر قرأت کرتے تھے جب سے انہوں نے حضور ﷺ سے یہ سنا۔

حدیث (۱۴) اسی ابوداؤد شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بطریق دیگر مروی:

یقول صلی بنا رسول اللہ ﷺ صلوۃ نظن انها الصبح بمعناه الی قوله مالی انازع القرآن۔

(ابوداؤد شریف ج ا ص مذکور)

یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی ہمیں خیال ہے کہ وہ صبح کی نماز تھی، اور پھر اوپر کی حدیث کا پورا مضمون یہاں تک بیان کیا کہ مجھے کیا ہو کہ میں قرآن میں منازعت کیا جاؤں۔

حدیث (۱۵) اسی ابوداؤد شریف میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

ان النبی ﷺ صلی الظهر فجاء رجل یقرأ خلفه بسبح اسم ربك الاعلیٰ فلما فرغ قال ایکم قرأ؟ قالوا: رجل، قال: قد عرفت ان بعضکم خالجنیها۔

(ابوداؤد شریف ج ا باب من رأی القرأة اذا لم یجهر)

یعنی حضور نبی کریم ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی، ایک شخص آیا اور اس نے آپ کے پیچھے "سبح اسم ربک الاعلیٰ" پڑھا، حضور ﷺ جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: تم میں سے کس نے قرأت کی؟ لوگوں نے عرض کیا: ایک شخص نے، فرمایا میں نے جانا کہ تم میں سے بعض نے مجھ سے قرأت میں منازعت کی۔

حدیث (۱۶) اسی ابوداؤد شریف میں انہیں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بطریق دیگر بالفاظ آخر مروی ہے: ان النبی ﷺ صلی بهم الظهر فلما انفتل قال: ایکم قرأ بسبح اسم ربك الاعلیٰ فقال: رجل انا یا رسول الله! فقال علمت ان بعضکم خالجنیها۔

(ابوداؤد شریف باب مذکور)

یعنی حضور نبی کریم ﷺ نے لوگوں کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی، تو جب حضور نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: تم میں سے کس نے سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھا؟ ایک شخص نے عرض کی میں نے، فرمایا: میں

نے جانا تم میں سے بعض نے مجھ سے قرأت میں منازعت کی۔

حدیث (۱۷) ابن ماجہ شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: قال رسول اللہ ﷺ: انما جعل الامام لیؤتم به فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا ، واذا قال غیر المغضوب علیهم ولا الضالین فقولو اآمین الحدیث۔

(ابن ماجہ ج ۱ مطبوعہ نظامی دہلی ص ۶۱ باب اذا قرأ الامام فانصتوا)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، تو جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب امام غیر المغضوب علیهم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔

حدیث (۱۸) ابن ماجہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: قال رسول اللہ ﷺ اذا قرأ الامام فانصتوا فاذا عند القعدة فلیکن اول ذکر احدکم التشهد۔

(ابن ماجہ ص مذکور)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب وہ قعدہ میں پہونچے تو تمہارا پہلا ذکر تشہد ہے۔

حدیث (۱۹) اسی ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: صلی النبی ﷺ باصحابه صلوة اظن انها الصبح فقال هل قرأ منکم من احد ؟ قال رجل: انا، قال انی اقول مالی انازع القرآن۔

(ابن ماجہ ص مذکور)

یعنی نبی ﷺ نے اپنے اصحاب کو نماز پڑھائی، میں گمان کرتا ہوں کہ وہ صبح کی نماز تھی، فرمایا: کیا تم میں سے کسی نے قرأت کی؟ ایک شخص نے عرض کی: میں نے، فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہو کہ میں قرآن میں منازعت کیا جاؤں۔

حدیث (۲۰) اسی ابن ماجہ میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: قال رسول اللہ ﷺ: من کا ن له امام فقرأة الامام له قرأة۔

(ابن ماجہ ص مذکور)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کا امام ہو تو امام کا قرأت کرنا اس کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۲۱) نسائی شریف میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: صلی النبی ﷺ الظهر فقرأ رجل خلفه سبح اسم ربك الاعلیٰ ، قال رجل: انا ، قال قد علمت ان

بعضکم قد خالجنیھا ۔

(نسائی ج ا مطبوعہ انصاری دہلی ص ۹۳ باب ترک القرأۃ خلف الامام فیما لم یجھر فیہ)

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ظہر پڑھائی تو حضور کے پیچھے ایک شخص نے سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھا، حضور نے بعد نماز فرمایا: کس نے سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھا؟ ایک شخص نے عرض کیا: میں نے، فرمایا: میں نے جانا کہ تمہارے بعض نے مجھ سے قرأت میں منازعت کی۔

حدیث (۲۲) اسی نسائی شریف میں انہیں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بطریق دیگر و بالفاظ آخر مروی ہے، ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی صلوۃ الظھر او العصر ورجل یقرأ خلفہ فلما انصرف قال ایکم قرأ سبح اسم ربك الاعلیٰ؟ قال رجل من القوم انا، ولم ارد بھا الاالخیر فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد عرفت ان بعضکم قد خالجنیھا ۔

(نسائی شریف ص و باب مذکور)

یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ظہر یا نماز عصر پڑھائی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک شخص نے قرأت کی، تو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: تم میں سے کس نے سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھا؟ قوم میں سے ایک شخص نے کہا: میں نے، اور میں نے سوائے بھلائی کے اور کچھ ارادہ نہیں کیا، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے جانا کہ تمہارے بعض نے مجھ سے قرأت میں منازعت کی۔

حدیث (۲۳) اسی نسائی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصرف من صلوۃ جھر فیھا بالقرأۃ فقال ھل قرأ معی احد منکم انفا، قال رجل نعم یا رسول اللہ! قال انی اقول مالی انازع القرآن ،

(نسائی ص مذکور)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں جہری قرأت پڑھی جاتی ہے، فرمایا: کیا تم میں سے کسی نے میرے ساتھ ابھی قرأت کی؟ ایک شخص نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ میں نے، فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا کہ میں قرآن میں منازعت کیا جاؤں۔

حدیث (۲۴) اسی نسائی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا واذا قال سمع اللہ لمن حمدہ فقولوا اللھم ربنا لك الحمد ۔

(نسائی شریف ص مذکور باب تاویل قوله عز وجل

واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، پس جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب امام سمع اللہ لمن حمده کہے تو تم اللهم ربنا لك الحمد کہو۔

حدیث (۲۵) اسی نسائی شریف میں انہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بالفاظ دیگر مروی ہے: قال رسول ﷺ انما الامام لیؤتم به فاذا کبر فکبروا واذا قرا فانصتوا۔

(نسائی صفحہ و باب مذکور)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ امام اس لئے ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے۔ پس جب امام تکبیر کہے۔ تو تم بھی تکبیر کہو۔ اور جب امام قرات کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۲۶) اسی نسائی میں حضرت ابو داؤد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ سئل رسول الله ﷺ فی کل صلوة قرأة قال: نعم، قال رجل من الانصار وجبت هذه فالتفت الی وکنت اقرب القوم منه فقال ما اری الامام اذا ام القوم الا وقد کفاهم۔

(نسائی شریف صفحہ مذکور باب اکتفاء الماموم بقراۃ الامام)

یعنی رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا۔ کیا ہر نماز میں قرات ہے۔ فرمایا: ہاں۔ انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا۔ کہ یہ قراۃ واجب ہوئی۔ تو میری طرف توجہ فرمائی اور میں قوم میں حضور سے زیادہ نزدیک تھا۔ فرمایا میں یہی جانتا ہوں۔ کہ جب امام قوم کی امامت کرتا ہے۔ تو ان کے لئے وہی کافی ہے۔

حدیث (۲۷) موطا امام مالک میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ من صلی رکعة لم یقرا فیها بام القران فلم یصل الا وراء الامام۔

(موطا امام مالک مطبوعہ نظامی دہلی صفحہ ۲۱ باب ماجاء فی ام القرآن)

یعنی جس نے ایک رکعت نماز پڑھی۔ اور اس میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی۔ تو اس نے نماز ہی نہیں پڑھی مگر امام کے پیچھے۔

حدیث (۲۸) اسی موطا امام مالک میں ہے۔ ان عبد الله بن عمر کان اذا سئل هل یقرا

أحد خلف الامام قال اذا صلی احد کم خلف الامام فحسبه قراة الامام واذا صلی وحده فلیقرا قال کان عبدالله بن عمر لا یقرا خلاف الامام۔

(موطا امام مالک باب ترک القراۃ خلف الامام فیما یجہر قبہ صفحہ ۲۲)

یعنی حضرت عبداللہ بن عمر سے جب سوال کیا جاتا کہ کیا کوئی شخص امام کے پیچھے قرات کرے تو فرماتے جب تمہارا کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے۔ تو اسے امام کا قرات کرنا کافی ہے اور جب تنہا نماز پڑھے تو قرات کرے۔ راوی نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن عمر امام کے پیچھے قرات نہیں کرتے تھے۔

حدیث (۲۹) اسی موطا امام مالک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ ان رسول الله ﷺ انصرف من صلوة جهر فیها بالقرأة فقال هل قراء معی منکم احد انفا فقال رجل نعم انا یا رسول الله فقال رسول الله ﷺ انی اقول سالی انازع القرآن فانتهیٰ الناس عن القرأة حین سمعوا ذلك من رسول الله ﷺ۔

(موطا امام مالک باب وصفحہ مذکور)

یعنی رسول اللہ ﷺ اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں قرات بالجہر پڑھی جاتی تھی۔ فرمایا کیا تم میں کسی نے میرے ساتھ ابھی قرأت کی۔ ایک شخص نے عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ ﷺ! تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہو کہ میں قرآن میں منازعت کروں۔ راوی نے کہا کہ لوگ حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ قرأت کرنے سے ان نمازوں میں باز رہے جن میں حضور بالجہر قرأت کرتے جب سے انہوں نے یہ رسول اللہ ﷺ سے سنا۔

حدیث (۳۰) جامع مسانید امام اعظم میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ ان رسول الله ﷺ قال من کان له امام فقراة الامام له قراة۔

(جامع مسانید امام اعظم مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف حیدر آباد صفحہ ۳۳۱ جلد اول)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کا امام ہو تو امام کا قرات کرنا اس کا قرات کرنا ہے۔

یہ حدیث بکثرت طرق مروی ہے۔

حدیث (۳۱) اسی جامع مسانید اعظم میں انہیں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بالفاظ دیگر مروی ہے۔ ان رجلا قرأ خلف النبی ﷺ فی الظهر او فی العصر و او می الیه رجل منها فلما انصرف قال: اتنهانی ان اقرا خلف رسول الله ﷺ فتذاکرا ذلك حتی سمع النبی ﷺ فقال

رسول اللہ ﷺ: من صلی خلف الامام فقراۃ الامام لہ قراۃ۔

(جامع مسانید امام اعظم صفحہ نمبر ۳۳۴ / ج اول)

یعنی ایک شخص نے نبی ﷺ کے پیچھے نماز ظہر یا عصر میں قرات کی اس کو ایک شخص نے اشارہ سے منع کیا۔ تو جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو کہنے لگا کیا تو مجھ کو رسول اللہ ﷺ کے پیچھے قرات کرنے سے منع کرتا ہے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے ان دونوں کی یہ گفتگو سنی تو حضور نے فرمایا جس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو امام کا قرأت کرنا اس کا قرأت کرنا ہے۔

یہ حدیث بھی بطرق کثیرہ مروی ہے۔

حدیث (۳۲) اسی جامع مسانید امام اعظم میں انہیں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بالفاظ دیگر مروی ہے: قال: صلی رسول اللہ ﷺ بالناس فقرأ رجل خلفہ فلما قضی الصلوۃ قال ایکم قرأ خلفی ثلاث مرات فقال رجل انا یا رسول اللہ! فقال من من صلی خلف الامام فان قرأۃ الامام لہ قرأۃ۔ (جامع مسانید امام اعظم ص ۳۳۷ ج ا)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو نماز پڑھائی، ایک شخص نے آپ کے پیچھے قرأت کی، جب حضور ﷺ نے نماز پوری فرمائی تو فرمایا: تم میں میرے پیچھے کس نے قرأت کی؟ یہ تین مرتبہ فرمایا، تو ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ میں نے قرأت کی، تو حضور ﷺ نے فرمایا: جو امام کے پیچھے نماز پڑھے تو بیشک امام کا قرأت کرنا اسی کا قرأت کرنا ہے۔

یہ بھی چند طرق سے مروی ہے۔

حدیث (۳۳) اسی جامع مسانید امام اعظم میں انہیں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بالفاظ دیگر مروی ہے: انصرف النبی ﷺ من صلاۃ الظھر و العصر فقال من قرأ منکم سبح اسم ربك الاعلیٰ فسکت القوم حتی سأل عن ذلك مرارا فقال رجل من القوم انا یا رسول اللہ! فقال: رأیتك تناز عنی او تخالجنی القرآن۔ (جامع مسانید امام اعظم ص ۳۳۸ ج ا)

یعنی حضور نبی کریم ﷺ نماز ظہر یا نماز عصر سے فارغ ہوئے تو فرمایا: تم میں سے کسی نے سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھا، تو سب لوگ ساکت رہے یہانتک کہ حضور ﷺ نے یہ بار بار دریافت فرمایا، تو قوم میں سے ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے پڑھا، حضور سید عالم ﷺ نے فرمایا: میں نے تجھے جانا کہ تو مجھ سے قرآن میں منازعت کرتا ہے۔

اس حدیث کے بھی چند طریق بیان کئے گئے ہیں۔

حدیث (۳۴) اسی جامع مسانید امام اعظم میں ہے: ان عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہلم یقرأ خلف الامام لا فی الر کعتین الاولیین ولا فی غیرھما۔

(جامع مسانید امام اعظم ص ۳۱۰ ج ۱)

یعنی حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرتے، نہ پہلی دونوں رکعتوں میں اور نہ ان کے غیر میں۔

حدیث (۳۵) اسی جامع مسانید امام اعظم میں ہے: لا یقرأ علقمة خلف الامام حرفا لا فیما یجھر فیه ولا فیما لا یجھر فیه ولا یقرأ فی الاولیین بام الکتاب ولا غیرھا خلف الامام ولا اصحاب عبد اللہ جمیعا۔

(جامع مسانید امام اعظم ص ۳۱۰ ج ۱)

یعنی حضرت علقمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام کے پیچھے کوئی حرف نہیں پڑھتے تھے، نہ ان نمازوں میں جن میں قرأت بالجہر پڑھی جاتی ہے اور نہ ان نمازوں میں جن میں بالجہر نہیں پڑھی جاتی، اور انہوں نے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ آخر کی دو رکعتوں میں پڑھی اور نہ ان کے غیر میں اور نہ اصحاب عبد اللہ نے۔

حدیث (۳۶) مسند امام احمد میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ان رسول اللہ ﷺ قال: من کان له امام فقرأة الامام له قرأة۔

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کا امام ہو تو امام کا قرأت کرنا اس کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۳۷) مسند امام احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: صلی رسول اللہ ﷺ باصحابه صلوة اظن انھا الصبح فقال ھل قرأ منکم من احد؟ قال رجل: انا، قال: انی اقول مالی انازع القرآن۔

یعنی رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کے ساتھ ایک نماز پڑھی، مجھے خیال ہے کہ وہ نماز صبح تھی، فرمایا: کیا تم میں سے کسی نے قرأت کی؟ ایک شخص نے عرض کیا: میں نے، فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا کہ میں قرآن میں منازعت کیا جاؤں۔

حدیث (۳۸) مسند امام احمد میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: لا صلوۃ الا بقرأة فاتحة الکتاب فی کل رکعة الا وراء الامام۔

یعنی نماز کی ہر بغیر سورۂ فاتحہ پڑھے کامل نہیں ہوتی مگر جب امام کے پیچھے ہو۔

حدیث (۳۹) دار قطنی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے: ان رسول اللہ ﷺ قال :من کان له امام فقرأة الامام له قرأة۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا: جس کا امام ہوتو امام کا قرأت کرنا اس کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۴۰) اسی دار قطنی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے: قال رسول الله ﷺ: یکفیك قرأة الامام خافتاو جهرا ۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تجھے امام کی قرأت کافی ہے، سری ہو یا جہری۔

حدیث (۴۱) اسی دار قطنی میں حضرت مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: من قرأ خلف الامام فقد اخطأ الفطرة ۔

یعنی جس نے امام کے پیچھے قرأت کی تو اس نے فطرت سے خطا کی۔

حدیث (۴۲) اسی دار قطنی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: انما جعل الامام لیؤتم به فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا۔

یعنی امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، پس جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۴۳) اسی دار قطنی میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: کان النبی ﷺ یصلی بالناس ورجل یقرأ خلفه فلما فرغ قال من ذا الذی یخالجنی سورة کذا فنهاهم عن القرأة۔

یعنی حضور نبی کریم ﷺ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے، ایک شخص نے حضور کے پیچھے قرأت کی جب حضور ﷺ فارغ ہوئے تو فرمایا: کون ہے جس نے فلاں سورت کے ساتھ مجھ سے منازعت کی تو حضور ﷺ نے انہیں امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع فرمادیا۔

حدیث (۴۴) اسی دار قطنی میں حضرت مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: قال رجل أقرأ خلف الامام او انصت ؟قال بل انصت فانه یکفیك ۔

یعنی ایک شخص نے حضور حضور نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: میں امام کے پیچھے قرأت کروں یا خاموش رہوں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: بلکہ خاموش رہو کہ تجھے یہی کافی ہے۔

حدیث (۴۵) اسی دارقطنی میں حضرت شعبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ان النبی ﷺ قال :لا قرأة خلف الامام ۔ یعنی حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: امام کے پیچھے قرأت نہیں۔

حدیث (۴۶) طبرانی نے اپنی معجم اوسط میں حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی :قال رسول اللہ ﷺ:من کان له امام فقرأة الامام له قرأة۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کا امام ہوتو امام کا قرأت کرنا اس کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۴۷) صحاح ستہ کے ائمہ سے امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ ان سب کے استاذ حضرت ابوبکر ابن ابی شیبہ اپنی مصنف میں حضرت علقمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ :ان عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنه کان لا یقرأ خلف الامامفیما یجهر و لا فیما یخافت فیه و اذا صلیٰ وحده قرأ فی الاولیین بفاتحة الکتاب و سورة و لم یقرأ فی الاخرین سورة۔

یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے، نہ ان نمازوں میں جن میں جہر کیا جاتا ہے اور ان نمازوں میں جن میں آہستہ پڑھا جاتا ہے، اور جب تنہا پڑھتے تو پہلی دو رکوتوں میں فاتحہ پڑھتے اور ساتھ میں سورت بھی، اور پچھلی دونوں رکعتوں میں کوئی سورت نہیں ملاتے۔

حدیث (۴۸) اسی مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: من کان له امام فقرأته له قرأة ۔ یعنی جس شخص کے لئے امام ہوتو اس امام کا قرأت کرنا اسی کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۴۹) اسی مصنف ابن ابی شیبہ میں انہیں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ :قال لا یقرأ خلف الامام ۔یعنی حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرے۔

حدیث (۵۰) اسی مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے مروی ہے :قال من قرأ خلف الامام فقد اخطأ الفطرة ۔ یعنی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جس نے امام کے پیچھے قرأت کی تو اس نے فطرت سے خطا کی۔

حدیث (۵۱) اسی میں ابووائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: جاء رجل الی عبد اللہ

فقال اقرأ خلف الامام فقال :ان فی الصلوۃ شغلا و سیکفیك قرأۃ الامام ۔ یعنی ایک شخص حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: کہ امام کے پیچھے قرأت کروں؟ تو فرمایا: نماز میں یہ ایک شغل ہے اور تجھے امام کا قرأت کرنا کافی ہے۔

حدیث (۵۲) مؤطا امام محمد میں وہب بن کیسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ :انہ سمع جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یقول :من صلیر کعۃ لم یقرأ فیھا بام القرآن فلم یصل الا وراء الامام ۔ (مؤطا امام محمد مصطفائی باب القرأۃ فی الصلوۃ خلف الامام ص ۹۳)

یعنی وہب نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا، وہ فرماتے ہیں: کہ جس نے ایک رکعت پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس نے نماز ہی نہ پڑھی مگر جب امام کے پیچھے ہو۔

حدیث (۵۳) اسی مؤطا امام محمد میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ :قال رسول اللہ ﷺ :من صلی خلف الامام فان قرأۃ الامام لہ قرأۃ ۔

(مؤطا امام محمد باب مذکور ص ۹۶)

یعنی حضور انور ﷺ نے فرمایا: کہ جس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو بیشک امام کا قرأت کرنا اس کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۵۴) اسی مؤطا امام محمد میں ہے :عن وائل قال سئل عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن القرأۃ خلف الامام ،قال انصت فان فی الصلوۃ شغلا و سیکفیك ذالك الامام ۔ (مؤطا امام محمد باب مذکور ص ۹۶)

یعنی حضرت وائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قرأت خلف الامام کا مسئلہ دریافت کیا گیا تو فرمایا خاموش رہو یعنی امام کے پیچھے قرأت نہ کرو، بیشک نماز میں یہ ایک شغل ہے اور امام کا قرأت کرنا تیرے لئے کافی ہے۔

حدیث (۵۵) اسی موطا امام محمد میں ہے :ان عبد اللہ بن مسعود کا ن لا یقرأ خلف الا مام فی ما یجھر فیہ لا فی الا ولیین ولا فی الا خرین ۔

(موطا امام محمد باب مذکور ص ۹۶)

یعنی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرتے تھے، نہ جہری نماز میں نہ سری نماز میں نہ پہلی دو رکعتیں میں نہ پچھلی دو رکعت میں۔

حدیث (۵۶) اسی موطا امام محمد میں ہے: عن نافع عن ابن عمر قال :اذا صلی احد کم خلف الا م فحسبه قرأة الا مام و اذا صلی وحده فلیقرأ قال: و کا ن عبد الله بن عمر لا یقرأ خلف الا مام۔ (موطا امام محمد باب مذکور ص ۹۳)

یعنی حضرت نافع سے مروی کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا کہ جب تمہارا کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اسے امام کا قرأت کا کرنا کافی ہے۔اور جب تنہا نماز پڑھے تو قرأت کرے۔راوی نے کہا کہ عبداللہ بن عمر امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے۔

حدیث (۵۷) اسی موطا امام محمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے :ان رسول الله ﷺ انصرف من صلوة جهر فيها بالقرأة فقال هل قرأ معی منکم من احد فقال رجل انا یا رسول الله !قال فقال انی اقول ما لی انازع القرآن فانتهی الناس عن القرأة مع رسول الله ﷺ فيما جهر به من الصلوة حين سمعوا ذلك۔

(مؤطا امام محمد مصطفائی باب القرأۃ فی الصلوۃ خلف الامام ص ۹۳)

یعنی رسول اللہ ﷺ اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں قرأت بالجہر ہوتی ہے،فرمایا: کیا تم میں سے کسی نے میرے ساتھ قرأت کی؟ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ میں نے،حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: کہ حضور نے فرمایا؛ میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا کہ میں قرآن میں منازعت کیا جاؤں،تو لوگ حضور ﷺ کے ساتھ جہری نمازوں میں قرأت سے باز رہے جب سے انہوں نے یہ سنا۔

حدیث (۵۸) اسی مؤطا امام محمد میں نافع سے مروی ہے:ان ابن عمر کان اذا سئل هل یقرأ احد مع الامام قال اذا صلی احد کم مع الامام فحسبه قرأة الامام و کا ن ابن عمر لا یقرأ مع الامام۔ (مؤطا امام محمد باب مذکور ص ۹۳)

یعنی جب حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے دریافت کیا گیا کہ کیا کوئی امام کے ساتھ قرأت کرے تو فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص امام کے ساتھ نماز پڑھے تو اس کو امام کا قرأت کرنا کافی ہے اور ابن عمر امام کے ساتھ قرأت نہیں کرتے تھے۔

حدیث (۵۹) اسی موطا امام محمد میں ہے:عن ابن عمر قال :من صلی خلف الامام کفته قرأته۔ (موطا امام محمد باب مذکور ص ۹۴)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں جس نے امام کے پیچھے نماز

پڑھی تو اسے امام کی قرأت کافی ہے۔

حدیث (۶۰) اسی موطا امام محمد میں ہے: عن ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنهما انه سئل عن القرأة خلف الامام قال تکفیك قرأة الامام۔ (موطا امام محمد باب مذکور ص ۹۴)

انہیں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے قرأت خلف الامام کا مسئلہ پوچھا گیا تو فرمایا: تجھ کو امام کی قرأت کافی ہوگی۔

حدیث (۶۱) اسی موطا امام محمد میں ہے: عن ابن مسعود رضی الله تعالیٰ عنه قال انصت للقرأة فان فی الصلوة شغلا و سیکفیك الامام۔ (موطا امام محمد باب مذکور ص ۹۸)

یعنی حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: تو قرأت کے لئے خاموش ہو، بیشک نماز میں ایک شغل اور تجھے امام کافی ہے۔

حدیث (۶۲) اسی موطا امام محمد میں حضرت عبداللہ بن شداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: ام رسول الله فی العصر قال فقرأ رجل خلفه فغمزه الذی یلیه فلما صلی قال لم غمزتنی ؟قال : کان رسول الله ﷺ قدامك فكرهت ان تقرأ خلفه فسمع النبی ﷺ فقال :من کان له امام فان قرأته له قرأة۔ (موطا امام محمد باب مذکور ص ۹۸)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے نماز عصر میں امامت فرمائی، راوی نے کہا کہ ایک شخص نے حضور ﷺ کے پیچھے قرأت کی تو اس کے پڑوسی نے اس کو اشارہ سے روکا تو جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو اس نے پڑوسی سے، کہا کہ تو نے مجھے اشارہ سے کیوں روکا تو اس نے جواب دیا کہ حضور ﷺ تیرے آگے تھے تو میں نے تیری حضور کے پیچھے قرأت کو مکروہ جانا، تو اس کو نبی ﷺ نے سنا اور فرمایا: جس کے لئے امام ہو تو بیشک اس امام کا قرأت کرنا اسی کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۶۳) اسی موطا امام محمد میں ہے: عن علقمة بن قیس قال: لان اعض علی جمرة احب الی من ان اقرأ خلف الامام۔ (موطا امام محمد باب مذکور ص ۹۸)

یعنی حضرت علقمہ ابن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: مجھے آگ کی چنگاری کو منہ میں لینا امام کے پیچھے قرأت کرنے سے زیادہ پسند ہے۔

حدیث (۶۴) اسی موطا امام محمد میں ہے: عن ابراهیم رضی الله تعالیٰ عنه قال :ان اول من قرأ خلف الامام رجل اتهم۔ (موطا امام محمد ص ۹۸)

یعنی حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: امام کے پیچھے سب سے پہلے جس نے قرأت کی وہ متہم شخص تھا۔

حدیث (۶۵) اسی مؤطا امام محمد میں ہے: ان سعدا قال: وددت ان الذی یقرأ خلف الامام فی فیہ جمرۃ۔ (موطا امام محمد ص ۹۸)

یعنی حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں پسند کرتا ہوں کہ جو امام کے پیچھے قرأت کرے اس کے منہ میں چنگاری ہو۔

حدیث (۶۶) اسی مؤطا امام محمد میں ہے: ان عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: لیت فی فم الذی یقرأ خلف الامام حجرا۔ (مؤطا امام محمد ص ۹۸)

یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کاش کہ امام کے پیچھے پڑھنے والے کے منہ میں پتھر ہوتا۔

حدیث (۶۷) اسی مؤطا امام محمد میں ہے: ان زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: من قرأ خلف الامام فلا صلوۃ لہ۔ (مؤطا امام محمد ص ۱۰۰)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جس نے امام کے پیچھے قرأت کی تو اس کی نماز نہیں۔

حدیث (۶۸) شرح معانی الآثار معروف طحاوی میں ہے: عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: ان رسول اللہ ﷺ انصرف من صلوۃ جھر فیھا بالقرأۃ فقال ھل قرأ منکم معی احد انفا؟ فقال رجل نعم یا رسول اللہ! فقال رسول اللہ ﷺ: انی اقول مالی انازع القرآن، قال فانتھی الناس عن القرأۃ مع رسول اللہ ﷺ فیما جھر فیہ رسول اللہ ﷺ بالقرأۃ من الصلوات حین سمعوا ذلک منہ۔ (طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۸ باب القرأۃ خلف الامام)

یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں قرأت بالجہر ہوتی ہے فرمایا: کیا تم میں سے ابھی میرے ساتھ کسی نے قرأت کی؟ ایک شخص نے عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ! تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا کہ میں قرآن میں منازعت کیا جاؤں، راوی نے کہا کہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قرأت کرنے سے ان نمازوں میں باز رہے جن میں رسول اللہ ﷺ قرأت بالجہر فرماتے تھے جب سے لوگوں نے حضور ﷺ سے یہ سنا۔

حدیث (۶۹) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن ابی هريرة رضی الله تعالیٰ عنه قال: قال رسول الله ﷺ: انما جعل الامام ليؤتم به فاذاقرأفانصتوا۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۸ باب القرأۃ خلف الامام)

یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے تو جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۷۰) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن عبد الله رضی الله تعالیٰ عنه قال: كانوا يقرؤن خلف النبی ﷺ فقال خلطتم علی القرأة۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۸ باب القرأۃ خلف الامام)

یعنی حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کہ لوگ حضور نبی کریم ﷺ کے پیچھے قرأت کرتے تھے تو حضور ﷺ نے فرمایا: تم نے مجھ پر قرأت خلط کردی۔

حدیث (۷۱) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن جابر رضی الله تعالیٰ عنه قال: ان النبی ﷺ قال: من كان له امام فقرأة الامام له قرأة۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۸ باب القرأۃ خلف الامام)

یعنی حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس شخص کا امام ہو تو امام کا قرأت کرنا اسی کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۷۲) اسی طحاوی شریف میں ہے: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے انہیں الفاظ اور مضمون کے ساتھ مروی ہے۔ (طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۸ باب القرأۃ خلف الامام)

حدیث (۷۳) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن جابر رضی الله تعالیٰ عنه قال: ان النبی ﷺ قال: من صلى ركعة فلم يقرأ فيها بام القرآن فلم يصل الا وراء الامام۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۸ باب القرأۃ خلف الامام)

یعنی حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے ایک رکعت پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس نے نماز ہی نہ پڑھی مگر امام کے پیچھے۔

حدیث (۷۴) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن انس رضی الله تعالیٰ عنه قال: صلى رسول الله ﷺ ثم اقبل بوجهه فقال: اتقرؤن والامام يقرأ فسكتوا فسألهم ثلاثافقالوا انا

لنفعل قال فلا تفعلوا۔ (طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۸ اباب القرأۃ خلف الامام)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: کیا تم لوگ قرأت کرتے ہو اور امام بھی قرأت کر رہا ہے تو لوگ چپ رہے یہاں تک کہ حضور ﷺ نے ان سے تین مرتبہ سوال کیا تو بولے بیشک ہم نے قرأت کی، حضور ﷺ نے فرمایا: تم قرأت نہ کرو۔

حدیث (۷۵) اسی طحاوی شریف میں ہے: قال علی رضی الله تعالیٰ عنه: من قرأ خلف الامام فليس على الفطرة۔ (طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۸ اباب القرأۃ خلف الامام)

یعنی حضرت مولی علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جس شخص نے امام کے پیچھے قرأت کی تو وہ فطرت پر نہیں۔

حدیث (۷۶) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن عبد الله بن مسعود رضی الله تعالیٰ عنه قال: انصت للقرأة فاب فی الصلوة شغلا وسيكفيك ذلك الامام۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۸ اباب القرأۃ خلف الامام)

یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: خاموش رہو یعنی امام کے پیچھے قرأت نہ کرو بیشک نماز مین یہ ایک شغل ہے اور امام تجھے کافی ہے۔

حدیث (۷۷) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن ابن مسعود رضی الله تعالیٰ عنهقال: ليت الذی يقرأ خلف الامام ملئ فوه ترابا۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۹ اباب القرأۃ خلف الامام)

یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کاش کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرے اس کا منہ خاک سے بھر دیا جائے۔

حدیث (۷۸) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن عبيد الله رضی الله تعالیٰ عنه انه سأل عبد الله بن عمر وزيد بن ثابت وجابر بن عبد الله رضی الله تعالیٰ عنهم فقالوا: لا تقرأ خلف الامام فی شی من الصلوات۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۹ اباب القرأۃ خلف الامام)

یعنی حضرت عبیداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نےعبداللہ بن عمر وزید بن ثابت وجابر بن عبداللہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہم سے قرأت خلف الامام کا مسئلہ دریافت کیا تو ان ہرسہ حضرات نے جواب دیا کہ نمازوں میں سے کسی نماز میں امام کے پیچھے قرأت نہ کرو۔

حدیث (۷۹) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن ابی حمزۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہقال :قلت لابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اقرأ والامام بین یدی فقال :لا۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۹ باب القرأۃ خلف الامام)

یعنی حضرت ابوحمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے عرض کیا: کہ میں نماز میں قرأت کرسکتا ہوں اور امام آگے موجود ہو تو فرمایا: نہیں۔

حدیث (۸۰) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال :ان عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کان اذا سئل ھل یقرأ احد خلف الامام یقول :اذا صلی احدکم خلف الامام فحسبہ قرأۃ الامام وکان عبد اللہ بن عمر لا یقرأ خلف الامام۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۹ باب القرأۃ خلف الامام)

یعنی جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے دریافت کیا جاتا کہ کیا امام کے پیچھے کوئی قرأت کرے تو فرماتے جب تمہارا کوئی شخص امام کے کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کا قرأت کرنا کافی ہے ،اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے۔

حدیث (۸۱) سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے :عن ابی موسی الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال :ان رسول اللہ ﷺ کان یعلمنا اذا صلی بنا فقال :انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۶ ج ۲

باب من قال یترک الماموم القرأۃ فیما جھر فیھا الامام بالقرأۃ)

یعنی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کہ رسول اللہ ﷺ جب ہمیں نماز پڑھاتے تو ہمیں تعلیم کرتے اور فرماتے کہ امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے ،تو جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۸۲) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال :ان النبی ﷺ قال :انما جعل الامام لیؤتم بہ فلا تختلفوا علیہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فا

نصتوا واذا قال غير المغضوب عليهم ولا الضالين فقولوا آمين۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد ص ۱۵۶ ج ۲ باب من قال یترک الماموم القرأۃ فیما جھر فیھا الامام بالقرأۃ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے تو تم امام سے اختلاف نہ کرو، اور جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب امام غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔

حدیث (۸۳) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن ابی هريرة رضى الله تعالىٰ عنه قال: ان النبی ﷺ ان النبی ﷺ انصرف من صلوة جهر فيها با لقرأة فقال هل قرأ معی احد منكم انفا فقالرجل نعم يا رسول الله! قال انی اقول ما لی انازع القرآن قال فانتهى الناس عن القرأة مع رسول الله ﷺ فيما جهر فيه النبی ﷺ بالقرأة من الصلوات حين سمعوا ذلك من رسول الله ﷺ۔ (السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد ص ۱۵۶ ج ۲ باب من قال یترک الماموم القرأۃ فیما جھر فیھا الامام بالقرأۃ)

یعنی حضور نبی کریم ﷺ اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں جہری قرأت پڑھی جاتی ہے۔ فرمایا کیا تم میں سے کسی نے میرے ساتھ ابھی قرأت کی ایک شخص نے عرض کی ہاں یارسول اللہ فرمایا میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا کہ میں قرآن میں منازعت کروں۔ راوی نے کہا کہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قرأت کرنے ان نمازوں میں باز رہے جن میں حضور قرأت نہ کرتے جب سے انہوں نے یہ رسو اللہ ﷺ سے سنا۔

حدیث (۸۴) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن عبد الله بن بحينة رضى الله تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله ﷺ: هل قرأ احد منكم انفا فی الصلوة؟ قالوا نعم، قال: انی اقول ما لی انزر القرآن فانتهى الناس عن القرأة حين قال ذلك۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد ص ۱۵۸ ج ۲)

یعنی حضرت عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم میں سے کسی نے ابھی نماز میں قرأت کی؟ لوگوں نے عرض کیا: ہاں، فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا

کہ قرآن میں منازعت کیا جاؤں، تو لوگ جب سے حضور ﷺ نے فرمایا قرأت کرنے سے باز رہے۔

حدیث (۸۵) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن جابر بن عبد الله رضی الله تعالیٰ عنه قال: ان النبی ﷺ صلیٰ و کان من خلفه یقرأ فجعل رجل من اصحاب النبی ﷺ ینهاه عن القرأة فی الصلوة فلما انصرف اقبل علیه الرجل فقال: اتنهانی عن القرأة خلف رسول الله ﷺ فتنازعا حتی ذکر ذلك لرسول الله ﷺ فقال النبی ﷺ: من صلی خلف الامام فان قرأة الامام له قرأة۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب من قال لایقرأ خلف الامام علی الاطلاق)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھائی اور آپ کے پیچھے ایک شخص قرأت کرتا تھا، تو حضور ﷺ کے اصحاب میں سے ایک صحب اس کو نماز میں قرأت کرنے سے منع کرنے لگے تو جب وہ شخص نماز سے فارغ ہوا تو ان صحابی کی طرف متوجہ ہوکر بولا کیا تم نے مجھے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کیا؟ تو انہوں نے جھگڑا کیا یہاں تک کہ حضور نبی کریم ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو امام کے پیچھے نماز پڑھے تو بیشک امام کا ورأ تکرنا اسی کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۸۶) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن عبد الله بن شداد رضی الله تعالیٰ عنه قال: قال رسول الله ﷺ: من کا ن له امام فان قرأة الامام له قرأة۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

حضرت عبد اللہ بن شداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کے لئے امام ہو تو امام کا قرأت کرنا اس مقتدی کا قرأت کرنا ہے

حدیث (۸۷) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن جابر بن عبد الله رضی الله تعالیٰ عنه قال: قال رسول الله ﷺ: من کا ن له امام فقرأة الامام له قرأة۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس کے لئے امام ہو تو امام کا قرأت کرنا اسی کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۸۸) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن جابر بن عبد الله رضی الله تعالیٰ عنه قال: من صلیٰ رکعة لم يقرأ فيها بام القرآن فلم يصل الا وراء الامام۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا: جس شخص نے ایک رکعت پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس نے نماز ہی نہ پڑھی مگر جب امام کے پیچھے ہو۔

حدیث (۸۹) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن ابی وائل رضی الله تعالیٰ عنه قال: ان رجلا سأل ابن مسعود رضی الله تعالیٰ عنه عن القرأة خلف الامام فقال: انصت للقرآن فان فی الصلوة شغلا وسيكفيك ذاك الامام۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

ایک شخص نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قرأت خلف الامام کا مسئلہ دریافت کیا تو فرمایا: قرآن کے لئے خاموش رہو، بیشک یہ نماز میں ایک شغل ہے اور تجھے یہ امام کافی ہے۔

حدیث (۹۰) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن نافع عن ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنه انه كان يقول: من صلی وراء الامام كفاه قرأة الامام۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

حضرت نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے: جس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی اس کے لئے امام کی قرأت کافی ہے۔

حدیث (۹۱) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنه قال: كان رسول الله ﷺ يصلی بالناس ورجل يقرأ خلفه فلما فرغ قال: من ذا الذی يخالجنی سورتی فنهی عن القرأة خلف الامام۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک شخص نے آپ کے پیچھے قرأت کی، جب حضور ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھ سے کسی نے میری سورت میں منازعت کی تو امام کے پیچھے قرأت سے منع فرمایا۔

حدیث (۹۲) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن عمران بن حصین رضی الله تعالیٰ عنه قال :ان النبی ﷺ صلی یوما الظهر فجاء رجل فقرأ خلفه سبح اسم ربك الاعلیفلما فرغ قال:ایكم القاری ؟قال:انا،قال:قد ظننت ان بعضكم خالجنيها ـ

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ ایک دن ظہر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک شخص آئے اور انہوں نے آپ کے پیچھے سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھا، جب حضور فارغ ہوئے تو فرمایا: تم میں سے کون قرأت کر رہا تھا؟ ایک شخص نے کہا: میں، فرمایا: میں نے جانا کہ تم میں سے بعض نے میرے ساتھ قرأت میں منازعت کی۔

حدیث (۹۳) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن ابی الدرداء رضی الله تعالیٰ عنه قال:سئل رسول الله ﷺ افی كل صلوة قرأة قال :نعم ،فقال رجل من الانصار :وجبت هذه ،فقال لی رسول الله ﷺ وكنت اقرب القوم اليه ،ما ارى الامام اذا ام القوم الا قد كفاهم ـ (السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا ہر نماز میں قرأت ہے؟ فرمایا: ہاں، انصار میں سے ایک شخص نے کہا: قرأت واجب ہوگئی، تو رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا: کہ میں قوم میں حضور ﷺ سے زیادہ قریب تھا، میں امام کو جانتا ہوں جب وہ قوم کی امامت کرتا ہے تو وہی ان کے لئے کافی ہے۔

حدیث (۹۴) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن عطا بن یسار رضی الله تعالیٰ عنهقال: سئل زيد بن ثابت رضی الله تعالیٰ عنهعن القرأة مع الامام فقال: لا اقرأ مع الامام

فی شیٔ۔ (السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۹
ج ۲ باب مذکور)

حضرت عطا بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے امام کے کے ساتھ قرأت کرتے کا مسئلہ دریافت کیا گیا تو فرمایا: میں امام کے ساتھ کچھ نہیں پڑھتا ہوں۔

حدیث (۹۵) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن زید بن ثابت رضی الله تعالیٰ عنه قال :من قرأ وراء الامام فلا صلوة ۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۹
ج ۲ باب مذکور)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جس شخص نے امام کے پیچھے قرأت کی تو اس کی نماز نہیں۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

﴿۲۰﴾

باب الجماعۃ

مسئلہ (۲۷۸)
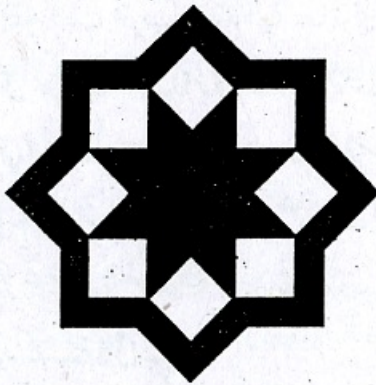
کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص جماعت ثانیہ کے حرام ہونے کا قائل ہے۔ دریافت یہ امر ہے کہ از روئے شرع جماعت ثانیہ حرام ہے یا نہیں؟

از رام نگر منڈی

الجواب

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم

سائل کا جماعت ثانیہ کو حرام کہنا کتب فقہ کے بالکل خلاف ہے۔ حرام ایک بہت بڑی چیز ہے۔ وہ کتنی ہی عرق ریزی کرے اس کا ناجائز ہونا بھی ثابت نہیں کر سکتا۔ جماعت ثانیہ فقہائے کرام کے نزدیک بالاتفاق جائز ہے۔

الحجة القاطعة میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ ناقل ہیں۔

ویجوز تکرار الجماعة بلا اذان واقامة ثانية اتفاقا وفی بعضها اجماعا بلا کراهة قال فی شرح الدرر هو الصحیح۔

یعنی جماعت کی تکرار بغیر اذان وتکبیر کے اجماعاً بلا کراہت جائز ہے۔ اس قول میں جماعت ثانیہ کے بلا کراہت جائز ہونے بلکہ اجماع بلا کراہت پر کیسی صاف صراحت ہے۔ علاوہ بریں درر میں یہ تصریح کردی کہ صحیح بھی یہی قول ہے۔ اسی میں مجمع البحرین سے منقول ہے۔

وتکرار ها فی مسجد محلة باذان ثان یعنی اذا کان للمسجد امام معلوم وجماعة معلومة فصلوا فیه بجماعة باذان واقامة لایباح تکرار الجماعة باذان واقامة عندنا وقید باذان ثان لا نهم ان صلوا بلا اذان ثان یباح اتفاقا۔

یعنی محلہ کی مسجد میں دوسری اذان کے ساتھ جماعت کا مکرر کرنا جب کہ اس مسجد میں امام اور مقتدی متعین ہوں اور اذان واقامت کے ساتھ جماعت پڑھ چکے ہوں اسی مسجد میں ہمارے نزدیک

جماعت کا اذان واقامت کے ساتھ مکرر کرنا غیر مباح ہے۔ اور اذان ثانی کی قید میں یہ فائدہ ہے کہ اگر جماعت کا بغیر اذان اعادہ کیا جائے تو باتفاق علماء مباح ہے۔ اسی میں ہے:

ثم قد علمت ان الصحیح انه لا یکره تکرار الجماعة اذالم تکن علی هیئة الاولیٰ۔

یعنی میں نے یہ تحقیق اس کا صحیح ہونا جانا کہ جماعت جب پہلی ہیئت پر نہ ہو تو مکروہ نہیں ہے۔

عالمگیری میں ہے: المسجد اذاکان له امام معلوم وجماعة معلومة فی محلة فصلی اهله فیه بالجماعه لا یباح تکرارها فیه باذان ثان اما اذا صلوا بغیر اذان یباح اجماعا۔

یعنی جب مسجد محلہ میں امام اور مقتدی متعین ہوں اور وہ جماعت پڑھ چکے ہوں اس میں دوسری اذان کے ساتھ جماعت کا مکرر کرنا غیر مباح ہے لیکن بلا اذان جماعت ثانیہ مباح ہے بالاجماع۔

ان عبارتوں سے ثابت ہوا کہ جماعت ثانیہ بلا کراہت جائز ہے۔ اور اسی پر اجماع بھی ہے۔ لیکن محلہ کی مسجد مین اذان جماعت ثانیہ کے لئے دوبارہ نہ کہی جائے اور امام کی جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ جماعت قائم کی جائے۔

الحجۃ القاطعۃ میں ردالمحتار سے ناقل ہیں: عن ابی یوسف اذالم تکن علی الهیئة الاولیٰ لا تکره والاتکره وهو الصحیح۔ وبالعدول عن المحراب تختلف الهیئة کذا فی البزازیة۔

یعنی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ جب پہلی ہیئت پر نہ ہو تو مکروہ نہیں ہے۔ ورنہ مکروہ اور قول صحیح ہے۔ اور محراب سے علحدہ ہونا ہی ہیت کو بدلتا ہے۔

بلکہ فقہاء اس کی بھی تصریح فرماتے ہیں۔ کہ بازار کی مسجد میں جماعت ثانیہ کے لئے اذان واقامت کا اعادہ افضل ہے۔

خزائن الاسرار شرح تنویر الابصار میں ہے: لو کان مسجد طریق جاز اجماعا کما فی مسجد لیس له امام ولا موذن ویصلی الناس فیه فوجا فوجا فان الافضل ان یصلی کل فریق باذان واقامة علی حدة کما فی امالی قاضی خاں۔

یعنی اگر مسجد راستہ کی ہو اور اس میں گروہ گروہ آکر نماز پڑھتے ہیں تو افضل یہ ہے کہ ہر گروہ اذان واقامت کے ساتھ جماعت کریں اس کے جواز پر اجماع ہے اس مسجد کی مانند کہ جس میں امام مؤذن مقرر نہ ہوں۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۲۷۹)

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک مقتدی دوسری رکعت میں امام کے ساتھ جماعت میں آ کر ملا۔ امام صاحب نے دو رکعت کے بعد تشہد پڑھی اور اس مقتدی کی ایک رکعت والے نے بھی تشہد پڑھی۔ امام صاحب نے دو رکعت پوری کر کے تشہد پڑھی اور اس مقتدی نے بھی تشہد پڑھی اور ایک باقی رکعت کو پورا کر کے پھر تشہد پڑھی اس مقتدی کی چار رکعت میں تین تشہد ہوئے۔ جو شخص جان کر ایسا کرے اس کی نماز میں شریعت کے لحاظ سے کچھ نقص تو واقع نہیں ہوتا؟۔ یا کسی سے سہوا ایسا ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہے۔ بینوا توجروا

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

اس میں کوئی نقص نہیں۔ اس مقتدی کو ایسا ہی کرنا چاہئے۔ یہاں تو چار رکعتوں میں تین تشہد ہوئے اور کتب فقہ میں تو ایسی صورت بھی لکھی ہے جس میں تین رکعتوں میں دس تشہد ہوں۔

ادرك الامام فی تشهد المغرب الاول وتشهد معه فی الثانية وكان عليه سهو فسجده وتشهد معه فی الثالثة وتذكر الامام سجدة تلاوة فسجدمعه و تشهد الرابعة وسجد للسهو وتشهد معه الخامسة۔ فاذ سلم قام الی قضاء مافاته فصلی ركعة تشهد السادسة ويصلی ركعة اخری ويتشهد السابعة ۔ وكان قد سها فيما يقضی فيسجد ويتشهد الثامنة ثم تذكر انه قرأ آية سجدة فی قضائه فيسجد لهاو يتشهد التاسعة ثم يسجد للسهو ويتشهد العاشرة ۔ (طحطاوی علی مراقی الفلاح مصری ص ۲۷۰)

لہذا یہ صورت بلاشبہ جائز ہے۔ واللہ تعالیٰ علم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۸۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک امام صاحب نے صبح کی نماز پہلی رکعت میں سورۂ یٰسین کا آخری پورا رکوع پڑھ کر اس کے متصل دوسری سورۃ والصافات کا پہلا پورا رکوع پڑھا۔ ایسا کرنے سے لوگوں کی نماز ہو جاتی ہے یا کہ نہیں اور کیا کیا نماز میں نقص واقع ہوتے ہیں؟۔ آپ مع فقہ کی کتاب یا حدیث سے ساتھ صفحہ وباب کے حوالہ دیں۔ بینوا توجروا

الجواب

نحمده ونصلى ونسلم على رسوله الكريم

صورت مسئولہ میں بلاشک نماز ہو جائے گی لیکن یہ خلاف اولیٰ ہے۔

تاتارخانیہ میں ہے:

اذا جمع بين سورتين في ركعة رأيت في موضع انه لا باس به وذكر شيخ الامام لاينبغي له ان يفعل على ما هو ظاهر الرواية ۔ (ردالمحتار مصری ج ا ص ۳۸۳)

غنیۃ المستملی شرح المنیہ میں ہے:

الاولیٰ ان لايفعل فى الفرض ولوفعل لايكره ۔ (غنیۃ مطبوعہ فخر المطابع لکھنؤ ص ۴۶۲)

لہذا صورت مسئولہ میں صرف اولویت کا خلاف لازم آتا ہے اور کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۸۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع کہ

ایک مسجد کے امام کا کئی مرتبہ چوری کی عادت اس کے مقتدیوں کو پایہ ثبوت تک پہونچ گئی۔ اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ یہ امام صاحب اسی مسجد کی امامت پر برقرار رکھے جا سکتے ہیں؟۔ بینوا توجروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جب چوری کرنا گناہ کبیرہ ہے تو چور ارتکاب کبیرہ کی وجہ سے فاسق ہوا۔

ردالمحتار میں ہے: المراد به من يرتكب الكبائر كشارب الخمر والزانى واكل الربا ونحو ذلك۔ (ردالمحتار ۳۹۳)

فاسق سے، مراد وہ شخص ہے جو کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرے جیسے شراب پینے والا، زنا کرنے والا، سود کھانے والا اور مثل اس کے۔

علامہ طحطاوی شرح مراقی الفلاح میں فاسق کی بحث میں فسق کی شرعی تعریف لکھتے ہیں:

وشرعا خروج عن طاعة الله تعالىٰ بارتكاب كبيرة۔ (طحطاوی ص ۱۷۶)

فسق شریعت میں ارتکاب کبیر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طاعت سے خارج ہونے کا نام ہے۔

اور فاسق کی امامت مکروہ ہے۔

کنز الدقائق میں ہے: كره امامة العبد والاعرابى والفاسق۔ (عینی ج ا ص ۳۷)

غلام۔ دہقانی۔ فاسق کی امامت مکروہ ہے۔

ملتقی الابحر میں ہے:

تكره امامة العبد والاعرابى والاعمى والفاسق۔ (حاشیہ شرح وقایہ فارسی ص ۳۴)

غلام۔ دہقانی۔ نابینا۔ فاسق کی امامت مکروہ ہے۔

نور الایضاح میں ہے: كره امامة العبد والاعمى والاعرابى وولدزنا والجاهل والفاسق۔ (نور الایضاح ص ۲۲)

غلام، نابینا، دہقانی، حرامی، جاہل، فاسق کی امامت مکروہ ہے۔

مراقی الفلاح میں ہے: كره امامة الفاسق لعدم اهتمامه بالدين فتجب اهانة شرعا ولايعظم بتقديمه للامامة۔ (ص ۱۷۶)

فاسق عالم کی اہانت بوجہ دینی اہتمام ہونے کے مکروہ ہے اور شرعا اس کی اہانت واجب ہے تو اس کو امامت کے لئے پیش کر کے تعظیم نہ کی جائے۔

تنویر الابصار میں ہے: يكره امامة عبد واعرابى وفاسق۔ (شامی ج ا ص ۳۹۳)

غلام۔ دہقانی۔ فاسق کی امامت مکروہ ہے۔

بالجملہ فاسق کی امامت مکروہ ہے اور اس کراہت سے مراد مکروہ تحریمی ہے۔

چنانچہ شرح منیہ میں ہے: ان کراهة تقديمه كراهة تحريم ۔ (غنیۃ ص ۴۷۹)

فاسق کے امامت کے لئے پیش کرنے کی کراہت تحریمی کراہت ہے۔

طحطاوی میں ہے: مفاده كون الكراهة في الفاسق تحريمة ۔ (ص ۱۷۶)

امامت فاسق کے مکروہ ہونے کا مفاد تحریمی ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ چور کی اپنے فسق کی وجہ سے امامت مکروہ تحریمی ہے اور جب وہ چوری کا عادی ہے اور مقتدیوں کو اسکا فسق پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے تو اس کی امامت بدرجہ اولیٰ مکروہ تحریمی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۸۲)

علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں

کہ زید اپنے ساتھیوں کے ساتھ مسجد میں بیٹھا رہتا ہے۔ پہلی جماعت جب ختم ہوئی امام نے سلام پھیرا تو فوراً وہ دوسری جماعت کرتا ہے۔ مسلمانوں میں تفریق پیدا کرتا ہے اور کر رہا ہے۔ جماعت توڑنے کی کوشش میں رہتا ہے جس سے مسلمانوں میں نفاق پیدا ہو رہا ہے۔ لہٰذا از روئے شرع شریف کے بتایا جائے کہ زید کا فعل جائز ہے یا ناجائز۔ بینوا توجروا

المستفتی، حسین بخش حاجی محمد اسمٰعیل کی دکان نمبر ۱۱ لا گیٹ سوداگر پٹی کاشی پور کلکتہ

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

اگر پہلی اور دوسری جماعت کے لوگوں میں اختلاف عقائد کا فرق ہے کہ ایک جماعت بدمذہبوں -وہابی، غیر مقلد، قادیانی وغیرہ کی جماعت ہے۔ اور دوسری اہل سنت صحیح العقیدہ لوگوں کی جماعت ہے تو اہل سنت وجماعت کی ان بدمذہبوں کے ساتھ اور بدمذہب امام کی اقتداء میں پڑھنا ناجائز و ناروا ہے۔

دار قطنی کی حدیث شریف میں ہے " ولا تصلوا معهم " یعنی تم بدمذہب امام کی اقتداء میں نماز نہ پڑھنا۔

فقہ کی مشہور کتاب کبیری میں ہے " روی محمد عن ابی حنیفة وابی یوسف رحمهما الله ان الصلوة خلف اهل الاهواء لا یجوز "۔

یعنی حضرت امام اعظم ابوحنیفہ وامام ابو یوسف علیہما الرحمۃ سے امام محمد علیہ الرحمۃ نے روایت کی کہ بیشک بدمذہبوں کے ساتھ اوران کے پیچھے نماز جائز نہیں۔

تو اگر پہلی جماعت بد مذہبوں کی ہے اور زید سنی صحیح العقیدہ ہے تو زید کا بد مذہبوں کی جماعت میں شریک نہ ہونا اور دوسری جماعت کرنا صحیح و جائز فعل ہے۔ اوراس کو نفاق و تفریق بین المسلمین کہنا غلط اور اندھا پن ہے۔ اور کہنے والوں کے دین سے ناواقف ہونے کی روشن دلیل ہے۔ اور اگر ان دونوں جماعتوں میں اختلاف عقائد بالکل نہیں ہے۔ لیکن جماعت اولی کے امام میں کچھ شرعی عملی خامی ہے۔ یعنی کسی طرح کا فسق ہے تو زید کا اس بناء پر پہلی جماعت میں شرکت نہ کرنا اور دوسری جماعت منعقد کرنا قابل ملامت ولائق مواخذہ نہیں۔ مگر اس کا بوقت جماعت اس شان سے وہاں موجود رہنا اور فوراً دوسری جماعت قائم کردینا شرعاً یہ طریقہ مذموم و ناپسندیدہ ہے۔ اوراس صورت میں تفریق بین المسلمین کی مجرم وہ جماعت والی ہے کہ اس نے ایسے فاسق امام کو کیوں مقرر کر رکھا ہے۔ جس کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہو جو واجب الاعادہ ہو۔ اور اگر ان دونوں جماعتوں اور اس کے امام میں اعتقاد اور عمل کسی طرح کا فرق نہیں بلکہ زید کو اس امام سے محض دنیوی امور کی بنا پر عداوت و دشمنی ہے تو پھر زید کے یہ افعال جماعت اولیٰ میں شریک نہ ہونا اور اس کے بعد فوراً جماعت ثانیہ قائم کرنا شرعاً مذموم و ناجائز ہے اور فی الواقع تفریق بین المسلمین ہے۔ زید کو اپنی ایسی ناپاک حرکت سے باز آنا چاہئے مولیٰ تعالیٰ قبول حق کی توفیق دے۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل
۹ صفر المظفر ۷۶؍ ۱۳ھ۔

مسئلہ (۲۸۳)

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ

زید پڑھا لکھا اور صوم وصلوۃ کا پابند ہے مگر مسجد و نماز کے پابند نہیں، محلہ کی مسجد زید صاحب کے

مکان سے صرف چار سو قدم کے فاصلے پر ہے، برسات میں بارش وغیرہ کیوجہ سے راستہ ضرور خراب وتکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ پھر بعد ختم برسات راستہ بہت صاف ستھرا ہو جاتا ہے مگر زید صاحب موصوف کے لئے، جاڑا، گرمی، برسات سب برابر ہے۔ حالانکہ اپنی کاموں کے لئے مسجد سے بھی دوری فاصلے پر دن تو دن اندھیری شب میں جاتے آتے ہیں اور مسجد کے لئے ہمیشہ عذر در پیش رہا کرتا ہے۔ مسجد میں صرف جمعہ کی امامت کے لئے چلے جاتے ہیں، باقی پنج گانہ اپنے گھر پر پڑھا کرتے ہیں۔ اس پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ بغیر عذر شرعی مکان پر نماز ہرگز نہ ہوگی، اور ایسے امام جو بغیر عذر شرعی تارک مسجد وجماعت ہو ان کے پیچھے نماز درست نہیں۔ لہٰذا شرعی حکم سے بالتشریح بحوالہ کتب فقہ مطلع فرمایا جائے؟

المستفتی، عبدالکمال مظفر پوری خریدار سنی

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

جو شخص بغیر عذر شرعی کے تارک جماعت کا عادی ہو وہ فاسق ہے۔

ردالمحتار میں ہے "انه یاثم اذا اعتاد الترك" اور جب وہ فاسق قرار پایا تو اس کو امامت کے لئے پیش کرنا مکروہ ہے اور سوائے جمعہ کے اس کے پیچھے جو نماز پڑھی جائیگی وہ واجب الاعادہ ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

۳ رمضان المبارک ۶/۷۱۳ھ

مسئلہ (۲۸۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

زید فجر کی سنت مسجد میں ایک طرف کو ادا کر رہا ہے اور جماعت ہو رہی ہے۔ کیا یہ سنت ادا ہو جائیں گی؟۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

جماعت کے وقت فجر کی سنتیں مسجد میں پڑھ سکتا ہے لیکن اس کے اور جماعت کے درمیان ستون

دیوار وغیرہ کا آڑ ہو۔ یا اندر باہر کا فرق ہو۔ اور اگر خارج مسجد میں کوئی جگہ ہوتو وہاں پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۸۵)

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
امام کے مصلی پر پہنچنے سے پہلے تکبیر کہنا جائز ہے یا نہیں : اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ کیا تھی اور آپ کس وقت مصلے پر تشریف لاتے تھے: بینوا توجروا؟

المستفتی محبوب حسین محلہ محمود خاں سرائے ۴ رجب المرجب سنہ ۶۲ھ

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

بلا شک امام کے مصلے پر جانے سے پہلے تکبیر کا شروع کردینا جائز ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں ایسا عمل ہوتا تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالی عنہ جب حضور کو حجرہ شریفہ سے برآمد ہوتا ہوا دیکھتے اقامت (تکبیر) شروع کردیتے۔

چنانچہ حاکم نے مستدرک میں یہ حدیث حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کی:

کان بلال یوذن ثم یمهل فاذا رأی رسو ل الله صلی الله تعالی علیه وسلم قدخرج فاقام الصلوة هذا حدیث صحیح علی شرط مسلم (وفی روایة)فاذا رأی النبی صلی الله تعالی علیه وسلم قد اقبل اخذفی الاقامة (رواه حاکم فی المستدرك)(و فی روایة) لا یقیم حتی یری النبی صلی الله تعالی علیه وسلم فاذا رأه اقام حین یراه (رواه مسلم والبیهقی)

حضرت بلال اذان کہتے پھر توقف کرتے پھر جب حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کو نکلتے ہوئے دیکھتے تو نماز کے لئے اقامت کہتے (یہ مسلم کی شرط پر حدیث صحیح ہے) (ایک روایت میں ہے) کہ نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کو برآمد ہوتا دیکھتے تو اقامت شروع کردیتے (اس حدیث کو حاکم نے مستدرک میں روایت کیا) (اور ایک روایت میں ہے) کہ حضرت بلال اقامت نہیں کہتے یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کو دیکھتے پس جب آپ کو دیکھتے تو دیکھنے کے ساتھ ہی اقامت کہتے؛

ان احادیث سے ظاہر ہو گیا کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کو جس وقت حجرہ شریفہ سے باہر تشریف لاتا ہوا دیکھتے موذن اقامت شروع کردیتے۔ تو ظاہر ہے کہ اقامت امام کے مصلے پر جانے سے پہلے شروع کردی گئی اور یہ طریقہ حضور ہی کی تعلیم سے جاری ہوا۔ ورنہ اس پر ضرور منع فرمادیتے اور خود حضور انور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کی عادت کریمہ مقرر معلوم نہیں ہوتی۔ کبھی حجرہ شریفہ سے برآمد ہوتے اور موذن آپکو دیکھتے ہی اقامت شروع کردیتے جیسا کہ ان احادیث میں مذکور ہے اور کبھی تکبیر کی آواز سنکر حجرہ شریفہ سے باہر تشریف لاتے۔

چنانچہ بخاری ومسلم وترمذی وغیرہ میں حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کی کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا اقیمت الصلوۃ فلا تقوموا حتی ترونی: جب نماز کے لئے اقامت کہی جائے تو کھڑے نہ ہو یہاں تک کہ مجھے دیکھ لو۔

علامہ علی قاری مرقات میں اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں:

ولعله صلى الله تعالى عليه وسلم كان يخرج من الحجرة بعد شروع المؤذن في الاقامة ويدخل في محراب المسجد عند قوله حي على الصلوٰة ؛

شاید کہ حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم موذن کے اقامت شروع کردینے کے بعد حجرہ سے نکلتے تھے اور محراب مسجد میں حی علی الصلوٰۃ کے کہنے کے وقت داخل ہوتے: اور کبھی اقامت کے ختم کے وقت حجرہ شریفہ سے برآمد ہوتے۔

چنانچہ مشکوٰۃ شریف کے حاشیہ میں بحوالہ مرقات یہ عبارت ہے:

قال ابن حجرو كان يخرج صلى الله تعالى عليه وسلم عند فراغ المقيم من اقامته فامرهم بالقيام حينئذ لانه وقت الحاجة اليه : (مشکوٰۃ ص ۶۴)

ابن حجر نے کہا کہ حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم مقیم کے اقامت سے فارغ ہونے کے وقت برآمد ہوتے تھے اور صحابہ کو اس وقت کھڑے ہونے کا حکم فرماتے۔ کیونکہ اسی وقت قیام کی حاجت ہے؛ اور کبھی ان کے علاوہ اور صورتیں عمل میں آتیں (الحاصل) امام کے مصلے پر پہنچنے سے قبل تکبیر شروع کردینا جائز ہے اور حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے (واللہ تعالی اعلم بالصواب)

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۲۸۶)

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بیٹھ کر پڑھنے والے امام کی اقتدا کھڑے ہوکر کرنے کا جواز تنویر الابصار، درمختار، کنزالدقائق عینی، بحرالرائق، شرح وقایہ، نہایہ، غنیّۃ، فتاوے خانیہ، فتاوے سراجیہ، قدوری، جوہرہ نیرہ، جامع الفتاوے، نورالایضاح، مراقی الفلاح، طحطاوی، ہدایہ وغیرہ متون وشروح میں موجود ہے۔ اور کیونکر نہ موجود ہو کہ بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف، نسائی شریف بیہقی وغیرہ کتب حدیث میں مروی ہے کہ خود نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کا یہ آخری فعل ہے کہ حضور نے آخر مرض میں بیٹھ کر نماز پڑھائی اور صحابہ نے آپ کی اقتدا میں کھڑے ہوکر نماز پڑھی۔

چنانچہ درمختار میں ہے:

(وصح اقتداء قائم بقاعد) یرکع ویسجد لانہ ﷺ آخر صلاتہ قاعدا وھم قائمون وابو بکر یبلغھم تکبیرہ۔ (شامی ص ۴۱۳ ج ۱)

البتہ فرائض میں شیخین اور امام محمد میں اختلاف منقول ہے۔ شیخین جواز کے قائل ہیں اور حدیث ان کی مستدل ہے۔ اور امام محمد بربنائے قیاس اس کو ناجائز فرماتے ہیں۔ لیکن فرائض میں بھی اکثر فقہا نے قول شیخین کو ترجیح دی اور اسی کو قول مفتی بہ قرار دیا۔

اب رہے نوافل وتراویح اس میں یہ اقتدا باتفاق جائز ہے۔

شامی میں ہے: (قولہ وقائم بقائد) ای قائم ساجد او موم وھذا عندھما خلافا لمحمد واقتداء القاعد بکونہ یرکع ویسجد لانہ لما کان موجبا لم یجز اتفاقا والخلاف ایضا فیما عدا النفل اما فیہ فیجوز اتفاقا وفی التراویح فی الاصح۔

(شامی ص ۴۱۳ ج ۱)

بالجملہ صورت مسئولہ میں یعنی تراویح امام کا بیٹھ کر پڑھنا اور مقتدیوں کا کھڑا ہو کر اس کی اقتدا کرنا باتفاق فقہا صحیح درست ہے۔ اب اس تحقیق کے بعد کسی عالم کا اس میں اختلاف کرنا اس کی ناواقفی کی دلیل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۸۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں کہ

ایک شخص صبح یا ظہر کی نماز کیلئے مسجد میں پہنچتا ہے جماعت ہو رہی ہے۔ ایک رکعت پہنچنے سے پہلے ختم ہو جاتی ہے، دوسری رکعت امام کے ساتھ ملتی ہے، امام اپنی نماز پوری کر کے سلام پھیرتا ہے، بعد کا آنے والا شخص جسکی ایک رکعت فوت ہوئی ہے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور ثنا اور اعوذ کے بعد الحمد اور سورۃ پڑھکر اپنی نماز ادا کر لیتا ہے۔ زید اس کے خلاف بتلاتا ہے کہ ثنا نہ پڑھی جائے۔ زید اپنے عمل کے ثبوت میں بہشتی زیور۔ مفتاح الجنۃ۔ شرح وقایہ پیش کرتا ہے۔ شخص مذکور اپنے عمل کے ثبوت میں مالا بد۔ بہار شریعت۔ فتاوی عالمگیری، درمختار لاتا ہے۔ لہذا ان دونوں شخصوں میں کون حق بجانب ہے۔ مدلل طریقہ سے جو کتب دینیات مذہب حنفی میں ہو رقم فرمایا جائے۔ کہ مسئلہ حقہ پر عمل ہو۔ و نیز نماز جہر وخفی کا عمل بھی تحریر فرمایا جائے کہ مسبوق کو کس طرح نماز پڑھنی چاہیے۔

ممتاز الٰہی اشرفی نقشہ نویس چنگی چندوسی۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسبوق جب امام کے سلام کے بعد اپنی باقی نماز پڑھنے کیلئے کھڑا ہو تو وہ ثنا پڑھے پھر تعوذ اور الحمد اور سورت ملائے۔ ثنا کا پڑھنا عامہ کتب فقہ میں موجود ہے۔

تنور الابصار و درمختار میں ہے:

المسبوق من سبقه الامام بها او بعضها وهو منفرد حتى يثنى ويتعوذ ويقرء۔

(ردالمحتار مصری ص ۴۱۸ ج ۱)

مسبوق وہ مقتدی ہے کہ امام کی اس سے پہلے سب نماز کی رکعتیں یا بعض رکعات ہو چکیں تو وہ

منفرد کے حکم میں ہے یہانتک کہ وہ ثنا اور تعوذ اور قرأت پڑھے۔

علامہ شامی ردالمحتار میں قولہ یثنی کے تحت میں فرماتے ہیں:

تفریع علی قوله منفرد فیما یقضیه بعد فراغ اما مه فیاتی بالثناء والتعوذ لا نه للقراة ویقرألا نه یقضی اول صلا ته فی حق القرأة کما یا تی حتی لو ترك القرأة فسدت۔

(ردالمحتار۔ مصری ص ۴۱۸ ج ۱)

یہ مصنف کے قول منفرد کی تفریع ہے کہ مسبوق اپنی باقی نماز کی امام کے فارغ ہونے کے بعد قضا کرے تو وہ ثنا اور تعوذ پڑھے۔ تعوذ قرأت کیلئے ہے۔ اور قرات پڑھے اسلئے کہ حق قرأت میں وہ اپنی پہلی نماز کی قضا کر رہا ہے۔ جیسا کہ آئندہ آئے گا۔ یہاں تک کہ اگر اسنے قرات ترک کی تو نماز فاسد ہو جائیگی

نور الایضاح اور اس کی شرح مراقی الفلاح میں ہے:

فیا تی به المسبو ق فی ابتداء ما یقضیه بعد الثنا ء۔ (طحطاوی ص ۱۶۴۔)

تو مسبوق تعوذ کو ثنا کے بعد اپنی فوت شدہ نماز کی ابتداء میں لائے۔

فتاوی قاضی خان میں ہے:

ولو ان المسبو ق لم یا ت با لثناء فی اول الصلا ۃ فقام الی قضاء ما سبق ذکر فی الکیسا نیا ت انه یا تی باثناء عند محمد رحمه الله تعالی ولم یذکر فیه خلا فا وبعد الفراغ من الثنا ء یتعوذ۔ (قاضی خاں ص ۴۳)۔

اگر مسبوق ثنا اول نماز میں نہ لایا پھر اپنی فوت شدہ کو قضا کی طرف کھڑا ہوا کیسانیات میں ذکر کیا گیا کہ امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک وہ ثنا پڑھیگا اور کسی مخالف قول کا اس میں ذکر نہیں کیا اور ثنا سے فارغ ہو کر وہ تعوذ پڑھے۔

اسی فتاوے خانیہ میں ہے:

المسبو ق اذا ادرك الاما م فی القرأة التی یجهر فیها لا یا تی بالثنا ء فا ذا اقام الی قضاء ما سبق یا تی بالثنا ء ویتعوذ للقرأة ۔ (خانیہ ص ۵۱)۔

مسبوق نے جب امام کو جہری نماز کی قرأت میں پایا تو وہ اب ثنا نہ پڑھے۔ پھر جب اپنی فوت شدہ کی قضا کی طرف کھڑا ہو تو ثنا پڑھے، اور قرأت کے لئے تعوذ پڑھے۔

فتاوے سراجیہ میں ہے:

المسبوق اذا قام الی قضاء ما سبق فانه یستفتح لان هذا اول صلاته فی حق القرأة وان کان اخرصلاته فی حق القعدة ۔

(ش خانیہ ص ۹۶)

مسبوق جب فوت شدہ نماز کوطرف کھڑا ہوتو وہ ثنا پڑھے۔اسلئے کہ حق قرأت میں یہ اس کی پہلی نماز ہے۔اگر چہ حق قعدہ میں یہ اس کی آخر نماز ہے۔

شرح وقایہ اور عمدۃ الرعایہ فی حل شرح الوقایہ میں ہے:

المسبوق وهو الذی ادرک آخر صلوۃ الامام فلم یلتزم اداء الکل خلف الامام فهو فی اداء ما لم یدرکه مع الامام منفرد حتی یجب علیه القرأة (قال المحشی)قوله منفرد ای حقیقة وحکما ایضا ولذا یقرأالمسبوق القرآن ویتعوذ ویثنی ۔(شرح وقایہ ص۱۷۹ج۱)

مسبوق وہ ہے جس نے امام کی آخر نماز کو پایا اور امام کے پیچھے کل نماز کوادانہ کرسکا تو وہ اس کی ادا میں جوامام کے ساتھ نہ ملی منفرد کے حکم میں ہے یہاں تک کہ اس پر قرأت واجب ہے۔محشی نے کہا کہ وہ حقیقۃ اور حکما منفرد ہے۔اسی لئے مسبوق قرآن پڑھے گا اور تعوذ پڑھے گا اور ثنا پڑھے گا ۔

الحاصل فقہ کی مشہور کتب تنویر الابصار۔درمختار۔ردالمحتار۔نورالایضاح۔مراقی الفلاح۔فتاوے قاضی خاں۔فتاوے سراجیہ۔شرح وقایہ۔عمدۃ الرعایہ سے نہایت واضح طور پر ثابت ہوگیا کہ مسبوق جب اپنی فوت شدہ رکعات پوری کرے گا تو وہ ثنا پڑھیگا۔اور عبارت قاضی خاں سے معلوم ہوا کہ یہ ایسا قول ہے جس کا کوئی مخالف قول منقول نہیں۔لہذا اب زید اس کے خلاف قول کہاں سے لائیگا۔زید کا شرح وقایہ کو اپنے استدلال میں پیش کرنا اس کی نا قابلیت کی دلیل ہے۔

اقول اولا: شرح وقایہ میں غالبا جو مسبوق کیلئے ثنا پڑھنے کی ممانعت کی ہے وہ اس صورت میں ہے کہ جب یہ مسبوق بوقت شروع ثنا پڑھ چکا ہے کہ ثنا کی مشروعیت نماز میں ایک ہی مرتبہ کیلئے ہے چنانچہ فقہائے کرام دوسری رکعت میں ثنا تعوذ نہ پڑھنے کی یہی علت لکھتے ہیں۔

درمختار میں ہے:

الرکعة الثانیة کالاولی فیما مر غیر انه لا یاتی بثناء ولا تعوذ فیها اذلم یشرعا الامرة ۔

تو اس بناپر شرح وقایہ کی عبارت۔المسبوق یقرأولا یثنی فیتعوذ،کا یہ مطلب ہوا کہ وہ

مسبوق جو بوقت شروع ثنا پڑھ چکا ہے وہ قرأت اور تعوذ پڑھے اور ثنا نہ پڑھے کہ ثنا کی نماز میں تکرار نہیں ہوتی اور وہ شروع میں ثنا پڑھ چکا ہے تو یہ عبارت ہماری پیش کردہ عبارات کے مخالف نہیں ہوئی:

ثانیاً: اور اگر زید عبارت شرح وقایہ کا یہ مطلب سمجھتا ہے کہ یہ اس مسبوق کے لئے ہے جس نے بوقت شروع ثنا نہیں پڑھی ہے تو اس میں فقہاء کے طبقہ ثالثہ کے مجتہد فی المسائل امام اجل فخر الدین قاضی خاں کی مخالفت لازم آتی ہے جیسا کہ عبارت منقولہ فتاوی خانیہ سے ظاہر ہے۔

ثالثاً: اگر مخالفت قاضی خاں سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو محرر مذہب اجل شاگرد امام اعظم حضرت امام محمد رحمۃ اللہ کی کتاب کی صریح مخالفت ہوتی ہے۔

رابعاً: جب اصحاب مذہب سے کوئی مخالف قول منقول نہیں جیسا کہ کیسانیات سے ظاہر ہوا تو کیا زید قول شرح وقایہ کو مخالف قول ہونے کا صالح سمجھتا ہے۔

خامساً: اس عبارت شروح وقایہ میں قرأت کے ساتھ تعوذ پڑھنے کا حکم ہے اور تعوذ کے لئے متوارث یہ ہے کہ وہ بعد ثناء پڑھا جائے۔

چنانچہ کبیری میں ہے:

ولا یتعوذ الا بعد الثناء لانہ المتوارث۔ (کبیری صفحہ ۱۹۸)

تو اس صورت میں تعوذ کا بلا ثنا کے اجازت دید ینا خلاف متوارث ٹھہرتا ہے۔ بالجملہ شرح وقایہ کی عبارت کی تاویل وہ ہے جو ہم نے اقول کے بعد لکھی ہے کہ اس میں دیگر کتب فقہ سے مخالفت لازم نہیں آتی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس عبارت میں ناسخین یا مطابع کی غلطی ہو اس کا قرینہ یہ ہے۔

کہ میرے پاس شرح وقایہ کا ایک فارسی ترجمہ ہے جو مولانا عبد الحق سرہندی نے ۱۰۸۶ھ میں زمانہ حضرت سلطان محمد اورنگ شاہ عالمگیر علیہ الرحمۃ میں کیا ہے اور مطبع مرتضوی دہلی میں ۱۲۸۳ء میں طبع ہوا ہے۔ اس میں جب اس مقام کو دیکھا گیا تو مترجم ان الفاظ میں ترجمہ کرتے ہیں:

بعد از ثنا تعوذ گوید بداں کہ تعوذ تابع قرأت است نہ تابع ثناء۔ پس مسبوق پیش از قرأت خود تعوذ بخواند و موتم راچوں قرأت نیست تعوذ نہ خواند۔ (ص ۳۰)

لہذا اس ترجمہ میں شرح وقایہ کے لفظ "لا یثنی" کا ترجمہ ہی نہیں کیا۔ بالجملہ زید کا شرح وقایہ سے استدلال کرنا غلط ثابت ہوا۔

اسی طرح مفتاح الجنۃ سے اسکا استناد ہے۔

اولا: زید کا مفتاح الجنۃ کا مذہب کی ان مشہور و معتمد و مستند کتابوں کے مقابلہ میں پیش کرنا ہی سخت جہالت ہے۔

ثانیا: اگر بالفرض مفتاح الجنۃ میں یہ مسئلہ زید کے قول کے موافق بھی ہے تو کیا مفتاح الجنۃ ان مذہب کی کتابوں کی تمام تصریحات کو نا قابل عمل اور غیر معتبر اور غلط قرار دیدے گی۔

ثالثا: میں نے مفتاح الجنۃ جو مولوی شاہ کرامت علی صاحب جونپوری کی تصنیف ہے اور ۱۳۰۶ھ میں مطبع نامی لکھنو میں چھپی ہے، اس کے چار مقام دیکھے لیکن مجھے اس میں مسبوق کے ثنا پڑھنے کی ممانعت کسی میں نظر نہ آئی۔ بلکہ اس میں ایک مستقل باب احکام مسبوق میں ملا جس میں وہ صاف تحریر فرماتے ہیں۔

جو شخص کہ امام کے ساتھ آخر نماز میں ملے یعنی اس کے اوپر کی نماز جاوے تو اس کو مسبوق کہتے ہیں اور مسبوق کا مسئلہ اسطرح پر ہے کہ مثلا ایک شخص فجر کی نماز میں امام کو دوسری رکعت میں پاوے تو ثنا اور تعوذ اور تسمیہ کہے۔ (ص ۵۷)

اسی کتاب کے یہ آخری الفاظ۔ تو ثنا اور تعوذ اور تسمیہ کہے۔ اگر اس سے وقت شروع مراد لیا جائے تو یہ خلاف تصریحات کتب فقہ قرار پاتا ہے کہ مسبوق کا بوقت شروع تعوذ و تسمیہ پڑھنا اب تک کسی فقہ کی کتاب میں نظر سے نہیں گزرا۔ ثنا کے متعلق تو اتنا کتب فقہ میں ہے کہ مسبوق سری نماز میں ثنا پڑھ سکتا ہے لیکن اس میں بھی اگر امام کو دوسرے سجدے میں یا قعدہ میں پایا تو بہتر یہ ہے کہ بغیر ثنا پڑھے شامل ہو جائے۔ اور رکوع اور پہلے سجدے میں بھی اگر گمان غالب یہ ہے کہ ثنا پڑھنے میں اس امام کے ساتھ شرکت نہ ہو سکے گی جب ثنا نہ پڑھے۔

الحاصل شروع میں ثنا کے متعلق بھی مطلقا مسبوق کو اجازت نہیں ملی تو پھر تینوں ثنا اور تعوذ اور تسمیہ کا شروع میں مراد لینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟۔ تو لا محالہ اس عبارت مفتاح الجنہ کی یہ مراد لینا ہے کہ جب مسبوق اپنی فوت شدہ رکعات پڑھنے کیلئے کھڑا ہوا تو ثنا اور تعوذ اور تسمیہ کہے لہذا اب زید آنکھیں کھول کر دیکھے کہ مفتاح الجنہ سے بھی مسبوق کیلئے ثنا پڑھنے کا حکم ثابت ہوا۔ تو زید کا مفتاح الجنہ کو سند میں لانا بھی غلط ہوا۔

اب باقی رہا زید کا بہشتی زیور کو اپنی سند میں پیش کرنا تو بہشتی زیور بھی کوئی ایسی کتاب ہے جسکو سند میں پیش کیا جا سکے۔ کہ کہیں اس میں کہانیاں، غیر معتبر قصے، کہیں صابن بنانے، کھانا پکانے کی ترکیبیں ہنر

۔اور کہیں رنگنے اور پارسل وغیرہ ڈاک خانہ کے طریقے ۔کہیں امراض کے علاج ہیں تو کہیں مخصوص شکایات کے شرمناک وحیا سوز نسخے ۔کہیں مسلمان کو مشرک و بدعتی بتانے کے باطل عقائد ہیں تو کہیں مرجوح اور غیر مفتی بہ مسائل ۔تو ہر ذی عقل کے نزدیک تو ایسی کتاب قابل سند نہیں ہو سکتی ۔لیکن اگر زید اس بنا پر پیش کرتا ہے کہ وہ اس کے حکیم الامت تھانوی صاحب کی مصنفہ ہے، اس کے ایک ایک حرف ایک ایک لفظ پر ایمان ہے کہ اس کے خلاف آیات قرآنی ۔اور احادیث نبوی آجائیں تو وہ سب قابل انکار ہیں ۔تو پھر ایسے شخص کی کتب فقہ اور تصریحات فقہا کیا تسکین کر سکتی ہیں ۔

لہذا اب ایسی الٹی کھوپڑی کیلئے انہیں بہشتی زیور والے حکیم الامت تھانوی کے فتاوے اشرفیہ سے تین زبردست اور عظیم الشان پہاڑیاں لاتے ہیں ۔زید بگوش ہوش سنے ۔امداد الفتاوے معروف بہ فتاوے اشرفیہ مطبوعہ مجتبائی دہلی ۔۱۳۲۹ھ ۔

سوال ، جو شخص فرض ظہر یا عصر کی چوتھی رکعت میں شریک ہوا وہ تین رکعت باقی کس طور سے ادا کرے ، کس رکعت کے بعد جلسہ کرے اور کن رکعتوں میں ختم سورت کرے ۔کئے رکعت بدون سورت کے پڑھے ؟ ۔اور جو شخص تیسری رکعت میں شریک ہوا وہ دو رکعت باقی کس طور سے ادا کرے ؟ ۔جو مغرب کی تیسری رکعت میں امام کیساتھ شریک ہوا وہ اپنی دو رکعت باقی کس طور سے ادا کرے ؟ ۔جلسہ اور ختم سورت کن رکعت میں کرے فقط ۔

الجواب ۔جسکی کوئی رکعت امام کے ساتھ فوت ہوگئی ہو اس کو مسبوق کہتے ہیں اس کی باقی نماز حق قرأت میں اول ہوتی ہے اور حق تشہد میں آخر ۔

یقضي اول صلوۃ في حق قرأۃ وآخرها في حق تشهد ۔(درمختار)

پس جو شخص ظہر یا عصر میں چوتھی رکعت میں شریک ہوا ۔بعد فراغ امام کے کھڑا ہو کر ثنا اور تعوذ پڑھکر فاتحہ وسورت پڑھے ۔اور یہ رکعت پوری کر کے قعدہ کرے پھر کھڑا ہو کر وہ رکعت بھی فاتحہ وسورت سے پڑھکر پچھلی رکعت فقط فاتحہ سے پڑھکر نماز تمام کرے ۔اور جو تیسری میں شریک ہوا وہ دونوں رکعتیں فاتحہ وسورت سے پڑھے اور ان دونوں کے بیچ میں جلسہ نہ کرے ۔دونوں کے بعد قعدہ اخیرہ کر کے فارغ ہو ۔جو مغرب کی تیسری میں شریک ہوا وہ دونوں میں فاتحہ وسورت پڑھے اور ہر رکعت پر بیٹھے ۔فقط

واللہ اعلم ۔از فتاوے اشرفیہ حصہ اول ص ۲۲ ۔

سوال ۔جس میں پانچ سوالات اور ہیں اور چھٹا سوال بالکل یہی ہے ۔صرف اتنے الفاظ کا تغیر

ہے (کئے رکعت کے بعد جلسہ کرے) یعنی بجائے کس کے کئے ہے، کریں کے کرے ہے۔ ختم سورت کی جگہ ضم سورت ہے، اور بجائے اس کے کہ پہلے سوال کو فقط پر ختم کردیا۔ اس میں اتنی عبارت اور زائد کی جواب بسند کتب تحریر ہو۔ بینوا عند اللہ توجروا۔

معلوم ہوتا ہے کہ فتاوے کے صفحات زائد کرنے کیلئے ایک سوال کو بار بار لکھا گیا ہے اور فرق کیلئے اسپر پانچ سوالوں کا اور اضافہ کردیا گیا ہے تاکہ پہلے سے ممتاز ہوجائے۔ یا اسی سائل نے بعینہ اسی سوال کو کسی شبہ کے بنا پر پھر انہیں الفاظ مین دریافت کیا ہے۔ یا کس دوسرے سائل نے کسی شک کی بناپر اسی سوال کو پھر نقل کردیا ہے ورنہ کسی ناواقف سائل نے بالکل سوال کی وہی شکل وہی الفاظ وہی ترتیب کسطرح لکھی۔ اب جو چند الفاظ کا فرق ہے وہ کتابت میں بھی ہوجاتا ہے۔ اب جواب کا حال دیکھئے۔

الجواب۔ اس جواب اور پہلے جواب میں بالکل فرق نہیں۔ ایک دو جگہ تو اتنا معمولی فرق ہے کہ اس جواب میں لفظ جو زائد ہے اس میں نہیں ہے۔ اور اس میں آخر میں لفظ فقط ہے۔ اس میں ہے البتہ شروع میں ایک یہ فرق ہے کہ جسکی کوئی رکعت امام کے ساتھ فوت ہوگئی ہو اس کو مسبوق کہتے ہیں یہ عبارت تو پہلے جواب کی ہے، اس جواب میں بجائے کوئی کے ایک دو ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ بالکل پہلے جواب ہی کو نقل کردیا ہے اور اسی طرح اسی فتاوے کا حجم مکررات سے بڑھایا گیا ہے۔ یہ ہے اس حکیم الامت کی قابلیت کا ایک نمونہ۔ پھر اس جواب میں ایک یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس میں مسبوق کی تعریف اب ان الفاظ میں ہوگئی جسکی ایک دو رکعت امام کے ساتھ فوت ہوگئی ہو اس کو مسبوق کہتے ہیں۔ تو اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ جسکی تین رکعتیں فوت ہوگئی ہوں یا چار رکعتیں فوت ہوگئی ہوں اور وہ قعدہ اخیرہ میں شریک ہوا ہے۔ وہ ان کے نزدیک مسبوق نہیں تو نہ معلوم اس کو یہ کیا کہتے ہیں۔ باوجودیکہ مسبوق کی تعریف اسی درمختار میں ہے جسکی انہوں نے عبارت اسی جواب میں نقل کی ہے۔

بالجملہ اس جواب میں بھی انہوں نے مسبوق کو ثنا اور تعوذ کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے کہ بعد فراغ امام کے کھڑا ہوکر ثنا وتعوذ پڑھکر فاتحہ وسورت پڑھے۔ یہ سوال وجواب اسی فتاوے امدادیہ معروف بہ فتاوے اشرفیہ کے ص ۱۰۷ اور ص ۱۰۸ پر ہے۔

سوال۔ مسبوق رکعات جہریہ وخفیہ میں ثنا وتعوذ وتسمیہ تینوں پڑھے یا نہیں؟۔ اور جب بعد فراغت کے اپنی بقیہ رکعتیں ادا کرنے کے لئے کھڑا ہو تو اسوقت ثنا وتعوذ وتسمیہ تینوں پڑھے یا صرف تعوذ وتسمیہ پر قناعت کرے؟۔ جو کچھ فرق اس مسئلہ کے متعلق رکعات جہریہ وسریہ میں ہو مطلع فرمائیگا۔

الجواب۔فی الدر المختار قبل باب الاستحلاف المسبوق منفرد حتی یثنی ویتعوذ ویقرأوان قرأ مع الامام بعدم الاعتدادبها لکراهتها مفتاح السعادة فیما یقضیه اه مختصرا۔

اس عبارت سے دوامر مستفاد ہوئے ایک یہ کہ مسبوق امام کے ساتھ ثناوتعوذ وتسمیہ نہ پڑھے۔ دوسرے یہ کہ بعد فراغ امام کے جب اپنی بقیہ نماز پڑھنے کھڑا ہوسب چیزیں اور قرات پڑھے اور جہری وسری اس حکم میں دونوں برابر ہیں۔لا طلاق الدلیل واللہ تعالی اعلم۔۷ اذیقعدہ ۱۳۲۳ھ۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ان تینوں جوابوں میں انہیں بہشتی زیور کے مصنف تھانوی نے مسبوق کے لئے صاف لکھدیا کہ وہ بعد فراغ امام کے کھڑا ہوکر ثناوتعوذ پڑھکر فاتحہ وسورت پڑھے۔اسی طرح تیسرے جواب میں صاف کہا کہ وہ بعد فراغ نماز امام کے جب اپنی بقیہ نماز پڑھنے کھڑا ہوسب چیزیں اور قرات پڑھے۔سب چیزوں سے مراد ثناوتعوذ وتسمیہ ہے کہ انھوں نے خود انکا ذکر کیا اور سوال ہی ان کے متعلق ہے،تواب زید بتائے کہ وہ اس مسبوق کے مسئلہ میں بہشتی زیور کو مانیگا یا فتاوے اشرفیہ کو۔پھر یہ بھی بتائے کہ ان دونوں کتابوں میں سے کون سچی ہے کون جھوٹی اور کون حق پر ہے اور کون باطل اور کس پر عمل کیا جا ئگا اور کس کو نا قابل عمل ٹھرایا جائیگا؟۔

افسوس جس تھانوی کی محبت میں قرآن عظیم سے منہ موڑا۔احادیث رسول کریم کو چھوڑا۔سلف وخلف کی کتابوں سے تعلق توڑا۔اسی تھانوی نے زید کی عزت خاک میں ملادی۔تمام حجت وبحث کی عمارت گرادی۔مخالف کی بات بنادی۔موافق کے منہ پر مہر سکوت لگادی۔بحمد اللہ اس مسئلہ پر نہایت کافی بحث ہوگئی اور حقانیت آفتاب کی طرح روشن ہوگئی جس پر اب مخالف کو مجال سخن وجائے دم زدن باقی نہیں۔ مولی تعالی مخالف کو قبول حق کی توفیق دے واللہ تعالے اعلم بالصواب۔

اور مسبوق بعد فراغ امام جب اپنی باقی نماز پڑھنے کیلئے کھڑا ہوتو اگر وہ سری نماز ہے تو وہ قرات آہستہ پڑھے اور جہری نمازوں میں مختار ہے کہ چاہے قرأت آہستہ پڑھے یا جہر کے ساتھ۔

لان المسبوق منفرد فی حق ما بقی والمنفرد ان قضی السریة یخافت وان قضی الجهریة خیر فکذلک المسبوق هذا مستفاد من الطحطاوی ورد المختار وغیرهما۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۸۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

مسجد کے متصل برآمدہ ہے اور درمیان کی دیوار کی موٹائی ایک گز یا اس سے کم وبیش ہو اور اس میں صرف دو کھڑکیاں ہوں دروازہ یا در کچھ نہ ہوں تو اس برآمدہ میں امام مسجد کی اقتدا کرے تو یہ اقتدا صحیح ہو سکتی ہے باوجود کہ یہ مقتدی مسجد کے اندر مقتدیوں سے جدا ہیں۔ مسجد کے اندر کی صف سے ان کا اتصال نہیں ہے۔ اور جب اتصال صفوف نہیں ہے تو کیا ان دونوں کھڑکیوں کا کھلا ہونا ان کی اقتدا کو درست کرے گا یا نہیں؟۔ امام مسجد کے اندر ہے اور اس کے ساتھ مسجد میں مقتدی ہیں اور کچھ مقتدی اس برآمدہ میں۔ بینوا توجروا

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

اتصال صفوف اقتدا کے لئے ضروی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ مقتدی کو امام کے انتقالات کا علم سن کر یا دیکھ کر ہو جائے۔ مراقی الفلاح میں ہے:

من صلی علی سطح بیته المتصل با لمسجد او فی منزله بجنب المسجد وبینه وبین المسجد حائط مقتدیا باما م فی المسجد وهو یسمع التکبیر من الامام او من المکبر تجوز صلا ته۔ (طحطاوی مصری ص ۱۷۰)

جس نے اپنے گھر کی چھت پہ نماز پڑھی جو مسجد سے متصل ہے یا اپنے گھر میں جو مسجد کے پہلو میں ہے اور اس کے اور مسجد کے درمیان دیوار ہے اور وہ مسجد کے امام کی اقتدا کر رہا ہے اور وہ امام یا مکبر کی تکبیر سنتا ہے تو اس کی نماز جائز ہے اور اقتدا صحیح ہے۔

فتاوے عالمگیری میں ہے:

یصح ان کان الحائط صغیر ا لا یمنع او کبیر اوله ثقب لا یمنع الوصول و کذا اذا کان الثقب صغیر ایمنع الوصول الیه لکن لا یشتبه علیه حال الاما م سما عا او روية هو الصحیح۔ (ص ۴۶ ج ۱)

اور اقتدا صحیح ہے اگر دیوار چھوٹی ہو اور مانع نہ ہو۔ اور اگر بڑی ہو اور اس میں ایسا سوراخ ہو جو آواز پہنچنے کیلئے مانع نہو اور اسی طرح جب سوراخ چھوٹا ہو اور آواز پہنچنے کیلئے مانع ہو لیکن اس پر امام کا حال

سنکر یا دیکھ کر مشتبہ نہ ہو یہی صحیح قول ہے۔

ان عبارات سے واضح ہو گیا کہ صورت مسئولہ میں جب برآمدہ مسجد سے متصل ہے اور جو دیوار ہے اسکا ایسا عرض نہیں جو اتصال صفوف کو مانع ہو پھر اس دیوار میں بھی کھڑکیاں ہیں جن سے امام کے انتقالات کا علم بلا اشتباہ ہو جائیگا تو برآمدہ کے مقتدیوں کو امام مسجد کی اقتدا کرنا صحیح ہے اور اتصال صفوف حاصل ہے کہ ان کھڑکیوں سے کم از کم امام کی آواز ان برآمدہ کے مقتدیوں کو ضرور پہنچے گی۔ لہذا یہ مقتدی مسجد کے اندر کے مقتدیوں سے جدا نہیں ہوئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۸۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ ذیل میں کہ

زید مولوی اشرفعلی تھانوی کا مرید اور خلیفہ ہے اور دیوبندی عقائد بھی رکھتا ہے مگر کبھی کبھی میلاد شریف کی محفلوں میں شرکت کر کے سلام بھی پڑھ لیتا ہے لیکن ضروری نہیں سمجھتا۔ اور کھانا وغیرہ پر فاتحہ بھی کر لیتا ہے۔ لھذا زید کے پیچھے اہل سنت و جماعت کی نماز ہوگی یا نہیں؟ اور سنیوں کو اس کے پیچھے جان بوجھ کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟ صاف صاف بیان کیجئے۔

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

جب زید مولوی اشرفعلی تھانوی کا مرید و خلیفہ ہے تو وہ انکو کم از کم مسلمان اور عالم پیشوا تو اعتقاد کرتا ہی ہوگا اور انکے عقائد و احکام کو صحیح جانتا ہوگا اور انکی کتاب حفظ الایمان کے کفری قول کو کفر نہ سمجھتا ہو گا۔ تو زید کے بدمذہب و گمراہ ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے چہ جائے کہ وہ دیوبندی عقائد بھی رکھتا ہے۔ لھذا زید کے پیچھے اہل سنت و جماعت کی نماز ہرگز نہ ہوگی اور ہمارے برادران اہلسنت ان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں۔

کبیری میں ہے:

وعن ابی حنیفۃ وابی یوسف رحمھما اللہ تعالی ان الصلوۃ خلف اہل الاھواء لاتجوز۔

اور ظاہر ہے کہ زید تفصیل بالا کی بنا پر اہل اہواء سے ہے تو اس کی نماز حقیقۃ نماز نہیں اور وہ جماعت دراصل جماعت نہیں۔ اب باقی رہا زید کا میلاد شریف کی محفل میں شریک ہونا اور سلام پڑھنا اور فاتحہ وغیرہ اعمال کر لینا تو ان پر سنیت کا دارومدار نہیں، دیوبندی اس کو کسی اعتقاد کی بنا پر نہیں کرتے ہیں بلکہ عوام اہل سنت کو اپنی دام تزویر میں پھانسنے کے لئے کرتے ہیں۔ تو ان کی ان باتوں پر انہیں سنی سمجھ لینا ہمارے عوام سنی بھائیوں کی سادہ لوحی ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

سوال (۲۹۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ اقامت سے پہلے یا اقامت شروع ہوتے ہی مقتدیوں کو کھڑا ہو جانا چاہئے یا حی علی الفلاح کے وقت؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اقامت سے پہلے یا بوقت شروع مقتدیوں کا کھڑا ہو جانا مکروہ ہے۔ بلکہ انہیں حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا چاہیئے۔

عالمگیری میں ہے: اذا دخل الرجل عند الا قامة یکره له الا نتظار قائما ولکن یقعد ثم یقوم اذا بلغ المؤذن قوله حی علی الفلاح کذا فی المضمرات ان کان المؤذن غیر الامام وکان القوم مع الامام فی المسجد فانه یقوم الا مام والقوم اذا قال المؤذن حی علی الفلاح عند علمائنا الثلثة وهو صحیح و الله تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۹۱-۲۹۲-۲۹۳-۲۹۴)

کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام ومفتیان شرع عظام دامت برکاتہم النوریہ مسائل ہذا میں کہ
(۱) لاؤڈ اسپیکر پر نماز درست بلا کراہت جائز ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو صحیح وجائز نہ ہونے کا

کیا سبب ہے۔ کیا کوئی صورت ہے کہ جس سے نماز لاؤڈ اسپیکر پر صحیح و درست بلا کراہت جائز ہو جائے ۔نیز اذان و اقامت لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنا کیا جائز ہے یا نہیں؟۔

(۲) گراموفون سے جو آواز نکلتی ہے وہ عین آواز متکلم ہے یا نہیں، لاؤڈ اسپیکر سے جو آواز نکلتی ہے وہ عین آواز متکلم ہے یا نہیں؟۔

(۳) لاؤڈ اسپیکر پر نماز ہو تو مقتدیوں کی نماز ہوگی یا نہیں۔ اگر نہیں ہوگی تو کس بنا پر مفصل و مدلل بیان کیجئے؟۔

(۴) لاؤڈ اسپیکر پر نماز ہو تو امام کی نماز ہوگی یا نہیں اگر نہیں ہوگی تو کس بنا پر مفصل مدلل بالتفصیل تحریر فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

(۱) امام و مقتدی کے درمیان تکبیرات وغیرہ کی آواز پہنچانے کے لئے لاؤڈ اسپیکر ایک واسطہ ہے اور ظاہر ہے کہ وہ انکا غیر ہے، انکی نماز میں شریک نہیں۔ تو مقتدی کی نماز کی بنا ایسی چیز پر لازم ہے جو انکا غیر ہے اور خود نمازی نہیں۔ لہذا مقتدی نے قول غیر پر عمل کیا جو مفسد صلوۃ ہے۔

ردالمحتار میں ہے: اخذ المصلي غير الامام بفتح من فتح عليه تفسد ايضا كذا في البحر عن الخلاصة او اخذ الامام بفتح من ليس في صلاة ۔ تو لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر جو لوگ اقتدا میں ارکان نماز ادا کریں گے انکی نماز نہ ہوگی۔

اب باقی رہی یہ تحقیق کی لاؤڈ اسپیکر اور گراموفون میں جو آواز مسموع ہوتی ہے وہ عین آواز متکلم اور قرع اول ہی ہے۔ یا نہیں۔ تو اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان سے عین آواز متکلم بھی سنی جاتی ہے تو اس سے تو کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آواز متکلم پر برقی طاقت کی آواز کا شمول اصل آواز متکلم سے کئی گنا زائد ہے۔ اسکا ثبوت ظاہر ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز اس قدر دور تک پہنچ جاتی ہے کہ اصل آواز متکلم اتنی دور تک ہر گز ہر گز نہیں پہنچ سکتی۔ اسی غلبہ کی بنا پر اس آواز کی نسبت لاؤڈ اسپیکر یا گراموفون کے طرف کر دی جاتی ہے۔ اور ہر سننے والا یہ بے تکلف کہتا ہے کہ یہ لاؤڈ اسپیکر یا گراموفون کی آواز ہے اور یہ آلات اس آواز کو اپنی کیفیات کے ساتھ اس قدر مکیف کر دیتے ہیں کہ کبھی اصل متکلم کی آواز کا امتیاز مٹ جاتا ہے اور پہچان میں نہیں آتا کہ کون بول رہا ہے۔ تو ان آلات کے تصرفات کا انکار نہیں کیا

جاسکتا۔ لہذا یہ ماننا پڑے گا کہ ان آلات سے عین آواز متکلم میں زبردست اضافہ اور بین فرق پیدا ہوگیا تو اس آواز پر نہ سجدہ تلاوت واجب، نہ اقتدا صحیح۔ اور اب استعمال کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان آلات میں عین آواز متکلم اپنی اصلیت پر باقی نہیں رہتی اور قرع اول باقی نہیں رہتا بلکہ آواز بازگشت ہوجاتی ہے تو اس بناپر اقتدا ہی صحیح نہیں ہے۔

رہی امام کی نماز تو اس کے لئے یہ وجہ فساد تو نہیں ہے مگر وہ بھی کراہت سے خالی نہیں، اس لئے کہ آلہ سے نماز کے شغل خاص میں خلل پیدا ہوتا ہے، جو کراہت کو مستلزم ہے۔ رہا اذان واقامت کا حکم تو اس میں اگرچہ نماز کے سے احکام نہیں لیکن ان میں اس آلہ کا استعمال خلاف اولی ضرور قرار پائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۹۵_۲۹۶_۲۹۷)

کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام ومفتیان شرع عظام دامت برکاتہم النوریہ مسائل ہذا میں

(۱) آج ہی یہاں کی جامع مسجد میں پیش امام صاحب جو یہاں کے خطیب بھی ہیں تکرار ہوتے ہوئے جھگڑا ہوگیا۔ وہ اس بحث پر کہ جماعت فرض سے پڑھا ہوا شخص ہی جماعت سے نماز وتر پڑھ سکتا ہے۔ دوسرا شخص جماعت سے وتر نہیں پڑھ سکتا، اس کا جماعت سے وتر پڑھنا جائز نہیں۔ یہ کہاں تک صحیح ہے۔ اصل مسئلہ کا حل کیا ہے؟۔

(۲) ہمیشہ کی طرح رمضان میں حیدرآباد سے رائے پور جامع مسجد کو تراویح پڑھانے اختر نجمی صاحب آئے ہیں اور جامع مسجد کے پیش امام جو خطیب بھی ہیں، یہ اعتراض پیش کررہے ہیں، کہ جو پیش امام داڑھی صاف کرائے اس کے پیچھے اس کی امامت جائز نہیں۔ نماز پڑھنا نہیں چاہتے، یہ کیا صحیح ہے۔ اصل مسئلہ کیا ہے؟۔

(۳) یہ پیش امام جامع مسجد جو خطیب بھی ہیں، آجکل جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں، اور ابوالاعلی مودودی کا لٹریچر ہر وقت زیر مطالعہ رکھتے ہیں، چونکہ یہ رائے پور کے خطیب ہیں، کیا انہیں سنیوں کو بحیثیت خطیب کے اس طرح دوسری جماعتوں سے رابطہ پیدا کرلینا جائز ہے۔ اور کیا انکی خطابت وامامت جائز ہے؟۔ کیا انہیں سنی اپنا امام بناسکتے ہیں۔ یہاں کے دیگر سنی بھائی امامت سے ہٹادینا چاہتے

ہیں۔ کیاان کیساتھ ایسا سلوک کرنا جائز ہوگا۔ اور پھر خطیب صاحب کی کئی ایکڑ زمین بھی انعام کی ہے اس کا کیا کریں۔ آیا اس حکومت کے قبضہ میں دیدیں، نتیجہ میں کاروائی یہی صورت اختیار کرے گی۔ خطیب کا بیان یہ ہے کہ درگاہوں پر نہ جاؤ۔ نذرو نیاز نہ کرو۔ اور پھر یہ صاف کہتے ہیں، کہ زندے مردوں کو فائدہ پہونچاؤ۔ مردے زندہ کو کیا فائدہ پہونچائیں گے۔ کیا ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے؟۔

یہ میں اکیلا معلوم کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ بلکہ میرے تمام اہل محلّہ بھی اس کے خواہش مند ہیں۔ میرے محلّہ کی مسجد میں اس پر بہت قیاس ہوا پھر میں نے اُنکو اطلاع لکھ کر جواب کا انتظار کرنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ حالات دن بدن بگڑتے جارہے ہیں، اس لئے اپنے معلوماتی کوئیں سے کچھ فیض ہمیں بھی پہنچاویں۔ بیک وقت میں نے کافی سوالات لکھ دیا۔ مگر میں مجبور تھا، قبلہ محترم، کچھ واقعات ہی ایسے پیش آگئے۔ تو آپ سے معلوم کرلینا ہی مناسب سمجھا، اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

(۱) جس نے فرض عشاء جماعت سے نہ پڑھی ہو وہ وتر بھی جماعت سے نہ پڑھے۔

ردالمحتار میں ہے۔ اذا لم یصل الفرض معه لا یتبعه فی الوتر۔ اس عبارت سے ثابت ہوگیا کہ جس نے جماعت سے فرض نہ پڑھے ہوں وہ جماعت سے وتر نہیں پڑھ سکتا۔ جو اسکے خلاف کہتا ہے وہ اس عبارت شامی کا جواب دے۔ اور اپنے دعوے پر بھی وہ ایسی عبارت پیش کرے ساری علمی قابلیت کی پول کھل جائے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۲) جو شخص یکمشت سے کم داڑھی رکھتا ہو، یا بالکل صاف ہی کرادیتا ہو، وہ بلاشبہ فاسق ہے۔ اس کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے۔ اور اس کے پیچھے جو نماز پڑھی جائے گی، وہ واجب الاعادہ ہوگی، لہذا خطیب کا یہ اعتراض تو صحیح ہے، کہ اسکے پیچھے نماز نہ پڑھنی چاہیے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۳) جب یہ امام وخطیب جامع مسجد مودودی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ اور مودودی کے لٹریچر کو صحیح جانتا ہے، اور عقائد واعمال کی تصدیق کرتا ہے، اور اسکے بالمقابل عقائد مسائل اہل سنت کو غلط و باطل اور بدعت وشرک کہتا ہے، اور اسکے قول کے بموجب ساری امت کو بدعتی ومشرک جانتا ہے، تو اس امام کو جامع مسجد کی امامت سے علیحدہ کردینا ضروری ہے۔ اہل سنت اس کے پیچھے ہرگز نماز نہ

پڑھیں، کہ یہ امام گمراہ ہو گیا اور گمراہوں کے پیچھے نماز کے جائز ہونے کا قول خود ہمارے امام اعظم علیہ الرحمۃ کا ہے۔

کبیری میں ہے۔ روی محمد عن ابی حنیفة و ابی یوسف ان الصلوة خلف اهل الهواء لا تجوز۔ لہذا اہل اسلام اس امام کو جامع مسجد کی امامت سے علیحدہ کردیں کہ اس کے پیچھے کسی کی نماز نہیں ہوتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۹۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

زید کا کہنا ہے کہ نماز پڑھنے میں امام سب کچھ پڑھتا ہے۔ مقتدی کو بھی سب پڑھنا چاہیے، اور اگر امام کے اوپر بات ہے تو مقتدی کو کچھ بھی نہ پڑھنا چاہیے، التحیات تسبیح رکوع وسجود بھی نہ پڑھنا چاہیے کہ امام تو سب پڑھتے ہیں۔

المستفتی حبیب اللہ، مظفر پور

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

عقلا تو مقتدی کو نماز میں سب کچھ پڑھنا چاہیے تھا کہ وہ اپنے فریضہ کو ادا کر رہا ہے لیکن قرأت کے متعلق چونکہ حدیث شریف میں وارد ہو گیا۔ من كان له امام فقرأة الامام له قرأة۔ یعنی جس کا امام ہو تو امام کا قرأت کرنا اسی کا قرأت کرنا ہے تو اس حدیث کے حکم سے مقتدی سے صرف قرأت کو معاف کر دیا گیا۔ باقی رہے اوراذکار، ثنا، تسبیحات، تشہد چونکہ ان کے لئے کوئی شارع علیہ السلام کا ایسا حکم وارد نہیں، تو مقتدی ان سب کو پڑھے گا جن میں امام کا پڑھنا مقتدی کے لئے کافی ہوسکتا ہے، فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۲۹۹)

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

بڑے مقامات پر جیسے دہلی، اجمیر شریف، وغیرہ، عیدین، عرس وغیرہ کے موقع پر نماز کے لئے لوگ چھتوں پر بھی نماز پڑھتے ہیں۔ کہیں امام سے اونچے کہیں نیچے، کہیں درمیان میں، زیادہ جگہ چھوٹی ہوئی تو لوگوں کی کثرت کی وجہ سے امام کی آواز سنائی نہیں دیتی ہے، تو امام کی حرکت وانتقال کے وقت توپ چھوڑی جاتی ہے، توپ کی آواز پر لوگ رکوع ، سجدہ وغیرہ کرتے ہیں تو اس صورت سے نماز ہوگی یا نہیں؟ کثرت کی وجہ سے نماز کما حقہ ادا نہیں ہوسکتی ہے۔ مصلی چاروں طرف سے دبا ہوا ہے، بچوں کی طرح نماز میں دھکے لگتے جاتے ہیں، سجدہ بھی گھٹنوں کے قریب ہی ہوتا ہے، ایسی حالت کی نماز ہوگی کہ نہیں۔ اس پر بھی لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو پڑھتے ہیں خدا قبول کرے یا نہ کرے۔ امام کی آواز سنائی دینے کے لئے لاؤڈ اسپیکر استعمال کرسکتے ہیں یا نہیں۔ اگر استعمال کیا تو نماز ہوگی یا نہیں؟۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

ازدہام کے مواقع پر چھت اور ہر اس جگہ اقتدا کی جاسکتی ہے جہاں تک صفوں کا اتصال ہو، درمیان میں فاصلہ نہ ہو، امام کے انتقالات کا صحیح طور پر علم ہوتا ہو اگرچہ بوجہ کثرت کے سجدہ گھٹنوں کے قریب ہی کرنے پڑتے ہوں۔ اور ہر طرف سے دباؤ پڑتا ہو۔ اور امام کی آواز بھی نہ سنتا ہو، صرف مکبرین کی تکبیروں کی آواز آتی ہو۔ جس پر رکوع سجدہ وغیرہ ادا کرتا ہو۔ چاہے وہ مقام امام کی جگہ سے پست ہو یا بلند ہو۔ تو اس طرح مقتدی کی نماز ہوجائے گی۔ لیکن توپ کی آواز یا لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر رکوع یا سجدہ وغیرہ انتقالات کرنا اور اس کو امام کی اقتدا سمجھنا سخت غلطی ہے، کہ یہ ہر دونوں چیزیں نمازی نہیں، لہذا ان کا امام ومقتدی کی نماز کے درمیان میں آجانا مقتدی کی نماز کے لئے مفسد صلوۃ ہے۔ تو لاؤڈ اسپیکر یا توپ کا نماز کے انتقالات کے لئے شرعا ناجائز ممنوع ہے۔ ان کی آوازوں پر اقتدا صحیح نہیں۔ اس میں میرا ایک مستقل مبسوط فتوی ہے، جو فتاوی اجملیہ میں موجود ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۰۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

بوقت جماعت نماز پنجگانہ میں اکثر اشخاص تکبیر کے قدقامت الصلوۃ الفاظ ہونے تک بیٹھے رہتے ہیں۔شریعت میں یہ امر کیسا ہے؟۔

ح۔م۔اشرفی ۲۵ر اکتوبر

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

نماز پنجگانہ کی جماعتوں کے لئے لوگوں کو صف بنا کر بیٹھ جانا مستحب ہے اور پھر جب مکبر (حی علی الفلاح) پر پہونچے اس وقت سب لوگوں کو کھڑا ہونا چاہئے ابتداء تکبیر سے کھڑا ہو جانا مکروہ ہے جیسا کہ فتاوی عالمگیری وشامی وغیرہا کتب فقہ میں بالتصریح موجود ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

﴿۲۱﴾

باب الامامت

مسئلہ (۳۰۱_۳۰۲_۳۰۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ

(۱) ایک شخص یہ کہتا ہے کہ جو شخص زانی ہو یا اغلام کرتا ہو اور کراتا ہو یا قمار بازی کرتا ہو یا شراب پیتا ہو اس قسم کے تمام لوگوں کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے آیا یہ کہنا اس شخص کا درست ہے یا نہیں جواب مع حوالہ قرآن وحدیث کے ہونا چاہئے۔

(۲) جو شخص ایسا ہو کہ اس کو علم ہے کہ میری عورت کا دوسرے شخص سے تعلق ہے اور اس نے اپنی آنکھ سے اپنی عورت کو زنا کراتے دیکھ لیا ہو اور اس پر بھی اس نے عورت کو طلاق نہ دی اور نماز پڑھانے کے لئے تیار ہو تو ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟۔

(۳) اگر نکاح سے آزاد ہوگئی ہو اس نے طلاق دیدی ہو اور بغیر نکاح اپنی بیوی بنا کر رکھتا ہو تو ایسے شخص کے پیچھے بھی نماز درست ہے یا نہیں۔ بینوا وتوجروا

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

(۱) فاسق معلن۔ زانی۔ مغلم۔ جواری۔ شرابی۔ اور ہر وہ شخص جو کوئی گناہ کبیرہ بالاعلان کرتا ہو اس کو امام بنانا معصیت ہے اور امامت کے لئے پیش کرنا مکروہ تحریمی۔

کبیری میں ہے: لو قدموا فاسقا یاثمون بناءً علی ان کراهة تقدیمة کراهة تحریم لعدم اعتنائه بامور دینه وتساهله فی اتیان بلوازمه فلایبعده منه الاخلال ببعض شروط الصلوة وفعل ماینافیها بل هو العالب بالنظر الی فسقه۔ (ص ۴۷۹)

اور مراقی الفلاح میں ہے: کره امامة الفاسق العالم لعدم اهتمامه بالدین فتجب اهانته شرعا فلایعظم بتقدیمه للامامة۔ (حاشیہ طحطاوی مصری ص ۱۷۶)

طحطاوی میں ہے: ومفاده کون الکراهة فی الفاسق تحریمیة۔ (ص ۱۷۶)

جوہرہ نیرہ میں ہے: وتکرہ الصلوۃ خلف شارب الخمر واکل الربا لانہ فاسق۔

(ص ۸۵)

شامی میں ہے: اما الفاسق فقد عد کراھۃ تقدیمہ بانہ لایھتم لامر دینہ وبان فی تقدیمہ للامامۃ تعظیمہ وقدوجب علیھم اھانتہ شرعا۔ (مصری ص ۳۹۳)

ان عبارات سے صاف طور پر معلوم ہوگیا کہ فاسق کا امام بنانا گناہ اور اس کا امامت کے لئے پیش کرنا مکروہ تحریمی ہے اور انتہائی درجہ ہے کہ فاسق کے پیچھے نماز مکروہ تنزیہی ہوگی اور ہر نماز جو کراہت سے ادا ہو اس کا اعادہ کرنا چاہئے۔

مراقی الفلاح میں تجنیس سے ناقل ہیں: کل صلوۃ ادیت مع الکراھۃ فانھا تعاد۔

(حاشیہ طحطاوی ص ۲۰۱)

طحطاوی میں ہے: اطلق الکراھۃ فعم التحریمۃ والتنزیھۃ۔ (ص ۲۰۱)

لہذا اب کراہت کو قطع نظر کرتے ہوئے نفس جواز لیکر مسئلہ بیان کرنا فقہ سے ناواقفی کی دلیل ہے اور قلوب عوام سے عظمت شرع کم کرنے کی بری سبیل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) ایسے شخص کو امام نہیں بنانا چاہئے۔

لعلۃ نفرۃ الناس عنہ ولکراھتھم وفیہ التقلیل بالجماعۃ۔

حدیث شریف کا ایسے ہی امام کے متعلق ارشاد ہے:

لایقبل اللہ الصلوۃ من تقدم قوما وھم لہ کارھون۔ (رواہ ابوداؤد)

اللہ تعالیٰ اس شخص کی نماز قبول نہیں فرماتا جو کسی قوم کا امام بنے اور وہ اس سے کراہیت کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) یہ شخص بھی فاسق ہے اس کا مفصل حکم جواب اول میں مذکور ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المتوسل بنعال النبی الافضل المدعو بمحمد اجمل بن الشاہ محمد اکمل الحقھما اللہ بحزبہ الاول ناظم المدرسۃ الموسومۃ باجمل العلوم الواقعۃ فی بلدۃ سنبھل۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۰۴)

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ

زید وبکر عرصہ چھ سال کا ہوا ایک جنازہ میں شریک تھے اس اثناء میں بکر نے سوال کیا کہ اگر کوئی ہندو جو کہ عرصہ دراز تک کسی مسلمان کے یہاں ملازم رہے اور فوت کر جائے تو رسم میت بطریق اہل اسلام ادا کریں گے یا بطریق اہل ہنود زید نے جواباً کہا کہ بطریق اہل ہنود۔ بکر نے کہا اس کے منہ میں کلمہ کا دم کیا ہوا پانی ڈال کر رسم میت بطریق اہل اسلام ادا ہوگی زید نے اس کے متعلق چند آیات قرآن پیش کیا اور کہا کہ ہرگز رسم میت بطریق اہل اسلام ادا نہ کریں گے۔ بکر نے کہا کہ میں کلمہ کو مانتا ہوں قرآن کو نہیں مانتا۔ زید نے کہا کہ تم کافر ہو گئے توبہ کرو بصورت عدم توبہ زید نے سلام وکلام اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا ترک کر دیا کچھ عرصہ بعد لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا اس نے گفتگوئے مذکورہ کا قطعاً انکار کیا اور کہا کہ میں نے ایسا نہیں کہا بلکہ یوں کہا ہے کہ کوئی مسلمان کسی ہندو کے یہاں ملازم رہے اور ارکان اسلام کو تمام وکمال ادا نہ کیا ہو اور فوت کر جائے تو رسم میت کی ادائیگی کا کیا طریقہ ہے بصورت عدم شہادت کے زید نے اس کا بیان حلفی طلب کیا اس نے اس کا بھی انکار کر دیا تو آیا بکر خارج از اسلام ہو گیا یا نہیں۔ بر بنائے مخاصمت ہذا مابین زید وبکر کچھ عرصہ ہوئے ایک متنازعہ ہوا تھا اس میں بکر نے زید کو حرامی کہا اور اس کا اعلان بھی تمام گاؤں میں کر دیا جب اس کی دلیل طلب کی گئی تو اس نے کہا کہ والدہ زید نے بغیر طلاق لئے ہوئے موضع ہذا میں آخر عقد ثانی کر لیا تھا اور یہ زید شوہر ثانی سے ہے اور اپنے قول کی صداقت میں ان شخصوں کا بیان حلفی پیش کیا جن سے زید سے دشمنی تھی زید نے کہا کہ یہ بالکل غلط ہے واقعہ دراصل یہ ہے کہ میری والدہ نے شوہر اول سے طلاق پا کر موضع ہذا میں آکر عقد ثانی کیا تھا بلکہ بعد طلاق کے بھی وہ تین ماہ وہیں رہی اور شہادت میں والدہ کے ماموں ونانا اور ایک ایک گڈریہ کا بیان حلفی پیش کیا۔

واضح ہو کے زید وبکر دونوں حافظ ہیں بلکہ زید نابینا اور شوہر اول وثانی دونوں فوت کر چکے ہیں شوہر اول نے جو عقد ثانی کیا تھا وہ عورت اب تک موجود ہے اور اس کا بیان حلفی مطابق زید ہے اور اس کے برادر کے اکثر بیانات اس کے خلاف ہیں تو آیا زید حرامی ہے یا نہیں اور اس کے پیچھے تراویح ودیگر نمازیں پڑھنا کیسا ہے۔ بینوا توجروا بالکتاب وبالحساب فقط

فقیر حافظ رمضان علی عفی عنہ ڈاکخانہ واسٹیشن بھرواری ضلع الہ آباد

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بلاشک قرآن کریم کی کسی آیت یا کسی کلمہ کا بلکہ کسی حرف کا انکار کفر ہے حضرت قاضی عیاض شفا شریف میں فرماتے ہیں:

جمیع من ینتحل التوحید متفقون ان الجھود بحرف من التنزیل کفر۔

(شرح شفا مصری صفحہ ۵۵۲)

لیکن جب بکر کے اس قول پر نہ کوئی شہادت ہے نہ وہ خود اقرار کرتا ہے تو محض ایک زید کی شہادت کی بنا پر اس کو کافر قرار نہیں دیا جاسکتا اور اس کا بیان حلفی سے انکار کرنا احتمال کفر کو متعین نہیں کرتا کہ بیان حلفی نہ دینے کی اور وجوہ بھی ہو سکتی ہیں لہذا بکر کا خارج از اسلام ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

اسی طرح زید جب حرامی ہوگا کہ بکر اس کو شہادت شرعی سے ثابت کرے۔ اور مسئلہ امامت میں بعد ثبوت زید کی امامت مکروہ تنزیہی ہے۔ کہ اس سے افضل کوئی اور امام موجود ہو۔ چنانچہ کبیری میں مبسوط سے ناقل۔

انمایکرہ تقدیم الاعمیٰ اذا کان غیرہ افضل منہ۔

اور جب اس مسجد میں زید سے افضل کوئی دوسرا امام موجود نہ ہو تو وہی اولیٰ ہے چنانچہ عینی میں بدائع سے ناقل ہیں:

اذا کان لا یوازیہ غیرہ فی الفضیلۃ فی مسجدہ فھو اولیٰ وقد استخلف النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ابن ام مکتوم علی المدینۃ (وھو کان اعمیٰ) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۰۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

اقامت جب پڑھی جائے تو حی علی الفلاح کے بعد کھڑا ہونا سنت ہے یا کہ مستحب اس کا جواب بحوالہ کتب فقہ معہ عبارت مرحمت فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

آج کل اکثر جگہ یہ رواج پڑ گیا ہے کہ بوقت تکبیر سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں بلکہ بعض جگہ تو یہاں تک نوبت پہونچ گئی کہ جب تک امام مصلی پر کھڑا نہ ہو جائے اس وقت تک تکبیر ہی نہیں کہتے تو یہ بات مکروہ اور خلاف سنت ہے اور تصریحات کتب فقہ اور اقوال فقہاء احناف بلکہ خود قول امام الائمہ سراج الامۃ حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے خلاف ہے بلکہ عمل صحابہ کرام وحدیث خیر الانام علیہ التحیۃ والسلام کے بھی خلاف ہے مسلمانوں کو چاہئے کہ ایسے غلط فعل اور بلا دلیل عمل سے پرہیز کریں مکروہ اور خلاف سنت رواج سے بچیں اور شروع تکبیر سے کھڑے نہ ہوں کتب فقہ میں تو یہاں تک تاکید موجود ہے کہ اگر کوئی شخص ایسے وقت میں مسجد میں آیا کہ تکبیر ہو رہی تھی تو وہ فوراً بیٹھ جائے اور جب تکبیر کہنے والا حی الفلاح کہے تو یہ شخص کھڑا ہو۔

(۱) چنانچہ فتاوی عالمگیری میں ہے:

اذا دخل الرجل عند الاقامۃ یکرہ لہ الانتظار قائما ولکن یقعد ثم یقوم اذا بلغ المؤذن قولہ حی علی الفلاح ۔ کذا فی المضمرات (ص ۴۴۰)

جب کوئی شخص تکبیر کے وقت آئے تو اسے کھڑے ہو کر انتظار کرنا مکروہ ہے بلکہ وہ بیٹھ جائے پھر جب تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح پر پہونچے تو کھڑا ہو ایسے ہی مضمرات میں ہے۔

(۲) جامع الرموز میں ہے:

لو دخل المسجد احد عند الاقامۃ یقعد لکراھۃ القیام والانتظار ۔ (ج ۱ ص ۷۲)

اگر کوئی شخص تکبیر کے وقت مسجد میں داخل ہو تو قیام اور انتظار کے مکروہ ہونے کی وجہ سے بیٹھ جائے۔

(۳) ردالمحتار میں ہے: یکرہ لہ الانتظار قائما ولکن یقعد ثم یقوم اذا بلغ المؤذن حی علی الفلاح۔ (ردالمحتار ص ۴۸۰)

(تکبیر کے وقت آنے والے کو) کھڑے ہو کر انتظار کرنا مکروہ ہے بلکہ وہ بیٹھ جائے پھر تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح پر پہونچے تو وہ کھڑا ہو۔

(۴) طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

واذا اخذ المؤذن فی الاقامة ودخل رجل المسجد فانه یقعد ولا ینتظر قائما فانه مکروه کما فی المضمرات و قهستانی ویفهم منه کراهة القیام ابتداء الاقامة والناس عنه غافلون ۔ (طحطاوی مصری ص ۱۶۱)

جب تکبیر کہنے والا تکبیر شروع کرے اور کوئی شخص مسجد میں آئے تو وہ بیٹھ جائے اور کھڑے ہوکر انتظار نہ کرے کہ یہ مکروہ ہے جیسا کہ مضمرات اور قہستانی میں ہے اور اس سے شروع تکبیر سے کھڑے ہونے کی کراہت معلوم ہوئی اور لوگ اس سے غافل ہیں۔

ان عبارات سے ثابت ہوا کہ جب تکبیر میں آنے والے کو تھوڑی دیر کے لئے کھڑے ہوکر انتظار کرنا مکروہ ہے تو شروع تکبیر سے کھڑے ہوکر انتظار کرنا تو بدرجہ اولیٰ مکروہ ہوا۔ اب باقی رہا یہ امر کہ مقتدیوں کو تکبیر میں کس وقت کھڑا ہونا چاہئے اس کی چند صورتیں فقہاء نے لکھی ہیں جنہیں یہ تفصیل ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) امام محراب کے قریب نہیں ہے اور تکبیر ہو رہی تھی کہ مسجد میں صفوں کے آگے سے داخل ہوا تو سب مقتدی امام کو دیکھتے ہی کھڑے ہو جائیں۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، دارمی، طبرانی، وغیرہا کتب احادیث میں یہ حدیث مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۱) (حدیث) اذا اقیمت الصلاة فلاتقوموا حتی ترونی ۔ (بخاری شریف ص ۸۸)

جب نماز کے لئے تکبیر کہی جائے تو تم کھڑے نہ ہونا یہاں تک کہ تم مجھے دیکھ لینا۔

(۲) درمختار میں ہے: وان دخل من قدام قاموا حین یقع بصرهم علیه۔

اگر امام صفوں کے آگے سے آئے تو اسے مقتدی جس وقت دیکھیں کھڑے ہو جائیں۔

(۳) طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے: وان دخل من قدامهم قاموا حین رأوه ۔ (طحطاوی ص ۱۶۱)

اگر امام صفوں کے سامنے سے داخل ہو تو مقتدی اسے دیکھتے ہی کھڑے ہو جائیں۔

(۴) عینی شرح کنز الدقائق میں ہے: وان دخل من قدام یقومون حین یقع بصرهم علیه (عینی ص ۳۱)

اگر امام سامنے سے آئے تو مقتدیوں کی اس پر جب نگاہ پڑے کھڑے ہو جائیں۔

(۵) بدائع میں ہے: ان دخل الامام من قدام الصفوف فکما رواه قاموا لانه کما

دخل المسجد قام مقام الامامۃ۔ (بدائع ص ۲۰۰)

اگر امام صفوں کے آگے سے آیا تو اس کو جب مقتدی دیکھیں کھڑے ہو جائیں اس لئے کہ وہ مسجد میں داخل ہوا تو امامت کی جگہ پر قائم ہو گیا۔

(۲) امام محراب کے قریب نہ ہو اور مسجد میں صفوں کے پیچھے سے آیا ہو تو امام جس صف پر گذرتا جائے وہی صف کھڑی ہوتی جائے۔ یہ مضمون اس حدیث شریف سے بھی مستفاد ہوتا ہے اور بکثرت کتب فقہ سے ثابت ہے۔

مراقی الفلاح اور طحطاوی میں ہے: وان لم یکن حاضرا یقوم کل صف حین ینتهی الیه الامام فی الاظهر وفی عبارة بعضهم فلما جاوز صفا قام ذلك الصف۔ (طحطاوی ۱۶۱)

وان لم یکن حاضرا لایقوم القوم کل صف حین ینتهی الیه الامام فی الاظهر وفی عبارة بعضهم فکلما جاوز صفاقام ذلك الصف۔ (طحطاوی مصری ۱۶۱)

اگر امام مسجد میں موجود نہ ہو تو وہ امام جس صف تک پہونچے وہ ہی صف کھڑی ہوتی جائے اور یہی قول ظاہر تر ہے اور بعض فقہاء کی یہ عبارت ہے کہ امام جس صف پر گذرے وہی صف کھڑی ہو جائے

عینی شرح کنز الدقائق میں ہے:

وان لم یکن امام بقریب المحراب بان کان فی موضع آخر فی المسجد و خارجه ودخل من خلفٍ فیقوم کل صف ینتهی الیه الامام علی الاظهر ملخصا۔ (ردالمحتار ص ۳۳)

اگر امام محراب کے قریب نہ ہو اور مسجد کی کسی دوسری جگہ میں ہو یا مسجد سے باہر ہو اور صفوں کے پیچھے سے داخل ہو تو امام جس صف تک پہنچے وہی صف کھڑی ہوتی جائے بنابر قول ظاہر تر کے۔

بدایہ میں ہے:

وان کان خارج المسجد لایقومون مالم یحضر لقول النبی صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم لاتقوموا فی الصف حتی ترونی خرجت (وفیه ایضا) وان دخل من وراء الصفوف فالصحیح انه کلما جاز فصار فی حقهم کانه اخذ مکان۔ بدائع ج ا ص ۲۰۰

اگر امام مسجد سے باہر ہو تو مقتدی اس کے آنے تک کھڑے نہ ہوں جیسا کہ فرمان نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے: تم صف میں کھڑے نہ ہو یہاں تک کہ مجھ کو نکلتا ہوا دیکھو (اور اسی میں ہے) اگر امام

صفوں کے پیچھے سے آیا تو صحیح قول یہ ہے کہ جب وہ کسی صف سے گذر گیا تو ان کے حق میں ایسا ہو گیا کہ گویا کہ وہ اپنی جگہ پہونچ گیا۔

(۳) امام مسجد میں محراب کے قریب موجود ہے تو امام ومقتدی اس وقت کھڑے ہوں جب تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح تک پہونچے۔

علامہ قاری علی علیہ رحمۃ الباری مرقات میں اس حدیث شریف کے تحت میں فرماتے ہیں: جو نمبرا میں منقول ہوئی۔

ولعله صلی اللّٰه تعالیٰ علیه وسلم کان یخرج من الحجرة بعد شروع المؤذن فی الاقامة ویدخل فی محراب المسجد عند قوله حی علی الصلاة ولذا قال أئمتنا ویقوم الامام والقوم عند حی علی الصلاة۔ (حاشیہ مشکوۃ شریف ص ۶۴)

شاید کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حجرے شریف سے تکبیر کہنے والے کی تکبیر شروع کرنے کے بعد نکلتے تھے اور محراب مسجد میں حی علی الصلوۃ کہنے کے وقت تشریف لاتے اس لئے ہمارے ائمہ نے فرمایا کہ امام اور مقتدی حی علی الصلوۃ کے وقت کھڑے ہوں۔

نووی شرح مسلم میں ہے:

کان انس رحمه اللّٰه تعالیٰ یقوم اذا قال المؤذن قدقامت الصلاة وبه قال احمد رحمه اللّٰه تعالیٰ۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس وقت کھڑے ہوتے تھے جب تکبیر کہنے والا قدقامت الصلاۃ کہتا اور یہی امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

(۴) کتاب الآثار میں ہے:

عن الامام الاعظم عن طلحة عن مطرف عن ابراهيم انه قال اذا قال المؤذن حی علی الفلاح فینبغی للقوم ان یقوموا للصلوۃ قال محمد وبه ناخذ وهوقول ابی حنیفة۔

(صحیح البہاری ص ۴۶۹)

حضرت امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ جب تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح کہے تو قوم کے لئے کھڑا ہونا مناسب ہے امام محمد نے فرمایا کہ ہم اسی کو دلیل بناتے ہیں اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ کا قول ہے۔

(۴) وقایہ میں ہے:

ویقوم الامام والقوم عند حی علی الفلاح ۔ (شرح وقایہ ص ۱۶۸)

امام اور مقتدی حی علی الفلاح کے وقت کھڑے ہوں۔

ملتقی الابحر میں ہے: واذ قال حی علی الصلاۃ قام الامام والجماعۃ۔

(شرح وقایہ فارسی ص ۲۸)

جب تکبیر کہنے والا حی علی الصلوۃ کہے تو امام اور جماعت کھڑی ہو۔

کنز الدقائق میں ہے: القیام حین قیل حی علی الفلاح۔ (کنز قیومی ص ۱۳)

اور کھڑا ہونا جس وقت حی علی الفلاح کہی جائے۔

نور الایضاح میں ہے: والقیام حین قیل حی علی الفلاح ۔

(نور الایضاح مطبوعہ قاسمی ص ۲۸)

اور کھڑا ہونا جب حی علی الفلاح کہی جائے۔

تنویر الابصار میں ہے: والقیام حین قیل حی علی الفلاح ان کان الامام یقرب المحراب۔ (شامی ص ۳۳۶)

اور کھڑا ہونا جس وقت حی علی الفلاح کہی جائے اگر امام محراب کے قریب میں موجود ہو۔

مراقی الفلاح میں ہے۔

ومن الادب القیام ای قیام القوم والامام ان کان حاضرًا یقرب المحراب حین قیل ای وقت قول المقیم حی علی الفلاح لانه امر له فیجاب ۔

(طحطاوی ص ۱۶۱)

اگر امام محراب کے قریب موجود ہو تو تکبیر کہنے والے حی علی الفلاح کے وقت امام اور مقتدیوں کا کھڑا ہونا مستحب ہے اس لئے کہ اس نے حی علی الفلاح سے قیام کا حکم کیا تو اس کی اجابت کی جائے۔

درمختار میں ہے: والقیام للامام والمؤتم حین قیل حی علی الفلاح خلافاً لزفر فعنده عند حی علی الصلاۃ ۔ (حاشیہ ردالمحتار ص ۳۳۶)

اور امام اور مقتدی کو حی علی الفلاح کے وقت کھڑا ہونا چاہئے اور امام زفر سے اس کی مخالفت مروی ہے ان کے نزدیک حی علی الصلوۃ پر۔

عینی شرح کنز الدقائق میں ہے:

الخامس (من الاداب) القیام ای قیام الامام والقوم حین قیل ای حین یقول المؤذن حی علی الفلاح۔ (عینی ص ۳۱)

مستحبات سے پانچواں مستحب تکبیر کہنے والے کے حی علی الفلاح کہنے کے وقت امام اور مقتدیوں کا کھڑا ہونا ہے۔

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

قولہ لانہ امربہ فیجاب ای لان المقیم امر بالقیام ای ضمن قولہ حی علی الفلاح فان المراد بفلاحھم المطلوب منھم حینئذ الصلوۃ فیبادر الیھا بالقیام۔ (طحطاوی ص ۱۶۱)

مراقی الفلاح کے اس قول لانہ امر بہ فیجاب کا یہ مطلب ہے کہ تکبیر کہنے والے نے اپنے قول حی علی الفلاح کے ضمن میں کھڑے ہونے کا حکم کیا ہے کہ نمازیوں کی فلاح مراد ہے جو حی علی الفلاح سے مطلوب ہے اس وقت نماز سے اس کی طرف قیام سے مبادرت چاہئے۔

تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق میں ہے: قولہ والقیام حین قیل حی علی الفلاح لانہ امربہ فیستحب المسارعۃ الیہ۔ (ص ۱۰۸)

صاحب کنز کا یہ قول کہ حی علی الفلاح کے وقت کھڑا ہونا چاہئے اس کی علت یہ ہے مکبر حی علی الفلاح کہہ کر حکم دیتا ہے تو قیام کی طرف مسارعت مستحب ہے۔

بحر الرائق شرح کنز الدقائق میں ہے:

قولہ والقیام حین قیل حی علی الفلاح لانہ امربہ فیستحب المسارعۃ الیہ اطلقہ فشمل الامام والمأموم ان کان الامام یقرب المحراب۔ (ص ۳۲۱)

صاحب کنز کا یہ قول کہ حی علی الفلاح پر قیام ہو اس کی علت یہ ہے کہ بکر نے حی علی الفلاح سے قیام کا حکم کیا ہے تو قیام کی جانب عجلت مستحب ہے اور صاحب کنز نے قیام کو مطلق کہا تو یہ حکم امام اور مقتدی کو شامل ہے جب کہ امام محراب کے قریب موجود ہو۔

مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں ہے:

واذا قال المؤذن فی الاقامۃ حی علی الصلاۃ قام الامام والجماعۃ عند علمائنا الثلثۃ۔ (مجمع الانہر ص ۳)

جب مکبر تکبیر میں حی علی الصلوۃ کہے تو چاہئے تینوں امام (یعنی امام اعظم اوران کے شاگرد امام یوسف اورامام محمد) کے نزدیک امام اور جماعت اس وقت کھڑے ہوں۔

بدائع میں ہے: ان المؤذن اذا قال حی علی الفلاح فان کان الامام معهم فی المسجد یستحب للقوم ان یقوموا فی الصف۔ (بدائع ص ۲۰۰)

جب مکبر حی علی الفلاح کہے پس اگر امام ان کے سامنے مسجد میں موجود ہو تو مقتدیوں کو صف بنا کر کھڑا ہونا مستحب ہے۔

ذخیرہ میں ہے: یقوم الامام والقوم اذا قال المؤذن حی علی الفلاح عند علمائنا الثلاثة۔ (شامی ص ۳۳۶)

جب مکبر حی علی الفلاح کہے تو ہمارے تینوں اماموں کے نزدیک امام اور مقتدی کھڑے ہوں۔

مبسوط للامام السرخسی میں ہے: فان کان الامام مع القوم فی المسجد فانی احب لهم ان یقوموا فی الصف اذا قال المؤذن حی علی الفلاح۔ (ص ۳۹)

اگر امام قوم کے ساتھ مسجد میں موجود ہو تو ان کے لئے محبوب جانتا ہوں کہ وہ صف میں اس وقت کھڑے ہوں جب تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح کہے۔

شبلی حاشیہ زیلعی میں ہے:

قال فی الوجیز والسنة ان یقوم الامام والقوم اذا قال المؤذن حی علی الفلاح اھ مثله فی المبتغی۔ (ص ۱۰۸)

جب تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح کہے تو امام اور مقتدیوں کا کھڑا ہونا سنت ہے یہ وجیز میں کہا اور ایسا ہی مبتغی میں ہے۔

عالمگیری میں ہے: وان کان المؤذن غیر الامام وکان القوم مع الامام فی المسجد فانه یقوم الامام والقوم اذا قال المؤذن حی علی الفلاح عند علمائنا الثلثة وهو الصحیح۔ (ص ۴۴)

اگر مکبر امام کے علاوہ ہو اور قوم امام کے ساتھ مسجد میں موجود ہو تو ہمارے تینوں اماموں کے نزدیک جب تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح کہے اس وقت امام اور قوم کھڑے ہوں مفتیٰ بہ صحیح مذہب ہے۔

اسی طرح اصلاح ۲۱۔ ایضاح ۲۲۔ ظہیریہ ۲۳۔ درر ۲۴۔ غرر ۲۵۔ فیض ۲۶۔ نقایہ ۲۷۔

حاوی ۲۸۔ مختار ۲۹۔ طحطاوی ۳۰۔ درالمختار ۳۱۔ قہستانی ۳۲۔ مضمرات ۳۳۔ شرح کنز علامہ ملا مسکین ۳۴۔ شرح کنز علامہ شیخ مصطفیٰ ۳۵۔ فتح المعین ۳۶۔ شرح نبلائی ۳۷۔ محیطہ ۳۸۔ بزازیہ ۳۹۔ وجیز ۴۰۔ مبتغی ۴۱۔ عمدۃ القاری ۴۲۔ فتح الباری ۴۳۔ درالمتقی ۴۴۔ موطا امام محمد ۴۵۔ مالابد منہ ۴۶۔ میں یہ مسئلہ مذکور ہے جن کی عبارات بخوف طوالت نقل نہیں کی گئی ہیں اور چار عبارات اور ایک حدیث ابتدا میں نقل ہوئی کل تعداد (۵۰) ہوگئی ان عبارات سے نہایت واضح طور پر ثابت ہوگیا کہ حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا مستحب ہے اور یہ خود امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمان سے ثابت ہے بلکہ احادیث سے مستفاد ہے البتہ ان عبارات میں بعض طبیعتیں یہ احساس کرینگی کہ اکثر عبارات میں حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کا حکم ہے اور بعض میں حی علی الصلوۃ پر تو بظاہر ان میں تعارض معلوم ہوتا ہے مگر حقیقۃً کوئی تعارض نہیں ہے تطبیق عبارت کی صورت یہ ہے کہ اول الذکر عبارات سے ابتدا مراد لی جائے اور ثانی الذکر سے انتہا۔ یعنی جب مکبر حی علی الصلوۃ کو تمام کر کے حی علی الفلاح پر پہنچے تو امام اور مقتدی کھڑے ہوجائیں اس طور پر ظاہری تعارض بھی نہیں رہا۔

(۴) اگر امام خود ہی تکبیر کہے تو جب تک وہ پوری تکبیر کہہ کر فارغ نہ ہوجائے اس وقت تک مقتدی کھڑے نہ ہوں یعنی اس صورت میں بعد فراغت تکبیر مقتدی کھڑے ہوں۔

عالمگیری میں ہے: وان کان المؤذن والامام واحد اقام فی المسجد فالقوم لایقومون مالم یفرغ عن الاقامت۔ (ص ۴۴)

اگر امام اور مکبر ایک ہوں پس اگر امام نے مسجد میں تکبیر کہی تو مقتدی کھڑے نہ ہوں جب تک امام تکبیر سے فارغ نہ ہو۔

عالمگیری میں ہے: اگر خود ہی امام نے تکبیر کہی لیکن مسجد سے باہر کہی تو مقتدی فوراً بعد فراغت تکبیر کھڑے نہ ہوں بلکہ اس وقت کھڑے ہوں کہ امام مسجد میں داخل ہوجائے۔

عالمگیری میں ہے: وان اقام خارج المسجد فمشائخنا اتفقوا علی انهم لایقومون مالم یدخل الامام المسجد۔

اگر امام نے مسجد سے باہر تکبیر کہی تو ہمارے مشائخ کا اس بات پر اتفاق کہ مقتدی اس وقت تک کھڑے نہ ہوں جب تک امام مسجد میں داخل نہ ہو۔

بالجملہ اس تفصیل سے ظاہر ہوگیا کہ مقتدیوں کو شروع سے کھڑا ہونا یقیناً مکروہ ہے اور درمیان

تکبیر میں پہلی دو صورتوں میں مقتدیوں کے کھڑے ہونے کے لئے تکبیر کا کوئی کلمہ مقرر نہیں کیا جاسکتا کہ ان دونوں صورتوں میں مقتدیوں کا کھڑا ہونا امام کے آنے پر موقوف ہے کہ وہ جب آئے گا یہ اسی وقت کھڑے ہوں گے تیسری صورت میں کلمہ حی علی الفلاح پر مقتدیوں کا کھڑا ہونا مستحب ہے سوال میں اسی صورت کو دریافت کیا گیا ہے اور اکثر یہی صورت پیش آتی ہے چوتھی صورت میں مقتدیوں کو فراغت تکبیر کے بعد کھڑا ہونا چاہئے۔

الحاصل یہ تمام صورتیں صرف مقتدیوں کے لئے ہیں اب باقی رہا امام تو اس کے لئے تیسری صورت میں تو کتب فقہ میں اس قدر تصریح ہے کہ وہ بھی حی علی الفلاح پر کھڑا ہو علاوہ اس کے امام کے لئے کوئی خاص حکم مذکور نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (٣٠٦)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

زید کی عمر ١٨ سال کی ہے کہ جو بالغ حافظ قرآن خوش آواز صحت کے ساتھ پڑھنے والا ہے البتہ اس کے ابھی تک داڑھی نہیں نکلی ہے مونچھیں نمودار ہیں اور سوا اس کے اور کوئی صحت سے پڑھنے والا بھی نہیں ہے تو ایسی صورت میں از روئے شرع شریف زید کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں اور اگر جائز ہے تو اس کا جواب بحوالہ کتب فقہ معہ عبارت مرحمت فرمائے گا۔ بینوا توجروا

المستفتی حافظ عبدالوہاب سنبھل

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الكريم

شخص مذکور کی جب اٹھارہ (١٨) سال کی عمر ہے تو وہ بلاشبہ یقیناً بالغ ہے کہ شرع میں پندرہ برس کا بالغ قرار دیا گیا ہے۔

کنز الدقائق میں ہے: ويفتى بالبلوغ فقها بخمس عشرة سنة۔

درمختار وتنویر الابصار میں ہے: فان لم يوجد فيها شئ فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة وبه يفتى۔

ان عبارات سے واضح ہوگیا کہ قول مفتی بہ یہی ہے کہ جب پندرہ برس کی عمر ہو جائے تو وہ شرعاً بالغ ہے اور سوال میں اس کی عمر اٹھارہ برس کی ظاہر کی گئی ہے لہذا اس کے بالغ ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں اب باقی رہی امرد (بے ریش) کی امامت تو فقہاء نے اس کے مکروہ تنزیہی ہونے کی یہ علت لکھی ہے کہ وہ ایسا خوبصورت ہو کہ محل فتنہ اور شہوت بن جائے۔

شامی میں ہے: تکرہ خلف امرد الظاهر انها تنزيهة ايضا والظاهر كما قال الرحمتي ان المراد الصبيح الوجه لانه محل الفتنه۔

اور شخص مذکور کو سائل نے بروقت فتوی طلب کرنے کے پیش کیا تو وہ ایسا خوبصورت نہیں ہے جو محل شہوت وفتنہ ہو لہذا اس کی امامت مکروہ تنزیہی بھی نہیں ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ شخص مذکور یقیناً بالغ ہے اور ایسا امرد بھی نہیں ہے جس کی امامت مکروہ تنزیہی ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۰۷)

جناب مفتی صاحب اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس ناچیز کو جمعہ کی نماز کے متعلق مسئلہ دریافت کرنا ہے

ایک مسجد میں نماز پڑھتے تھے تو ان کو معلوم ہوا کہ شیخ احمد مدینوار کے مرید ہیں تو وہاں نماز پڑھنا چھوڑ دیا ہے تب دوسری مسجد میں جانے لگے تو ان کا بھی معلوم ہوا کہ سینما وغیرہ دیکھا کرتے ہیں اور حافظ قرآن کہلاتے ہیں تو وہاں بھی جانا چھوڑ دیا تیسرے مسجد کا بھی وہی حال ہے تو چوتھے مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے لگے تو وہ امام حافظ ہیں ظاہری تقوی درست ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ کسی کو بھلا برا نہیں کہنا چاہئے اپنا اعمال کو صحیح رکھنا چاہئے اور شاہ سعود کو کہتے ہیں کہ وہ اسلام کے صحیح راستہ پر ہیں اور مدینہ شریف کے مزار کا اچھی طرح خیال کرتے ہیں تو ہم کو پورا معلوم نہیں ہے اس لئے مسئلہ دریافت طلب ہے کہ اب اس اطراف میں کوئی اور مسجد نہیں کہ جمعہ جا کر پڑھیں اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ تین جمعہ چھوڑ دینے سے مسلمان سے خارج ہو جاتا ہے تو اب ہم کیا کریں نماز جمعہ کے بارے میں کیا حکم نافذ ہے زیادہ کیا لکھوں فقط والسلام

عبد الحمید معرفت ماہنامہ سنی لکھنو

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مقتدی کی نماز کی صحت امام کی نماز کی صحت پر موقوف ہے تو جب امام ہی کی نماز صحیح نہ ہوتو پھر مقتدی کی نماز کیسے صحیح ہوسکتی ہے ادھر تو بدمذہب گمراہ کافر مرتد کی نہ نماز حقیقۃ نماز ہے نہ ان کی جماعت حقیقۃ جماعت ہے بلکہ ان کی کوئی عبادت شرعاً عبادت ہی نہیں ادھر مولوی حسین احمد صدر مدرس مدرسہ دیوبند اور شاہ سعود نجدی کو جو شخص مسلمان جانے اور ان کو اسلام کے صحیح راستے پر بتائے۔ تو گویا وہ ان کی شان الوہیت اور رسالت میں گستاخیوں اور ان کی بداعتقادیوں اور کفریات کو اسلام کا راستہ جانتا ہے تو یہ بھی ان کفریات اور گستاخیوں کے ساتھ ایسا راضی ہوگیا کہ انھیں کو اسلام کا صحیح راستہ بتائے گا لہذا یہ شخص بھی کفر کو اسلام بتا کر مرتد و کافر کو مسلمان ٹھہرا کر شرعاً خود کافر ہوگیا۔

شرح فقہ اکبر اور تمام کتب عقائد میں ہے " الرضا بالکفر کفر "

تو ایسے بدمذہب و بدعقیدہ کی نہ نماز نماز ہے نہ جماعت جماعت ہے تو ایسے امام کے پیچھے نماز صحیح ادا نہیں ہوسکتی مسلمان ایسے بدمذہبوں کی ہرگز ہرگز اقتدا نہ کریں۔ اب باقی رہا ایسے امام کا حکم جو بدمذہب تو نہیں ہے لیکن وہ بدعمل فاسق ہے تو اس کے پیچھے پنج وقتہ نماز تو مکروہ تحریمی ہے اور واجب الاعادہ ہے لیکن جمعہ اس کے پیچھے بلا کراہت کے جائز ہے۔ اور ظاہر ہے کہ پہلی اور چوتھی مسجد کے امام بدعقیدہ دیوبندی ہیں ان کے پیچھے ہرگز ہرگز نماز نہ پڑھے اب باقی رہا لوگوں کا یہ قول کہ تین جمعوں کے ترک سے خارج اسلام ہوتا ہے غلط و باطل ہے۔ حدیث شریف میں جو تارک کے لئے وعیدیں ہیں وہ ان کے لئے ہیں جو جمعہ بلا عذر نہیں پڑھتے ہیں اور امام کے بدعقیدہ ہونے کی بنا پر تو ترک جمعہ بعذر ہے بلکہ اس کی اقتدا میں خود جمعہ ہی کب ادا ہوگا تو وہ جمعہ حقیقۃ جمعہ ہی نہیں ہے تو ترک جمعہ کی وعید اس کے لئے نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

۱۰ جمادی الاولیٰ ۷۶/ ۱۳ھ

مسئلہ (۳۰۸-۳۰۹)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

(۱) کہ بعد نماز عید بہت سے لوگ امام کے مصلے کے نیچے روپیہ یا پیسے رکھ دیا کرتے ہیں۔ کیا امام کو اس رقم کا کھانا جائز ہے یا ناجائز؟۔

(۲) بہت سے دنوں سے ہماری مسجد میں امام مستقل ہے کوئی شخص باہر کا چند دنوں کے واسطے آئے اور وہ نماز پڑھائے اس کے بعد پھر پردیس چلا جائے تو اس امام کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز۔ امام مسجد میں مستقل ہے اور لوگ دوسرے آدمیوں کی خوشنودی مزاج کے لئے دوسرے امام کو کھڑا کر دیتے ہیں اس پر چند آدمیوں نے نماز پڑھنا چھوڑ دی ہے۔ بینوا و توجروا

المستفتی، احمد حسن صابری چنور

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

(۱) جب وہ رقم مال زکوۃ و صدقہ واجبہ ہی سے نہ ہو یا ہو تو وہ امام اس کا اہل و مستحق ہو پھر وہ دینا بھی تنخواہ امامت کے سلسلہ میں بھی نہ ہو بلکہ یہ دینا بہ نیت محض اس کی اعانت کے لئے ہو تو اس امام کو ایسی رقموں کا لینا بلاشبہ جائز ہے۔ بلکہ لوگوں کو اپنے امام کی ایسی خدمتیں واعانتیں کرنی چاہیں واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) جس مسجد میں امام مستقل ہو تو باہر کا شخص اس امام کی اجازت سے نماز پڑھا سکتا ہے اور جب وہ باہر کا شخص امام مستقل سے اعتقاداً وعملاً ہر طرح افضل ہو تو وہ امام کی اجازت سے نماز پڑھا سکتا ہے اور نمازیوں کو بغیر اس کی اجازت کے ایسی جرأت نہیں کرنی چاہئے بلکہ بہتر یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے امام سے عرض کریں اور امام ان کو نماز پڑھانے کی اجازت دے۔ اور نماز ایسے امام کے پیچھے ناجائز ہوتی ہے جس میں کوئی وجہ شرعی ہو اور جنہوں نے فقط اتنی سی بات پر جماعت ترک کر دی ان کو ایسا نہ کرنا چاہئے کہ امام کی اقتداء کسی وجہ شرعی پر چھوڑی جاتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

۱۴ رمضان المبارک ۷۶ / ۱۳ھ

مسئلہ (۳۱۰_۳۱۱_۳۱۲_۳۱۳_۳۱۴_۳۱۵_۳۱۶_۳۱۷_۳۱۸)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

(۱) زید پیش امام ہے اور باوجود سید ہونے کے بالاعلان صدقہ اور خیرات لیتا ہے اور فطرہ کھاتا ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا نا جائز ہے؟۔

(۲) زید پیش امام ہے اور کاشتکاری اور نکاح خوانی اور خیاطی کرتا ہے اور اپنے گھر سے کھاتا پیتا ہے لیکن صاحب نصاب ہونے کے باوجود زکوۃ نہیں دیتا اور قربانی نہیں کرتا اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز؟۔

(۳) زید پیش امام ہے اور کچہری میں دوسرے کی ضد پر جھوٹا حلف اٹھاتا ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا نا جائز؟۔

(۴) زید پیش امام ہے اور وہابیہ جیسے غیر مقلدین دیوبندیہ نیچریہ وغیرہ بد مذہبوں سے الحاق کرتا ہے اور ان کے ساتھ میل جول رکھتا ہے اور اپنے کو اہل سنت والجماعت کہتا ہے اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ مندرجہ ذیل مسائل پر دستخط کر دو تو دستخط نہیں کرتا ایسی صورت میں زید سنی حنفی ہے یا وہابی ہے اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا نا جائز وہ مسائل یہ ہیں۔

(۱) غیر مقلدین وہابیہ مرتد ہیں مسلمان نہیں۔

(۲) غیر مقلدین وہابیہ کے پیچھے نماز حرام ہے۔

(۳) لازم ہے اہل سنت و جماعت کو کہ غیر مقلدوں کو اپنی مسجدوں میں نہ آنے دیں اور نکال دیں۔

(۴) غیر مقلدین وہابیہ کے ذبیحہ میں احتیاط لازم ہے۔

(۵) غیر مقلدین وہابیہ سے شادی بیاہ کرنا حرام ہے۔

(۶) زید پیش امام ہے اور قرآن اور خطبہ غلط اور خلاف تجوید پڑھتا ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا نا جائز؟۔

(۷) زید پیش امام ہے اور حد شرع سے اپنی داڑھی کم کراتا ہے کترواتا ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا نا جائز؟۔

(۸) زید پیش امام ہے اور بالاعلان بد مذہبوں کا ساتھ دیتا ہے اور ان کے پس پشت اپنے کو سنی حنفی کہتا ہے ایسا شخص سنی حنفی ہے یا نہیں اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا نا جائز۔؟

(۹) زید پیش امام ہے اور ضروریات دین اور مسائل ضروریہ سے عموماً اور مسائل امامت سے

خصوصاً ناواقف ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز۔

سائل، معرفت علن دھوبی ٹانڈا حرمت نگر ڈاکخانہ بلاسپور رام پور چھمن بیسلپور والے

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ان احوال کی بنا پر زید کے سنی حنفی ہونے کا دعویٰ صحیح نہیں کہ اگر وہ فی الواقع سنی حنفی ہوتا تو بلا تامل ان بعد والے نمبروں پر دستخط کر دیتا لہٰذا جب اس نے ان احکام شرعیہ متعلقہ وہابیہ غیر مقلدین پر دستخط نہیں کئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ احکام اس کے نزدیک صحیح نہیں۔ اور ان احکام کا صحیح نہ جاننا خود اس کے بدمذہب اور وہابی غیر مقلد ہونے کی دلیل ہے پھر مزید سوال میں اس کے فسق وفجور کے کافی افعال مذکور ہیں تو نماز تو اس کے پیچھے ناجائز ہے لہٰذا زید کا عمل اور اعتقاد غلط اور فاسد ہے تو نہ اس کے سنی حنفی ہونے کا دعویٰ صحیح نہ اس کے پیچھے نماز جائز وروا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

۲۵ ذیقعدہ ۶/ ۱۳۷ھ

مسئلہ (۳۱۹)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

زید نے کہا کہ اس مسجد پر لعنت اور میری امامت پر لعنت آپ لوگ مجھکو خدا کے واسطے معاف کریں میں نماز نہیں پڑھاؤں گا ایسے شخص کو امام بنانا جائز ہے یا نہیں بادلیل قوی کتب شرع شریف تحریر فرمایا جاوے۔ گواہان حاجی محمد یعقوب صاحب، حافظ عبدالریاض صاحب، حافظ محمد لئیق احمد صاحب، اقرار حسن خاں صاحب، اشفاق صاحب، محمد شفیع صاحب۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

زید کے یہ ہر دو جملے بہت سخت اور قبیح ہیں۔ فوراً اس کو توبہ کرنی چاہئے پھر جب تک وہ توبہ نہ کرے اس کو امام بھی نہ بنانا چاہئے کہ اس کی ایسی جرأت ودلیری پتہ دیتی ہے کہ شعار مذہبی واحکام دینی

کی اس کے دل میں کچھ قدر نہیں ہے تو وہ امامت جیسی ذمہ داری کی چیز میں نہ معلوم کیا کیا فروگذاشت کریگا۔ لہٰذا لوگوں کی نمازوں کے لئے ایسے غیر ذمہ دار شخص کو امام بنانا خلاف احتیاط اور نا مناسب ہے فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۷ جمادی الاخریٰ ۱۳۷۸ھ

مسئلہ (۳۲۰)

لو قام الامام الی الرکعة الخامسة ویعلمه رجل هل له ان یقتدی به فیها بنیة الفرض ویلقنه ام لا ؟

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

صح الاقتداء به فی هذه الصورة وله ان یلقنه قبل ان یقید الخامسة بسجدة صرحه صاحب ردالمحتار ناقلا عن البحر لو اقتدی به مفترض فی قیام الخامسة ولم یقعد قدر التشهد صح الاقتداء لانه لم یخرج من الفرض قبل ان یقید ها بسجدة ۔ والله تعالیٰ اعلم بالصواب ۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۲۱)

هل یحصل با قتداء الحافظ الجاهل عن شرائط الوضوء والصلوة وفروضهما وسننها فضیلة الجماعت وایضا جا هل بمفسد اتهما ام لا؟۔ اوهل یجو ز الاقتداء للعالم ام ل؟۔ا والانفراد افضل عن هذاام الجماعة احسن الینا یرحملکم الله بجاه سید العرب والعجم ﷺ ۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

قال النبی ﷺ فلیئومکم علماء کم فتقدیم الجاهل مع کون العالم حاضرامکروه فاقتداء العالم له اولیٰ من الانفراد لحصول فضیلة الجماعة کما هو مصرح فی کتب الفقه والله تعالی اعلم بالصواب ۔

مسئلہ (۳۲۲)

امام کے لئے تنخواہ لینا جائز رکھا گیا ہے۔ اگر قرآن شریف پڑھ کر اس کا ثواب بخش دینے کے بدلے میں کچھ لینا جائز ہو تو فبہا اور اگر نا جائز ہے تو امام کے لئے تنخواہ دینا جائز قرار دیا گیا ہے، وہ بھی نا جائز ہونا چاہئے۔ کیونکہ ادھر قرآن شریف پڑھنے کا عوض ہے اور ادھر نماز پڑھانے کا عوض ہے۔

بینوا توجروا

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

امامت ، اذان ۔ تعلیم القرآن پر تنخواہ لینا متاخرین نے ضرورۃ جائز قرار دیا۔

چنانچہ فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے:

وبعض مشائخنا رحمهم الله تعالی استحسنوا الاستیجار علی تعلیم القرآن الیوم لظهور التوانی فی الامور الدینیة ففی الامتناع تضییع حفظ القرآن وعلیه الفتوی وزادمتن المجمع الامامة وبعضهم الاذان والاقامة والوعظ ۔

ہمارے بعض مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس وقت تعلیم قرآن پر اجرت لینا اچھا سمجھا کہ امور دینیہ میں سستی ظاہر ہے۔ تو منع کرنے میں حفظ قرآن کا ضائع کرنا ہے، اسی پر فتوی ہے۔ اور متن مجمع میں امامت کو اور بعض فقہا نے اذان اور تکبیر اور وعظ کو زائد کیا۔

اور میت کے ایصال ثواب کی غرض سے تلاوت پر اجرت و تنخواہ لینا کوئی ضروری چیز نہیں۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے:

وقد ذکرنا مسئلة تعلیم القران علی الاستحسان یعنی للضرورة ۔ولا ضرورة فی الاستیجار علی القرأة علی القبر ۔ (ردالمحتار ص ۳۶ ج ۵)

ہم نے مسئلہ تعلیم قرآن بضرورت استحسان کا ذکر کیا اور قبر پر پڑھنے کی اجرت لینے میں کوئی ضرورت نہیں۔

تو میت کے ایصال ثواب کی غرض سے تلاوت کا امامت وغیرہ پر قیاس مع الفارق ہے کہ یہاں ضرورت داعی الی الجواز اور وہاں ضرورت ہی نہیں پائی جاتی تو اس کو امامت وغیرہ قیاس نہیں کر سکتے ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ

(۳۲۳_۳۲۴_۳۲۵_۳۲۶_۳۲۷_۳۲۸_۳۲۹_

۳۳۰_۳۳۱_۳۳۲_۳۳۳_۳۳۴_۳۳۵_۳۳۶_۳۳۷)

کیا فرماتے ہیں نائبان رسول کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم ومفتیان مذہب احناف مسائل مندرجہ ذیل کے بارے میں کہ

(۱) لفظ امام شہر بغیر کسی تاویل وتوجیہ کے اپنی ترکیبی حیثیت سے صحیح ہے یا غلط؟۔

(۲) لفظ امام شہر اصطلاحات شرعیہ میں منقول ہے یا نامشروع وبے اصل ہے؟ اگر منقول ہے تو اس کی تعریف شبینہ ظاہرہ میں کیا ہے اور اس کو شرعا کن احکام کے اجراء کا اختیار ہے؟۔

(۳) کسی ایسے مقام کی جامع مسجد کا امام جمعہ وعیدین یا امام مسجد جو مقام شہر یا پرگنہ ہونے کے ساتھ شرعا بھی قول مفتی بہ پر مصر ہو، ایسے امام کو امام شہر وعیدین یا امام پنجگانہ جو مقام یا شہر یا پرگنہ ہونے کے ساتھ ساتھ شرعا بھی قول مفتی بہ مصرع ہو ایسے امام کو امام شہر یا قاضی شہر کہنا شرعا جائز ہے یا ناجائز؟۔

(۴) امام مذکور اپنے آپ کو شہر یا قاضی شہر کہے اور لکھے یا لوگوں سے امام شہر وقاضی کہلوائے یا شہر پرگنہ کے امام مسلمان ایسے امام کو امام شہر یا قاضی شہر کہیں اور لکھیں تو یہ کہنا یا کہلوانا اور لکھنا شریعت طاہرہ میں درست ہے یا نہیں؟۔

(۵) امام مذکور جو اپنے آپ کو امیر المومنین وخلیفۃ المسلمین جانے اور اعتقاد کرے یا اپنے آپ کو ایسا قاضی متصور کرے جو سلطان اسلام کا مقرر کردہ قاضی ہو اور عوام کو بھی ایسا ہی امیر المومنین وقاضی باور کرائے یا عام مسلمان ایسے امام کو امیر المومنین اور سلطان اسلام کا مقرر کردہ قاضی اعتقاداً جانیں امام مذکور وعام مسلمان کا ایسا اعتقاد صحیح ودرست ہے یا نہیں؟ اور ایسے امام وعوام مومنین کیلئے شرعا کیا حکم ہے؟

(۶) امام مذکور کے اختیارات واحکام وہی ہوں گے جو امیر المومنین وقاضی شرع کے ہیں یا وہ بالکل بے اختیار ہوگا اور شرعا اس کے احکام نافذ نہ ہوں گے؟۔

(۷) امام مذکور یا کسی عالم ومفتی کا کسی حکم شرع کے بارے میں عوام مومنین سے یہ کہنا یا اعلان کر

نا کہ میرے حکم سے یہ کام کرو اور اس کا ثواب وعذاب میرے گردن پر ہوگا جائز وروا ہے یا ناجائز وجہل و نادانی ہے؟۔

(۸) اگر امام مذکور یا کسی عالم ومفتی کے ایسے کہنے یا اعلان کرنے پر عام مسلمان اس پر عمل کریں اور فی الحقیقت امام مذکور یا مفتی وعالم کا ایسا حکم گناہ خلاف حکم شریعت طاہرہ ہو تو کیا عام مسلمان شرعا مجرم و گنہگار نہ ہوں گے اور سب کے گناہوں کا عذاب وبال صرف امام مذکور یا مفتی وعالم پر ہوگا یا عام مسلمان بھی اس کے خلاف شرع حکم پر عمل کرنے کے باعث شرعا مجرم وگنہگار و مستحق عذاب عقبی ہوں گے؟۔

(۹) کسی ایسے مقام کی بڑی مسجد کے امام کو جو شرعا مصر نہ ہو شرعا سلطان اسلام کا مقرر کردہ قاضی مانا جائے یا نہیں؟۔

(۱۰) کتاب القاضی الی القاضی کے شرعا مستند ومعتبر ہونے کے لئے کتنی شرائط ضروری ہیں؟۔

(۱۱) کیا کسی شہر کی جامع مسجد کا امام یا غیر مصر کی بڑی مسجد کا امام جسے نہ باشندگان شہر نے نہ سلطان اسلام نے قاضی مقرر کیا ہو لیکن وہ امام خود کو شرعا قاضی متصور کرے اور کتاب القاضی الی القاضی کی طرح باہم احکام شرعیہ نافذ کر لینے کے لئے خط بھیجے تو شرعاً ایسا امام قاضی ہوگا یا نہیں اور اس کے خط کا اعتبار ان احکام شرعیہ میں ہوگا یا نہیں جن میں شہادت ضروری ہے؟۔

(۱۲) اور اگر عام مسلمان ایسے امام کو شرعا قاضی جانیں اور اس کے مکتوبات مذکورہ کو احکام شرعیہ مذکورہ میں معتبر جانیں تو ایسے عوام خطا کار ہوں گے یا نہیں؟۔

(۱۳) کسی شہر کی جامع مسجد کے امام یا غیر مصر کی بڑی مسجد کے امام کو شرعا کیا کیا اختیارات حاصل ہیں اور ان کے کیا کیا احکام نافذ کردہ واجب العمل ہوں گے؟۔

(۱۴) اگر کسی شہر کی جامع مسجد کے امام یا غیر مصر کی بڑی مسجد کے امام اپنے آپ کو قاضی متصور کر کے کتاب القاضی الی القاضی کی بنا پر رویت ہلال عیدین کا حکم واعلان اس طرح کریں کہ سب لوگ آج روزہ افطار کر لیں ۔یا آج قربانی کر لیں ۔لیکن نماز عید الفطر یا نماز عید الاضحی کل ہوگی جبکہ تین چار گھنٹہ کے قریب نماز عیدین کا وقت باقی ہو اور کوئی عذر شرعی بھی تاخیر نماز عیدین کا نہ ہو تو اگلے روز نماز عیدین بکراہت ادا ہوگی یا بغیر کراہت اور کسی عذر شرعی کی صورت میں اس اعلان کی بنا پر اگلے روز کی نماز مکروہ ہوگی یا غیر مکروہ؟۔

(۱۵) شہر کی جامع مسجد یا عیدگاہ سے پہلے شہر کی کسی دوسری ایک مسجد میں یا متعدد مساجد میں

جمعہ یا عیدین ادا کیجائے تو وہ نماز جمعہ یا عیدین صحیح و درست ہوگی یا نہیں؟ جبکہ اس دوسری مسجد یا متعدد مساجد میں زمانہ دراز سے نماز جمعہ و نماز عیدین ہو رہی ہوں۔ ایک شہر میں جامع مسجد یا عیدگاہ کے علاوہ دوسری متعدد مساجد میں نماز جمعہ و عیدین ادا کی جائے تو قول راجح و مفتی بہ پر وہ نماز جمعہ اور نماعیدین جائز ہوگی یا ناجائز؟ امور مستفسرہ بالا کے جوابات مدلل بحوالہ کتب فقہیہ معتبرہ لکھے جائیں۔

المستفتی حاجی محمد ظہور صاحب کارخانہ چمچہ لال مسجد مراد آباد

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

(۱) لفظ امام شہر ترکیبی حیثیت سے صحیح ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) لفظ امام شہر فارسی ترکیب ہے جس کا عربی میں ترجمہ امام المصر ہے اور لفظ امام المصر اصطلاحات شرعیہ میں منقول ہے اور اس کی تعریف کتب فقہ میں اس طرح موجود ہے۔

مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں ہے:

اما م المصر و هو سلطا نه ۔ (از مجمع الا نهر مصر ج ۱ / ص ۱۸۲)

یعنی امام مصر سلطان شہر اور امیر البلدہ ہے۔ اور شرعا اس امام کو ان احکام کے اجرا کے اختیارات ہیں۔

علامہ شامی باب الامامۃ میں عقائد نسفیہ سے ناقل ہیں:

والمسلمو ن لا بد لهم من اما م يقو ل تنفيذ احكا مهم و اقا مة حد و دهم و سدثغو رهم و تجهير جيو شهم و اخذ صد قا تهم و قهر المتغلبة و المتلصصة و قطا ع الطر يق و اقامة الجمع والا عبا د و قبو ل الشها دا ت القا ئمة على الحقو ق و تز ويج الصغا ر و الصغا ئز الذ ين لا او ليا ء لهم و قسمة الغنائم ۔ اھ

(رد المحتا ر مصر ى ج ۱ ص ۳۸۴)

اور مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ ایک امام ہو جو ان کے لئے تنفیذ احکام اور اجراء حدود اور شہر کی رخنوں اور دوسرے خطروں کے انتظام اور لشکروں کی تیاری اور صدقہ کے قبول کرنے اور متغلبوں اور چوروں ڈاکوؤں پر غلبہ حاصل کرنے اور جمعہ و عیدین کے قائم کرنے اور حقوق پر شہادتوں کے سننے اور قبول کرنے اور نابالغ بچوں کے نکاح کرنے پر جن کے ولی موجود نہ ہوں اور مال غنیمت کی تقسیم کرنے پر قادر ہو۔

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ جس کو ایسے اختیارات حاصل ہوں وہ شرعا امام شہر ہے اور جسے ایسے اختیارات حاصل نہ ہوں وہ ہرگز ہرگز امام شہر نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) جامع مسجد کے امام کو کتب شرع میں امام جمعہ اور امام مسجد فقہاء کرام لکھتے ہیں:

درمختار میں ہے: اما م المسجد الجا مع او لی من اما م الحی ای مسجد محلته۔

(ردالمحتار ج ا ص ۶۱۶)

جامع مسجد کا امام محلّہ کی مسجد کے امام سے بہتر ہے جبکہ اس کا اہل ہو۔

علامہ حلبی کبیری میں صلوۃ الجنازہ کے ذکر میں فرماتے ہیں:

الا و لی بالاما مة فیها السلطا ن ثم القا ضی ثم اما م الجمعة ثم اما م الحی ثم الو لی۔ (از کبیری مطبوعہ فخر المطابع لکھنو ص ۵۴۱)

نماز جنازہ کی امامت کیلئے سب سے بہتر سلطان ہے پھر قاضی پھر امام جمعہ پھر امام محلّہ پھر ولی میت۔ مجمع الانہر میں فتح القدیر سے ناقل ہیں:

الخلیفة او لی ان حضر تم اما ما لمصر و هو سلطا نه ثم القا ضی صا حب الشر ط ثم خلیفة القاضی ثم اما م الحی (فیه ایضا) اما م المسجد الجا مع او لی من اما م الحی۔

(مجمع الانہر ص ۱۸۲)

امامت نماز جنازہ کیلئے سب سے افضل اور حقدار خلیفۃ المسلمین ہے اگر وہ موجود نہ پھر امام شہر یعنی امیر بلدہ پھر قاضی شہر پھر کوتوال شہر پھر خلیفۂ والی پھر خلیفہ قاضی پھر امام محلّہ اور امام جامع مسجد امام محلّہ سے بہتر ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ فقہائے کرام جامع مسجد کے امام کو امام المسلمین الجامع اور امام الجمعہ کے لقب سے ذکر کرتے ہیں۔ اور امیر شہر کو امام المصر یعنی امام شہر کے لقب سے ملقب کرتے۔ امام جامع مسجد منجملہ والیوں کے کوئی والی بھی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ نماز جنازہ کی امامت کے حق دار ہونے میں یہ خلیفہ قاضی کے بعد ہے اور خلیفہ قاضی خلیفہ والی کے بعد ہے اور خلیفہ والی کوتوال شہر کے بعد ہے اور کوتوال قاضی کے بعد ہے اور قاضی امیر بلدہ یعنی امام شہر کے بعد ہے اور امام شہر خلیفۃ المسلمین کے بعد ہے تو یہ امام جامع مسجد اس خلیفۂ قاضی کے برابر نہ ہو سکا جو قاضی سے دو درجہ نیچے ہے۔ پھر یہ قاضی شہر کی برابر کس طرح ہو سکتا ہے پھر جب یہ قاضی کے درجہ تک نہ پہنچ سکا تو اس کو امیر البلدہ یعنی امام شہر کس

معنی کی بنا پر کہا جا سکتا ہے۔ اور امام عیدین امام جمعہ ہی کی حیثیت رکھتا ہے اور امام پنجگانہ کا امام جامع مسجد سے بھی کم رتبہ ہے۔ لہٰذا بغیر ثبوت تامہ اور ولایت عامہ کے امام جامع مسجد کو قاضی شہر اور اس سے بڑھ کر امام شہر کہنا کتب فقہ کی تصریحات کے خلاف ہے اور فقہائے کرام کی کھلی ہوئی مخالفت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۴) جواب نمبر دو سے یہ ثابت ہو گیا کہ امام جامع مسجد اپنی شوکت و ولایت عامہ نہ ہونے کے باعث نہ شرعاً قاضی شہر ہے اور نہ امام شہر تو اس کو لوگوں کا قاضی یا امام شہر کہنا یا لکھنا شریعت طاہرہ میں کس طرح درست ہو سکتا ہے اور اس کا خود اپنے آپ کو قاضی شہر یا امام شہر کہنا، یا لکھنا اور زیادہ قبیح و مذموم اور اس کا دوسروں سے یہ کہلوانا اور زیادہ بدترین شنیع فعل ہے۔

حدیث شریف میں اس کی سخت ممانعت وارد ہے۔ ابن ماجہ شریف میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روئی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

من ادعی ما لیس له فلیس منا و لیتبؤ مقعده من النار۔

(جامع صغیر للسیوطی ج ۲ ر ص)

جو شخص ایسی چیز کا دعویٰ کرے جو اس میں نہ ہو تو وہ ہم میں سے نہیں اور وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے۔

(۵) جو امام جامع مسجد اپنے اندر شوکت تامہ اور ولایت عامہ حاصل نہ ہونے اور تنفیذ احکام واجراء حدود پر قادر نہ ہونے کے باوجود بھی اپنے آپ کو امیر المؤمنین وخلیفۃ المسلمین یا قاضی جانے یا دوسروں کو یہ باور کرائے یا عوام اس کو ایسا اعتقاد کریں تو ایسا امام وعوام کالانعام انتہائی جاہل و نادان ہے ورنہ احکام شرع کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۶) جب یہ امام جامع مسجد نہ امیر المؤمنین نہ قاضی نہ اور کسی طرح کا حاکم و والی تو اس بے اختیار کے کیا اختیارات ہو سکتے ہیں اور اس کے تمام احکام کس طرح نافذ ہو سکتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۷) امام مذکور یا کسی عالم کا اپنی ناقص تحقیق اور غلط حکم کی بنا پر ایسا اعلان کرانا نہایت جرأت و دلیری اور انتہائی جہالت و نادانی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۸) امام جامع مسجد یا غیر مفتی شہر عالم کا ایسا اعلان و حکم اگر مخالف شرع ہے تو اس پر مسلمانوں کو عمل کرنا گناہ و ممنوع ہے۔

بخاری و مسلم اور ابوداؤد، نسائی وغیرہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا:

لاطاعة لاحد فی معصية الله انما لطاعة فی المعروف۔

(جامع صغیر مصری ج ۲ / ص ۱۹۳)

اللہ کی معصیت میں کسی کی اطاعت نہیں کہ اطاعت تو نیکی ہی میں ہوتی ہے۔

بلکہ ان کے گناہوں کا وبال اس امام مذکور وغیرہ پر بھی ضرور ہوگا۔

حدیث شریف میں ہے جس کو ابوداؤد نے اور حاکم نے مستدرک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ حضور نے فرمایا: من افتی بغیر علم کان اثمه علی من افتاه۔

(جامع صغیر ص ۱۴۸)

جس نے بلا علم کے فتویٰ دیا تو اس کا گناہ اس فتویٰ دینے والے پر ہوگا۔

(۹) جب امام مذکور کی حیات میں نہ کبھی یہاں سلطان اسلام ہوا نہ اب ہے تو اسے سلطان اسلام کا مقرر کردہ قاضی کوئی اسے سمجھ والا تو مان نہیں سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۱۰) قیاس کا اقتضا تو یہ تھا کہ کتاب القاضی الی القاضی مطلقا شریعت میں معتبر نہ ہوتی کہ خط مشابہ خط کے ہوا کرتا ہے اور عقلا خط قاضی خود بیان قاضی سے زیادہ قوی نہیں تو بیان قاضی قابل عمل ہوتا اور خط قاضی نا قابل عمل ہوتا۔ مگر اجماع نے کتاب قاضی کو قابل عمل قرار دیا اور خود بیان قاضی کو نا قابل عمل ٹھہرایا۔

چنانچہ مجمع الانہر میں ہے: والقیاس یابی جواز العمل بکتاب القاضی لان القاضی الکاتب لو حضر بنفسه مجلس المکتوب الیه و عبر بلسانه عما فی الکتاب لم یعمل به القاضی فکیف بالکتاب و فیه شبه التزویر اذ الخط یشبه الخط والخاتم یشبه الخاتم الا انه یجوز استحسانا لحاجة الناس الیه لما روی ان علیا رضی الله تعالیٰ عنه جوزه لذلک و علیه اجمع الفقهاء۔ (مجمع الانہر ج ۲ / ص ۱۶۵)

قیاس کتاب القاضی الی القاضی پر عمل کرنے کے جواز کا انکار کرتا ہے کیونکہ خود قاضی کاتب اگر مجلس قاضی مکتوب الیہ میں حاضر ہو جائے اور اپنی زبان سے مضمون کتاب کو بیان کرے تو اس کو قاضی مکتوب الیہ قابل عمل نہ ٹھہرائے تو کیسے اس کتاب کو قابل عمل قرار دیں جس میں گڑھ دینے کا شبہ ہو کہ خط خط کا مشابہ ہو جاتا ہے اور مہر مہر کے مشابہ ہو جاتی ہے۔ مگر لوگوں کی حاجت کیلئے کتاب القاضی کو استحسانا

جائز قرار دیا کہ حضرت مولا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس کتاب القاضی کو جائز ٹھہرایا اور اسی کے اوپر فقہاء کرام نے اجماع کیا۔

اس عبارت سے بمقابلہ بیان قاضی کے خط قاضی کا باجماع حجت ہونا ثابت ہوا۔ لیکن خط قاضی کا حجت ہونا اس کے تمام شرائط کے جمع ہو جانے پر موقوف ہے۔

عالمگیری میں ہے: یجب ان یعلم ان کتاب القاضی الی القاضی صار حجة شرعا فی المعاملات بخلاف القیاس لان الکتاب قد یفتعل و یزور و الخط یشبه الخط و الخاتم یشبه الخاتم ولکن جعلناه حجة بالاجماع ولکن انما یقبله القاضی المکتوب الیه عند وجود شرائطه۔ (فتاویٰ عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۱۷۲)

یہ جاننا واجب ہے کہ قاضی کا خط دوسرے قاضی کی طرف معاملات میں خلاف قیاس حجت شرعی ہے کہ خط بنایا اور گڑھا جا سکتا ہے اور خط خط کے مشابہ ہو جاتا ہے لیکن ہم نے اس کو اجماع سے حجت قرار دیا مگر اس کو بھی قاضی مکتوب الیہ اس کے تمام شرائط کے پائے جانے پر قبول کرے۔

لہٰذا شرائط کتاب القاضی الی القاضی سے اگر ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو پھر کتاب القاضی نہ حجت شرعی نہ اس پر عمل جائز۔ تو اب شرائط کتاب القاضی کا ذکر ہدایہ، درمختار، ردالمحتار، مجمع الانہر۔ فتاویٰ عالمگیری وغیرہا سے نقل کیا جاتا ہے اور ان کی عربی عبارات کو بخوف طوالت نقل نہیں کیا۔ لہٰذا وہ شرائط کتاب القاضی یہ ہیں۔

(۱) کتاب القاضی جس شہر سے دوسرے کی طرف جائے تو ان پر دو شہروں کے درمیان مقدار سفر کی مسافت کا ہونا۔ اور بقول بعض کم از کم اتنی مسافت کا ہونا کہ جانے والا اسی دن میں مکان واپس نہ آسکے۔

(۲) قاضی کاتب کا اگر نام مشہور ہو تو اس کا نام و قاضی بلد فلاں ورنہ اس کے باپ، دادا کے اسی کتاب ہی میں مکتوب ہونا۔

(۳) قاضی کاتب کے روبرو جس واقعہ پر شہادت گزرے اس واقعہ کا تفصیلی ذکر کتاب میں ہونا

(۴) شاہدین واقعہ کے اسماء مع نام پدر و جد کے اس کتاب میں ہونا۔

(۵) قاضی کاتب کے روبرو جس واقعہ پر شہادت گزرے اس واقعہ کا تفصیلی ذکر کتاب میں ہونا۔

(۶) قاضی کا ان شاہدین واقعہ کے عدالت کا کتاب میں لکھنا اور اگر قاضی کو ان کی عدالت کا خود

علم نہ ہو تو یہ بھی لکھدینا کہ میں نے ان کی عدالت پر فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں مزکیوں سے دریافت کر کے اعتماد کیا۔

(۷) قاضی کا شاہدین کتاب کے اسماء مع نام پدر وجد کے اور مع ان کے عدالت کے کتاب میں لکھدینا۔

(۸۔) اس کتاب پر دو عادلوں کو شاہد بنانا۔

(۹) ان شاہدین کتاب کے اسماء مع نام پدر وجد کے لکھدینا اور مع عدالت کے کتاب میں لکھدینا۔

(۱۰) کتاب میں تاریخ ویوم اور سنہ کا لکھنا۔

(۱۱) قاضی کاتب کا آخر کتاب میں یہ لکھنا کہ میں فلاں بن فلاں قاضی بلدہ ہوں، یہ میری کتاب ہے، اس میں میرا حکم ہے، میری مہر اس پر چسپاں ہے، یہ کتاب اس قدر کاغذ کی اتنی سطروں میں ہے، میں نے فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں پر اس کو لکھ کر پڑھا۔ اور اس کے مضمون وحکم پر مطلع کیا۔ اور ان کے سامنے اس پر مہر لگائی اور انہیں اس پر شاہد بنایا۔ میں نے یہ آخری سطریں اپنے حکم سے فلاں تاریخ میں لکھیں۔

(۱۲) قاضی کاتب کا شاہدین کتاب پر اس کتاب کو پڑھنا۔

(۱۳) ان شاہدین کتاب کے سامنے کتاب کو طے کر کے سربمہر کرنا۔

(۱۴) قاضی کاتب کا مجلس قضا میں ان شاہدوں کو یہ کتاب سونپنا۔

(۱۵) شاہدین کتاب کا مضمون کتاب کو محفوظ کرنا بلکہ اس کی نقل کو اپنے پاس رکھنا۔

(۱۶) ان تمام شاہدوں کا مسلمان صحیح العقیدہ ہونا عادل ہونا۔

(۱۷) خاص مکتوب الیہ کا اس کتاب کے کندہ ہونے پر اور مہر کے صحیح باقی رہنے کو بغور پہلے دیکھ لینا کہ اس کو کھلا ہوا نہ ہونا اور مہر کو ٹوٹا ہوا پانے کی حالت میں قبول نہ کرنا۔

(۱۸) خاص مکتوب الیہ پھر شاہدین کتاب کی شہادت لے اور وہ یہ کہیں کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ فلاں بن فلاں قاضی بلدہ فلاں کی کتاب ہے جو آپ کے پاس بھیجی ہے اس نے اسے ہمارے سامنے پڑھا اس کا مضمون ہے۔ اس پر ہماری موجودگی میں مہر لگائی اور ہمیں اس پر گواہ بنایا اور ہمیں یہ مجلس میں سونپی۔ یہ اسی خاص کی مہر ہے۔

(۱۹) قاضی مکتوب الیہ اس شہادت کے گزر جانے کے بعد اس کتاب کو کھول کر دیکھے۔

(۲۰) پھر مضمون کتاب کا اگر اس شہادت کے موافق ہو ورنہ بصورت مخالفت وہ کتاب قابل رد ہے۔

(۲۱) قاضی کاتب اس قاضی کے کتاب پڑھنے تک زندہ رہے نہ وہ معزول ہو نہ اسے جنون و فسق اور ردلاحق ہو۔

(۲۲) قاضی مکتوب الیہ بھی وصول کتاب تک زندہ رہے نہ وہ معزول ہو نہ وہ خارج از بلد ہو۔

(۲۳) اگر قاضی خارجی کی کتاب آئے اور قاضی مکتوب الیہ ہی جانتا ہے کہ اس کے شاہد خارجی ہیں یا یہ علم نہ ہو کہ شاہد خارجی ہیں یا اہل عدل تو یہ قاضی مکتوب الیہ اس کتاب کو قبول نہ کرے۔

(۲۴) ظاہر الروایت میں ہے کہ قاضی شہر قاضی شہر یا قاضی قریہ کو کتاب لکھ سکتے ہیں اور قاضی قریہ قاضی شہر کو نہ لکھے۔

(۲۵) قاضی مکتوب الیہ کا اس کتاب قاضی پر عمل کرنا ضروری نہیں اس کو اس پر عمل کرنے اور نہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

یہ ۲۵ شرائط کتاب القاضی ہیں جو کتاب القاضی الی القاضی کے معتبر و مستند ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۱۱) جب ایک امام جمعہ کو نہ سلطان اسلام نے قاضی مقرر کیا نہ اہل شہر کے علماء اور اکابر نے قاضی تجویز کیا تو وہ شرعاً قاضی ہی نہ ہوا تو اس کا خط نہ کتاب القاضی الی القاضی نہ حجت شرعی۔ درمختار میں ہے: القاضی یکتب الی القاضی وھو نقل الشھادۃ حقیقۃ ولا یقبل من حکم بل من قاضی مولی من قبل الامام ملخصاً۔

قاضی دوسرے قاضی کی طرف خط لکھے کہ یہ حقیقۃ شہادت کا نقل کرنا ہے اور حکم کا خط قبول نہ کیا جائے گا بلکہ اس قاضی کا جو امام کی طرف سے مقرر کیا ہوا ہو۔

(۱۲) عوام کا ایسے امام جمعہ کو قاضی شرع ماننا یا اس کے خط کو حجت شرعی جاننا خلاف شرع ہے تو ان کے خطا کار و گنہگار ہونے میں کوئی شک نہیں،۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۱۳) شریعت نے امام جامع مسجد کو ولایت عامہ کے اختیارات نہیں دیئے تو نہ اسے احکام نافذ کرنے کا حق حاصل نہ اس کے ہر حکم کا ماننا اس پر عمل کرنا واجب۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۱۴) جو امام جامع مسجد شرعا قاضی شرع نہ ہو تو شرعا نہ اسے کتاب القاضی الی القاضی لکھنے کا حق

حاصل، نہ مکتوب الیہ کیلئے اس کا خط قبول کے قابل ۔ نہ ایسا خط ثبوت رویت ہلال کے لئے طریق موجب، نہ مسلمانوں کو اس پر عمل کرنا واجب۔ تو اس پر اس کا اعلان وحکم غلط و باطل ہے۔ لہذا اس پر نہ روزہ کے افطار کی اباحت، نہ قربانی کی اجازت۔ پھر جنہوں نے اس اعلان پر روزہ افطار کرلیا یا قربانی کرلی ان پر ایک روزہ کی قضا لازم اور قربانی واجب۔ مسلمانو!۔ جب اس امام کی مسائل شرع اور احکام دین سے ناواقفی وجہالت کا یہ حال کہ یہ نماز عیدین کا تین چار گھنٹہ وقت باقی رہنے کے باوجود بھی بلا کسی عذر شرعی کے دوسرے دن نماز عیدین کے ادا کرنے کا اعلان کراتا ہے تو اس میں نہ قاضی شہر ہونے کی اہلیت نہ مفتی شہر بننے کی صلاحت۔ پھر یہ بے خبر نادان انسان شرائط کتاب القاضی الی القاضی سے کس طرح واقف ہوسکتا ہے۔

بالجملہ جب اس امام کے نزدیک رویت ہلال کا ثبوت زوال سے تین چار گھنٹے قبل پہنچ چکا تو اتنے وقت میں اعلان ہوکر لوگوں کا اجتماع بھی ہوجاتا اور نماز عیدین بھی اسی دن میں ہوسکتی تھی۔ لیکن اس امام نے اس دن میں بلا کسی عذر شرعی کے نماز عیدین نہیں پڑھی۔ تو اس نے سب لوگوں کی نماز عید قضا کرادی کہ بلا عذر عید الفطر تو دوسرے دن جائز نہیں اور نماز عید الاضحیٰ مکروہ ہے۔

درمختار میں ہے: یجوز تا خیرھا الی آخر ثالث ایام النحر بلا عذر مع الکراھۃ وبہ ای بالعذر بدونھا فالعذر ھنا لنفی الکراھۃ و فی الفطر للصحۃ۔ (ردالمحتار۔ ج ۱۔ ص ۵۸۶)

اور نماز عید الاضحیٰ کی تاخیر بغیر عذر کے قربانی کے اخیر تیسرے دن تک جائز مع الکراہت ہے اور بعذر جائز بلا کراہت ہے تو عذر اس میں تو کراہت کی نفی کے لئے ہے۔ اور نماز عید الفطر میں صحت کے لئے ہے۔

مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں ہے: یسئی بالتأخیر من غیر عذر فیہ تأخیر الواجب بلا ضرورۃ عند القائل بالوجوب فالعذر فی الاضحیٰ لنفی الکراھۃ و فی الفطر للجواز۔

(ج ۱۔ ص ۱۷۵)

بغیر عذر کے نماز عید الاضحیٰ کی تاخیر اساءت ہے کہ اس میں بلا ضرورت قائل وجوب کے نزدیک تاخیر واجب ہے تو عذر نماز عید الاضحیٰ میں معنی کراہت کے لئے ہے اور نماز عید الفطر میں جواز کے لئے ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: لو اخروھا الی ثلثۃ ایام من غیر عذر جاز الصلوۃ وقد اساؤ و

فی الفطر الجواز حتی لو اخروھا الی الغد من غیر عذر یجوز۔ (ج ا۔ص ۷۸)

اگر بغیر عذر کے نماز عید الاضحیٰ کو تین دن تک مؤخر کردیا تو نماز جائز مع الکراہۃ ادا ہوئی۔ اور عذر نماز فطر میں جواز کے لئے یہاں تک کہ اگر اس کو بغیر عذر کے دوسرے دن تک مؤخر کیا تو یہ جائز نہیں۔

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ بلا عذر شرعی دوسرے دن عید الاضحیٰ کی نماز پڑھنا تو مکروہ ہے اور عید الفطر کی نماز صحیح اور جائز نہیں۔

لہذا اس امام نے جب بلا عذر شرعی دوسرے دن نماز عید الفطر پڑھائی تو وہ نماز صحیح و جائز نہیں ہوئی تو لوگوں کی یہ نماز ادا نہ ہونے کا گناہ و وبال اس امام کی گردن پر رہا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۱۵) ایک شہر میں جامع مسجد یا عیدگاہ کے علاوہ کسی اور ایک مسجد یا متعدد مساجد میں نماز جمعہ و عیدین بلاشبہ جائز ہے۔

مجمع الانہر شرح الملتقی الابحر میں ہے: تجوز صلاۃ العید فی مصر فی موضعین وعند محمد فی ثلاثة مواضع کما فی الفتح لکن قد کان جواز الجمعة فی المصر الکبیر فی مواضع کثیرة لدفع الحرج لان فی اتحا دالموضع حرجا بینا لا ستد عا ئه تطویل المسافة علی الاکثر کما بین آنفا وھذه العلة تجری فی العید علی انه صرح فی بعض المعتبرات جوازه اتفاقا وبھذا عمل الناس الیوم۔ (مجمع الانہر۔ج ا۔ص ۱۷۳)

نماز عید شہر میں دو مقام میں اور امام محمد کے نزدیک تین جگہوں میں جائز ہے جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔ لیکن بڑے شہر میں دفع حرج کیلئے اکثر جگہوں پر بھی جائز ہے۔ اس لئے کہ ایک جگہ پر خاص کرنے سے کھلا ہوا حرج لازم آتا ہے کہ اکثر لوگوں کو طویل مسافت طے کرنا پڑے گی۔ اور یہی علت عید کے لئے بھی جاری ہے، اور بعض معتبر کتابوں میں جواز عید کی بالاتفاق تصریح کی اور اس وقت لوگوں کا عمل اسی پر ہے۔

درالمنتقی شرح ملتقی میں ہے: تصح فی مصر فی مواضع کثیرة ھو الصحیح و علیه الفتوی۔ (ج ا۔ص ۱۶۷)

ایک شہر میں کثیر مقاموں پر جمعہ کی نماز صحیح ہے اور یہی صحیح مذہب ہے اور اسی پر فتوی ہے۔

مراقی الفلاح وطحطاوی میں ہے:

وتصح اقامة الجمعة فی مواضع کثیرة بالمصر وفنائه وھو قول ابی حنیفة و محمد

فی الاصح (فی الطحطاوی قال السرخسی و بہ نأخذ و علیہ الفتوی۔ (ص ۱۹۲)

ایک شہر میں بہت سی جگہوں پر جمعہ کا قائم کرنا صحیح ہے اور اسی طرح فناء مصر میں اور یہی امام اعظم اور امام محمد کا صحیح قول ہے۔ اور امام سرخسی نے فرمایا کہ ہم اسی قول کو اختیار کرتے ہیں اور اسی پر فتوی ہے۔

و تؤدی الجمعة فی مصر و احد فی مواضع کثیرة وھو قول ابی حنیفة و محمد وھو الصحیح و ذکرہ امام السرخسی انه الصحیح من مذھب ابی حنیفة و به ناخذ ھکذا فی البحرالرائق۔ (عالمگیری ۔ج ا۔ص ۷۵)

جمعہ ایک شہر میں چند مقامات پر ادا کیا جائے اور یہی امام اعظم و امام محمد کا صحیح قول ہے اور امام سرخسی نے ذکر کیا کہ مذہب امام اعظم کا صحیح قول یہی ہے اور ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں۔ اسی طرح بحر الرائق میں ہے:

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ شہر میں جامع مسجد یا عید گاہ کے علاوہ کسی ایک مسجد میں یا متعدد مساجد میں نماز جمعہ وعیدین کا بقول راجح و مفتی بہ پڑھنا جائز وصحیح ہے اور جب شہر میں تعدد جمعہ وعیدین کا جواز ثابت ہو گیا تو پھر قول راجح کی بنا پر جامع مسجد یا عید گاہ سے پہلے یا بعد کا فرق کوئی چیز نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۳۸-۳۳۹-۳۴۰-۳۴۱-۳۴۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

اگر کسی امام کی وجہ سے محلہ کے نمازیوں میں اختلاف ہو جائے تو ایسی حالت میں متولی کو اس امام کا رکھنا یا اس امام کا رہنا ضروری ہے۔ متولی کو بغیر اطلاع یا نمازیوں کے مرضی کے خلاف امام کا رکھنا درست ہے؟ امام کی وجہ سے مقتدیوں میں اختلاف ہونا ذیل میں درج ہے۔

(۱) نماز میں امام کو بوجہ عادت یا بغیر کسی تکلیف کے اپنے داہنے پیر کے انگوٹھے کو حرکت دینا۔

(۲) نماز فرض کے علاوہ امام کا بغیر کسی تکلیف کے سنت یا نفل یا واجب کا بیٹھ کر ادا کرنا۔

(۳) نماز میں امام کا رکوع یا سجدہ میں جاتے ہوئے اپنے پائجامہ کو بار بار حرکت دینا اور سجدہ

میں اپنی دونوں کہنیوں یا ایک کہنی کا زمین پر ٹیک دینا ایسی حالت میں نماز پوری ہوتی ہے یا نہیں؟

(۴) امام نماز کا پانچوں وقت کا پورا پابند نہ ہونا۔

(۵) امام کا اخلاق اچھا نہ ہونا۔ اور صاف نہ رہنا اور نہ دوسروں کو ہدایت کرنا وغیرہ۔

برائے کرم اس کا تحریری طور پر جواب فرمادیں تا کہ محلّہ کا اختلاف دور ہو جائے۔

المستفتی مستری محمد رمضان، جناب مولوی محمد اشفاق صاحب محمد حمید جودھپور

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

امام مذکور امور بالا کی عادات ترک کرے۔ خصوصاً یہی امور اختلاف کا باعث ہیں اور بعض ان میں مکروہ بھی ہیں۔ تو شرعاً اسے ان امور سے احتیاط اور پرہیز کرنا ضروری ہے۔ اور متولی کو بھی یہی چاہئے کہ اہل محلّہ کی رضا مندی کو ملحوظ رکھے خصوصاً ان کی ایسی بات جو کسی شرعی غلطی کی بنا پر ہو۔ بالجملہ امام مذکور آداب شرعی کو مد نظر رکھے اور اہل محلّہ کے اختلاف دور کرنے کا ثواب حاصل کرے۔ اور متولی یہ ایثار کرے کہ اہل محلّہ کو راضی کر کے اختلاف بین المسلمین کو دور کرے۔ مولی تعالیٰ ان سب کو اجر و ثواب جزیل عطا فرمائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل
یکم ربیع الآخر ۱۳۷۳ھ

مسئلہ (۳۴۶-۳۴۷-۳۴۸-۳۴۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) ہماری مسجد میں جو امام ہیں وہ ایک پیر سے لنگڑا اور ایک ہاتھ سے لنجا ہے، لیکن چلتا پھرتا ہے۔ اس کی امامت درست ہے یا نادرست؟۔ اور اس کے پیچھے نماز پڑھنی شرع مطہرہ میں جائز ہے یا ناجائز یا مکروہ ہے؟۔ شرع محمدی میں ایسے آدمی کے پیچھے نماز پڑھنی مکروہ لکھی ہے، اور بہار شریعت میں بحوالہ فتاوی عالمگیری کے یہ لکھا ہے کہ ایسے شخص سے دوسرے شخص کو کہ جس کے اندر یہ بات نہیں ہو اس کو امام بنانا اولی ہے۔

(۲) مسجد کا تیل اپنے اور اپنی بیوی کے کھانے میں خرچ کرتا ہے، اگر اس سے منع کیا گیا تو چند

مرتبہ یہ جواب دیا کہ میرے لئے جائز ہے۔ کیونکہ میں محتاج ہوں اور یہ بات اس کی غلط ہے کیونکہ وہ یہاں پر معقول تنخواہ پر امامت کر رہا ہے۔

(۳) صدقہ فطر بھی اس نے لیا ہے، شرح وقایہ میں لکھا ہے کہ جس کے اوپر صدقہ واجب ہے اس کو صدقہ لینا ناجائز ہے۔

(۴) مسجد کی لکڑی بھی اس نے گھر کے خرچ میں جلائیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کل وجوہات مذکورہ پر نظر ڈال کر موافق شریعت مطہرہ کے ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھیں یا اسکو امام بنانا کیسا ہے۔ برائے کرام جواب بحوالہ مستند حدیث شریف کے مرحمت فرمائیں۔ جواب اس کی پشت پر ہی لکھ دینا۔ راقم عبداللطیف قریشی اشرفی موضع نگلہ ڈاک خانہ

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الكريم

امام مذکور میں نہ فقط اتنے جسمانی عیوب بلکہ شرعی نقطہ نظر سے یہ اہم نقص ہیں کہ وہ حلت و حرمت کا امتیاز نہیں کرتا مسجد کے تیل کو اپنے استعمال میں لاتا ہے، مسجد کی لکڑیاں اپنے گھر میں جلاتا ہے۔ صدقہ فطر خود اس پر واجب ہے۔ لیکن وہ باوجود اس کے دوسروں سے وصول کرتا ہے، تو ایسے جری و غیر محتاط اور غیر متشرع شخص کو امام نہ بنانا چاہئے۔ بیہقی و دار قطنی کی حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اجعلوا ائمتكم خيار كم فانهم وفد كم فيمابينكم و بين ربكم۔

(بخاری، ج ۲۔ ص ۴۵۹)

تم اپنے امام بہتر شخصوں کو بناؤ کیونکہ وہ تمہارے رب کے درمیان تمہارے قاصد ہیں۔

حاکم نے مستدرک میں حضرت مرثد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ان سر كم ان يقبل صلوتكم فليؤ مكم خيار كم۔ (ص ۴۵۹)

تمہیں اگر یہ اچھا لگے کہ تمہاری نماز مقبول ہو تو تمہارے بہترین شخص تمہاری امامت کریں۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ امام ہر اعتبار سے بہتر شخص ہو، پابند شرع ہو، نیک و صالح ہو، نظر عوام میں حقیر نہ ہو، دینی احکام میں محتاط ہو، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۵۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین بابت اس مسئلہ کے کہ

پیش امام مسجد جو امامت کی خدمت انجام دے رہا ہے، اور جو کچھ نذرانہ ان کو ملتا ہے وہ اس کو تنخواہ تصور کرلے اور یہ کہے میری تنخواہ کئی ماہ سے نہیں ملی تو اگر امامت کے نذرانہ کو تنخواہ کہہ کر لیتا ہے تو اسکی امامت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

امام اپنی امامت پر تنخواہ طے کر کے ماہ بماہ مطالبہ کرسکتا ہے۔ درمختار میں ہے: و يفتى اليوم بصحتها لتعليم القران والفقه والامامة والاذان۔ (شامی مصری ج۵ ص ۳۶)

فتاویٰ خیریہ میں ہے: و اخذ الاجرة على الامامة لا يقول به المتقدمون اصلا واستحسنه المتأخرون لاشتغال الناس بمعاشهم وقلة من يعمل حسنة لوجه الله تعالىٰ۔

صاحب مجمع الانہر ذخیرہ وروضہ سے ناقل ہیں۔ يجوز الاستيجار علم التعليم و الفقه والامامة۔ (مجمع الانہر مصری ج۲ ص ۳۸۵)

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ امامت کی اجرت اور تنخواہ لینا جائز ہے۔ متاخرین فقہاء کرام نے اس کو مستحسن قرار دیکر فتویٰ جواز دیا۔ تو جب امامت کی تنخواہ لینا جائز ثابت ہوئی تو اب اس امام مذکور کا یہ مطالبہ تنخواہ کوئی فعل ناجائز نہیں ہوا۔ لہٰذا اس بنا پر اس کی امامت جائز ثابت ہوگئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۵۱_۳۵۲_۳۵۳_۳۵۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرع متین حسب ذیل مسائل پر جواب معہ دستخط ومہر کے روانہ فرما،

نہیں۔

(۱) ایک پیش امام ایسا نابینا ہے جسے کوئی چیزیں نظر نہیں آتی ہیں، خفیف نجاست کا اندازہ نہیں کر سکتا مگر حتی الامکان پاکی کا خیال رکھتا ہے اور گاؤں کے اندر سب سے زیادہ مسئلہ مسائل جانتا ہے اور تین پارہ کا حافظ ہے۔ گاؤں کے رئیس کے یہاں سے تنخواہ پانے والا مقررہ پیش امام عرصہ دراز سے چلا آتا ہے اور عقائد اہل سنت والجماعت رکھتا ہے۔ پر ایک لڑکوں کی تعلیم دینے والے دیوبندی مولانا کے یہاں دعوت پر جس میں گاؤں کے اور چند اشخاص بھی گئے تھے تین روز شرکت کرتا ہے اور اس شخص کے پوچھنے پر جس نے جاتے وقت اس سے کہدیا تھا کہ تعلیم اور لڑکوں کی بود باش کے متعلق دریافت کیا کہتا ہے کہ انتظام معقول ہے اور تعلیم اچھی ہوتی ہے وہاں لڑکوں کو بھیجنا ہرج نہیں۔ اس بنا پہ کچھ لوگ اس کی پیش اما مت سے گریز کرتے ہیں حالانکہ اس کے عقائد میں کچھ فرق نہیں آیا۔ اس کے پیچھے نماز ہوسکتی ہے یا نہیں اور ان گریز کرنے والے اشخاص کا علیحدہ اسی گاؤں کی دوسری مسجد میں نماز جمعہ پڑھنا درست ہے یا نہیں؟۔

(۲) دیوبندی لوگوں سے ملنے، جلنے، اٹھنے، بیٹھنے، کھانے، پینے، سلام و دعا کرنے سے ہی کیا کفر کا فتویٰ ہوتا ہے یا نہیں یا برا و نا جائز ہے؟ اگر اس کے عقائد میں کچھ فرق نہ آئے۔

(۳) کہار کافر کے بھرے ہوئے پانی سے غسل و وضو کرنا۔ اس میں پکا ہو کھانا کھانا، بازاری (کافروں کے یہاں بنی ہوئی) مٹھائیاں کھانا، کافروں سے ملنا جلنا درست ہے یا نہیں؟۔ اور سوائی لینا کیسا ہے؟۔

(۴) سوال ۲۔۳ کے عمل پیر الوگوں کا مقابلہ۔

محمد اسماعیل خاں ہیڈ ماسٹر اسلامیہ پرائمری اسکول ہردوئی ضلع باندہ یوپی ۱۳ راگست ۵۴ء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) امام مذکور جب تک عقائد اہل سنت و جماعت ہی پر قائم ہے اور وہ باوجود اس کے دیوبندیو ں سے اجتناب اور پرہیز نہیں کرتا تو یہ اس کی بدعملی ہے۔ اسے پہلے اس بری عادت سے روکا جائے اگر وہ اپنے ان حرکات سے رجوع کر کے دیوبندیوں سے اجتناب کرنے لگے جب تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا چا ہئے اور گاؤں کی دوسری مسجد میں جمعہ قائم نہ کرنا چاہئے اور اگر وہ اپنی پہلی عادت سے باز نہ آئے اور ان

سے میل جول باقی رکھے تو اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھنا چاہئے۔ اور دوسری مسجد میں جمعہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ لانہ فاسق والصلوٰۃ خلف الفاسق مکروہ واجب الاعادۃ ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۔

(۲) دیوبندیوں سے ملنا جلنا، ان کے پاس بلاضرورت اٹھنا بیٹھنا، ان کے ساتھ کھانا پینا، ان سے سلام وکلام کرنا۔ ان کے ساتھ بیاہ وشادی کرنا ناجائز ہیں۔ احادیث شریفہ میں ہے: لا تواکلوھم ولا تشاربوھم ولا تناکحوھم ولا تسلموا علیھم ایاکم وایاھم ۔ (رواہ ائمۃ الحدیث فی سننھم)

اور جب اس کے عقائد میں فرق نہیں آیا ہے تو محض ان امور کی بنا پر فتویٰ کفر عائد نہیں ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) کفار کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا یا مٹھائی اگر اس میں ناپاکی کا یقین نہ ہو تو اس کو کھانا جائز ہے لیکن کفار کی بے احتیاطی اور گندہ مزاجی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا کھانا خلاف اولیٰ اور نامناسب ہے بلکہ احتیاط وتقوی کے تو بالکل خلاف ہے اور ان کے ہاتھ کا بھرا ہوا پانی جس میں ان کی انگلی کے ڈوب جانے کا گمان غالب ہے۔ اس سے وضو وغسل نہیں کرنا چاہئے۔ کفار سے ملنے جلنے کا حکم جواب نمبر (۲) میں مذکور ہوا اور سوائی لینا دینا یہ ہمارا مانوس لفظ نہیں اس لئے کوئی حکم نہ دیا جا سکا۔ اس کو آپ بالتفصیل دریافت کریں تو جواب دیا جائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۴) یہ بھی مجمل ہے اس کو آپ بالتفصیل دریافت کریں تو حکم بیان کیا جا سکتا ہے۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

۲۸ رذی الحجہ ۱۳۷۳ھ

مسئلہ (۳۵۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک شخص وکیل یا مختار کا محرر ہے اور امامت کی اہلیت بھی رکھتا ہے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ جو شخص وکیل یا مختار کا محرر ہو اس کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز ہے۔ امید ہے کہ جواب سے مطلع فرمائیں گے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اگر شخص مذکور فی السوال دین میں مطعون نہ ہو اور فواحش ظاہرہ سے اجتناب کرتا ہو اور اہلیت امامت رکھتا ہو تو اس کی امامت نہ فقط جائز بلکہ افضل ہے۔ شامی میں ہے: وان کان افضل القوم فھو اولی۔ پھر اس کی اقتدا میں کیا شبہ وشک کیا جا سکتا ہے، اور اگر وکیل کے محرر ہونے میں اس کو ارتکاب کبائر کرنا ہی پڑتا ہے تو اسکو امامت کیلئے خود بھی تیار نہیں ہونا چاہیے۔ اور لوگوں پر فسق ظاہر ہو تو وہ بھی اسکی اقتدا سے پرہیز کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۵۶)

ایک شخص کے ہاتھ پیر منھ پر برص کے سفید داغ ہیں اور یہ شخص حافظ قاری بھی ہے، اب اسکے لئے علماء دین اور شرع متین کا کیا فتوی ہے، اس کے پیچھے کسی قسم کی نماز ہوسکتی ہے، یا نہیں؟۔

حافظ غلام رسول

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

محض کسی کو سفید برص کے داغوں کی بنا پر امامت کے لئے نا اہل سمجھنا سخت جہالت ہے، شریعت میں اس کا کوئی وجود نہیں اور جب وہ دین میں مطعون نہیں اور فواحش ظاہرہ سے اجتناب کرتا ہے اور حافظ وقاری ہے تو اس کو امامت کے لئے منتخب کرنا بلاشک جائز ہے۔ بلکہ اولی اور افضل ہے،۔۔ شامی میں ہے۔ وانکان افضل القوم فھو اولی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۵۷)

محترمی مکرمی جناب مولانا مفتی اجمل شاہ صاحب قبلہ السلام علیکم گذارش عرض یہ ہے:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ ہمارے سنی مسلمانوں میں چند لوگ یہ کہتے ہیں کہ سنیوں کی نماز دیوبندیوں کے پیچھے جائز ہے، اور بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ بدعقیدہ ہے، اور ان کے پیچھے سنیوں کی نماز جائز نہیں ہے۔ براہ کرم معہ صحیح حوالہ کتاب مفصل جواب سے مطلع فرمائیں۔ بینوا توجروا،

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

دیوبندی اپنے عقیدہ میں اپنی جماعت کے سوا تمام مسلمانوں کو بدعتی اور مشرک کہتے ہیں بلکہ ان کے حکم سے اس زمانہ سے لیکر سلف صالحین ائمہ وتابعین آل واصحاب وخلفا راشدین بلکہ حضرات انبیاء کرام ومرسلین حتی کہ خود حضور سید المرسلین محبوب رب العالمین صلوات اللہ علیہ وعلیہم اجمعین میں سے کوئی بھی شرک سے بچ نہ سکا، اسی بنا پر انہوں نے اولیا کرام کی شانوں میں گستاخیاں کیں۔ اللہ تعالیٰ کی بے عیب ذات کے لئے مکر اور جھوٹ جیسے عیوب ثابت کئے، انکی یہ بدعقیدگیاں انکی کتابوں تقویۃ الایمان، حفظ الایمان،، براہین قاطعہ، تحذیر الناس، وغیرہ رسائل میں چھپی ہوئی موجود ہیں انکی انہیں بدعقیدگیوں کی بنا پر علماء حرمین شریفین نے ان پر کفر کے فتوے دئے۔ تو کم از کم ان کا گمراہ واہل ہوا ہونا نا قابل انکار بات ہے اور اہل ہوا کے پیچھے نماز ناجائز ہے۔

فقہ کی مشہور ومعتبر کتاب میں یہ حکم ہے: روی عن محمد عن ابی حنیفة وابی یوسف ان الصلوة خلف اهل الاهواء لاتجوز۔ (کبیری۔ ص ۴۸۰)

امام محمد نے روایت کی حضرت امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف سے کہ بیشک اہل ہوا کے پیچھے نماز ناجائز ہے۔

یہ حکم خود حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ سے مروی ہے تو جو لوگ یہ کہتے ہیں انکے پیچھے سنیوں کی نماز جائز نہیں ہے بالکل صحیح کہتے ہیں انکی یہ بات فقہ کی کتاب اور قول حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ کے حکم کے موافق ومطابق ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۵۸_۳۵۹_۳۶۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس تلفظ اور کلمہ میں کہ

(۱) شافعی کی امامت حنفی کے لئے بالکل جائز اور درست نہیں گویا ایسے قائل کسی حد تک تعزیز کا قابل نہیں؟۔

(۲) کسی زمانے میں ایسے الفاظ بولنے والوں کے ساتھ عوام مسلمانون کو کیا سلوک کرنا چاہیے؟۔

(۳) کوئی ایسا شخص خطبہ پڑھنے کو منبر پر چڑھ رہا تھا جس نے امام محمد ادریس الشافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مذہب کی پڑھی ہے اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذہب کی کتب فقہ درسیہ ختم کردیا ہے اور حواشی اور فتاوی میں بغیر تحقیق کے نگاہ بھی ڈالا اور پکا سنی حنفی المذہب ہونے کے ساتھ رسم رسوم میں ظاہر طور پر کوئی شرعی برائی بھی نظر آتی نہیں۔ایسے حالت میں دوسرا ایک شخص ہاتھ پکڑ کر اس کو منبر سے اتارا اور یوں بولتے ہوئے اتارا کہ تو شافعی ہے تیری امامت صحیح نہیں۔ اور روکنے والا روکتے وقت اس کا ہاتھ میں ایک عصائے بانسا بھی موجود تھا اور اسی عالم نے فساد و شور سے ڈرتے ہوئے خاموش بیٹھ گیا، تو فوراً مانع امامت العالم نے وہاں کے (اسی مسجد کے امام) امام سے یہ کہلایا آپ مسجد کا امام ہو آپ خطبہ پڑھاؤ اور امامت کرو جو عربی الفاظ کی صحت اور مسائل حنفیہ ضروریہ کی کی وقفیت سے خالی ہے۔اور ان سے خطبہ اور نماز پورا کیا، اب استفتاء یہ ہے کہ گویا مانع مخوف بالعصا کا یہ قول وکلمہ کہاں تک مقبول ہے کہ شافعی کی امامت حنفی کے لئے جائز نہیں۔ نیز ان مانع کی یہ حرکت شرعا مذموم ہے یا محبوب۔ حالانکہ عالم صاحب کا کھڑا ہونا امام کا اصرار اور محبوب ترین اجازت کے بعد تھا اگر مذموم ہو تو ایسی حرکت کرنے والوں سے اہل محلہ کس قدر اور کیسا برتاؤ وسلوک کرنا شرعا ضروری ہے۔ دلائل شرعیہ کے ماتحت میں براہین قطعیہ اگرچہ ظنیہ ہوں، جواب مرحمت فرمادیں۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

شافعی المذہب صحیح العقائد اور اہل سنت و جماعت ہوتا ہے وہ فروعات میں احناف سے اختلاف رکھتا ہے تو صحت عقائد کی بنا پر تو شافعی کے پیچھے حنفی کی نماز جائز ہونی چاہیے۔ باقی رہا اختلاف

فروعی تو اگر شافعی امام اختلافی مسائل میں احناف کی رعایت مدنظر رکھتا ہے۔ جیسے فصد وقی وغیرہ میں رعایت احناف کی بنا پر۔ تو ایسے شافعی امام کے پیچھے حنفی کی نماز بلا کراہت جائز ہے۔ احکام احناف اور رعایت احناف کو مدنظر نہیں رکھتا تو ایسے شافعی امام کے پیچھے حنفی کی نماز جائز مع الکراہت ہے۔

ردالمحتار میں ہے: ذهب عامة مشائخنا الى الجواز اذا كان يحتاط في موضع الخلاف والا فلا والمعنى انه يجوز في المراعي بلا كراهة و في غيره معها۔

اسی میں شرح منیہ سے ناقل ہیں: واما الاقتدا بالمخالف في الفروع كالشافعي فيجوز مالم يعلم منه ما يفسد الصلوة على اعتقاد المقتدى عليه الاجماع انما اختلف في الكراهة۔ لہٰذا اب جو نادان حنفی امامت شافعی کو حنفی کیلئے مطلقا ناجائز کہتا ہے وہ غلط کہتا ہے۔ اور اگر بر بنائے تعصب کہتا ہے تو اسکو اپنے اس فعل مذموم سے رجوع کرنا چاہیے۔ اہل محلہ انکو سمجھائیں اگر وہ باز آگیا تو ٹھیک ورنہ اس سے تعزیرا پرہیز کر سکتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۶۱_۳۶۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ

(۱) معمہ بھرنا اور امید انعام میں معمہ بھر بھیجنا جائز ہے یا نہیں، ۔ اور جو ایسا کرے اس کے اس فعل کے سبب نماز پڑھنا اس کے پیچھے جائز ہے یا نہیں ۔ اور اس کو امام بنانا کیسا ہے؟۔

(۲) کسی ناجائز کام کو کرنے میں لفظ ان شاء اللہ کہنا مثلا یوں کہ انشاء اللہ یا خدا کا حکم ہوا تو میں معمہ بھر کر بھیجوں گا۔ اس طرح کہنا کہ خدا یا اس کے رسول جل جلالہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حکم ہوا یا اولیاء کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی مدد ہوئی، تو انعام پاؤں گا۔ معمہ بھر کر بھیج رہا ہوں اس طرح کہنا شرعا کیا ہے جائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

(۱) معمہ بھرنا اور اس پر انعام لینا یہ سب قمار اور جوا ہے۔ اور قمار کی حرمت سے کون مسلمان نہ

واقف ہے۔ تو اس کام کا کرنے والا گنہگار و فاسق ہوا۔ اور فاسق کی امامت مکروہ ہے۔ جو واجب الاعادہ ہے۔ ردالمحتار میں ہے۔ و اما الفاسق فقد عللوا الکراهة تقديمه بانه لا يهتم بامر دينه وبان فی تقديمه للامامة تعظيمه وقد وجب عليهم اهانته شرعا ۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۲) یہ معمہ بھر کر بھجتے وقت لفظ ان شاء اللہ کہہ کر یا یہ کہہ کر کہ خدا اور سول جل جلالہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حکم ہوا تو انعام پاؤں گا، اس لئے معمہ بھر کر بھیج رہا ہوں۔ تو اس فعل حرام پر ایسا کہنا شرعاً ناجائز ناروا ہے۔ ایسے شخص پر توبہ و استغفار لازم ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۶۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین کہ

ہمارے سنی مسلمانوں میں چند لوگ یہ کہتے ہیں کہ سنیوں کی نماز دیو بندیوں کے پیچھے جائز ہے۔ اور بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ بدعقیدہ ہیں اور انکے پیچھے سنیوں کی نماز جائز نہیں ہے۔ براہ کرم صحیح معہ حوالہ کتاب مفصل جواب سے مطلع فرمائیں۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الكريم

دیو بندی قوم کے عقائد و مسائل چونکہ کتب عقائد و احکام اسلام کے خلاف ہیں یہاں تک کہ اکابر دیو بند کا عقیدہ اللہ تبارک وتعالی کی توہین کرنا ہے۔ جیسے اس سبوح قدوس کے لئے کذب جیسے عیوب کو ثابت کرنا دیو بندیت کی جان ہے۔ اور حضرات انبیا علیہم السلام کی شانوں میں گستاخیاں کرنا جیسے ان حضرات کو نادان، بیخبر، عاجز، بے اختیار لکھنا، بڑے بھائی کی سی عزت ماننا، انکی سرادری کو چودھری اور گاؤں کے زمیندار جیسی بتانا۔ انکو اللہ کی شان کے آگے چمار سے زیادہ ذلیل ٹھہرانا، انکو ذرہ نا چیز سے کمتر قرار دینا، ان سے قوت و کمال میں جادوگر اور طلسم کو زائد کہنا۔ امتیوں کو اعمال میں ان سے بڑھا دینا۔ انکے علوم کو بچوں، پاگلوں، جانوروں کے علوم کی برابر بتانا۔ وغیرہ کفری اقوال ہیں۔ جن پر دیو بندیت کی بنیاد ہے۔ اور انکی کتابیں مطبوعہ موجود ہیں تو انہیں اقوال کی بنا پر اکابر علماء دیو بند پر

عرب وعجم مفتیان حرمین شریفین نے کفر کے فتوے دئے جو حسام الحرمین اور الصوارم الہندیہ میں مطبوعہ موجود ہیں۔ تو جب ان دیوبندیوں کا کفر وضلالت انکی کتابوں رسالوں سے ظاہر ہے پھر انکے پیچھے اہل اسلام کی نماز کس طرح جائز ہوسکتی ہے۔ فقہ کی مشہور کتاب کبیری میں ہے۔ روی محمد عن ابی حنیفة و ابی یو سف ان الصلوٰة خلف اهل الاهوا لا تجوز۔ یعنی امام اعظم علیہ الرحمۃ سے مروی ہے کہ گمراہوں کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ تو جب گمراہوں کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ تو یہ دیوبندی تو حد کفر تک پہونچ چکے تو انکے پیچھے نماز کس طرح جائز ہوسکتی ہے۔ لہذا جن لوگوں نے کہا تھا کہ دیوبندیوں کے پیچھے سنیوں کی نماز جائز نہیں، انکا قول بالکل صحیح ہے اور کتب فقہ کے موافق ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۶۴-۳۶۵-۳۶۶-۳۶۷-۳۶۸،۳۶۹-۳۷۰-۳۷۱-۳۷۲-۳۷۳)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

کیا فرماتے علمائے دین ومفتیان شرع متین اس امر میں کہ

ایک شخص مسمی زید نے سیکڑوں مسلمانوں کے روبرو مسجد میں ایک دلخراش تقریر کی جس سے مسلمانوں کے قلوب بے چین ہیں از راہ کرم شرعی نقطہ نظر سے ان امور کے احکام بیان فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

(۱) زید نے کہا کہ جھنڈا رسم کفار ہے۔

(۲) جھنڈا اسلام میں نہ کبھی تھا اور نہ کبھی بلند کیا گیا۔

(۳) یہ بھی کہا کہ اگر جھنڈے کا ثبوت اسلام میں پایا جاتا تو جھنڈے کا صدر مسلمان ہی ہوتا جھنڈوں کا صدر کبھی مسلمان نہیں ہوا۔ باوجود اس کے کہ امروہہ میں تقریبا بیالیس جھنڈے ہیں اور ہر جھنڈے کا صدر مسلمان ہی ہے،

(۴) یہ بھی کہا کہ جتنے جھنڈے کے حامی ہیں اور ترغیب صوم وصلوۃ کے نعرے لگاتے ہیں وہ سب کے سب غنڈے نانجار نابکار ہیں۔ بدمعاش اغلام باز زنا کار و لامذہب ہیں۔

(۵) یہ بھی کہا کہ شعراء گمراہ ہوتے ہیں وہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ایسے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ مجھے اب مدینے بلالو،

(۶) شعرائے اسلام کہتے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسکو نہیں سنتے اور نہ انکو سلام پہونچ سکتا ہے۔

(۷) یہ بھی کہا کہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مثل اور مردوں کے مردہ ہو چکے ہیں انکی قبر پر جا کر کہیں تو شاید سن سکیں۔

(۸) یہی بھی کہا کہ کچھ کہہ رہا ہوں اسلامی کتب دیکھ کر اور سمجھ کر کہہ رہا ہوں، کسی کے بہکانے سے نہیں کہہ رہا ہوں،۔

(۹) کیا ایسا شخص مسلمانوں کا امام ہوسکتا ہے کیا اس تقریر کے حامی کے پیچھے مسلمانوں کی نماز ادا ہوسکتی ہے؟۔

(۱۰) ہر ایک نمبر کے محازی جواب مرحمت فرمائیے۔ کیا اسلامی کتب اسی قسم کی تعلیم سے بھرپور ہیں۔ ہر ایک نمبر کے مطابق جواب دیں گے،۔ زحمت گوارہ فرمائیے۔

حکیم ڈاکٹر اخلاق محمد محلہ منڈی چوب امروہہ

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

(۱۔۲) اسلام میں جھنڈا تھا، اور ہمیشہ رہا اور خود بانی اسلام علیہ السلام، کے دو جھنڈے تھے، ایک سیاہ رنگ کا دوسرا اسفید جو غزووں میں بلند کئے جاتے تھے، حضرت شیخ محقق عبدالحق محدث دہلوی مدراج النبوۃ میں نقل فرماتے ہیں۔ وآں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رایات بود یک رایت سیاہ بود کہ عقاب نام داشت دیگر لوائے سفید بود۔ اب زید کا جھنڈا کو رسم کفار بتانا کیسی زبردست جرأت و دلیری ہے۔ اور خود اسکی جہالت و نادانی کی کیسی روشن دلیل ہے۔ بیشک یہ زید اپنے اس باطل قول سے رجوع کرے اور توبہ واستغفار کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۳) اکثر جھنڈے کا بلند کرنے والا مسلمانوں کا صدر اور سردار ہی ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جنگ خیبر میں حضرت مولی علی کرم اللہ وجہہ کو اسی خصوصیت وامتیاز کی بنا پر جھنڈا عطا فرمایا اور ایک دن قبل یہ مژدہ دیا۔ ولا عطین الرایۃ غدا رجلا یفتح اللہ علی یدیہ یحب اللہ و رسولہ و یحبہ اللہ و رسولہ۔ یعنی میں جھنڈا اکل ایسے شخص کو دوں گا کہ اللہ جس کے ہاتھ پر فتح عطا فرمائے گا، جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔ اور اللہ ورسول اس سے محبت رکھتے ہیں۔

اسی طرح جنگ موتہ میں حضرت زید بن حارثہ امیر لشکر تھے جو جھنڈے کو بلند کرتے تھے جب وہ شہید ہو گئے تو حضرت جعفر طیار کو امیر بنایا گیا، تو انہوں نے جھنڈے کو بلند کیا۔ جب وہ بھی شہید ہو گئے، تو حضرت عبداللہ بن رواحہ کو امیر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے اس جھنڈے کو بلند کیا۔ جب وہ بھی شہید ہو گئے تو حضرت خالد بن ولید کو امیر متعین کیا گیا۔ انہوں نے اس جھنڈے کو بلند کیا۔ فتح مکہ میں تو ہر قبیلہ اور جماعت کا علیحدہ علیحدہ ممتاز جھنڈا تھا تو اس لشکر میں کثیر جھنڈے بلند تھے۔ جیسا کہ کتب سیر مواہب لدنیہ وغیرہ میں ہے تو اس طرح سرداران مسلمین نے جھنڈوں کو بلند کیا ولہرایا ہے۔ تو اب زید کا قول کس قدر غلط اور باطل ثابت ہوا اور وہ کس قدر دینی امور سے ناواقف اور بیخبر ظاہر ہوا۔ اور وہ کتنا بڑا جاہل، اور نادان قرار پایا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۴) احادیث میں وارد ہے، کہ زمانہ نبوی میں اعلان نماز کے لئے کثیر بن صلت کے گھر کے قریب جھنڈا نصب کیا گیا۔

ابوداؤد شریف کی حدیث میں ہے۔ فاتی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم العلم الذی عند دار کثیر بن الصلت فصلی ثم خطب الح ۔ یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس جھنڈے کے پاس تشریف لائے جو کثیر بن صلت کے گھر کے قریب تھا، پھر حضور نے نماز عید پڑھائی، اس کے بعد خطبہ پڑھا تو جب اعلان صلوۃ کے لئے جھنڈے کا ثبوت موجود ہے تو ترغیب صلوۃ کے لئے جھنڈا بلند کرنے کی بھی یہی حدیث اصل و دلیل قرار دی جا سکتی ہے۔ زید جو اس کو ممنوع کہتا ہے، وہ بھی تو اس کی ممانعت پر کوئی حدیث صریح پیش کرے ورنہ دعوی بلا دلیل قابل قبول نہیں۔ اسی طرح اس جھنڈے کی حمایت شرعا ممنوع نہیں تو اس کے حامیوں پر لعن وطعن کس دلیل کی بنا پر ہے۔ پھر تو غیر صوم وصلوۃ کے لئے نعرے لگانا بھی شرعا ممنوع نہیں۔ بلکہ فعل محمود و مستحسن ہے۔ کہ حدیث شریف میں ہے۔ مارأہ المومنون حسنا فھو عند اللہ حسن۔ یعنی مسلمان جس چیز کو اچھا جانیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔ تو زید اسکی برائی کو بھی کسی نص سے ثابت کرے۔ پھر اس کا سب مسلمانوں کو غنڈا و نانہجار نابکار و بدمعاش کہنا اور اغلام باز و زنا کار بتانا اگر درحقیقت باعتبار واقع کے صحیح ہے جب تو وہ مجرم قرار نہیں پاتا اور اگر یہ باتیں خلاف واقعہ فقط افترا و الزام ہیں یا محض اس جھنڈے کو بلند کرنے یا ترغیب صوم وصلاۃ کے نعرے لگانے کی بنا پر ہیں تو زید شرعا سخت مجرم و گنہگار اور مفتری وکذاب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۵) مطلقا شعرا کو گمراہ کہہ دینا اسکے خود گمراہ ہونے کے دلیل ہے۔ صحابہ کرام میں حضرت حسان بن ثابت، عبداللہ بن رواحہ۔ کعب بن مالک۔ کعب بن زھیر۔ ابوسفیان بن حارث۔ عباس بن مرداس ۔عدی بن حاتم وغیرہ ہیں۔

اور امام شعبی نے فرمایا: كان ابوبكر يقول الشعر و كان عمر يقول الشعر و كان على اشعر منهما وروى عن ابن عباس انه كان ينشد الشعر و ينشده فى المسجد۔

(تفسیر خازن، ج ۸۔ ص ۱۱۰)

یعنی حضرت ابو بکر شعر کہتے تھے، اور حضرت عمر شعر کہتے، اور حضرت مولی علی دونوں سے بڑے شاعر تھے، حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ شعر کہتے اور مسجد میں شعر پڑھواتے تھے، پھر سلف وخلف میں صدہا شعرا گزرے اور وہ مسلمان شاعر جو حمد ونعت و مدح و منقبت وعظ و نصیحت کے اشعار حد شرع میں رہ کر کہتا ہے تو کیا یہ گمراہ ان سب کو گمراہ کہہ سکتا ہے۔ اب باقی رہا شاعر کا یہ لکھنا کہ مجھے اب مدینہ بلا لو، ہرگز ہرگز گمراہی نہیں۔ اگر زید اسکو گمراہی کہتا ہے تو کسی معتبر دلیل سے ثابت کرے لیکن انشاء اللہ تعالیٰ وہ کسی دلیل سے اسکا گمراہ ہونا ثابت نہیں کرسکتا اور نہ اسکے ہر کہنے والے کو گمراہ کہہ سکتے ہیں۔

(۶) فقط شعرا ہی نہیں بلکہ ہر مسلمان نماز جیسی عبادت میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر السلام علیک ایہا النبی کہہ کر سلام بھیجتا، ہے تو اگر حضور روحی فداہ تک سلام نہیں پہنچ سکتا نہ وہ اسکو سن سکتے ہیں تو پھر ساری امت کا یہ فعل کیا زید کے نزدیک لغو و بیکار ہے۔ پھر شارع علیہ السلام نے بلکہ قران مجید میں خود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صلوۃ وسلام کا حکم کیوں دیا۔ علاوہ بریں خود زید ہی نماز میں ان کلمات سلام کو قعدہ میں پڑھتا ہے یا نہیں۔ اگر پڑھتا ہے تو کیا سمجھ کر پڑھتا ہے۔

نسائی شریف کی حدیث میں ہے۔ ان لله ملائكة سياحين فى الارض يبلغونى من امتى السلام۔

یعنی حضور اکرم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالی کے کچھ فرشتے ہیں زمین میں سیر کرنے والے جو مجھ تک میری امت کا سلام پہونچاتے ہیں۔ تو یہ زید اس حدث کا انکار کر کے خود بھی گمراہ ہوا یا نہیں۔

اسی طرح دلائل الخیرات میں یہ حدیث ہے: اسمع صلاة اهل محبتى واعرفهم۔

یعنی حضور فرماتے ہیں کہ میں اپنے عشاق کے صلوۃ وسلام کو خود سن لیتا ہوں اور ان کو پہچانتا ہوں۔

تو اب اس زید کا ان احادیث کے خلاف یہ کہنا کہ امتی کا سلام نہ حضور تک پہونچتا ہے، نہ حضور سن سکتے ہیں۔اس زید کی کیسی جرات ودلیری وگمراہی و بیدینی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

۷۔ حضرات انبیا کرام علیہم السلام مثل اور مردوں کے ہرگز ہرگز مردہ نہیں ہیں، بلکہ وہ بعد وفات بھی اپنی قبور میں زندہ ہیں۔

امام بیہقی نے کتاب حیاۃ الانبیاء میں اس حدیث کی روایت کی۔

الانبیاء احیاء فی قبورهم یصلون ۔ یعنی حضرات انبیاء کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں نماز پڑھتے ہیں۔

اسی طرح یہی بیہقی شعب الایمان میں اس حدیث کے راوی:

من صلی علی عند قبری سمعته ۔ یعنی حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو میری قبر کے پاس مجھ پر درود پڑھے اس کو میں خود سن لیتا ہوں۔

اب زید کا ان احادیث کے خلاف یہ کہنا کہ حضور مثل اور مردوں کے مردہ ہو چکے ہیں اور وہ قبر کے پاس کے سلام کو شاید سن سکیں۔ کیسی جرات ودلیری اور بیدینی وگمراہی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۸) اسلامی کتب اور صریح احادیث سے اس فتوی میں زید کی ہر بات کا غلط ہونا اور خلاف دین ہونا ثابت کر دیا گیا۔ اب اس زید کی یہ جرات اور ڈھٹائی کرنا کہ اسکی ہر بات موافق کتب اسلامی ہے صریح کذب اور افترا ہے۔ اگر وہ قول کا سچا اور بات کا پکا ہے تو ان کتب اسلامی کو پیش کرے ورنہ، لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔ پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لے۔

(۹) ایسا جری شخص جو قرآن وحدیث کی کھلی ہوئی مخالفت کرے۔ عقائد اسلام کے خلاف عقیدہ بنائے، مسلمانوں پر افترا و بہتان باندھے، انکو گمراہ بتائے، وہ ہرگز ہرگز مسلمانوں کا امام نہیں ہو سکتا، ایسے گمراہ اور اہل ہوا کے پیچھے، اہل اسلام کی نماز ادا نہیں ہو سکتی ہے۔ فقہ کی مشہور کتاب کبیری میں ہے:

وروی محمد عن ابی حنیفة و ابی یوسف ان الصلوۃ خلف اهل الاهواء لایجوز۔ (کبیری ص ۴۸۰)

یعنی حضرت امام محمد نے حضرت امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہم سے روایت کی کہ اہل ہوا گمراہ کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ لہذا اہل اسلام ایسے گمراہ کے پیچھے ہرگز ہرگز نماز نہ پڑھیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۷۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ

زید دہلی کا رہنے والا ہے اور مراد آباد کی کسی مسجد میں امامت کرے بیوی بچے سب دہلی میں ہی رہتے ہیں تو کیا زید کے تنہا ہونے سے امامت میں فرق آتا ہے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صورت مسئولہ میں زید کی امامت میں کسی طرح کا فرق نہیں آتا۔ اگر ایسا ہوتا تو سلف وخلف دوسرے دور دراز مقامات پر کسی کو امام بنا کر روانہ نہ کرتے۔ پھر اگر شرع میں یہ شرط ہوتی تو کسی کتاب میں تو نظر سے گزرتی، تو معلوم ہوا کہ یہ شرط جاہلانہ دماغ کی پیداوار ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۷۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ

زید کی بیوی بچے سب ساتھ ہیں مگر زید کی بیوی پردہ نہیں کرتی بے پردہ رہتی ہے تو کیا بیوی کے بے پردہ رہنے کی وجہ سے زید کی امامت میں کوئی فرق آئے گا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

زید کی بیوی جب بے پردہ پھرتی ہے، اور اسکو زید بے پردگی سے نہیں روکتا تو زید کے پیچھے نماز نہ پڑھی جائے، جامع العلوم میں فتاوی برہانیہ سے ناقل ہیں:

قال ابوحنیفة رحمه الله تعالی: امرأة خرجت من البیت و لا یمنعها زوجها فهو دیوث لا تجوز الصلوة خلفه ولا یقبل شهادته وعلیه الفتوی۔

تو اس عبارت سے ظاہر ہوا ہو گیا کہ بیوی کی بے پردگی سے شوہر کی امامت میں فرق آجاتا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۷۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ
زید کی لڑکی جوان ہوگئی ہے اور ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی ہے تو لڑکی کی شادی نہ ہونے سے زید کی امامت میں کچھ فرق آتا ہے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صرف لڑکی کا جوان ہو جانا اور اسکی شادی کا نہ ہونا، امامت پر اثر انداز نہیں۔ اگر باپ جوان لڑکی کی شادی میں جلدی کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۷۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ
اگر زید گنپتی کی پوجا کرے، یا حد شرع سے داڑھی کم رکھے، اور دوسری رسم اہل ہنود کی کرے، تو کیا ان صورتوں میں زید امامت کرسکتا ہے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جب زید حد شرع سے داڑھی کم رکھتا ہے تو وہ فاسق ہوا اسکی امامت اس بنا پر تو مکروہ تحریمی ہوئی اور اگر وہ گنپتی کی پوجا کرے یا اہل ہنود کی اور رسمیں ادا کرے تو اس بنا پر امامت کا بالکل اہل ہی نہیں رہا، تو اس صورت میں کوئی اسکی اقتدا ہی نہ کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ (۳۷۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ

اگر زید گائے، بکری، بیل، ذبح کرنے جاتا ہے، تو اسکی امامت میں کوئی فرق ہے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

زید پر جانور ذبح کرنے کی بناء پر کوئی الزام شرعی عائد نہیں ہوتا، تو اس بناء پر کوئی اثر اس کی امامت پر نہیں پڑتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم، بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۷۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین شریعت کی رو سے

ایک شخص کتنے ہی آدمیوں سے عداوت رکھتا ہے اور مجھ سے بھی عداوت رکھتا ہے اور میرے خلاف جھوٹا دعوی کیا تھا۔ پنچکورٹ میں اور اس کے متعلق یہ آواز بھی اٹھی ہوئی ہے کہ یہ شخص نماز نہیں پڑھتا۔ لیکن وہ کبھی کبھی امام کی غیر موجودگی میں نماز پڑھانے کھڑا ہو جاتا ہے اور میری طبیعت اس کے پیچھے نماز پڑھنے کو نہیں چاہتی ہے تو میرے لئے کیا حکم ہے اور ایسا شخص نماز پڑھانے کے قابل ہے کہ نہیں اور دونوں میاں بیوی ذرا ذرا سی بات پر جھگڑتے رہتے ہیں اور اسکی بیوی بستی کے باہر جانوروں کا گوبر لینے کے لئے بھی جاتی ہے ایسے شخص کے لئے امام بننے کا کیا حکم ہے شریعت کا جواب دیں باقی میرا سلام۔ نور محمد ولد خدا بخش مقام ڈاکخانہ مانگروالی ضلع کوٹہ متصل جمعہ مسجد

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

شخص مذکور کے یہ افعال واعمال اس حد تک مشہور ہو گئے کہ ان سے عام طور پر مقتدی واقف ہیں یا وہ یہ افعال بالاعلان کرتا ہے تو وہ شرعا فاسق معلن ہے اور فاسق معلن کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے لہذا وہ

اگر امام بھی بن جائے تو جو شخص اس کے فاسق معلن ہونے کی بنا پر اس کی اقتداء نہ کرے تو وہ شرعا مجرم نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۸۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک شخص حافظ قرآن و ذی علم ہوتے ہوئے بھی اپنی منکوحہ بیوی کے انتقال ہو جانے کے بعد منکوحہ بیوی کی چھوٹی بہن کو حافظ صاحب نکال لائے ہیں جو دوسری جگہ بیاہی ہوئی تھی اس نکالی ہوئی مسماۃ کو اتنی مدت تک بلا نکاح رکھے رہے کہ دو بچے پیدا ہوئے وہ اب تک بحیات ہیں اور سن تمیز کو پہونچ چکے ہیں اور حافظ صاحب کا بایاں پیر بھی کٹا ہوا ہے ایڑی ہے اور کچھ تھوڑا حصہ اور ہے پنجہ نہیں ہے لیکن چلنے پھرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہے بچوں کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد نکالی ہوئی مسماۃ کے شوہر سے طلاق لیتے ہیں اور عدت گذار کر کے اپنا عقد نکالی مسماۃ کے ساتھ کرتے ہیں اور حافظ صاحب کہتے ہیں کہ میں نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لیا ہے دوئم یہ کہ حافظ صاحب نماز پنجگانہ فرض اور جمعہ کی پڑھا سکتے ہیں یا نہیں سوئم یہ کہ مقامی مولوی کے انتقال ہو جانے کے بعد دیگر قریبی موضع کے ایک حافظ قرآن صاحب تراویح و نماز عید و بقرہ عید کی پڑھاتے تھے لیکن امسال یہ حافظ صاحب مذکور عید بقرہ عید کی نماز پڑھانے کے لئے جبراً کھڑے ہوئے اور امامت کی جس کی وجہ سے مسلمانوں میں دو جماعتیں ہو گئیں اور نماز دو جگہ ہوئی۔ ایسی حالت میں ہم کو از روئے شرع محمدی جواب سے مطلع کیا جاوے آیا کہ حافظ مذکور کے پیچھے نماز پنجگانہ فرض و جمعہ پڑھنا درست ہے یا نہیں اس کی ایک نقل الہ آباد اور ایک دہلی بھی روانہ کر رہا ہوں امید ہے کہ جواب سے جلد مطلع کریں۔

نوٹ:۔ جماعت میں اس سے زیادہ ذی علم کوئی نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ جند و محمد حسن فرحت مرچنٹ بہرور ری پوسٹ خاص

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

امام کے لئے جب پیر کا کٹا ہونا شرعی مجبوری کی کسی حد تک نہیں پہنچا ہے تو اتنی بات سے ان کی امامت قابل اعتراض نہیں۔ ہاں جب غیر منکوحہ عورت کو اپنے پاس رکھا اور اس سے حرام کاری میں مبتلا ہوا جس سے اہل محلہ بھی واقف ہیں۔ اور اہل مسجد اس گناہ پر مطلع ہیں تو اس کا امام بنانا شرعاً مکروہ ہے اس کے پیچھے نماز مکروہ واجب الاعادہ یہ نماز پنجگانہ کے لئے حکم ہے رہا جمعہ اور عیدین اس میں اس قدر کراہت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۷۹ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۸۱۔۳۸۲۔۳۸۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں۔

(۱) صلوۃ عید الفطر وصلوۃ عید الاضحیٰ کی جماعت سے پیشتر ایک شخص عیدگاہ کے منبر پر کھڑا ہو کر صلوۃ پکارتا ہے اس کا جواز کتاب اللہ کتاب سنت سے مدلل ومفصل طور سے ہے یا نہیں اور چند افراد کا کہنا ہے کہ جو شخص منبر پر صلوۃ کہتا ہے اس فرد پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہتے ہیں کہ اس شخص کو اپنا منھ قبلہ رخ رکھنا چاہئے جس طرح نماز میں جہت کعبہ کھڑے ہوتے ہیں۔ جانب مشرق منھ نہیں رکھنا چاہئے۔ یہ کیا ہے صلوۃ کہنے میں جہت قبلہ رخ کرنے کا ثبوت قرآن وحدیث سے مدلل ومسکت مع دلائل واضح عبارات صحیح وساطعہ مع متوں وشروح مطابع مصنفین وصفحات سے مطلع فرمائیں۔

(۲) مثلاً ایک امام مسجد اسمگلر یعنی افیون فروخت کرتا ہے اس کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں ایسا شخص امامت کے قابل ہے یا نہیں؟۔

(۳) ایک شخص نے اپنی زوجہ دوم کی بغیر طلاق دیئے ایک لڑکی سے ناجائز تعلقات کے طور سے عقد سوم اس لڑکی ہذا سے کرلیا ہے یہ نکاح سوم از روئے شریعت کے درست ہوا یا نہیں لہذا مسائل ثلاثہ کو کافی شافی وافی مستند دلائل سے تحریر فرمائیں۔

راقم حافظ محمد قاسم عفی عنہ اجملی خادم بینوا توجروا ۱۷ / اپریل

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) کتاب اللہ اور سنت سے اس کی صریح ممانعت کا نہ ہونا دلیل جواز ہے باجود اسکے کسی اور دلیل کی حاجت نہیں باقی رہی اس کا قبلہ کو رخ نہ کرنا اور لوگوں کی طرف مونھ کرنا تو یہ درست ہے کہ بعد فراغت نماز امام کا لوگوں کی طرف متوجہ ہونا اور دعا کرنا اور خطیب کا جہت قبلہ سے موڑ کر لوگوں کی طرف مونھ کرنا اس کی کافی دلیل ہے۔ اعتراض کرنے والے اسی پر غور کر کے مسئلہ کو حل کرلیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) افیون کا فروخت کرنا شرعا حرام ہے تو اس کا مرتکب فاسق قرار پایا اور فاسق کی امامت بہ تصریح فقہاء کرام مکروہ تحریمی بتاتے ہیں تو یہ شخص ہرگز قابل امامت نہیں اور اس کے پیچھے نماز درست نہیں ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) زوجہ کی لڑکی سے نکاح حرام و ناجائز ہے۔

فتاوی عالمگیری میں محرمات کے ذکر میں ہے:

والثانية بنات الزوجة وبنات اولادها وان سفلن ۔

تو یہ نکاح ہرگز صحیح نہ ہوا بلکہ باطل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل
یکم ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ

﴿۲۲﴾
باب سجود السہو

مسئلہ (۳۸۴)

لوقرء المصلیٰ فی الرکعة الاولی من السورة البقرة ثم فی الرکعة الثانية نسی الو
قف وتفکر فلم یتذکر له وقرأ سورة اخری فهل علیه سجدة السهوام لا ـ

کتبه : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

لا یلزمه سجود السهو فی هذه الصورة نعم ان طال تفکره ومنعه التفکر عن القرا
یجب علیه سجود السهو صرح به فی الغنیةوالله تعالی اعلم بالصواب۔

کتبه : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۸۵)

لو قرء سورة فی الرکعة الاولیٰ ولم یختم لطولها ثم فی الرکعة الثانية شرع سور
اخری وهو حافظ فهل علیه سجود السهو ـ

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

لا یجب علیه سجود السهو فی هذه الصورة لعدم وجود سبب من اسبابه ک
یفهم من کتب الفقه والله تعالیٰ اعلم بالصواب ـ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۸۶)

لو سہا عن القعدۃ الاخیرۃ وقام الی الخامسۃ فتذکر قبل السجود وجلس فھل علیہ سجود السھو ام لا ؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ذکر فی القنیۃ ان سہا عن القعدۃ الاخیرۃ فی ذوات الاربع وقام الی الخامسۃ یعود الی القعدۃ ما لم یسجد للخامسۃ ویسجد للسہو لتاخیر القعدۃ وان قید الرکعۃ الخامسۃ بالسجدۃ بطل فرضہ وتحولت صلوتہ نفلا واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۸۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسائل ذیل میں
الحمد شریف میں غالباً سات آیتیں ہیں ان میں سے ہر ایک کا پڑھنا واجب ہے یا کل الحمد کا ؟۔ اگر ہر آیت واجب ہے تو اگر امام ایک آیت چھوڑ دے سہو سے، یا مکرر پڑھے، یا جہر میں اخفا اور اخفا میں جہر کرے۔ اس صورت میں کیا حکم ہے؟ اگر الحمد کی ہر آیت واجب ہے نماز کے اندر تو اس کا حکم بھی واجب کے احکام جیسا ہوگا یا اسکے خلاف؟

المرسل مولوی محمد عبد اللہ خاں از نگینہ مسجد اون ضلع ایوت محل برار

۲۸ جولائی ۵۱ء بروز جمعہ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

الحمد شریف کی ہر آیت واجب ہے۔ اور جب ہر آیت واجب ہوئی تو اس کے ترک یا تکرار یا اختلاف جہر وسر پر سجدہ واجب ہے۔

درمختار میں ہے:" ویسجد بترک آیة منها (ای الفاتحة) وهو اولی قلت فکل آیة واجبة"

(شامی ص ۳۲۱) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۲۷/ شوال المکرم ۱۳۷۰ھ ۱۹۵۱ء

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل
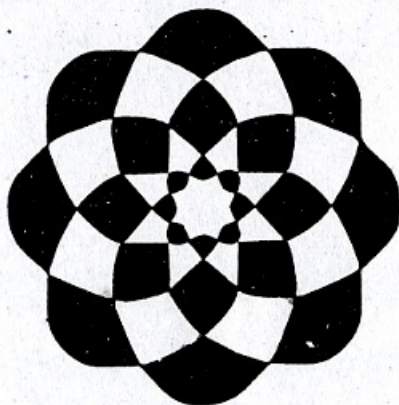
﴿۲۳﴾
باب صلوٰۃ المسافر

مسئلہ (۳۸۸-۳۸۹) از سنبھل محلّہ کوٹ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) ایک شخص نے اپنے گھر سے ارادہ پینتالیس کوس کے سفر کا کرلیا لیکن پندرہ کوس پر چل کر قیام کیا اور وہاں پر اپنے کام میں مصروف رہا اور اس کام کا ارادہ بھی اس نے گھر ہی سے اپنے دل میں کرلیا تھا، اور اسی طرح متعدد مقامات پر اپنے کاموں کی وجہ سے رکا رہا اور اپنے کام پورا کرتا رہا۔ اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ یہ شخص مسافر رہا یا نہیں؟ اور اس پر احکامات مسافر واجب ہوں گے یا نہیں؟۔ بینوا وتوجروا

(۲) ایک شخص نے رمضان المبارک میں فرض جماعت کے ساتھ ادا نہیں کیے۔ البتہ تراویح ضرور جماعت کے ہمراہ ادا کیں۔ تو یہ شخص وتر جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

مسافر جبکہ پینتالس کوس تک اپنے گھر سے جانے کا ارادہ کر کے چلا۔ یا اپنے شہر اور بستی کی آبادی سے اس نے تجاوز کیا تو اس پر مسافر کے احکام واجب ہوگئے۔ اور یہ احکام جب تک واجب رہیں گے کہ جب تک کہ اپنے شہر پر واپس نہ آئے کہ پندرہ یوم یا زیادہ کی اقامت کی نیت نہ کرے۔ پس شخص مذکور فی السوال کو مسافر کے احکام ادا کرنے پڑیں گے۔

شرح وقایہ میں باب صلاۃ المسافر میں ہے:

هو من قصد سيرا وسطا ثلثة ايام ولياليها وفارق بيوت بلده۔

اور اس کے بعد ہے: وله رخص تدوم وان كان عاصيا في سفره حتى يدخل بلده او ينوى اقامة نصف شهر ببلدة او قرية۔

اور ہدایہ میں اس باب میں: واذا فارق المسافر بيوت المصر صلى ركعتين ولا يزال على حكم السفر حتى ينوى الاقامة في بلدة او قرية۔

وتر جماعت سے ادا کرنے چاہیں اگرچہ فرض جماعت سے ادا نہ کئے ہوں۔

درمختار میں ہے: ولو لم یصلها ای التراویح بالامام او صلاها مع غیره له ان یصلی الوتر معه۔

کتبہ عبدالوحید سنبھلی۔

الجواب صحیح بلاریب، محمد معین الدین عفی عنہ مدرس مدرسہ محمودیہ ریاست چھتاری ضلع بلندشہر

الجواب صحیح سعید احمد عفی عنہ مدرس مدرسہ سراج العلوم سنبھل ر

الجواب صحیح محمد مظہر اللہ عفی اللہ عنہ سنبھلی مدرس مدرسہ عبدالرب دہلی

الجواب صحیح محمد عبدالحق عفی عنہ

المجیب مصیب:۔ خصوصا در بارہ وتر صغیری میں مذکور ہے۔

واذا لم یصل الغرض مع الامام قیل لا یتبعه فی التراویح ولا فی الوتر وکذا اذالم یصل معه التراویح لا یتبعه فیالوتر والصحیح انه یجوز ان یتبعه فی ذالك کله۔ محمد کریم غفرلہ مدرس مدرسہ الشرع سنبھل

صح الجواب:۔ اور خاص وتر کے متعلق کبیری میں یہی لکھا ہے کہ صورت مذکورہ میں جماعت کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔

وقال ابو یوسف اذا صلی: مع الامام شیئا من التراویح یصلی معه الوتر وکذا اذالم یدرك معه شیئا منها وکذا اذا صلی مع غیره له ان یصلی الوتر معه وهو الصحیح ذکره ابو اللیث ۔ واللّٰہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۔

عبدالوحید عفی عنہ سنبھلی مدرس مدرسہ میرٹاسیئ

الجواب

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم:

یہ دونوں جواب ان سوالات سے بالکل غیر متعلق ہیں۔ مجیب صاحب کو جب یہ مسائل معلوم نہیں تھے تو پھر قلم اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ اور پھر اگر کاش یہ حضرات ان عبارات کو اپنے اپنے جواب میں نقل نہ کرتے تو مجھ کو اتنی کافی بحث کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ اس وقت صرف ان کا جواب ہی غلط ٹھرتا۔ مگر جب انہوں نے عوام کو دھوکا دینے کے لئے کتب فقہیہ سے بے علاقہ عبارتیں نقل کی ہیں۔ لہٰذا مجھ کو ان کی علمی قابلیت اور ان عبارات کے صحیح محمل کے اظہار کی ضرورت ہوئی اور عوام کو ان کے فریب سے آگاہ کرنا لازم

ہوا۔علاوہ بریں ان میں ہر ایک غالباً صدر مدرس ہے اور بعض کا اکثر عمر کا حصہ اسی درس وتدریس میں گذرا مگر سخت افسوس ہوتا ہے ان میں ابھی تک عربی عبارات کی صحیح مراد نکالنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی اور اپنے مدعا پر دلائل اور عبارات کا منطبق کرنا بھی نہیں آیا۔اور سوال و جواب میں تعلق اور عدم تعلق کی معرفت بھی حاصل نہیں ہوئی۔اور پھر یہ انہیں صاحبوں کی حالت نہیں ہے بلکہ ان کے پیشوا مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولوی اشرفعلی تھانوی بھی اسی غلطی میں مبتلا ہیں۔چنانچہ فتاوی رشیدیہ اور فتاوے اشرفیہ میں مسئلہ وتر کو اسی طرح لکھا ہے۔لہذا میں ان حضرات سے یہ التجا کرتا ہوں کہ آپ حضرات کی جب یہ حالت زار ہے تو للہ مسلمانوں کی حالت پر رحم کیجئے اور ان کو ایسے غلط فتوے دیکر فرقہ بندی کی بلا میں گرفتار نہ کیجئے۔

جواب مسئلہ سفر

شخص مذکور فی السوال مسافر نہیں ہوا بلکہ مقیم ہی رہا۔

مقدمہ اول: جو سفر احکام شرع متغیر کرنے کا سبب ہے وہ کم از کم تین دن کا سفر ہے۔

چنانچہ کبیری میں ہے:السفر التام الذی به یتغیر الاحکام لکونه مظنة المشقة المقتضیة للتخفیف هی الثلثة۔

اس لئے اگر کوئی شخص تمام دنیا کی سیر کر آیا اور کسی مکان خاص سے اس کا قصد متعلق نہ ہوا جس میں تین دن کی مسافت ہو تو یہ شخص مسافر نہ ہوگا۔چنانچہ جوہرہ نیرہ میں ہے:

لو طاف جمیع الدنیا ولم یقصد مکانا بعینه بینه و بینه ثلثة ایام لا یصیر مسافر۔

لہذا سفر کے احکام مرتب ہونے کے لئے تین دن کی مسافت کا ارادہ ضروری ہوا۔

مقدمہ دوم: اس مقدار سفر میں نزول بھی ضروری ہے۔اب وہ نزول یا استراحت کے لئے ہوگا یا حاجت کے لئے۔نزول استراحت تو بضرورت مدت سفر کے ساتھ لاحق کر دیا گیا۔چنانچہ جوہرہ نیرہ میں ہے:

فالحقت مدة الاستراحة بمدة السفر للضرورة۔

اب رہا نزول حاجت تو یہ علت قصر سفر یعنی مشقت کی شرط ثانی کے منافی ہے۔

شامی میں ہے:العلة فی الحقیقة هی المشقة واقیم السفر مقامها ولکن لا یثبت علیتها الابشرط ابتداء وبشرط بقاء فالاول مفارقة البیوت قاصدا مسیرة ثلثة ایام و الثانی استکمال السفر ثلثة ایام فاذا وجد الشرط الاول ثبت حکمها ابتداءً فلذا یقصر بمجرد مفارقة العمران

نادیا ولا یدوم الابشرط الثانی فهو شرط لاستحکامها علة فاذا عزم علی ترك السفر قبل تمامه بطل بقائوها علته لقبولها النقض قبل الاستحکام۔

یعنی سفر میں تخفیف کی علت حقیقیہ مشقت ہے اور سفر اس کا قائم مقام ہے۔ لیکن اس کا علت ہونا دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔

پہلی شرط تین دن کی مسافت کا قصد کر کے اپنے شہر کی عمارتوں سے جدا ہونا۔ دوسری شرط تین دن کے سفر کو کامل کرنا۔ لہٰذا جب شرط اول پائی جاتی ہے سفر کا ابتدائے حکم ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے بشرط سفر اپنے شہر کی عمارتوں سے جدا ہوتے ہی قصر کا حکم ہو جاتا ہے لیکن شرط ثانی کے ساتھ وہ حکم قصر باقی رہتا ہے۔ تو یہ دوسری شرط علت سفر کے استحکام کی شرط ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے مقدار سفر تمام ہونے کے قبل سفر کے ترک کرنے کا ارادہ کیا تو قصر کا حکم جو علت کی بقا سے حاصل ہوا تھا باطل ہو جائے گا کہ استحکام سفر سے پہلے ہی اس نے نقض کو قبول کر لیا۔

لہٰذا اس عبارت کا یہ نتیجہ نکل کر آیا کہ نزول حاجت جو مقدار سفر کے اندر ہو وہ استحکام سفر کو باطل کرتا ہے۔ اور ایسے شخص پر قصر کے بقائے حکم کو نہیں چاہتا۔

مقدمہ سوم: سفر و اقامت میں اقامت اصل ہے کہ سفر عارض ہے۔

چنانچہ شامی میں ہے: الاقامة للرجل اصل والسفر عارض۔

یہی ہدایہ وطحطاوی وجوہرہ نیرہ ودرمختار وشرح وقایہ وغیرہ میں ہے۔ اور جب ایسا سفر ہو کہ نہ کہیں اس میں مقدار سفر کامل ہو نہ استحکام سفر متحقق ہو تو ایسے سفر کے لئے یقیناً اقامة اصلیہ ناقض ہو جائے گی۔ چنانچہ شامی میں اس کو ان الفاظ میں تعبیر کیا ہے:

اذا لم یتم علة فکانت الاقامة ناقضا للسفر العارض۔

لہٰذا اب اس کا محض قصد سفر بغیر استحکام سفر کے اس اقامۃ اصلیہ کو باطل نہیں کرے گا۔

مقدمہ چہارم: فقہ کا یہ قاعدہ ہے کہ جب نماز کے قصر اور اتمام دونوں کے وجوہ قائم ہوں تو احتیاطاً اتمام یعنی چار رکعت فرض پڑھنے کو ترجیح دی جائے گی۔

چنانچہ شامی میں ایک مسئلہ کی دلیل میں فرماتے ہیں:۔

اجتمع فی هذه الصلوة ما یوجب الاربع ومایمنع فرجحنا ما یوجب الاربع احتیاطا۔

خلاصہ کلام کا یہ ہے کہ شخص مذکور فی السوال کا حکم انہیں مقدمات سے ظاہر ہو گیا۔

مزید توضیح کے لئے عرض کرتا ہوں۔

اولا: مقدار سفر کا ارادہ کرنا اس کو ابتداءً تو مسافر ثابت کرتا ہے لیکن اس کا پندرہ یا آٹھ آٹھ کوس پر اترنا اس کے مقدار سفر والے ارادہ کی مخالفت کرتا ہے اور بقائے سفر کے حکم کو باطل کرتا ہے۔لہذا یہ شخص مقدمہ دوم کے اعتبار سے مسافر نہیں ہوا۔

ثانیا: جب نماز قصر کے لئے تین یوم کے سفر کا قصد ضروری ہوا جیسا کہ مقدمہ اول سے معلوم ہوا۔اب اس کا مقدار سفر کے اندر بار بار اس طرح اترنا جن کے نیت گھر ہی سے اپنی کسی حاجت کے لئے کی تھی نزول استراحت تو نہیں کیا جا سکتا جس کو سفر کے ضروریات میں شمار کیا جائے،اور اتصال قطع نہ ہو۔ بلکہ وہ شخص بلا ضرورت سفر کو قطع کر رہا ہے اور مقدار سفر کا نام لیکر محض رخصت سفر کے احکام کا افادہ چاہتا ہے۔ لہذا اس کا ابتدا ہی سے تین یوم کے سفر کا ارادہ نہیں ہوا۔اور اس پر مسافر کی تعریف صادق نہیں آتی۔

ثالثاً: جب یہ شخص مسافر شرعی نہیں ہوا تو اسپر احکام سفر کس طرح مرتب ہونگے باوجودیکہ اقامت اصل ہے جیسا کہ مقدمہ سوم سے معلوم ہو چکا۔لہذا شخص مذکور مقیم ہی رہا۔

رابعاً: جہاں سفر و اقامت دونوں محتمل ہوں وہاں چار رکعت پڑھنے کو فقہاء نے راجح قول قرار دیا ہے۔اور یہاں تو سفر شروع ہی سے متحقق ہوا نہ شخص مذکور شرعاً مسافر ہوا۔لہذا ایسا شخص قصر نہیں پڑھے گا بلکہ چار رکعت نماز ہی پڑھے گا۔

الحاصل مسئلہ تو نہایت وضاحت سے ثابت ہو چکا اس میں جائے سخن باقی نہیں رہی۔منصف کے لئے بہت کافی وافی ہے اور ہٹ دھرم کے لئے ایک دفتر بھی ناکافی ہے۔لیکن مزید اطمینان کے لئے اس کا جزیہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔چنانچہ عالمگیری بحر سے اور بحر معراج الدرایہ سے ناقل ہے:۔

من اراد الخروج الی مکان ویرید ان یترخص برخص السفر ینوی مکانا ابعد منه وهذا غلط۔

یعنی جس نے ایک مکان کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا اور یہ چاہتا ہے کہ سفر کی رخصت سے فائدہ اٹھا

ئے اور اس سے ایک اور دوسری جگہ کی نیت رکھتا ہے، یہ غلط ہے۔ بالجملہ مسئلہ کا صحیح جواب تو یہ ہے کہ جوان چند الفاظ میں لکھا گیا۔اب ان ملایان دیوبند کے جوابات وہ اس قابل ہی نہیں ہیں جن کی طرف کوئی عاقل

التفات کرے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مدرسہ دیوبند میں اسی قسم کے سوالات سے غیر متعلق جوابات لکھنے تعلیم کیئے جاتے ہوں اور پھر علمی استعداد کا یہ حال ہے کہ مقدار سفر ۴۵؍ کوس قرار دیتے ہیں باوجودیکہ ہندوستان میں کوس کی مقدار انگریزی میل کے اعتبار سے بہت مختلف ہے۔ کہ کہیں سوا میل کا کوس ہوتا ہے، کہیں دو میل کا، کہیں اور بیش وکم کا۔ لہذا اب کوس سے کون سا کوس مراد لیا جائے اور کس کوس سے مقدار سفر کا تعین کیا جائے۔ اور ان ۴۵؍ کوس میں وہ کون سے کوس ہیں جس کے چلنے والے کو مسافر کہا جائے۔

اب یہ مجیب صاحبان پہلے اسی سے اپنی گلوخلاصی کرالیں پھر اپنے فتووں میں اور کچھ پیوند لگائیں۔ الحاصل میں اس وقت اتنے ہی جواب پر اکتفا کرتا ہوں اور ان کے فتووں کے باقی مواخذات کو نظر انداز کرتا ہوں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

جواب مسئلہ وتر

اس مسئلہ کی حقیقت یہ ہے کہ رمضان شریف میں وتر کے جماعت سے پڑھنے اور نہ پڑھنے کو فقہاء کرام نے چند صورتیں بیان فرمائیں ہیں جو کتب فقہیہ میں ادنی غور وفکر سے معلوم ہوسکتی ہیں۔ اور چونکہ میں نے التزام کیا ہے کہ میں بھی اپنے جواب میں انھیں کتابوں کا حوالہ دوں گا جن کو ہمارے مجیب صاحبان نے پیش کیا ہے۔ لہذا ان کتابوں میں اس مسئلہ کی بظاہر چار صورتیں بیان فرمائیں ہیں۔

(۱) فرض جماعت سے پڑھے اور تراویح جماعت سے نہ پڑھیں تو وتر جماعت سے پڑھے۔

چنانچہ درمختار میں ہے: ولو لم یصلها ای التراویح بالامام او صلاها مع غیره له ان یصلی الوتر معه۔

شامی اس کے تحت میں لکھتے ہیں: ای قد صلی الفرض معه۔

یعنی خلاصہ مطلب یہ ہے کہ جس نے تراویح امام کے ساتھ نہیں پڑھیں اور فرض امام کے ساتھ پڑھ چکا ہے تو وہ وتر امام کے ساتھ پڑھے۔

(۲) فرض جماعت سے ایک امام کے ساتھ پڑھے اور تراویح دوسرے امام کے ساتھ تو وہ بھی وتر جماعت سے پڑھ سکتا ہے۔

درمختار میں ہے: او صلاها مع غیره له ان یصلی الوتر معه۔

کبیری میں ہے: وکذا اذا صلی التراویح مع غیره له ان یصلی الوتر معه وهو الصحیح

ان دونوں عبارتوں کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ جب تراویح ایک امام کے ساتھ پڑھیں اور فرض

دوسرے کے ساتھ تو وہ دوسرے کے ساتھ وتر جماعت سے پڑھے۔

(۳) فرض جماعت سے پڑھ کر کچھ تراویح بھی امام کے ساتھ پڑھیں تو وہ بھی وتر جماعت کے ساتھ پڑھے۔

چنانچہ کبیری میں ہے: قال ابو یوسف البانی اذا صلی مع الامام شیئا من التراویح یصلی معه الوتر وهو الصحیح۔

یعنی جب امام کے ساتھ کچھ تراویح بھی پڑھیں تو وہ وتر جماعت سے پڑھے۔

(۴) فرض جماعت سے نہیں پڑھے اور تراویح جماعت سے پڑھی تو وہ وتر جماعت سے نہ پڑھے۔

اب ملاحظہ ہو کہ سائل چوتھے نمبر کا سوال کرتا ہے مگر ہمارے ان مجیب صاحبان کے جوابات کو ملاحظہ کیجئے۔ وہ لکھتے ہیں: وتر جماعت سے ادا کرنے چاہئیں اگر فرض جماعت سے ادا نہ کئے ہوں۔

اب ہمارے مجیب مولوی عبدالوحید صاحب اردو عبارت میں تو سائل کو یہ جواب دیتے ہیں اور چونکہ یہ سمجھتے ہیں کہ سائل عربی زبان سے ناواقف ہے لہذا اس کی تسلی کے لئے درمختار کی یہ عبارت نقل کر دیتے ہیں: ولو لم یصلها ای التراویح بالامام او صلاها مع غیره له ان یصلی الوتر معه۔

اور مجیب صاحب ترجمہ یا تو یوں نہیں کرتے ہیں کہ عوام پر یہ راز کھل جائے گا کہ عبارت مدعا کو ثابت نہیں کرتی۔ عبارت کی تو یہ مراد ہے کہ جو فرض جماعت سے پڑھ چکا ہے اور تراویح جماعت سے نہیں پڑھیں تو وہ وتر جماعت سے پڑھے۔ جیسا کہ پہلے نمبر میں ہم نے اس عبارت کو پیش کیا اور قدرے تفصیل آئندہ آئے گی۔ مگر حقیت یہ ہے کہ مجیب صاحب عبارت ہی کو نہ سمجھے۔ اس لئے کہ اس کے بعد لکھتے ہیں:

اس عبارت سے متبادر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ فرض بھی بغیر جماعت سے پڑھے ہوں گے۔

مجیب صاحب آفریں ہے آپ کی اس سمجھ پر۔ کیا آپ اسی سمجھ پر مدرسی کرتے ہیں؟ کیا جناب کے نزدیک تراویح کی جماعت اور فرض کی جماعت میں کوئی ملازمہ ہے جس سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا؟ مجیب صاحب آپ کی سمجھ کی تو مجھے اتنی شکایت نہیں مگر جناب کے مقتدا حکیم الامۃ فقیہ زماں صاحب الشریعۃ والطریقہ مولانا اشرفعلی صاحب تھانوی اپنے فتاوی ''امدادالفتاوی'' کے جلد اول کے صفحہ ۲۰/اور فتاوی اشرفیہ کے حصہ اول کے صفحہ چار میں جناب ہی کی پیش کردہ عبارت درمختار کو اسی آپ کے مزعومہ

مسلک کی سند میں پیش کرتے ہیں تو آپ کے اس صاحب شریعت کی سمجھ تو سمجھ سے ورا ہے۔ لہٰذا میرا خطاب نہ فقط آپ سے بلکہ آپ کی شریعت کے صاحب شریعت سے بھی ہے کہ اگر آپ کی سمجھ میں اس عبارت کی صحیح مراد نہیں آئی تھی تو اسی درمختار کا حاشیہ شامی ہی دیکھ لیا ہوتا کہ علامہ شامی "لو لم یصل الخ" کی تصویر مسئلہ لکھتے ہیں۔

ای قد صلی الفرض معه خلاصه۔

مطلب یہ ہے کہ صاحب درمختار نے جو یہ لکھا ہے کہ تراویح امام کے ساتھ نہ پڑھنے کی صورت میں وتر جماعت سے پڑھ سکتا ہے۔ یہ اسی صورت میں ہے کہ امام کے ساتھ فرض پڑھ چکا ہو۔

مسلمانو! آپ نے دیکھا کہ سائل تو یہ دریافت کرتا ہے کہ جس شخص نے فرض جماعت سے نہ پڑھے ہوں اور تراویح کی جماعت میں شامل ہو جائے، تو وہ وتر جماعت سے پڑھے یا نہیں۔ لہذا اس کے جواب میں اشرفعلی تھانوی یا ہمارے مجیب کا اس عبارت درمختار کو پیش کر دینا (جس کا شامی یہ مطلب بیان کرتے ہیں، کہ تراویح جماعت سے نہ پڑھنے کی حالت میں وتر جماعت سے جب پڑھ سکتا ہے کہ امام کے ساتھ فرض پڑھ چکا ہو۔) مسلمانوں کو صریح دھوکہ دینا ہے۔ مجیب صاحب و صاحب شریعت ذرا آپ ہی انصاف سے کہئے کیا یہ درمختار کی عبارت اس سائل کے سوال کا جواب ہوگئی؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ لہٰذا آپ صاحبان کا اس عبارت کو اس کے جواب میں لکھ مارنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اب میں کہنے کے لئے مجبور ہوں کہ آپ صاحبوں سے عربی عبارت کا صحیح مفہوم نکالنا نہیں آتا تو پھر آپ کا یہ مدرسی اور صاحب شریعت اور فقیہ زماں کے دعوے کیا معنی رکھتے ہیں۔ اور اگر عربی عبارت کا صحیح مفہوم سمجھنے کی لیاقت رکھتے ہو تو اس عبارت کے یہاں نقل کرنے میں سوائے مسلمانوں کو مغالطہ میں ڈالنے کے کیا آپ کا اور کوئی صحیح مقصد تھا؟

مسلمانو! اس عبارت میں جو بات کہی گئی تھی اس کی صحیح مراد صرف اپنی طرف سے نہیں بلکہ علامہ شامی نے جو اس کا مطلب بیان کیا وہ نقل کر دیا گیا۔ اب ان مجیبوں کی دہن دوزی کے لئے یہ عرض کرتا ہوں کہ یہی درمختار کی عبارت ہمارے مسلک کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ چنانچہ یہی علامہ شامی اسی عبارت کے تحت میں فرماتے ہیں: لکنه اذا لم یصل الفرض معه لا یتبعه فی الوتر۔

یعنی جب فرض امام کے ساتھ نہیں پڑھے تو وتر جماعت سے نہیں پڑھے گا۔

کہیئے! مجیب صاحب یہ عبارت درمختار آپ کو کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ کاش اگر آپ شامی کو دیکھتے تو اتنی شرمندگی نہ اٹھانی پڑتی۔ لیکن دیکھی تو ضرور ہوگی مگر شاید عبارت کا مفہوم جناب نے نہیں سمجھا ہوگا۔

عربی کی عبارت ہے ممکن ہے کہ ذہن کی رسائی نہ ہوئی ہو اس لئے میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ جناب کی پیش کردہ درمختار کی عبارت کا مطلب اردو زبان میں پیش کروں تا کہ جناب کے سمجھنے میں آسانی ہو اور وہ بھی آپ ہی کے پیشوا محمد احسن صاحب نانوتوی جو اسی درمختار کے ترجمے "غایۃ الاوطار" میں لکھتے ہیں:

ولولم یصلہا ای التراویح بالامام او صلاہا مع غیرہ لہ ان یصلّی الوتر معہ۔

اور اگر نہ پڑھا تراویح کو امام کے ساتھ یا تراویح کو دوسرے امام کے ساتھ پڑھا تو نمازی کو جائز ہے کہ وتر کو امام کے ساتھ پڑھے۔

مراد اس سے یہ ہے کہ فرض کو جماعت کے ساتھ پڑھا اور تراویح کو جماعت سے نہیں پڑھا تو وتر جماعت سے پڑھ سکتا ہے۔ لیکن اگر فرض تنہا پڑھے ہوں تو جماعت سے نہ پڑھے۔ لہٰذا اہل انصاف غور فرمائیں کہ یہ وہی عبارت ہے جس کو صاحب شریعت دیوبند اپنے ہر دو فتاوی میں اور ہمارے مجیب صاحب اس لئے نقل کر کے لائے ہیں کہ یہ ہر دو صاحبان اسی عبارت سے یہ ثابت کریں کہ جس نے فرض تنہا پڑھے ہوں وہ وتر جماعت سے پڑھے۔ اور علامہ شامی اور مولوی محمد احسن اس عبارت کا یہ مفہوم بیان کرتے ہیں کہ اگر فرض تنہا پڑھے ہوں تو وتر کو جماعت سے نہ پڑھے۔ لہٰذا انھوں نے محض دھوکہ دینے کے لئے اپنے فتووں میں اسی عبارت درمختار کو نقل کیا ہے یا نہیں؟۔ اور اس عبارت کی مراد ان مجیبوں کے مسلک سے نہ صرف بے تعلق بلکہ بالکل خلاف ہے اور ہمارے مسلک کا قوی ہونا ثابت کرتی ہے۔ اور نہ آج تک کسی دیوبندی نے کوئی ایسی صریح عبارت پیش کی ہے جس کی صریح یہ مراد نکلتی ہو۔ کہ جس نے فرض تنہا پڑھے تو وہ بلا کراہت وتر جماعت سے پڑھ لے۔

اب مجیب کا یہ کہنا: اور دوسری کتابوں میں فرض کی بغیر جماعت سے پڑھنے کی تصریح ہے۔ کہاں تک واقعیت رکھتا ہے۔ مجیب صاحب اگر کچھ ہمت ہو تو پیش کیجئے لیکن خدا کے لئے کوئی درمختار کی سی عبارت پیش نہ کر دیجئے گا جو آپ کے لئے وبال جان بن جائے۔

اب رہا کلام مصححین کے متعلق ان پر بھی یہ ہی کل بحث ناطق ہے وہ بھی اپنی گلوخلاصی کی کوشش کریں۔ خصوصا مولوی عبدالوحید صاحب مدرس میٹرتاشٹی کا کبیری کے بے علاقہ عبارت کو پیش کر دینا۔ تو یہ ان کی انتہائے قابلیت کی بین دلیل ہے کہ مولانا صاحب کبیری ہی کے صحیح مفہوم نکالنے سے قاصر ہیں۔ اور مولوی کریم بخش صاحب کی صغیری کی عبارت۔ لہٰذا یہ خود انھوں نے اپنی طرف سے تلاش کر کے نہیں لکھی ہے۔ چونکہ ان کی شریعت کے صاحب شریعت نے اپنے دونوں فتاوی میں اس کو لکھا ہے انھوں نے بھی بلا

سوچے سمجھے اسی عبارت کو نقل کر دیا۔ لہٰذا میں اس کے متعلق صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ اولاً تو یہ عبارت اپنی مراد میں صریح نہیں اور اگر آپ اس کی صراحت کے مدعی ہیں تو یہ سات سوالات حاضر ہیں ان کے جواب آنے پر پھر اور کچھ پیش کیا جائے گا۔

(۱) مع الامام میں الف لام کونسا ہے اور اس کا کیا فائدہ ہے؟۔

(۲) مع امام اور مع الامام میں کچھ فرق ہے یا نہیں اگر ہے تو کیا؟۔

(۳) جواز جب کراہت کو بھی شامل ہے تو اس پر کیا دلیل ہے کہ یہاں جواز بلا کراہت ہے؟۔

(۴) قہستانی کی اس صریح عبارت "لکنه اذا لم يصل الفرض معه لا يتبعه فی الوتر" کا کیا جواب ہے؟۔

(۵) پھر قہستانی سے نقل کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ صاحب منیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

(۶) پھر علامہ شامی کا اسی قہستانی کی عبارت کو نقل کر کے اس پر اعتماد کرنا کیا آپ کے مسلک کو قوت پہنچاتا ہے یا ہمارے مسلک کو؟۔

(۷) آپ کے پیشوا مولوی محمد احسن کا ہمارے مسلک کی تصریح کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟۔

فی الحال اتنے ہی جواب پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ جناب نے اگر حوصلہ افزائی کی تو پوری تفصیل حاضر کردوں گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۹۰)

ما قولکم دام فیضکم وفضلکم فیما اذا اقتدی المقیم با لمسافر فی الرکعۃ الثانیۃ من العشاء ھل یقرء فی الثلث الاتی یا تیھا الاما م بعد فرغ اما مہ ام لا ؟۔وان قلتم با لقراۃ فی الرکعۃ من الرکعات ففی ایتھن یقرأ استحباباً؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اذا کا ن المقیم مسبو قا واما مہ مسافر وفات الرکعۃ الاولی فیقضی الرکعۃ بعد سلام الاما م با لقرأۃ لا ن القرأۃ فی حقہ فرض کما صرح الطحطاوی فی حاشیۃ الفلا ح فکان الاحتیا ط فی حقہ القرأۃ فصار جعلہ منفردا اولی من جعلہ مقتدیا فکا نت قرأتہ فیما یقضی فرضا واماا لرکعتان الا خیر ا ن فلا یقرء فی الاصح واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

﴿۲۴﴾
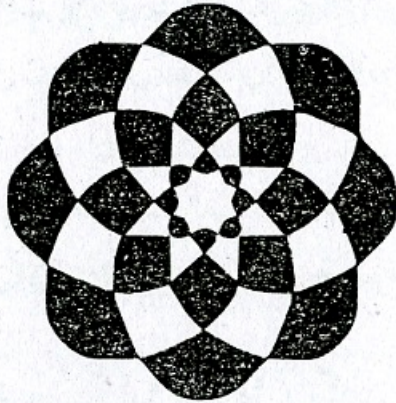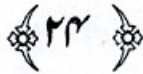
باب المکروہات والمفسدات

مسئلہ (۳۹۱_۳۹۲_۳۹۳_۳۹۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

(۱) زید امامت کرتا ہے اور نماز کی حالت میں کرتے کے گریبان کے اوپر کا ایک بٹن کھلا رکھتا ہے اور حالت نماز میں اسے مسنون بتاتا ہے بلکہ نماز اور غیر حالت نماز میں ہر وقت کھلا رکھتا ہے اور اپنے اس دعوی کے ثبوت میں مشکوۃ شریف کی وہ حدیث پیش کرتا ہے جو کتاب اللباس فصل ثانی میں معاویہ بن قرہ کے والد صاحب سے مروی ہے اور شمائل ترمذی میں بھی اس کو روایت کیا ہے۔ مشکوۃ شریف کی روایت یہ ہے:

عن معاوية بن قرة عن ابيه قال اتيت النبی صلی اللّٰہ تعالیٰ علیه وسلم فی رهط من مزينة فبايعوه وانه لمطلق الازرار فادخلت يدی فی جيب قميصه فمست الخاتم رواه ابو داؤد۔

تو کیا زید کا ثبوت دعوی میں اس حدیث شریف کو پیش کرنا صحیح ہے یا غلط؟۔

(۲) اور کیا ائمہ اربعہ میں سے کسی نے مسنون بتایا ہے یا محدثین یا شارحین حدیث نے سنت فرمایا ہے؟۔

(۳) کرتے کا بٹن نماز میں کھلا ہوا رکھنے کو سنت سمجھنا اور اسی حالت سے نماز پڑھنا یا پڑھانا مسنون ہے یا خلاف سنت؟۔

(۴) اگر نماز میں کھلا ہوا رکھنا سنت نہیں ہے تو اس کو مسنون کہنے والا شریعت پر افترا کرتا ہے یا نہیں؟۔ اور شریعت پر افترا کرنے والے اپنی طرف نئے مسائل گڑھ کر مسلمانوں میں فتنہ وفساد اختلاف وافتراق پیدا کرنے والے کے لئے کیا حکم ہے اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا اور اسے امام بنانا جائز ہے یا نہیں؟۔ بینوا توجروا۔ المستفتی عبدالکریم ۲۴ رذیقعدہ ۱۳۷۵ھ ساکن قصبہ آنولہ ضلع بریلی

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) حالت نماز میں کرتے کے بٹن کھلے رکھنا اور اس کے نیچے میں خوری بھی نہ ہو تو یہ سدل ہے جومکروہ تحریمی ہے۔ فقہاء نے سدل کی یہ تعریف کی ہے کہ کسی کپڑے کو اس کے خلاف عادت لٹکا چھوڑ دینا۔

طحطاوی میں ہے: (السدل) فی الشرع الارسال بدون لبس معتادا۔ (ص ۲۰۴)

کبیری میں ہے: حدالسدل وهو الارسال من غير لبس ۔ (ص ۳۳۶)

اور یہ بات بدیہی ہے کہ کرتا پہنتے وقت ہر شخص عادۃ بٹن لگایا کرتا ہے تو جس نے اس کے بٹن نہ لگائے اس نے اس کے لبس معتاد کا خلاف کیا جس پر سدل کی تعریف صادق آئی اور نماز میں سدل مکروہ تحریمی ہے۔

درمختار میں ہے: (كره سدل) تحريما للنهى (ثوبه) اى ارساله بلالبس معتاد۔

(شامی مصری ج ا ص ۴۴۸)

اور حدیث شریف میں ہے جس کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

ان رسول اللّٰه صلى اللّٰه تعالىٰ عليه وسلم نهى عن السدل فى الصلوة ۔

(مشکوۃ شریف ص ۷۳)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نماز میں سدل سے منع فرمایا۔

اسی لئے علامہ ابراہیم حلبی نے یہ مسئلہ تحریر فرمایا کہ اگر قبا کی آستینیں پہن لیں اور بٹن نہ لگائے تو یہ سدل کے مشابہ ہو جائے گا اور اگر اس کے بٹن لگا لئے تو اس میں سدل بھی لازم نہ آیا اور مکروہ بھی نہ ہوا،

عبارت یہ ہے: لوادخل يديه فى كميه ينبغى ان يقيد بما اذا لم يزرازراره لانه يشبه السدل ح اما انه الازرار فقد التحق بغيره من الثياب فى اللبس فلاسدل فيه فلايكره ۔

(کبیری ص ۳۳۶)

لہذا اس صورت میں کرتے کے بٹن کا نماز میں کھلا رکھنا مکروہ تحریمی ثابت ہوا۔

اور جب کرتے کے نیچے میل خوری بھی ہو تو حالت نماز میں کرتے کے بٹن کھلے رکھنا مکروہ تنزیہی ہے۔ علامہ شامی خزائن سے ناقل ہیں:

ذکر ابو جعفر انه لوادخل یدیه فی کمیه ولم یشد وسطه اولم یزرازراره فهو مسئ لانه یشبه السدل۔ (شامی ج اص ۴۴۹)

یہی علامہ شامی حلیہ سے ناقل ہیں: اختلف فی کراهة شد وسطه اذا کان علیه قمیص ونحوه ففی العتابية انه یکره لانه صنیع اهل الکتاب۔ (شامی ج اص ۴۴۹)

بالجملہ کتب فقہ کی تصریحات سے تو مسئلہ واضح ہو چکا۔ اب باقی رہا جاہل زید کا یہ دعوی (کرتے کے گریبان کے اوپر کے بٹن کا حالت نماز میں کھلا رہنا مسنون ہے) نہ صرف بلا دلیل بلکہ کتب فقہ کی تصریحات کے خلاف ہے۔ وہ اپنے اس دعوی پر کوئی حدیث پیش نہیں کرسکتا اور اس نے جو حدیث پیش کی ہے اس سے اس کا دعوی ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے اس استدلال سے اس کی جہالت ضرور ثابت ہوتی ہے۔

اولاً: حدیث شریف میں کوئی لفظ بھی حالت نماز پر دال نہیں اور غیر حالت نماز پر حدیث کی صریح دلالت ہے تو اب زید کا غیر حال نماز کو حال نماز پر قیاس کرنا جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔

ثانیاً: اسی مشکوۃ شریف میں حدیث شریف کے وازررہ ولو بشوکة کے حاشیہ میں مرقات سے ناقل ہیں:

ومن آداب الصلوة زرالقمیص۔ یعنی نماز کے آداب سے قمیص کے بٹن لگانا ہے۔

تو اب زید کا اپنی پیش کردہ حدیث کو حالت نماز کے لئے دلیل بتانا کیسی سخت جہالت ہے۔

ثالثاً: زید کی پیش کردہ حدیث میں جو امور ہیں وہ بیان جواز کے لئے ہیں۔ علامہ ابراہیم بیجوری نے المواهب اللدنیہ علی الشمائل المحمدیہ میں اسی زید کی پیش کردہ حدیث کی شرح میں فرمایا:

وفی هذا الحدیث حل لبس القمیص وحل الزرفیه وحل اطلاقه وسعة الجیب لجیب تدخل الید فیه وادخال ید الغیر فی الطرق۔ (مواهب لدنیہ مصری)

لہذا اب زید اپنے زعم باطل کی بنا پر حالت نماز میں فقط بٹن کھلے رہنے کو مسنون نہ کہے بلکہ حالت نماز ہی کے اندر گریبان میں غیر کے ہاتھ داخل کرنے کو بھی مسنون قرار دے۔

ع۔ بریں عقل و دانش بباید گریست

رابعاً: زید نے شمائل ترمذی کی اسی حدیث پر عمل کیا جس میں حالت نماز پر کوئی دلالت بھی نہ تھی باوجودیکہ اسی شمائل ترمذی میں اسی حدیث کے بعد دوسری یہ حدیث بھی ہے۔

عن انس بن مالك ان النبی صلی اللّٰه تعالیٰ علیه وسلم خرج وھو یتکی علی اسامة بن زید علیه ثوب قطری قد توشح به فصلی بھم۔ (شمائل ص ۵)

جس میں صاف بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی چادر شریف کو داہنی بغل شریف کے نیچے سے نکال کر بائیں شانے پر محرم کی طرح امامت فرمائی۔

لہذا زید نے اس سنت پر کبھی کیوں نہیں عمل کیا اور وہ اس طرح کیوں امامت نہیں کرتا۔

خامساً: حضور اکرام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہر فعل کو مسنون سمجھ کر بلا تحقیق قابل عمل جاننا خود جہل ونادانی کی دلیل ہے۔

یہی علامہ ابراہیم بیجوری اسی مواھب لدنیہ میں اسی حدیث انس کی شرح میں فرماتے ہیں:

انه صلی اللّٰه تعالیٰ علیه وسلم قد یفعل المکروہ لبیان الجواز ولا یکون مکروھا فی حقه بل یثاب علیه ثواب الجواز۔ (مواھب ص ۶۰)

سادساً: زید ایک بٹن کھلا رکھتا ہے اور وہ جس حدیث شریف کو ثبوت میں پیش کرتا ہے اس میں ایک بٹن کی تخصیص نہیں بلکہ اس میں مطلق الازرار ہے تو اس تخصیص کا حدیث میں کہاں ذکر ہے؟۔

سابعاً: فقہ کی تصریحات کے موجود ہوتے ہوئے زید کی یہ جرأت ودلیری کہ وہ احادیث سے مسائل کا استخراج واستنباط کرتا ہے۔ اس کی انتہائی جہالت کی دلیل اور ضلالت کی سبیل ہے باوجودیکہ یہ مرتبہ اب کسی کو حاصل نہیں۔

حضرت سیدی عبد الوہاب شعرانی میزان الشریعۃ الکبری میں فرماتے ہیں:

لیس فی قوۃ احد بعد الائمة الاربعة ان یبتکر الاحکام ویستخرجھا من الکتاب والسنة فیما نعلم ابدا۔ (میزان مصری ج ۱ ص ۳۶)

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فقہ کی تصریحات سے فقہائے کرام کا مسلک معلوم ہوگیا کہ وہ نماز میں بٹن کھلے ہوئے چھوڑنے کو مکروہ کہتے ہیں۔ اور محدثین وشارحین کا قول مرقات کے حوالے سے گذرا کہ آداب نماز سے بٹنوں کا لگانا ہے۔ مزید ابحاث کی حاجت نہیں ہے۔ جب فقہ کی کتابوں سے اس کی کراہت ثابت ہو چکی تو زید کا اس کو سنت کہنا گویا مکروہ کو سنت کہنا ہے اور اس کا اس طرح نماز پڑھنا مکروہ خلاف سنت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

شامی سے عبارت منقول ہوئی کہ جس نے نماز میں بٹن کھلے ہوئے رکھے وہ گنہگار ہے۔ اور جو اسے مکروہ و گناہ نہ جانے اور اسے مسنون کہکر نہ فقط شریعت پر بلکہ خود شارع علیہ السلام پر عمداً افترا کرتا ہے وہ اس حدیث کا مصداق ہے۔

من کذب علی متعمدا فلیتبؤا مقعدہ من النار۔ (مشکوۃ ص ۳۲)

اسے چاہئے کہ استغفار کرے اور امت میں اختلاف وافتراق پیدا نہ ہونے دے اور مسلمانوں میں فتنہ وفساد کی بنیاد نہ قائم کرے۔

اب باقی رہا زید کا امام بنانا اور اس کی اقتدا اس کا حکم بھی اسی تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ جب خود اس کی نماز مکروہ ہوئی اور شرعاً ہر ایسی نماز جو بکراہت ادا ہو اس کا اعادہ کیا جائے۔

مراقی الفلاح میں تجنیس سے ناقل ہیں: کل صلوۃ ادیت مع الکراھۃ فانھا تعاد لا علی وجہ الکراھۃ۔ (طحطاوی مصری ص ۲۰۱)

تو اب ایسے امام کی اقتدا میں جو نماز ہوگی اس کے اعادہ کا حکم ہوگا۔ لہذا اس میں حرج کثیر لازم آتا ہے اس وجہ سے اس امام ہی کو بدلنا چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۹۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ ذیل میں

زید مولوی کہلاتا ہے اور امامت کرتا ہے تین سال سے کرتے کے اوپر کا بٹن کھولکر نماز پڑھتا اور اسکو سنت بتاتا رہا لیکن جب ایک اور مولوی سے اسی مسئلہ میں بحث ہوئی تو زید نے اسے مستحب لیکن اس مولوی نے اس کو مستحب بھی تسلیم نہ کیا چونکہ زید کے اس فعل سے عام مسلمانوں میں بے چینی پھیل رہی تھی اور اندیشہ تھا کہ کہیں تصادم ہو جائے اس مولوی نے زید سے یہ کہا بالفرض اگر میں آپ کے مستحب بتانے کو تسلیم کرلوں (جو میرے نزدیک نہیں ہے) تب بھی آپ کو مناسب ہے کہ مسلمانوں کی بے چینی دور کرنے کے واسطے اس بٹن کو آپ بند کرلیں زید نے بٹن بند کیا۔ لہذا اب سوال یہ ہے کہ تین سال سے جو نمازیں زید کے پیچھے پڑھی گئیں وہ درست ہوئیں یا نہیں اگر نہیں تو اس کی ذمہ داری

عائد ہوتی ہے اور کیا کفارہ واجب ہوتا ہے صحیح جواب سے مطلع فرمائیں والسلام

مرسلہ علیم الدین عفی عنہ کٹرہ پختہ کوچہ بنگلہ آنونہ ضلع بریلی۔

نوٹ:- اس دوران میں بٹن کے متعلق اکثر علماء دین کے فتوے بٹن کھلا رکھنے کے خلاف میں آئے لیکن زید اس کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا اور کسی مولوی سے اس مسئلہ میں بحث کرنا گوارہ نہیں کی یہ ایک اتفاق تھا جو زید نے مذکورہ بالا مولوی سے بحث کی اور ان کی جرح پر مستحب قرار دیا۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

دو سال کے قریب ہوئے کہ اسی قصبہ آنولہ ہی سے بتوسط مولوی عبداللطیف صاحب جناب عبدالکریم صاحب نے یہی سوال بھیجا تھا جس کا مبسوط جواب لکھدیا گیا تھا اور اس میں فقہ کی عبارات سے بٹن کھولکر نماز پڑھنے کی کراہت پر کافی تصریحات پیش کرائی گئیں تھیں اور اس زید کے دعوے سنت کی دھجیاں اڑادی گئیں تھیں اور اس کی پیش کردہ حدیث کے غلط استدلال پر سات رد بلیغ کئے گئے تھے۔ یہ سائل بھی چونکہ اسی قصبہ کا ساکن ہے لہذا اس فتوے کو عبدالکریم سے حاصل کر کے ملاحظہ کرے کہ اس میں جواب مکمل ومدلل ہے میں اس وقت بوجہ اپنی عدم الفرصتی کے اس جواب کا خلاصہ عرض کرتا ہوں۔
اگر کرتے کے نیچے کوئی کپڑا نہ ہوتو کرتے کے بٹن کھولکر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور اگر کرتے کے نیچے کوئی کپڑا ہوتو کرتے کے بٹن کھولکر نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے اور شرعا ہر ایسی نماز جو بکراہت ادا ہو اس کا اعادہ کیا جائے۔

مراقی الفلاح میں ہے: كل صلوة اديت مع الكراهة فانها تعاد۔

لہذا جب امام کی نماز قابل اعادہ ہے تو مقتدی کی نماز کیوں قابل اعادہ نہ ہوگی۔

بالجملہ جس جس مقتدی نے اس امام کی اقتداء جس قدر نمازوں میں کی ہے ان تمام نمازوں کا اعادہ کرنا چاہیئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں
بلا عذر شرعی بنڈی (سینڈو بنیان کے مطابق) پہن کر نماز پڑھنا کیسا ہے آیا ایسا کرنے سے نماز ہوتی ہے یا نہیں میرے دو سوال کا جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں عام فہم دیا جاوے۔
المستفتی، محمد رضا گوہر قادری قریشی ۳۲۲۹ معرفت لکھنو

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

بلا حاجت فقط بنڈی بنیائن پہن کر نماز پڑھنا مکروہ ہے مراقی الفلاح میں ہے

تکره الصلوة فی ثیاب البذلة بکسر الباء وسکون الذال المعجمة ثوب لا یصان عن الدنس ممتهن وقیل مالا یذهب به الی الکبراء۔ تو ایسی نماز کو دوبارہ پڑھنا چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۹ جمادی الاولیٰ ۷۶/۱۳۷ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۹۷)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں
تکبیر نماز کھڑے ہو کر سننا مکروہ تنزیہی یا مکروہ تحریمی؟

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

فتاویٰ عالمگیری میں ابتدا سے کھڑے ہو جانے کو اقامت میں مکروہ لکھا ہے لیکن غالباً یہ کراہت تنزیہی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۹۸)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں

زید کہتا ہے کہ ٹوپی سے نماز مکروہ ہے۔ احکام شریعت مصنفہ اعلی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ دیتا ہے۔ کیا احکام شریعت میں مکروہ لکھا ہے؟۔ جواب دیں امام ٹوپی سے نماز پڑھادے تو کیا وہ نماز مکروہ ہے جواب مہر شدہ ارسال فرمائیں۔ نیاز، غیور علی رضوی منزل غفرلہ بری سادڑی

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جس طرح عمامہ باندھنا سنت ہے اسی طرح صرف ٹوپی کا اوڑھنا بھی سنت ہے، تو صرف ٹوپی سے نہ تو نماز مکروہ ادا ہوتی ہے نہ امام کا ٹوپی سے نماز پڑاھنا مکروہ ہے۔ احکام شریعت میں اس کی کراہت کی تصریح ہماری نظر سے تو گذری نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۸ ذیقعدہ ۱۳۷۶ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۳۹۹)

حضرت مولینا مولوی المکرّم والمحترم مفتی اعظم شاہ محمد اجمل صاحب قبلہ مدرسہ اجمل العلوم سنبھل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

گذارش خدمت شریف میں یہ ہے کہ حضرت کا فتویٰ تشریف لایا لیکن اس فرمان شرع کو زید نے غلط بتایا۔ زید کا کہنا ہے کہ ٹوپی سے نماز مکروہ ہوتی ہے جس کے پاس عمامہ موجود ہو اور کپڑا میسر ہو تو وہ ٹوپی سے نماز نہیں پڑھ سکتا۔ حوالہ میں ''راہ نجات'' نامی چھوٹی کتاب مطبوعہ نولکشو پریس لکھنؤ کی پیش کرتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ کپڑا میسر ہوتے ہوئے ٹوپی سے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ نماز ہو جاتی ہے مگر ثواب کم ہو جاتا ہے۔ اور آپ کے فتویٰ پر جواب کا حوالہ دلائل شرعیہ سے جلد از جلد جواب عنایت فرمائیں کہ ٹوپی سے نماز بالکل درست ہوتی ہے یا نہیں۔ اور ''راہ نجات'' کتاب سنی نے لکھی ہے یا شیعہ نے لکھی ہے وہ کتاب مستند ہے یا نہیں؟۔ آپ بہار شریعت یا احکام شریعت جیسی معتبر کتاب کا حوالہ ضرور دیں۔ آپ علاوہ اس مسئلہ کے جواب کے یہ بھی دیں کہ ٹوپی اوڑھنا سنت ہے یا نہیں؟۔

تکلیف کی جزا حق تبارک وتعالیٰ عنایت کریگا۔ اگر ایک دو دستخط مفتیوں کے اس جواب پر ہو جائیں تو بہتر

فرمائیں والسلام۔ المستفتی، قاضی سید غیور علی قادری رضوی مصطفوی

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بغیر عمامہ کے صرف ٹوپی کا پہننا سنت ہے اور خود فعل رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔

چنانچہ ابن عساکر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی" کان یلبس القلنسوة بغير عمامة" (از زاد المعاد مصری جلد ا صفحہ ۱۳۱)

حضور اکرم ﷺ بغیر عمامہ کے ٹوپی استعمال کرتے تھے

اس حدیث سے آفتاب کی طرح ثابت ہو گیا کہ صرف ٹوپی کا پہننا بھی سنت رسول علیہ اسلام ہے۔ اور جب اس کا سنت ہونا ثابت ہو چکا تو ٹوپی سے نماز مکروہ اور نا درست کس طرح ہو سکتی ہے۔ پھر ٹوپی سے نماز کا مکروہ ہونا آج تک کسی معتبر کتاب میں تو دیکھا نہیں۔ اور کتاب راہ نجات کوئی مستند معتبر کتاب نہیں۔ لہٰذا یہ کراہت کا حکم کیسے ہو سکتا ہے کہ نماز میں عمامہ کا ہونا صرف مستحب ہے۔ فقہ کی مشہور کتاب مراقی الفلاح میں ہے۔ المستحب للرجل ان يصلى فى ثلاثة اثواب ازار وقميص وعمامة۔ (ہامش طحطاوی مصری صفحہ ۲۰۴)

آدمی کے لئے تین کپڑوں تہبند اور قمیص اور عمامہ کے ساتھ نماز پڑھنا مستحب ہے۔ تو جب نماز میں عمامہ کا ہونا مستحب قرار پایا تو ٹوپی سے غیر مستحب لازم آیا جو شرع میں خلاف اولیٰ کہلاتا ہے۔ تو خلاف اولیٰ تو مقابل مستحب کا ہے نہ کہ مکروہ۔ تو ٹوپی سے نماز کا مکروہ قرار دینا جہالت و نادانی نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ تو زید کا قول حدیث کے بھی خلاف ثابت ہوا اور فقہ کی تصریح کے بھی مقابل ٹھہرا۔ لہٰذا میرا پہلا فتویٰ حدیث وفقہ کے موافق صحیح ثابت ہوا۔ اور قول زید غلط اور مخالف حدیث وفقہ کے قرار پایا۔ نیز اسی تحقیق سے راہ نجات کے حکم کا بھی غیر مفتیٰ بہ اور نا معتبر ہونا ظاہر ہو گیا۔ مولیٰ تعالیٰ زید کو حق کے قبول کر لینے کی توفیق عطا فرمائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۹ ذیقعدہ ۱۳۶۷ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۰۰)

حضرت قبلہ علمائے دین کیا فرماتے ہیں دربارہ ان مسائل کے کہ

کسی آدمی کے پیر کے انگوٹھے اور انگلی زمین سے نہیں جمتے یعنی انگوٹھہ اور انگلیاں پیر کی ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ ایسے شخص کے لئے کیا حکم ہے کہ نماز پڑھائے یا نہیں؟۔ وہ شخص اپنی معذوری بتلاتے ہیں تو کیا ان کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟۔ فقط جواب سے مطلع فرمائیے عنایت ہوگی۔

المستفتی، شمشاد احمد منیجر سیرت کمیٹی محلہ پچھم تھوک نزد مسجد ڈونڈورہ ضلع ایٹہ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

نماز میں بحالت سجدہ پاؤں کے انگوٹھوں اور انگلیوں کے پیٹ کا زمین پر لگانا بلکہ جمنا شرعا ضروری و شرط ہے۔ صرف انگلی کی نوک زمین سے لگ جانا کافی نہیں۔ اگر شخص مذکورہ فی الواقع معذور مجبور ہے تو اس کی نماز ہو تو ہو جائیگی لیکن وہ غیر معذور لوگوں کا امام نہیں بن سکتا۔ کہ ایسے معذور امام کے پیچھے غیر معذور مقتدیوں کی نماز درست نہیں۔ لہٰذا نہ ایسے معذور امام کو امام بنایا جائے نہ غیر معذور مقتدی ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۲۴؍رجب المرجب ۷۷ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۰۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

نماز میں اگر تھوکنے کی ضرورت ہو تو کیا کرے۔ یا تھوک کو نگل جائے یا کسی جانب تھوکے۔ اگر مسجد میں نماز پڑھ رہا ہے اور یہ صورت پیش آئے تو اس میں کیا عمل کرے اور تھوکنے کی عادت بنالینا کیسا ہے؟۔ زید اب تک دوران نماز میں جب کبھی مکان پر نماز پڑھتا تھا سامنے کی طرف تھوکنے کا عادی تھا۔ اس عمل میں کسی نے اعتراض کیا تب اس نے ایک عالم سے یہ مسئلہ پوچھا۔ عالم نے بجائے سامنے تھوکنے کے دائیں بائیں جانب تھوکنے کی اجازت دی۔ پھر دوسرے سے دریافت کیا تو تھوکنے کی اجازت اس نے بھی دیدی لیکن اس طرح سے تھوکے کہ برابر والے کو معلوم نہ ہو۔ زید اپنے عمل کے ثبوت میں ایک عالم کے عمل کو پیش کرتا ہے۔ عالم کا عمل یہ ہے کہ نماز جماعت کی عالم موصوف پڑھاتا ہو دوران

نماز میں جب ضرورت تھوکنے کی ہوتی ہے سامنے برتن رکھا ہوا ہے، اس کو اس میں تھوک لیا اور پھر اسی طرح سے برتن اپنی جگہ پر رکھ دیا، جھکنے اور اٹھنے میں نہیں ہوا اور اس کی نماز میں تو کوئی فرق نہیں آیا؟۔ مدلل طریقہ پر مسئلہ کا جواب دیں۔

ممتاز الٰہی اشرفی عفی عنہ شعبان المعظم ۱۳۶۰

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

نماز میں تھوکنا مکروہ ہے، چنانچہ مراقی الفلاح میں بیان مکروہات میں ہے:

ویکرہ ان یرمی بزاقہ۔ (ص ۲۰۳)

اور اگر تھوکنے کیلے مضطر ہو تو اس کے لئے احادیث میں یہ چند صورتیں بیان فرمائی ہیں۔

بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے کہ حضور سید عالم صلے اللہ تعالی علیہ وسلم فرماتے ہیں: ان احد کم اذاصلی قام فی الصلوۃ فا نما ینا جی ربہ وان ربہ بینہ و بین القبلۃ فلا یبزقن احدکم قبل قبلتہ ولکن عن یسارہ او تحت قد مہ۔ ثم اخذ طرف ردائہ فبصق ثم ردبعضہ علی بعض فقال اویفعل ھکذا۔ (مشکوۃ شریف ص ۷۱)

جب تم میں کوئی شخص نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے مناجات کرتا ہے۔ بیشک اس کے اور قبلہ کے درمیان رب ہوتا ہے تو تم میں کوئی قبلہ کی طرف ہرگز نہ تھوکے۔ البتہ بائیں جانب یا زیر پا تھوکے۔ پھر حضور نے اپنی چادر کا ایک گوشہ لیا اس میں تھوکا اور اس گوشہ کو مل دیا اور فرمایا: یا اس طرح کرے۔

حضرت شیخ محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

اواگر مسجد است البتہ ہمچنیں کند ودر غیر مسجد اختیار دارد کہ در جانب چپ بیند از دیا زیر پا:

اگر مسجد میں ہے تو ایسا ہی کرے اور اگر غیر مسجد میں تو اسے اختیار ہے کہ دائیں جانب تھوکے یا زیر پا۔

مراقی الفلاح میں ہے: ویکرہ ان یرمی بزاقہ الا ان یضطر فیاخذ بثوبہ او یلقیہ تحت رجلہ الیسریٰ اذ صلی خارج المسجد: (ص ۲۰۳)

اور نماز میں تھوکنا مکروہ ہے ہاں بحالت اضطراب اسے اپنے کپڑے میں لے یا بائیں پاوں کے

نیچے پھینک دے۔ یہ جب ہے کہ غیر مسجد میں نماز پڑھ رہا ہو۔

بالجملہ اگر نمازی مسجد میں نماز پڑھ رہا ہے اور اسے تھوکنے کی ضرورت ہی پیش آجائے تو حرمت مسجد کے لحاظ سے اس کے لئے بہتر طریقہ یہی ہے کہ وہ اپنے کسی کپڑے کے حصہ میں تھوکے اور مسجد کو ملوث نہ کرے۔ اور غیر مسجد میں بھی دائیں جانب اور سامنے نہ تھوکے۔ بائیں جانب کی اجازت ہے اور یہ بیان اس وقت ہے جب اس کی ضرورت شدید پیش آجائے ورنہ اس کی کراہت مصرح ہے۔

اب رہا اس کی عادت بنالینا اس کے منافی صلاۃ ہونے میں کوئی شک نہیں، اور جس عالم نے دائیں طرف تھوکنے کی اجازت دی اور پھر مسجد اور غیر مسجد کا فرق نہیں کیا یا محض اپنی رائے سے کہا کہ اس طرح تھوکو کہ برابر والے کو نہ معلوم ہو۔ یہ سب تصریحات کتب شرعیہ کے خلاف ہے اور زید اپنے عمل کے ثبوت میں جس عالم کا عمل پیش کرتا ہے یہ واقعی عمل کثیر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۰۲)

لو رفع شخص فی الصلوۃ یدیہ او رجلیہ مرۃ أھذا فعل واحد ام کثیر؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

الاصل ان العمل الکثیر یفسد الصلوۃ وفسرہ بعضھم کما فی ردالمحتار ان ما یعمل عادۃ بالیدین کثیر وان عمل بو احدۃ کالتعمم وشد السراویل۔ وما عمل بواحد قلیل وان عمل بھما کحل السراویل و لبس القلنسوۃ ونزعھا الا اذا اتکررثلاثا متوالیۃ۔

فرفع الیدین فی الصلوۃ ان کان مما یعمل عادۃ بالیدین فکثیر ویفسد بہ الصلوۃ ولو مرۃ والا فھو قلیل لا یفسد بہ الصلوۃ لو کان مرۃ الا اذار فعھما ثلاثا متوالیۃ واما لو رفع یدیہ عند الرکوع والرفع۔

منہ کما ھو مذھب الشافعی فیکرہ عندنا فلا یفسد الصلوۃ وقس حکم عمل الرجلین علیٰ حکم عمل الیدین کما ھو مصرح فی ردالمحتار۔ واحسن الاقوال الذی علیہ عامۃ الفقھاء و ھو کل عمل یغلب علی ظن الناظر الی المصلیٰ انہ لیس فی

الصلوۃ فھو عمل کثیر ولو مرۃ ۔فرفع الیدین او الرجلین ان کان علی ھذا القدر فھو مفسد للصلوۃ ولو کان مرۃ ۔ و اللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۰۳)

حضرت علامہ الدھر وحید العصر فقیہ معظم مفتی ہند مولینا مولوی شاہ محمد اجمل صاحب دامت برکاتہم العالیہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ

عرض یہ ہے کہ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ

مسجد کے وسط در میں باہر کی جانب امام کے کھڑے ہونیکی جگہ دو تین چوکے رکھدیتے ہیں جسکی اونچائی باہر کے فرش سے بعض جگہ دو انگل اور بعض جگہ چار انگل اور بعض جگہ اس سے زائد ہوتی ہے۔ ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟۔اور نماز میں تو کوئی نقص لازم نہیں آتا؟۔اور اگر آتا ہے تو کس درجہ کا مع حوالہ جواب مرحمت فرمائیے فقط (نوٹ) مقدار اونچائی کتنی ہونی چاہیے؟۔

المستفتی مولو محمد اشفاق حسین غفرلہ از پالی مارواڑ مدرسہ محافظ العلوم ۔۱۰ شعبان المعظم ۱۳۶۲ھ۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد کے در میں ستونوں کے درمیان امام کا کھڑا ہونا مکروہ ہے۔

علامہ ابن عابدین معراج الدرایہ سے ناقل ہیں: الاصح ماروی عن ابی حنیفۃ انہ قال یکرہ للامام ان یقوم بین الساریتین۔ (ردالمحتار مصری ص ۳۹۹ وص ۴۵۳)

تو امام در سے باہر کھڑا ہوگا، پھر جن مساجد میں اندر کا فرش باہر کے فرش سے اونچا ہو تو باہر کے فرش کو مقدار قدم یا اکثر قدم کے اندر کے فرش کی برابر اونچا کیا جائیگا تاکہ امام در سے باہر کھڑا ہو سکے۔ لہذا یہ باہر کے فرش کا امام کے کھڑے ہونے کی مقدار اونچا کرنا کراہت سے بچنے کیلئے ہے۔تو ایسی مساجد میں امام کے کھڑے ہونیکی جگہ کا اونچا نہ کرنا اور امام کا در میں ستونوں کے درمیان کھڑا ہونا مکروہ ہے اور یہ کراہت کا قول خود ہمارے امام مذہب حضرت امام الائمہ سراج الامہ ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ سے مروی ہے، اور جب یہ مکروہ ثابت ہوا تو نماز بکراہت ادا ہوئی اور جو نماز بکراہت ادا ہوا سکے اعادہ کا

حکم ہے۔ مراقی الفلاح میں ہے" کل صلوۃ أديت مع الكراهة فا نها تعا د۔

(طحطاوی مصری ص ۲۰۱)

فتاوے عالمگیری میں یہ الفاظ اور زائد ہیں:" فان كا ن تلك الكراهة كراهة تحريم تجب الاعادة او تنزيه تستحب ۔

(عالمگیری مجیدی ص ۵۷ ج ۱)

اور یہ اونچائی اگر ایک گز سے کم ہے تو مکروہ بھی نہیں ہے، اور اگر ایک گز یا اس سے زائد ہے اور اس پر امام تنہا ہی کھڑا ہوا تو نماز مکروہ ہوگی۔

درمختار میں ہے: وانفراد الامام على الدكا ن للنهى وقدر الارتفاع بذراع ولا با س ما دونه۔

(در المختار ص ۴۵۳ ج ۱)

مراقی الفلاح میں ہے: يكروه قيام الامام على مكا ن بقدر ذراع على المعتمد ۔

(طحطاوی ص ۱۱)

حاصل جواب یہ ہے کہ امام نماز پڑھانے کیلئے در سے باہر ہو۔ واللہ تعالے اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۰۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

آیت سجدہ فرض نماز میں پڑھنی چاہیے یا نہیں؟ اگر پڑھی جائے تو سجدہ کیا جائے یا نہیں؟ اگر سجدہ کیا جائے تو فرض نماز میں کیا نقص ہوتا ہے؟۔

الجواب

نحمده ونصلى ونسلم على رسوله الكريم

آیت سجدہ کو امام کا پڑھنا مکروہ ہے۔ درمختار میں ہے:" ويكره للامام ان يقرأ ها فى مخا فته ونحو جمعة وعيد الا ان تكو ن بحيث تؤدى بركو ع الصلاة او سجو دها۔

(درمختار مصری ص ۵۴۷)

اور امام کو آیت سجدہ کا آہستہ پڑھنا یا جمعہ و عیدین جیسے مجمع میں اس آیت کی تلاوت کرنا مکروہ ہے

۔ہاں اگر وہ رکوع یا سجدہ میں ادا ہو سکے تو آیت سجدہ کا پڑھنا مکروہ نہیں۔

تو امام اگر آیت سجدہ پڑھ کے سجدۂ تلاوت نہیں کرتا ہے تو اس میں ترک واجب لازم آتا ہے اور اگر سجدۂ تلاوت کرتا ہے تو مقتدی اشتباہ میں پڑجائیں گے۔ ہاں اگر آیت سجدہ آخر آیت تھی اور اس نے فوراً رکوع وسجدہ کرلیا تو اس میں کوئی نقص لازم نہیں آتا۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۰۵_۴۰۶)

کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے کرام ومفتیان شرع عظام دامت برکاتہم العالیہ مسائل حسب ذیل کی بابت کہ

(۱) زید کہتا ہے پیلی بھیت، بریلی، کانپور، مرادآباد میں لاؤڈاسپیکر سے نماز پڑھنے کو علمائے کرام صرف انہیں چار شہروں کے منع کرتے ہیں اور بمبئی، لاہور، کراچی، پشاور وغیرہ تمام پاکستان اور مدینہ طیبہ مکہ معظمہ میں لاؤڈاسپیکر پر نماز پڑھی جاتی ہے۔ صرف مذکورہ بالا شہر پیلی بھیت بریلی کانپور مرادآباد میں لاؤڈاسپیکر سے نماز نہیں پڑھی جاتی ہے۔ اور یہاں کے علمائے کرام منع فرماتے اور لاؤڈاسپیکر سے نماز پڑھنے کو ناجائز قرار دے کر بمبئی کراچی وغیرہ تمام پاکستان مدینہ طیبہ مکہ معظمہ وغیرہ کے علمائے کرام کے خلاف فتوی صادر فرما کر وہاں کے علمائے کرام کی مخالفت کرتے ہیں۔ اگر واقعی لاؤڈاسپیکر پر نماز نہیں ہوتی ہے تو پھر وہاں کے علما منع کیوں نہیں کرتے؟۔ حالانکہ پاکستان میں حکومت بھی اسلامیہ ہے شرعاً کیا حکم ہے؟۔

(۲) زید یہ کہتا ہے کہ مدینہ طیبہ اور مکہ معظمہ میں جو نماز لاؤڈاسپیکر سے ہوتی ہے وہ جس صورت سے وہاں پر ہوتی ہے وہ جائز اور نماز صحیح ہوتی ہے۔ یعنی وہاں کے لاؤڈاسپیکر بہت زیادہ قیمت کے ہوتے ہیں اور وہاں امام کے گلے میں ایک ہارن جو ہار کی شکل میں ہوتا ہے پڑا ہوتا ہے۔ اور وہ کئی ہزار روپے کی قیمت کا ہوتا ہے۔ یہاں کے لاؤڈاسپیکر اس قیمت کے نہیں ہوتے جس قیمت کا وہاں کا وہ ہار ہوتا ہے اور وہ امام گردن میں ڈال کر نماز پڑھاتا ہے، یہاں پر یہ نہیں ہے۔ لہذا وہاں پر نماز لاؤڈاسپیکر پر جائز وصحیح ہے۔ اور یہاں پر صحیح نہیں ہے۔ لاؤڈاسپیکر پر نماز اسی وجہ سے یہاں کے علماء منع کرتے ہیں۔ اور ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اور وہاں پر وہاں کے علماء منع نہیں کرتے ناجائز قرار نہیں دیتے۔ کہ یہ طریقہ نماز صحیح

ہونے کا ہے۔ شرعا کیا حکم ہے؟۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

(۱) زید کا یہ دعوی ہی غلط و باطل ہے۔ لاؤڈ اسپیکر سے نماز باجماعت پڑھنے کو صرف چار شہروں پیلی بھیت، بریلی، مراد آباد، اور کانپور کے علماء منع کرتے ہیں۔ اور بمبئی، لاہور، کراچی، پشاور تمام پاکستان، مدینہ طیبہ، مکہ مکرمہ کے علماء منع نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اس کو جائز جانتے ہیں۔ ہاں زید کا یہ دعوی اس وقت صحیح ہوتا کہ وہ علمائے بمبئی، پاکستان، حرمین شریفین کے جواز کے فتاوی پیش کرتا۔ اور جب وہ ایسا کوئی فتوی پیش نہ کرسکا تو اس کا یہ دعوی بغیر ثبوت ہوا جو قابل قبول نہیں۔ اور فی الواقع اگر اسکے جواز کا کوئی فتوی ہوتو اس کا علم ہوتا، نظر کے سامنے گزرتا، لیکن میں نے تو ابھی تک کسی سے سنا بھی نہیں کہ کسی مفتی نے اس کے جواز پر فتوی دیا ہو۔ دیوبندی جماعت ایسے فتوے لکھنے میں سبقت کیا کرتی ہے۔ لیکن ابھی تک انہوں نے بھی اس کے جواز کا کوئی فتوی نہیں لکھا۔ بلکہ اسکے خلاف فتاوی دیوبند میں یہ فتوی چھپا ہوا موجود ہے۔

نماز باجماعت میں آلہ مکبر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) کا استعمال امام کی تکبیرات اور قرأت کو عام مقتدیوں تک پہنچانے کے لئے کرنا بالکل ناجائز ہے۔ اور جو لوگ تکبیر تحریمہ اس آلہ کی آواز پر کریں گے ان کی نماز فاسد ہوجائے گی۔ (فتاوی دیوبند، ج ۸ ـ ص ۷۰)

اور اس طرح مفتیان مظاہر العلوم، سہارنپور، اور مفتیان ڈھابیل ضلع سورت، ومفتیان مدرسہ فتح پوری و مدرسہ امینیہ دہلی نے نماز باجماعت میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ناجائز اور اسکی آواز پر اقتدا غلط اور نماز مقتدی کی فاسد قرار دی ہے۔ اور مفتی دہلی حضرت مولانا مولوی مظہر اللہ صاحب، امام مسجد فتح پوری نے تو اسکے عدم جواز پر ایسا مبسوط فتوی دیا ہے جو رسالہ ہوگیا جس کا نام قصد السبیل ہے۔

اس میں یہ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ آلہ امام اور مقتدیوں کا غیر ہے۔ اور امام کا غیر مقتدی کے قول پر اور مقتدی کا غیر امام کے قول پر عمل کرنا مفسد صلوۃ ہے۔ پس آلہ کی آواز پر جو لوگ ارکان نماز ادا کریں گے انکی نماز نہ ہوگی۔ (قصد السبیل ص ۱۰)

اب اس سے زید کا یہ دعوی غلط ہوگیا کہ صرف چار شہروں پیلی بھیت، بریلی، مراد آباد، کانپور کے علماء منع کرتے ہیں، رسالہ امانت الاسلام جو کراچی میں شائع ہوا ہے اس میں ہندوستان کے شہروں سے

دہلی، سہانپور، دیوبند، ڈھابیل ضلع سورت، اجمیر شریف، کچھوچھہ شریف۔ بھاولپور، مرادآباد، امروہہ، تھانہ بھون کے فتوے چھپے ہیں جس میں اسکو منع کیا گیا ہے۔تو زید کا جھوٹ کس قدر ظاہر ہو گیا، کہ صرف چار شہر کے علماء منع کرتے ہیں۔اسی طرح اس کا یہ کہنا بھی افترا اور جھوٹ ہے کہ تمام پاکستان کے علماء اس کو جائز جانتے ہیں۔اسی رسالہ امانت الاسلام میں ملتان، تونسہ شریف، علی پور میدان، گولڑہ شریف لاہور، کراچی، جالندھر، ڈیرہ غازی خان، راولپنڈی، لائل پور کے مفتیوں کے مطبوعہ موجود ہیں بلکہ مفتی پاکستان اور ۷۵ مفتیوں کے فتوی چھپ چکے جن میں انہوں نے اسکو منع کیا۔اور مفسد نماز قرار دیا۔تو زید کا یہ دعوی کہ لاہور کراچی وغیرہ تمام پاکستان کے علماء اس کو منع نہیں کرتے، کس قدر صریح جھوٹ اور جیتا افترا اور کھلا ہوا بہتان ہے۔

اب باقی رہا اس کا حرمین شریفین کا نام لینا تو یہ بھی علمائے حرمین پر افتراء معلوم ہوتا ہے۔کہ ان کا کوئی جواز کا فتوی ابھی تک نہ نظر سے گزرا نہ سماعت میں آیا۔اب رہا زید کا ان مقامات کے عمل سے استدلال کرنا۔تو عمل عوام ناجائز چیز کو جائز نہیں کر دیتا۔کتنے ناجائز امور عوام کے معمول ہیں تو وہ محض عمل عوام کے بنا پر جائز نہیں ہو جاتے، پھر زید کی ایک زبردست جہالت یہ ہے کہ پاکستان میں حکومت اسلام ہے، وہاں علماء نے منع کیوں نہیں کیا۔اس نادان سے پوچھو کہ مفتیان پاکستان نے اسکی ممانعت میں فتوے لکھ دیئے، رسائل چھاپ دیئے، تو پھر منع کرنا کس طرح ہوتا ہے۔ہم نے جو رسالہ امانت الاسلام کا نام پیش کیا ہے اس میں اکثر فتاوی علمائے پاکستان ہی کے ہیں۔اب آفتاب سے زیادہ روشن طور پر ثابت ہو گیا کہ علمائے بریلی، مرادآباد، پیلی بھیت، کانپور، نے جس طرح لاؤڈ اسپیکر سے نماز جماعت کو منع کیا اسی طرح بکثرت علمائے ہندوستان ومفتیان پاکستان نے بھی اس کو منع کیا ہے۔حتی کہ دیوبندی جماعت نے بھی اس میں کوئی اختلاف نہیں کیا۔تو زید سخت لغوگو، کذاب، افترا پرداز ثابت ہوا۔مولی تعالیٰ اس کو قبول حق کی توفیق دے۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) زید کا یہ قول بھی انتہائی لغو وسراسر باطل ہے کہ لاؤڈ اسپیکر پر نماز حرمین شریفین میں صحیح ہے۔نہ حرمین شریفین میں اور نہ غیر حرمین میں۔حکم شرع مقامات کے بدل جانے سے بدل نہیں سکتا۔نہ لاؤڈ اسپیکر کا زائد قیمتی ہونا اور کم قیمتی ہونا شرعا فرق کر سکتا ہے۔ہر ذی عقل جانتا ہے۔کہ لاؤڈ اسپیکر جس طرح یہاں مکلف انسان نہیں، اسی طرح وہاں بھی نہیں۔جس طرح یہاں نمازی نہیں وہاں بھی نہیں۔جس طرح یہاں آواز پہنچانے کا آلہ ہے وہاں بھی اسی طرح ہے۔یہاں اس کی آواز پر جس طرح نماز

نہیں ہوتی وہاں بھی نہیں ہوتی۔ یہاں اقتدا کی جو علت فساد ہے وہاں بھی وہی علت فساد ہے۔ تو اب زید کا یہاں کے لاؤڈ اسپیکر میں اور وہاں کے لاؤڈ اسپیکر میں فرق کرنا جہالت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے۔ اس کا کئی ہزار روپے کا قیمتی ہونا یا امام کے گلے میں بشکل ہار لٹکا دینا کیا اسکی حقیقت بدل دے گا۔ یا اس کو از قسم معدنیات سے مکلّف انسان بنا دے گا۔ حاصل یہ ہے کہ یہ سب زید کی جہالت ہے۔ حکم شرع وہی ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کا نماز جماعت میں لگا دینا، حرمین شریفین اور غیر حرمین ہر مقام پر ناجائز و نادرست ہے۔ اور مقتدی کی نماز کا مفسد ہے۔ مولیٰ تعالیٰ زید کو ہدایت فرمائے۔ اور باطل کی حمایت سے حفاظت فرمائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۰۷_۴۰۸)

کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے کرام و مفتیان شرع متین دامت برکاتہم العالیہ مسائل حسب ذیل کی بابت کہ

(۱) زید کہتا ہے بعض لاؤڈ اسپیکر اس قسم کے ہوتے ہیں جو بولنے والے کی بعینہ آواز (اصل آواز) کیچ کر کے یعنی کھینچ کر دور تک پہنچاتے ہیں۔ لہذا ایسے لاؤڈ اسپیکر سے اگر نماز پڑھی جائے تو امام اور مقتدیوں کی نماز بلا کراہت جائز و صحیح ہوگی۔ کیونکہ مقتدی جو لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر رکوع و سجود کریں گے۔ یہ آواز در حقیقت امام ہی کی آواز ہوگی۔ لہذا مقتدیوں نے امام کی بعینہ آواز پر اقتدا کی اس لئے نماز صحیح و درست ہوئی کہ لاؤڈ اسپیکر نے امام کی اصل آواز مقتدیوں تک پہونچائی ہے۔ دریافت طلب یہ امر ہے کہ زید کا قول شرعا صحیح ہے یا نہیں؟۔ کیا حکم شرعی ہے؟۔

(۲) جو لاؤڈ اسپیکر سے نماز پڑھائے اور جو پڑھیں وہ سب مجرم شرعی اور گنہگار ہوں گے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

تقریروں میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال سے یہ ثابت ہوا کہ لاؤڈ اسپیکر سے قرع اول منتقل نہیں ہوا جیسے گراموفون میں قرع اول کا انتقال نہیں ہوتا بلکہ اس سے آواز بازگشت پیدا ہوتی ہے۔ اور برقی

طاقت کی بنا پر اس کا احساس مشکل ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ حقیقت ہے تو اس میں بعینہ اصل آواز امام کا انتقال نہیں ہوا۔ تو اب آواز اسی آلہ لاؤڈ اسپیکر کی ہوئی۔ اسی لئے تو اس کی آواز سنکر ہر شخص یہی کہتا ہے کہ لاؤڈ اسپیکر بول رہا ہے۔ میں لاؤڈ اسپیکر کی آوازیں سن رہا ہوں، سنو لاؤڈ اسپیکر کی آواز آرہی ہے۔ تو آواز کی نسبت آلہ کی طرف کی جاتی ہے؟۔

پھر جب یہ آواز اس آلہ ہی کی ہوئی تو یقیناً یہ آلہ غیر امام ہے۔ اور غیر نمازی ہے۔ لہذا جب مقتدی نے اس آلہ کی آواز پر اقتدا کی تو اس نے غیر امام ہی کے قول پر تو عمل کیا اور غیر نمازی کے واسطے سے ارکان نماز ادا کئے۔ اور یہ امور مفسد صلوۃ مقتدی ہیں۔

ردالمحتار میں ہے: و کذا الاخذ ای اخذ المصلی غیر الامام یفتح من فتح علیہ مفسد۔

تو اب قول زید کا غلط و باطل ہونا ظاہر ہو گیا اور مقتدی کی نماز کا غیر صحیح و نادرست ہونا ثابت ہو گیا اور اگر فرض کر لیجئے کہ اس آلہ میں بعینہ اصل آواز امام ہی منتقل ہوتی ہے لیکن یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ امام کی آواز ہوا میں مکیف ہو کر اس آلہ میں پہنچی، اور اس آلہ نے اگلی ہوا میں نیا تموج پیدا کیا تو اگلی ہوا کے تموج کا سبب قریب یہ آلہ ہی تو قرار پایا۔ تو اب اس آواز کی نسبت اس آلہ لاؤڈ اسپیکر کی طرف ضرور کی جائے گی۔ نیز امام کی آواز جہاں تک پہونچی اس آلہ نے اس میں اتنا تصرف کیا کہ اب وہ آواز اس مقام پر بھی پہونچادی جہاں اصل آواز امام کسی طرح پہونچ نہیں سکتی تھی۔ تو اس لاؤڈ اسپیکر کا اتنا تصرف تو ناقابل انکار ہے۔ اور جب لاؤڈ اسپیکر کا یہ تصرف تسلیم ہے اور اس آواز کی نسبت لاؤڈ اسپیکر کی طرف صحیح ہے، تو پھر وہی نتیجہ نکلا کہ مقتدی کے حق میں غیر امام کا تصرف اور آواز واسطہ بنی۔ تو مقتدی کی نماز کے فاسد ہو جانے کے لئے اسقدر کافی ہے۔ جیسا کہ عبارت ردالمحتار سے ثابت ہو چکا۔ لہذا زید کا قول ہر طرح غلط ثابت ہوگا۔ اور لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ سے مقتدی کی نماز کسی طرح صحیح و درست ثابت نہ ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۲) جب لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ سے اقتدا ہی صحیح نہیں، اور مقتدی کی نماز ہی ادا نہیں ہوتی تو جو اس سے نماز پڑھائے اور جو پڑھیں وہ سب شرعاً مجرم و گنہگار رہوں گے۔۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

رسالہ مکبر الصوت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی بین لنا احکام الدین ۔ والصلوۃ والسلام علی رسولہ وحبیبہ الذی
ہر لنا مسائل الشرع المبین ۔ وعلی آلہ وصحبہ الذین اید واالاسلام بالقوۃ المتین وعلی
مجتھدین والفقھاء الذین اسسو االاصول للحوادث الی یوم الدین وعلی علماء امتہ
املین والمفتیین اجمعین ۔

امابعد: حمد اسکے وجہ کریم کو جس نے اپنے دین کے محافظت کیے لئے مجتہدین اور فقہاء کو پیدا کیا
صلوۃ وسلام اس رسول پاک صاحب لولاک پر جنہوں نے اپنی شریعت کی حفاظت کے لئے ہر صدی
رن میں ایسے مفتی اور عالم بنائے جنہوں نے ایسے فتاوے اور احکام دیئے جو ہر زمانہ میں حوادث
اقعات کے لئے مثل نص کے ثابت ہوتے ہیں۔

چنانچہ ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر اگر چہ نو ایجاد آلے ہیں لیکن فقہ میں انکی نظیریں آج بھی موجود ہیں
یت ہلال کے متعلق ریڈیو، وائرلیس، ٹیلی ویژن وغیرہ کے شرعی احکام میں میرا ایک مستقل مکمل رسالہ
ل القال مطبوعہ موجود ہے اور لاؤڈ اسپیکر کے متعلق مستقل رسالہ یہ ہے جسکے مطالعہ کے بعد اور کسی
حقیق کی حاجت باقی نہیں رہتی ۔ پہلے ۴۰ء میں جب تک اس لاؤڈ اسپیکر کی معرفت اور تجربہ نہیں ہوا تھا تو
س کا نماز میں امام کے سامنے لگانا مکروہ قرار دیا گیا تھا اور صرف کراہت کا فتوے دیا گیا تھا۔ اب چونکہ
س کی مکمل تحقیق اور تجربہ ہوا تو اس کا صدا اور آواز بازگشت ہونا ثابت ہوا۔ تو اب اسکو مفسد صلوۃ مقتدی
رار دیا گیا۔

لہذا حکم سے پہلے یہ چند مقدمات پیش کئے جاتے ہیں تا کہ فہم جواب میں آسانی ہو اور مسئلہ میں

فاقول وبتوفیق اللہ تعالی اجول:

مقدمہ اولی: لاؤڈ اسپکر میں قرع اول بعینہ منتقل ہوتا ہے اور امام یا قائل کی اصل آواز اس آلہ سے مقتدیوں یا سامعین تک پہنچتی ہے، اس دعوے پر ابھی تک کوئی دلیل شرعی قائم نہ ہوسکی۔ اور ادھر تجربہ شاہد ہے کہ اگر یہ بات فی الواقع ہوتی تو اس لاؤڈ اسپیکر میں بولنے والے کی آواز پہچان لی جاتی اور آواز ممتاز ہوجاتی لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ بسا اوقات معرفت آواز میں غلطی ہوجاتی ہے۔ تو ثابت ہوگیا کہ یہ آلہ اصل آواز کو اخذ کر کے اپنے خصوصیات سے متکیف کر کے آواز کا اعادہ کرتا ہے۔ چنانچہ نغمہ والی آواز اور بے نغمہ والی آواز اس میں ایک سی معلوم ہوتی ہے۔ رہا اسکا آواز کو بلند کردینا تو یہ مسلم ہے۔ تو اسکی مثال اس طرح ہے جیسے کسی نے گیند کو پھینکا کچھ اوپر جا کر محرک اول کی تحریک کمزور ہوگئی۔ تو اس میں کسی نے ٹھوکر لگا دی تو اس ٹھوکر سے اسکی حرکت ضرور قوی ہوجائے گی اور وہ بجائے دس گز کے بیس گز تک پہنچ جائے گی۔ تو اس کا ۲۰ گز تک پہنچ جانا یہ محرک اول کی حرکت سے نہیں ہوا بلکہ محرک ثانی کی ٹھوکر سے ہوا۔ ابھی چند سال ہوئے کہ جامع مسجد بریلی میں ایک جلسہ تھا جس میں یہ لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا اور اس میں کافی تعداد میں علمائے کرام تھے۔ جن میں حضرت مفتی اعظم فقیہ لاثانی مولانا مولوی شاہ الحاج مصطفے رضا خانصاحب ضرور قابل ذکر ہیں۔ تو یہ لاؤڈ اسپیکر واعظ کے الفاظ اور جملوں کا اسکے بعد اعادہ کرتا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر میں اعادہ کراتا اور تخت پر بیٹھنے والے دوہرا بیان سن رہے تھے۔ میں نے یہ احساس کر کے علمائے کرام سے عرض کیا کہ اسوقت ثابت ہوگیا کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز صدا اور آواز بازگشت ہے۔ سب نے بالاتفاق اسکو تسلیم کیا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز صدا اور آواز بازگشت ہے۔

مقدمہ ثانیہ: جب مقدمہ اولی سے یہ ثابت ہوچکا کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز صدا اور آواز بازگشت ہے تو فقہ میں صدا کے احکام موجود ہیں۔

چنانچہ آیت سجدہ اگر صدا سے سنی جائے تو سامع پر سجدہ تلاوت واجب نہیں۔

تنویر الابصار میں ہے:

لا تجب بسماعه من الصداء ۔صدا سے آیت سجدہ سننے سے سجدہ تلاوت واجب نہیں ہوتا۔

(از شامی ص ۵۴۰ ۔ ج ۱)

مراقی الفلاح میں ہے: لا تجب بسماعها من الصداء وما هو يجيبك مثل صوتك فی الجبال والصحاری ونحوها۔ (طحطاوی ص ۲۸۱)

صدا سے اور اس سے جو بھی آواز لوٹا دے جیسے پہاڑوں اور جنگلوں میں تو ان سے آیت سجدہ سننے سے سجدہ تلاوت واجب نہیں ہوتا۔

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

فانه لا اجابة فی الصدی وانما هو محاكاة ۔ (طحطاوی ص ۲۸۱)

غنیۃ شرح منیہ میں ہے: ولو سمعها من الطائر او الصدی لا تجب لا نه محاكاة وليس بقرأة۔ (غنیۃ ص ۴۶۸)

اگر آیت سجدہ کو پرندے یا صدا سے سنا تو سجدہ تلاوت واجب نہیں اس لئے کہ یہ آواز حکایت ہے قرأت نہیں ہے۔

درالمنتقی میں ہے: لا تجب عليه لو سمعها من طائر او صدی ۔

(حاشیہ مجمع الانہر مصری ص ۱۵۶ ج ۱)

اگر آیت سجدہ کو پرندے یا صدا سے سنا تو سننے والے پر سجدہ تلاوت واجب نہیں۔

ان عبارات فقہاء سے ثابت ہوگیا کہ صدا کی آواز کو فقہاء نے معتبر نہ مانا اور اس سے سجدہ تلاوت واجب نہیں کیا۔ تو مقتدی کے حق میں لاؤڈ اسپیکر کی صدا کیسے معتبر و کافی قرار دی جاسکتی ہے۔

مقدمہ ثالثہ: نماز میں خشوع کا حاصل ہونا اشد ضروری ہے۔ طحطاوی میں ہے:

الخشوع حضور القلب وتسكين الجوارح والمحافظة على الاركان ۔

(طحطاوی ۲۰۱ ج ۱)

خشوع قلب کا حاضر رہنا اور جوارح کا ساکن ہونا اور ارکان صلوۃ کی حفاظت کرنا۔

شامی میں ہے:

مبنی الصلوۃ علی الخشوع والخشوع الذی ھو روح الصلوۃ۔

مراقی الفلاح میں ہے:

نماز کی بنیاد خشوع پر ہے، اور خشوع نماز کی روح ہے۔

خشوع کا لحاظ جب نماز میں اس قدر ضروری ہے کہ وہ روح نماز اور مبنی صلوۃ ہے تو کون نہیں جانتا ہے کہ امام پر لاؤڈ اسپیکر کی پابندی ضرور خشوع کی منافی ہے۔ مقررین کو اس کی پابندی کبھی ایسی مشغول کرلیتی ہے کہ انھیں اپنی تقریر پوری کرنے کیلئے کبھی اس کو سامنے سے ہٹانا پڑ جاتا ہے۔ تو امام پر اس کی پابندی کس قدر شاغل قلب اور نماز کے منافی ہوگی۔ تو اس لاؤڈ اسپیکر کا امام کے سامنے لگانا روح نماز اور مبنی صلوٰۃ کے خلاف ہے۔

مقدمہ رابعہ: جو چیز خشوع قلب کو زائل کرے وہ نماز میں مکروہ تحریمی ہے۔

بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک منقش چادر مین نماز ادا فرمائی اور اسکو بعد نماز واپس کردیا۔

قال النبی ﷺ کنت انظر الی علمها وانا فی الصلوۃ فاخاف ان یفتننی۔

(بخاری ص ۵۴ ج ۱)

عینی میں اس حدیث کے تحت میں فرماتے ہیں:

فیه طلب الخشوع فی الصلوۃ والاقبال علیها ونفی کل ما یشغل ویلهی عنه۔

(عینی ص ۲۵۹ ج ۲)

مراقی الفلاح میں ہے:

وتکره بحضرة کل ما یشغل البال کزینة وبحضرة مایخل بالخشوع۔

(طحطاوی ص ۲۰۱)

کبیری میں ہے:

فان کان اجنبیا من الصلوة لیس فیه تتمیم لها ولا فیه دفع ضرر فهو مکروه کاللعب بالثوب او البدن وکل ما یحصل بسببه شغل القلب ۔ (کبیری ص ۳۳۴)

ردالمحتار میں ہے:

منها الصلوة بحضرة ما یشغل البال ویخل بالخشوع ۔ (ردالمحتار ص ۴۵۹ ج ۱)

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ ہروہ چیز جس سے شغل قلب ہواور دل میں تشویش ہواور خشوع زائل ہووہ نماز میں مکروہ تحریمی ہے۔اس سے اجتناب واحتراز ضروری ہے۔لہذا لاؤڈ اسپیکر کے نماز میں لگانے سے ظاہر ہے کہ شغل قلب اور تشویش ہوگی اور خشوع زائل ہوگا۔تواس کا نماز میں لگانا کم از کم مکروہ تحریمی ہے اور منافی نماز ہے۔

مقدمہ خامسہ: ظاہر ہے کہ یہ لاؤڈ اسپیکر جب نماز میں امام کے سامنے لگایا گیا تو یہ نہ امام ہے نہ اس کا مقتدی کہ اس میں شرائط امام ومقتدی نہیں پائے جاتے۔تو یہ اجنبی ہوااور بقول استعمال کرنے والوں کے امام کی تکبیرات کا مقتدیوں تک پہونچانے والا واسطہ ہوا۔گویا وہ مقتدیوں کے حق میں مبلغ تکبیرات امام قرار پایا۔اور فقہائے کرام نے مبلغ کیلئے کچھ شرائط واحکام مقرر فرمائے ہیں۔

(۱) مسلم ہو۔(۲) مکلّف ہو۔(۳) پابند شرع ہو۔(۴) متصف بعبادت یعنی نمازی ہو۔ (۵) صاحب قصد وارادہ ہو۔(۶) اور وہ تبلیغ انتقالات بھی بقصد احرام کرتا ہو۔یہاں تک کہ اگر مبلغ نے بقصد احرام تبلیغ نہیں کی بلکہ محض تبلیغ کیلئے آواز پہونچائی تو نہ خود اسکی نماز صحیح نہ اسکی تبلیغ پر جولوگ انتقالات کرنے والے ہیں نہ انکی صحیح ہے۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے:

وکذالك المبلغ اذا قصد التبلیغ فقط خالیا عن قصد الاحرام فلا صلوة له ولا عن

بند ہو جانے کا خطرہ غالب ہے۔ علاوہ بریں اسکی تبلیغ مفسد صلاۃ بھی ہے تو ایک سنت قدیمہ اور سہل الحصول خالی از خطرات کو چھوڑ کر بلا ضرورت شرعی کے ایسی بدعت کو جو مشکل الحصول پر از خطرات کو اختیار کرنا بلکہ اس کو ترجیح دینا کونسی فقہ دانی ہے۔ کہ اس میں ترک سنت لازم آئے۔ بدعت کو رائج کیا جائے۔ لوگوں کو پریشانی میں بتلا کیا جائے۔ انکی نمازوں کو فاسد کیا جائے۔ لہذا شریعت بمقابلہ سنت قدیمہ اقامت مکبرین کے موجود ہوتے ہوئے اس بدعت استعمال لاؤڈ اسپیکر کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتی۔ تو لاؤڈ اسپیکر کو نماز میں ہرگز استعمال نہ کیا جائے۔

ان مقدمات پر غور کرنے کے بعد مسئلہ کا جواب واضح ہو گیا کہ نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ناجائز و بدعت ہے۔ اور جو لوگ اس کی آواز پر اقتدا کرتے ہیں ان کی نماز صحیح نہیں ہوتی بلکہ فاسد و باطل ہو جاتی ہے۔ اور اس کا نماز میں استعمال نماز کی بنیاد اور اس کی روحانیت کے خلاف اور منافی ہے۔

اب باقی رہا اذان کا حکم تو چونکہ اذان میں مقصود اعظم اعلام ہے۔

شامی میں ہے: ان الاصل فی مشروعیۃ الاذان الاعلام لدخول الوقت۔

تو جب اذان کی مشروعیت ہی اعلام کے لئے ہے اور اس لاؤڈ اسپیکر میں اعلام علی وجہ الکمال ہے لہذا جب اس میں کوئی محظور شرعی لازم نہیں آتا ہو اور ضرورت متقاضی ہو تو اس کا اذان میں استعمال جائز ہوا، اگر کوئی محظور شرعی لازم آئے تو اس کا استعمال نہ کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۰۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
نماز کے واسطے اگر دوھرا یعنی دو جانماز بچھائے تو نماز میں کوئی کراہیت نہ ہوگی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ نماز نہیں ہوتی ہے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم
دو جانمازوں کے بچھالینے سے کسی طرح کی کراہت پیدا نہیں ہوتی۔ اور جب کراہت ہی اس میں نہیں تو نماز کے نہ ہونے کا خطرہ ہی پیدا نہ ہوا۔ تو جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس سے نماز نہیں ہوتی انکا یہ حکم غلط ہے۔ یہ بیچارے مسائل دین سے ناواقف ہیں اسی بنا پر ایسی غلط بات کہہ رہے ہیں۔ واللہ تعالی اعلم،

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۱۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس بارے میں کہ
ایک امام صاحب ۴ رمضان المبارک نماز تراویح کے وتروں کی رکعت میں بغیر دعائے قنوت پڑھے رکوع میں جھک گئے۔ لیکن امام صاحب کو فوراً خیال آگیا۔ اور کھڑے ہو کر دعا قنوت پڑھ لی اور سجدہ سہو ادا کر لیا بعدہ سلام پھر دیا۔ سوال یہ ہے کہ وتر ہو گئے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم
صورت مسئولہ میں امام کو رکوع میں پہونچ جانے کے بعد قیام کی طرف نہ لوٹنا تھا وہ آخر میں سجدہ سہو کر لیتا تو ترک دعا قنوت کا نقصان پورا ہو جاتا وتر ادا ہو جاتے، لیکن جب امام غلطی سے قیام کی طرف لوٹ ہی گیا اور آخر میں اس نے سجدہ سہو بھی کر لیا تو وہ وتر بلاشک ادا ہو گئے۔ کہ سجدہ سہو کی غرض ہی اسی قسم کی غلطیوں کی اصلاح کرنا ہے۔ ردالمحتار میں ہے۔ لانہ لا صلاح مافات ای ماترك من الواجبات

فی محلہ ۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۱۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ

اکثر اشخاص مسجد کے دروں میں نماز پڑھتے ہیں ۔اور جمعہ کی نماز میں بالخصوص قلت جگہ کے باعث نماز کو کھڑے ہوجاتے ہیں ۔آیا امام جماعت کو ہی مسجد کے در میں نماز پڑھنا جائز ہے یا مقتدیوں کو بھی ۔یا مسجد کے دروں کی کتنی چوڑائی نماز پڑھنے کے لئے درکار ہے ۔اکثر دروں کی محراب نہیں ہوتی اس میں بھی ہر جامع مسجد میں اکثر دروں میں نماز پڑھتے ہیں ۔اس کی بابت شریعت کے کیا احکام ہیں؟۔

ح۔م۔اشرفی ۲۵؍اکتوبر

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بلاضرورت مسجد کے دروں میں نماز پڑھنا خلاف اولیٰ ومکروہ ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

﴿۲۵﴾

باب الجمعہ

مسئلہ (۴۱۲_۴۱۳_۴۱۴_۴۱۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ نماز جمعہ کے متعلق جو ذیل میں درج ہیں۔

جواب اس کا مع حوالہ کتب معتبرہ مرحمت فرمایا جائے۔

(۱) آیا نماز جمعہ کی ادائیگی میں خطبہ ہونا ضروری ہے یا واجب یا سنت موکدہ یا غیر مؤکدہ یا مستحب ہے؟۔

(۲) آیا نماز مذکور میں خطبہ نہ پڑھا جائے تو نماز کی ادائیگی میں کچھ فرق آئے گا یا نہیں؟۔

(۳) آیا خطبہ کا نماز جمعہ سے پہلے ہونا ضروری ہے یا بعد میں بھی ہوسکتا ہے اور پیش امام اور خطیب کا ایک ہونا ضروری ہے یا علیحدہ علیحدہ بھی ہوسکتے ہیں؟۔

(۴) جو نماز بکراہت تحریمی ادا ہوئی تو اس کا اعادہ ضروری ہے یا نہیں؟۔ بینوا توجروا۔

از بھوپال وکیل عدالت

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الكريم

(۱) خطبہ نماز جمعہ کے لئے فرض ہے۔ اسی لئے شرائط جمعہ میں اس کا شمار ہے۔

تنویر الابصار میں ہے۔ والرابع الخطبة ۔

یعنی چوتھی شرط صحت جمعہ کی خطبہ ہے۔ اور اس سے واضح تصریح درمختار میں ہے:

(وكفت تحميده و تهليله او تسبيحه للخطبة) المفروضة مع الكراهة۔

یعنی کافی ہے خطبہ فرض کے لئے ایک بار " الحمد لله يا لا اله الا الله يا سبحان الله" کہنا مگر انھیں الفاظ پر اکتفا کرنا مکروہ ہے باوجودیکہ فرضیت ادا ہوجائے گی۔ کیونکہ سنت یہ ہے کہ دو خطبے پڑھے جائیں۔ جیسے تنویر الابصار میں ہے: ويسن خطبتان بجلسة بينهما ۔

اور مسنون ہیں دو خطبے مع ایک جلسہ کے ان کے درمیان میں۔

لہذا نفس خطبہ جمعہ کے لئے فرض ہوا۔

(۲) جب خطبہ نماز جمعہ کی صحت کے لئے شرط ہے۔ جیسا کہ تنویر الابصار اور اس کی شرح میں ہے۔ و یشترط لصحتها سبعة اشياء۔ یعنی جمعہ کی صحت کے لئے سات چیزیں شرط ہیں اور منجملہ ان کے چوتھی شرط جمعہ کی خطبہ ہے۔ تو جمعہ بغیر خطبہ کے ہرگز نہ ہوگا۔ کیونکہ شرط کی نفی سے مشروط کی نفی ہوتی ہے۔ درمختار میں ہے: فلو خطب قبله و صلى فيه لم تصح۔

یعنی اگر کسی نے خطبہ وقت سے پہلے پڑھ لیا اور نماز وقت میں پڑھی تو جمعہ درست نہیں ہوگا۔ لہذا جمعہ کی صحت کے لئے خطبہ کا ہونا ضروری ہے۔

(۳) خطبہ قبل نماز ہی ہوگا۔ درمختار میں ہے: والخامس كونها قبلها لان شرط الشى سابق عليه۔

یعنی پانچویں شرط صحت جمعہ کی خطبہ کا نماز جمعہ سے پہلے ہونا ہے۔ اس لئے کہ شرط چیز کی اس سے پیشتر ہوا کرتی ہے۔ رہا پیش امام اور خطیب کا ایک ہونا تو یہ کوئی شرط نہیں ہے۔ اسی میں ہے:

لا يشترط اتحاد الامام والخطيب۔ یعنی خطبہ پڑھنے والے اور نماز پڑھانے والے کا ایک ہونا شرط نہیں ہے۔ علاوہ بریں علامہ تمرتاشی صاحب تنویر الابصار نے اس کی اور زیادہ تصریح فرمائی ہے:

لا ينبغي ان يصلى بالقوم غير الخطيب فان فعل بان خطب صبى باذن السلطان وصلى بالغ جاز۔

یعنی مناسب نہیں کہ سوائے خطبہ پڑھنے والے کے دوسرا شخص آدمیوں کو نماز پڑھائے۔ پس اگر ایسا کیا جائے کہ امام جدا ہو اور خطیب جدا اس طرح کہ خطبہ ایک نابالغ لڑکا سلطان کی اجازت سے پڑھے اور نماز کوئی بالغ پڑھائے تو جائز ہے۔ صاحب درمختار لفظ جائز کے بعد لکھتے ہیں: وهو المختار۔

یعنی یہی قول علماء کا اختیار کیا ہوا ہے۔ لہذا بنا بر مذہب مختار کے امام اور خطیب علیحدہ علیحدہ ہو سکتے ہیں اور ہرگز اس نماز میں کسی قسم کی کراہت یا خرابی نہیں ہوگی۔

(۴) شامی وغیرہ نے تصریح کردی ہے کہ جو نماز بکراہت تحریمی ادا کی گئی ہو اس کا اعادہ واجب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل ، الفقیر الی اللہ عز و جل ،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ

(۴۱۶) ازمحلّہ چمن سرائے سنبھل

نحمدہ ونصلی علی رسول الکریم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درمیان خطبے میں اردو نظم کا پڑھنا ممنوع ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

خطبہ غیر عربی میں پڑھنا خلاف سنت ہے، اب چاہے وہ اردو زبان میں ہو یا فارسی میں۔اب رہی نظم اس کو علمائے کرام خود زبان عربی میں بھی پسند نہیں کرتے۔ چہ جائیکہ کسی اور زبان میں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ

(۴۱۷) ازگوالیار۔ قاسم جی، جان جی صاحب

کیا فرماتے ہیں علمائے دین وحامیان شرع متین ان مسائل میں کہ

جو دونوں خطبہ کے درمیان علمائے سلف نے بروز جمعہ یا عیدین زبان اردو یا فارسی میں نظم اشعار وغیرہ پڑھنے کے لئے ترتیب وار لکھے ہیں اور لوگ پڑھتے آئے ہیں۔ اور اب بھی پڑھتے ہیں لیکن کہیں کہیں روک تھام ہونے کی وجہ سے زمانہ حال میں اختلاف ہو رہا ہے۔ کوئی خلاف سنت اور کوئی کچھ کہتا ہے۔ بالخصوص مولانا اشرفعلی تھانوی بہشتی زیور، حصہ یازدہم، ص ۶۵ رمیں تحریر فرماتے ہیں کہ "دونوں خطبوں کا عربی زبان میں ہونا اور کسی اور زبان میں پڑھنا یا اس کے ساتھ کسی اور زبان کے اشعار وغیرہ ملا دینا جیسا کہ ہمارے زمانہ میں بعض عوام کا دستور ہے خلاف سنت مؤکدہ اور مکروہ تحریمی ہے" کیا یہ ارشاد آپ کا ہی ہے اور اسی صفحہ میں وعظ اور نصیحت کا خطبہ میں ہونا مسنون فرماتے ہیں۔ تو کیا وعظ مروجہ زبان میں ہونا چاہئے یا عربی زبان میں؟ اگر مولوی صاحب کا یہ ارشاد بالا ٹھیک ہے تو خیال پیدا ہوتا ہے کہ مجموعات خطبات تصنیفات علمائے دین بڑے مفسرین زمانہ سابقہ کی ہوئی موجود ہے جس میں دونوں خطبوں کے درمیان نظم اردو ترتیب وار پڑھنے کے لئے لکھی ہوئی ہے تو کیا علمائے [illegible]

شریعت سے بے خبر تھے یا کہ انھوں نے غلطی کی ہے؟ اور اگر خلاف سنت تھا تو اسی وقت کیوں نہ روکا گیا؟ مکروہ تحریمی فعل حرام اور خلاف سنت مؤکدہ کا کرنے والا گنہگار ہوتا ہے تو کیا علمائے دین سابقین سب کے سب گنہگار اور سزاوار ہوئے؟ اور جواب بھی خطبوں میں اردو نظم پڑھتے ہیں مستوجب سزا کے ہوتے ہیں؟۔

اگر مولوی صاحب موصوف کا قول غلط ہے تو جو اس آپ کی تصنیف مثلاً حفظ الایمان، اصلاح الرسوم، تعلیم الدین وغیرہ پر اعتماد رکھے اور نظم پڑھنے سے روک دیوے اور اذان میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نام کو بوسہ نہ دیوے اور دوسروں سے فرض واجب کی دلیل طلب کرے اور قبر کی مٹی جو میت کو لحد میں رکھ کر ایصال ثواب کے لئے دی جاتی ہے روک دیوے۔ غرض کہ جتنے کام علمائے دین نے ایصال ثواب کے لئے مروجہ کئے ہوئے ہیں سب کی ممانعت کرے اور جدید طریقہ رائج کرے اور قدیم کو چھڑادے۔ تو ایسے شخص کا کیا مذہب ہے اور شریعت میں اس کا کیا حکم ہے اور اس کی امامت جائز ہے یا نہیں؟ اور جس جگہ زبان عربی کو کوئی نہ سمجھتا ہو خطیب تو درکنار سامعین اور مانعین بھی عربی کے مترجم نہ ہوں تو ایسے دیہات میں دونوں خطبہ عربی زبان میں پڑھ دینے سے خطبہ کی ایجاد کا مقصد ادا ہو سکتا ہے ، اور خطبہ میں نظم کا رواج کب سے ہوا ہے اور کیوں ہوا؟ اس کی ضرورت تھی جو علمائے دین نے رائج کی اور بہ نسبت حال زمانہ کے وہ زمانہ علم اور دیانت داری میں کیسا ہے؟ اور از روئے خبر اس زمانہ سے بہتر تھا یا نہیں؟ اور اس زمانہ کو اجماع امت مانا جائے گا یا نہیں؟ بینوا وتوجروا

حضرت جو کچھ بانکا ترچھا آیا واہی تباہی لکھ کر پیش خدمت عالیہ میں گذارش کر دیا ہے، آپ حضرات مقصد ضروریہ کو مدنظر رکھ کر فتاوی عنایت فرما کر مشکور فرمائیں گے۔ یہاں پر ایسا موقع ہے کہ اگر نظم کے جواز کا فتوی مل گیا تو وہابیہ کا اعتقاد سب غلط مانا جائے گا ورنہ برعکس۔ اس مناور کے گرد و نواح میں کیا دیہات کیا شہر چاروں طرف نظم پڑھی جاتی ہے اور یہاں بھی پڑھی جاتی ہے، لیکن چند ماہ سے نئی روشنی والوں کی سازش سے روک دی گئی ہے۔ لہٰذا فتوی کی ضرورت ہے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

احکام شرع دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ جن کو عقائد سے تعلق ہے اور ان کو اعتقادیات کہتے ہیں۔ اس میں جو شخص مخالفت کرے گا وہ گمراہ، بددین ہو جائے گا۔ دوسرے وہ ہیں جو عمل سے تعلق رکھتے

ہیں ان کو شرعیات کہا جاتا ہے۔ان کے اختلاف سے کفر یا گمراہی یا بد مذہبی پیدا نہیں ہوتی۔ وہابیہ سے جو ہمارا اختلاف ہے وہ عقائد کے اعتبار سے ہے۔ وہ سید عالم نور مجسم فخر بنی آدم نبی مکرم رسول معظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخیاں اور بے ادبیاں کرتے ہیں، چھاپتے ہیں، شائع کرتے ہیں، اور مسائل شرعیہ عملیہ میں یعنی حلت وحرمت میں اگر ان کا ہمارا کہیں اتفاق ہو جائے تو وہ اتفاق ہمارے لئے کوئی مضر نہیں ہے، ہم پر یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ان کی ہر بات میں خلاف کریں۔ چنانچہ اگر وہ نماز عصر میں چار رکعتیں بیان کرتے ہیں تو ہم ان کی مخالفت میں پانچ یا تین رکعتیں کہنے لگیں۔ یا وہ زنا کو حرام کہتے ہیں تو ہم ان کی مخالفت میں اس کو حلال کہنے لگیں۔

خلاصہ کلام کا یہ ہے کہ اس مسئلہ میں اگر وہ ہمارے موافق ہیں تو اس سے ان کے مذہب کی حقانیت ثابت نہیں ہوتی، نہ ان کو اس پر سنیوں سے کچھ کہنے کا حق ہے، اور نہ سنیوں کو خواہ مخواہ ان کی مخالفت کرنی روا ہے۔

اب اصل مسئلہ کے جواب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ مسائل شریعت کے دو طرح کے ہیں ۔ایک وہ ہیں کہ جن کی علت اور غرض تک ہماری عقل کو رسائی ہو جاتی ہے۔ مثلاً شراب کی حرمت اس وجہ سے ہے کہ اس میں نشہ ہے۔اب اس علت کی وجہ سے ہم ہر اس چیز کو حرام کہہ دیں گے جس میں نشہ ہو۔ دوسرے وہ کہ جن کی علت وغرض تک ہماری عقل کو رسائی نہیں ہوسکتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کی پشت میں پھوڑا ہے اور اس سے خون بہا اور اب شریعت اس کے لئے وضو کرنے کا حکم دیتی ہے۔اب یہ بالکل عقل کے خلاف ہے کہ خون تو کہیں سے نکلے اور دھونے کا حکم دوسرے حصہ کو دیا جائے۔ لہٰذا اس بارے میں تمام علماء یہی لکھتے ہیں کہ اس کو بے تکلف جیسا شریعت نے بیان فرمایا ہے ہم تسلیم کرلیں گے۔ اپنی عقل سے اس میں تبدیلی اور تغیر ہر گز نہ کرسکیں گے۔ بالجملہ خطبہ کا عربی میں پڑھا جانا حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ سے آج تک برابر ہر ملک اور ہر اقلیم میں جاری ہے۔ باوجود کہ دور صحابہ میں عرب کے علاوہ عجمیوں میں جمعے قائم کردیئے اور وہ عربی ہی پڑھے جاتے تھے باوجودیکہ وہ لوگ عربی زبان نہیں جانتے تھے۔ لیکن اس وقت یہ سوال نہیں اٹھا کہ خطبہ میں ہر ملک کی زبان شامل کردی جائے، نہ پہلے ائمہ نے اس ضرورت کو محسوس کیا، نہ اور ہر صدی کے علماء نے اس کی اہمیت محسوس کی۔ آج چند برس سے کوتاہ اندیشوں اور سادہ لوحوں نے بغیر کسی عالم کے فتوے کے خود بخود اپنی طرف سے اردو، فارسی کے اشعار عربی خطبہ میں شامل کردیئے ہیں اور اس وقت ہر جگہ سے یہی سوالات آرہے ہیں کہ خطبہ بالکل اردو میں

ہونا چاہئے اور حقیقت یہ ہے کہ خطبہ میں اردو یا فارسی زبان کو عربی میں شامل کرنا خلاف سنت متوارثہ ہے

چنانچہ حاشیہ شرح وقایہ میں ہے۔

لا شك ان قرأة الخطبة بغير العربية خلاف السنة المتوارثه من النبی صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم والصحابة رضوان اللّٰہ تعالیٰ علیھم اجمعین فیکون مکروھا تحریما و کذا قراة اشعار الفارسیة والھندیة فیھا ۔

یعنی بیشک خطبہ میں عربی کا پڑھنا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی سنت کے خلاف ہے۔ پس مکروہ تحریمی ہوا اور ایسے ہی خطبہ میں فارسی اور ہندی کے اشعار کا پڑھنا۔

علاوہ بریں اس کے جواز کی اجازت دینے میں جو آئندہ نقصانات ہیں ان کا لحاظ رکھنا علماء کے لئے بہت ضروری ہے۔ عوام کو ان پر کیونکہ اطلاع نہیں ہے اس لئے وہ خواہ مخواہ اس مسئلہ کے لئے جبر کرتے ہیں۔ ہاں خطبہ کے مضمون کو بطریقہ وعظ بعد نماز جمعہ یا خطبے سے پہلے بیان کرنے کی اجازت ہے۔ اگر اس کی کافی تحقیقات دیکھنی ہو تو سنی کتب خانہ سے رسالہ ''السنیة السنیة فی کون الخطبة بالعربیه'' منگا کر ملاحظہ کیجئے۔

اور ان تھانوی صاحب پر علمائے عرب وہند نے اسی ''حفظ الایمان'' وغیر کی عبارتوں پر کفر کے فتوے دیئے ہیں۔ لہٰذا ان کی کتابیں، ان کے مسائل، ان کے فتوے، ہرگز قابل عمل نہیں۔ خود ان کے پیچھے یا باوجود ان کی کتابوں پر مطلع ہونے کے جو ان کو صحیح عقیدہ پر جانے اس کی اقتدا کرنا اور اس کو امام بنانا ہرگز ہرگز جائز نہیں۔ اور نام اقدس پر اذان میں انگوٹھے چومنا۔ یا قبر میں قل کئے ڈھیلے رکھنا۔ یا ایصال ثواب کے کام کرنا بالکل جائز ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۱۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی شخص کسی موقع پر کسی ذکر خیر یا کہیں مجمع میں کوئی بات بیان کرے تو اس وقت از روئے نصیحت کہ ہاتھ کے اشارہ سے سمجھانا اور بتلانا جائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

وعظ یا خطبہ کی حالت میں فقط شہادت کی انگلی کے ساتھ اشارہ تو خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے چنانچہ مشکوۃ شریف میں بروایت مسلم شریف یہ حدیث مروی ہے

عن عمارة ابن زويب انه رای بشير ابن مروان علی المنبر رافعا يديه فقال قبح الله هاتين العبدين لقد رأيت رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم ما يزيد على ان يقال بيده هكذا او اشار باصبعه المسبحة۔

یعنی حضرت عمارہ ابن زویب سے مروی ہے کہ انہوں نے بشیر ابن مروان کو منبر پر ہاتھ اٹھائے ہوئے دیکھ کر کہا: اللہ تعالیٰ ان دونوں ہاتھوں کو ہلاک کرے، میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ نہیں زیادہ فرماتے کچھ فرماتے وقت مگر اپنے ہاتھ کے ساتھ اس طرح۔ پھر انہیں حضرت عمارہ نے اپنی انگشت شہادت کے ساتھ اشارہ کر کے دکھایا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۱۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

امام نے خطبہ پڑھا اور جب پڑھ چکا دوسرے شخص سے کہا آپ نماز پڑھائیے۔ اس شخص نے کہا خطبہ دوبارہ پڑھوں گا ورنہ نماز نہیں ہوگی، امام نے کہا کہ اگر دوبارہ پڑھوں گا تو گنہگار ہونگا ان دو میں کون صحیح پر ہے؟۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

امام اور خطبہ پڑھنے والے کا ایک ہونا ضروری نہیں۔ چنانچہ درمختار میں ہے:

لا يشرط اتحاد الامام والخطيب۔

طحاوی میں قنیہ سے ناقل ہیں: اتحاد الخطيب والامام ليس بشرط على المختار نهر

لہٰذا صورت مسئولہ میں دوبارہ خطبہ پڑھنے کی ضرورت نہیں پہلا خطبہ کافی ہے۔

مسئلہ (۴۲۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ امام جمعہ کے دن خطبہ پڑھ کر پہلے نماز کے یعنی خطبہ اور نماز کے درمیان میں بات چیت کر سکتا ہے یا نہیں بینوا توجروا

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

خطبہ اور نماز کے درمیان دنیوی کلام کرنا مکروہ ہے۔ چنانچہ جوہرہ نیرہ میں ہے:

اما المتعلق بامور الدنیا مکروه اجماعا وهکذا کله قبل الخطبة او بعدها

اور اسی طرح درمختار اور سراج اور بحر اور عنایہ اور نہایہ وغیرہا میں ہے۔ اب رہا کلام وافر تو اس میں بھی امام صاحب کا یہی مسلک ہے کما ھو عامة الکتب ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۲۱_۴۲۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) سنت اخر ظہر کے پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ مولوی اشرفعلی صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اخیر الظہر پڑھنا جائز نہیں۔ اور بہت کہتے ہیں کہ گاؤں میں پڑھنا چاہئے شہر میں نہیں، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مثل نفل کے ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مثل واجب کے ہے، ان میں کس کا قول صحیح ہے؟ اس مسئلہ میں بہت اختلاف ہو رہا ہے اب عرض یہ ہے کہ اس مسئلہ کی پوری تحقیق کر دی جائے اور ساتھ ہی ساتھ دلیلیں بھی نقل کر دیں جائیں اور ترجمہ اردو میں ہو۔

(۲) عیدگاہ میں جمعہ کی نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر عیدگاہ سے ایک سو (۱۰۰) ہاتھ پر مسجد بھی ہو جب کہ سال گذشتہ عید الفطر جمعہ کے دن ہوئی اور اسی جگہ چار مسجد کے لوگ عیدگاہ میں جمع ہوئے اور چاروں مسجدیں عیدگاہ سے قریب ہیں کوئی ایک سو (۱۰۰) ہاتھ فاصلہ پر، کوئی تین سو ہاتھ فاصلہ پر، کوئی پانسو ہاتھ فاصلہ پر، اس صورت میں جمعہ کی نماز عیدگاہ میں پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟۔ بینوا توجروا

العبد المذنب عبد الکریم خاں ضلع ہوشنگ ملک بنگال

الجواب

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

(۱) اقول وباللہ التوفیق۔ ایسی آبادی جس میں چند محلے ہوں اور بازار بھی ہوں اور اس میں کوئی ایسا باختیار حاکم بھی ہو کہ مظلوم کا ظالم سے انصاف لینے پر قدرت رکھتا ہو اور جس کے متعلق کچھ دیہات بھی ہوں، اس کو بنا بر قول صحیح کے مصر کہتے ہیں۔ اور ہمارے عرف کی بنا پر وہ آبادی ضلع تحصیل یا پرگنہ کہلاتی ہے۔

چنانچہ غنیہ میں ہے:

صرح بہ فی تحفة الفقهاء عن ابی حنیفة انه بلدة كبيرة فيها سكك واسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم بحشمه وعلمه اوعلم غيره جمع الناس اليه فيما يقع من الحوادث وهذاهو الاصح۔

تحفۃ الفقہاء میں امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے تصریح ہے کہ مصر وہ بڑی آبادی ہے جس میں متعدد محلے اور بازار ہوں اور اس کے متعلق دیہات ہوں اور اس میں شہر کا حاکم ہو اپنی شوکت اور اپنے یا دوسرے کے علم کے ذریعہ سے مظلوم کا انصاف ظالم سے لینے پر قادر ہو، لوگ اس کے یہاں نالش میں رجوع کرتے ہوں اور یہی تعریف سب سے زیادہ صحیح ہے اور اسی تعریف کو بحر الرائق اور بدائع اور عینی شرح کنز الدقائق وغیرہ کتب فقہ نے اصح قول قرار دیا ہے۔ اور قریہ جات یعنی ان آبادیوں میں جہاں یہ مصر کی تعریف بالیقین صادق نہیں آتی وہاں جمعہ پڑھنے سے ظہر کی فرضیت ذمہ ہی باقی رہتی ہے۔

چنانچہ عینی اور بحر الرائق میں ہے:

شرط صحتها ان تودى فى مصر حتى لاتصح فى قرية ولا مفازة لقول على رضى الله تعالىٰ عنه: لا جمعة ولاتشريق ولا صلوة فطر ولا اضحى الا فى مصر جامع او فى مدينة عظيمة رواه ابن حبان وابن ابى شيبه وصححه ابن جزم وكفى بقوله قدوة واماما۔

غنیۃ شرح منیہ میں ہے:

الشرط الاول المصر اوفناء ه فلاتجوز فى القرىٰ عندنا وهو مذهب على ابن ابى طالب وحذيفه وعطاء والحسن ابن ابى الحسن والنخعى ومجاهد وابن سيرين والثورى وسحنون۔

خلاصہ ان دونوں عبارتوں کا یہ ہے کہ صحت ادائے جمعہ کی پہلی شرط اس آبادی کا مصر یا فناء مصر ہونا یہاں تک کہ ہمارے نزدیک گاؤں اور جنگل میں جمعہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ حضرت مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے مروی ہے کہ جمعہ اور تشریق اور عید الفطر اور عید اضحیٰ سوائے مصر جامع اور بڑی آبادی کے ادا نہیں ہوتے۔ اس کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا، اور ابن حزم نے تصحیح فرمائی۔ اور یہی حضرت علی اور حذیفہ اور عطا اور حسن ابن ابی الحسن اور نخعی اور مجاہد اور ابن سیرین اور ثوری اور سحنون رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مذہب ہے۔

لہذا جب کسی آبادی پر مصر کی تعریف صادق آئے اور دیگر شرائط جمعہ بھی پائے جائیں تو وہاں ہمارے ذمہ سے یقیناً حتماً جزماً فرض وقت یعنی نماز ظہر کی فرضیت ساقط ہو جائے گی۔ اب رہا چار رکعت آخر الظہر کا اس کے متعلق میرے خیال میں اقوال فقہاء کو جمع کر کے ان میں تطبیق کی جائے تو چار حکم کتب فقہ سے معلوم ہوتے ہیں۔

حکم اول: جس آبادی پر مصر کی تعریف مذکور صادق آئے اس میں کسی قسم کا تردد اور شک نہیں ہے بلکہ اس کا مصر ہونا یقینی ہے اور اس میں جمعہ کی جماعت صرف ایک جگہ ہوتی ہے تو وہاں آخر الظہر پڑھنے کی حاجت نہیں۔

چنانچہ بحر میں ہے: وقد افتيت مرارا بعدم صلوة الاربع بعدها بنية اخر الظهر خوف اعتقاد عدم فرضية الجمعة وهو الاحتياط فی زماننا۔

میں نے چند مرتبہ جمعہ کے بعد بنیت آخر ظہر چار رکعت نہ پڑھنے کو بخوف اس بات کے فتویٰ دیا کہ عوام جمعہ کے فرض نہ ہونے کا کہیں اعتقاد نہ کرلیں اور یہی ہمارے زمانہ میں احتیاط ہے۔

اور حاشیہ بحر میں ہے: واما فی البلاد فلاشك فی الجواز ولاتعاد الفرضية۔

لیکن شہروں میں پس جواز جمعہ میں کوئی شک ہی نہیں اور ظہر کا اعادہ نہ کیا جائے گا۔

حکم دوم: جس آبادی کا بنا بر تعریف مذکور کے مصر ہونا تو یقینی ہے لیکن اس شہر میں جمعہ چند مساجد میں ہوتا ہے تو وہاں آخر الظہر کا پڑھنا ایسے خواص کے لئے ہے جن کو فرض جمعہ ادا ہونے میں شک نہ ہو اور اختلاف علما سے پرہیز کرنا بنظر تقویٰ ہو، اور شبہات سے بچنا بلحاظ اپنی حفاظت دین کے لئے ہو، اور جن عوام کو آخر الظہر پڑھنے میں جمعہ کے ادا ہونے میں شک اور تردد ہونے لگے وہ اس آخر ظہر کو نہ پڑھیں۔ چنانچہ شامی نے بحر کے اس قول: انه لااحتياط فی فعلها لانه العمل باقوی الدليلين۔

کے جواب میں فرمایا:

اقول وفیه نظر بل هو الاحتیاط بمعنی الخروج عن العهدة بیقین لان جواز التعدد وان کان ارجح واقوی دلیلا لکن مبنیة علی شبهة قویة لان خلافه مروی عن ابی حنیفة ایضا واختار الطحاوی والتمرتاشی وصاحب در المختار وجعله العتابی الاظهر وهو مذهب الشافعی والمشهور عن مالك واحدی الروایتین عن احمد کما ذکره المقدسی فی رسالته نورالشمعة فی ظهر الجمعة بل قال السبکی من الشافعیة انه قول اکثر العلماء ولایحفظ عن صحابی ولا تابعی تجویزتعددها الخ وقد علمت قول البدائع انه ظاهر الروایة وفی شرح المنیة عن جوامع الفقه انه اظهر الروایتین عن الامام قال فی النهروفی الحادی القدسی وعلیه الفتوی وفی التکملة للرازی وبه ناخذ اھ فهو حینئذ قول معتمد فی المذهب لاقول ضعیف ولذا قال فی شرح المنیة الاولیٰ هو الاحتیاط۔ لان الخلاف فی جواز التعدد وعدمه قوی وکون الصحیح الجواز للضرورة للفتوی لایمنع شرعیة الاحتیاط للتقوی الخ۔ قلت علی انه لو سلم ضعفه فالخروج عن خلافه اولیٰ فکیف مع خلاف هولاء الائمة وفی الحدیث المتفق علیه فمن اتقی الشبهات استبرأ لدینه وعرضه۔

میں نے آخر ظہر نہ پڑھنے کو احتیاط اس لئے کہا کہ آخر ظہر کی اجازت جواز تعدد جمعہ کے ضعف پر مبنی تھی اور باوجود یکہ جواز تعدد جمعہ اقوی وارجح دلیل سے ثابت ہے، تواب آخر ظہر نہ پڑھنے میں احتیاط ہوئی۔ تواس۔ کے جواب میں علامہ شامی فرماتے ہیں: مجھے اس میں اعتراض ہے بلکہ احتیاط اس میں ہے کہ آخر ظہر کو پڑھنے میں یقین کے ساتھ ذمہ سے نکل جاتا ہے کہ جواز تعدد جمعہ کا قول بھی امام صاحب سے مروی ہے اور اس کو طحاوی اور تمرتاشی اور صاحب درمختار نے مختار کہا اور عتابی نے اس کو ظاہر تر قول قرار دیا اور یہی مذہب امام شافعی کا اور امام مالک کا مشہور مذہب اور ایک قول امام احمد کا ہے۔ جیسا کہ اس کو مقدسی نے اپنے رسالہ ''نور الشمعۃ فی ظہر الجمعۃ'' میں ذکر کیا۔ بلکہ امام سبکی نے فرمایا کہ اکثر علمائے شافعیہ کا یہی قول ہے اور تعدد جمعہ کی تجویز نہ کسی صحابی سے اور نہ کسی تابعی سے روایۃ محفوظ ہے۔ اور میں نے بدائع کے قول سے جانا کہ یہی ظاہر الروایت کا قول ہے اور شرح منیہ میں جوامع الفقہ سے ناقل ہیں کہ دونوں روایتوں میں یہ (ط) کی ظاہر روایت ہے اور نہر میں کہا کہ حاوی قدسی نے اسی پر فتوی دیا اور تکملہ میں رازی نے کہا کہ ہم اسی کو اخذ کرتے ہیں۔ لہذا اب عدم جواز تعدد کا قول مذہب میں معتمد ہوا۔

کہ ضعیف۔ اسی لئے تو شرح منیہ مین کہا کہ اولیٰ یہ ہی ہے کہ احتیاطا آخر ظہر پڑھی جائے اس لئے کہ جواز تعدد اور عدم جواز دونوں قوی ہیں اور جواز تعدد جمعہ کی صحت پر بضرورت فتوی ہے تو یہ بنظر فتوی ظہر احتیاطی آخر ظہر کی مشروعیت کو کیسے مانع ہوگی۔ کہ اگر عدم جواز تعدد کے قول کو ضعیف بھی تسلیم کرلیا جائے جب بھی اس خلاف سے نکلنا (یعنی اخر ظہر پڑھنا) اولیٰ ہے اور خاص کر ایسے ائمہ کا خلاف ہو۔ حدیث متفق علیہ میں ہے کہ جو شبہات سے بچا اس نے اپنے دین کو اور آبرو کو بچالیا۔

پھر یہی علامہ شامی قنیہ سے ناقل ہیں:

لما ابتلی اهل مرو باقامة الجمعتين فيها مع اختلاف العلماء فی جوازها امرائمتهم بالاربع بعدها حتما احتياطا۔

یعنی جب مرو کے رہنے والے اس میں دو جمعہ قائم کرنے میں مبتلا ہوئے باوجودیکہ اس کے جواز میں علما کا اختلاف تھا تو ان پیشواؤں نے احتیاطا لازمی طور پر ان کو بعد جمعہ چار رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا۔

اور اسی میں ظہیریہ سے ناقل ہیں:

واکثر مشائخ بخاری علیه ليخرج عن العهدة۔

یعنی اکثر بخارا کے مشائخ اسی پر ہیں کہ اخر ظہر پڑھنے میں یقین کے ساتھ ذمہ سے نکلنا پایا جاتا ہے۔

اور اسی میں فتح سے ناقل ہیں۔

فائدة الخروج عن الخلاف المتوهم او المحقق وان كان الصحيح صحة التعدد فهی نفع بلاضرر۔

یعنی آخر ظہر پڑھنے سے یہ فائدہ ہے کہ متحقق یا وہمی خلاف سے نکلنا ہے اگرچہ تعدد جمعہ کی صحت کا قول صحیح ہے۔ تو آخر ظہر پڑھنے میں نفع بلاضرر ہے۔

اور اس میں نہر سے ناقل ہیں۔

انه لا ينبغی التردد فی ندبها علی القول بجواز التعدد خروجا عن الخلاف۔

یعنی جواز تعدد کے اقوال پر آخر ظہر کے مستحب ہونے میں شک کرنا ہی مناسب نہیں ہے کہ اس میں خلاف سے نکل جانا پایا جاتا ہے۔

اور شرح باقانی میں اسی کو مفتی بہ قول قرار دیا ہے۔ لہذا ان عبارتوں سے نہایت واضح طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ جس شہر میں متعدد جگہ جمعہ کی جماعت ہوتی ہو تو وہاں پر احتیاطا آخر ظہر پڑھنا بہتر و اولیٰ ہے۔ ہاں اگر آخر ظہر کے التزام میں عوام کے لئے کوئی ایسا مفسدہ ہو جیسا علامہ طحطاوی نے لکھا:

هو اعتقاد ان الجمعة ليست فرضا لما يشاهدون من صلاة الظهر فيتكاسلون عن اداء الجمعة او اعتقادهم افتراض الجمعة والظهر بعدها۔

یعنی جب وہ نماز ظہر کا مشاہدہ کرینگے تو اس کا اعتقاد کرینگے کہ جمعہ فرض ہی نہیں ہے اور پھر وہ جمعہ کے ادا کرنے میں سستی کرینگے یا ان کا یہ اعتقاد کہ جمعہ فرض ہے اور اس کے بعد ظہر فرض ہے ہو جائے گا تو ایسے عوام کو آخر ظہر کا حکم نہ دیا جائے گا۔

چنانچہ یہی علامہ طحطاوی فرماتے ہیں:

نحن لانقول به ولا نفتي بفعلها اصلا بل ندل عليه الخواص الذين يحتاطون لامر دينهم ويتركون مايريبهم الى تحصيل يقينهم۔

یعنی ہم آخر ظہر کا عام فتوی نہیں دیتے ہیں بلکہ ہم ایسے خواص کو اجازت دیتے ہیں جو اپنے امور دینی میں احتیاط کرتے ہیں اور حصول یقین کے لئے شک میں ڈالنے والی چیزوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔

اور علامہ شامی فرماتے ہیں:

ان ادى الى مفسدة لاتفعل جهارا والكلام عند عدمها ولذا قال القدسي نحن لانامر بذلك امثال هذا العوام بل ندل فيه الخواص ولو بالنسبة اليهم۔

یعنی اگر آخر ظہر کا پڑھنا کسی فساد تک پہونچے تو اس کو علی الاعلان نہ پڑھا جائے اور گفتگو تو اس صورت میں ہے جب کسی فساد کا اندیشہ نہ ہو۔ اسی وجہ سے مقدسی نے فرمایا کہ ہم ایسے عوام کو حکم نہیں دیتے بلکہ خواص کو بتائینگے اگر چہ وہ باعتبار ان کے خواص ہوں۔

درمختار میں ہے: واما من لا يخاف عليه مفسدة منها فالاولىٰ ان تكون فى بيته خفيةً۔

یعنی اور وہ شخص جس پر فساد کا اندیشہ نہیں ہے تو اس کے لئے اولیٰ یہ ہے کہ وہ اپنے گھر میں چھپ کر پڑھے۔

اور یہی مضمون مراقی الفلاح میں ہے:

وبفعل الاربع مفسدة اعتقاد الجهلة عدم فرض الجمعة او تعدد المفروض فى

وقتها ولایفتی بالاربع الا للخواص ویکون فعلهم ایاها فی منازلهم۔

یعنی آخر ظہر پڑھنے میں عوام کو جمعہ کے فرض نہ ہونے یا ایک وقت میں چند فرض کا اعتقاد ہوجائے تو ان کا حکم صرف خواص کو دیا جائے گا اور وہ بھی اس کو اپنے گھروں میں پڑھیں۔

اور یہی علامہ مقدسی سے نقل ہیں:

نقول انما نهی عنها اذا ادیت بعد الجمعة بوصف الجماعة والاشتهار۔

یعنی ہم نے جو بعد جمعہ آخر ظہر ادا کرنے کی عوام کو ممانعت کی وہ جب ہے کہ اس کو علی الاعلان جماعت کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

بالجملہ اب حکم دوم بھی فقہاء کی بہت سی تصریحات سے ثابت ہو چکا۔ لہذا اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حکم سوم: وہ آبادی جس کے مصر ہونے میں بنا بر تعریف مذکور کے شک وتردد ہو تو وہاں آخر ظہر کا پڑھنا سب کے لئے واجب ہے۔

چنانچہ عالمگیری میں ہے:

ثم فی کل وقع الشك فی جواز الجمعة لوقوع الشك فی المصر او غیره اقام اهله الجمعة ینبغی ان یصلوا بعدالجمعة اربع رکعات وینوؤا بها الظهر حتی لولم تقع الجمعة موقعها یخرج عن عهدة فرض الوقت بیقین۔

یعنی ہر وہ جگہ جس میں جمعہ ادا ہونے میں اس وجہ سے شک واقع ہوا کہ اس کے خود مصر اور غیر مصر ہونے میں شک ہے اور وہاں کے رہنے والوں نے جمعہ قائم کرلیا تو انہیں چاہئے کہ وہ بعد جمعہ چار رکعتیں بنیت ظہر پڑھیں یہاں تک کہ اگر جمعہ سے اپنے وقت کا فریضہ ادا نہیں ہوا تو وہ اس کے پڑھنے سے یقین کے ساتھ فرض وقت کے ذمہ سے نکل جائے گا۔

اور یہی کافی اور محیط اور شامی اور غنیۃ اور فتاوی حجہ میں اور بحر میں ہے:

واذا اشتبه علی الانسان ذلك (المصر) فینبغی ان یصلی اربعا بعد الجمعة وینوی بها آخر فرض ادرکت وقته ولم أده بعد فان لم تصح الجمعة وقعت ظهره وان صحت کانت نقلا۔

یعنی جب کسی شخص پر کسی جگہ کا مصر ہونا مشتبہ ہوا سے چاہیئے کہ جمعہ کے بعد چار رکعت بنیت آخر

فرض ظہر کے ادا یوں کہے کہ میں نے اس کا وقت پایا اور اب تک ادا نہیں کیا تھا۔ لہذا اگر اس کا جمعہ صحیح نہیں ہوا تو اس کی ظہر ادا ہو جائے گی اور اگر جمعہ صحیح ہو گیا تو یہ نفل ہو جائے گی۔

اور غنیۃ میں فتاوی حجہ سے ناقل ہیں کہ:

والاحتیاط فی القریٰ (الکبیرۃ) ان یصلی السنة اربعا ثم الجمعة ثم ینوی سنة الجمعة اربعا ثم یصلی الظهر ثم رکعتین سنة الوقت هذا هو الصحیح المختار فان صحت الجمعة فقد ادی سنتها علی وجهها والا فقد صلی الظهر مع سنة۔

یعنی اور بڑے گاؤں (یعنی جس کے مصر ہونے میں شک ہو) میں یہ ہے کہ پہلے چار رکعت سنت پڑھے پھر جمعہ پھر چار رکعت سنت جمعہ کی نیت کرے پھر ظہر پڑھے اور دو رکعتیں سنت وقت کی پڑھے، یہی صحیح مختار ہے۔ تو اگر جمعہ صحیح ہوگا تو اس نے سنت کو اس کے طریقہ پر ادا کیا، ورنہ اس نے ظہر تو مع اس کی سنت کے پڑھا۔ اب باقی رہی یہ بات کہ آیا اس صورت میں آخر ظہر کا پڑھنا واجب ہے یا مستحب تو۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

قال المقدسی ذکر الشحنة عن جده التصریح اما عند قیام الشك والاشتباه فی صحة الجمعة فالظاهر الوجوب ونقل عن شیخه ابن الهمام مایفیده۔

یعنی مقدسی نے کہا کہ ابن شحنہ نے اپنے دادا سے اس تصریح کو ذکر کیا کہ جب صحت جمعہ میں کوئی اشتباہ یا شک قائم ہو پس ظاہر وجوب ہوا۔ اور جو ان کے شیخ ابن ہمام سے منقول ہے وہ اسی کا افادہ کرتا ہے۔ اور تمرتاشی اور قنیہ کی تفصیل بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔

بالجملہ ایسی آبادی جس کے شہر ہونے میں شک اور تردد ہو جیسے بڑے بڑے گاؤں ان میں بعد جمعہ عوام وخواص ہر ایک کو آخر الظہر کیا خود ظہر پڑھنا ضروری ہے اور لازمی ہے۔

حکم چہارم: جو آبادی ایسی ہے کہ اس پر تعریف مصر کا کسی طرح صدق نہیں ہوتا جیسے گاؤں دیہات جس میں مصر ہونے کا شک تو کیا وہم بھی نہیں ہے۔ لہذا ایسے دیہات میں یقیناً جمعہ ادا نہیں ہوتا جیسا کہ ابتدا میں بحر الرائق اور غنیہ کی عبارتوں سے ظاہر ہو چکا کہ فرض وقت یعنی ظہر ان کے ذمہ باقی رہتا ہے۔ لہذا ان کو ظہر کا پڑھنا فرض ہے۔

چنانچہ علامہ شامی جواہر سے ناقل ہیں: لو صلوا فی القری لزم اداء الظهر۔

یعنی اگر دیہات والے دیہات میں جمعہ کی نماز پڑھیں تو ان کو ظہر ادا کرنا ضروری ہے۔

بلکہ عالمگیری اور فتاوی قاضی خان میں تو یہ عبارت ہے۔

ومن لا یجب علیهم الجمعة من اهل القری او البوادی لهم ان یصلوا الظهر بجماعة یوم الجمعة باذان و اقامة۔

یعنی جولوگ ایسے ہیں جن پر جمعہ واجب نہیں جیسے گاؤں اور جنگل کے رہنے والے ان کو چاہئے کہ جمعہ کے دن ظہر کی نماز اذان واقامت کے ساتھ پڑھیں۔

ہاں جن دیہات میں نماز جمعہ عوام پڑھتے ہوں تو وہاں جمعہ تو ادا نہیں ہوتا لیکن بلحاظ دیگر مصالح دینی کے ان کو منع نہ کیا جائے اتباعا لحدیث ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

و کفی بقوله قدوة و اماما۔

کہ آخر نام الٰہی لیتے ہیں اور اس کے بعد ظہر کا ضرور حکم دیا جائے گا کہ ان کے لئے فرض وقت ظہر ہے اور اس جمعہ سے ظہر کی فرضیت ذمہ سے ساقط نہیں ہوئی۔ لہذا ظہر کا پڑھنا سب پر فرض ہے۔

الحاصل آخر ظہر کا جس نے مطلقا ہر جگہ ایک حکم دیا ہے اس کی نہایت نادانی اور اس کو اقوال فقہاء پر اطلاع نہیں ہے۔ ہماری اس تفصیل سے مسئلہ کہ ہر پہلو پر متعدد طریقہ پر روشنی پڑگئی اور ہر جگہ کے لئے علیحدہ حکم معلوم ہوگیا۔ اگر مزید تفصیل درکار ہو تو آئندہ کسی فرصت کے وقت روانہ کیجا سکتی ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ منصف کے لئے یہی کافی ووافی اور معاند کے لئے دفاتر بھی ناکافی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) عیدگاہ میں نماز جمعہ جائز ہے۔ اس لئے کہ جب نماز عید اس میں صحیح ہے تو نماز جمعہ بھی اس میں ادا ہو جائے گی۔

چنانچہ علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

کماان المصر وفناء ہ شرط جواز الجمعة فهو شرط جواز صلوة العيد۔

یعنی جیسے کے مصر یا فناء مصر جواز جمعہ کی شرط ہے ایسے ہی جواز نماز عید کی شرط ہے۔

اور مراقی الفلاح میں ہے:

(ويشترط لصحتها) ای صلوة الجمعة (ستة اشياء) الاول المصر اوفناء ہ سواء مصلی العيدا وغيره لانه بمنزلة المصر فی حوائج اهله ۔

یعنی نماز جمعہ کی صحت کی چھ (۶) شرطیں ہیں۔ پہلی چیز مصر ہونا یا فناء مصر ہونا۔ اب چاہے وہ عیدگاہ ہو یا علاوہ اس کے اور جگہ کہ یہ اہل شہر کے حوائج کے اعتبار سے بمنزلہ مصر کے ہے۔ اور عینی شرح

کنز الدقائق۔او مصلاہ۔کے تحت میں لکھتے ہیں۔

عطف علی المصر او مصلی المصر مثل مصلی العید۔

یعنی اداء جمعہ کی ایک شرط مصر ہے یا اس کی عیدگاہ۔

اورغنیہ میں ہے:والمسجد الجامع لیس بشرط ولهذا اجمعوا علی جوازها بالمصلی۔

یعنی نماز جمعہ کے لئے جامع مسجد ہونا ہی شرط نہیں ہے۔اسی لئے تو فقہا نے جمعہ کی نماز عیدگاہ میں جائز ہونے پر اجماع کیا ہے۔

بالجملہ اس مسئلہ میں فقہا کی تصریحات تو بہت زیادہ کتب میں موجود ہیں لیکن منصف کے لئے یہی بہت کافی ووافی ہے۔اب باقی رہا چند مساجد کا اس کے قرب میں ہونا یہ عیدگاہ میں جواز جمعہ کے لئے مانع نہیں جیسا کہ ابھی غنیہ کی عبارت سے ثابت ہو چکا بلکہ میرے خیال میں اگر کوئی مانع شرعی نہ ہو تو ان چار مسجدوں میں علیحدہ علیحدہ محلّہ میں جمعہ ہونے سے بھی زیادہ بہتر ہے کہ ان چار مسجدوں کے نمازی ایک جگہ جمع ہو کر جمعہ ادا کریں کہ اس میں تعدد جمعہ کی بحث سے ایک گونہ احتیاط لازم ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۲۳)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک شخص نے نماز جمعہ پڑھائی اور ہر دو رکعت میں رکوع سے اٹھ کر زیادہ قیام کیا اور اسی طرح سجدتین کے درمیان کچھ مقدار سے زیادہ بیٹھے نماز کے بعد امام صاحب سے معلوم کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے رکوع سے کھڑے ہو کر اور سجدتین کے درمیان وہ دعائیں پڑھیں تھیں جو حدیث شریف میں حضور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ان حالتوں میں پڑھنی منقول ہیں دریافت طلب یہ امر ہے کہ آیا یہ صورت نماز درست ہے یا نہیں اور کیا امام موصوف پر سجدہ سہو واجب تھا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

امام نماز جمعہ کے قومہ (یعنی رکوع کے بعد قیام) اور جلسہ (یعنی دونوں سجدوں کے درمیان کا قعدہ) میں احادیث میں کسی چیز کا پڑھنا منقول نہیں ہے۔

تنویر الابصار میں ہے:

ویجلس بین السجدتین مطمئناً ولیس بینهماذکر مسنون و کذابعد رفعه من الرکوع علی المذهب۔

اور دونوں سجدوں کے درمیان اطمینان سے بیٹھے اور اس میں کوئی ذکر ودعا سنت نہیں اور اسی طرح رکوع کے بعد قومہ میں کوئی دعا نہیں یہی مذہب صحیح ہے۔

طحطاوی، سراج اور مجمع الانہر سے ناقل ہیں:

ومقدار الجلوس عندنابین السجدتین مقدار التسبیحة ولیس فیه ذکر مسنون کمافی السراج کذالیس بعد الرفع من الرکوع دعاء وماورد فیهما محمول علی التهجد کما فی المجمع الانهر۔

اور ہمارے نزدیک دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنے کی مقدار ایک تسبیح سبحان اللہ کہنے کی مقدار ہے اور اس میں کوئی ذکر مسنون نہیں جیسا کہ سراج میں ہے اسی طرح رکوع کے بعد قومہ میں کوئی دعا نہیں اور جو دعائیں ان دونوں میں وارد ہوئی ہیں وہ تہجد پر محمول کی گئی ہیں۔ جیسا کہ مجمع الانہر میں ہے،

اسی طرح درمختار میں ہے تنویر الابصار کے اسی قول کو تحریر فرماتے ہیں:

وماورد محمول علی النفل۔

یعنی جو دعائیں قومہ وجلسہ میں وارد ہوئی ہیں وہ نماز نافلہ کے لئے خاص کر دی گئی ہیں

اور اسی طرح درر اور حلیہ اور خزائن وغیرہا کتب میں ہے۔ لہٰذا ان عبارتوں سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ فرائض کے قومہ اور جلسہ میں کسی دعا کا پڑھنا منقول نہیں خصوصاً اگر مقتدی کو اتنا انتظار ناگوار ہو تو امام کو ہرگز نہیں پڑھنا چاہئے اور اگر امام سے فرائض میں ایسا واقعہ ہو جائے تو اختلاف سے بچنے کے لئے احتیاطاً سجدہ کر لینا چاہئے۔

شامی نے ایک یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

لو اطال هذه الجلسة وقومة الرکوع اکثر من تسبیحة بقدر تسبیحة ساهیا یلزمه السجود سهوا۔

یعنی اگر جلسہ اور قومہ کو ایک تسبیح کی مقدار سے زائد ایک تسبیح برابر بھول کر طول دیا تو اسکو سجدہ سہو لازم ہے۔

بالجملہ قومہ اور جلسہ میں جو احادیث کی دعائیں منقول ہیں وہ فقہاء کے نزدیک نوافل کے ساتھ خاص ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۲۴_۴۲۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ان مسائل میں کہ

(۱) جن گاؤں میں مدت سے جمعہ ہوتا آیا اسے بند کردینا چاہیئے یا اسے جاری رکھا جائے؟۔

(۲) ایک مسجد میں ایک وقت میں دو جماعتیں ہوتی ہیں۔ ایک جماعت اہلسنت والجماعت کی ہوتی ہے اور ایک وہابی فرقہ کی۔ ان میں کونسی جماعت شرعا جماعت ہوتی ہے؟۔ اور ایک سات ایک مسجد میں دو جماعتیں ہوسکتی ہیں یا نہیں؟۔ بینوا وتوجرو

المستفتی محمد اسحاق ساکن موضع گھنسور پور پرگنہ سنبھل

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) جن مواضعات میں عرصہ سے جمعہ کی جماعت ہوتی ہے اسے بہت سے مصالح دینی کی بناپر بند نہ کیا جائے البتہ اس کے بعد فرض ظہر چار رکعتیں پڑھنی فرض ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) وہابیہ کی نماز اور جماعت بسبب ان کی گمراہی وضلالت کے شرعاً نہ نماز ہے نہ جماعت نہ ان کی جماعت میں شریک ہونے کا فریضہ اس کے ذمہ سے ساقط ہو۔ اہلسنت کی جماعت واقعی جماعت ہے اس کے مقابلہ میں وہابیہ کی جماعت کو جماعت کہنا ہی غلطی ہے۔ ایک وقت میں صحیح العقیدہ لوگوں کی دو جماعتیں واقعی ممنوع ہیں لیکن اہلسنت کی جماعت وہابیہ کی جماعت کے وقت قائم کرنے میں شرعا تو کوئی حرج نہیں البتہ بخوف فتنہ وفساد کے ایک وقت میں دو جماعتیں ہرگز نہیں ہونی چاہیئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۲۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ان مسائل میں کہ

جمعہ کے روز جمعہ کے پہلے صلوۃ پڑھنا کیسا ہے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

سائل نے جس میں صلوۃ کو دریافت کیا ہے غالبا یہ وہ صلوۃ ہے جو جمعہ کے دن پہلی اذان کے بعد دروازہ یا خارج مسجد میں بآواز بلند پکاری جاتی ہے جیسا کہ بمبئی ،کلکتہ ، بریلی وغیرہ مقامات میں رائج ہے۔ لہذا یہ صلوۃ جمعہ کے روز دونوں اذانوں کے مابین اور سوائے مغرب کے چاروں اوقات میں اذان وتکبیر کے درمیان میں بلاشک جائز ہے۔

متاخرین فقہائے کرام نے اس کے نہ فقط جواز بلکہ استحسان کا حکم دیا اور اس کا نام تثویب رکھا۔ چنانچہ نور الایضاح میں اور اس کی شرح مراقی الفلاح میں ہے:

(ویثوب) بعد الاذان فی جمیع الاوقات لظہور التوانی فی الامور الدینیۃ فی الاصح وتثویب کل بلد بحسب ماتعارفہ اہلہا۔ (طحطاوی مصری ص۱۱۴)

اور صحیح مذہب میں تمام وقتوں میں اذان کے بعد تثویب کہے کہ دینی باتوں میں سستی ظاہر ہے اور ہر شہر کی تثویب وہ ہے جو اس کے رہنے والے اسے سمجھیں (یعنی یہ جان لیں) کہ اذان کے بعد اس دوسرے اعلان سے نماز کے لئے بلایا جارہا ہے۔

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

(قولہ ویثوب الخ) ہو لغۃ مطلق العود الی الاعلام بعد الاعلام وشرعا ہو العود الی الاعلام المخصوص (قولہ بعد الاذان) علی الاصح لابعد الاقامۃ کما ہو اختیار علماء الکوفۃ (قولہ فی جمیع الاوقات) استحسنہ المتاخرون وقدروی احمد فی السنن والبزار وغیرہما باسناد حسن موقوفا علی ابن مسعو ما رآہ المسلمون حسنا فہو عنداللہ حسن۔

(طحطاوی مصری ص۱۱۴)

تثویب لغت میں پہلے اعلان کے بعد دوسرے اعلان کی طرف مطلق لوٹنے کو کہتے ہیں اور

شریعت میں وہ دوسرے مخصوص اعلان کی طرف لوٹنا مراد ہوتا ہے کہ صحیح مذہب میں تثویب اذان کے بعد ہے نہ کہ تکبیر کے بعد جیسا کہ وہ علمائے کوفہ کا مختار بہ قول ہے۔ تثویب کا اذان کے بعد تمام اوقات نماز میں کہنا اسے متاخرین فقہاء نے مستحسن جانا اور استحسان کا ثبوت اس حدیث سے ہے جس کو امام احمد نے سنن میں اور دیگر محدثین نے بسند حسن حضرت عبداللہ بن مسعود سے موقوفا روایت کیا کہ جسے مسلمان حسن جانیں وہ فعل اللہ کے نزدیک اچھا ہے۔

کنز الدقائق اور شرح عینی میں ہے:

(ویثوب) من التثویب وهو العود الی الاعلام بعد الاعلام وانما اطلقه تنبیها علی ما استحسنه المتاخرون من التثویب فی کل الصلوات بظهور التوانی فی الامور الدینیة۔
(عینی مصری ج۱ص ۲۷)

تثویب وہ پہلے اعلان کے بعد دوسرے اعلان کی طرف لوٹنے کا نام ہے۔ صاحب کنز نے اس کو مطلق بیان کرنے میں اس بات پر تنبیہ کی کہ متاخرین نے اس تثویب کو تمام نمازوں میں مستحسن جانا اس لئے کہ دینی امور میں سستی ظاہر ہو چکی ہے۔

جوہرہ نیرہ شرح مختصر قدوری میں ہے:

المتاخرون استحسنوه فی الصلوات کلها لظهور التوانی فی الامور الدینیة وصفته فی کل بلد علی مایتعارفونه۔ (جوہرہ نیرہ ج۱ص ۴۵)

متاخرین نے سب نمازوں میں تثویب کو مستحب جانا کہ امور دینیہ میں سستی ظاہر ہے اور تثویب کے الفاظ ہر جگہ کے لئے وہ ہیں جنہیں وہاں کے رہنے والے سمجھیں۔ (یعنی تثویب کے لئے کوئی خاص الفاظ مقرر نہیں ہیں۔

تنویر الابصار و در مختار میں ہے: (ویثوب) بین الاذان والاقامة فی الکل للکل بماتعارفوه۔
(ردمختار ج۱ص ۲۷۲)

اذان اور تکبیر کے درمیان تمام اوقات نماز میں ہر اس لفظ سے تثویب کہیں جسے لوگ جانتے ہوں۔

علامہ شامی عنایہ سے ناقل ہیں:

احدث المتاخرون التثویب بین الاذان والاقامة علی حسب ماتعارفوه فی جمیع

الصلوات سوی المغرب۔ (زشامی ج ۱ص ۲۷۲)

متاخرین نے سوائے مغرب کے تمام نمازوں میں اذان وتکبیر کے مابین تثویب کہنا ہراس لفظ کے ساتھ جسے لوگ سمجھتے ہوں یہ نیا طریقہ ایجاد کیا۔

خود وہابیوں کے پیشوا مولوی خرم علی غایۃ الاوطار ترجمہ اردو درمختار میں لکھتے ہیں "تثویب یعنی اعلام بعد الاذان کا طریقہ یہ ہے کہ بعد اذان بقدر بیس آیت پڑھنے کے ٹھہر جائے، پھر بلاوے اس طرح کہ الصلوۃ۔ یا یہ کہے چلو نماز تیار ہے۔ یا جس طرح رواج ہو۔ پھر اس کے بعد بقدر بیس آیت کے توقف کرے۔ پھر اقامۃ کہے کذا فی البحر۔ مگر مغرب میں تثویب نہیں۔ (غایۃ الاوطار ج ۱ص ۱۸۱)

بخیال اختصار چند عبارات پیش کی گئیں ہیں ورنہ اس کا جواز قنیہ، ملتقط بحر الرائق، ہدایہ فتاوی قاضیخان ۔نہر۔ مجتبے ۔ درر۔ غرر۔ نہایہ۔ حسن المحاضرہ۔ خزائن۔ القول البدیع وغیرہ کتب میں ہے۔

بالجملہ ان عبارات سے روشن ہوگیا کہ تثویب نہ فقط جائز بلکہ مستحسن ہے اور یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ فقہائے کرام نے تثویب کے کوئی الفاظ خاص مقرر نہیں فرمائے بلکہ اس کے الفاظ کو عرف اور رواج پر موقوف رکھا ہے۔ لہذا ہمارے عرف میں الصلوۃ والسلام علیک یارسول اللہ کے جیسے الفاظ صلوۃ وسلام میں رائج ہیں اب کسی منکر کو ان تصریحات کتب فقہ کے موجود ہوتے ہوئے جمعہ کے دن یا کسی اور دن صلوۃ پڑھنے پر لب کشائی اور دم مارنے کی کیا مجال ہے۔ لیکن وہابی کی دہن دوزی کے لئے خود انہیں کے پیشوا مولوی خرم علی کا قول نقل کیا جاتا ہے جو انہوں نے درمختار کی عبارت کے ترجمہ میں لکھا ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر سلام کہنا نیا پیدا ہوا ربیع الاخر ۷۸۱ سال ہجری میں عشاء کی نماز میں دوشنبہ کی رات پھر جمعہ کے دن پھر دس برس کے بعد پیدا ہوا سب نمازوں میں سوائے مغرب کے۔ پھر مغرب میں بھی دوبار سلام کہنا رائج ہوگیا۔ اور یہ امر بدعت حسنہ ہے۔ یہ فائدہ شارح نے جلال الدین سیوطی شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما کے حسن المحاضرہ سے نقل کیا اور سخاوی کے قول بدیع میں ہے کہ اس کی ابتداء حدوث سلطان صلاح الدین بن مظفر بن ایوب کے حکم سے ہوئی ۷۹۱ھ میں۔ طحطاوی نے کہا کہ مغرب کا سلام ہمارے وقت میں رائج نہیں اور نہ سیوطی کی اس عبارت میں ہے جو نہر الفائق میں منقول ہے انتہی۔ بدعت حسنہ وہ ہے جو قواعد شریعت کے مخالف نہ ہوں"۔ (غایۃ الاوطار ج ۱ص ۱۸۱)

حاصل کلام یہ ہے کہ صلوۃ کہنا فقط جمعہ کی نماز اور خطبہ سے قبل بلکہ سوائے مغرب کے چاروں

اوقات نماز میں مستحسن ہے۔ سلف صالحین۔ فقہائے متاخرین کا محبوب طریقہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۲۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسائل مندرجہ ذیل میں۔
لاؤڈ اسپیکر کا نماز عید میں لگانا جائز یا نہیں؟۔

ضروری نوٹ

(۱) مجالس اسلامیہ محافل و پند میں علمائے کرام کا لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ تقاریر کرنا۔ اور تقریر میں قرآن کریم و احادیث نبویہ کی تلاوت کرنا۔ مسائل دین کی تعلیم دینا اس امر کی دلیل صریح ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کوئی آلہ لہو و لعب نہیں بلکہ ایک شی مباح ہے۔

(۲) ماہرین فن برقیات سے تحقیق کی گئی کہ آلہ خالق الصوت نہیں بلکہ دافع الصوت ہے امام کی پست آواز کو بلند کرتا ہے جس طرح بولنے والا خود ہلکی اور باریک آواز سے گفتگو کرتے ہوئے گلے کی زیادہ طاقت صرف کرتے ہوئے بلند آواز سے بولے۔ اس کی نظیر غالبا ضعیف البصر کے لئے چشمہ۔ بہرے کے لئے آلہ مسماع الصوت ہو سکتے ہیں۔

(۳) لاؤڈ اسپیکر کی آواز امام ہی کی آواز ہے۔ امام کی آواز کے مدات، ادغام، غنہ سرعت، بطوء، مخارج حروف و صفات کسی میں کوئی فرق نہیں آتا، صرف پستی و بلندی میں امتیاز ہوتا ہے اور یہ بلندی و پستی خود امام کی آواز میں موجود ہے۔

(۴) جماعت کثیرہ میں صفوف تک امام کی آواز نہ پہونچنے کی شکل میں مکبر ین کا انتظام کیا جاتا ہے لیکن امام اگر خود جہیر الصوت ہے اور آواز آخر صف تک پہونچتی ہے تو مکبر ین کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تو پھر لاؤڈ اسپیکر سے جب امام کی آواز بلند ہو جاتی ہے تو مکبر ین کی ضرورت پیش ہی نہ آئے۔

گی تو اس صورت میں سنت کے خلاف بھی نہ ہوگا۔ سنت کے خلاف اس وقت ہوسکتا ہے کہ مکبرین قائم نہ کیے جائیں اور امام کی آواز کے علاوہ کسی اور چیز سے آواز پہونچائی جائے اور وہ آواز امام کی آواز سے بالکل تابع نہ ہو۔

(۵) آلہ کے استعمال کے واسطے نماز میں امام کو ہاتھ پاؤں میں حرکت دینا نہیں۔ وضع قطع میں تغیر و تبدل نہیں۔ جس طرح بجلی کے پنکھوں سے ہوا لینے میں نمازی کو کوئی دخل نہیں اگر چہ اپنے ہاتھ سے پنکھا ہلانا جائز نہیں۔

(۶) جب نماز میں مریض لاٹھی کی ٹیک سے کھڑا ہوسکتا ہے۔ اس کے بھروسہ پر دفع و خفض ہوسکتا ہے اور یہ محض اس کے ضعف معذوری سے۔ تو آلہ کے ذریعہ آواز پہونچانا کیونکر منع ہوسکتا ہے حالانکہ نمازی کے ہاتھ میں لاٹھی رہتی ہے اور یہ آلہ نمازی سے دور۔

امید کہ امور مذکورہ پر غور فرماتے ہوئے لاؤڈ اسپیکر کے متعلق تسلی بخش جواب مرحمت فرمائیں۔ اگر جواب جواز ہے تو اختصار کافی۔ دلائل کی ضرورت نہیں۔ اور اگر عدم جواز ہے تو مدلل و محقق درکار ہے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جواب سے قبل تین مقدمات پیش کیے جاتے ہیں تا کہ مسئلہ کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

مقدمہ اولیٰ: ۔نماز میں خشوع کا حاصل ہونا ضروری چیز ہے۔ خشوع قلب کے حضور اور ارکان صلوۃ کی محافظت اور جوارح کے سکون کا نام ہے۔

طحطاوی میں ہے: الخشوع حضور القلب وتسکین الجوارح والمحافظة علی الارکان ۔ (طحطاوی ص ۲۰۱)

مراقی الفلاح میں ہے:

واختلفوا فی الخشوع هل هو من اعمال القلب کالخوف او من اعمال الجوارح کالسکون او هو عبارة عن المجموع قال الرازی الثالث اولیٰ وعن علی رضی الله تعالیٰ عنه الخشوع فی القلب ۔ (طحطاوی ص ۲۱۰)

شامی میں ہے:

قد حکی اجماع العارفین علیه وان من لوازمه ظهور الذل وغض الطرف وخفض الصوت وسکون الاطراف ۔ (شامی ج۱ص ۴۵)

ان عبارات سے خشوع کی حقیقت اوراس کے لوازم معلوم ہو گئے ۔لہذا خشوع کالحاظ نماز میں کس قدر ضروری ثابت ہوا اس لئے خشوع کو بعض نے نماز کی روح فرمایا:

چنانچہ مراقی الفلاح میں ہے: الخشوع الذی ھو روح الصلوۃ ۔ (طحطاوی ص ۲۰۱)

اور بعض نے نماز کا مبنی قرار دیا۔

چنانچہ شامی میں ہے: مبنی الصلوۃ علی الخشوع ۔ (شامی ج۱ص ۴۵۰)

الحاصل، جب خشوع میں حضور قلب وتسکین جوارح ومحافظت ارکان داخل اور عجز وحیا اور پستی آواز اس کو لازم تو اسے کیونکر نماز کا مبنی اور روح نہ قرار دیا جائے اور اسے نماز میں کیونکر ملحوظ نہ رکھا جائے۔

مقدمہ ثانیہ:۔ جو چیز اس خشوع کو زائل کرے۔ اور قلب کو دوسری طرف مشغول کرے وہ چیز نماز میں مکروہ اور نمازی کو ہر ایسی چیز سے اجتناب و پرہیز لازم وضروری ہے

چنانچہ بخاری شریف میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک چادر میں نماز پڑھی جو منقش تھی اس کو واپس فرمایا اور آپنے اندیشہ شغل قلب کا اس طرح اظہار فرمایا:

قال النبی صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم کنت انظر الی علامها وانا فی الصلوۃ فاخاف ان یفتننی ۔ (بخاری شریف مصطفائی ج۱ص ۵۴)

عینی میں اس حدیث کے تحت میں فرماتے: فیه طلب الخشوع فی الصلوۃ والاقبال علیها ونفی کل مایشغل ویلهی عنه ۔ (عینی ج۲ص ۲۵۹)

مراقی الفلاح میں مکروہات صلوۃ کے بیان میں ہے: وتکره بحضرة کل مایشغل البال کزینة وحضرة مایخل بالخشوع۔ (طحطاوی ص ۲۱۰)

طحطاوی میں ہے: علة الکراهة المعقولة مایحصل من تشویش البال وشغل الخاطر ۔ (طحطاوی ص ۲۰۹)

کبیری میں ہے:

فان كان اجنبيا من الصلوة ليس فيه تتميم لها ولا فيه دفع ضرر فهو مكروه ايضا كاللعب بالثوب او البدن وكل مايحصل بسببه شغل يخل بالخشوع ۔

(ردالمحتار ج ۱ ص ۴۵۹)

ان عبارات سے واضح ہو گیا کہ ہر وہ چیز جن سے شغل قلب ہو۔ اور طبیعت میں تشویش ہو۔ اور خشوع زائل ہو وہ نماز میں مکروہ ہے اور نمازی کو اس سے اجتناب واحتراز ضروری ہے۔

مقدمہ ثالثہ: -اس میں چندان چیزوں کا ذکر ہے جو محض شغل قلب اور منافی خشوع ہونے کی بنا پر مکروہ قرار دی گئیں۔ مراقی الفلاح میں مکروہات کے بیان میں فرمایا:

كعبثه بثوبه وبدنه لانه ينافي الخشوع ۔ (طحطاوی ص ۲۰۱)

یعنی نمازی کا اپنے کپڑے یا بدن کے ساتھ شغل کرنا اس لئے مکروہ ہے کہ یہ خشوع کے منافی ہے ردالمحتار میں ہے: يكره للمصلي جعل نحو نعله خلفه لشغل قلبه ۔

(ردالمحتار ج ۱ ص ۴۵۹)

نمازی کو اپنے جوتے کا پیچھے رکھنا اس لئے مکروہ ہے کہ اس میں اس کا قلب مشغول رہے گا۔ عالمگیری میں ہے: كره بعض مشائخنا النقش على المحراب وحائط القبلة لانه يشغل قلب المصلي۔ (شامی ج ۱ ص ۴۶۲)

کتب فقہ میں اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں مگر بخوف طوالت یہاں انہیں کو کافی سمجھا گیا۔

بالجملہ لاؤڈ اسپیکر میں یہ امور روز روشن کی طرح ظاہر ہیں کہ یہ منافی خشوع ہے اسکے ساتھ شغل قلب ہوگا۔ اس کی رعایت خضوع علی وجہ الکمال کو مانع ہوگی۔ اس کی پابندی امام کے لئے انتشار طبیعت کا باعث ہوگی۔ بلکہ یہ مشاہدہ ہے کہ واعظین کو کبھی اس کی پابندی باعث تشویش خاطر ہوتی ہے۔ تو نماز میں اس کی کس طرح اجازت ہوسکتی ہے۔ اور مقدمہ ثانیہ میں جو حدیث منقول ہوئی کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب ایک منقش کپڑے کو باندیشہ شغل قلب دفع فرمائیں تو کوئی ایسا جری شخص ہے کہ لاؤڈ اسپیکر جیسی چیز سے شغل قلب کا اندیشہ نہ رکھے اور اسکو بجائے دفع کرنے کے اس کے اجراء کی سعی کرے اور فقہائے کرام جب بدن اور کپڑے کے شغل قلب کو منافی خشوع قرار دیکر مکروہ ٹھہرائیں

اور نقوش محراب کو بخیال شغل قلب مکروہ قرار دیں اور جوتے کے پیچھے رکھنے میں شغل قلب کا لحاظ فرما کر کراہت کا فتوی دیں تو کون ایسا دلیر ہے کہ لاؤڈ اسپیکر جیسی نئی شی میں شغل قلب کا احتمال بھی نہ جانے اور فقہاء کی علت کراہت کا مقابلہ کرے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کا نماز عیدین یا جمعہ وغیرہ میں استعمال کرنا ضرور باعث شغل قلب ہے اور اس کی پابندی ضرور خشوع کے منافی ہے۔لہذا علت کراہت بوجہ احسن موجود ہے تو اس کا نماز میں استعمال ضرور مکروہ ہے۔

اب مستفتی صاحب کے چند نوٹ کے متعلق بھی مختصر عرض کیا جاتا ہے۔

(۱) مجالس وعظ اور نماز ایک چیز نہیں کہ جو چیزیں مجالس وعظ میں روا ہیں وہ نماز میں بھی جائز ہو جائیں۔نماز میں صرف لہو ولعب ہی ممنوع نہیں۔کھانا پینا۔کسی سے بات کرنا۔داہنے بائیں دیکھنا۔آگے پیچھے بڑھنا۔ہاتھوں سے بار بار حرکتیں کرنا۔یہ سب مباحات ہیں نماز میں کب جائز ہیں۔یہ دعویٰ نہیں ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی وضع مثل آلات غنا کے لہو ولعب کے لئے ہوئی اور واضع کا اس سے یہ مقصود ہے بلکہ اس کی غرابت وندرت اور اس کی قوت صوت اور اس میں واقع ہونے والے تغیرات اپنی طرف ایسا مشغول کر لیتے ہیں کہ بعض اوقات مقرروں کو اپنے سامنے سے لاؤڈ اسپیکر ہٹانا پڑ جاتا ہے اور مخل مقصد تک پہنچا دیتا ہے۔

(۲) یہ گفتگو ہی بیکار ہے اور تعجب ہے کہ مستفتی صاحب نے یوں لکھی۔خلق الصوت کی کیا بحث یہ کسے وہم ہو سکتا ہے کہ کوئی ہو یا نہ ہو خود آواز پیدا کر لیتا ہے۔احتمال ہے تو یہ ہے کہ متکلم کے جس قرع وتحریک سے ہوا کے اجزاء متکیف ہوتے چلے آرہے تھے انہیں کو آلہ نے دوسری طرف پہونچایا یا اس ہواء متکیف سے پھر قرع جدید پیدا ہوا۔اور یہ بھی مسئلہ زیر بحث میں یکساں ہے کہ شغل تو دونوں صورتوں میں ہے۔

(۳) یہ بحث بیکار ہے بلکہ اور غلط۔کہ حروف کے مخارج وصفات اور نغمات کا متوافق ہونا دلیل وحدت صلوۃ نہیں۔فوٹو کی تصویر ذی صورت سے اس کے نقشہ وہیئت ومناسبت اعضا سے کس قدر مطابق ہوتی ہے مگر کون کہہ سکتا ہے کہ صورت اور ذی صورت میں مباینت نہیں۔

(۴) کثرت جماعت کی صورت میں امام ہی کی آواز پہونچانے کا شریعت نے حکم نہیں دیا اور امام پر جدوجہد لازم نہیں کی کہ اپنی طاقت سے جہاں تک آواز پہونچا سکتا ہے وہاں تک ضرور پہونچائے

اس سے زیادہ کے لئے مکبر ہے بلکہ امام اعتدال کے ساتھ قرأت کرے اور مکبر تبلیغ کیا کرے جب امام پر جہد نہیں رکھا گیا تو آلہ کس لئے۔ یہ آلہ تو بہت جہد تبلیغ سے اور ضرور سنت تبلیغ بالتکبیر اس سے معدوم ہوتی ہے۔

(۵) یہ سب بیکار باتیں ہیں یہ کہتا کون ہے کہ ہاتھ پاؤں سے حرکت کی جاتی ہے اسلئے اس آلہ کا استعمال ناجائز ہے۔ بجلی کا پنکھا کونسی سنت کو معدوم کرتا اور کس شغل کا موجب ہے اور اگر ہے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

(۶) اگر یہ مقیس علیہ قرار دیا جاسکے تو امام کو بگل کے ذریعہ سے تکبیرات کے پہونچانے کی ضرورت پڑے گی۔ نماز نہ ہوئی کھیل ہوگیا۔ وما کان صلوتھم عندالبیت الامکاء وتصدیة۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۲۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

اکثر گاؤں میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے اور بعض مفتیوں نے یہ فتوے دیا ہے کہ گاؤں میں جو جمعہ ہوتا ہے اس کو بند کردیا جائے چاہے وہاں ایک زمانہ سے جمعہ کی جماعت قائم ہو اب دریافت طلب یہ امور ہیں کہ آیا گاؤں میں نماز جمعہ کو واقعی بند ہی کردینا چاہیئے یا اسے قائم رکھا جائے اور قائم رکھنے کی صورت میں ظہر کی نماز بھی ادا کی جائے یا نہیں اگر ادا کیجائے تو اس کی کیا صورت ہے؟۔ بینوا توجروا۔

المستفتی صوفی ظہور شاہ از موضع دبھائی تحصیل ہاپوڑ ضلع میرٹھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اس وقت دیہات کے مسلمانوں کی ایسی ناگفتہ بہ حالت ہورہی ہے کہ ہر شخص فکر معاش میں مدہوش ہے زراعت کی مشغولیت میں منہمک ہے خوف الٰہی قلب سے نکل رہا ہے۔ نیکیوں کا شوق کم ہورہا ہے عبادات کا ذوق مٹ رہا ہے۔ فرائض کا احترام کم ہورہا ہے۔ بدیوں کی اشاعت ہے۔ گناہوں کی کثرت ہے۔ علی الاعلان کبائر کا ارتکاب کیا جارہا ہے۔ نہایت دلیری سے نماز روزہ کو ترک کیا

جارہا ہے۔ مساجد نمازیوں سے خالی نظر آرہی ہیں دین سے بے رغبی بڑھتی جارہی ہے۔ پھران میں وعظ ونصائح کے سلسلہ بند ہیں ترغیب وترہیب کے ذریعے بہت کم ہیں اوراس پران لوگوں کی بے رغبتی اور بد شوقی اورزیادہ رنگ لاتی ہے چنانچہ ان کی مساجد میں نماز پنج وقتہ کی پابندی کے ساتھ جماعت کم ہوتی ہے۔ بسااوقات اذان سے مسجد خالی رہجاتی ہے، مسلمانوں کے بڑے سے بڑے گاؤں میں چند نمازی نظر آتے ہیں، ہاں ان کے مردہ جذبات میں جان ڈالنے والا، ان کے بے حس یا قلوب میں شوق کی لہریں پیدا کرنے والا، ان میں غسل وطہارت کا جذبہ پیدکرنے والا، ان میں خط بنوانے اور کپڑے بدلنے کا ذوق پیدا کرنے والا، ان کے مشاغل دنیوی کو بند کرنے والا، ان کے کاروبار زراعت سے روکنے والا، ان کومسجد کی طرف متوجہ کرنے والا، ان کونماز کی جانب رغبت دلانے والا، ان کی جبیں نیاز کو جھکانے والا، اگرکوئی دن ہے تو یہی جمعہ کا دن ہے۔ اس دن کا ان کے قلوب میں بڑا احترام ہے، اس دن لوازم نیاز مندگی کا اظہار کرنا ان کے نزدیک نہایت ضروری کام ہے، اس روز وہ لوگ نماز جمعہ کوایسا امر اہم تصور کرتے ہیں کہ جواس میں شرکت نہ کرے اس پر زبان طعن دراز کرتے ہیں، اس کومعیوب نظروں سے دیکھتے ہیں، پھر یہ بھی مشاہدہ ہے کہ اس نماز جمعہ کی وجہ سے بعض لوگ ایک دوروز بعض تین چار روز تک نماز کی پابندی بھی کرلیتے ہیں، بعض اپنے جذبہ شوق میں شہر میں جمعہ کے لئے چلے جاتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ گاؤں میں جمعہ ہونے کی وجہ سے مسجد میں زینت ہوتی ہے، نمازیوں کی کثرت ہوتی ہے، نماز کی تبلیغ ہوتی ہے، دین داری کی ترویج ہوتی ہے، طہارت کا ذوق دعاء ومناجات کا ذوق پیدا ہوتا ہے، بلکہ اس کے طفیل میں اوردو تین روز تک نماز ادا کرنے کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔

لہذا ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے گاؤں میں جمعہ کی جماعت کو جاری رکھنا قابل لحاظ اور قرین مصلحت ہے، بلکہ دیہات کے حالات پر مطلع ہونے کے بعد ہر مذہبی درد رکھنے والا شخص اس چیز کے لئے مضطر ہو جائے گا کہ ان میں جمعہ کی جماعت کو قائم رکھا جائے اور ان کے قلوب سے اس شعار مسلمین کا احترام کم نہ کیا جائے اوراس نازک دور میں ان کی اس قابل قدر رغبت کو ٹھیس نہ لگائی جائے۔" مگر تعجب ہے ان مفتیوں پر جوان تمام مصالح دینی سے آنکھیں بند کر کے جمعہ کو بند کرانے کے درپے ہوگئے ہیں، تو نہ ایسے مفتیوں کا حکم قابل عمل ہے، نہ ایسا فتوی لائق اعتماد ہے، یہ لوگ اگر غور کرتے"۔ تو شریعت میں ایسی بکثرت نظیریں موجود ہیں جن میں فقہائے کرام نے عوام کو فعل مکروہ سے محض ان کی امور خیر سے قلت رغبت اوران سے خوف ترک فرض کا لحاظ فرماتے ہوئے نہیں منع کیا۔ ہم بخوف طوالت اس وقت صرف

دو نظیریں اسی سلسلہ نماز ہی مین پیش کرتے ہیں۔

علامہ شامی بحر سے بحوالہ تجنیس ناقل ہیں:

ان کسالی العوام اذا صلوا الفجر عند طلوع الشمس لا یمنعون لانهم اذا صنعو ترکوها اصلا واداؤها مع تجویز اهل الحدیث لها اولی من ترکها اصلا۔

(شامی مصری ج ۱ ص ۵۸۲)

عوام کے سست لوگ جب نماز فجر بوقت طلوع آفتاب پڑھیں تو انہیں منع نہ کیا جائے اس لئے کہ جب وہ منع کیے گئے تو وہ اس نماز کو بالکل ہی نہ پڑھیں گے اور محدثین کی تجویز پر اس وقت اس نماز کا ادا کرنا اس کے بالکل نہ پڑھنے سے بہتر ہے۔

علامہ شامی ردالمحتار میں اس عبارت کے چند سطر بعد فرماتے ہیں:

عدم منعهم عن صلاة الفجر عند طلوع الشمس لان ذلك لخوف ترکها اصلا فیقع التارك فی محظور اعظم۔

(ردالمحتار مصری ج ۱ ص ۵۸۲)

طلوع آفتاب کے وقت نماز فجر سے ان لوگوں کو منع نہ کرنا اس لئے ہے کہ اس میں بالکل نماز نہ پڑھنے کا خوف ہے تو وہ ترک نماز کے گناہ عظیم میں واقع ہو جائے گا۔

اسی طرح عوام کو عیدگاہ میں عید کے دن نماز نفل سے نہیں روکا جاتا ہے درمختار میں ہے۔

اما العوام فلا یمنعون من تکبیر ولا بنفل اصلا لقلة رغبتهم فی الخیرات۔

(شامی مصری ج ۱ ص ۵۸۲)

ان عبارات میں صاف طور پر موجود ہے کہ عوام کے سست لوگ نماز فجر بوقت طلوع آفتاب بھی پڑھیں تو انہیں اس وقت مکروہ میں بھی نماز پڑھنے سے منع نہ کیا جائے گا بخوف اس بات کے کہ وہ پھر نماز بالکل ہی نہ پڑھیں گے اور ان کی اس وقت مکروہ پر نماز کو محض ایک قول ضعیف کی تجویز پر اولیٰ قرار دیا گیا اور انہیں تارک کے فرض کے گناہ عظیم میں واقع ہونے سے بچا لیا گیا اسی طرح عوام کو ان کے امور خیر میں رغبت کم ہونے کی بنا پر عیدگاہ میں نفل نماز سے نہیں منع کیا جاتا۔

بالجملہ فقہائے کرام نے جب عوام کے لئے خوف ترک فرض اور ان کی امور خیر سے کم رغبتی کا اس قدر لحاظ فرمایا کہ انہیں اسی بنا پر فعل مکروہ سے نہیں روکا اور ان کے فعل کو قول ضعیف کی بنا پر اولیٰ قرار دیا تو کیا گاؤں کے جمعہ میں ان امور کا لحاظ نہیں کیا جائے گا بلکہ گاؤں میں جمعہ کی جماعت بند کرنے میں نہ

فقط ایک فرض کے ترک ہونے بلکہ چند فرائض کے ترک ہو جانے کا نہ صرف خوف بلکہ یقین ہے۔ ''تو کیا ان مفتیوں کے قول سے گاؤں میں جمعہ کی جماعت توڑ کر ان لوگوں کو ترک فرائض کے گناہ عظیم میں مبتلا کر دیا جائے''۔ پھر نیز گاؤں کے لوگوں کی نماز سے بے رغبتی کا حال کسی پر پوشیدہ نہیں ہے۔

لہذا اب جمعہ کی جماعت کس بنیاد پر بند کی جاسکتی ہے اور جب یہ مشاہدہ ہے کہ جمعہ کی نماز کی وجہ سے دو تین روز تک اور بھی چند اوقات کی نماز وہ لوگ پڑھ لیتے ہیں۔ ''تو ان مفتیوں کے نزدیک یہ دو تین روز کی نمازیں بالکل قابل لحاظ نہیں''۔ علاوہ بریں ہمارے نزدیک قول راجح واصح کی بنا پر گاؤں پر تعریف مصر صادق نہیں آتی لیکن دوسرا قول مرجوح جو اکثر فقہا کے نزدیک مفتی بہ بھی ہے اس کی بنا پر گاؤں مصر ہے اور آپ نے ابھی سنا کہ فقہاء نے ایک قول ضعیف کی بنا پر بخوف ترک فرض فعل مکروہ اولیٰ قرار دیا تو یہاں کیا جماعت جمعہ کو بخوف ترک فرائض قول مفتی بہ کی بنیاد پر بھی اولیٰ نہ قرار دیا جائے گا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ فقہاء کرام کی یہ دونوں نظیریں دیکھتے ہوئے گاؤں میں جمعہ کی جماعت کو بند کرنا سخت غلطی ہے لوگوں کو گناہ عظیم میں واقع کرنے کی تجویز ہے اور ان کے قلوب سے اس شعار مسلمیں کی عظمت کم ہو جانے کی تدبیر ہے تعجب ہے کہ ان مفتیوں کو ایسی جرأت و دلیری کرتے ہوئے خوف الٰہی نہیں معلوم ہوتا یہ لوگ حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ کا فرمان دیکھ کر کچھ سبق حاصل کریں۔

درمختار میں اس عبارت مذکورہ کی دلیل بنا کر قول نقل کیا:

لان علیا رضی اللہ تعالیٰ عنه رای رجلا یصلی بعد العید فقیل اما تمنعه یا امیر المومنین فقال اخاف ان ادخل تحت الوعید قال اللہ تعالیٰ ارأیت الذی ینهی عبداً اذا صلی۔

(شامی ج۱ ص۵۸۳)

کیونکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو بعد نماز عید نفل نماز پڑھتے ہوئے دیکھا عرض کیا گیا اے امیر المومنین کیا آپ اس کو نماز نفل پڑھنے سے منع نہیں فرماتے تو فرمایا میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ میں بھی اللہ تعالیٰ کے فرمان کی اس وعید میں داخل نہ ہو جاؤں بھلا دیکھئے تو جو منع کرتا ہے بندے کو جب وہ نماز پڑھے۔

بالجملہ گاؤں میں جب جمعہ ہوتا ہے تو اس کی جماعت کو قائم رکھا جائے گا اور برابر جمعہ کو پڑھا جائے گا۔ ''بلکہ اس کی شرکت کی لوگوں کو ترغیب دلائی جائے اور کسی ایسے غلط فتوے کی وجہ سے جمعہ کو بند نہ کیا جائے''۔ البتہ گاؤں کے لوگوں کو اس کے بعد ظہر کی نماز ادا کرنی ضروری اور فرض ہے۔

علامہ شامی ردالمختار میں جواہر سے ناقل ہیں۔

ولو صلوا فی القری لزمهم اداء الظهر۔ (شامی ج ۱ ص ۵۶۰)

اگر گاؤں میں جمعہ کی نماز پڑھیں تو انہیں ظہر کا ادا کرنا بھی لازم ہے۔

لیکن ظہر کے ادا کرنے کی بہتر صورت یہ ہے۔ جو علامہ خیر الدین رملی کے فتاوی خیریہ میں ہے جس کی عبارت یہ ہے:

والاحتياط فی القری ان یصلی السنة اربعا ثم الجمعة ثم ینوی اربعا سنة الجمعة ثم یصلی الظهر ثم یصلی رکعتین سنة الوقت فهذا هو الصحیح المختار۔

(فتاوی خیریہ مصری ص ۱۲)

گاؤں میں احتیاط یہ ہے کہ چار رکعت سنت پڑھے پھر جمعہ پھر چار رکعت سنت پڑھے جمعہ کی نیت کرے پھر ظہر پڑھے پھر دو رکعتیں سنت وقت کی پڑھے یہی قول صحیح مختار ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ جس گاؤں میں جمعہ ہوتا ہے اس کو ہرگز بند نہ کیا جائے بلکہ اس کی جماعت کو برابر قائم رکھا جائے اور جمعہ کو پڑھا جائے اور اس کے بعد چار رکعت سنت جمعہ پڑھ کر پھر ظہر کو ضرور ادا کیا جائے اس کے بعد دو رکعت سنت وقت اور نفل پڑھے منصف کے لئے یہ جواب نہایت کافی وافی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم الصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۲۹)

بسم الله الرحمن الرحيم ۔ نحمده و نصلی علی رسوله الكريم ۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ احناف رحم کرے اللہ آپ لوگوں پر اور برکت دے علم میں کہ فیض پہنچاتے ہیں علم سے خلائق کو اس مسئلہ میں کہ۔

ہمارا گاؤں جو سات آٹھ سو گھر آبادی پر مشتمل ہیں لیکن اس میں نہ کوئی نہر اور نہ بازار ہے عرصہ بعید سے ایک بڑی مسجد میں (جو جامع مسجد کے نام سے موسوم ہے) لوگ نماز جمعہ پڑھتے چلے آرہے تھے، اب دو چار ماہ سے ایک دوسری چھوٹی سی مسجد کے امام نے از راہ عناد و حسد و تخریب جامع مسجد قدیمہ یہ حیلہ تراش کر کہ جامع مسجد کا خطیب داڑھی سنت سے کم رکھتا ہے یعنی کترواتا ہے اسکے پیچھے نماز جمعہ نہیں

ہوسکتی اسی چھوٹی مسجد میں الگ نماز جمعہ پڑھا رہا ہے نیز دو ماہ سے ایک سید مولوی صاحب ہمارے گاؤں آئے ہوئے ہیں جو آپنے آپ کو (الرضوی الحنفی الچشتی النظامی الخراسانی الہروی) لکھتے ہیں انہوں نے ایک تیسری چھوٹی سی مسجد میں مذکورہ بالا حیلہ تراش کر براہ عناد وحسد وتخریب جامع مسجد قدیمہ الگ نماز جمعہ پڑھانی شروع کردی ہے سید صاحب موصوف سے اگر کوئی شخص تعدد نماز جمعہ کے متعلق اور شرائط ادائے صحت نماز جمعہ کے متعلق مسئلہ دریافت کرتا ہے تو سید صاحب ممدوح ارشاد فرماتے ہیں کہ شرائط نماز جمعہ جو کتب فقہ میں مندرج ہیں وہ فرقہ معتزلہ اور رافضیہ کی بنائی ہوئی ہیں نہ کہ جمہور ائمہ حنفیہ کی مزید برآں یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ نماز جمعہ بغیر شرائط کے ہر قریہ کی دو چار مسجدوں میں (خواہ قریہ صغیرہ تیس (۳۰) گھر کی آبادی پر مشتمل ہو) پڑھ لینا جائز ہے کیونکہ نماز جمعہ عین فرض ہے نہ کہ مقید بالشرائط۔ ونیز صاحب ممدوح سید صاحب نماز جمعہ جو نہ پڑھنے والے شخص کو بحوالہ مشکوۃ شریف منافق کہتے ہیں۔

اب دریافت طلب امور یہ ہیں کہ۔

(۱) مذکورہ بالا آبادی کا قریہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟۔

(۲) مذکورہ بالا آبادی کے قریہ میں (جس کا اطلاق عرف عام میں قدیم الایام سے قریہ چلا آتا ہے) امام اعظم کے مذہب پر نماز جمعہ جائز ہے یا نہیں؟۔

(۳) مذکورہ بالا قریہ میں امام اعظم کے مذہب پر مذکورہ بالا حیلہ تراش کر دو چار مسجدوں میں نماز جمعہ پڑھانی جائز ہے یا نہیں؟۔

(۴) آیا سید صاحب موصوف جو شرائط ادائے صحت نماز جمعہ کے انکاری ہیں اور شرائط ادائے صحت نماز جمعہ کو فرقہ معتزلہ ورافضیہ کی بنائی ہوئی بتلاتے ہیں اور کتب فقہ کو مشکوک بتلاتے ہیں وہ (الرضوی الحنفی الچشتی النظامی الخراسانی الہروی) کہلانے کے مستحق ہیں یا نہیں اور وہ لا امام وخطیب ہونے کے مستحق ہیں یا نہیں؟۔

(۵) آیا بموجب ارشاد صاحب مذکور صاحب کنز وقدوری وہدایہ وشرح وقایہ جنکی مصنفہ سب میں شرائط ادائے صحت نماز جمعہ مندرج ہیں) واقعی معتزلہ ورافضی حق پر تھے یا نہیں۔

(۶) اگر نہیں تو فقہائے کرام پر افترا واتہام ہے یا نہیں؟۔

(۷) اگر افترا واتہام ہے تو سید صاحب مذکور از روئے شریعت کس تعزیر کے مستوجب ہیں؟۔

(۸) آیا واقعی موجب ارشاد سید صاحب نماز جمعہ عین فرض ہے یا مقید با شرائط؟۔

(۹) اگر مقید با شرائط ہے تو شرائط کا اثبات آیات شریف اور حدیث سے ہے یا محض قیاس میں مجتہد سے اور موقوف علیہ ہونے میں جمعہ کے لئے برابر ہیں یا نہیں؟۔

(۱۰) اگر شرائط جمعہ کا اثبات آیت شریف اور حدیث شریف سے۔ہے تو بحوالہ کتب معتبرہ تفسیر وحدیث وفقہ مفصل ومدلل متفق علیہ تحریر فرمادیں؟۔

(۱۱) نیز جمعہ کی نماز اگر مقید بالشرائط ہے تو باوجود مفقود ہونے شرائط کے جو شخص نماز جمعہ نہ پڑھے وہ بموجب ارشاد سید صاحب مذکور واقعی منافق ہے یا کیا اگر منافق نہیں ہے۔تو منافق کہنے والے پر از روئے شریعت کیا تعزیر عاید ہوتی ہے؟۔

(۱۲) از راہ عناد وحسد وتخریب جامع مسجد قدیمہ ایک قریہ کی دو تین مسجدوں میں نماز جمعہ پڑھنا امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مذہب پر جائز ہے یا کیا؟ جیسا کہ آج کل ہمارے گاؤں میں پڑھی جارہی ہے؟۔بینوا توجروا

نوٹ:۔ ہر ایک امور مذکورہ بالا کا جواب باصواب بدلائل عقلی ونقلی بحوالہ کتب معتبرہ تفسیر وحدیث وفقہ بمعہ ترجمہ اردو عبارات عربیہ مفصل ومدلل ومتفق علیہ ہوتا کہ جواب الجواب کی نوبت نہ آئے نیز سوالات ہمراہ جوابات واپس ارسال فرما کر مشکور وممنون فرمائیں عین مہربانی ہوگی۔

المستفتی احقر العباد غلام رسول ولد چوہدری غلام مصطفیٰ صاحب کھوکر راجپوت

متوطن خاجیوالہ تحصیل وضلع گجرات (پنجاب) ۴۱۔۶۔۱۳

الجواب

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم علیہ وعلی الہ وصحبہ الصلوۃ والتسلیم

اہل اسلام میں ایسا اختلاف وگروہ بندی نہایت مذموم اور بہت زیادہ قابل افسوس ہے۔اگر کاش مسلمان اپنی ذاتی عداوتوں اور نفسانی اغراض کو پس پشت ڈال کر احکام شرعی پر عمل کرنے کا خلوص قلب سے مصمم ارادہ کرلیں تو کوئی اختلاف ہی رونما نہ ہو اور بیچارے عوام گروہ بندی کی مصیبت سے نجات پائیں۔مگر مشکل تو یہ ہے کہ چند خود غرض عالم بنکر ناواقف مسلمانوں میں اپنا علمی وقار قائم کر لیتے ہیں اور اپنے حصول غرض کے رات دن نیا اختلاف پیدا کرتے رہتے ہیں عوام ان کا شکار بن جاتے ہیں اور گروہ بندی کے دلدل میں پھنس جاتے ہیں اور یہ جستجو نہیں کرتے کہ شریعت مطہرہ کا اس میں کیا حکم ہے اس اختلاف میں کون حق پر ہے اور کون باطل پر قرآن کریم نے ہر ایسے اختلاف کے ختم کرنے کا یہ طریقہ تعلیم

فرمایا ہے۔

فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لاتعلمون۔

یعنی اگر تم کسی چیز کونہیں جانتے ہوتو جاننے والوں سے دریافت کرو۔

لہذا مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے ہر اختلاف میں معتمد و مستند علماء کرام ومفتیان عظام سے فتوے طلب کریں اور حکم شرعی کے ظاہر ہو جانے کے بعد اپنے تمام اختلافات کو ختم کر دیں اور آپس میں محبت ووداد والفت واتحاد پیدا کریں اور خود غرضوں کی کسی بات کی طرف التفات وتوجہ نہ کریں۔

بالجملہ میں اپنی عدیم الفرصتی کیوجہ سے اس وقت مفصل اور مبسوط جوابات پیش کرنے سے قاصر ہوں مختصر جواب دیا جائے گا جو مدلل ہوگا جس میں بغیر کسی کی جانب داری کے صریح الفاظ میں حکم شرعی کا اظہار کر دیا جائے گا اور طالب حق کے لئے بہت کافی ثابت ہوگا اور معاند اور متعصب کے لئے دفتر کے دفتر نا کافی ہیں۔

(۱) اگر فی الواقع اس آبادی میں سات آٹھ سو گھر ہیں اور مسلمانوں کی اکثریت ہے اور اس میں

چند مساجد ہیں تو اس کے قریہ کبیرہ ہونے میں کیا کلام ہے جب کہ فقہاء کرام کے ایک قول مفتی بہ کی بنا پر غالبًا اس پر مصر کی تعریف بھی صادق آجائے۔

درمختار میں ہے: المصر وهو مالا یسع اکبر مساجده اهله المکلفین بها وعلیه فتوی اکثر الفقهاء۔

یعنی مصر وہ آبادی ہے جس کی بڑی مسجد میں وہاں کے مکلّف مسلمان سمانہ سکیں اور اس قول پر اکثر فقہاء کا فتوی ہے۔

اگر چہ ہمارے نزدیک مصر کی وہ تعریف زیادہ معتمد ہے جو خود صاحب مذہب حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

عن ابی حنیفة انه بلدة کبیرة فیها سکك واسواق ولها رساتیق وفیها وال یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمه وعلمه اوعلم غیره یرجع الناس الیه فیما یقع من الحوادث وهذا هو الاصح۔ (شامی ص ۵٦۰)

یعنی امام اعظم علیہ الرحمۃ سے مروی ہے کہ مصر وہ بڑی آبادی ہے جس میں چند کوچے اور بازار

ہوں اور اس کے متعلق دیہات ہوں اور اس میں کوئی ایسا حاکم ہو جو اپنی سطوت اور علم سے یا دوسرے کے علم سے ظالم سے مظلوم کے انصاف پر قادر ہو لوگ اس کے یہاں حوادث میں رجوع کرتے ہیں کہا تعریف زیادہ صحیح ہے۔

بالجملہ اس آبادی مذکور پر یہ تعریف صادق نہیں آتی تو اسکا مصر ہونا تو ثابت نہیں ہوا اور اس قدر زبردست آبادی کو باوجود چند مساجد کے قریہ صغیرہ قرار دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا تو اس آبادی مذکور کو قریہ کبیرہ ہی مانا جائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) اس آبادی مذکور کا جب کبیرہ ہونا متحقق ہو تو قریہ کبیرہ میں وجوب جمعہ کا تو حکم دیا نہیں جاتا لیکن مذہب مختار کی بنا پر جمعہ پڑھنے کے بعد احتیاط الظہر پڑھنے کا حکم دیا جائے گا۔

فتاوی خیریہ میں ہے:

والاحتياط فى القرى (الكبيرة) ان يصلى السنة اربعا ثم الجمعة ثم اربعا سنة الجمعة ثم يصلى الظهر ثم يصلى الركعتين سنة الوقت فهذا هو الصحيح المختار۔

(فتاوی خیریہ ص ۱۲۵)

غنیۃ شرح منیہ میں ہے:

قالوا فى كل موضع وقع الشك فى جواز الجمعة ينبغى ان يصلى اربع ركعات وينوى بها الظهر حتى لو لم تقع الجمعة موقعها يخرج عن عهده فرض الوقت بيقين كذا فى الكافى قال فى فتاوى الحجة هذا فى القرى الكبيرة ۔ (غنیۃ ص ۵۱۲)

ان عبارات کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ بڑے گاؤں میں احتیاط یہ ہے کہ چار سنت پڑھے پھر جمعہ پھر چار جمعہ کی سنت پڑھے پھر ظہر پھر دو رکعت سنت وقت کی پڑھے یہی مذہب صحیح و مختار ہے اور فقہاء نے فرمایا ہر وہ مقام جس میں جمعہ کے جائز ہونے میں شک ہو تو وہاں بہ نیت ظہر چار رکعت پڑھنا مناسب ہے یہاں تک کہ اگر جمعہ ادا نہیں ہوا تو وہ فرض وقت کے ذمہ سے تو یقیناً نکل جائے گا اسی طرح کافی میں ہے اور فتاوی حجہ میں فرمایا کہ یہ حکم بڑے قریہ میں ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ قریہ کبیرہ میں جمعہ کی ممانعت نہیں البتہ اس کے بعد احتیاط الظہر بنا بر مذہب مختار کے ادا کی جائے۔ لہذا جب مذکورہ آبادی کا قریہ کبیرہ ہونا ثابت ہو چکا تو اس میں جمعہ پڑھ سکتے ہیں البتہ اس کے بعد احتیاط الظہر کو پڑھنا چاہیے اور اس تفصیل و ترتیب سے ادا کیا جائے جس کا

ذکر اور گذرا کہ اس طریقہ میں فرض وقت بیقین ذمہ سے ساقط ہوتا ہے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۳) جس آبادی پر بہ یقین مصر کی تعریف صادق آرہی ہے خود اس میں بھی تعدد جمعہ کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔

کبیری میں ہے: واما من حیث جواز التعدد وعدمه فالاولیٰ هو الاحتیاط لان الخلاف فیه قوی اذ الجمعة جامع للجماعات ولم تکن فی زمن السلف تصل الا فی موضع واحد من المصر و کون الصحیح جواز التعدد وللضرورة للفتوی لایمنع شرعیه الاحتیاط للتقوی۔ (کبیری ص ۵۱۲)

ردالمحتار میں ہے: جواز التعدد وان کان ارجح واقوی دلیلا لکن فیه شبة قویة لان خلافه مروی عن ابی حنیفة ایضا واختاره الطحاوی والتمرتاشی وصاحب المختار وجعله العتابی الاظهر وهو مذهب الشافعی والمشهور عن مالك واحدی الروایتین عن احمد کما ذکر المقدسی فی رسالة نور الشمعة فی ظهر الجمعة بل قال السبکی من الشافعیة انه قول اکثر العلماء ولا یحفظ عن صحابی ولا تابعی تجویز تعددها۔

(ردالمحتار ج ۱ ص ۵۶۵)

ان عبارات کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ تعدد جمعہ میں خلاف بہت قوی ہے کہ جمعہ تمام جماعتوں کا جامع ہے اور زمانہ سلف میں مصر میں بھی ایک ہی جگہ پر نماز ہوتی تھی اور تعدد جمعہ کا جواز فتوی کی ضرورت کے لئے ہے تو یہ تقوی کے لئے احتیاط کی مشروعیت کو مانع نہیں اور تعدد جمعہ کا جواز اگر باعتبار دلیل کے راجح اور قوی ہے لیکن اس میں قوی شبہ بھی ہے کہ اس کے خلاف امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی اور اس کو طحاوی اور تمرتاشی اور صاحب مختار نے اختیار کیا اور عتابی نے اسی کو اظہر مانا اور یہی امام شافعی کا مذہب ہے اور امام مالک کا قول مشہور اور امام احمد سے یہ مروی ہے امام سبکی نے فرمایا کہ یہ اکثر علماء کا قول ہے اور کسی صحابی وتابعی سے تعدد جمعہ کی تجویز محفوظ نہیں۔

اگر چہ مصر میں قول اصح کی بنا پر تعدد جمعہ کو جائز قرار دیا گیا مگر مصر میں بھی افضل یہی ہے کہ بلاعذر شرعی جمعہ جامع مسجد ہی میں پڑھا جائے۔

غنیۃ میں ہے:

والافضل هو الجامع الواحد وذلك للخروج من الخلاف والخروج عن العهدة

بیقین۔ (غنیۃ ص ۵۱۲)

تو وہ قریہ کبیرہ جس میں جمعہ کا جواز ہی محل تردد و شک میں ہے اس میں تعدد جمعہ کی کس طرح اجازت ہوسکتی ہے۔

بالجملہ مذکورہ بالا آبادی میں جامع مسجد ہی میں جمعہ ہونا چاہئے متعدد مساجد میں نہیں پڑھنا چاہئے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۴ تا ۷) شخص مذکور سخت جاہل ہے اور دین سے بے بہرہ ہے اور احکام شریعت سے بے خبر ہے اور کتب فقہ کا منکر ہے سلف وخلف کا مخالف ہے فقہاء کرام کا دشمن اور بدگو ہے اس پر توبہ اور استغفار لازم ہے اور تجدید ضرور ہے شرح فقہ اکبر میں ہے "من ابغض عالما من غیر سبب ظاھر خیف علیہ الکفر قلت الظاھر انہ یکفر" یعنی جس نے کسی عالم سے بغیر کسی سبب ظاہر کے بغض رکھا تو اس پر خوف کفر ہے۔ ملا علی قادری فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہ ہے کہ وہ کافر ہو جائیگا۔ لہذا شخص مذکور اس عبارت میں اپنا حکم دیکھے کہ فقہائے کرام کو بلاوجہ معتزلہ و رافضی کہکر اپنی عداوت قلبی اور بغض دلی کا صاف طور پر اظہار کر رہا ہے تو جبتک یہ شخص تائب نہ ہو اسکو امام نہ بنایا جائے۔ نہ اس سے سلام وکلام روا واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۸ تا ۱۰) نماز جمعہ فرض عین ہے۔ نور الایضاح و مراقی الفلاح میں ہے:

صلوۃ الجمعہ فرض عین بالکتاب والسنۃ والاجماع (طحطاوی صفحہ ۲۹۱)

یعنی جمعہ کی نماز کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور اجماع امت سے فرض عین ہے۔

شخص مذکور کی یہ انتہائی جہالت ہے کہ وہ فرض عین کا مقابل فرض مقید بالشرائط قرار دیتا ہے اگر کسی معمولی طالب علم سے بھی دریافت کرلیتا تو اسکی یہ جہالت طشت از بام نہ ہوتی، پھر وہ فرض عین کے کیا معنی سمجھتا ہے کیا اس کے نزدیک شرائط کی قید فرض عین کی عینیت کو باطل کردیتی ہے، اگر اس کے زعم باطل میں ایسا ہی ہے تو کیا اس کے ناپاک خیال میں نماز پنجگانہ مقید بالشرائط نہیں ہیں باوجودیکہ یہ فرض عین ہیں کیا وہ طہارت ستر عورت وقت نیت وغیرہ کو نماز کے شرائط نہیں جانتا اگر جانتا ہے تو کیا یہ نماز کے فرض عین ہونے کے منافی ہے، پھر جمعہ کے شرائط کا ثبوت آیات سے بھی ثابت ہے۔

چنانچہ تفسیر احمدی میں ہے: ان ثلثۃ نفر یشترط فی الجمعۃ سوی الامام عند ابی

حنیفه خلا فالهما و الحجة له قو له فاسعو الی ذ کر الله (احمدی صفحہ ۳۵)

اسی میں ہے: کما شر ط لو جو ب الجمعة اشر و ط الستته المذ کو ر ة لذ لك

یشتر ط لصحت ا دا ئها ستة ا خر ی المصرا و فنا ئه (احمدی صفحہ ۳۸۶)

ان عبارات کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ جمعہ میں امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک سوا امام کے تین شخصوں کا ہونا شرط ہے اوران کی دلیل یہ آیت ہے اللہ کے ذکر کی طرف سعی کرو اور جس طرح و جوب جمعہ کے لیے چھ شرطیں ہیں اسی طرح اس کی صحت ادا کے لیے چھ شرطیں اور ہیں مصر و فنائے مصر و غیرہ اس طرح احادیث سے بھی ثابت ہے چنانچہ بیہقی میں بروایت حضرت علی کرم اللہ وجہہ حدیث میں مروی ہے "لا جمعه الا فی مصر جا مع (اصح البہاری صفحہ ۵۲۷)

یعنی جمعہ مصر ہی میں ادا ہوتا ہے۔

یہ بطور نمونہ جمعہ کے شرائط کا ایک ایک آیت وحدیث سے اثبات کیا گیا ورنہ جمعہ کی ہر شرط آیت یا حدیث سے مستفاد ہے۔ بالجملہ شخص مذکور کا قول سراسر باطل ہے اور اس کی جہالت کی بین دلیل ہے مولی تعالی اسکو ہدایت کی توفیق دے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

(۱۱) نماز جمعہ فی الواقع مقید با شرائط ہے جیسا کہ اوپر کے جوابات سے ظاہر ہو چکا اور حدیث شریف میں اس تارک جمعہ کو منافقین میں شمار فرمایا ہے جو شرائط جمعہ کے موجود ہوتے ہوئے ادائے جمعہ پر قادر ہو کر بقصد جمعہ ترک کرے، چنانچہ الفاظ حدیث سے خود ظاہر ہے" من ترك الجمعة من غير ضر و ر ة كتب منا فقا" لیکن جو شرائط مفقود ہونے کی بنا پر جمعہ نہ پڑھے اس کو منافق کہنا مفہوم حدیث کے خلاف ہے اور اپنی رائے سے دین میں مداخلت ہے واللہ تعالی اعلم بالصواب

(۱۲) اسکا جواب نمبر ۳ میں گذرا کہ قریۂ کبیرہ میں چند مساجد میں جمعہ نہ قائم کیا جائے پھر بلا عذر محض تخریب جامع مسجد کی نیت سے کرنا بہت قبیح مذموم ہے واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۳۰)

الحمد لله رب العلمين و العاقبة للمتقين اما بعد سلام وآداب۔

عرض یہ ہے کہ جب خطیب منبر پر ہو اور موذن اذان پڑھے تو اذان کے بعد امام ومقتدیوں کو دعا

پڑھنی چاہئے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں علمائے دین کیا فرماتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ آپ پر رحمت فرمائے۔

المستفتی شبیر حسین از حسن پور

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

جمعہ کے دن خطیب کے روبرو موذن اذان ثانی کہکر فارغ ہو تو خطبہ شروع کردے۔

چنانچہ ابوداؤد شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے:

کان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم یخطب خطبتین کان یجلس اذاصعد المنبر حتی یفرغ اراه المؤذن ثم یقوم فیخطب ثم یجلس فلایتکلم ثم یقوم فیخطب۔

(ابوداؤد شریف مجتبائی ج۱ص ۱۶۳)

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دو خطبے پڑھتے تھے اور جب منبر پر تشریف لیجاتے اور خطبہ پڑھتے پھر بیٹھ جاتے اور کوئی کلام نہ فرماتے پھر کھڑے ہوجاتے اور خطبہ پڑھتے۔

ابوداؤد نے اپنے مراسیل میں حضرت ابن شہاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی:

بلغنا ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم کان یبدأ فیجلس علی المنبر فاذاسکت المؤذن قام فخطب فیخطب الخطبة الاولیٰ ثم جلس شیئا یسیرا ثم قام فخطب الخطبة الثانیة حتی اذا قضاها استغفرالله ثم نزل فصلی۔ (صحیح البہاری۔ ج۲ص ۵۳۲)

ہمیں یہ بات پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خطبہ شروع کرتے اور منبر پر جلوس فرماتے پس جب موذن خاموش ہوجاتا تو کھڑے ہوجاتے اور خطبہ اولیٰ پڑھتے پھر کچھ دیر بیٹھتے پھر کھڑے ہوجاتے اور خطبہ دوسرا پڑھتے یہاں تک کہ جب اسے پورا فرمالیتے تو استغفار کرتے پھر منبر سے نیچے تشریف لاتے اور نماز پڑھاتے۔

ابن مندہ نے حضرت سعید بن خاطب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی:

کان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم یخرج فیجلس علی المنبر یوم الجمعة ثم یوذن المؤذن فاذ فرغ قام یخطب۔ (صحیح البہاری ج۲ص ۵۳۲)

نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لاتے اور جمعہ کے دن منبر پر جلوس فرماتے پھر جب موذن اذان کہکر فارغ ہوجاتا تو حضور کھڑے ہوجاتے اور خطبہ پڑھتے۔

طبرانی نے کبیر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی:

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اذ دخل احدکم المسجد والامام علی المنبر فلاصلاۃ ولاکلام حتی یفرغ الامام۔ (صحیح البہاری ج ۲ ص ۵۴۴)

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جب تمہارا کوئی شخص مسجد میں پہنچے اور امام منبر پر ہو تو اس کے فارغ ہونے تک نہ کوئی نماز پڑھے نہ کوئی کلام۔

پہلی تین احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم موذن کے اذان سے فارغ ہونے اور خاموش ہو جانے کے بعد خطبہ کے لئے کھڑے ہو جاتے اور خطبہ شروع کر دیتے تھے لہذا فعل شارع علیہ السلام میں اذان اور خطبہ کے درمیان دعا کرنے کی تصریح مذکور نہیں ہے اور چوتھی حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صاف طور پر یہ فرمایا کہ امام کے منبر پر پہنچنے سے فارغ ہونے تک کوئی کلام اور نماز نہیں اور ظاہر ہے کہ کلام کا عموم دعا کو بھی شامل تو اس حدیث سے دعا کی ممانعت مستفاد ہو رہی ہے اسی طرح کتب فقہ میں اس دعا کا ثبوت نہیں ملتا فقہ کی مشہور کتاب۔

درمختار میں ہے اور وہ حاوی قدسی سے ناقل ہیں۔

اذا فرغ المؤذن قام الامام۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۵۷۷)

جب اذان کہنے والے فارغ ہو جائیں تو امام خطبہ کے لئے کھڑا ہو جائے۔

ہدایہ کے متن بدایہ اور قدوری میں ہے:

اذا خرج الامام یوم الجمعۃ ترك الناس الصلاۃ والکلام حتی یفرغ من خطبتہ۔

(ہدایہ ج ۱ ص ۱۵۱ جوہرہ نیرہ ج ۱ ص ۵۲)

جب امام جمعہ کے دن نکلے تو لوگ نماز اور کلام چھوڑ دیں یہاں تک کہ امام اپنے خطبہ سے فارغ ہو جائے۔

جوہرہ نیرہ شرح قدوری میں اس عبارت کے تحت میں ہے:

المراد مطلق الکلام سواء کان کلام الناس اوالتسبیح او تشمیت العاطس اوردالسلام فی العیون المراد بہ اجابۃ المؤذن اما غیرہ من الکلام یکرہ بالاجماع۔ (وفیہ ایضا) قیل خلاف فی کلام یتعلق بالاخرۃ اماالمتعلق بامور الدنیا فمکروہ اجماعا وھذا کلہ قبل الخطبۃ وبعدھا امام فیھا فلایجوز شئ من الکلام والقرأۃ والذکر اصلاً۔

(جوہرہ نیرہ ج اص ۹۲)

مراد مطلق کلام ہے برابر ہے کہ لوگوں کا کلام ہو یا تسبیح ہو یا چھینکنے والے کے لئے دعا کرنا ہو یا سلام کا جواب ہو اور عیون میں ہے کہ کلام سے مراد موذن کے کلمات کا جواب دینا ہے لیکن اس کے سوا اور کلام تو وہ باجماع مکروہ ہے اور بعض نے کہا کہ فقہاء کا اختلاف اس کلام میں ہے جو آخرت سے متعلق ہو لیکن وہ کلام جو امور دنیا سے متعلق ہو تو وہ اجماعا مکروہ ہے اور یہ کل بحث خطبہ سے قبل اور بعد میں ہے لیکن خطبہ کے درمیان تو اس میں اصلا کوئی کلام اور قرات اور ذکر جائز نہیں۔

تنویر الابصار درمختار میں ہے: اذ خرج الامام من الحجرة ان كان والا فقيامه للصعود شرح المجمع فلاصلاة والكلام الى تمامها۔ (ردالمحتار ج اص ۵۷۴)

جب امام حجرہ میں ہو اور اس سے نکلے ورنہ اس کا منبر پر خطبہ کے لئے کھڑا ہونا تو تمام خطبہ تک نہ کوئی نماز ہے اور نہ کوئی کلام۔

علامہ شامی قولہ الی تمامہا کے تحت میں محیط اور غایۃ البیان سے ناقل ہیں:

انها يكرهان من حين يخرج الامام الى ان يفرغ من الصلاة۔

(ردالمحتار ج اص ۵۷۴)

نماز اور کلام امام کے نکلنے کے وقت سے نماز سے فارغ ہونے تک مکروہ ہیں۔

ان عبارات سے یہ واضح ہو گیا کہ امام موذن کی اذان سے فارغ ہونے کے بعد ہی خطبہ کے لئے کھڑا ہو جائے تو اذان کے بعد اگر دعا ہوتی تو فقہاء کرام اس کی تصریح فرماتے لہذا ثابت ہوا کہ اذان وخطبہ کے درمیان کوئی دعا مسنون نہیں نیز متون فقہ میں یہ مسئلہ موجود ہے کہ خروج امام سے فراغت خطبہ تک کوئی کلام ونماز نہیں شارحین فرماتے ہیں کہ عین خطبہ میں تو مطلق کلام ممنوع حتی کہ قرات وذکر بھی ناجائز اب رہا خطبہ کا قبل وبعد تو اس میں کلام دنیوی تو باجماع مکروہ ہے لیکن اجابت موذن وذکر وتسبیح اور جواب سلام وغیرہ کلام اخروی انہیں بھی لفظ کلام کے عموم داخل کر کے نفی کر دیا گیا تو دعا کلام ہوئی اور کلام کا خروج امام سے فراغت نماز تک مکروہ ہونا بتصریح فقہ ثابت ہے اور یہ دعا خروج کے بعد یا کہ اذان کے بعد میں ہے تو اس دعا کا مکروہ ہونا انہیں عبارات سے ہے بلکہ اس دعا کی کراہت خود قول امام اعظم علیہ الرحمہ سے مستفاد ہے۔

مراقی الفلاح میں ہے: كان ابو حنيفة رحمة الله عليه يكره تشميت العاطس ورده

السلام اذا خرج الامام حتی یفرغ من صلاتہ ۔ (طحطاوی ص ۳۰۱)

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ چھینکنے والے کے لئے دعا کو اور سلام کے جواب کو خروج امام سے فراغت نماز تک مکروہ قرار دیتے تھے۔

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ جب خروج امام سے فراغت نماز تک جواب سلام مکروہ جو شرعا ضروری بھی ہے تو یہ دعا تو نہ شرعا ضروری ہے نہ سنت لہذا اس درمیان میں دعا کی کراہت کیوں نہ ہوگی خاص کر وہ وقت اجابت جس میں دعا کی بکثرت احادیث میں ترغیب ہے لیکن اس وقت میں زبان سے دعا کرنے کی اجازت نہیں صرف قلب سے دعا کرنا مسنون قرار دیا گیا۔

چنانچہ علامہ شامی اسی ساعت اجابت کے متعلق فرماتے ہیں۔

وفی ھذہ الساعة اقوال اصحها او من اصحها انها فیما بین ان یجلس الامام علی المنبر الی ان یقضی الصلاة کما هو ثابت فی صحیح مسلم عنه صلی اللّٰہ تعالیٰ علیه وسلم ایضا حلیه. قال فی المعراج سن الدعا بقلبة لابلسانه لانه مامور بالسکوت ۔

(ردالمحتار ج ا ص ۵۷۸)

ساعت اجابت میں چار اقوال ہیں اصح قول یہ ہے کہ وہ ساعت امام کے منبر پر بیٹھنے سے فراغت نماز تک کے درمیان ہے جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت سے ثابت ہے جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی حلیہ معراج میں کہا کہ دعا قلب سے مسنون ہے زبان کے ساتھ نہیں کیونکہ سکوت کا حکم کیا گیا ہے۔

تو یہ دعا جس کا ذکر احادیث میں بھی نہیں اس کو زبان سے کس طرح کیا جائے گا بالجملہ اذان ثانی کے بعد زبان سے دعا کرنے کی بلا کراہت اجازت نہ احادیث سے ثابت نہ تصریحات فقہاء سے ظاہر نہ قول امام سے مستفاد اب اسکے محض رواج کو پیش کرنا کوئی دلیل شرعی نہیں رسم کو سند بنانا کسی عاقل کا کام نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۳۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

موضع بھکاری پور میں دو مسجدیں ہیں۔ایک چھوٹی مسجد اور ایک بڑی جامع مسجد جس میں ستراسی سال سے زائد جمعہ قائم اور ہوتا آیا ہے۔آبادی اس گاؤں کے کل مسلمان نماز جمعہ میں آجاتے ہیں تو بڑی جامع مسجد موضع بھکاری پور کی بھر جاتی ہے۔اور کچھ مختصر نمازی مسجد کے دروازے کے باہر انتظام کے ساتھ نماز جمعہ پڑھ لیتے ہیں۔ایسا اتفاق رمضان المبارک میں الوداع کو ہو جاتا ہے یا کثرت نمازیوں کے علاوہ رمضان المبارک کے اور زمانے میں کبھی جامع مسجد بھر جاتی ہے اور کبھی خالی رہ جاتی ہے۔ایک جگہ نماز جمعہ ہونے میں شوکت اسلام اور اتفاق واتحاد آپس میں مسلمانوں کا ظاہر ہوتا ہے۔ویسے تو گاؤں میں دنیاوی رنجش نا اتفاقیاں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔مگر نماز جمعہ اور عیدین ایک جگہ گاؤں کے کل مسلمان جمع ہو کر مل جل کر پڑھنے میں میل ملاپ اسلامی شان وشوکت اتفاق محبت میں بڑی ترقی تقویت ہوتی ہے، کتاب قانون شریعت بیان جمعہ میں لکھا ہے کہ جمعہ شعائر اسلام سے ہے اور جامع جماعت ہے یعنی عند المومنین۔اب قریب ایک ماہ سے دوسرے چھوٹی مسجد میں جمعہ پڑھنے لگے ہیں جس میں کل اہل محلہ کا اتفاق نہیں۔کچھ جامع مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے جاتے ہیں۔اور بقیہ چھوٹی مسجد میں جمعہ پڑھتے ہیں۔

دریافت طلب یہ امر ہے جس میں اسلام کی شوکت گھٹتی کم ہوتی ہو اور محلہ میں سے کچھ اتفاق نہ کرتے ہوں۔اور محلہ اور گاؤں میں اسلامی اتحاد میں فرق آتا ہو۔اور مسلمانوں کی جماعت کے ٹکڑے ہوتے ہوں ایسی صورت میں جامع مسجد کو چھوڑ کر چھوٹی مسجد میں جمعہ پڑھ سکتے ہیں جمعہ ہو جائیگا یا نہیں؟اور پڑھنے پڑھانے سے رک جانا چاہئے یا نہیں؟۔دونوں مسجدوں کی تعمیر سو سال زائد کی ہیں ابھی تک چھوٹی مسجد میں امام مقرر نہیں تھا ایک ماہ ہوا امام مقرر کرنے پر جمعہ بھی قائم کر لیا ہے آبادی مردم شماری دو ہزر جس میں آٹھ سو نابالغ بچے لڑکے لڑکیاں۔چھ سو عورتیں اور چودہ سو مرد بالغ ہیں۔دونوں مسجدوں میں جمعہ ہو جائیگا یا نہیں؟شرع مطہرہ سے آگاہی فرمائی جاوے۔

المستفتی،مقبول احمد شاہ بھکاری پور ڈاکخانہ خاص ضلع پیلی بھیت۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ایسے موضعات میں جمعہ کی نئی جماعت قائم نہیں کی جاسکتی۔لہذا چھوٹی مسجد میں نئی جماعت کا قائم کرنا ہی غلط ہے اور بڑی مسجد میں جب زمانہ دراز سے جمعہ کی جماعت قائم ہے تو نہ اس جمعہ کو بند کیا جائیگا اور نہ اس کی جماعت کو توڑا جائیگا اور نہ ایسے موضع میں دو جمعہ کی جماعتیں کی جائیں نہ مسلمانوں کے

اتحاد اتفاق کو ٹھیس لگائی جائے بلکہ سب لوگ صرف بڑی مسجد میں نماز جمعہ پڑھا کریں اور اس کے بعد چار رکعت فرض وقت ظہر کی ضرور پڑھا کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ المتوسل النبی المرسل العبد الارذل محمد اول بن المفتی مولٰینا الحاج محمد اجمل

نائب مفتی اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل ۴ ربیع الاول ۱۳۷۷ھ

الجواب صحیح محمد اجمل غفرلہ عزوجل مفتی مدرسہ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل۔

مسئلہ (۴۳۲)

کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین نسبت مسائل کے حوالہ جات قرآن واحادیث سے جواب عنایت فرمایا جائے

کیا خطبہ جمعہ کے دوران میں اردو اشعار پڑھنا چاہئے؟۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

جائز ہے مع الکراہۃ اور خلاف سنت متوارثہ۔ ہدایہ میں ہے۔

یجوز عند العجز الا انه یصیر شیئا لمخالفة السنة المتوا رثه

تو جب عربی سے عاجز ہونے کی صورت میں بھی اردو میں خطبہ پڑھنا خلاف سنت متوارثہ ثابت ہوا تو باوجود قدرت کے اردو کے اشعار پڑھنا کیسے خلاف سنت متوارثہ نہ ہونگے۔ واللہ اعلم

کتبہ المتوسل بالنبی المرسل العبد الارذل محمد اول بن المفتی

مولٰینا الحاج محمد اجمل نائب مفتی اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

یکم جمادی الاخرہ ۱۳۷۷ھ

الجوب صحیح محمد اجمل غفرالله عز وجل بلدة سنبهل

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۳۳)

کیا فرماتے ہیں علماء دین اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) میں چنگی حسن پور میں ملازم ہوں۔ صبح ۸ بجے سے شام کے ۸ بجے تک ۱۲ گھنٹہ ڈیوٹی رہتی

ہے۔ایک مہینہ کی ڈیوٹی ایک چنگی پر رہتی ہے۔جس میں پندرہ دن رات کو ڈیوٹی دینی پڑتی ہے اور پندرہ دن دن میں کیش ہر وقت رہتا ہے، مال آتا رہتا ہے ایسی حالت میں چنگی چھوڑ کر نماز جمعہ نہیں پڑھ سکتا اس حالت میں ہر مہینہ دو یا تین جمعہ نکل جاتے ہیں۔جب کہ مولویوں کا مسئلہ ہے کہ اگر ایک جمعہ چھوٹ جائے تو یہ ہو جاتا ہے اور دوسرے پر یہ اور تیسرے پر یہ لہٰذا مجھے بتایا جائے کے میرے لئے کیا حکم صادر ہوتا ہے واللہ اعلم جب ایسی حالت میں میں پابند غلام کے مانند ہوں اور میرے لئے شرعی حکم کیا ہے؟۔

(۲) محصول چنگی آرندہ مالی کو چھپا کر لیجانا اسلامی قانون کیا ہے اور ملازم چنگی کو آرندہ مال سے ملکر محصولی پیسہ بچانا کیسا حکم۔معہ حدیث اور دلائل سے بتایا جائے۔

المستفتی، منشی مہربان حسن منشی عبدالرحمٰن لال باغ چنور

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) بلا شبہ نماز جمعہ فرض ہے اور یہ کوئی ایسی مجبوری نہیں ہے جس کی بنا پر جانب شرع سے ترک جمعہ کی اجازت مل سکے۔ہفتہ بھر میں صرف نماز جمعہ کے لئے کس طرح کا انتظام کیا جائے چاہے اتنے وقت کے لئے کسی کو پیسہ دیکر مقرر کیا جائے۔یا اتنے وقت کی پابندی کو مستثنٰی کرایا جائے ورنہ پھر ایسی ملازمت شرعاً جائز نہیں جس میں ترک فرائض کرنا پڑے۔

(۲) چھپ کر مال آرندہ سے ملازم چنگی کو کوئی پیسہ حاصل کرنا ممنوع ہے اسی طرح مال آرندہ کو اپنے حال کو چھپا کر نہ لیجانا چاہیے۔فقط کارڈ میں دلائل قرآن وحدیث نہیں لکھے جا سکتے اس لئے مجبوری ہے۔یکم اگست ۱۹۵۸ء

مسئلہ (۴۳۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
کوئی شخص نماز جمعہ میں قعدہ اخیرہ میں زریک ہوا تو اس کو جمعہ کی نماز ملی یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

نماز جمعہ کے قعدہ اخیرہ میں جو شخص شامل جماعت ہو گیا وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد صرف دو رکعت فرض جمعہ پڑھے کہ اس نے یقیناً جمعہ پالیا ہے۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۳۵)

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین ان مسائل میں کہ
اذان ثانی جمعہ میں کہاں کھڑا ہو کر کہنا چاہئے؟ اور صلوۃ قبل از جماعت اور جماعت میں قد قامت الصلوۃ پر کھڑے ہونا واسطے نماز با جماعت میں۔ مدلل مع حوالہ کتاب کے جواب باصواب سے سرفراز فرمائیے، بینوا توجروا سائل، چندا میاں حیات نگر ضلع مراد آباد یوپی

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

جمعہ میں اذان ثانی یعنی خطبہ کی اذان کا خارج مسجد میں ہونا حدیث شریف سے ثابت ہے۔ ابو داؤد شریف میں حضرت سائب رضی اللہ عنہ سے مروی "كان يوذن بين يدي رسول الله ﷺ اذا جلس على المنبر يوم الجمعة على باب المسجد وابى بكر وعمر الخ"
(ابوداؤد مجتبائی ص ۱۶۲)

حدیث کا مضمون یہ ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ بروز جمعہ منبر پر تشریف فرما ہو جاتے تو دروازہ مسجد پر حضور کے سامنے اذان دیجاتی تھی اسی طرح خلافت صدیقی و فاروقی میں ہوتا رہا۔

اس حدیث شریف سے ثابت ہو گیا کہ خطبہ سے پہلے جو اذان ثانی ہوتی ہے وہ زمانہ نبوی سے برابر منبر کے مقابل دروازہ مسجد پر ہوتی رہی کسی بھی حالت میں اس کو مسجد کے اندر نہیں دیا گیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ دروازہ مسجد خارج مسجد ہوتا ہے تو اس اذان کا مسجد سے باہر ہونا مسنون قرار پایا، اسی بنا پر فقہاء نے اذان کو مسجد کے اندر کہنا ممنوع قرار دیا۔ فتاوی قاضی خاں و فتاوی عالمگیری میں ہے:

ينبغي ان يوذن على المأذنة او خارج المسجد ولا يوذن فى المسجد"

تو خطبہ سے پہلے اس اذان ثانی کا خارج مسجد میں خطیب کے سامنے ہونا حدیث شریف اور کتب فقہ سے ثابت ہو گیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب اذان کے بعد جو دوسرا اعلان کیا جاتا ہے اس کو تثویب کہتے ہیں بکثرت کتب فقہ میں اس تثویت کو جائز لکھا ہے لیکن اس تثویب کے لئے الفاظ خاص متعین نہیں ہیں اور صلاۃ وسلام کے الفاظ تثویب میں ۷۸۱ھ میں جاری ہوئے فقہاء نے انہیں جائز بلکہ

مستحسن قرار دیا۔ چنانچہ فقہ کی مشہور کتاب درمختار میں ہے:

التسلیم بعد الاذان حدث فی ربیع الاول اخر سنة سبعمائة واحدی وثمانین فی عشاء لیلة الاثنین ثم یوم الجمعة ثم بعد عشرین حدث فی الکل الا المغرب ثم فیھا مرتین وھو بدعة حسنة۔ (درمصری ج۱ ص۲۷۳)

تو اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ اذان کے کچھ دیر کے بعد قبل از جماعت صلوۃ وسلام کہنا نہ فقط جائز بلکہ مستحسن ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

قد قامت الصلوہ سے پہلے حی علی الفلاح پر مقتدیوں کو کھڑا ہونا چاہئے اور اس سے پہلے کھڑا ہو جانا مکروہ ہے فتاوی عالمگیری میں ہے:

" اذدخل الرجل عند الاقامة کره له الا نتظار قائما ولکن یقعد ثم یقوم اذا بلغ المؤذن قوله حی علی الفلاح کذافی المضمرات ان کان المؤذن غیر الامام وکان القوم مع الامام فی المسجد فانه یقوم الامام والقوم اذاقال المؤذن حی علی الفلاح عندعلمائنا الثلثة وھو الصحیح "۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۱۹ جماع الاخریٰ ۱۳۷۸ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۳۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتین شرع متین مسائل ذیل کہ

(۱) آیا گاؤں میں نماز جمعہ ائمہ اربعہ کے مذہب میں پڑھنی جائز ہے یا نہیں؟۔

(۲) جس گاؤں میں نماز جمعہ پڑھی جاتی ہو آیا اس گاؤں میں ان لوگوں کو جو گاؤں میں عدم جواز جمعہ یا تساہل کی وجہ سے نماز جمعہ میں شامل نہ ہوئے ہوں واقعی جمعہ کے دن نماز ظہر کا باجماعت یا فردا فردا نماز جمعہ سے قبل یا بعد جامع مسجد یا دیگر مسجدوں میں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب میں پڑھنا مطلقا حرام ہے یا کیا؟۔

(۳) مسلمانوں کو ہندو کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا کھانا یا بھرا ہوا پانی پینا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ یا دیگر ائمہ کے مذہب میں شرعا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو آیت (انما المشرکون نجس۔الخ) کا کیا جواب؟ اگر نا جائز ہے تو کن وجوہات کی بنا پر؟۔

(۴) مسلمان قصاب کو گوشت فروخت کرنے کے لئے روزمرہ خود ذبیحہ کا ذبح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نا جائز ہے تو کن وجوہات وواقعات کی بنا پر؟ ۔(بینوا توجروا)

(نوٹ) ہر ایک سوال کا جواب بمع وجوہات کتب معتبرہ فقہ وحدیث سے بمع ترجمہ اردو عبارت عربیہ مفصل ومدلل تحریر فرما کر مشکور فرمادیں۔ تا کہ جواب الجواب کی نوبت نہ آنے پائے۔

المرسل۔ چودہری نصر اللہ خاں طالب علم مدرسہ عربیہ حاجیوالہ
ڈاکخانہ خاص تحصیل وضلع گجرات ۴۲۔۱۰۔۱۶

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) حنفیہ کے نزدیک گاؤں میں جمعہ واجب نہیں، حدیث شریف میں ہے جس کو طبرانی نے اوسط میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کیا:

قال رسول الله ﷺ خمسه لا جمعة عليهم المراة والمسافر والعبدوالصبى واهل البا دية۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچ وہ شخص ہیں جن پر جمعہ نہیں، عورت، مسافر، غلام، گاؤں والے، بچے۔

ہدایہ میں ہے: لا تصح الجمعة الافى مصر جامع او فى مصلى المصرو لا تجوز فى القرى لقوله عليه السلام: لا جمعة ولا تشريق ولا فطرولا اضحى الا فى مصر جامع۔

جمعہ شہر یا اس کی عیدگاہ ہی میں صحیح ہے اور گاؤں میں جائز نہیں، حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جمعہ اور تشرق اور فطر اور اضحیٰ شہر ہی میں ہے۔

غنیۃ شرح منیہ میں ہے:

الشرط الاول المصراوفناء ه فلا تجو ز فى القرى عندنا وهو مذهب على ابن ابى طالب وحذيفة عطاء والحسن بن ابى الحسن والنخعى ومجا هد وابن سيرين والثورى وسخنو ن خلا فا للائمه الثلة۔

جمعہ کی پہلی شرط شہر یا فنائے شہر ہے۔ تو ہمارے نزدیک جمعہ گاؤں میں جائز نہیں اور یہی حضرت امیر المومنین علی اور حذیفہ اور عطاء اور حسن ابن ابی الحسن اور نخعی اور مجاہد اور ابن سیرین اور ثوری اور سخنون کا

مذہب ہے، ائمہ ثلثہ اس کے خلاف ہیں۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ حنفیہ کے نزدیک گاؤں میں جمعہ جائز نہیں اور ائمہ ثلثہ اس کے خلاف ہیں۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۲) جس گاؤں میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے تو بلحاظ مصالح دینی کے اسے بند نہ کیا جائے گا۔ کما فصلنا ہ فی فتاونا۔ لیکن ان لوگوں کو فرض ظہر پڑھنا ضروری ہے۔ شامی میں ناقل جواہر سے ہے:

لو صلو افی القری لزمهم اداء الظهر "۔ اگر گاؤں میں جمعہ پڑھا تو ان پر ادائے ظہر لازم ہے۔ اب چاہے یہ لوگ فرض ظہر فردا فردا پڑ ہیں یا با جماعت۔

کبیری میں ہے:

ويكره للمعذورين والمسجو نين اداء الظهر بجما عة فى المصريو م الجمعة سواء كا ن قبل الفراغ من الجمعة او بعده لا ن الجمعة جا معة للجما عات فينبغى ان لا تكو ن جما عة غير ها فى المصر الذى هى فيه ولئلا يتطرق الى الاقتداء بهم غيرهم بخلا ف اهل القرى لانه لا جمعة عليه فكان هذا اليو م فى حقهم لغير ه كا لايام ۔

اس عبارت کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ معذورن اور قیدیون کو جمعہ کے دن نماز جمعہ سے قبل یا بعد شہر میں فرض ظہر کا با جماعت پڑھنا مکروہ ہے اور گاؤں میں فرض ظہر کا با جماعت پڑھنا مکروہ نہیں یعنی بلا کراہت جائز ہے۔

بالجملہ گاؤں میں ظہر کا پڑھنا فرض ہے چاہے کے وہ جمعہ کی جماعت میں شامل بھی ہو چکا ہو واللہ تعالی اعلم بالصواب،

(۳) آیت کریمہ " انما المشر کو ن نجس " کی تفسیر میں علامہ ابو البرکات نسفی تفسیر مدارک میں فرماتے ہیں:

انهم لا ينظهرو ن ول يغتسلو ن ولا يجتنبون النجا سا ت فهى ملا بسة لهم

(مدارک مصری ص ۹۳ ج ۲)

بیشک مشرکین طہارت نہیں کرتے اور غسل نہیں کرتے اور نجاستوں سے پرہیز نہیں کرتے تو نجاست ان کے ملابس ہو گئی یعنی وہ نجاست والے ہوئے۔

ہندوں کے پلید مزاجوں اور گندی طبیعتوں کے بھی دن رات مشاہدے ہوتے ہیں اور انکا نجا

ستوں سے پرہیز نہ کرنا ایسی نا قابل انکار بات ہے جسکے لئے ثبوت کی کوئی حاجت نہیں۔ پھر مسلمانوں کو ان کے ہاتھوں کے پکائے ہوئے کھانے اور پانی سے کیوں نہ احتیاط کرنی چاہیے خصوصا وہ مسلمان کے ہاتوں کی چیزوں سے کمال درجے کی احتیاط کرتے ہیں اور انکا کھانا پینا کسی طرح گوارہ نہیں رکھتے تو نہایت شرم وغیرت کی بات ہے کہ مسلماں طاہر وپاک ہوکران ناپاکوں کے ہاتھ کی چیزیں کھائیں اور جواز کی آڑلیکر احتیاط کی صورت مٹائیں اور بمقابلہ کفار کے اپنی اسلامی شان گھٹائیں اور اپنی بیداری وحیات کے فنا ہوجانے کی یہ شرمناک تصویر اہل دنیا کو دکھائیں۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۴) مسلمان قصاب کا ذبیحہ بلاشک جائز ہے۔ تنویر الابصار ودرمختار میں ہے:

شرط کو ن الذابح مسلما ۔ یعنی ذبح کرنے والا مسلمان ہونا شرط ہے۔

کنز الدقائق میں ہے: وحل ذبیحة مسلم۔ یعنی مسلمان کا ذبیحہ حلال وجائز ہے۔

اور اگر اس کا محتاط اور دیندار ہونا قابل اعتماد نہ ہو تو اسی بنا پر اس سے احتیاط کیجائے، تو یہ ناجائز ہونے کی بنا پر نہیں ہے بلکہ صرف احتیاط کی بنا پر ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۳۷)

ما قولكم دام فضلكم؟ بلدة فى فنائها محطة الريل و مدرسة الا نكليزية الكبيرة وبوسطه محطة الشرطية (پولیس اسٹیشن) وفى قرب المحطة ارض عمر فيها عمارة على سكونة المسافرين (مسافر خانه) وفى تلك الارض ايضا بنى عمارة للعبادة يصلى فيها الجماعة فى كل الاوقات مع جم غفير من الطلباء الانكليزية وهم خمسة وعشرون بعد المأة وهذه العمارة ليس فيها محراب العرفى ولا المنبر العرفى بل يفرش للامام خاصة مصلى ولا يرفع الاعند التنظيف فهل يجوز ان تقام الجمعة فى البقعة المذكورة ام ل؟! فصلوا فى الجواب وفصلوا فى الثواب۔

هل يحصل الفضيلة فى تلك البقعة مع الكمال ام ل؟! فما ذا يفعل لتحصيل الفضيلة الكاملة والارض والعمارات موقوفة فهل يجوز ان تجعل تلك العمارة مسجدا حقيقيا ام لا؟ بینوا توجروا ۔ المستفتی مولوی احمد الملی باری ۲۶ رجب المرجب ۱۳۶۲ھ

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الكريم

شرط صحة الجمعة ان يكون المصر وفناءه وصرح بالمصر فی تحفة الفقهاء عن ابی حنيفة عليه الرحمة انه بلدة كبيرة فيها سكك واسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمه وعلمه اوعلم غيره يرجع الناس اليه فيما يقع من الحوادث وهذا هوالاصح كما فی الغنية والعينی والشامی وغيرهم وصرح العينی شرط ادائها ای اداء صلوٰة الجمعة المصرفلا تجوز فی القری ولا مفازة، يقول علی رضی الله تعالی عنه: لا جمعة ولا تشريق ولا صلوٰة فطرولا اضحی الافی مصر جامع فان صدق علی هذه البلدة حد المصر بتمامها تقام الجمعة فيها وفی فنائها ولا يلزم فی فناء المصران يكون مسجد او اذاكانت هذه البقعة فناء المصر يحصل فضيلة الجمعة فيها. والله تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۳۸)

علمائے دین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں کہ

جامع مسجد کو خالی رکھ کر قرب وجوار کی مسجدوں میں نماز جمعہ ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز خصوصا ان مساجد میں جہاں پر کہ جامع مسجد کی اذان وقرات اچھی طرح سنتے ہیں نیز جامع مسجد شہر یا ل کیلئے کافی گنجان ہے برائے کرم اس بارے میں فتوے صادر فرما کر مشکور فرمادیں کہ تعدد جمعہ جائز ہو کر بھی قرب وجوار کی مساجد میں نماز جمعہ ادا کر کے مسجد جامع کو خالی رکھنا جائز ہے یا نہیں؟۔

المستفیان مسلمانان قصبہ اسلام آباد کشمیر بذیعہ واعظ جلدم محمد وطاہر وپردیشی۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الكريم

علاوہ جامع مسجد کے اور مساجد میں جواز جمعہ میں تو کوئی شک ہی نہیں ہوسکتا کہ تعدد جمعہ کا قول

مفتی بہ ہے۔ درمختار میں ہے۔ تودی الجمعة فی مصر واحد بمواضع کثیرة مطلقا علی المذهب وعلیه الفتوی۔ (ردالمحتار ص ۵۶۵ ج ۱)

اور جامع مسجد میں جمعہ کا ادا کرنا افضل واولی ہے۔ چنانچہ الاشباہ والنظائر میں ہے۔

اعظم المساجد حرمة المسجد الحرام ثم مسجد المدینة ثم مسجد بیت المقدس ثم الجوامع ثم مساجد المحال۔ (اشباہ ص ۵۶۱)

غنیۃ میں ہے: والافضل هو الجامع الواحد وذلك للخروج من الخلاف الخروج من العهدة بیقین ۔

اور ردالمحتار میں ہے: والحاصل ان بعدالقدس الجوامع ای المساجد الکبیرة الجامعة للجماعة الکثیرة لکن الاقدم منها افضل۔ ۔ (درالمحتار ص ۴۶۴ ج ۱)

لہذا اقرب وجوار کی مساجد میں جمعہ پڑھنا خلاف اولے اور ترک افضل ہے بلکہ حق جامع مسجد کو باطل کرنا ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ

(۴۳۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ان مسائل میں

(۱) ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟۔

(۲) ہندوستان میں جمعہ فرض ہے یا نہیں؟۔

(۳) ایک امام جمعہ کی نماز بہ نیت نفل پڑھائے تو کیا مقتدیوں کی نماز جمعہ جو بہ نیت فرض پڑھتے ہیں ادا ہو جائیگی یا نہیں؟ اور جن مقتدیوں نے اس کے پیچھے جمعہ پڑھا ہے ان کے ذمہ سے فرض وقت یعنی فرض ظہر ساقط ہو گیا یا نہیں؟۔

(۴) جمعہ کے فرض کے بعد جو چار رکعت سنت پڑھتے یہ جناب رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں یا زمانہ اقدس کے بعد علماء نے ایجاد کئے ہیں؟۔ بینوا توجروا۔

الجواب

(۱) ہندوستان ہمارے امام اعظم ابوحنیفہ وامام ابویوسف وامام محمد رحمہم اللہ تعالی کے مذہب کی تصریحات کی بنا پر ہرگز ہرگز دارالحرب نہیں ہے بلکہ دارالاسلام ہے۔فتاوے عالمگیری میں ہے:

اعلم ان دارالحرب تصیر دارالاسلام بشرط واحد وهو اظهار حكم الاسلام فيها قال محمد فی الزيادات: انما تصير دار الاسلام دارالحرب عند ابی حنيفة بشروط ثلاثة۔احدهما اجراء احكام الكفار على سبيل الاشتهار وان لا يحكم فيها بحكم الاسلام۔ والثانی ان تكون متصلة بدار الحرب لا يتخلل بينهما بلد من بلاد الاسلام۔ الثالث ان لا يبقى فيها مومن ولاذمی آمنا بامانه الاولى الخ۔

(عالمگیری ص۲۶۹ ج۲)

جانو کہ دارالحرب ایک شرط سے دارالاسلام ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں اسلام کے احکام علانیہ طور پر جاری ہوں۔ امام محمد نے زیادات میں فرمایا کہ امام اعظم کے نزدیک دارالاسلام کے دارالحرب ہو جانیکی تین شرطیں ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں احکام کفار علانیہ طور پر جاری ہوں اور احکام اسلام مطلقا نہ جاری ہوں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ یہ دارالحرب دوسرے دارالحرب سے ایسا متصل ہو کہ ان کے درمیان بلاد اسلامیہ میں سے کوئی شہر نہ ہو۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اس میں کوئی مسلمان اور ذمی اسلام کی اپنی پہلی امان پر باقی نہ ہو۔

مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں ہے:

دارالحرب تصير دارالاسلام باجراء احكام الاسلام فيها كاقامة الجمعة والاعياد وان بقى فيها كافر اصلى وان لم يتصل بدار الاسلام (مجمع الانہر مصری ص۶۵۹ ج۱)

دارالحرب میں جمعہ اور عید قائم کرنیکا احکام اسلام جاری ہو جانے کی بنا پر وہ دارالاسلام ہو جاتا ہے اگرچہ اس میں کفار باقی رہ جائیں اور وہ دارالاسلام سے نہ ملے۔

درمختار وتنویرالابصار میں ہے:

دارالحرب تصير دارالاسلام باجراء احكام اهل الاسلام فيها كجمعة وعيد وان بقى فيها كافر اصلى وان لم تتصل بدار الاسلام (شامی مصری ص۲۶۱ ج۳)

دارالحرب میں جب احکام مسلمین جاری ہو جائیں تو وہ دارالاسلام ہو جاتا ہے اگرچہ اس میں کافر اصلی باقی رہیں اگرچہ وہ دارالاسلام سے متصل نہ ہو۔

علامہ شامی طحطاوی سے ناقل ہیں:

لو اقرت احکام المسلمیں واحکام اهل الشرك لا تکو ن دارحرب

(رالمحتار مصری ص ۲۶۱ ج ۳)

اگر کہیں احکام مسلمیں اور احکام مشرکین دونوں جاری ہوں تو وہ دارالحرب نہ ہوگا۔

ان عبارات سے آفتاب کی طرح روشن ہو گیا کہ جب ہندوستان میں مسلمان جمعہ وعیدین۔اذان واقامت۔نماز باجماعت وغیرہ احکام اسلام علی الاعلان ادا کرتے ہیں اور ہندوستان کو اور کوئی دارالحرب احاطہ نہیں کر رہا ہے بلکہ دو جانبیں بلاد اسلامیہ سے متصل ہیں تو یہ دارالحرب کس طرح قرار دیا جاسکتا ہے۔اب باقی رہا یہ شبہ کہ اس میں احکام مشرکین بھی جاری ہیں تو اس شبہ کو طحطاوی کی عبارت نے صاف کر دیا کہ جہاں احکام مسلمین اور احکام مشرکین دونوں جاری ہوں تو وہ دارالحرب نہیں۔لہذا اب باوجود ان عبارات کے ہندوستان کو دارالاسلام نہ کہنا اقوال ائمہ کی مخالفت ہے اور تصریحات فقہا سے انکار ہے اور اپنی عقل وفہم کی دین میں مداخلت ہے۔مولیٰ تعالے قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۲) بلاشبہ جمعہ فرض ہے۔مراقی الفلاح میں ہے:

صلواة الجمعه فرض عين با لكتاب والسنة والاجمع (طحطاوی مصری ص ۲۹۱)

قرآن اور حدیث اور اجماع سے نماز جمعہ فرض عین ہے۔

اب باقی رہا یہ عذر کہ جمعہ پڑھنے کیلئے بادشاہ کا ہونا شرط ہے اور ہندوستان میں بادشاہ اسلام نہیں ہے بلکہ کفار کی حکومت ہے تو جمعہ کی شرط ہی نہیں پائی جاتی۔لہذا جمعہ فرض ہی نہیں ہوا۔اس عذر کا جواب کتابوں میں موجود ہے کہ جہان بادشاہ اسلام نہ ہو اور کفار کی حکومت ہو تو وہاں مسلمانوں کو جمعہ وعید قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔طحطاوی میں مجمع الفتاوے سے ناقل ہیں:

غلب على المسلميں ولا ة الكفار يجوز للمسلمين اقامه الجمع والاعيا د

(طحطاوی مصری ص ۲۹۴)

کفار کے والی مسلمانوں پر غالب آگئے تو مسلمانوں کیلئے عیدوں اور جمعوں کا قائم کرنا جائز ہے،

فتاوی عالمگیری میں ہے: بلا د عليها ولا ة الكفار يجو ز للمسلميں اقامة الجمعة۔

(عالمگیری ص ۵۷ ج ۲)

جن شہروں پر کفار کے احکام ہوں تو مسلمانوں کو جمعہ کا قائم کرنا جائز ہے۔

ردالمحتار میں ہے: اما فی البلاد علیھا ولاۃ الکفار فیجوز للمسلمین اقامۃ الجمع والعیاد (ردالمحتار مصری ص۲۶۱ ج۳)

احکام کفار جن شہروں میں مسلط ہوں تو اہل اسلام کیلئے عیدوں اور جمعوں کا قائم کرنا جائز ہے۔

صاحب درمختار شرح ملتقی میں فرماتے ہیں:

اذالم یکن احد من ذکر (ای من السلطان ونائبہ) فللناس ان یجتمعوا علی واحد یصلی بھم للضرورۃ (شرح ملتقی ص۵۶۵ ج۱)

جب بادشاہ اسلام اور اس کے نائب میں سے کوئی موجود نہ ہو تو ضرورۃ لوگ ایک شخص پر اتفاق کرلیں کہ وہ انہیں نماز جمعہ پڑھائے۔

غنیۃ شرح منیہ میں ہے:

فان لم یکن احد من ھولاء (ای السلطان ونائبہ) فاجتمع الناس علی واحد فصلی بھم جاز۔ (غنیۃ مطبوعہ لکھنو ص۵۱۳)

بادشاہ اسلام اور اس کے نائب میں سے جب کوئی نہ ہو تو لوگ ایک شخص پر اتفاق کرلیں اور وہ انہیں نماز جمعہ پڑھائے تو جائز ہے۔

ان عبارت سے صاف یہ نتیجہ نکل آیا کہ ہندوستان میں اگرچہ کفار کی حکومت ہے اور بادشاہ اسلام نہیں لیکن جمعہ کی صحت کیلئے اسقدر کافی ہے کہ مسلمان جمعہ وعیدین قائم کرتے ہیں اور ایک شخص کو امام مقرر کرتے ہیں ۔لہذا ہندوستان میں جمعہ کا فرض ہونا ثابت ہوا اور ادائے جمعہ سے نماز ظہر کی فرضیت ساقط ہوگئی۔اور اب کسی کا جمعہ کو نفل قرار دینا ان تصریحات فقہ کی مخالفت اور سخت نادانی وجہالت ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۳) جو امام شہروں میں نماز جمعہ بہ نیت نفل پڑھتا ہے وہ سخت غلطی کا مرتکب ہے۔پہلی غلطی یہ ہے نفل کی جماعت قائم کرتا ہے اور نفل کی جماعت ناجائز ہے۔۔ردالمحتار میں ہے۔"النفل بجماعۃ وھو غیر جائز۔ (ردالمحتار ص۵۶۶ ج۱)

دوسری غلطی یہ ہے کہ وہ فرض پڑھنے والوں کی امامت کرتا۔ہے باوجودیکہ مسئلہ یہ ہے کہ فرض پڑھنے والا نفل پڑھنے والے کی اقتدا نہیں کرسکتا۔

غنیۃ میں ہے۔ ص ۴۸۱، لا یقتدی المفتر ض بالمتنفل۔
ملتقی میں ہے۔ ص ۱۱۱، وفسدا قتداء مفتر ض بمتنفل۔
عالمگیری میں ہے۔ ص ۴۴، لا اقتدا ء مفترض بالمتنفل۔
تیسری غلطی یہ ہے کہ جب اس کے نزدیک جمعہ فرض نہیں تو وہ فرض وقت یعنی ظہر کو جماعت سے کیوں نہیں پڑھتا۔ جیسے قریہ جات میں نماز ظہر کا باجماعت پڑھنے کا حکم ہے۔
چنانچہ عالمگیری ص ۵۷ میں ہے۔ من لا تجب علیھم الجمعة من اھل القری والبوادی لھم ان یصلی الظھر بجماعة یو م الجمعة باذان واقامة۔
بالجملہ فقہائے کرام نے تو عوام کے لئے بعد جمعہ آخر الظہر کی چار رکعتیں پڑھنے کو اسلئے فساد عظیم قرار دیا کہ وہ لوگ جمعہ کی ادائیگی میں سستی اور کسل کرینگے اور جمعہ کے فرض نہ ہونے کا اعتقاد کرلیں گے،
چنانچہ طحطاوی ص ۴۵۴ میں ہے:
وفی فعل الاربع مفسدة عظیمة و ھی اعتقا دا ن الجمعة لیست فرضا لما یشاھدون من صلو ة الظھر فتیکا سلون عن اداء الجمعة او اعتقادھم افترا ض الجمعة والظھر بعدھا۔
اور یہ امام تصریحات فقہ کے خلاف بغیر کسی دلیل کے محض اپنی ناقص فہم سے جمعہ کی فرضیت ہی کا انکار کرتا ہے تو یہ تو بہت زبردست فساد پیدا کرتا ہے اور مقتدیوں کی نماز کو فاسد کررہا ہے۔ لھذا اس امام کا یہ فعل نہایت مذموم ہے اور ان مقتدیوں کی نماز جو جمعہ بہ نیت فرض پڑھتے ہیں اس امام کے پیچھے ہرگز ادا نہیں ہوتی کہ یہ اقتدا فاسد ہے اور انکا فریضہ وقت ان کے ذمہ سے ساقط نہیں ہوتا بلکہ اس امام کے پیچھے باوجود اس اعتقاد کے ان لوگوں نے جس قدر جمعے پڑھے ہیں انکا حساب لگا کر اسی قدر قضائے ظہر پڑھنا ان کے ذمہ فرض ہے واللہ تعالی اعلم بالصواب۔
(۴) بعد جمعہ جو چار رکعتیں بہ نیت سنت پڑھی جا تی ہیں یہ واقعی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور حدیث شریف سے ثابت ہیں۔
مسلم شریف وابن ماجہ وبیہقی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:
قال رسو ل اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم: اذا صلیتم بعد الجمعة فصلو ھا اربعا،
نیز ترمذی شریف ومسلم شریف ودارمی وبیہقی میں ہے:

من کان منکم مصلیا بعد الجمعة فیصلی اربعا ''یعنی جو تم میں جمعہ کے بعد نماز پڑھے تو چار رکعتیں پڑھے۔

طبرانی اوسط میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی:

کان رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم یصلی قبل الجمعہ اربعا وبعدھا اربعا''

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے چار رکعتیں پڑھتے اور بعد میں چار رکعتیں پڑھتے۔

ان احادیث سے ثابت ہوگیا کہ جمعہ کے بعد چار رکعتوں کا پڑھنا حدیث قولی و فعلی دونوں سے ثابت ہے۔ تو انہیں جو سنت نہ کہے وہ سخت جاہل اور دین سے ناواقف ہے واللہ تعالے اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۴۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین صورت مسئولہ میں کہ

موضع اٹواں بازار میں تقریباً ساٹھ گھر مسلمانوں کے آباد ہیں اور اطراف و جوانب کے مواضعات میں جہاں مسلمان آباد ہیں یہاں مسلمانوں کی آبادی نسبتاً زیادہ ہے۔ بقائے حیات کی ضروری اشیاء یہاں بروقت مل جاتی ہیں اور ہر طرح کے ہنرمندوں اور پیشہ وروں کے لئے یہاں کسب معاش کی آسانیاں ہیں ۔زمانہ دراز نا یادگار سے یہاں عیدین اور جمعہ کی نمازیں ہوا کرتی ہیں، اور اطراف و جوانب کے مواضعات سے مسلمانان عیدین اور جمعہ کی نمازیں پڑھنے آیا کرتے ہیں، اب موضع بہٹیا میں جو موضع اٹوان بازار سے بالکل ملحق ہے اور جہاں کل بارہ گھر مسلمان ہیں ایک نو تعمیر کھپریل پوش مکان میں جو اسکول کے نام سے تعمیر کیا گیا تھا یکا یک امسال عید الفطر کے موقع پر اس بستی کے باشندوں نے جو نماز اور طہارت کے مسائل میں مہارت تامہ نہیں رکھتے ملت بیضائے اسلامیہ کی یک جہتی و اجتماعیت کو پاش پاش کر کے جماعت اسلامیہ میں افتراق و انتشار کی صورت پیدا کر دی، اور نماز عید موضع بہٹیا میں پڑھی، بعدازیں جمعہ بھی قایم کرلیا، اور اپنے اقربا اور ملنے جلنے والوں کو اٹوان بازار کی مسجد کی بجائے بہٹیا کی نو تعمیر عمارت میں نماز عیدین اور جمعہ ادا کرنے کی فہمائش شروع کر دی۔

موضع اٹواں بازار میں جمعہ کو ہاٹ لگتی ہے، اطراف و جوانب کے علاوہ دور دور کے کاروباری مسلمان خرید و فروخت کی غرض سے اٹوان بازار آیا جایا کرتے ہیں جس سے مسجد میں بہت اچھی خاصی

جماعت ہو جایا کرتی تھی، اب موضع بہٹا کے باشندوں کے اس طرز عمل سے اٹوان بازار کی مسجد اور جماعت کو شدید نقصان پہونچا ہے اور مسلمانوں میں افتراق وانتشار بھی رونما ہو گیا ہے۔

اندریں حالات موضع بہٹیا مذکور میں عیدین وجمعہ کی نمازیں پڑھنی اور قائم کرنا کتاب وسنت کے موافق ہے یا مخالف جواب باصواب دیکر عنداللہ ماجور ہوں۔

نیز یہ بھی ارقام فرمائیں کہ۔"ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعدما جاء ھم البینات واولئك لھم عذاب عظیم۔"

کا منشور خداوندی اور نص قطعی ہوتے ہوئے جو لوگ اسلامی برادری اور اجتماعیت کے خلاف عام مسلمانوں کو قبائلی جماعت بندی کی تعلیم دیکر اور حمایت کر کے جماعت اسلامیہ میں انتشار وافتراق پیدا کرتے ہیں انہیں شریعت حقہ کی روشنی مین نیکوکار اور مصلح قوم سمجھا جائے یا گمراہ کن۔ ہر ایک سوال کا جواب باصواب دیکر مسلمانوں کو افتراق وانتشار اور بے جا جماعت بندی سے بچائیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی ارقام فرمائیں کہ اسلامی اجتماعیت اور اسلامی برادری کے ہوتے ہوئے نسلی اور قبائل جماعت بندی رائج کر کے مسلمانوں میں افتراق وتشتت پیدا کرنا کیسا ہے؟ جائز ہے یا ناجائز؟ اور اسکی تلقین وہدایت کرنے والا شریعت کی اصطلاح میں کیا ہے؟۔

والسلام محمد واصل پیش امام جامع مسجد اٹوان ڈاکخانہ لکھئے پور (ضلع گیا)

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مواضعات میں جمعہ وعیدین کی جدید جماعت قائم کرنے کی شریعت اجازت ہی نہیں دیتی۔

حدیث شریف میں ہے:

لا جمعة ولا تشریق ولا صلوۃ فطر ولا اضحی الا فی مصر جامع او مدینة عظیمة۔

یعنی سوائے شہر جامع اور بڑے قصبہ کے اور کہیں جمعہ اور تشریق اور نماز عید الفطر وعید الاضحیٰ نہیں ہوتی۔

اس سے ثابت ہو گیا کہ جمعہ وعیدین کے ادا ہونے کے لئے شہر یا بڑے قصبہ کا ہونا ضروری ہے۔ تو مواضعات میں جمعہ وعیدین ادا نہیں ہوتے۔ اسی بنا پر جمعہ وعیدین کی نمازوں کی جماعت مواضعات میں قائم کرنا غیر مشروع ہے۔ البتہ جس موضع میں زمانہ دراز سے جمعہ وعیدین کی نمازیں ہوتی

چلی آرہی ہیں اس میں جمعہ وعیدین کی جماعت کو بسبب دینی مصالح کے ہرگز ہرگز بند نہیں کیا جائے گا۔اوران لوگوں کو بعد میں فرض ظہر کی چار رکعتوں کے پڑھنے کا حکم دیا جائے گا کہ ان پر ظہر کا پڑھنا فرض ہے۔علامہ شامی ردالمحتار میں جواہر سے ناقل ہیں:

لو صلوا فی القری لزمهم اداء الظهر۔ (ردالمحتار مصری۔ص ۵۶۰ ج ۱)

اگر گاؤں میں جمعہ کی نماز پڑھیں تو انہیں فرض ظہر کا ادا کرنا لازم ہے۔اور ظہر کے ادا کرنے کی صورت یہ ہے جسکو علامہ خیرالدین رملی نے تحریر فرمایا۔

فتاوے خیریہ میں ہے:

والا حتیا ط فی القری ان یصلی السنة اربعاثم الجمعة ثم ینوی اربعا سنة الجمعة ثم یصلی الظهر ثم یصلی رکعین سنة الوقت فهذا هو الصحیح المختار۔

(فتاوی خیریہ مصری ص ۱۲ ج ۱)

گاؤں میں احتیاط یہ ہے کہ پہلے چار رکعت سنت کی پڑھے پھر جمعہ پڑھے پھر چار رکعت سنت جمعہ کی نیت کر کے پڑھے پھر فرض ظہر پڑھے پھر دو رکعتیں سنت وقت کی پڑھے، یہی قول صحیح ومختار ہے۔

الحاصل صورت مسئولہ میں جب موضع اٹواں میں زمانہ دراز سے جمعہ وعیدین کی نمازیں ہوتی چلی آرہی ہیں۔تو اس موضع اٹواں میں جمعہ وعیدین کو بند نہیں کیا جاسکتا۔لیکن وہ موضع بیٹیا جو موضع اٹواں کے ملحق اور قریب ہے اس میں اب جدید جماعت قائم کرنے کی جرات نہیں کرنی چاہیے اور خاص کر جب اس جماعت کے قائم کرنے سے نئی ٹولیاں بن جانے کا خوف ہے پھر تو انہیں موضع بیٹیا میں جمعہ وعیدین کی جدید جماعت قائم کرنا حرام وگناہ عظیم ہے۔مولے تعالی انہیں قبول حق کی توفیق دے اور اختلاف بین المسلمین کے شر سے محفوظ رکھے اور ان میں محبت ووداد اور اتفاق واتحاد کی لہر پیدا کرے۔واللہ تعالی اعلم بالصواب۔۶ر صفر المظفر ۱۳۷۲ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۴۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

زید کہتا ہے کہ خطبہ کا اردو میں ترجمہ کرنا اس مطلب سے کہ نمازیوں کی سمجھ میں آجائے جائز

ہے۔ بکر یہ کہتا ہے کہ خطبہ نماز کا حکم رکھتا ہے اور اردو میں ترجمہ کرنا ناجائز ہے۔ کیونکہ نماز اللہ تعالیٰ سے گفتگو ہے تو اللہ تعالیٰ کی زبان مبارک عربی ہے تو اللہ تعالیٰ کے دربار مقدس میں اردو بولنا گو سخت گستاخی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں کیسے آئے تو نیاز مند کو تسکین بخش جواب مرحمت فرمایا جائے۔ اور جو لوگ کہتے ہیں کہ نیت نمازیوں کی اردو میں کہی جاتی ہے تو یہ نیت نماز کے اندر ہے یا باہر؟

المستفتی کفش بردار آستانہ عالیہ رضویہ قادریہ محمد حنیف و رئیس احمد رضوی قادری

۳ ربیع الثانی ۷۴ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

زید کا خطبہ کو اردو میں مطلقاً جائز کہنا خلاف تحقیق اور غلط ہے۔

ھدایہ میں ہے: الخطبة و التشهد على هذا الخلاف ـ

اور بکر کی اتنی بات تو صحیح ہے کہ اکثر امور میں خطبہ نماز کا حکم رکھتا ہے۔

درمختار میں ہے: کل ما حرم فی الصلوۃ حرم فیھا ای الخطبة ـ

لیکن بکر کا یہ قول (کہ خطبہ کا اردو میں پڑھنا ناجائز ہے) صحیح نہیں کہ خطبہ کا غیر عربی میں پڑھنا جائز مع الکراھۃ اور خلاف سنت متوارثہ ہے۔

ہدایہ میں ہے: یجوز عند العجز الا انه یصیر مسیئالمخالفة السنة المتوارثة ـ

جب عربی سے عاجز ہونے کی صورت میں بھی اردو میں خطبہ پڑھنا خلاف سنت متوارثہ ثابت ہوا تو غیر عاجز کا اردو میں خطبہ پڑھنا بدرجہ اولیٰ سنت متوارثہ کے خلاف ثابت ہوا۔ اسی طرح بکر کی یہ بات بھی غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ کی زبان مبارک عربی ہے۔ اسلئے کہ پہلی کتب آسمانی عربی میں کہاں تھیں تو صرف عربی کو اللہ تعالیٰ کی زبان بتانا بھی غلط ہے۔ (ہاں عربی اللہ تعالیٰ کے محبوب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبان ہے۔ اہل جنت کی زبان ہے۔ اسی طرح بکر کی یہ بات بھی غلط ہے کہ اللہ کے دربار میں اردو بولنا سخت گستاخی ہے۔

کتب فقہ میں ہے: ردالمحتار کی یہ عبارت ہے:

واللہ تعالی لا یحب غیر العربیة ولهذا کان الدعاء بالعربیةاقرب الی الاجابةفلایقع غیرها من الالسن فی الرضا والمحبة لها موقع کلام العرب ـ

اس عبارت سے عربی زبان کا اللہ تعالٰی کی زبان محبوب وپسندیدہ ہونا ثابت ہوا نہ کہ غیر عربی زبا نیں دربار الٰہی میں بولنا سخت گستاخی ہو۔

اب باقی رہا یہ عذر کہ عربی سمجھ میں کیسے آئے۔ تو یہ خاص خطبہ ہی میں نہیں بلکہ کل نماز عربی میں ہے تو کیا اس عذر کی بنا پر نماز بھی اردو میں پڑھ لی جائے گی۔ درحقیقت خطبہ ونماز عبادت ہیں اور عبادت کا سمجھ میں آنا ضروری نہیں۔ اور سمجھ میں نہ آنے کا اگر احساس ہے تو عربی زبان کو سیکھا جائے کہ عربی میں مسلمان کے مذہبی ضروریات ہیں۔ غور کیجئے بلکہ قرآن کریم عربی میں ہے۔ تفاسیر عربی میں۔ احادیث عربی میں۔ عقائد اسلام عربی میں۔ احکام شرع فقہ عربی میں۔ کتب سیر عربی میں۔

مسلمان جب دنیوی ضروریات کے لئے انگریزی، ہندی زبان سیکھتا ہے تو اس ضرورت کی اس کی نظر میں اس قدر اہمیت بھی نہیں۔

اب باقی رہا اردو میں نماز کی نیت کرنا تو یہ عوام کیلئے جائز ہے۔ اور نیت کا زبان سے کرنا ضروری نہین بلکہ نیت کرنا حقیقۃ دل کا کام ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ نیت نماز سے خارج ہے۔ اب رہی یہ بات کہ فلاں مولانا صاحب خطبہ کا ترجمہ اردو کرتے ہیں تو وہ اپنے فعل کے ذمہ دار ہیں۔ ان کا فعل کوئی دلیل شرع نہیں۔ ہم نے جب کتب فقہ سے خطبہ کا اردو میں پڑھنا خلاف سنت متوارثہ ثابت کردیا تو ان کا فعل سنت متوارثہ ثابت نہیں کرسکتا ہے کہ زمانۂ اقدس سے صحابہ وتابعین ائمہ مجتہدین سلف وخلف سے غیر عربی میں خطبہ پڑھنا ثابت نہیں۔ بہار شریعت میں جو بعد نماز جمعہ کے خطبہ سنوانا مستحب لکھا ہے یہ صحیح ہے اور درمختار کی عربی عبارت کا ترجمہ ہے۔ واللہ تعالٰی اعلم بالصواب۔ ۲۰ / رجمادی الاول ۷۴ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۴۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ذیل کے مسائل میں کہ

جمعہ کو جس شخص کو دوسری رکعت کا رکوع بھی نہ ملے یا صرف قعدۂ اخیرہ ملے تو اس کی نماز جمعہ ادا ہوگی یا نہیں؟۔ ایک شخص نے فقیر سے دریافت کیا تھا کہ دوسری رکعت کا رکوع جمعہ کی نماز میں امام کے پیچھے نہ ملا تو نماز جمعہ ہوئی یا نہیں۔ فقیر نے بتایا ہوجائے گی۔ پھر اس نے کتاب طریق احمدی حصہ اول دکھایا۔ شروع کا ورق نہ تھا مصنف کا نام معلوم نہ ہوا اس میں تھا کہ جس کو امام کے پیچھے نماز جمعہ میں ایک

رکعت نہ ملے وہ بعد کو پوری کرلے۔ اور جس کو امام کے پیچھے ایک رکعت بھی پوری نہ ملے تو وہ ظہر کی نماز پڑھے۔ فقیر کی سمجھ میں نہ آیا شرعا جو حکم ہو صادر فرمایا جائے؟۔ بینوا توجروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جمعہ کی جماعت میں کسی کو اگر صرف قعدہ اخیرہ ہی امام کیساتھ مل سکا تو اس نے فضل جماعت کو پالیا تو پھر اسکا جمعہ بھی ادا ہو گیا یہی قول معتمد و مفتی بہ ہے۔ طریق احمدی کے قول کا ضعف خود اس سے ظاہر ہو گیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۴۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین ذیل کے مسائل میں کہ

(۱) ہمارے ملک گجرات میں دعائے ثانی سنت ونوافل (یعنی نماز پوری کر لینے کے بعد) اوسط آواز سے پڑھتے ہیں۔ ان کے دعا مانگنے سے دیگر مصلیوں کی نماز میں کوئی خلل نہیں آتا، اور مقتدی آمین کہتے ہیں۔ اخیر میں فاتحہ کا اعلان امام کرتے ہیں، اور سب فاتحہ پڑھ لیتے ہیں، پھر امام صاحب وسلموا تسلیما کی آیت پڑھتے ہیں اور سب لوگ درود شریف پڑھتے ہیں، پھر امام صاحب سبحان ربك پورا پڑھکر ختم کرتے ہیں۔ یہ طریقہ مستحسن ہمیشہ سے برابر چلا آرہا ہے۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جمعہ کی اذان کے بعد فوراً تحیۃ الوضو پڑھ کر چند آدمی باری باری بلا آواز سے سورۂ کہف پڑھتے ہیں، اور اس خیال سے جو لوگ نہ پڑھے ہوں وہ بھی شریک ثواب ہیں باقی لوگ خاموش ہو کر سنتے ہیں سورہ کہف پڑھے جانے کے بعد فاتحہ خوانی ہوتی ہے پھر سب لوگ سنتیں پڑھتے ہیں، پھر امام خطبہ پڑھتا ہے،۔ یہ طریقہ مستحسنہ بھی ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔ عوام کو بھی اسی معمول سے خبر ہے۔

(۳) یہاں پنجگانہ نماز کے بعد امام اور مقتدی آپس میں مصافحہ کرتے ہیں، چند آدمی اس پر بھی معترض ہیں کیا یہ فعل جائز ہے؟۔

(۴) مزرات اولیا کی آستانہ بوسی وتبرکات کا بزرگان دین کا بوسہ دینا اور بزرگان دین کی قدم بوسی وغیرہ کے متعلق کیا حکم ہے اور شریعت حقہ کے کیا دلائل ہیں؟۔

(۵) گجرات میں عام طور سے سنیوں میں یہ رواج ہے کہ جمعہ کا پہلا خطبہ کچھ عربی پڑھتے ہیں اور اردو پھر خطبے ثانیہ عربی میں پڑھتے ہیں۔ رواج ایسے زور پکڑے ہوئے ہے کہ اگر کوئی امام ایسانہ کرے تو اس کے لئے مصیبت ہے ملازمت جائے عوام میں فتنہ فساد برپا ہو، اسطرف زیادہ تر عوام پیران طریقت وقاضی صاحبان کے کہنے پر چلتے ہیں، یہ حضرات بھی مذکورہ بالا طور پر خطبہ پڑھنے پر زور دیتے ہیں، علاوہ ازیں چند فتاوے جواز اردو کے متعلق آچکے ہیں، جواز کے استدلال میں منقول ہے وہ یہ ہیں،

آیۂ کریمہ۔ و ما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه۔ و ارسلنك كافة للناس بشير او نذيرا۔۔

و كما قال فى در المختار۔ صح لو شرع فى غير عربية اى لسان كان و شرطنا عجزه و على هذا الخلاف الخطبة و ايضا فيه و الا مر بالسعى الى الذكر ليس الا استماع و فى العيد ويعلم الناس فيها اى فى الخطبة عيد الفطر من لم يودها ينفى تعليمهم فى الجمعة التى قبلها ليخرجوها فى محلها و هكذا كل حكم احتيج اليه لان الخطبة شرعت للتعليم فافهم انتهى ۔ كما فى السراجية اذا لم يكن المفتى مجتهدا فالاصح انه يفتى بقول الامام۔ وفى التجنيس الواجب عندى ان يفتى على قول ابى حنيفة على كل حال والحاصل انه لا يرجح قول صاحبيه او احدهما على قول الامام الا بموجب عن ضعف دليل او ضرورةاو تعامل او اختلاف لسان وفى السراجيةولو خطب بالفارسيةيجوز۔

جواہر اخلاطی میں ہے۔ ولو كبر بالفارسيةاو باى لسان كان وهو يحسن العربية اولا جاز بالاتفاق۔

غیاث المفتین میں ہے ۔لا يجوز صلوة الجمعة اذا لم يعلم الخطيب ما يقول۔

فتاوی علماء عرب وعجم ۱۳۳۵ھ سوال ۔ما قولكم دام فضلكم نفعنا الله بعلومكم فى الدين بلا دالاسلام و اهلها لا يعلمون لسان العرب لا يفهون معانى النصوص القرآنية والاحاديث الشريعة بلغة العربية فهل يجوز للخطيب ان يقرا اولا شيئا خطبة الجمعة بالعربية ثم يترجم بلسانهم من نفس الخطبة ما يتضمن الا وا مرو النواهى التى

لابدمنها انه يسمعها الناس فيمتنعون من المعاصی ويقترفون الحسنات من الاعمال الصالحات بينوا توجروا۔

الجواب۔۔ نعم يجوز ذلك اذا كان المترجم من المواعظ والاوامر والنواهی ماعد القرآن العظيم والله اعلم۔ امر برقمه خادم الشريعة والمنهاج عبد االله بن عبد الرحمن سراج الحنفی قاضی القضاة و مفتی للاقطار العربيه بمكة المحمية۔ كان الله لهما۔

حامدا و مصليا و مسلما باسمه سبحانه و تعالیٰ اثبت الجواب واستمد به الهدايه والصواب۔ عبداللہ بن عبدالرحمٰن سراج الحنفیة ۱۳۲۵ھمکہ معظمہ۔

اور بہار شریعت واحکام شریعت والملفوظ وفتاوی افریقہ میں خلاف سنت متوارثہ ومکروہ لکھا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر سنی ائمہ مذکورہ بالا طور پر خطبہ نہیں پڑھتے تو ان فتاوی کا خلاف ہوتا ہے، ملازمت جاتی ہے، عوام میں فتنہ فساد ہوتا ہے۔ اور اگر پڑھتے ہیں تو بہار شریعت واحکام شریعت والملفوظ وفتاوی افریقہ کا خلاف ہوتا ہے۔ مخالفین کو موقع ملتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا کریں اگر انہیں کتابوں پر عمل ضروری ہے تو ان عبارتوں اور فتاوی حرمین کا کیا جواب ہے۔۔

نوٹ اس طرف اردو خطبہ مذکورہ بالا سوالات معیار سنت سمجھے جاتے ہیں۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الكريم

سنن ونوافل سے فارغ ہونے کے بعد امام کا بآواز دعا مانگنا بلا شبہ جائز ہے۔ بلکہ اس کی اصل حدیث شریف سے ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی انہوں نے فرمایا۔

مايفوت النبی صلی الله تعالیٰ عليه وسلم فی د بر صلوة مكتوبة ولا تطوع الاسمعته اللهم اغفر خطا يای كلها اللهم اهدنی لصالح الاعمال والاخلاق الخ۔

(رواه ابونعيم الحافظ فی كتاب عمل اليوم والليلة)

اس حدیث شریف سے ثابت ہوگیا کہ خود نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بعد فراغت نوافل بھی دعا کرتے تھے اور یہ دعا اس قدر بلند آواز سے ہوتی تھی کہ جس کو صحابہ کرام نے بھی سن لیا تو دعا کا بعد نوافل بلند آواز سے کرنا خود قول شارع علیہ سلام سے ثابت ہوگیا۔ نیز نماز کسوف، استسقا

،نماز حاجت وغیرہ بھی نوافل ہی سے ہیں انکے بعد میں خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باآواز بلند دعائیں کیں اور دوسروں کو حکم بھی دیا تو نوافل وسنن کے بعد باآواز دعا کرنے کو کس طرح ناجائز وبدعت کہا جاسکتا ہے۔اب باقی رہا امام کی باآواز دعا پر مقتدیوں کا آمین کہنا۔تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ کتب فقہ میں جب بوقت اجتماع ایک شخص باآواز دعا پڑھے تو یہی طریقہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اور لوگ آمین کہیں۔

مراقی الفلاح میں ہے:اذ دعا یومنون علی دعائه۔ پھر سورۃ فاتحہ خود احسن دعا ہے نیز وہ حمد وثنائے الٰہی پر بھی مشتمل ہے۔اور اس کے بعد و سلموا تسلیما۔ پر درود شریف کا پڑھنا تعمیل حکم ہے اور یہ سب آداب دعا سے ہیں پھر دعا حمد وثنائے الٰہی پر ختم کرنا بھی آداب اجابت سے ہے اس کے لئے آیہ سبحان ربك ،الآیہ سے تبرک حاصل کرنا اور زیادہ بہتر ہے۔لہذا ملک گجرات کا یہ دعائے ثانی کا طریقہ شرعا محمود و مستحسن ہے جو اسکو ناجائز وبدعت کہتا ہے وہ دین سے ناواقف ہے اور احکام شرع کو محض اپنی رائے ناقص سے ناجائز وبدعت قرار دیتا ہے ورنہ وہ انکے ناجائز وبدعت ہونے پر کوئی شرعی دلیل پیش کرے۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۳) جہاں اذان جمعہ فوراً بعد زوال اول وقت میں ہوتی ہے تو تحیۃ الوضو یا تحیۃ المسجد اسی وقت پڑھنا چاہئے کہ وقت زوال میں نوافل ممنوع ہیں،اس کے بعد اگر ایک آدمی باآواز بلند سورۂ کہف پڑھتا ہے اور سب لوگ خاموش سنتے ہیں تو اس میں کوئی ممانعت شرعی لازم نہیں آتی بلکہ اس میں سب لوگ جتنے سن لیں وہ بھی مستحق اجر وثواب ہو جائیں گے،پھر بعد تلاوت قرآن دعا کرنا آداب اجابت دعا سے ہے کہ حدیث شریف میں ہے من قرء القرآن فلیسال الله به۔ تو جس نے قرآن پڑھا تو اللہ سے اسکے توسل سے سوال کرے۔پھر سورۃ فاتحہ خود احسن دعا ہے۔تو سورہ کہف کے بعد فاتحہ خوانی کو کون ممنوع ٹھہرا سکتا ہے۔پھر سنن جمعہ کا پڑھنا اور خطبہ کا سننا امور مختلف فیہ میں سے نہیں،۔جس کے جواز میں کوئی کلام ہو۔لہذا عوام کے اس معمول میں شرعا کوئی حرج نہیں۔جو اس کو ناجائز کہتا ہے وہ اس کے عدم جواز پر کوئی صریح دلیل قائم کرے۔ورنہ امور مباحہ کو محض اپنی ناقص عقل سے ناجائز وبدعت قرار دیتا ہے۔ دین میں اپنی عقل سے دخل دیتا ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم،

(۴) مسلمان سے مصافحہ کرنا سنت ہے۔،حدیث شریف میں ہے: تصافحو ایذهب الغل۔

(مشکوۃ شریف۔ص ۴۰۱)

یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو تم مصافحہ کیا کرو کہ مصافحہ کینہ کو دور کرتا

ہے۔

پھر یہ مصافحہ تمام اوقات میں سنت ہی ہے، طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے: المصافحة سنة فی سائر الاوقات۔ اب کسی ملاقات اور کسی وقت کی تخصیص کر کے اس خاص وقت اور ملاقات کے مصافحہ کو اس مصافحہ مسنونہ سے خارج نہیں کر سکتا۔ لہذا نماز پنجگانہ کے اوقات کا مصافحہ بھی اس مصافحہ مسنونہ کے تحت میں داخل ہو کر بلاشبہ جائز ثابت ہوا۔

درمختار میں ہے: ان المصافحة مستحبة عند كل لقاء اما ما اعتاده الناس من المصافحة بعد صلاة الصبح و العصرفلا اصل له فی الشرع علی هذا الوجه ولكن لا باس به فان اصل المصافحة سنة و كونهم حافظين عليهما من بعض الاحوال او اكثروفرطوافی كثير من الاحوال اوا كثر ها لا يخرج ذالك البعض عن كونه المصافحة التی ورد الشرع باصلها ۔ قال الشيخ ابو الحسن البكری و تقييده بما بعد الصبح و العصر علی عادة كانت فی زمنه والا فعقب الصلوات كها كذالك۔ (ردالمحتار۔ ج ۵۔ ص ۲۵۲)

بیشک مصافحہ کرنے کی عادت مقرر کر لی ہے تو اس طریقہ پر شرع میں کوئی اصل اسکی نہیں ہے لیکن اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے کیونکہ مصافحہ کی اصل سنت ہے اور انکا بعض احوال میں مصافحہ پر محافظت کرنا اور اکثر احوال میں اس سے کوتاہی کر جانا ان بعض احوال کو اس مصافحہ سے خارج نہیں کر دیتا جس کی اصل شرع میں وارد ہوئی۔ شیخ ابوالحسن بکری نے فرمایا کہ مصافحہ کو فجر وعصر کو ساتھ مقید کر دینا اس عادت کی بنا پر ہے جو انکے زمانہ میں موجود تھی ورنہ مصافحہ کا سب نمازوں یعنی پنجگانہ نمازوں کے بعد بھی یہی حکم ہے کہ وہ جائز ہے۔ اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ نماز پنجگانہ کے بعد مصافحہ کا جواز شرع سے ثابت ہے۔ کتب فقہ میں یہ تصریح موجود ہے۔ اور جب ان اوقات میں مصافحہ کرنا جائز ثابت ہوا۔ اب چاہے مقتدی امام سے مصافحہ کریں یا آپس میں مصافحہ کریں۔ بالجملہ اس مصافحہ کا جواز حدیث اور فقہ سے ثابت کر دیا گیا جو اس کے جواز پر اعتراض کرتا وہ محض اپنی کم فہمی کی بنا پر مذہب پر اعتراض کرتا ہے۔ خود اسکے پاس اسکے عدم جواز کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۴) مزارات حضرات اولیاء کرام کا بوسہ جائز تو ہے، حضرت علامہ احمد مقری مغربی فتح المتعال فی مدح النعال میں ناقل ہیں: ان بعضهم كان اذا رأى المصاحف قبلها و اذا رأى اجزاء الحديث قبلها و اذا رأى قبور الصالحين قبلها۔ (فتح المتعال)

بیشک بعض علماء جب مصاحف کو دیکھتے تو انکو چومتے اور جب حدیث کی جلدوں کو دیکھتے توان کو بوسہ دیتے، اور جب اولیا کی قبروں کو دیکھتے توان کو بوسہ دیتے،

اور بعض روایات فقہ میں قبر والدین کے بوسہ دینے کا جواز منقول ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں:

در بعض روایات فقہیہ بوسہ دادن بر قبر پدر و مادر را نیز آمدہ است۔

لیکن اولی یہ ہے کہ عوام کے سامنے مزارات اولیا کرام پر بوسہ نہ دے۔

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے: ولا یمس القبر ولا یقبله فانه من عادة اهل الکتاب، (طحطاوی۔ص ۶۲۳)

اور قبر کو نہ چھوئے نہ بوسہ دے کہ یہ اہل کتاب کی عادت ہے۔

اب باقی رہا بزرگان دین کو بوسہ دینا اواشیاء معظّمہ آثار صالحین کا بوسہ دینا اور علماء اور صلحا کی دست بوسی وقدم بوسی کرنا تو یہ نہ فقط جائز بلکہ حسن ومحمود ہے۔

فتح المتعال میں علامہ عراقی کا قول منقول ہے: اما تقبیل الا ماکن الشریفة علی قصد التبرك و ایدی الصالحین وارجلهم فهو حسن محمود باعتبار قصد النیة۔ (ص ۳۳۹)

اور بقصد تبرک معظم مقاموں اور صالحین کے ہاتھوں اور قدموں کو بوسا دینا باعتبار قصد و نیت کے حسن اور محمود ہے۔

اسی فتح المتعال میں ہے: کان ثابت البنانی لایدع ید انس رضی الله تعالیٰ عنه حتی یقبلها و یقول یدمست ید رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم (فیه ایضا) ان الامام احمد یسئل عن تقبیل قبرا لنبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم و تقبیل منبره فقال لا باس به وعنه انه غسل قمیص الشافعی وشرب الماء الذی غسله به۔ (فتح المتعال۔ص ۳۲)

و فیه ایضا قد صرح جماعة من ائمتنا المهتدی بهم بتقبیل اسمه الشریف ﷺ فیما هو مکتوب فیه و بتبجیله والتبرك به ورفعه علی العیون والرؤس۔

حضرت ثابت بنانی حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ کو بغیر بوسہ دیئے ہوئے نہیں چھوڑتے اور فرماتے یہ وہ ہاتھ ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دست مبارک کو چھوا ہے۔ حضرت امام احمد سے حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر شریف اور ممبر شریف کے بوسہ دینے

کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں، انہیں امام احمد نے حضرت امام شافعی کی قمیص کو دھویا اور دھوئے ہوئے پانی کو پی لیا۔ ہمارے ائمہ ہادی و رہبر ہیں ایک جماعت علماء نے ان سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نام شریف جس چیز پر لکھا ہوا ہو اس کو بوسہ دینے اور اسکی تعظیم کرنے اور اس سے تبرک حاصل کرنے اور اسکو انکھوں اور سروں پر رکھنے کی تصریح کی۔

فقہ کی مشہور کتاب درمختار میں ہے:

طلب من عالم او زاهد ان يدفع اليه قدمه ويمكنه من قدمه ليقبله اجابه۔

(درالمختار۔ ج ۵، ص ۲۵۳)

کوئی کسی عالم یا زاہد سے اسکا قدم اپنی طرف دراز کرنے اور اس قدم پر اسے بوسہ دینے کی موقع پانے کی خواہش کرے تو وہ عالم یا زاہد اس کی اجابت کرے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار میں حضرت شیخ احمد مجد شیبانی کے حال میں لکھتے ہیں جو جامع شریعت وصاحب ورع وتقوی تھے۔

اگر کسے پیش آمدہ گفتی کہ من حضرت رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم درخواب دیدہ ام باادب نشستے وتمام قصہ رویا را بشنودے ودست وپائے وے ببوسیدے ودامان وآستینش اوراب روئے خود فرو مالیدے وبرجائے کہ آن شخص می گفت کہ درفلاں جا دیدہ ام آنجا رفتے وبوسہ دادے وگرد آن جائے را بخوردے وبرتن وبرجامہ چوں گلاب پاشیدے۔　　(اخبار الاخیار۔ ص ۱۸۵)

اگر کوئی شخص شیخ احمد کے سامنے آکر کہتا کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے تو مودب ہو کر بیٹھ جاتے اور خواب کا پورا قصہ سنتے اور اس کے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دیتے، اور اس کے ہاتھوں اور آستینوں کو اپنے چہرے پر ملتے اور جس جگہ کو وہ کہتا کہ فلاں جگہ میں نے دیکھا ہے وہاں جاتے اور اس کو بوسہ دیتے اور اس مقام کی خاک کو اپنے چہرے پر ملتے، اور وہ پتھر ہوتا تو اس پتھر کو دھوتے اور اس پانی کو پی لیتے، اور اپنے بدن اور کپڑے پر گلاب کی طرح چھڑکتے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ علما وصلحا کی دست بوسی وقدم بوسی اور آثار صالحین وتبرکات بزرگان دین کو بوسہ دینا اور مقام مقدسہ واشیاء معظّمہ کا بوسہ دینا وراس سب اور اس ہر چیز کی جو کسی بزرگ کی طرف منسوب ہو تعظیم وتوقیر کرنا اس سے تبرک حاصل کرنا انکو انکھوں سے لگانا جائز ومستحسن ہے۔ اور صحابہ وتابعین اور سلف وخلف صالحین کا مبارک فعل ہے اور عشق ومحبت کی علامت ہے، اور جو انکے بوسہ کو

ناجائز اور بدعت کہے اور انکی تعظیم وتوقیر سے جلے ان سے تبرک حاصل نہ کرے انکو اپنی انکھوں سے لگانا برا جانے وہ عمل صالحین کا مخالف ہے۔ بزرگان دین کا دشمن ہے۔ فعل سلف کو ناجائز کہتا ہے۔ طریقہ صالحین سے منحرف ہے۔ صرف باعتبار صورت کے مسلمان ہے۔ مولی تعالیٰ اس کو ہدایت کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۵) بہار شریعت واحکام شریعت وفتاوے افریقہ میں جو اردو کے خطبہ پڑھنے کو خلاف سنت متوارثہ ومکروہ تنزہی لکھا ہے یہ حق ہے یہی میری بھی تحقیق ہے اور خاص اس مسئلہ میں میرا ایک مستقل رسالہ بھی ہے لیکن اگر وہاں کی مقامی خصوصیات کی بنا پر یہ بات فی الواقع صحیح ہے کہ انکے خلاف کرنے سے یقیناً فتنہ وفساد برپا ہو جائے گا تو رفع فتنہ کو مدنظر رکھتے ہوئے خطبہ کو اردو میں بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ کہ وہ جائز تو ہے لیکن بتدریج آہستہ آہستہ عوام تک صحیح مسئلہ پہنچایا جائے۔

اب رہیں سوال کی منقولہ عبارات اور فتاوے انکا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ ہمارے خلاف نہیں کہ ان عبارات اور فتاوے کا مقدمہ اور خلاصہ حکم اردو میں خطبہ پڑھنے کی جواز ہے۔ اور جواز کے ہم بھی مخالف نہیں لیکن جواز خلاف اولے لکروہ تنزہی کو بھی عام ہے۔ ردالمحتار میں ہے۔ اطلق الجائز و اراد بہ مایعم الکراھۃ ۔ تو اس بنا پر بہار شریعت واحکام شریعت وفتاوے افریقہ میں اور ان فتووں میں کوئی تناقص نہیں اور حکم میں کوئی زبردست مخالفت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۴۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں۔

ایک گاؤں جس کی آبادی دوسو گھر کی ہے ساٹھ گھر جس میں مسلمانوں کے ہیں ضرورت کی تمام اشیا تقریبا مل جاتی ہیں جس کے چوطرفہ بارہ بارہ کوس دور شہر لگتے ہیں وہاں مسجد نہیں ہے اب مسلمان وہاں کے مسجد بنانا چاہتے ہیں اور جمعہ پڑھنا چاہتے ہیں کیا ایسی بستی میں مسجد بنانا اور جمعہ قائم کرنا از روئے شرع شریف کیسا ہے شہر کی مفصل تعریف لکھئے گا۔ جس پر علمائے کرام کا اتفاق ہے۔

محمد شفیع مدرس مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد سادڑی پور ضلع چورو راجستھان

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

بلاشبہ ایسے گاؤں میں مسجد بنائی جائے اب رہا جمعہ کا قائم کرنا تو اس کے لئے شہر کا ہونا ضروری ہے۔ شامی میں ہے: لاجمعة في القرى۔

شہر کی مفصل تعریف یہ ہے کہ اس میں مختلف محلے ہوں اور اس قدر بازار ہوں کہ وہاں کی ضروریات کے لئے کافی ہو اور اس میں ایک ایسا حاکم ہو جو معمولی مقدمات کا فیصلہ کرے کما حققہ علامہ شامی فی ردالمحتار۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۴۵)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اہلسنت وجماعت کثف اللہ تعالیٰ نصرہم وامداد ہم مسئلہ ذیل

(۱) میں کہ گذشتہ عید الفطر کا واقعہ ہے کہ ہمارے بلدہ گوہاٹی کی دس بارہ عورتوں سے عید الفطر کی نماز الگ الگ جماعت قائم کر کے پڑھ لئے ہیں۔ ایک نیم ملا خطرہ جان ناقص العقل نے امام ہو کے عورتوں کی عید کی نماز پڑھا دیا ہے ابھی اس کے بارے میں بہت فتنہ فساد ہو رہے ہیں اور ہونے کے اندیشے ہیں عورتوں کو بہت روکا گیا ہے آخر مانا نہیں سنتے ہیں اور عید الاضحیٰ کی نماز جماعت قائم کر کے پڑھنے کی تبلیغ کر رہے ہیں کیا یہ طریقہ شریعت میں جائز ہے یا نہیں؟۔

(۲) کیا فرماتے ہیں علماء کرام شرع متین اس مسئلہ میں کہ ہمارے شہر گوہاٹی میں عیدین کی نماز بہت بھاری جماعت ہوتی ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ اسپیکر کی آواز بہت بلند ہے دور تلک جاتی ہے لہذا امام کے سامنے لاؤڈ اسپیکر رکھکر نماز پڑھا دیتے ہیں اور سب لوگ سنتے اور خوش ہو جاتے ہیں کیا یہ جدید آلہ شریعت میں جائز رکھا ہے یا نہیں۔ بینوا توجروا والسلام۔

احقر الناس خادم محمد عابد الرحمٰن پیش امام گوہاٹی

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

(۱) عورتوں پر نماز جمعہ وعیدین واجب نہیں ہے۔

طحطاوی میں ہے: فلاتجب علی امرأة۔

مراقی الفلاح میں ہے: فتجب علی من تجب علیه الجمعة بشرائطها۔

توجب جمعہ عیدین کی نماز ان پر واجب ہی نہیں تو عورتوں کا اس کے لئے جماعت قائم کرنا غلط وباطل ہے نیز عورتوں کی جماعت مکروہ تحریمی ہے۔

درمختار میں ہے: یکرہ تحریما جماعة النساء ولو فی التراویح فی غیرصلوۃ جنازة۔

لہذا جب ان کی جماعت مکروہ تحریمی ہے تو اس کے لئے اہتمام وتداعی کرنا بھی ممنوع ہے وہ ہرگز ہرگز عید اضحیٰ کی جماعت قائم نہ کریں۔

(۲) نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا لگانا بلاضرورت شرعی جو مقتدیون کیلئے مفسد نماز ہے لہذا لاؤڈ اسپیکر کا امام کے سامنے ہونا ممنوع وناجائز قرار پایا ہے اگر اس کی تفصیل وادلہ دیکھنی ہوں تو میرے ایک رسالہ میں جمع ہیں اور اس میں یوں نہیں لکھ سکتا کہ تقریبا ایک سال سے بیمار ہوں دلائل کثیرہ پیش کرنے سے مجبور ہوں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۶ / ذیقعدہ ۱۳۷۹ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

باب العیدین

مسئلہ (۴۴۶)

جناب مفتی جی صاحب ہادی دین و جامع علوم ظاہری و منبع فیوض باطنی بعد مسنون السلام علیکم کے واضح ہو کہ آپ برائے مہربانی مسائل ذیل کے جواب باقاعدہ مہر کے تحریر فرمادیجئے گا عین مہربانی ہوگی۔ بندہ کو ممنون و مشکور فرمائیگا۔ (نوٹ) خط صاف ہوتا کہ پڑھنے میں مشکو کی نہ ہو۔

عید الاضحیٰ کو مسجد میں جگہ نہ رہنے کی وجہ سے تقریبا تیس یا چالیس آدمی مسجد سے باہر تھے۔ ایک شخص مسجد سے باہر ٹین یعنی صحن میں تکبیر کہنے کے لئے مقرر کئے گئے۔ اب امام صاحب نے تکبیر تحریمہ کہی۔ ٹین میں جو تکبیر کہنے والے تھے انہوں نے بھی کہی لیکن اس وقت تک باہر کوئی انتظام صفیں سیدھی ہونے وغیرہ کا نہیں ہوا تھا۔ نہ امام صاحب نے اس پر غور کیا کہ انتظام نہیں ہوا ہے۔ وہ باہر والے اشخاص انتظام کرنے میں شور وغل کرتے رہے۔ انہوں نے اسی شور غل میں تکبیر تحریمہ نہیں سنی۔ بعد میں ان لوگوں کے بیان سے معلوم ہوا کہ انہوں نے مسجد کی طرف غور کیا تو نماز میں اندرون مسجد سب آدمی مشغول تھے۔ تب ہم لوگوں نے نیت کی۔ ان لوگوں کو اختتام نماز کے بعد معلوم ہوا کہ ہماری تو ایک ہی رکعت ہوئی ہے۔ کیونکہ ان کے شور وغل کے وقت پہلی رکعت فوت ہو چکی تھی اب ٹین میں جو تکبیر کہنے والے شخص تھے انہوں نے تکبیر تحریمہ کہی لیکن اس کے بعد پھر کوئی تکبیر یا ربنا لک الحمد پہلی رکعت میں نہیں کہا دوسری رکعت میں تکبیر کہنی پھر شروع کی اور وہ پوری تکبیریں اور ربنا لک الحمد کہی اب سلام پھیرنے کے وقت جب امام صاحب نے سلام سیدھی جانب کو سلام پھیرا تو جو شخص ٹین میں تکبیر کہنے والے تھے انہوں نے بھی پھیرا لیکن امام صاحب کو یہ عادت تھی کہ ہمیشہ دوسری جانب کو سلام کچھ رک کر پھیرتے ہیں یعنی تسلی کے ساتھ۔ لیکن اس شخص نے جو ٹین میں تکبیر کہنے والے تھے انہوں نے امام صاحب سے پہلے بائیں جانب کو سلام پھیر دیا۔ تو اکثر لوگوں نے جو صحن مسجد اور ٹین میں تھے ان کے ساتھ سلام پھیر دیا اور کچھ لوگوں نے امام صاحب کی تائید کی اور اندرون مسجد سب لوگوں نے امام صاحب کی تائید کی اور بیرون مسجد والوں نے بھی کسی نہ کسی کی تائید پر سلام پھیرا۔ اس کے بعد بیرون مسجد کے آدمیوں نے کہا کہ ہماری تو ایک

رکعت ہوئی ہے۔ تو میں نے اور چند آدمیوں نے کہا کہ نماز دوبارہ پڑھ لو کیونکہ آدمی بہت رہ گئے۔ تب امام صاحب نے بھی یہی کہا۔ لیکن اس کے بعد امام صاحب کہنے لگے کہ جن لوگوں کی نماز نہیں ہوئی ہے وہ آدمی دو دو رکعت نفل نماز ادا کریں تو عید کی نماز ادا ہو جائیگی یعنی دو دو رکعت نفل پڑھنے سے نماز عید الاضحیٰ درست ہوگئی۔ حل کر دیجئے گا۔ نماز عید الاضحیٰ ہوئی یا نہیں؟۔ یا کوئی شخص ان میں گنہگار ہوا یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صورت مسئولہ میں مکبر نے بھی سخت غلطی کی کہ اس نے پہلی رکعت کی تکبیرات انتقال ترک کر دیں اور دوسرا سلام امام سے قبل پھیر لیا۔ پھر سب سے زائد امام صاحب کی نہ صرف ایک غلطی بلکہ کثیر غلطیاں ہیں کہ انتظامات صفوف سے قبل ہی اس نے تکبیر تحریمہ شروع کر لی اور اس ناواقف شخص کو اپنی جانب سے ایسا مکبر تجویز کر دیا جو دوسروں کی نماز عید فوت ہو جانے کا سبب بنایا۔ پھر اس کی یہ غلطی بھی ہے کہ وہ اس صورت میں دوبارہ نماز عید پڑھنے کو تیار ہوگیا۔ پھر اس کی غلطی یہ ہے کہ اس نے یہ مسئلہ بتایا کہ دو رکعت نفل پڑھ لینے سے نماز عید الاضحیٰ ہو جائیگی اور حکم شرع یہ ہے کہ ان دو رکعات نفل سے ہرگز نماز عید الاضحیٰ ادا نہیں ہوگی۔ پھر جن لوگوں نے اس امام کے ساتھ ہر دو رکعات نماز عید ادا کر لی ہے ان کی نماز عید ہوگئی اور بیرون مسجد کے وہ لوگ جنھوں نے امام کے ساتھ صرف ایک رکعت پڑھی ہے اور امام کے ساتھ سلام پھیر دیا ہے ان کی نماز عید ادا نہیں ہوئی تو یہ چار رکعت بہ نیت نماز چاشت پڑھ سکتے تھے؟۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد **محمد اجمل** غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۴۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسائل ذیل میں

عید کی نماز کا سلام پھیر کر فوراً امام کو خطبہ پڑھنا چاہئے، یا سلام کے بعد دعا "الھم انت السلام" پڑھنے کے بعد خطبہ کے لئے کھڑا ہونا چاہئے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

نماز عید کا سلام پھیرنے کے بعد امام کو خطبہ پڑھنا چاہئے کہ نماز اور خطبہ کے درمیان کوئی دعا دا

جب نہیں۔ بخاری شریف میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی:

کان النبی ﷺ یخرج یوم الفطر و الاضحی الی المصلی فاول شئی یبدء به الصلاۃ ثم ینصرف فیقوم مقابل الناس والناس جلوس علی صفوفهم فیعظهم ویوصیهم ویأمرهم (صحیح البخاری (ص۱۸۵ ج۱)

حضور نبی کریم ﷺ عید الفطر اور عید اضحیٰ کے روز عیدگاہ کی طرف تشریف لے جاتے اور سب سے پہلی چیز یہ تھی کہ نماز پڑھتے پھر نماز سے فارغ ہو کر لوگوں کے سامنے کھڑے ہوتے اور لوگ صف بہ صف بیٹھے ہوتے اور حضور انہیں نصیحت فرماتے اور وصیت کرتے اور حکم فرماتے۔

طبرانی اور مسند امام احمد میں حضرت سعد رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی:

کنا جلوساً ننتظر رسول اللہ ﷺ یوم الاضحی فجاء فسلم علی الناس وقال ان اول من نسك یومکم هذا الصلاۃ فقدم فصلی بالناس رکعتین ثم سلم فاستقبل القوم بوجهه ثم اعطی قوسا او عصا فاتکاء علیها فحمد اللہ واثنی علیه فامرهم ونهاهم"

(صحیح البخاری ص۵۸۲)

ہم عید قربانی کے دن رسول اکرم ﷺ کے انتظار میں بیٹھے تھے تو حضور تشریف لائے اور لوگوں کو سلام کیا اور فرمایا آج کے دن پہلا فعل یہ نماز ہے پھر نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھے اور لوگوں کو دو رکعتیں پڑھائیں پھر سلام پھیر کر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور کمان یا لاٹھی حاضر کی گئی تو اس پر اعتماد کیا پھر اللہ کی حمد وثنا کی اور لوگوں کو بعض چیزوں کا حکم دیا اور بعض سے منع فرمایا۔

کتاب الآثار میں خود امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی:

کانت الصلاۃ فی العیدین قبل الخطبة ثم یقف الامام علی راحلته بعد الصلاۃ فیدعو الخ۔ (صحیح البخاری (ص۵۷۳ ج۱)

دونوں عیدوں میں نماز خطبہ سے پہلے ہے پھر بعد نماز امام اپنی سواری پر کھڑے ہو کر خطبہ دے پھر دعا مانگے۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ نماز عید کی فراغت کے بعد امام کو خطبہ ہی پڑھنا چاہئے اور دعا بعد خطبہ کے پڑھے اور نماز وخطبہ کے درمیان کسی دعا کا پڑھنا ثابت نہیں۔ واللہ تعالی اعلم۔

کتبہ : الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۴۴۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

ایک صاع کا وزن کتنا ہوتا ہے؟ ایک جگہ چار سیر دیکھا ہے اور ایک جگہ ساڑھے چار سیر دیکھا ہے۔آپ اس کا وزن تولے کی شمار سے تحریر فرمایے کہ صاع اتنے تولے کا ہوتا ہے۔ گیہون یا گیہوں کا آٹا فطرے میں نصف دیا جائے گا اور کوئی چیز بھی ایسی ہے جو گیہوں کے برابر دی جائے گی، یا اس کے علاوہ ہر چیز گیہوں سے دوگنی دی جائیگی ۔ بینوا وتوجروا

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

صاع حنفیوں کے نزدیک آٹھ رطل کا ہے۔علامہ برہان الدین مرغینانی۔ ہدایہ میں فرماتے ہیں:

" الصاع عند ابی حنیفة ومحمد ثمنية ارطال "(ہدایہ ص ۱۹۰)

امام ابوحنیفہ وامام محمد علیہما الرحمۃ کے نزدیک صاع آٹھ رطلوں کا ہوتا ہے۔

امام اجل ابوالحسن بغدادی قدوری میں فرماتے ہیں:

الصاع عند ابی حنیفة ومحمد ثمانية ارطال بالعراقی "(مختصر القدوری ص ۵۱)

حضرت امام ابوحنیفہ وامام محمد رحمۃ اللہ تعالی علیہما کے نزدیک صاع آٹھ رطل عراقی کا ہے۔

علامہ برہان الشریعۃ وقایہ میں فرماتے ہیں:

"الصاع ما یسع فیه ثمانية ارطال من مج او عدس" صاع وہ ہے جس مین ماش یا مسور کے عراقی آٹھ رطل بھرتے ہیں۔

علامہ ابوالبرکات نسفی کنز الدقائق میں فرماتے ہیں: " وهو (الصاع) ثمانية ارطال "
(کنز الدقائق قیوبی س ۲۲۹ ج ۱)

صاع آٹھ رطل کا ہوتا ہے۔ علامہ ابراہیم حلبی ملتقی الابحر میں فرماتے ہیں:

والصاع ما یسع ثمانية ارطال بالعراقی من نحو عدس او مج
(مجمع الانھر مصری ص ۲۲۹ ج ۱)

صاع وہ جس میں ماش یا مسور کے عراقی آٹھ رطل بھرتے ہیں:

فقیہ حنفی ابوالفتح خوارزمی کتاب المغرب میں فرماتے ہیں: الصاع ثمانية ارطال عند اهل

العراق۔ (المغرب ص ۳۱۱ ج ۱)

اہل عراق کے نزدیک صاع آٹھ رطلوں کا ہے،

ان عبارات سے ثابت ہو گیا ہے کہ ہمارے امام اعظم رضی اللہ تعالی عنہ کے نزدیک عراقی صاع آٹھ رطل کا ہے اور اس میں یہ بھی تفصیل ہے کہ اس صاع میں مسور یا ماش کے آٹھ عراقی رطل سما جائیں۔ یا اس صاع کو اس طرح سمجھئے کہ صاع چار مد کا ہوتا ہے۔

علامہ شامی ردالمحتار میں شرح درالبحار سے ناقل: اعلم ان الصاع اربعة امد ادو المد رطلان والرطل نصف من۔ (از ردالمحتار مصری ص ۹۷ ج ۲)

جاننا چاہئے کہ صاع چار مدوں کا ہوتا ہے اور ایک مد دو رطلوں کا اور ایک رطل آدھے من کا۔

علامہ شیخ محمد طاہر مجمع بحار الانوار میں فرماتے ہیں: " واجمعوا علی انہ (الصاع) اربعة امداد، (ص ۲۷۱ ج ۲)

سب نے اس پر اجماع کیا ہے کہ صاع چار مدوں کا ہے۔

ان ہر دو عبارات سے یہ ثابت ہوا کہ فقہاء کا اس پر اجماع ہوا کہ صاع چار مدوں کا ہے اور مد دو رطل کا ہوتا ہے یا صاع تو یوں سمجھئے کہ صاع چار من کا ہوتا ہے اور من دو رطل کا ہوتا ہے۔

علامہ علاء الدین حصکفی صاحب درمختار اپنی کتاب بدرالمنتقی شرح ملتقی میں فرماتے ہیں: " الصاع اربعة امناء والمن رطلان " (بدرالمنتقی مصری ص ۲۱۵)

صاع چار من کا ہے اور من دو رطل کا ہوتا ہے۔

علامہ صدرالشریعہ شرح وقایہ میں فرماتے ہیں: " وعندنا نصف صاع من العراق وهو منوان" (شرح وقایہ ص ۲۳۱ ج ۱)

ہمارے نزدیک عراقی آدھا صاع دو من کا ہے۔

ان ہر دو عبارتوں سے ثابت ہوا کہ عراقی صاع چار من کا ہوتا ہے اور ہر من دو رطل کا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ صاع کو اگر چار مد یا چار من کا بھی مان لیا جائے تو جب ہر مد اور من دو دو رطل کا ہے تو چار مد یا چار من کے بھی وہی آٹھ رطل ہوتے ہیں جو مذکور ہوئے تو یہ اقوال تو مختلف ہوئے مگر سب کا نتیجہ ایک ہی ہے۔ تو اب رطل کی تحقیق ضروری ہوئی کہ اس کی تفصیل سے صاع کا وزن معلوم ہو جائے گا۔

علامہ محقق شیخ زادہ مجمع الانہر میں فرماتے ہیں: " وکل رطل عشرون استاراً "

(مجمع الانہر مصری ص ۲۲۹ ج ۱)

اور ہر رطل بیس استار کا ہوتا ہے۔ فتاوی عالمگیری میں ہے: " الصاع ثمانية ارطال بالبغدادی ورطل البغدادی عشرون استاراً والاستار اربعة مثاقيل ونصف مثقال "

(عالم گیری مجیدی ص ۹۸)

صاع بغدادی آٹھ رطلوں کا ہے اور بغدادی رطل بیس استار کا ہے اور استار ساڑھے چار مثقال کا ہے۔

قاضی عبدالنبی احمد نگری جامع العلوم میں فرماتے ہیں: " الصاع ثمنية ارطال والرطل نصف المن عشرون استارا والاستار اربعة مثاقيل ونصف مثقال " وباید دانست کہ ہر مثقال چہار ونیم ماشہ است پس از استار یک تولہ وہشت وربع ماشہ می شود وبریں حساب صاع دوصد وہفتاد تولہ شود هذا صاع عراقی ذهب اليه ابو حنيفة رحمه الله تعالیٰ "

(جامع العلوم حیدرابادی ص ۲۳۰ ج ۲)

صاع آٹھ رطل کا ہے اور رطل نصف من یعنی بیس استار کا ہے اور استار ساڑھے چار مثقال کا ہے۔ اور جاننا چاہئے کہ ہر مثقال ساڑھے چار ماشہ کا ہے تو استار ایک تولہ سوا آٹھ ماشہ کا ہوا۔ پس اس حساب سے صاع دوسوستر تولہ کا ہوا۔

اور یہ عراقی صاع ہے۔ ہمارے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا یہی مسلک ہے۔

اسی جامع العلوم میں ہے: " وفی القنية مثقال بالکسر چہار ونیم ماشہ فيعلم من ههنا ان المثقال ستة وثلثون حبة حمراء " (جامع العلوم وحیدرآبادی ص ۲۱۰ ج ۲)

قنیہ میں ہے۔ مثقال ساڑھے چار ماشہ کا ہے۔ تو اسی سے معلوم ہوا کہ مثقال چھتیس سرخ کا ہموزن ہے۔

ان عبارات سے ظاہر ہو گیا کہ مثقال ساڑھے چار ماشہ کا ہے اور استار ساڑھے چار مثقال کا تو استار ایک تولہ سوا آٹھ ماشہ کا ہوا، اور رطل بیس استار کا تو رطل تینتیس تولہ نو ماشہ کا ہوا، اور صاع آٹھ رطل کا ہے تو صاع دوسوستر تولہ کا ہوا جو انگریزی روپیہ سے سوا گیارہ ماشہ کا ہے، دوسو اٹھاسی روپیہ بھر کا قرار پایا۔ اور اس کا نصف صاع ایک سو چوالیس روپیہ بھر کا ٹھہرتا ہے۔ لیکن جب سیدنا اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس نصف صاع کا تجربہ کیا کہ اس پیمانے میں جو بھر کر تولے تو وہ ایک سو چوالیس بھر ہوئے اور

جب اسی نصف صاع شعیری میں گیہوں بھر کر تولے تو وہ ثمن رطل کم پانچ رطل آئے یعنی ایک سو چوالیس رو
پیہ بھر جو کی جگہ ایک سو پچھتر روپیہ آٹھ آنے بھر گیہوں ہوئے۔ اور اس قدر وزن میں فرق ہو جانا بعید از قیا
س نہیں ہے۔ کیونکہ جو ہلکا ہوتا ہے اور گیہوں بہ نسبت اس کے وزنی ہے تو جس برتن میں ایک سو
چوالیس روپیہ بھر جو وزن میں اترے اسی میں جب گیہوں اسی طرح بھر کر تولے جائیں گے تو وہ یقیناً اس
مقدار سے زائد ہوں گے کہ گیہوں جو سے زائد وزنی ہے۔ لھذا احتیاط اسی میں ہے کہ جب صدقہ فطر میں
گیہوں یا اس کا آٹا دیا جائے تو ایک سو پچھتر روپیہ آٹھ آنے بھر یعنی اس اسی روپیہ کی تول سے دو سیر تین
چھٹانک اٹھنی بھر دیا جائے۔ اور جو اور گیہوں کے علاوہ جو غلہ دینا چاہیں تو ایک صاع جو یا نصف صاع
گیہوں کی قیمت کے حساب سے دیا جائے، اس میں وزن کا اعتبار نہیں ہے۔

درمختار میں ہے: " ما لم ینص علیه کذرة و خبز تعتبر فیه القیمة ۔

واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

باب النوافل

مسئلہ (۴۴۹)

کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام مسئلہ ذیل میں کہ

آیا سنتوں اور نفلوں کی چار رکعت کی نیت میں قعدہ اولیٰ میں صرف التحیات پڑھی جائیگی یا اس کے بعد درود شریف اور دعا پڑھ کر تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوں اور تیسری رکعت میں بسم اللہ اور الحمد شریف سے قرأت شروع کی جائے یا اس سے پہلے سبحنك اللهم اور اعوذ بالله بھی پڑھی جائی گی بحوالہ کتب جواب سے مطلع فرمائیں۔ بینوا توجروا

المستفتی، عبداللہ ساکن دیپا سرائے سنبھل

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

ظہر کی پہلی چار سنت مؤکدہ اور جمعہ کے قبل وبعد کی چار چار سنت کا حکم تو فرض جیسا ہے کہ ان کے قعدہ اولیٰ میں صرف التحیات پڑھ کر تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہو جائیں اور تیسری رکعت سبحنك اللهم اور اعوذ بالله سے شروع نہ کیا جائے بلکہ بسم اللہ اور الحمد للہ سے شروع کریں۔ لیکن ظہر اور جمعہ کی ان سنتوں کے علاوہ اور تمام سنتوں۔ مستحبات۔ نفلوں کی چار رکعتوں میں قعدہ اولیٰ میں بعد التحیات کے درود شریف اور دعا بھی پڑھی جائے اور تیسری رکعت کو سبحنك اللهم اور اعوذ بالله سے شروع کیا جائے۔

چنانچہ فقہ کی مشہور کتاب درمختار میں ہے " ولا یصلی علی النبی ﷺ فی القعدة الاولیٰ فی الاربع قبل الظهر والجمعة وبعدها ولو صلی ناسیا فعلیه السهو وقیل لاشئی ولا یستفتح اذا قام الی الثالثة منها لانها لتاكدها اشبهت الفریضه وفی البواقی من ذوات الاربع یصلی علی النبی ﷺ ویستفتح ویتعوذ ولو نذرًا لان کل شفعة صلاة "

(ردالمحتار مصری جلد ا صفحہ ۲۷۴)

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل ، الفقیر الی اللہ عز و جل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۵۰)

هل يو مر الصبيان با لنوافل كا ربع قبل العصر و ضربوا على تر كها ام لا؟

الجواب

نحمده ونصلى ونسلم على رسوله الكريم

نعم يومر الصبى با لنوافل ويضرب اذا كان ابن عشر سنة ليتخلق بفعلها و بعتاده ولقوله عليه السلام مروا اولادكم با لصلوة وهم ابناء سبع واضربوهم عليها وهم ابناء عشر وفرقوا بينهم فى المضاجع رواه ابو داؤد ۔ يستدل من الحديث على الصلوة وهى مشتملة على النوافل ايضا وعلى ان الفرض فى حق الصبى نوافل فثبت الا مر والضرب للنوافل ايضا ويستوى فى التخلق والا عتياد الفرائض والنوافل بل ينبغى ان يومر بجميع الماموارت وينهى عن جميع المنهيات كما صرح به فى رد المحتار و الله تعالى اعلم با لصواب:

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل ، الفقیر الی اللہ عز و جل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۵۱)

سنت فجر کے متعلق جو حدیث ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو فجر کی نماز کے بعد دو رکعتیں پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ ۔صلوۃ الصبح رکعتیں رکعتیں ۔ تو اس شخص نے جواب دیا کہ میں فرض سے پہلے کی سنتیں نہیں پڑھی تھیں اب پڑھی ہیں اتنا سن کر حضور خاموش رہے اور کچھ نہ فرمایا تو زید اس حدیث کی بنا پر کہتا ہے کہ فرض پڑھنے کے بعد فجر کی سنتیں پڑھ سکتے ہیں اگر فرض کے بعد سنتیں جائز نہ ہوتیں تو حضور خاموش کیوں رہتے اس کو منع کرتے کہ ایسا آیندہ نہ کرنا۔ اگر اس حدیث کی ناسخ کوئی حدیث ہو تو جواب میں تحریر کیجئے۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

فقہ کی کتب متون وشروح وحواشی وفتاوی وغیرہ میں فقہائے کرام کی یہ تصریحات موجود ہیں۔

ردالمحتار کی عبارت یہ ہے: لا يقضى سنة الفجر الا اذا فاتت مع الفجر فيقضيها تبعا لقضائه لو قبل الزوال واما فاتت وحدها لا تقضى قبل طلوع الشمس بالاجماع لكراهة النفل بعد الصبح۔ (شامی ص ۵۰۳)

سنت فجر کی قضا نہ کی جائے مگر جب فرض کے ساتھ قضا ہو جائیں تو زوال سے پہلے تک فرض کی قضا کی متابعت میں ان کی بھی قضا پڑھیں۔ لیکن جب فقط سنت قضا ہو جائیں تو باجماع طلوع آفتاب سے پہلے قضا نہ پڑھیں کہ صبح کے بعد نفل مکروہ ہیں۔

تو اگر زید مقلد حنفی ہے تو اسے باوجود تصریحات فقہا اور روایات مذہب کے حدیث سے استدلال کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں اور جب فقہاء نے اس حدیث کے خلاف پر اجماع کیا تو خلاف ظاہر ہو گیا، بلاشبہ یہ حدیث ضعیف نا قابل عمل ہے کہ اجماع فقہاء حدیث صحیح کے خلاف پر کبھی نہیں ہو سکتا۔

اور اگر زید غیر مقلد ہے تو یہ بتائے کہ یہ کہاں ہے؟۔ اور اس کے رجال کیسے ہیں؟۔ اور اس کی صحت کا کیا حال ہے؟۔ اور اسکا کونسا زمانہ ہے؟۔ اور اس کے معارض یہ احادیث ہیں:

عن ابن مسعوان رجلا صلى مع النبى ﷺ الصبح فلما انصرف صلى ركعتين فقال له ﷺ الصبح اربعا؟۔ قال: يا رسول الله ! انى كنت لم اصل ركعتى الفجر قال فلا اذا ۔راوه رزين ۔

عن قيس جد يحيى بن سعيد الانصارى انه فعل مثل ذلك فقال له ﷺ: مهلا ياقيس ! اصلا تان معا؟۔ فقال :انى لم اركع الركعتين قال فلا اذا۔

(رواه ابو داؤدو الترمذى)

اب زید اپنی پیش کردہ حدیث اور ان احادیث میں یہ بتائے کہ کون مقدم ہے اور کون متاخر اور سکوت وممانعت صریح میں کون راجح ہے کون مرجوح۔ بالجملہ جب زید ان امور صغیرہ کو بالتفصیل بیان کردیگا تو پھر اس کے استدلال کی حقیقت بھی ظاہر کر دی جائیگی۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : الفقیر الی اللہ عزوجل ،العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۴۵۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

صلاۃ اوابین جو چھ رکعت پڑھی جاتی ہے وہ فرض کے بعد کی دوسنتوں کے علاوہ چھ رکعتیں پڑھی جاتی ہیں یا معہ سنتوں کے چھ رکعتوں کو پوری کی جاتی ہیں۔ حضور ہر مسئلہ کا جواب اطمینان بخش ہونا چاہئے معہ حوالہ کتب کے

المستفتی محمد عبداللہ خاں مدرس مدرسہ عربیہ متصل رسالہ مسجد جھند باڑاہ۔ سی۔ پی۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اوابین کی چھ رکعتوں کی ایک نیت ہی باندھی جائے، دو رکعتیں سنت کی اسی میں محسوب ہونگی۔

درمختار میں ہے: هل تحسب الموكدة من المستحب ويؤدى الكل بتسليمة واحدة اختار الكمال نعم۔ (شامی ص ۴۷۳۔ ج ۱)

کبیری میں ہے: وقع عندى انه اذا صلى اربعا بعد الظهر بتسليمة واحدة او اثنين يقع عن السنة والمندوب سواء احتسب هو الموكدة منها اولا ۔ وفيه ايضا و الحال فى الست بعد المغرب كالحال هذه الاربع والله تعالى اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۵۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

اگر ایک شخص رمضان کے مہینہ میں دوجگہ نماز تراویح پڑھاوے تو کیا یہ نماز تراویح ہوسکتی ہے۔ پہلی دفعہ اول رات میں اور دوسری دفعہ پچھلی رات میں اور امام صاحب کہتے ہیں کہ میں تو نفل پڑھتا ہوں تو کیا ایسی نماز ہوسکتی ہے اور اس امام کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

نماز تراویح کہ سنت موکدہ اور جماعت سے وقت میں صرف ایک مرتبہ پڑھی جاسکتی ہے اور دوسری

بار نوافل ہونگے اور نوافل کی جماعت مکروہ ہے۔

شامی میں ہے: و النفل بالجماعة غير مستحب ۔

اور جب اس امام میں سوا اس کے اور کوئی موانع امامت نہ ہوں تو اس کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ہاں اسے ایسی عادت سے منع کیا جائے واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۵۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

بعض حضرات ایسے ہیں کہ وہ کبھی فرائض ادا نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو کبھی کبھی بخلاف اس کے کہ وہ نفل و احکام مستحبہ کرنے کو تو اڑے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ بغیر ان باتوں کے تو دین ہی بیکار ہے۔ مثلاً سوم، کونڈہ، گیارہویں شریف، تعزیہ داری، مروجہ عرس شریف، برسی، چہلم، رجبی شریف وغیرہ۔ دیگر یہ کہ کچھ حضرات یہ کہتے ہیں کہ بھائیو پہلے جب تک آپ لوگ فرائض ادا نہیں کریں گے، تو یہ تمہارے اوپر والے تمام اعمال کام نہیں دیں گے۔ اور نہ یہ قبول ہوں گے۔ اور وہ اس کی سند کے واسطے حضرت مولانا مولوی احمد رضا خان صاحب کی عبارت پیش کرتے ہیں، جو معہ حوالہ نقل کی جاتی ہے،

کتاب الوظیفۃ الکریمہ مطبوعہ مطبع اہل سنت و جماعت بریلی واقع آستانہ عالیہ رضویہ بار سوم ۵۰ جلد ص ۱۴ کے آخر میں عبارت تحریر ہے۔ فقیر احمد رضا قادری غفرلہ پنجم محرم ۱۳۳۸ھ بھی تحریر ہے۔ اصلی عبارت۔

جس پر فرض باقی ہوں اس کے نفل اور اعمال مستحبہ کام نہیں دیتے بلکہ قبول نہیں ہوتے جب تک فرائض ادا نہ کرے۔

اس عبارت کے پیش کرنے پر بھی وہ لوگ احکام شریعت سے روگردانی کرتے ہیں۔ تو ایسے حضرات کی بابت شرعاً کیا حکم ہے؟۔ کیا وہ حق بجانب ہیں جو اعمال مستحبہ و نفلی پر اڑے رہیں اور فرائض ادا نہ کریں؟۔

المستفتی لیاقت حسین انصاری۔ بلاری مراد آباد ۱۳ ر رمضان المبارک ۷۵ھ

الجواب

نحمده و نصلی و نسلم علی رسوله الكريم

فرائض کی ادا ذمہ پر ضروری ہے یہاں تک کہ اس کا تارک سخت گنہگار اور فاسق ہو جاتا ہے اور نوافل واعمال مستحبہ نہ ذمہ پر ضروری نہ انکا تارک فاسق گنہگار۔ اور بلاشک جس پر فرائض باقی ہوں اسکے اعمال مستحبہ ونوافل قبول نہیں ہوتے۔ تو فرائض کا ادا کرنا تو فرض ہی ہوا اور مستحبات ونوافل صرف باعث اجر وثواب ہوئے تو فرائض ونوافل کا یہ فرق باعتبار عمل اور ادا کے ہے اور یہ امر تو اتفاقی ہے اس میں کوئی بھی شمہ بھر کا اہل سنت و جماعت اور فرقہ ضالہ وہابیہ میں فرق نہیں، جو ہے اس کو سائل یا تو اپنی جہالت کی بنا پر نہیں سمجھ سکا یا وہ جان بوجھ کر مسلمانوں کو مغالطہ میں ڈالنا چاہتا ہے۔

فرق یہ ہے کہ اہل سنت نوافل میں مستحبات کو جائز اور سبب اجر وثواب اعتقاد کرتے ہیں، اور وہابیہ ان مستحبات کو ناجائز وبدعت کہتے ہیں، تو ان وہابیہ نے ان مستحبات کو ناجائز و بدعت بتا کر گویا فعل حلال کو حرام قرار دیا، جو گمراہی وضلال ہے۔ لہذا اب فرق یہ ہوا کہ تارک فرض فاسق وگنہگار تو ہوا لیکن گمراہ وضال نہیں ہوا۔ اور جو مستحبات کو ناجائز بدعت کہتا ہے وہ نہ صرف گنہگار بلکہ گمراہ وضال قرار پایا۔ تو حقیقۃ یہ تقابل عمل کا عمل سے نہیں ہے بلکہ تقابل عمل کا عقیدہ سے ہے۔ تو اب اس سائل کی سخت جہالت یہ ہے کہ ترک عمل کا مخالفت عقیدہ سے تقابل کر رہا ہے۔ یا اس کا انتہائی فریب یہ ہے کہ وہ ترک فرض کی اہمیت دکھا کر اعتقادی امور سے گمراہ کرنے کی ناپاک سعی کرتا ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ سوم، گیارہویں شریف، فاتحہ، عرس، برسی، رجبی شریف، وغیرہ امور مختلف فیہا تو یہ عملی طور پر تو ضرور مستحبات سے ہیں جو ان کو جائز اعتقاد کرتے ہوئے اگر نہ کرے تو نہ وہ گنہگار ہے نہ اس پر ملامت نہ عذاب۔ لیکن انکا عملا وہابیہ تو کرتے ہی نہیں اور اس کے ساتھ ان امور کو ناجائز و بدعت کہتے ہیں۔ تو یہ ان مستحبات کو ناجائز وحرام ٹھہرا کر سخت گنہگار بھی ہوئے۔ اور گمراہ وضال بھی ہوئے۔ تو ان مستحبات کو جائز اعتقاد کرنا شعار اہل سنت ہے۔ اور انکو بدعت وناجائز اعتقاد کرنا شعار وہابیہ اہل ضلال سے ہے۔ تو وہابیہ کا ان امور مستحبہ کو ناجائز و بدعت کہنا، گویا حلال کو حرام قرار دینا ہے تو اس اعتبار سے اہل سنت کا اڑنا بالکل صحیح ہے، کہ یہ شعار اہل سنت ہے اور ان امور کو ترک کرانے والے وہابیہ ہیں جو اپنی فریب کاری سے مسلمانوں کو طریقہ حقہ سے گمراہ کرنے کی فکر میں ہیں۔ مولی تعالیٰ ان وہابیہ کے شر اور فریب ومکر سے بچائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۵۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ
عشاء کی دوسنت اور وتر کے درمیان جو دونفل پڑھنے کا اکثر رواج ہے، اس کا کیا ثبوت ہے اور سنت وتر کے درمیان دونفل کیسے آئے؟۔ درمیان میں نہ پڑھتے ہوئے آخر میں چار نفل پڑھے جائیں تو کیسا ہے؟ اور جمعہ، ظہر، مغرب عشا میں جو نفل پڑھتے ہیں، انکا ثبوت کہاں سے ہے؟۔ آیا کسی حدیث سے ہے یا کسی بزرگ کے مقرر کردہ ہیں۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الكريم
فرض عشا کے بعد علاوہ دوسنت مؤکدہ کے چار رکعت نفل پڑھنا مستحب ہے۔
مراقی الفلاح میں ہے: وندب اربع بعد العشاء لما روينا لقوله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم من صلی قبل الظهر اربعا كان كانما تهجد من ليلته و من صلى هن بعد العشا كان كمثلهن من ليلة القدر۔
یعنی فرض عشا کے بعد چار رکعت پڑھنا مستحب ہے، اس حدیث کی بنا پر جو ہم نے روایت کی اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اس حدیث کی بنا پر کہ جس نے فرض ظہر سے پہلے چار رکعت پڑھیں تو گویا اس نے اس رات کی تہجد کی نماز پڑھی۔ اور جس نے فرض عشا کے بعد چار پڑھیں تو وہ لیلۃ القدر میں چار رکعت پڑھنے کے مثل ہے۔ تو اس سے بعد عشا چار نوافل پڑھنا مستحب ثابت ہوگیا پھر اگر ان نوافل کی دو رکعت سنت مؤکدہ کے بعد اور پڑھ لی جائیں اور دو رکعت بعد وتر پڑھ لی جائیں تو اس میں کوئی محظور شرعی لازم نہیں آتا۔ کہ حقیقۃً نوافل جبر نقصان کے لئے مشروع ہوئے ہیں۔
اسی مراقی الفلاح میں ہے: النوافل شرعت لجبر نقصان يمكن فی الفرض۔
تو پہلی دو رکعتیں فرائض کے جبر نقصان کے لئے ہوگئیں اور بعد کی دو رکعات نفل وتر کے جبر نقصان کے لئے ہوئیں۔ لہذا یہ طریقہ اس سے اولی ہے کہ چاروں رکعات نفل اخیر میں پڑھے جائیں اگر چہ اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح بعد جمعہ وظہر اور بعد مغرب وعشا جو نوافل پڑھے جاتے ہیں، ان کا ثبوت بھی احادیث سے ثابت ہے۔
حدیث ترمذی شریف میں حضرت ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

من حافظ علی اربع رکعات قبل الظهر و اربع بعدها حرمه الله علی النار۔ یعنی، جس نے فرض ظہر سے پہلے چار رکعتوں اور بعد والی چار رکعتوں پر ہمیشگی کی تو اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ حرام فرما دے گا۔

حدیث دیلمی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے، کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

من صلی اربع رکعات بعد المغرب قبل ان یتکلم احد ارفعت له فی علیین و کان کمن ادرك لیلة القدر فی المسجد الا قصی و هو خیر من قیام نصف لیلة۔

یعنی جس نے بعد فرض مغرب کے چار رکعتیں کسی سے بات کرنے سے پہلے پڑھ لیں تو وہ اس کو علیین میں بلند کرائیں گی۔ اور وہ شخص اس کی مثل ہو جائے گا۔ جس نے مسجد اقصی میں لیلۃ القدر کو پالیا اور وہ نصف شب کے قیام سے افضل ہے۔

حدیث طبرانی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

من صلی العشاء فی جماعة و صلی اربع رکعات قبل ان یخرج من المسجد کان کعدل لیلة القدر۔

یعنی جس نے فرض عشاء جماعت میں پڑھے او چار رکعتیں مسجد سے نکلنے سے پہلے پڑھیں، تو وہ لیلۃ القدر میں پڑھنے کے مثل ہیں۔ تو ان احادیث سے بعد ظہر و جمعہ اور بعد مغرب و عشا نوافل کا پڑھنا ثابت ہو گیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۵۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

مسجد میں جا کر کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اکثر اشخاص تحیۃ الوضو۔ تحیۃ المسجد۔ یا مستحب نوافل یا سنت موکدہ ادا کرتے ہیں۔ یہ وقفہ شریعت میں کیسا ہے؟۔ ح۔م۔ اشرفی ۲۵ / اکتوبر

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد میں داخل ہونے کے بعد تحیۃ المسجد ودیگر نوافل بلا کسی وقفہ کے پڑھنے چاہئیں اور کچھ دیر بیٹھنے کے بعد تحیۃ المسجد یا نوافل کا پڑھنا نامناسب وخلاف اولیٰ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

﴿۲۸﴾

باب التہجد

مسئلہ (۴۵۷)
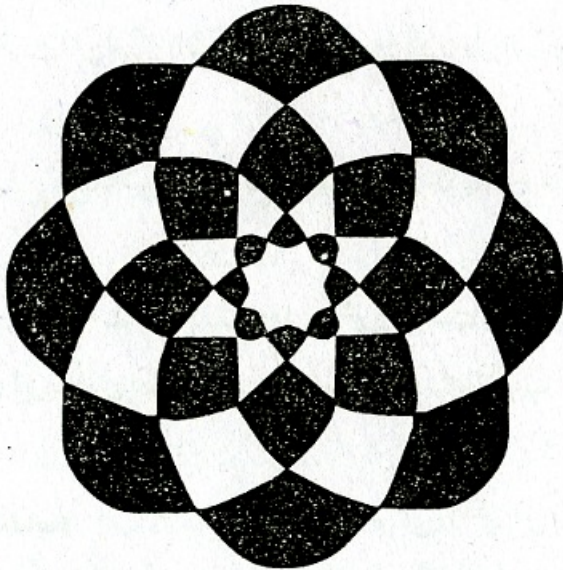
کیا فرماتے ہیں حضرات علماء اہل سنت اس مسئلہ میں کہ

زید کہتا ہے کہ تہجد کی نماز کا وقت عشاء کی نماز پڑھ کر سونے کے بعد ہے جب رات کے کسی حصہ میں آنکھ کھلے پڑھ سکتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص عشاء کی نماز پڑھکر ۹ بجے سویا اور دس بجے بیدار ہو گیا تو ۱۰ بجے پڑھ سکتا ہے اگر شب بیداری کرے تو تہجد نہیں پڑھ سکتا ہے۔ بکر کہتا ہے کہ یہ مسئلہ غلط ہے اگر کوئی شخص شب بیداری کرے تو بھی ۱۲ بجے کے بعد تہجد پڑھ سکتا ہے دریافت طلب امر یہ ہے زید صحیح کہتا ہے یا بکر ؟۔ بینوا تو جروا

المستفتی ، رمضان علی محلہ قاضی پورہ بہرائچ

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

تہجد کے معنیٰ بہ تکلف نیند کا زائل کرنا ہے۔ ردالمحتار میں ہے " التهجد ازالة النوم بتكلف " تو تہجد والا وہی شخص قرار پایا جو سونے کے بعد نماز نفل پڑھے۔ چنانچہ معجم طبرانی کی حدیث میں ہے:

يحسب احدكم اذا قام من الليل يصلی حتی يصبح انه قد تهجد انما تهجد المرأ يصلی الصلوة بعد رقدة ۔ (ردالمحتار جلد اصفحہ ۴۸۰)

یعنی تمہارا کوئی شخص گمان کرتا ہے کہ جب رات کے کسی حصہ میں نماز پڑھے یہاں تک کہ صبح ہو جائے تو اس نے تہجد کو ادا کر لیا۔ بلکہ تہجد پڑھنے والا وہی شخص ہے جو سونے کے بعد نماز پڑھے

تو اس حدیث سے ثابت ہو گیا کہ نماز تہجد سونے کے بعد ہی ہوا کرتی ہے۔ اب باقی رہا یہ امر کہ تہجد کا وقت کب سے شروع ہو جاتا ہے تو حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وقت تہجد نماز عشاء کے بعد ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔

چنانچہ طبرانی کی حدیث مرفوع میں ہے:

" وما کان بعد صلوۃ العشاء فھو من اللیل " (ردالمحتار جلد ا صفحہ ۴۸۰)

یعنی نماز عشاء کے بعد جو نفل بھی ہوگا وہ تہجد ہی ہے۔تو اب جو شخص اول وقت میں نماز عشاء پڑھ کر سو گیا۔ پھر ایک گھنٹہ کے بعد آنکھ کھل گئی تو اب وہ جس قدر نفل پڑھیگا وہ نماز تہجد ہی ہوگی۔تو اسی سے قول زید کا صحیح ہونا اور قول عمر کا خلاف تحقیق ہونا ثابت ہوگیا۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۲ ربیع الآخر ۱۳۷۶ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

باب قضاء الفوائت

مسئلہ (۴۵۸)
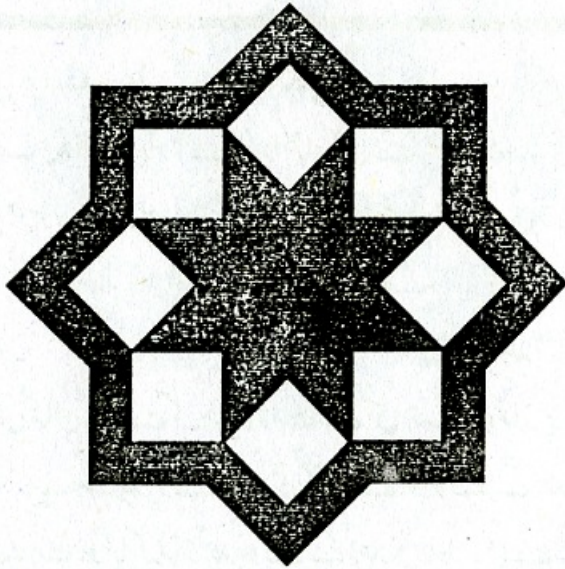
کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین دامت برکاتھم العالیہ مسائل ھذا میں
جس شخص کی نماز فجر قضا ہو تو وہ پہلے ظہر کی نماز پڑھے یا فجر کی قضا؟۔ یونہی اگر ظہر کی قضا ہو تو عصر کو۔ یا عصر کی قضا ہو تو مغرب کو۔ اگر مغرب کی قضا ہو تو عشاء کو۔ اور عشاء کی قضا ہو تو فجر کو پہلے قضا نماز پڑھے بعد کو وقتی فرض نماز پڑھے۔ یا پہلے وقتی فرض پڑھنے کے بعد اگر جماعت ہو رہی ہو تو جماعت میں شریک ہو یا قضا پڑھے؟۔

زید یہ کہتا ہے کہ جس وقت کی نماز قضا ہوئی تو دوسرے روز اسی وقت پر پہلے قضا بعد کو وقتی فرض نماز پڑھے۔ مثلا دو شنبہ مبارکہ کو نماز ظہر قضا ہوئی تو اب یوم سہ شنبہ کو پہلے قضا پڑھے بعد کو سہ شنبہ کی ظہر اگر چہ جماعت ہی کیوں نہ ہو رہی ہو۔ کیا زید کا کہنا صحیح ہے؟۔ بینوا بالتفصیل توجروا بالجلیل۔

المستفتی، فقیر محمد عمران قادری رضوی مصطفوی غفرلہ ربہ محلہ میر خاں پیلی بھیت شریف

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صاحب ترتیب پہلے قضا نماز پڑھے اس کے بعد وقتیہ نماز ادا کرے۔ نیز اگر جماعت ہو رہی ہو تو وہ پہلے اپنی قضا نماز پڑھے اور جماعت میں شرکت نہ کرے۔ اور غیر صاحب ترتیب پہلے وقتیہ نماز پڑھ سکتا ہے اور وہ قضا سے پہلے جماعت میں شریک ہو جائے۔

زید کا قول صحیح نہیں ہے کہ صاحب ترتیب پر وہ وقتی نماز سے پہلے قضا نماز کا پڑھنا ضروری ہے تو وہ دوسرے دن کے اوقات کا انتظار کر ہی نہیں سکتا اور غیر صاحب ترتیب کو بھی جلد از جلد پہلی فرصت میں قضا نماز ادا کرنی چاہئے دوسرے روز کا انتظار پھر اسی وقت خاص کا التزام اس کے لئے ثابت کرنا مسائل دین سے ناواقفی کی دلیل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۲ صفر المظفر ۱۳۷۸ھ

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

باب المساجد

مسئلہ (۴۵۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک مسجد میں کڑیوں کی چھت ہے۔ اہل محلہ یہ چاہتے ہیں کہ چھت کو اکھاڑ کر ڈاٹ لگوادی جائے۔ اہل محلہ کے پاس صرف سوروپیہ جمع ہیں اس سے زیادہ دام ہونے کی توقع نہیں اور یہ کڑیاں مسجد کے کام میں آنے والی نہیں اور اسی طرح پڑی رہنے سے ضائع ہونے کا خوف ہے۔ لہذا دریافت طلب یہ امر ہے کہ ان کڑیوں کو فروخت کر کے کڑیوں کی قیمت ڈاٹ میں صرف کر سکتے ہیں یا نہیں؟۔ بینوا توجروا

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الكريم

کڑی تختے اجزائے مسجد میں داخل ہیں۔ اگر وہ فی الواقع اس مسجد کی حاجت سے زائد اور آئندہ بھی عمارت مسجد میں کام نہ آئیں اور ان کے اٹھا رکھنے میں ضائع ہونے کا خوف ہو تو اس محلہ کا ایک مسلمان دیندار خدا ترس موتمن معتمد اس بار کو اپنے اوپر اٹھا کر مناسب قیمت کے ساتھ فروخت کر سکتا ہے اور وہ قیمت ڈاٹ میں صرف ہو سکتی ہے۔

عالمگیری میں ہے: مسجد اراد رجل ان ينقضه ويبنيه احكم ليس له ذلك۔ لانه لاولاية لـه مضمرات الا ان يخاف انه ينهدم تاتار خانيه ـ وتاويله ان لم يكن البانى من اهل تلك المحلة واما اهلها فلهم ان يهدموا ويجددوا بناءه وليفرشوا الحصير ويعلقوا القناديل لكن من مالهم لامن مال المسجد الا بامر القاضى خلاصه اه۔ وفى العقود الدرية عن البحر عمدة الفتاوى لايجوز بيع بناء الوقف قبل هدمه اه۔ وفى الهندية عن السراجية لو باعوا غلة المسجد او نقض المسجد بغير اذن القاضى الاصح انه لايجوز اه۔ وفى الدر صرف الحكم او المتولى نقضه ثمنه ان تعذر اعادة عليه الى عمارته ان احتاج والا حفظه ليحتاج الا اذا خاف فباعه فيبيعه ويمسك ثمنه ليحتاج۔ وفى الخانية من فصل المقابر والرباطات قد

ذکر نا ان الصحیح من الجواب ان بیعهم بغیر امر القاضی لایصح الا ان یکون فی موضع لا قاضی هناك ۔

مگر ہاں جوان کو خریدے وہ کسی ناپاک یا تحقیر کی جگہ جیسے پاخانہ و غسل خانہ وغیرہ میں نہ لگائے، کہ مسجد کے اجزا کی حرمت کا لحاظ ضروری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۶۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ عورتوں کو مسجد میں دن یا رات میں بغرض عمارت دیکھنے مسجد کے اندر جانا جائز ہے یا نہیں؟۔

عبد الغفار ساکن محلّہ کوٹلہ ۲۸ شعبان ۷۴ھ

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

عورتوں کے لئے مساجد میں جانے۔ جمعہ اور عیدین اور پنجوقتی جماعتوں کی شرکت کرنے کو شرع نے ممنوع قرار دیا حالانکہ شریعت میں ان چیزوں کی کیسی سخت تاکید ہے۔

درمختار میں ہے: ویکره حضورهن الجماعة ولو لجمعة وعید ووعظ مطلقا ولو عجوزا لیلا علی المذهب المفتی به لفساد الزمان۔

مراقی الفلاح میں ہے: ولا یحضرن الجماعات لما فیه من الفتنة والمخالفة ۔

جوہرہ نیرہ میں ہے: الفتوی الیوم علی الکراهیة فی الصلوات کلها لظهور الفسق فی هذا الزمان ۔

علامہ شیخ مصطفیٰ کی شرح کنز میں ہے: ولا یحضرن الجماعات مطلقا ولو عجائز فی الفجر او غیره وعلیه الفتوی۔

اسی طرح عینی۔ غنیۃ۔ طحطاوی۔ بحر۔ نہر وغیر کتب فقہ میں ہے۔

ان عبارات سے واضح طور پر ظاہر ہو گیا کہ ہمارے مذہب کا اس زمانہ میں قول مفتی بہ یہی ہے کہ بوڑھی عورتوں کی بھی خصوصا شب کے وقت میں خاص ادائے فریضہ کے لئے مساجد میں جانا جائز

نہیں۔ تو ایک غیر ضروری چیز محض عمارت دیکھنے کے لئے عورتوں کا جانا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ عمارت دیکھنے کی نہ کوئی حاجت۔ نہ وہ شرعا موکد۔ اور حدیث میں وارد ہے:

فاذا خرجت استشرفها الشيطان رواه الترمذی وفی رواية مسلم تقبل فی صورة شيطان وتدبر فی صورة شيطان الحديث۔

کہ جب عورت نکلتی ہے دو شیطان اس کے ساتھ ہوتے ہیں ایک آگے ایک پیچھے۔

بالجملہ عورت کا صرف عمارت دیکھنے کی غرض سے ہمارے زمانہ فسق وفجور میں نکلنا احتمال فتنہ وفساد سے خالی نہیں۔ لہذا وہ شرعا ناجائز ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (٤٦١)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ سود کے مال سے مسجد بنانا یا عیدگاہ بنانا عند الشرع جائز ہے یا ناجائز؟۔ بینوا توجروا

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الكريم

مسجد پاک مکان ہے اور سودی روپیہ مال خبیث ہے۔ لہذا مال خبیث سے مسجد کی تلویث ممنوع ہے۔ شامی میں ہے۔

لو انفق فی ذلك مالا خبيثا ومالا سببه الخبيث والطيب فيكره لان الله تعالىٰ لايقبل الا الطيب فيكره تلويث بيته بمالا يقبل۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (٤٦٢)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
مسجد کے فرش کے باہر کوئی درخت عشق پیچاں وغیرہ بو کر اس کی بیل دیوار یا سائبان مسجد پر برائے زیبائش پھیلانا جائز ہے یا نہیں؟۔ بینوا توجروا۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

خارج مسجد درخت بوکر اس کی بیل دیوار یا سائبان مسجد پر بقصد زیبائش پھیلانا جب بہ نیت تعظیم مسجد ہو شرعا ممنوع نہیں۔ کما ھو مصرح فی کتب الفقه لانه فیه تعظیم المسجد وتقع للناس ولیس فیه تفریق الصفوف والضیق علی الناس کمافی الهندیة ورد المحتار والدر المختار والخلاصة وغیرها فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۶۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

کسی مسجد کو ایک معاہدہ یا اقرار نامہ کے ذریعہ سے جس کی نقل اس استفتاء کے ہمرشتہ ہے گورنمنٹ بند بن کے محکمہ آثار قدیمہ کی سپرد کر دینا اور اس محکمہ کو مندرجہ اقرار نامہ اختیارات دیدینا اور پابندیاں قبول کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

مسجدیں خاص اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ :ان المسٰجد للہ۔

اور ولایت کافر کی مسلم پر جائز نہیں :لاولایة لـلکافر علی المسلم کما قال اللہ تعالیٰ :لن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا۔

اقرار نامہ کی رو سے بہت امور میں نا مسلم حکومت کے مقابلہ میں متولیان مسجد کو مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔ کیونکہ مسجد کی تعمیر وحرمت قربت ہے اور یہ غیر مسلم سے صحیح نہیں۔

مسجد کی تعمیر مسلمان کے پاک مال سے ہوسکتی ہے۔ کافر کا مسجد بنانا اور اپنے روپے اور اختیار سے اس کی تعمیر کرنا یا مرمت کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ مسجد کی تعمیر ومرمت قربت ہے اور وہ غیر مسلم سے صحیح نہیں۔

درمختار میں ہے:

وشرط سائر التبرعات کحریة وتکلیف ان یکون قربة فی ذاته۔

مسجد عبادت کے لئے ہے سوائے معتکف کے دوسرے کے لئے اس میں کھانا۔ پینا۔ سونا۔ بینا۔ بلکہ دنیا کی باتیں کرنا تک ممنوع ہے۔ ان امور کی مسلمانوں کو بھی اجازت نہیں چہ جائے کہ مومن وکافر سب کے لئے ایک تماشا گاہ بنا دینا۔

الاشباہ والنظائر میں ہے: ومن البیع والشراء کل عقد لغیر المعتکف ویجوز له بقدر حاجة ان لم یحضر السلعة وانشاد الضالة والاشعار والاکل والنوم لغیر غریب ومعتکف والکلام المباح۔

مسجدوں میں بلحاظ حرمت مسلمانوں کے بچے تک لانے کی ممانعت ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم وبیعکم وشراءکم ورفع اصواتکم وسیوفکم واقامة حدودکم۔

مسجد میں آواز بلند کرنے کی ممانعت بھی اسی حدیث سے معلوم ہوگئی، پھر چہ جائیکہ ہر شخص مومن یا کافر کو سیر یا تماشا کے لئے مسجد میں آنے کی تمام اجازت دینا۔

مسجد میں مسلمانوں کو بھی خاص نماز وذکر کے لئے آنے کی اجازت ہے اور ان کے داخلہ کے بھی بہت پابندیاں ہیں۔ چنانچہ جنب یعنی بے غسل اور حائضہ اور نفساء مسجد میں داخل نہیں ہو سکتے۔

الاشباہ والنظائر میں ہے: فمنھا (ای من احکام المسجد) تحریم دخوله علی الجنب والحائض والنفساء ولو علی وجه المرور۔

اسی طرح پیاز لہسن یا کوئی ایسی چیز کھانے والا جس کی بدبو کھانے کے بعد اس کے منہ سے آتی ہو مومن بھی داخل نہیں ہو سکتا۔

الاشباہ والنظائر میں ہے: ویکرہ دخوله لمن اکل ذا ریح کریھة ویمنع منه۔

اسی طرح جس کے بدن پر نجاست لگی ہوئی ہو وہ بھی مسجد میں داخل نہ ہوگا۔

عالمگیری میں ہے: لایدخل المسجد من علی بدنه نجاسة۔

نیز مسلم ونا مسلم بے پردہ عورتیں بھی آئیں گی علاوہ اس کے کہ بے پردہ عورتوں کا اور پردہ نشینوں کا دن میں جماعتوں کے اوقات میں بھی آنا ممنوع ہے۔ عامہ کتب۔

لہذا اب کون تحقیق کرے گا کہ وہ عورتیں حائضہ ہیں یا نہیں؟۔ اور اس عام داخلہ کی اجازت کی صورت میں پاک اور ناپاک کا امتیاز کس طرح رہے گا۔ اور یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اس کے بدن یا کپڑے رنجاست لگی ہے یا نہیں؟۔ اور کس کس کا مونھ سونگھا جائے گا کہ شرابی تک مسجد میں آئینگے۔ اس لئے اس تعمیم سے مسجد کی بے حرمتی ہوتی ہے۔

یہ اقرار نامہ متولیوں کے شرعی اختیارات سلب کرتا ہے اور اس سے تولیت کو نقصان پہنچتا ہے اور یہ واقف کے منشا کے خلاف ہے۔

ونیۃ الواقف کنص الشارع۔

علاوہ بریں متولیوں کو ایسا اقرار نامہ لکھنا اور کسی نامسلم کو اسے اختیارات دینا جائز نہیں۔ کیونکہ واقف نے جب تصرف کی اجازت نہ دی ہو متولی اس تصرف کا اختیار نہیں رکھتا۔

کماھو مصرح فی الکتب۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۶۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) بخدمت جناب قبلہ علمائے دین اسلام علیکم گذرش یہ ہے کہ ہمارے گاؤں کے سب مسلمانوں نے یہ رائے پاس کیا کہ جو مسلمان نماز جمعہ نہ ادا کرے جنازے میں نہ شامل ہو وہ پانچ آنہ جرمانہ دیں۔ وہ جرمانہ مسجد کی مرمت میں لگے سب نے اقرار کیا۔ اور ایک آدمی نے کہا میں نہیں دوں گا۔ جرمانہ دیگر نماز نہیں پڑھوں گا۔ بلکہ الگ رہوں گا ایسے آدمی کے ساتھ کیا کیا جائے۔

(۲) اس آدمی کے باپ نے زندگی میں کچھ روپیہ مسجد کے تعمیری میں چندہ دیا تھا زمانہ زیادہ گذر چکا اس نے سوال کیا ہمارا چندہ واپس کردو سب کی رائے ہوئی کہ واپس کردو وہ واپس کردیا گیا۔ دینے کے بعد کہا کہ اس وقت چاندی کے روپیہ چلتے تھے ہم چاندی روپیہ کے بھاؤ لیں گے لوگوں نے کہا کیا لو۔ گے کہا ایک کا ڈیڑھ۔ دیا گیا بتائیں آپ اسلامی قانون کیا ہے۔

(۳) پہلے سوال کے جرمانہ کی رقم مسجد میں لگ سکتی ہے یا نہیں۔ کسی عالم کو روپیہ دیکر یا غلہ دے کر نماز اس کے پیچھے پڑھنا روا ہے یا نہیں۔

خطبہ میں جو درود میں نظم درج ہیں پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟۔ برائے مہربانی جواب عنایت کریں
۔اور میں جاہل ہوں غلطی اور بے ادبی کی معافی چاہتا ہوں۔اور سوالات بھی زیادہ اس کی بھی معافی چاہتا
ہوں۔ المستفتی، عبدالجبار خاں معرفت رسالہ سنی لکھنؤ

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

(۱) بے نمازی کی تنبیہ کے لیے ایسی سزا کے دینے میں کوئی حرج نہیں جو شرع کے خلاف نہ ہو، لیکن جنازہ میں شامل ہونا تو میت کا حق ہے۔جس کو کسی رشتہ دار کی سزا کی بنا پر ترک نہیں کرنا چاہے۔اور سزا میں مالی جرمانہ کرنا تو شرعا جائز ہی نہیں۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے: الحاصل ان المذھب عدم التعزیر باخذ المال"

اور جب مالی جرمانہ ناجائز ثابت ہوا تو شرعا یہ مال خبیث قرار پایا۔اور مال خبیث کو مسجد میں نہیں لگا سکتے۔لہذا ایسی خلاف شرع رائے طے کرنا اور لوگوں کا اسکو اقرار کرلینا یہ سب غلط فیصلہ ہوا۔اور جس شخص نے جرمانہ دینے سے انکار کیا اگر وہ جرمانہ ہی کا منکر ہے جب تو اس کا انکار کرنا صحیح ہے۔اور اگر وہ نماز سے بھی انکار کرتا ہے تو وہ قابل سزا ہے۔ واللہ تعالی اعلم

(۲) شخص مذکور کے باپ نے جو چندہ تعمیر میں دیا تھا اور وہ تعمیر ہی میں صرف بھی ہو چکا تو اسکے بیٹے کو اب اس رقم کے طلب کرنے کا شرعا کوئی حق حاصل نہیں۔نہ لوگوں کو اسے اس رقم واپس کرنا چاہے تھا۔اور مزید اس کا ایک روپیہ کے مقابلے میں ڈیڑھ روپیہ کا مطالبہ ایسا غلط ہے جس کی اسلام اجازت ہی نہیں دیتا۔ واللہ تعالی اعلم

(۳) سوال اول کے جواب میں مذکور ہوا کہ جرمانہ کا مال خبیث مال ہے اور اس کا مسجد میں لگانا جائز نہیں۔ واللہ تعالی اعلم

(۴) فقہائے متاخرین نے امامت کی تنخواہ کو جائز قرار دیا ہے تو تنخواہ دار امام کے پیچھے نماز بلا شبہ جائز ہے۔ ہدایہ و درمختار وغیرہ واللہ تعالی اعلم۔

(۵) خطبہ کا اردو کی نظم یا نثر میں پڑھنا خلاف سنت متوارثہ ہے اور مکروہ تنزیہی ہے۔اس کا مفصل و مدلل جواب فتاوی اجملیہ میں ہے واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۴۶۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

گذارش یہ ہے کہ قصبہ کوچندہ میں آج زمانہ ۳۵ سال کا ہوتا ہے کہ اس وقت یہاں مسلمانوں کی حالت اچھی تھی اور سب گیا، پٹنہ، بنارس وغیرہ وغیرہ کے رہنے والے تھے، اور راجہ بامڑہ ان لوگوں کو بہت عزت اور قدر کرتا تھا۔ یہ لوگ عہدہ دار بھی تھے۔ یہاں ایک مسجد بنوائی اور اس وقت مسلمانوں کا خرچ ہوا اور راجہ بامڑہ نے بھی کافی روپیہ اور انجام دیکر مسجد بنوائی۔ بعد جب مسجد بن گئی تو چند جگہ سے چند عالموں اور علاموں کو بلوا کر میلا د ہوئی۔ بعد اس کے جتنا روپیہ راجہ بامڑہ کا خرچ ہوا تھا سب کے سامنے وقف کر دیا۔ وقف کرنے کے بعد بھی راجہ بامڑہ چند دفعہ اور بھی مسجد کی مرمت تعمیری بھی کیا۔ لہٰذا اس وقت اب وہ مسلمان بھی نہیں۔ اگر ہیں بھی تو ان کے خاندان والے۔ تو ان کی حالت اچھی نہیں۔ وہ عہدہ اور ہستی نہیں علاوہ ازیں اب راجہ بامڑہ کا وہ خودسر زمانہ نہیں۔ اسٹیٹ اس وقت ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ مسجد کی حالت اس وقت بالکل خراب ہے۔ تمام سے شق ہوگئی ہے ممکن ہے اگر اس سال مرمت تعمیر یہ لوگوں نے نہیں کیا تو شہید ہو جانے میں کوئی اندیشہ نہیں۔ خدانخواستہ اگر ایسی حالت ہوئی تو آئندہ ازسر نو بنانا غیر ممکن ہے۔ یہاں کے غیر مسلم مارواڑی اڑیسہ جو ان کی آبادی بہت ہے یہ لوگوں کا سوال یہ ہوتا ہے اگر آپ لوگوں سے نہیں ہوتا ہے ہم لوگوں کو دید یجئے ورنہ چندہ ہم لوگوں سے کافی روپیہ لیکر مسجد کی مرمت کرایئے ہم لوگ خوشی سے دینگے، دینے کو تیار ہیں، ہم چند ایسے غیر مسلموں سے سنا ہے رامپور شفق صاحب کے یہاں لکھا ہوا حوالہ فتوے کا آپ کے یہاں کا جواب دیا۔ امید کہ آپ جواب سے بندہ کو آگاہ فرمائینگے۔ فقط

راقم الحروف عبدالرزاق عراقی مقام وڈاکخانہ کوشمسی اسٹیٹ بامرۃ ضلع سجھیر اڑیسہ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

غیر مسلموں سے مرمت مسجد میں بھی چندہ نہیں لینا چاہئے۔ ہاں ایک یہ صورت ہوسکتی ہے کہ وہ لوگ کسی مسلمان کو اس چندہ کی رقم کا مالک بنادیں اور پھر وہ مسلمان اس رقم کو تعمیر مسجد میں خرچ کر دے اس میں کسی قسم کا حرج وخطرہ نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم ۱۱ جمادی الاخریٰ ۷۶/ ۱۳ھ

کتبہ : الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۴۶۶)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

کہ میں ایک مسجد کا متولی ہوں اور مسجد کا کچھ روپیہ میرے نام سے بینک میں جمع ہے جس کا سود نہیں لیا جاتا ہے۔ مقامی حکومت مجھے مجبور کر رہی کہ یا تو مسجد کا یہ روپیہ خرچ کر دیا جائے ورنہ اس روپیہ سے سرکاری قرضہ کی دستاویزات خرید لی جائیں۔ سر دست مسجد کا کوئی ایسا کام بھی نہیں ہے جس میں یہ روپیہ خرچ کر دیا جائے نہ ہی حکومت مسجد کے لئے کوئی زمین یا مکان وغیرہ خریدنے کی اجازت دیتی ہے۔ جس سے مسجد کی آمدنی میں اضافہ ہو سکے لہٰذا اس بارے میں مجھے مفصل جواب سے سرفراز فرمائیں کہ

(۱) از روئے شرع شریف مسجد کا روپیہ دیگر امور خیر میں خرچ کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

(۲) اگر خرچ کیا جا سکتا ہے تو اس کا صحیح مصرف کیا ہو سکتا ہے۔

(۳) بینک میں مسجد کا جو روپیہ جمع ہے اس کا سالانہ سود لینا جائز ہے یا نہیں اگر سود لیا جائے تو اس روپئے کو کن امور میں خرچ کیا جائے۔

نوٹ مسجد کا محل وقوع ایسا ہے کہ جہاں مسلم آبادی بہت کم بلکہ الشاذ کالمعدوم کے مصداق ہے جسکی وجہ سے اس مسجد میں کوئی دینی درسگاہ بھی قائم نہیں کیجا سکتی۔

خاکپائے علماء حاجی غلام مصطفےٰ مسلم سوسائٹی احمد آباد

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

صورت مسئولہ میں فی الواقع اس وقت جب وہ مسجد روپئے سے بے نیاز ہے سر دست اس میں کوئی ایسا کام نہیں جس میں یہ روپیہ خرچ کر دیا جائے نیز اس کا ماحول بھی ایسا نہیں ہے جس کی بنا پر کوئی دینی درسگا بھی جاری کی جا سکے اور حکومت اس روپیہ سے مسجد کے لیئے کوئی زمین یا مکان وغیرہ خریدنے کی بھی اجازت نہیں دیتی اور بصورت خرچ نہ ہونے کے اس روپیہ کو حکومت لینا چاہتی ہے تو اس مال موقوفہ کے تحفظ کے لیے صرف ایک صورت ہے اس رقم کو کسی حاجتمند مسجد یا مدرسہ کو بطور قرض دیدیا جائے اور حکومت کو اس روپیہ کا خرچ باور کرا دیا جائے پھر جب اس مسجد کو کوئی حاجت ہو یا حکومت کی نہ دینے سے بچنے کی کوئی صورت پیدا ہو تو اس قرض کو وصول کر لیا جائے اور مصالح مسجد میں صرف کیا جائے لہٰذا اس صورت میں وہ روپیہ اس دوسری مسجد یا مدرسہ میں درحقیقت اس کا مصرف صحیح سمجھ کر خرچ نہیں کیا

گیا ہے بلکہ اسکے ضائع ہوجانے سے تحفظ مقصود ہے جسکی ایک نظیر فتاوے عالمگیری میں ہے:

مال موقوف علی المسجد الجامع و اجتمعت من غلاتها ثم نابت الاسلام نائبة مثل حادثة الروم و احتیج الی النفقة فی تلك الحادثة اما المال الموقوف علی المسجد الجامع ان تکن للمسجد حاجة للحال فللقاضی ان یصرف فی ذلك لکن علی القرض اقول فی هذه الصورة المتولی قائم مقام القاضی فی تصرف المال الموقوف بل صرح فی الاشباه فی قاعدة الولایة الخاصة اقوی من الولایة العامة بعدان ذکر فروعا و علی هذا لا یملك القاضی التصرف فی الوقت مع وجود ناظر ای متول الخ فان لم یثبت للمتولی هذه التصرف و لم ینقل مال هذه المسجد بطریق القرض الی مسجد اخر او مدرسة المحتاجین الی النقل الیهما فیاخذ الحکومة و ضاع وقف هذه المسجد و ایضا خرب المسجد الاخر او المدرسة فغرض الواقف بما قلنا و یعود الوقف الی محله۔

اور سود تو حرام و ناجائز ہی ہے پھر مسجد کے روپیہ پر سود لینا کس طرح جائز ہوسکتا ہے۔ البتہ اس وقت اس منافع کی رقم کو بینک ہی میں نہ چھوڑ دینا چاہیے۔ بلکہ اس کو وہاں سے وصول کر کے فقراء کو بغیر نیت ثواب دیدیا جائے کہ ایسے مال حرام کا مصرف صرف فقراء ہی ہیں۔'' اور ایسا مال خبیث مسجد میں تو کسی طرح صرف نہیں کیا جاسکتا'' ''فیکره تلویث بیت الله بالمال الخبیث'' واللہ اعلم بالصواب۔

۱۴ رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۶۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) مسجد کی آمدنی سے جو دو کانیں وغیرہ وقف مسجد کی ہیں اس سے فاتحہ وغیرہ دلا کر شیرینی لوگوں کو تقسیم کرنا کیسا ہے؟۔

(۲) جو شخص مسجد کو ملکیت ثابت کرے اس میں نماز ہوجائیگی یا نہیں؟۔

الجواب

نحمده و نصلی و نسلم علی رسوله الکریم

(۱) جس دوکان کی آمدنی مسجد کے لئے وقف ہے تو اس آمدنی سے فاتحہ وغیرہ کے لئے شیرنی نہیں خریدی جاسکتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) اگر فی الواقع جو مسجد کسی کی خاص ملک ہو اور اس میں دوسروں کو نماز پڑھنے کی اجازت نہ ہو پھر بھی اگر کسی نے اس میں نماز پڑھ لی تو ہو جائیگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۶۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

مسجد کا فرش عیدگاہ لیجانا جائز ہے یا نہیں؟۔ بینوا توجروا مع حوالہ کتب تسلی بخش مرحمت فرمائیں

المستفتی، زید الدین فرید پور ضلع بریلی

الجواب

جو فرش مسجد کی ضرورت سے زائد ہو اس کو بوقت ضرورت عیدگاہ لے جاسکتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۶۹)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

کہ مسجد کی آمد کے لئے مسجد کے صحن میں جو قبرستان تھا وہ تمام قبروں کا صفایا کروا کر دکانیں بنالیں۔ اور زید سود کے چٹیاں چلاتا ہے جو ہر ہفتہ میں ایک وقت سوال پکارتا ہے جو ہزار اور پانچسو نہیں سوال میں جو آدمی سود بڑا کر لیتا ہے اس کے نام سے وہ چٹی چھوڑتا ہے پھر وہ سود کے روپئے کو بھی سوال چھوڑتا ہے۔ غرض یہ روپئے سے مسجد کے لئے دوکانیں طیار ہوتی ہیں زید اس طرح روپیہ جمع کر کے مسجد کے لئے کام میں لانا جائز ہے یا ناجائز؟۔ عند اللہ ماجور وعند الناس مشکور فرمائیں۔

غوث ۳/۹ پیر مرچنٹ دکھنی پیٹ مدن پھلی (ضلع چترا اندھرا)

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد میں کسی مال خبیث سود وغیرہ کا کوئی پیسہ ہرگز صرف نہیں کیا جا سکتا۔نہ مسجد کے لئے ایسے خبیث مال سے دوکانیں تیار کرنے کی اجازت ہے۔اور شرعاً قبرستان کی ایسی بے حرمتی کرنا اور اس کی قبروں کو صاف کرنا بھی ممنوع ہے۔بالجملہ دین پاک مسجد کے لئے ایسی ناپاک آمدنی کی اجازت نہیں دیتا۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۳شوال المکرم ۱۳۷۶ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۷۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

اس بستی میں دو مسجد ہے۔ایک مسجد بالکل شہید ہموار زمین اور ایک مسجد جو ٹوٹی پھوٹی مرمت کے لائق تھی جس میں پنجوقتہ جماعت ہوتی تھی۔بستی کے لوگوں نے چندہ کیا اور مشورہ ہوا کہ ٹوٹی پھوٹی مسجد کو اچھے حالت میں بنایا جائے اور اسی مسجد کا چندہ صحیح ہے۔مگر ایک وہابی عالم نے فتویٰ دیا کہ جو مسجد بالکل شہید ہے ہموار زمین ہے اس کو بنایا جائے۔چند لوگوں نے بالکل شہید مسجد کو بنایا۔بعد میں ٹوٹی پھوٹی مسجد جس میں جماعت ہوتی ہے بالکل شہید ہوگیا۔اب لوگ جماعت کی نماز نئی مسجد میں پڑھتے ہیں۔ایک عالم صاحب نے فرمایا کہ اس مسجد کا روپیہ اس مسجد میں لگانا یہ مسجد کا قرض ہے۔اس لیے اس مسجد میں نماز نہیں پڑھنا چاہیے ورنہ نماز باطل ہوجاتی ہے۔ایسی حالت میں ہم لوگ کیا کریں؟۔

ایم،اے جلیل معرفت رسالہ سنی لکھنوء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

یہ تو صحیح ہے کہ ایسی مسجد کا چندہ جو خود مرمت کی محتاج تھی دوسری ایسی مسجد میں جو بالکل منہدم ہو چکی ہے ہرگز نہیں لگانا چاہئے تھا۔لیکن جب ایسی غلطی ہو چکی اور اس چندہ سے وہ منہدم شدہ مسجد تعمیر ہو چکی تو اس میں نماز اور جماعت کا پڑھنا بلاشک جائز ودرست ہے۔اس میں نماز کو باطل قرار دینا خود باطل حکم ہے۔البتہ پھر چندہ کر کے اس مسجد کا قرض ادا کر دیا جائے اور وہ مسجد بھی تعمیر کر دی جائے۔واللہ تعالی

اعلم بالصواب۔ ۴ شوال المکرم ۶ ۱۳۷ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۷۱)

مکرمی جناب قبلہ مولوی مفتی محمد اجمل شاہ صاحب سنبھل شریف...... السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) گذارش یہ ہے کہ یہاں منڈی ٹنکپور ضلع نینی تال میں ہم دو فریق ہیں اول ہم بفضل خدا حنفی اہل سنت اور دوئم دیوبندی خیال یہاں مسجد ایک ہے اور اس ہی میں دونوں فرقہ کا ایک ہی امام ہے اہل سنت کے پیچھے نماز پڑھتے چلے آرہے تھے اور پیش امام وغیر کا انتظام بھی فریق اول ہی کیا کرتے تھے مگر کچھ ماہ سے ہم لوگوں کی سچائی اور سیدھائی سے فریق دوئم اپنا ہم خیال پیش امام مقرر کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ بعد میں جب یہ معلوم ہوگیا۔ جیسا کہ ہمارے علماء کرام کا حکم ہے ہم فریق اول نے ان کے پیچھے نماز پڑھنا چھوڑ دیا اور زیادہ جھگڑا بڑھنے کی وجہ سے چند ماہ مسجد بھی چھوٹی رہی مگر کہاں تک صبر کیا جاتا پھر ہم فریق اول نے متفق ہوکر اپنا امام بلاکر یہ ارادہ کیا کہ ہم اپنی نماز الگ پڑھنگے۔ اس پر فریق اول دیوبندی صاحبان نے بڑا اثر پیدا کیا اور نماز الگ پڑھنے کی ہماری جائز بات کا جھگڑا اقرار ادے کر نماز روکنے کی کوشش کی مگر درمیان میں یہاں بفضل خدا مسجد اور حجرات وغیرہ من جملہ آٹھ دوکان کے چار دوکان ہم فریق اول ایک کو دینا قرار پایا اور جس پر بفضل خدا وہ قابض ہیں علاوہ زمیں جو پشت مسجد پر واقع ہے۔ وہ چار دوکانات کے فریق دوم دیوبندی صاحبان کو دی گئی جس کا اقرارنامہ باہمی مرتب ہوگیا اب اس ہی آراضی میں فریق دوم نے ایک مسجد جو کہ ضد کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے بنالی اور اس ضد سے مسلمانوں کو ضرر پہنچا جیسا کہ سورہ توبہ میں مسجد ضرار کا واقعہ گذرا لہذا اب وہ اپنی نماز الگ پڑھتے ہیں اور اس نوتعمیری مسجد میں نماز جو قرأت پڑھی جاتی ہے اس کا آواز قدیم مسجد میں بالکل صاف آتا ہے اور فاصلہ بھی اندازہ دس پندرہ گز کا ہے کیا ایسی حالت میں اس مسجد میں نماز جائز ہے۔

(۲) اب بموقع عید الفطر دیوبندی صاحبان میں ہم میں سے بعض حضرات اہل سنت کو بہ اصرار اپنے مکان پر لیجا کر سوئیاں وغیرہ کھلائیں اور پھر ان ہی حضرات فریق اول نے بھی دیوبندی صاحبان کو بلا بلا کر خاطر مدارات سے کھلایا پلایا جب کہ پیچھے مسجد اور مسجد خدا کے واسطے سے دیوبندی صاحبان سے

سلام دعا میل ملاپ بھی ترک کیا ہوا ہے۔ لہٰذا ان دونوں مسئلوں میں روشنی ڈال کر خدا اور رسول کے حکم سے ہم کو آگاہ فرمایا جائے تاکہ راہ راست نصیب ہو اور آئندہ غلط راہ سے بچیں اس مسئلہ میں اگر ہم پر کوئی کفارہ وغیرہ بھی واجب ہوتا ہو تو وہ بھی صاف صاف حکم خدا اور رسول سے جلد از جلد آگاہ فرما کر ثواب دارین حاصل فرمائیں۔

المستفتی، عبدالروف بقلم خود، جمیل بقلم خود، شفاعت خاں
۳ شوال المعظم ۶ ۱۳۷ھ ٹنکپور منڈی ضلع نینی تال

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) نماز تو ان میں سے ہر ایک مسجد میں جائز ہے رہا قرأت دوسری کے لئے مانع قرار نہیں پاتی ۔ہاں یہ بات پہلے ہی ضرور قابل لحاظ تھی کہ جدید مسجد کو مسجد قدیم کے اسقدر قریب تعمیر نہیں کرنا چاہئے تھا اب جب کہ وہ تعمیر ہو چکی ہے تو ان میں سے کسی کو غیر آباد اور ویران نہیں کیا جا سکتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) دیوبندیوں، غیر مقلدوں، قادیانیوں، رافضیوں وغیرہ گمراہوں سے میل جول، سلام کلام، ان کے ساتھ نشست و برخاست ان کے ساتھ کھانے پینے۔ نماز پڑھنے نکاح کرنے کی ممانعت احادیث میں وارد ہے:۔

وفی صحیح مسلم ایاکم وایاھم لا یضلونکم ولا یفتنونکم (وفی ابی داود) وان مرضو فلا تعودوھم وان ماتو فلا تشھدوھم (وزاد ابن ماجہ) وان لقیتمو ھم فلا تسلموا علیھم (وعند العقیلی) لا تجالسوھم ولا تشاربوھم ولا تواکلوھم ولا تناکحوھم (زاد ابن حبان) لا تصلوا علیھم ولا تصلوا معھم۔

ان احادیث کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ گمراہوں سے الگ رہو۔ انہیں اپنے سے دور رکھو کہ وہ کہیں تمہیں بہکا نہ دیں اور تمہیں فتنہ میں ڈال نہ دیں۔ وہ اگر بیمار پڑیں تو پوچھنے نہ جاؤ۔ اور اگر مر جائیں تو جنازہ پر حاضر نہ ہو۔ جب تم ان سے ملو تو سلام نہ کرو۔ ان کے پاس نہ بیٹھو۔ ان کے ساتھ پانی نہ پیؤ۔ ان کے ساتھ کھانا نہ کھاؤ۔ ان کے ساتھ نکاح نہ کرو۔ ان کے جنازے کی نماز نہ پڑھو۔ ان کے ساتھ نماز نہ پڑھو۔

لہذا ان گمراہوں کے ساتھ تعلقات کے بارے میں حضور نبی کریم ﷺ کے یہ احکام ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۹ شوال المکرّم ۶۳ ؁ ۱۳ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۷۲)

بخدمت جناب مولوی مفتی والحاج اجمل خان صاحب مدظلہ العالی

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں مدلل جواب عنایت فرمائیں

(۱) ہماری مسجد کا صحن کافی وسیع ہے نمازیوں کی تعداد کافی کم ہے صحن کا فرش شروع ہی سے سمنٹ کا بنا ہوا ہے موسم گرما میں بہت گرم رہتا ہے دری وغیرہ کا کافی انتظام ہے اور پانی بھی چھڑکا جا سکتا ہے جس سے قدرے سکون نصیب ہو جاتا ہے چند احباب کا یہ کہنا ہے کہ مسجد کی چھت پر نماز پڑھی جایا کرے اگران سے یہ کہا جاتا ہے کہ مسجد کی چھت پر نماز مکروہ ہے تو وہ چند مقامی مسجدوں کی جن کی چھت پر نماز پڑھی جاتی ہے مثالیں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کی چھت کے سامنے کی دیوار قد آدم بنالی جائے اور محراب بنادی جائے نماز مکروہ نہیں ہوگی۔ فرمایئے کہ کیا حکم ہے اس بات میں۔

(۲) ایک مسلم کا ایک غیر مسلم عورت سے برسوں سے ناجائز تعلق ہے اس نے نکاح نہیں پڑھا ہے اور اس کے بطن سے بچے پیدا ہوتے ہیں اچانک کسی حادثہ کے باعث ناگہانی دونوں کی موت ہو جاتی ہیں فرمایئے ان کی تجہیز وتکفین کس طرح سے ہو کیا اصول اسلامی کے مطابق ہو ان کی جنازے کی نماز پڑھائی جاوے یا نہیں اگر کسی عالم کے فرمانے کے بموجب اس کی نماز جنازہ پڑھائی جاوے تو کیا نماز پڑھانے والے پر کفارہ واجب ہو جاتا ہے۔

(۳) کیا نابالغ کے پیچھے تراویح پڑھنا جائز ہے برائے کرم مذکورہ مسائل پر مکمل روشنی ڈالیں اور جواب عنایت فرمائیں۔

(۴) کیا فرماتے ہیں علماء دین ان مسائل میں کہ اگر کسی شخص نے دو سگی بہنوں سے نکاح کر رکھا ہے جو قطعا حرام ہے اگر ان دونوں کے بطن سے اولاد ہو اور بالفرض سن بلوغیت کے پہنچنے سے پہلے

ان کا انتقال ہو جائے تو ان کی تجہیز و تکفین کیسے کی جاوے۔ یہ بھی فرمائیں کہ ایسے بچے جن کا ذکر ابھی کیا ہے سن بلوغیت پر پہنچ جائیں تو ان کی شادی کے کیا حکم ہے؟۔ اور مرنے پر تجہیز و تکفین کیا اسلامی اصول کے مطابق کی جا سکتی ہے؟۔ اور کیا ان کے جنازے کی نماز پڑھ سکتے ہیں؟۔ جواب عنایت فرمائیں سن بلوغ ہونا بالغ دونوں حالتوں میں اگر جدا احکام ہوں تو مرحمت فرمائیں۔ ۱۹ ذی الحجہ/ ۶ / ۱۳ ھ

احقر العباد عبدالحمید پیش امام مسجد واقع محلہ دھوبی تلائی۔ بیکانیر راجستھان

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) بلا ضرورت کے مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا مکروہ ہے کہ اس مین ترک تعظیم ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے " وتکرہ الصلوۃ علی سطح الکعبۃ لما فیہ من ترک التعظیم"

ردالمحتار میں ہے " ولزمہ کراھۃ الصلوۃ ایضاً فوقہ (ای المسجد) "

بلکہ بلا حاجت مسجد کی چھت پر چڑھنا بھی مکروہ ہے۔

ردالمحتار میں ہے" نقل عن المفید کراھۃ الصعود علی سطح المسجد'

'تو ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ بلا ضرورت مسجد کی چھت پر نماز کا پڑھنا مکروہ ہے بلکہ صرف چڑھنا بھی مکروہ ہے کہ اس میں ترک تعظیم مسجد ہوتی ہے۔ اور صورت مسئولہ میں مسجد کی چھت پر بلا ضرورت ہی نماز پڑھنا اور چڑھنا ہے تو یہ مکروہ ہوا۔ اور اس میں ترک تعظیم مسجد کا گناہ بھی ہوگا۔ اور اوپر دیوار بنا لینے اور اس میں محراب قائم کر دینے سے اس کی کراہت نہیں اُٹھ سکتی۔ اور ترک تعظیم مسجد جائز نہیں ہو سکتی پھر اگر دوسری مساجد میں خلاف شرع کوئی فعل جاری ہو جائے تو وہ دلیل جواز نہیں بن سکتا بلکہ ان اہل مساجد کو بھی بلا ضرورت ایسا فعل مکروہ نہیں کرنا چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) صورت مسئولہ میں جب وہ کہ زنا سے ہے تو اس بچہ کا نسب شرعاً اس حکم سے تو ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس کا باپ ہے قرار نہیں پاتا۔

فتاوے عالمگیری میں ہے" ان قال انہ فی من الزنا فلا یثبت نسبہ ولا یرث منہ '

تو وہ بچہ احکام تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ میں اس حکم زانی کا تابع تو نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا یہ بچہ اپنی ماں کے تابع ہوگا اور ماں غیر مسلمہ ہے تو اس بچہ کی نہ تو شرعی طور پر تجہیز و تکفین کی جائے گی نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے۔ پھر اگر کسی عالم نے اسی صورت مسئولہ میں اس بچہ کی نماز جنازہ کا غلط حکم دیدیا اور اس

غلط حکم کی بنا پر کسی امام نے اس کی نماز جنازہ پڑھادی تو اس امام پر شرعاً کوئی کفارہ تو لازم نہیں آتا لیکن پھر بھی اس کو توبہ واستغفار کر لینی چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) نابالغ کے پیچھے تراویح پڑھنا صحیح نہیں کبیری میں ہے:

ولا یصح اقتداء البالغ بغیر البالغ فی الفرض وغیرہ وھو الصحیح۔

(کبیری صفحہ ۴۸۱)

درمختار میں ہے: ولا یصح اقتداء رجل بامرأۃ وخنثیٰ وصبی مطلقا ولو فی جنازۃ ونفل علی الاصح۔ (از ردالمحتار صفحہ ۲۰۵)

ردالمحتار میں ہے: انہ لا یجوز فی الصلوت کلھا۔

طحطاوی میں ہے: قال بعض مشائخ بلخ یصح اقتداء البالغ بالصبی فی التراویح والسنن المطلقۃ والنفل والمختار عدم الصحۃ بلا خلاف بین اصحابنا۔

(طحطاوی صفحہ ۱۶۷)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

وعلی قول ائمۃ بلخ یصح الاقتداء بالصبیان فی التراویح والسنن المطلقۃ کذا فی فتاویٰ قاضی خاں والمختار انہ لا یجوز فی الصلوت کلھا کذافی الھدایۃ وھو الاصح ھکذا فی المحیط وھو قول العامۃ وھو ظاھر الروایۃ ھکذا فی البحر الرائق

(عالمگیری قیومی جلد ۱ صفحہ ۲۲)

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ بالغوں کو نابالغ کے پیچھے تراویح پڑھنا صحیح نہیں یہی عام فقہاء کا قول صحیح اور مختار اور اصح ہے اور یہی ظاہر الروایت ہے اور یہی اکثر مشائخ کا مسلک ومذہب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۴) بلاشبہ دو سگی بہنوں کا ایک وقت میں جمع کرنا حرام ہے قرآن کریم میں ہے:

وان تجمعوا بین الاختین۔ (سورہ النساء)

پھر جب ان سے اولاد ہوجائے تو وہ اگر سن بلوغ کو پہونچ جائے تو ان کے خود مسلمان ہونے کی بنا پر نکاح شادی بھی کی جائے گی۔ اور اگر شرعی طور تجہیز وتکفین بھی ہوگی اور نماز جنازہ بھی پڑھی جائیگی۔ اور اگر وہ اولاد سن بلوغ کو نہیں پہونچی ہے تو بھی وہ اپنی اپنی مسلمان ماں کی تبعیت میں شرعی طور پر تجہیز

وتلفین کے مستحق اوران کی نماز جنازہ بھی پڑھی جائیگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۱۹ محرم الحرام ۱۳۷۷ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۷۳)

کیا فرماتے ہیں علماء کرام مفتیان عظام مسائل مندرجہ ذیل کے جواب میں

(۱) کہ شہر ناگور میں ایک مسجد محلہ نکاس میں مسجد حمالوں کے نام سے مشہور ہے کئی برسوں پہلے مسجد مذکور بہت نیچے چلی جانے کی وجہ سے بھرتی بھروا کر اوپر دوسری منزل کی شکل میں لے لی گئی تھی اور پہلی منزل میں بھرتی بھروادی گئی تھی اس پہلی منزل مسجد میں جس جگہ جماعت کی پہلی صف نماز پڑھا کرتی تھی ایک شخص نے دیوار میں دروازہ بنا کر ایک دوکان سی بنالی تھی اور اب وہاں ایک شخص دیگر چائے کا ہوٹل کرتا ہے۔

اسی پہلی منزل کی مسجد میں جہاں پہلی صف جماعت کی نماز پڑھتی تھی دوکان کا ہونا جائز ہے یا نہیں برائے کرم پوری طور پر جواب مرحمت فرمائیں۔

(۲) ایسے شخص کے لئے کیا حکم ہے جو کہ خلاف مرضی مسلمانان اہل محلہ زبردستی اس مسجد مذکور کے پہلی منزل میں جہاں پہلے صف نماز پڑھتی تھی دوکانداری کرتا ہو اور خالی نہیں کرتا ہو۔

(۳) ایک شخص جو مسئلہ سے واقف ہوتے ہوئے اس دوکاندار مذکور بالا کو غلط راستہ بتا کر مذکور مسجد خالی نہیں کرنے دیتا ہو ایسے شخص کے لئے شرعاً کیا حکم ہے۔ برائے کرم تینوں مسائل کے جواب مفصل طور پر مرحمت فرمائیں۔

المستفتی ، مسجد محلہ نکاس ناگوار محمد صدیق۔ صدر انجمن محمد حسین معتمد انجمن تبلیغ العلی محمد یوسف

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جس محدود زمین کا مسجد ہونا متعین ہو چکا تو وہ تحت الثریٰ سے آسمان تک مسجد قرار پا چکی۔ شرعاً اس کے کسی جز پر دکان بنالینا ناجائز و حرام ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: اذا اراد الانسان ان یتخذ تحت المسجد حوانیت غلۃ لحرمۃ المسجد او فوقہ ولیس لہ ذلک کذا فی الذخیرۃ۔

(عالمگیری قیومی جلد۲ صفحہ ۳۴۷)

درمختار میں ہے: لو تمت المسجدية ثم اراد البناء منع۔

(ردالمحتار جلد۳ صفحہ ۳۸۲)

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ مسجد کے کسی جز پر نیچے اور اوپر اس کی مسجدیت کے تمام ہوجانے کے بعد ضرورت مسجد کے لئے بھی دوکانیں یا کوئی تعمیر کا بنانا ممنوع وناجائز ہے شرعاً متولی کو یا اہل محلہ کو یا کسی مسلمان کو اس کے کسی حصہ کی مسجدیت کے باطل کردینے اور اس میں تصرف کرکے دوکان بنانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ لہٰذا شخص مذکور اگر اپنے اس خلاف شرع تصرف اور زبردستی دوکانداری سے باز نہ آوے۔ اور اس حصۂ مسجد کو اپنے تصرف سے خالی نہ کرے۔ تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ قانونی۔ اخلاقی ہر طرح کے دباؤ ڈال کر اس کے ناجائز تصرف سے اس حصۂ مسجد کو خالی کرائیں۔ اور اس کے جدید دیوار کو منہدم کرکے اور دروازہ کو بند کرکے جیسی پہلی مسجد کی شکل تھی اسی طرح قابل جماعت ونماز بنا دیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

۳ صفر المظفر ۱۳۷۷ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۷۴)

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں

کہ ایک مسجد کی کچھ رقم چندہ کی بسلسلہ تعمیر مسجد جمع ہے لوگوں کا ارادہ ہے کہ اس رقم سے سینگ کا کھاد۔ یا انگریزی کھاد۔ یا آلو کی بیج خرید کر اہل ضرورت حضرات مسلم یا غیر مسلم کو کچھ نفع سے ادھار دیدیا جائے۔ جب آلو کی فصل آئے تب وہ روپیہ ان لوگوں سے وصول کرلیا جائے۔ اس صورت سے مسجد کا روپیہ بڑھ جائیگا اور تعمیر مسجد میں سہولت ہوگی۔ چونکہ اہل محلہ غریب لوگ ہیں۔ اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ روپیہ مذکور کو جو مسجد کی ملکیت ہوچکا ہے اس طرح سے تجارت میں لگانا اور پھر اس پر جو منافع حاصل ہوں مسجد میں لگانا شرعاً درست ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

صورت مسئولہ میں اگر چندہ دہندگان یہی لوگ ہیں جو اس محدود رقم کو تجارت میں لگا کر

بڑھانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور یہ چندہ تعمیر مسجد ہی کی غرض سے جمع کیا گیا ہے۔ اور اہل محلہ اپنی غربت کی بنا پر اس عمارت مسجد کی تکمیل نہیں کر سکتے ہوں۔ اور تجارت سے رقم کثیر ہو کر مسجد کی تعمیر مکمل ہو جانے کی امید ہو۔ تو ظاہر ہے کہ یہ مقصد محض منفعت مسجد اور تکمیل عمارت مسجد ہی کے لئے ہے تو بنا بر قاعدہ فقہ کے "الامور بمقاصدھا" اس سلسلہ تجارت میں اگر منافع کا ظن غالب ہے اور فساد و تضیع رقم کا خطرہ نہ ہو اور بہتر یہ ہے کہ کوئی نیک شخص اس رقم کا ضامن بنکر اس سے اشیاء مذکورہ یا اور کوئی چیز خرید کر منافع کے ساتھ بیع کرے۔ اور اپنے اعتماد پر ادھار بھی بیچ دے تو شرعاً ایسا کرنا درست ہے۔ اور جائز طور پر جو اسکے منافع حاصل ہوں ان کے مسجد میں صرف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور اگر ان ارادہ کرنے والے لوگوں کا چندہ ہی نہیں ہے تو چندہ دہندگان سے اس رقم سے تجارت کرنے کے لئے اجازت کا حاصل کر لینا ضروری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۷۵)

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

کہ حالیہ میونسپل انتخابات میں ہمارے حلقہ سے جملہ امیدواران غیر مسلم تھے۔ ان میں سے ایک نے کچھ رقم اس شرط پر پیش کی کہ جملہ مسلم ووٹران میری حمایت کریں چنانچہ اس پر عمل کیا گیا۔ اب رائے یہ قرار پائی کہ اس رقم کو مسجد کی مرمت میں صرف کر دیا جائے اور متعلقہ مسجد دکان تعمیر کر دی جائے جس کے کرایہ کی آمدنی مسجد میں صرف ہوتی رہے زید کہتا ہے کہ اس قسم کی رقوم مسجد میں لگنا یا دوکان بنا کر اس کا کرایہ مسجد میں لگنا جائز نہیں ہے بکر کہتا ہے کہ مسجد میں لگانا تو واقعۃً جائز نہیں مگر دوکان بنا کر اس کا کرایہ لگا سکتے ہیں اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کس کی رائے صائب ہے اور کون حق پر ہے۔ بینوا توجروا فقط

السائل: قدرت اللہ ٹیلر ماسٹر بازار بزازہ چندوسی ضلع مراد آباد یوپی ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۷ء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بہتر یہ ہے کہ ایسی رقم سے مسجد کو محفوظ رکھا جائے اگر چہ ووٹروں نے جب اپنی طرف سے اس رقم کو دیا ہے تو یہ تعمیر دوکان متعلقہ مسجد میں شرعاً صرف کی جاسکتی ہے اور اسکا کرایہ بھی مسجد میں صرف کیا

جاسکتا ہے لیکن حرمت مسجد کی ملحوظ رکھتے ہوئے احتیاط اسی میں ہے کہ مسجد کو ایسی رقم سے بچایا جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۲۵ ربیع الآخر ۱۳۷۷ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۷۶)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

ایک مسجد کی افتادہ زمین ہے اس میں مدرسہ بنانا چاہتے ہیں تو اس زمین میں مدرسہ تعمیر ہوسکتا ہے مدرسہ کے لئے وہ زمین خریدی جاسکتی ہے یا کرایہ پر لی جائے تو تعمیر کا حق ہوگا یا عمارت تیارشدہ مسجد ہی کا وقف ہوگی۔ اور یہ کرسکتے ہیں کہ زمین مسجد ہی کی رہے اور عمارت مدرسہ پر وقف رہے، بہرحال شرعا جو صورت درست و جائز ہو تحریر فرمائی جائے۔

المستفتی، مبین الدین عفی عنہ دار العلوم شاہ عالم احمد آباد گجرات

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جب وہ مسجد کی افتادہ زمین ہے تو وہ مسجد ہی کی موقوفہ زمین ہوئی پھر جب مسجد کی موقوفہ ہے تو اس کو خرید نہیں سکتے اب باقی رہا بغیر خرید کیئے ہوئے اور بلا کرایہ کے اس پر مدرسہ کے لئے تعمیر کرلینا تو اس میں کچھ حرج نہیں کہ وہ تعمیر تو مسجد ہی کی قرار دی جائیگی۔ فتاوی عالمگیری میں ہے:

"متولی وقف بنی فی عرصة الوقف فهو للوقف" لیکن اس میں دینی درس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تو مسجد کی افتادہ زمین میں دینی درس دیا جارہا ہے۔ دینی درس تو خود مسجد میں جائز ہے۔

درمختار میں ہے "لا لدرس او ذکر فی المسجد۔

ردالمحتار میں ہے "اس پر یہ تصریح کی گئی" لانه مابنی لذلك وان جاز فیه"

یہانتک کہ مسجد کے چراغ سے درس دینے میں کوئی حرج نہیں:

قاضی خاں میں ہے "قالو لا باس بان یدرس به الی ثلث اللیل "تو جب خود مسجد میں درس دینا جائز ہے تو افتادہ زمین مسجد میں درس کیونکر ناجائز ہوسکتا ہے فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۲۵ ذیقعدہ ۷۷ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۷۷)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں
موضع سانچور میں ایک مسجد کے اندر بجانب مشرق کنواں ہے اور غسل خانہ بھی انکا راستہ مسجد کے اندر سے گذرتا ہے بایں صورت جنبی وغیرہ کو غسل کرنے اور پانی بھرنے کے لئے ازراہ مسجد گذرنا جائز ہے یانہیں جب کہ دوسرا راستہ نہ ہے نہ بنوانے کی جگہ ہے اور اس شکل کا حل درکار ہے بینوا وتوجروا
المستفتی، ظہور الدین احمد ناگوری

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم
اگر جنبی کو کنویں اور غسل خانے تک جانے کے لئے صرف ایک ہی راستہ ہو جو مسجد کے اندر سے ہو اور اسکے سوا کوئی دوسرا راستہ بنوانے کی جگہ بھی نہ ہو تو ایسی مجبوری اور ضرورت کے وقت مسجد کے اندر سے تیمم کر کے صرف گذر جانا جائز و درست ہے۔
ردالمحتار میں ایسی ضرورت کی چند نظیریں موجود ہیں: " مسافر مر بمسجد فيه عين ماء وهو جنب ولايجد غير ه فانه يتيمم لدخول المسجد عندنا (وفيه عن در ر ومجمع البحار) لا نحوز العبور فی المسجد بلا تیمم (وفيه ايضا) فالظاهر وجوبه على من كان بابه الى المسجد اراد المرور فيه " واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۵ جمادی الاولیٰ ۷۸/۷۷ھ۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۷۸)

هل يجوز ادخال الصبيان فی المسجد واجلا سهم على فرش المسجد مع انهم لا يستنجو ن بالاحتياط؟

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الكريم

قال رسول الله تعالى عليه وسلم: جنبوا مساجد كم صبيانكم ومجانينكم الحديث ۔فيحرم ادخال الصبيان والمجانين حيث غلب تنجيسهم والا فيكره ولانه يذهب منه حرمة المسجد ومها بتة صرح به فى الدر المختار وقال ابن الهمام يكره التعليم ان لم يكن ضرورة كان نفس التعليم ومرا جعه الا طفال لا يخلو عما يكره فى المسجد والله تعالىٰ اعلم بالصواب ۔

كتبه: المعتصم بذيل سيد كل نبی ومرسل، الفقير الى الله عز وجل، العبد محمد اجمل غفرله الاول، ناظم المدرسة اجمل العلوم فی بلدة سنبھل

مسئلہ (۴۷۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

درمیان زید وبکر وعمر وغیرہ کے بابت چندہ محرم و چندۂ مسجد کے نزاع پیدا ہوگیا ہے جس کو تقریبا تو عرصہ ۳ ماہ کا ہوا۔صرف اس بات پر زید یہ کہتا تھا کہ روپیہ چندہ مسجد کا تحصیل کرنا چاہئے کیونکہ چندہ محرم وصول کرنے عمر وبکر وغیرہ گئے تھے چندہ پہلے محرم کا وصول کیا جائے گا بعد کی چندہ مسجد کا کیا جائے گا۔ چونکہ عمر بکر وغیرہ ذی اثر ہستیاں ہیں اور اکثریت بھی اسی جانب ہے۔اس حصہ سے عمر بکر وغیرہ نے اہل قریہ پر زور ڈالا اور مجھے کہا اس بات پر ضرور زید کا حقہ کا پانی بند کر دیں اور زید کے کئی معاملہ دینی دنیاوی گاؤں کا کوئی شخص شریک حال نہ ہو مثلا موت شادی وغیرہ یہاں تک کہ زید کے یہاں ایک میت ہوگئی تو اس کے تجہیز وتکفین میں گاؤں کا کوئی شخص شریک نہ ہوا اور دیگر موضع سے آدمی بلوا کہ اس میت کو دفن کیا۔ یہاں تک کہ زید کے ساتھ عمر بکر وغیرہ نے یہاں تک مستحق اختیار کی جائے کہ گاؤں میں یہ حکم دیا ہے کہ زید کا جو کوئی شریک حال ہوگا اس کا بھی یہی تدارک حشر کیا جائیگا:

اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ صورت مذکور میں جبکہ محرم اس اہمیت کو پہونچ گیا ہے کہ مسجد کے چندے کو پس پشت ڈالکر محرم کے چندے کو اس قدر جدو جہد کے ساتھ وصول کیا جارہا ہے تو مسجد کے مقابلہ میں محرم کو ترجیح دینا شرعا جائز ہے یا ممنوع اور محرم بنانے میں جو روپیہ صرف کیا جاتا ہے شرعا اس روپیہ کا صرف کرنے والا مستحق ثواب ہے یا عذاب؟۔

(۲) عمر بکر وغیرہ کا زید کے ساتھ اسقدر شدت کا برتاؤ شرعا کس حد تک ہوگا اور عمر بکر وغیرہ شرعا کس تعزیر کے مستحق ہونگے:

(۳) یہ بیان فرمائیں عمر بکر وغیرہ کا فتوی محرم کے متعلق حاصل کر کے دکھلایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اس کو نہیں مانیں گے ان کے فتوے کو نہ ماننے پر شرعا علمائے کرام کیا حکم فرمائیں گے؟۔

بینوا توجروا۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

(۱) اللہ عزوجل اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے نزدیک مساجد محبوب ترین جگہ ہے۔ ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے:

قال رسول الله تعالی صلی الله علیه وسلم: اذا مررتم بریاض الجنة فارتعوا۔ قیل یا رسول الله ﷺ وما ریاض الجنة قال المساجد۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم جنت کے باغوں پر گزرو تو میوہ چنا کرو۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ جنت کے باغوں سے کیا مراد ہے فرمایا: مسجدیں:

مسلم شریف میں انہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے:

قال رسول الله صلی الله تعالی علیه وسلم احبّ البلاد الی الله مساجدها۔

رسول اقدس صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا: محبوب ترین جگہوں میں اللہ کے نزدیک مساجد ہیں۔

بیہقی وطبرانی میں حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے:

قال رسول الله ﷺ ان عمار المسجد هم اهل الله:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسجد کے تعمیر کرنے والے اہل اللہ ہیں:

ابو الفرع نے کتاب العلل میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کی:

قال رسول الله تعالی صلی الله تعالی علیه وسلم: من بنی لله مسجدا بنی الله له بیتا فی الجنة۔ ومن علق فیه قندیلا صلی علیه سبعون الف ملك حتی یطفی ذالك القندیل۔ ومن بسط فیه حصیرا صلی علیه سبعون الف ملك حتی ینقطع ذالك الحصیر۔ ومن

اخرج منه قذاة كان له كفلان من الاجر ۔

رسول مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اللہ کے لئے مسجد بنائی اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بنائیگا جس نے مسجد میں قندیل لگائی تو اس پر ستر ھزار فرشتے اس قندیل کے گل ہونے تک رحمت بھیجتے ہیں۔ اور جس نے مسجد پر چٹائی بچھائی اس پر ستر ہزار فرشتے رحمت کی دعا کرتے ہیں اور جس نے مسجد سے خس وخاشاک نکالا تو وہ اس کے لئے اجر وثاب کا باعث ہوں گے:

ان احادیث سے مساجد کی عظمت وعزت اور اس کی امداد کرنے والے اس میں چندہ دینے والے اور ان کی خدمت کرنے والے کا اجر وثواب معلوم ہو گیا اور محرم یعنی تعزیہ کی عزت وعظمت کا احادیث میں کہیں ذکر نہیں اور اس میں خرچ کرنے والوں کا اجر وثواب بھی کہیں شریعت میں موجود نہیں تو پھر مقابلہ کیا۔ ہر ادنی شخص ہر ناداں آدمی بھی ذرا غور وفکر سے کام لینے کی کوشش کرے تو اسے بھی مسجد کے چندہ کو محرم کے چندے پر یقیناً ترجیح دینی پڑیگی مسجد کے عبادت گاہ ہونے کا ایسا تعلق ہے جو مسلمانوں کے قلب سے کبھی مسجد کی عزت کم نہیں ہونے دیتا لہذا ایسا کون مسلمان ہے جو مسجد کے چندہ کو باوجود ضرورت مسجد کے محرم کے چندہ پر ترجیح نہ دیگا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس اختلاف میں نفسانیت رنگ دکھا رہی ہے۔ مولیٰ تعالیٰ مسلمانوں میں محبت والفت پیدا کرے اور انہیں نفسانیت سے بچائے. واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) مسلمان سے ایسا ترک تعلق شرعاً منع ہے۔

بخاری شریف میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

قال رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم: لا يحل لرجل ان يهجر اخاه فوق ثلاثة ايام: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کسی شخص کے لئے اپنے بھائی مسلمان سے تین دن سے زیادہ ترک تعلق نہیں:

ابوداود شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

ان رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم قال: لا يحل لمسلم ان يهجر اخاه فوق ثلاث فمن هجر فوق ثلاث فمات دخل النار ۔

بیشک رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کسی مسلمان کے لئے اپنے بھائی مسلمان سے تین روز سے زیادہ علیحدگی حلال نہیں اور جس نے تین دن سے زیادہ جدائی کی پھر مر گیا تو وہ دوزخ

میں داخل ہوگا:

ان احادیث سے ثابت ہوگیا کہ مسلمان اپنے مسلمان بھائی سے ترک تعلق نہ کرے اور ایسا ترک تعلق جو نہ فقط زندہ کے ساتھ بلکہ مردہ کے ساتھ بھی کیا جائے اشد گناہ ہے اور اس کی انتہائی حق تلفی ہے واقعہ یہ ہے کہ یہ نہایت بدترین حرکت ان سے صادر ہوئی: واللہ تعالی اعلم بالصواب

(۳) علمائے اہل سنت کے شرعی فتوے سے انکار کرنا گناہ عظیم ہے کہ فتوے کے انکار سے ایک حکم شریعت کا انکار لازم آتا ہے اور یہ بات مسلمان کی شان سے بہت بعید ہے مولی تعالی اہل اسلام میں اخوت ومحبت پیدا کرے اور ان میں مذہب کا سچا جذبہ پیدا کرے اور انہیں احکام شرعی پر عمل کرنے کی توفیق دے اور ان کے درمیان کے نفاق وعداوت کو دور کرے: واللہ تعالی اعلم بالصواب:

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۸۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

جامع مسجد بھرت پور جملہ مسلمانان وملازمان کے چندہ سے تعمیر ہوئی اور صدر دروازہ شرقی کی بلندی پر کتبہ کندہ ہوکر لگ چکا ہے اس جامع مسجد کے جنوبی وشمالی دونوں دروازہ اسوقت تک بلاتعمیر تھے میمن وزیر بخش مرحوم منہاران کی بیوہ نیا پنی برادری چوڑی فروشان بھرتپور کو ۱۴ تولہ طلاتی زیورات دیکر عرض کیا کہ تم اس کو فروخت کرو اور شمالی دروازہ جامع مسجد جو بازار کی طرف ہے اس رقم سے تعمیر کرایا جائے اور میرے خاوند کی یادگار کا اس دروازہ پر ایک کتبہ نام کندہ کراکر لگایا جائے۔ چونکہ جامع مسجد کی تنظیم کے واسطے ایک کمیٹی مقرر ہے ہم پنچوں نے بیوہ سے عرض کیا کہ ہم یہ رقم داخل خزانہ جامع کرتے ہیں اور اسوقت درخواست دیتے ہیں چنانچہ ہماری قوم کے پنچ جامع مسجد کمیٹی کی خدمت میں پہونچے۔ اور عرض کیا کہ مبلغ نوسو روپیہ دو آنہ ہم بطور امانت اس غرض سے جمع کئے ہیں کہ ہمکو وقت ضرورت تعمیر درازہ کیلئے ملے اور دروازہ بنانیکی اجازت عطا فرمائی جائے اور ہم اس کو اپنی ہی منشاء کے موافق بنوائینگے اور جو کمی پڑیگی تو ہم اپنی اہل برادری سے رقم چندہ فراہم کر کے لائیں گے اور دروازہ مذکور کو مکمل کرائیں گے مگر مرحوم کے نام کا اور ہماری برادری کا کتبہ دروازہ پر لگائیں گے۔

چنانچہ اس سوال پر ایک ممبر صاحب نے جواب دیا کہ حسب منشاء میں سب چیز شامل ہے اس کو

تحریر میں لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم لوگ خاموش ہو گئے اور تکمیل دروازہ کیلئے انتظامات شروع کئے گئے اور تخمینہ کیا گیا تو رقم مذکور بالا بہت ناکافی تھی تب ہم نے اہل برادری سے چندہ فراہم کرکے تعمیر شروع کردی۔ چونا سمنٹ خشت ٹالس چینی وغیرہ کی اور کتبہ کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی جب دروازہ قریب مکمل پر آیا اور کتبہ بن کر آیا اور لگانے کا وقت آیا تو اہل شہر کے وہ افراد جو ہم سے عداوت رکھتے تھے اور ہما رے پیشہ کو اور ہم کو ذلیل سمجھتے تھے انہوں نے موقع کو غنیمت سمجھ کر اس قسم کی شورش پیدا کردی کہ کتبہ دروازہ پر لگانے سے پوری مسجد پر انکا قبضہ ہو جائیگا اس وجہ سے ان بعض افراد نے تمام شہر کو ورغلایا کہ ہم کتبہ تمہاری برادری کے نام سے ہرگز نہ لگانے دینگے ہم لوگوں نے عرض کیا کہ کتبہ اگر شریعت سے ناجائز ہو گا تو ہم ہرگز نہ لگائیں گے اور اگر جائز ہوا تو لگائیں گے۔ بعض حاسدین نے اس پر یہ جواب دیا کہ اگر فتوی جواز کی صورت میں بھی آگیا ہم فتوی کو ہی ہرگز ہرگز نہ مانیں گے چاہے کچھ ہو جائے اب قابل طلب بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ۔

(۱)۔ کتبہ لگایا جانا قبول کے نام سے جائز ہے یا نہیں صرف وقت شدہ شئی پر۔

(۲) فتوی کے نہ ماننے والوں پر کیا حکم ہے شریعت سے۔

(۳) ہم چوڑی والان نے وعدہ کیا بیوہ وزیر مرحوم سے کتبہ لگانے کا ہم کیا کریں۔

(۴)۔ اور ہم سے وعدہ کیا کمیٹی جامع مسجد نے کہ ضرور کتبہ لگانا کمیٹی کا کیا ارشاد ہے ایسی وقف شدہ چیز پر رقم نہو یا فروخت کرنا جائز یا ناجائز ہے۔

(۵) اور مخالفین کا یہ بھی کہنا ہے جو رقم تم نے دروازہ پر صرف کی ہے لے لو ایسی وقف شدہ چیز پر رقم کہنا یا فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں۔

(۶) کتبہ کا مضمون یہ ہے۔ باب الوزیر مرحوم دروازہ جماعت چوڑی سوداگران بھرتپور اور سنہ تاریخ و حکم طبیعت اللہ اکبر کنندہ یہ سب سنگ مرمر پر خوش قلم عمدہ ڈزاین سے تیار ہے۔

(۷) اس معاملے کے کتبہ لگانے میں کون کون ذمہ دار ہیں لگایا جائے یا نہیں براہ کرم جلد از جلد جواب مرحمت فرمایا جائے فقط والسلام۔

المستفتی احقر ریاض الحسن عرف بندا اشرفی چوڑی سوداگر بھرتپور۔ ۴۳، ۳۔ ۱۵۔

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

بلا شک مسجد میں روپیہ صرف کرنا باعث اجر وثواب ہے لیکن جب فخر ونا موری کیلئے نہ ہو اور جو کام فخر ونا موری کیلئے ہے وہ رب العزت کی بارگاہ میں قبول نہیں۔ حدیث شریف میں ہے:

یقول اللہ لھم یوم یجازی العباد باعمالھم اذھبو االی الذین کنتم ترائون فی الدنیا فانظرواھل تجدون عندھم جزاء خیرا رواہ البیقی فی شعب الایمان۔

(مشکوۃ شریف ص ۴۵۶)

یعنی اللہ تعالی جس روز بندوں کو ان کے اعمال کی جزاء دے گا تو جو لوگ دکھاوے کے لئے اعمال کرتے تھے ان کے لئے فرمائیگا انہیں ان کی طرف لیجاؤ جنہیں یہ دنیا میں دکھانے کیلئے اعمال کرتے تھے تو دیکھیں کہ کیا ان سے جزاء خیر پاتے ہیں۔

تو مسلمان کا ہر نیک کام رضائی الہی کیلئے ہونا چاہیئے۔ اس میں خواہش نفسانی اور وسوسہ شیطان کا دخل نہ ہونا چاہئے۔ لہذا اگر یہ کتبہ محض فخر وشہرت اور ریا ونا موری کی بنا پر ہے تو زوجہ وزیر بخش اور ان کی برادری کو اس پر ہر گز ہر گز اصرار نہ کرنا چاہئے اور درگاہ رب العزت میں رجوع کر کے یہ دعا کرنا چاہئے کہ مولی تعالی اس خدمت کو قبول فرمائے اور اسکا اجر وثواب مرحوم کی روح اور جن جن لوگوں نے شرکت کی ہے ان کو اپنے فضل وکرم سے عطا کرے اور ہمیں فخر ونا موری کے شیطانی خیالات سے بچائے۔

اور اگر اس کتبہ کا نصب کرنا فخر ونا موری کی غرض سے نہیں ہے تو اسکا لگانا نہ فقط جائز بلکہ سلف سے منقول ہے بلکہ اس کی اصل حدیث شریف سے ثابت ہے ابوداؤد ونسائی شریف میں ہے کہ حضرت اور بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے سرکار رسالت میں آکر عرض کیا:

یا رسول اللہ ان ام سعد ما نت فای صدقۃ افضل قال الماء فحفرا بیراوقال ھذا لام سعد۔

(از مشکوۃ ص ۱۶۹)

حضور ام سعد کا انتقال ہو گیا تو کونسا صدقہ افضل ہے؟۔ حضور نے فرمایا: پانی، تو حضرت سعد نے اپنی ماں کے نام کا کنوں کھودوایا اور کہا کہ یہ کنواں ام سعد کے لئے ہے۔

تو اس حدیث اس کنوئیں کی نسبت ام سعد کی طرف کی گئی۔ اسی طرح بکثرت مقامات پر نسبتوں کا وجود ہے۔ خود مساجد کو لیجئے کہ انہیں ایسی نسبتیں ہوتی ہیں۔ مدینہ منورہ میں ایک مسجد علی ہے۔ ایک مسجد ابو بکر ہے۔ ایک مسجد ابی ابن کعب ہے۔ ایک مسجد سلمان فارسی ہے۔ اور مسجد بنی جعفر میں یہ کتبہ لگا ہوا موجود ہے جس کو حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی۔ نے جذب القلوب میں نقل کیا۔

درہمیں محراب سنگے است بروے نوشتہ خلد اللہ ملک الامام ابی جعفر المنصور المستنصر باللہ امیر المومنین عمر سنۃ ثلثین وستمائۃ''

تو اگر ایسی نسبتیں اور کتبہ لگانا ناجائز ہوتا تو علمائے کرام وفقہائے عظام خود مدینہ شریف میں اس کو کب روا رکھتے اور اس پر عدم جواز کا فتوی صادر فرماتے۔ خود مسجد نبوی میں جب بادشاہ روم سلطان مراد نے ممبر شریف ۹۹۸ھ میں پتھر کا تیار کرایا اور علمائے روم نے اس کی یہ تاریخ نکالی۔

منبر عمر سلطان مراد۔

اس قسم کی بکثرت مثالیں جذب القلوب میں ہیں۔ تو یہ بات نہایت صاف طرح پر ثابت ہوگئی کہ مساجد وغیرہ اوقاف پر بانی کا نام کندہ کرنا ایسا جائز ہے کہ اس پر کبھی کسی نے اعتراض ہی نہیں کیا تو یہ کہنا کہ کتبہ لگانے سے وقف پر قبضہ ثابت ہو جائے گا سخت جہالت اور نادانی کی بات ہے اور مسلمانوں میں بلاوجہ کی شورش پیدا کرنا اور مسلمانوں کو ذلیل وحقیر کہہ کر ان کے دل دکھانا اذیت اور تکالیف پہونچانا شرعا حرام ہے اور اپنی نفسانیت وضد میں اس حد تک پہنچ جانا کہ اپنے خلاف حکم شرعی کے فتوی کے انکار کر دینے کا اظہار کرنا انتہائی اور دین سے بے تعلقی کی دلیل ہے مولی تعالی مسلمانوں کی حالت پر رحم فرمائے اور انہیں اختلاف ونفاق سے محفوظ رکھے اور حسد وخودنمائی سے بچائے اور حق کے قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان میں حقیقی اتفاق واتحاد پیدا کرے واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۸۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

سی۔ پی کے علاقہ میں کچھ لوگ ایسے مسلمان ہیں کہ جاروبکشی کرتے ہیں جیسے کہ یو پی میں بھنگی سڑکوں پر جھاڑو لگاتے ہیں۔ اگر وہ سی پی کے جاروب کش مسلمان یو پی میں آئیں اور کسی مسجد میں نماز پڑھنے جائیں تو کیا ان کو مسجدوں میں داخل ہونے سے منع کیا جائیگا؟۔ اس کے متعلق جو مسئلہ ہو مطلع کیا جائے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بلاشبہ جاروب کش بوجہ اسلام کے متقین میں داخل ہے اور حدیث شریف میں ہے۔

المساجد بیوت المتقین۔ یعنی مساجد متقیوں کے گھر ہیں۔ رواہ الطبرانی۔

تو مسجد جاروب کش مسلمان کا بھی گھر ہوا۔ تو اس کو مسجد میں داخل ہونے سے کون روک سکتا ہے۔ ہاں جب مسلمان ناپاک ہو یا اس کے بدن اور کپڑے پر کسی طرح کی نجاست ہو یا اس سے کوئی بو آتی ہو تو اس کو دخول مسجد سے منع کیا جائے گا اس میں جاروب کش اور غیر جاروب کش سب برابر ہیں۔ محض جاروب کشی کا پیشہ دخول مسجد کے لئے مانع نہیں۔ جن مقامات پر مسلمان اس پیشہ کو کرتے ہیں وہ پاک وصاف ہو کر اچھے کپڑے بدل کر مسجد میں باجماعت نماز پڑھتے ہیں پھر جب وہ مسلمان ہیں تو انہیں جماعت اور مسجد کے اجر و ثواب سے کس طرح محروم کیا جا سکتا ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۸۲)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

جب مسجد کا ٹین یا کڑی یا اینٹ وغیرہ اس مسجد کی عمارت سے جدا کر دئے گئے ہوں اور پھر ان کے تعمیر میں لگانے کی ضرورت باقی نہ رہے تو انہیں متولی فروخت کر سکتا ہے یا نہیں۔ اور خریدار انہیں اپنے مکان یا دوکان میں لگا سکتا ہے یا نہیں؟۔ بینوا توجروا۔

المستفتی عبد المجید برف والا ساکن محلّہ سرائے سنبھل۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

مسجد کا ٹین، اینٹ، وغیرہ جب اس مسجد میں پھر نہ لگ سکے یا اس کے پڑے رہنے میں ضائع ہونے یا خراب ہو جانے کا خوف ہو تو انہیں فروخت کر سکتے ہیں اور اس کی قیمت مسجد کی عمارت میں صرف کی جائے گی۔ صاحب درمختار، درالمنتقی شرح منتقی میں فرماتے ہیں:

و نقص الو قف ای المنقو ض من خشب و حجر و اجر و غیر ها یصرف الی عما رته ان احتا ج الیها با لفعل و الا حفظ الی وقت الحا جة الیها و ا ن تعذر صر ف عینه با ن لا یصلح لذ لك یبا ع ای با عه القا ضی و المتو لی و یصرف ثمنه الیها اقا مة للبد ل مقا م

المبدل ۔

پھر جب شرعا ان کی بیع جائز قرار پائی تو خریداران کو جہاں چاہے لگا سکتا ہے۔ ہاں انکا یہ احترام چاہئے کہ انہیں ناپاک مقام پر نہ لگائیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۴ ر جمادی الاول ۱۳۷۳ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۸۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا از روئے شریعت جائز ہے یا ناجائز؟۔ اگر چھت کی دیوار پر از سرنو محراب بنوادی جائے تو اس صورت میں بھی نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ از روئے شریعت جواب جلد مرحمت فرمایا جائے۔ عین بندہ نوازی ہوگی فقط والسلام

سائل عثمان غنی عرف لاڈو میوہ فروش سبزی منڈی پالی مارواڑ جودھپور
مورخہ دو رمضان المبارک یوم جمعہ ۱۳۷۰ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد کی چھت بھی مسجد ہی ہے جو احکام مسجد کے ہیں وہ مسجد کی چھت کے بھی ہیں۔ کبیری میں ہے: "کما لا یکرہ فی المسجد لا یکرہ فو قہ ایضا"

تو ناجائز کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ خود خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھنا ترک تعظیم ہے مگر باوجود اس کے جماعت سے نماز پڑھا بکراہت تنزیہی جائز ہے۔

درمختار میں ہے: یصح فرض ونفل فیہا وفوقہا ولو بلا سترۃ وان کرہ الثانی للنھی وترك التعظیم منفرد او بجماعۃ'

تو ان مساجد کی چھت پر جماعت ناجائز کس طرح ہو سکتی ہے۔ بیت اللہ کے لئے تو صراحۃ نہی وارد ہے اس لئے جواز مع کراہت تھا اور باقی مساجد کے لئے بلا کراہت جواز ثابت ہوگا۔

لھذا جس کی مسجد میں نیچے صحن نہ ہو، یا ہو لیکن کم ہو اور گرمی اور گرمی کے موسم میں نیچے سخت گرمی معلوم ہوتی ہو اور چھت پر ایسی چہار دیواری ہو جس سے کسی مکان کی بے پردگی نہ ہوتی ہو تو اس

ضرورت کی بنا پر اوقات گرمی میں جماعت سے نماز پڑھی جاسکتی ہے یہ خلاصہ تحقیق ہے۔ واللہ تعالی اعلم با الصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۸۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین سوالات ذیل کے متعلق

(۱)۔ آیت کریمہ۔ ومن اظلم ممن منع مساجد الله ان یذکر فیها اسمه وسعی فی خرابها اولئك ما كان لهم ان یدخلوها الا خائفین لهم فی الدنیا خزی ولهم فی الآخرة عذاب، عظیم۔ میں ذکر سے کون کون سے ذکر مراد ہیں؟۔

(۲)۔ زید جو ایک مسجد کا متولی حکومت کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے وہ مسجد میں اپنے آمرانہ طور پر عمل کیساتھ اہل جماعت کو مسجد کے اندر اکثر بیشتر (یہاں تک کہ رمضان المبارک میں روزے کی حالت میں) فحش فحش گالیاں بہت شور کے ساتھ بکتا ہے کہ آواز مسجد کے باہر سڑک کے لوگ بھی بآسانی سن سکتے ہیں۔ جب کہ مسجد کے اندر دنیا کی باتیں کرنا منع ہے تو پھر اہل جماعت کو بلند آواز سے گالی دینے والے خاص کر مسجد کے اندر اس کے متعلق کیا حکم ہے۔ (مسجد کے اندر اس صورت میں گالی دینے کے باعث بعض مصلیاں حنفی سنی نے فتنے کے اندیشے سے مسجد ترک کر دی ہے۔

(۳)۔ قمری ماہ کی سترہ تاریخ کو حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وابستگی اور عقیدت کے اظہار کے لئے کوئی شخص خود یا اہل جماعت چندہ کر کے میلاد مبارک مسجد میں کرنا چاہیں تو ممانعت کرنے والے کے متعلق کیا حکم ہے؟۔

(۴)۔ اسی طرح اگر مصیبت زدہ انسان مشکل کشائی کے لئے آیت کریمہ کا وظیفہ کرنا چاہے یا اہل جماعت اعدا کی شرانگیزیوں سے بچنے کی غرض سے باجازت عالم دین متین بعد نماز عشا یا بعد نماز مغرب مسجد میں بیٹھ کر آیت کریمہ کا وظیفہ یا کوئی دوسرا ورد کرنا چاہیں تو ایسا کرنے کی ممانعت کرنے والے کے متعلق کیا حکم ہے؟۔

(۵)۔ یہاں اہل سنت والجماعت کی مسجد میں عام طور پر یہ قاعدہ ہے کہ ہر ماہ گیارہویں شریف اور بارہویں شریف کی فاتحہ ہوتی ہے مگر مسجد کے متولی زید کا کہنا ہے کہ بغیر میری اجازت کے مسجد میں کچھ

نہیں کر سکتے۔درست ہے یا نہیں؟۔

لہذا صورت مسئولہ یہ ہے کہ ایسا شخص جو مسجد میں وظیفہ کریمہ گیارہویں شریف یا بارہویں شریف میلاد مبارک ختم قرآن یا درود، وظائف کی مجلس مقرر کرنے سے روکے شرعاً کسی مسجد کا متولی ہو سکتا ہے؟ اور کیا حکومت کو ایسے شخص کو متولی مقرر کرنے کا حق ہے؟ کیا مسجد کے متولی کو شریعت حقہ نے ایسے اختیار دئے ہیں کہ بغیر اس کی مرضی اور اجازت کے مسجد میں سوائے نماز پنجگانہ ذکر وفکر اور درود اور وظائف، ختم ومیلاد مبارک کی کوئی مجلس منعقد کی جا سکتی، اور کیا آیت مذکورہ بالا کا ایسے شخص پر اطلاق نہ ہوگا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱)۔آیت کریمہ مذکورہ میں ذکر سے مراد ذکر اللہ ہے، جو خود آیہ کریمہ ہی کے کلمات سے ظاہر ہے۔فرمایا جاتا ہے کہ "ان یذکر فیھا اسمہ" یعنی مساجد میں نام خدا ذکر کرنے سے روکے۔اور ذکر اللہ جس طرح تسبیح وتحمید اور تہلیل وتکبیر ہیں اسی طرح تمام عبادات ودعا اور تلاوت قرآن کریم اور علم دین بھی ذکر اللہ ہی میں داخل ہیں۔

تفسیر احمدی میں ہے: واذکر ربك فی نفسك عامة فی الاذکار من قراة القران والدعا والتسبیح والتہلیل وغیرہ ذلك۔ (تفسیر احمدی۔ص ۲۴۷)

اور تفسیر مدارک التنزیل میں ہے:

بنیت المساجد للعبادة والذکر ومن الذکر درس العلم۔

(تفسیر مدارک ج ۲۔ص ۹۱)

اور اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ذکر پاک اور صحابہ وصالحین رضی اللہ عنہم کا ذکر بھی ذکر اللہ میں داخل ہے۔چنانچہ حدیث قدسی شرح شفا شریف سے مع شرح کے نقل کے جاتی ہے۔

جعلتك ذکرك من ذکری) ای نوع ذکر من اذکاری (فمن ذکرك ذکرنی) ای فکانه ذکرنی۔ (شرح شفا۔ج ۱۔ص ۴۶۰)

یعنی میں نے اپنے ذکروں میں سے آپکو ایک ذکر کی قسم قرار دیا تو جس نے آپ کا ذکر کیا تو گویا

کہ اس نے میرا ذکر کیا۔ اسی بنا پر منجملہ اسمائے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آپ کا نام ذکر اللہ بھی ہے۔ چنانچہ زرقانی میں ہے:

قال مجاهد فی الابذکر الله تطمن القلوب انه محمد و اصحابه صلی الله تعالیٰ علیه وسلم (زرقانی شرح مواہب۔ ج ۳۔ ص ۱۳۰)

تو ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ ذکر رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و ذکر صحابہ و صالحین رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی ذکر اللہ میں داخل ہے۔ اور تفسیر مدارک کی عبارت سے ثابت ہوا کہ مساجد ذکر اللہ ہی کے لئے بنائی گیں ہیں۔ لہذا مساجد میں آیہ کریمہ کا وظیفہ پڑھنا یا حلقہ ذکر کرنا یا کوئی درود و دعا کرنا، یا محافل میلاد شریف و گیارہویں شریف کرنا یا وعظ اور مسائل شرعیہ کا بیان کرنا یا تلاوت قرآن کریم کرنا بلاشک جائز و درست ہیں۔ کہ یہ سب ذکر اللہ میں ہی داخل ہیں۔ یہاں تک کہ مسجد میں نکاح کی مجلس منعقد کرنا مستحب ہے۔

درمختار میں ہے: ویندب اعلانه (ای النکاح) وتقدیم خطبة و کونه فی مسجد۔
(ردالمحتار۔ ج ۲۔ ص ۲۶۸)

نیز قاضی کو مسجد میں مقدمات کرنے کی منجانب شرع اجازت ہے۔ درمختار میں ہے:

و یقضی فی المسجد و یختار مسجدا فی وسط البلد تیسیرا للناس و یستد برا لقبلة کخطیب و مدرس۔ (ردالمحتار۔ ج ۲۔ ص ۳۳)

لہذا جب شریعت مطہرہ نے قاضی کو مسجد میں مقدمات کرنے سے نہیں روکا، لوگوں کو مسجد میں مجلس نکاح سے منع نہیں کیا تو شریعت مطہرہ ذکر میلاد شریف، گیارہویں شریف، محفل وعظ، تعلیم مسائل شرعیہ، تلاوت قرآن کریم، حلقہ ذکر، وظیفہ آئیہ کریمہ، مجلس شہادت، وغیرہ ذکر خیر سے کس طرح منع کرسکتی ہے۔ کہ یہ سب امور ذکر اللہ ہیں اور مساجد ذکر اللہ ہی کے لئے بنائی گئی ہیں۔ تو انکا منع کرنے والا آیت کریمہ کے تحت میں دخل ہو کر گنہگار و ظالم قرار پایا۔

تفسیر مدارک میں ہے: وهو حکم عالم لجنس مساجد الله و ان مانع من ذکر الله مفرط فی الظلم۔ (تفسیر مدارک، ج ۱۔ ص ۵۵) واللہ تعالیٰ اعلم،

(۲) مسلمان کو گالی دینا اور اذیت پہنچانا ممنوع ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

سباب المسلم فسوق رواه الصحیحین عن ابن مسعود رضی الله تعالیٰ عنه۔

اور مسجد میں گالیاں بکنا مزید قباحت کو مستلزم ہے اور احترام مسجد کے خلاف ہے۔ اسی طرح مسجد میں آواز بلند کرنا اور شور مچانا ممنوع ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

جنبوا مساجد کم صبیا نکم و مجانینکم و شراء کم و بیعکم و خصوما تکم و رفع اصواتکم الحدیث۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۳) میلاد شریف سترہ تاریخ یا کسی تاریخ میں کرنا بلا شک جائز و مستحب ہے جس کے جواز کے قران وحدیث اور اجماع وقیاس سے تفصیلی دلائل میری رسالہ ''عطر الکلام فی استحسان المولد والقیام'' میں بکثرت موجود ہیں۔ لہذا میلاد شریف کا مسجد میں منعقد کرنا یقیناً جائز و مستحب ہے کہ یہ ذکر اللہ میں داخل ہے تو اس کا منع کرنے والا گویا ذکر اللہ کا منع کرنے والا ہے۔ اور بحکم آئیہ کریمہ گنہگار و ظالم ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۴) آئیہ کریمہ کا وظیفہ یا کوئی قرآن وحدیث کی دعاؤں کا ورد ذکر اللہ ہی میں داخل ہیں تو انکے جواز میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ ہاں اگر کسی نمازی یا قاری کے لئے باعث تشویش ہو تو باواز بلند نہ پڑھا جائے۔

ردالمحتار میں ہے: اجمع العلماء سلفا و خلفا علی استحباب ذکر الجماعۃ فی المساجد وغیرھا الا ان یشوش جھر ھم علی نائم و مصل او قاری الخ۔

تو اس کو منع کرنے والا اجماع علما کا مخالف اور بحکم آئیہ کریمہ ظالم ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۵) مسجد میں مسائل شرعیہ کے ذکر کرنے کو بلا وجہ شرعی کے منع کرنا بڑی سخت جرأت و دلیری ہے۔ تفسیر مدارک سے معلوم ہوا کہ مساجد علم دین کے درس کے لئے ہیں اور یہ شخص مسائل شرع کے ذکر کو منع کر کے کیسا سخت مجرم و گنہگار بنا۔ مولیٰ تعالیٰ اس کو چشم بصیرت عطا فرمائے، واللہ تعالیٰ اعلم،

(۶)۔ گیارہویں شریف و بارہویں شریف کی فاتحہ مساجد میں بلا شک درست و جائز ہیں،۔ کہ یہ ذکر اللہ میں داخل ہے تو مسلمان کے لئے سب سے ضروری شریعت کی اجازت ہے اور جب شریعت کی اجازت ہے تو متولی کی اجازت کو کون پوچھتا ہے۔ ایسا شخص اہل سنت کی مساجد کا یقیناً متولی نہیں ہوسکتا، نہ حکومت ایسے شخص کو اہل سنت کی مساجد کا متولی بنانے کا حق رکھتی ہے۔ نہ متولی کو شریعت نے ایسے اختیارات دئے ہیں۔ لہذا یہ شخص آئیہ کریمہ کے حکم میں داخل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،۔

کتبہ : الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۴۸۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

جو کہ حوض وضو کرنے کا مسجد کے صحن سے ملا ہے حوض تو دہ دردہ ہے اور مسجد کے صحن کے باہر جہاں جوتے اتارے جاتے ہیں اس سے ملا ہوا غسل خانہ ہے اور اس سے نل لگا ہوا ہے جو کبھی بند بھی ہو جاتا ہے مگر غسل کرنے والے اہل محلہ جس میں کثیر تعداد بے نمازیوں کی ہے تو لوگ گھر سے بالٹیاں لاکر مسجد کے حوض سے پانی لیکر جہاں جوتے اتارے جاتے ہیں وہاں بیٹھ کر غسل کرتے ہیں، ایک بالٹی سے بدن بھگو کر صابن لگا کر دوبارہ سہ بارہ پھر اسی بالٹی کو حوض سے بھرتے ہیں اور مسجد کا صحن بھگوتے ہوئے آتے جاتے ہیں، ان کے بدن کا پانی ناپاک پانی صحن میں گرتا ہے، جماعت والے بخیال فساد کے کوئی مزاحمت نہیں کرتے۔ اس کے لئے کیا حکم ہے علمائے دین کا؟۔ اور مسجد کے قریب تالاب کنوئیں نل وغیرہ ہیں مگر وہاں نہ جا کر مسجد ہی میں آتے ہیں اکثر اوقات حوض کا پانی بہت نیچے چلا جاتا ہے جس سے وضو کرنے والوں کو دقت اٹھانا پڑتی ہے، اور کپڑے دھو کر مسجد کے صحن میں سکھانے کو ڈالتے ہیں اور کوئی ضرورت مند گھڑی دیکھنے کے واسطے آیا تو وہی پانی پریوں پاؤں میں لگا ہوا مسجد میں چلے جاتے ہیں تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے۔

سائل شیخ جمن متولی مسجد پتھر پھوڑ۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

مسجد کی تعظیم واحترام اور تطہیر وتنظیف یعنی اس کو پاک وستھرا رکھنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔

کبیری میں ہے: تنزیه المسجد من القذر واجب ۔ (کبیری۔ص ۵۶۸)

یہاں تک کہ مسجد کی دیوار اور صحن پر حتی کہ بوریوں پر تھوکنا ممنوع ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: ولا یبزق علی خیطان المسجد ولا بین یدیه علی الحصیر ولا فوق البواری ولا تحتها و کذا المخاط ۔ (عالمگیری۔ص ۵۷)

اسی طرح صحن مسجد میں کلی کرنا یا وضو کرنا مکروہ ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: تکره المضمضة والوضوء فی المسجد ۔

علامہ شامی ردالمحتار میں اس کی دلیل ان الفاظ میں فرماتے ہیں: لان ماء ہ مستقذر طبعا

فیجب تنزیهه من المخاط و البلغم۔ (ردالمختار۔ص ۴۶۳)

یعنی وضو کا پانی ناپاک طبعا ہے تو مسجد کا اس سے بچانا واجب ہے، جیسے رینٹ اور بلغم سے مسجد کی حفاظت واجب ہے۔ (تو جب مسجد کی وضو کے پانی سے حفاظت ضروری ہے تو غسل کے پانی سے مسجد کی حفاظت کس قدر ضروری ہے۔ لہذا ایسے بے نمازی لوگوں کا غسل کے پانی سے صحن مسجد کا آلودہ و ملوث کرنا سخت ممنوع اور گناہ ہے، اوران کی یہ نازیبا حرکت بالکل حرمت مسجد کے خلاف ہے، جو مسلمان کی شان سے بہت بعید ہے۔ اسی طرح کپڑے دھو کر صحن مسجد میں سکھانا یہ بھی احترام مسجد کے خلاف ہے۔

بالجملہ مسلمان کو اپنی عبادت گاہ مسجد کا انتہائی احترام ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اور وہ اپنے کسی فعل و عمل سے اہل مسجد کو ایذا و تکلیف ہرگز ہرگز نہ پہچائیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۸۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس امر میں کہ

ایک مسجد یہاں عرصہ دراز سے قائم ہے جس کے گرد ونواح ہر جانب مسلمان مقیم ہیں اور مسجد مذکورہ کی دیکھ ریکھ بذمہ اہل محلّہ کے ہے جنکی تعداد تقریبا سو گھروں کی ہے۔ مسجد کی چبوتری سرکار کی طرف سے توڑنے پر اہل محلّہ کو معلوم ہوا کہ مسجد کا قبالہ نہیں ہے۔ تب سب اہل محلّہ نے متعین رائے سے اہل محلّہ کہ نام قبالہ بنانے کی درخواست حکومت موصوف میں کی گئی تو محلّہ سے ایک قوم جو کہ چند گھروں کے شورگروں کے نام سے معروف ہے انہوں نے عذرداری حکومت موصوف میں پیش کی کہ یہ مسجد ہماری موروثی ومملوکہ ومقبوضہ ہے اس کا قبالہ محلّہ کے نام نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ ہمارا ذاتی قبالہ ہونا چاہئے۔ ایسی صورت میں کیا اس مسجد میں نماز جائز ہے، یا نہیں، کیا قبالہ عذرداروں کے نام کا ہو جائے۔ ان کے کل گھروں کی تعداد آٹھ گھر کی ہے۔ قبالہ ان کے نام جائز ہے یا نہیں، اگر چند لمحہ کے لئے مان لیا جائے کہ عدالت موصوف نے عذرداروں کے نام قبالہ بنا دیا اور اہل محلّہ مسجد مذکورہ سے دست بردار ہو گئے تو ایسی صورت مین ذمہ اہل محلّہ کو کچھ علت تو نہیں ہے۔ فقط جواب بکتب حدیث وفقہ مرحمت فرمائیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جو قوم ایسی مسجد کو اپنی موروثی مملوکہ کہتی ہے وہ بر سر غلطی ہے کہ مسجد کسی کی موروثی مملوکہ نہیں ہوتی، بلکہ وہ موقوفہ ہوتی ہے، حکومت کسی کے نام کا بھی قبالہ دیدے لیکن اس میں نماز ہر مسلمان کو پڑھنا جائز ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی بانی مسجد نے کسی خاص اہل محلہ ہی کے لئے مسجد تعمیر کرائی تو دوسرے محلہ کے لوگوں کو بھی اس میں نماز پڑھنا جائز ہے۔

عالمگیری میں ہے: لو بنی مسجد الاهل محلة وقال جعلت هذا المسجد لا هل هذه المحلة خاصة كان لغير اهل تلك المحلة ان يصلي فيه ۔تو پھر اس مسجد کے اہل محلہ ہی کو اس میں نماز پڑھنا کیسے ناجائز ہے۔ لہذا اگر وہ قبالہ اس قوم ہی کے نام ہو جائے تو اہل محلہ نہ اس مسجد سے دست بردار ہوئے نہ ان کا اس میں نماز پڑھنے کا حق باطل ہوا نہ انہیں اس بات کی اجازت ہے کہ وہ حقوق مسجد سے بے پرواہی کریں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۸۷)

کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے کرام ومفتیان شرع عظام دامت برکاتہم النوریہ مسائل حسب ذیل میں۔

(۱) قبرستان میں اور مسجد میں اور مسجد کے اندر اور بیرون مسجد یعنی جو مسجد بمعنی موضع صلوٰۃ کے باہر حدود مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔ اگر ان جگہون میں اگر نماز جنازہ پڑھی جائے تو نماز بلا کراہت ادا ہوگی یا نہیں شرع کا حکم کیا ہے؟۔ بینوا توجروا۔

(۲) قبرستان میں اور مسجد کے اندر (مسجد بمعنی موضع صلوۃ اور بیرون مسجد یعنی وہ جگہ جو مسجد بمعنی موضع صلوۃ کے باہر اور حدود مسجد میں ہو اس جگہ اور میت کے ساتھ جاتے وقت قبرستان کے اور میت کو کاندھا دیتے وقت حقہ پینا جائز ہے۔ یا نہیں؟ بعض جگہ یہ دستور ہے کہ میت کے ساتھ جاتے وقت بلکہ میت کو کاندھا دیتے وقت قبرستان تک حقہ لیتے ہوئے جاتے ہیں ان کا یہ فعل کیسا ہے اور ان پر شرعا کیا حکم ہے نیز میت کو دفن کرنے سے پہلے یا بعد دفن موضع قبرستان سے باہر حقہ پینا جائز ہے یا نہیں۔ امام یا

موذن جو مسجد کے حجرے کے سامنے خارج مسجد میں حقہ پیئے تو کیا حکم ہے کیا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

المستفتی فقیر محمد عمران دادری رضوی مصطفوی غفرلہ ربہ محلّہ خیر خان پیلی بھیت شریف۔

(۱۴ ذی الحجۃ الحرام ۔ ۱۳۷۳ھ ۔ ۱۵ راگست ۱۹۵۲ء۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

(۱) خاص مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے۔

فتاوے عالمگیری میں ہے: وصلوۃ الجنازۃ فی المسجد الذی تقوم فیه الجماعة مکروهة ''اور حدود مسجد کے اندر فرش مسجد سے علیحدہ جو صحن ہو اور وہ داخل مسجد میں شمار نہ ہو اسمیں نماز جنازہ بلا کراہت جائز ہے۔ قبرستان میں اگر نماز جنازہ کے لئے کوئی جگہ متعین ہے تو اسمیں تو نماز جنازہ بلا شبہ جائز ہے۔ اور اگر کوئی جگہ متعین نہ ہو تو پھر اسمیں نماز جنازہ ضرورۃ پڑھی جائے بلا ضرورت نہیں پڑھنی چاہیے واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۲) مسجد میں حقہ پینا ناجائز ہے اور قبرستان میں یا میت کو اٹھاتے ہوئے حقہ کا پینا ترک ادب ہے اور قبور سے علیحدہ فاصلہ پر قبل دفن یا بعد دفن حقہ پینے میں کوئی حرج نہیں۔ امام اور موذن کو خارج مسجد میں یا اس حجرہ میں جو صحن مسجد سے جدا ہو حقہ پینے میں کوئی حرج نہیں واللہ تعالی اعلم بالصواب۔ ۱۴ ۔صفر المظفر۔

کتبہ : الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۴۸۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ

ایک شخص منشی عبد الحمید مرحوم نے موضع گدنا میں مسجد و مدرسہ کی تعمیر کی ہے مدرسہ کی احاطہ میں بھی ایک مسجد ہے ان ہر دو مساجد کے صدر دروازوں پر حسب ذیل کتبات سنگ مرمر نصب ہے۔

عبارات کتبات

(۱)

میری خدائے پاک سے ہے التجا سدا بھولے سے بھی قدم نہ رکھیں اسمیں بیوفا

اہل حدیث۔ غیر مقلد۔ محمدی — سنت جماعت کیلئے معبد ہے یہ بنا

حنفی وشافعی حنبلی مالکی — اہل فتن وہابی رہیں اس سے سب جدا

بہر نماز اہل تقی وصفا وفا — حمد ایزد حمید بنا خانہ خدا۔ ۔۱۳۱۴ھ۔

(۲)

بنایا خوب ہے مسجد ومدرسہ حمیدیہ — عبدالحمید حاجی نے مال وقف بھی کیا

حنفی وشافعی وحنبلی ومالک — سنت جماعت کیلئے مفید ہے یہ بنا

اہل حدیث غیر مقلد محمدی — اہل فتن وہابی یہ ہیں اس سے سب جدا

بہر نماز مومن ومسلم واتقیا — فضل خدا سے جب بنا ہے خانہ خدا۔ ۱۳۲۵ھ۔

ان ہر دو کتبات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بانی مسجد ومدرسہ کے نزدیک۔ اہل حدیث غیر مقلد محمدی اور وہابی اہل فتن اور بیوفا ہیں اور سنت جماعت سے خارج ہیں۔ اس لئے وہ اس مسجد ومدرسہ میں نماز وغیرہ کے لئے نہیں آسکتے ہیں اور مدرسہ کی تعمیر محض حنفی وشافعی وحنبلی ومالکی۔ اہل سنت جماعت کیلئے ہوئی ہے۔

کتبہ ثانی کے آخری شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسجد ومدرسہ کی تعمیر محض ان مومن ومسلم اور اتقیاء کیلئے ہوئی ہے جو اہل حدیث غیر مقلد محمدی اور وہابی اہل فتن نہ ہوں۔ ان تشریحات کی موجودگی میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ

(۱) بانی مسجد ومدرسہ کا مساجد میں اس قسم کا کتبہ نصب کرنا از روئے شریعت پاک جائز ہے یا نہیں۔

(۲) اہل حدیث غیر مقلد محمدی اور وہابی اہل فتن بیوفا ہیں یا نہیں۔ اور سنت جماعت سے خارج ہیں یا نہیں۔

(۳) اگر بانی مسجد ومدرسہ کا نصب کتبہ صحیح وجائز ہے اور جس فریقوں کا تذکرہ انہوں نے اس کتبہ میں کر کے انہیں سنت جماعت سے خارج بتایا ہے اس کو جو صحیح وجائز تسلیم نہ کرے اور اس پر عامل نہ ہو تو دریں صورت ایسے شخص کے متعلق کیا حکم ہوگا۔ اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ جواب مدلل معہ حوالہ کتب ہوں تو بہتر ہے۔

محمد سلیم اختر موضع سان ڈاکخانہ ابویل گنج۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم علی رسوله الکریم

(۱) شرعا واقف اپنی بنا کردہ مسجد ومدرسہ کو مذہب اہلسنت وجماعت کے ایک خاص فرقہ حنفیہ کیلئے بھی متعین کرسکتا ہے۔ پھر تو اس میں اہلسنت وجماعت ہی کے دوسرے فرقہ مالکی شافعی۔ حنبلی کو مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں رہتا اگرچہ یہ فرقہ بھی یقیناً اہلسنت وجماعت ہی میں داخل ہیں۔ چنانچہ ردالمحتار میں ہے۔ مدرسة مو قوفة علی الحنفية مثلا لا یملك احدان یجعلها لا هل مذهب آخرون۔ (ص ۴۸۰ ج ۳)

تو جو مخالف اہلسنت وجماعت ہو اور اسکے آنے سے بدمذہبی کا فتنہ پھیلنے کا خوف ہو تو واقف کا اس فتنہ بدمذہب سے حفاظت کیلئے اور گمراہی وضلالت کا سدباب کرنے کی غرض سے اس مسجد ومدرسہ کا اہلسنت وجماعت کیلئے مخصوص ومتعین کردینا نہ فقط جائز بلکہ مستحسن اور ضروری ہے "کما هو ظاهر من اکتب الفقه۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۲) علماء عرب وعجم کے فتوؤں سے وہابی۔ دیوبندی۔ غیر مقلد۔ نجدی مودودی۔ قادیانی۔ وغیر فرقہ باطلہ یقیناً۔ اہل فتن اور سخت بیوفا ہیں۔ اور بلاشک اہلسنت وجماعت سے خارج ہیں جن کا تفصیلی ذکر اور حکم حسام الحرمین۔ الصوارم الہندیہ۔ فتاوے اہل سنت وغیرہ مطبوعہ کتب سے ظاہر ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۳) بانی مسجد ومدرسہ کے نصب کئے ہوئے۔ کتبوں کی صحت جواب نمبر (۱) سے ثابت وہ چکی۔ اور ان میں جن فرقوں کو خارج از اہلسنت وجماعت ظاہر کیا ہے اسکی صحت جواب نمبر (۲) سے ثابت ہوگی پھر جو اسکو صحیح نہ جانے اور اس پر عامل نہ ہو وہ منکر احکام شریعت اور مخالف اہلسنت وجماعت ہے۔ بلکہ وہ انہیں گمراہ فرقوں میں سے ایک فرقہ میں داخل ہے تو وہ شرط واقف کے خلاف نہ اس مسجد ومدرسہ کا متولی بنایا جاسکتا ہے نہ امام مقرر کیا جاسکتا ہے۔ نہ وہ کسی طرح کی ان مین مداخلت کرسکتا ہے کہ فقہاء کرم کا مسلمہ مشہور حکم ہے۔ شرط الوقف کنص الشاع ای فی المفهوم والد لا لة ووجوب العمل به (از درمختار) واللہ تعالی اعلم بالصواب۔ ۴ / ربیع الآخر شریف۔ ۱۳۷۴ھ۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۸۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

یہاں جبل پور محلہ مکارم گنج میں ایک چھوٹی سی مسجد لب سڑک واقع ہے۔ جسکی مالی حالت کمزور ہے مسجد کے انتظامات مثلاً۔ صفائی پتائی۔ مرمت روشنی امام وموذن وغیرہ مصارف کے لئے ضرورت آمدنی کا کوئی معقول مستقل ذریعہ نہ ہونے کے باعث مسجد کے بعض مصلیان نے مسجد مذکورہ کے سائے اور برآمدہ اور صحن کے شمال دیوار سے اندر کی جانب مسجد میں جہاں نماز ہوتی ہے مسجد کی چھ فٹ اور بیس فٹ طول لابنے فرش پر ایک پختہ دیوار بنا کر دو دکانیں بنانا چاہتے ہیں۔ تا کہ مسجد کی آمدنی بڑھ جائے۔ مگر اس صورت میں مسجد کی شمالی جانب تقریبا چھ صفوں کا کافی حصہ مسجد سے کٹ جاتا ہے جس کی وجہ سے تقریبا چوبیس نمازیوں کی جگہ مسجد سے نکل جاتی ہے اور یہ مسجد کا فرش مسلم دوکانداروں کے استعمال میں آسکتا ہے۔ (جیسا کہ مندرجہ ذیل میں مسجد کے نقشے سے معلوم ہوسکتا ہے۔)

مگر اس کو بعض مصلیان مسجد۔ مسجد مذکورہ کی بے حرمتی اور نمازیوں کی تکلیف کے باعث سمجھتے ہوئے اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسجد کے فرش پر جہاں نماز ہوتی ہے دوکانیں نہیں بنائی جاسکتی ہیں۔

لہذا بعد ادب التماس یہ ہے کہ کیا مسجد کے اندرونی فرش پر جہاں نماز ہوتی ہے دوکانیں بنائی جاسکتی ہیں اور صورت مذکورہ میں مسجد کے اندر ایسی دیوار قائم کر کے صفوں کی جگہ مسجد سے خارج کرنا اور مسلم وغیر مسلم دوکانداروں کو حسب مرضی استعمال کے لئے دینا جائز ہے یا نہیں۔ جواب باجواب سے بحوالہ کتب سرفرازی بخشی جائے تا کہ اس پر عمل ہوسکے۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

بانی مسجد نے جس قدر زمین کو مسجدیت کے لئے متعین ومحدود کر دیا ہے اس کا تحت الثری سے آسمان تک مسجد ہونا ایسا متعین ہوگیا ہے کہ اب کسی متولی یا اہل محلہ یا کسی مسلمان کو اس کے حصہ کی مسجدیت کو نہ باطل کرنا جائز۔ نہ اس کا علاوہ ذکر ونماز کے کسی اور شغل کے لئے مقرر کر دینا جائز۔ نہ اسکو اجرت پر دینا جائز۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: "ان ارادوا ان یجعلوا شیئا من المسجد طریقا للمس

فقد قیل لیس لھم ذلك وانه صحیح كذا فی المحیط ۔ (فیه ایضا) المسجد وان خرب واستغنی عنه اهله لا یعود الی ملك البانی هو مسجد ابدا لا یصح والفتوی علی هذا القول ۔ ملخصا ۔ (وفیه ایضا) اذا اراد انسان ان یتخذ تحت المسجد حوانیت غلة لمرمة المسجد او فوقه لیس له ذلك كذا فی الذخیرة ۔

صورت مسئولہ میں برآمدہ اور صحن مسجد کے اس حصہ کا مسجد ہونا ظاہر ہے تو اب اس میں دیوار یا دوکان بنا کر اس حصہ کا مسجد سے خارج کر دینا کسطرح جائز ہوسکتا ہے۔ نیز اس کے دوکان بنا دینے میں اس کو نماز سے روک دینا ہے اور یہ بھی ممنوع ہے۔ لان فیها شغل ما اعد للصلاة ونحوها كما ذكره العلامة الشامی۔ نیز اس حصہ زمین مسجد کا اجرت پر دینا لازم آتا ہے۔ لزم ایجار قطعة منه ذلك لا یجوز "لھذا مسجد کے ان ہر دو مقاموں پر دوکانیں بنانا یا دیوار بنا کر اس کو مسجد سے خارج کر دینا ناجائز وممنوع ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۹۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک مسجد تین سو سال کی تقریبا پرانی ہوگئی جو اونچی کرسی کی ہے اس کے خرچ کیلئے تہ خانہ در دوکان بنی ہوئی ہے اور اس مسجد کے دروازے کے سامنے ملتا ہوا زینہ ہے اور زینہ کے ہر دو طرف مسجد ہی کی زمین میں چبوترہ اس عمارت یعنی مسجد کی حد تک ہے مسجد کے اندر ایک مزار بھی ہے جس کو دیوار کھینچ کر علیحدہ کر دیا ہے بوجہ مزار کی دیوار کھینچنے کے مسجد کے اندر سے چھوٹی اور تنگ ہوگئی ہے اکثر و بیشتر جمعہ کے روز دو چبوتروں پر نماز پڑھتے ہیں بوجہ تنگی۔ مسجد تمام پختہ بنی ہوئی ہے۔ سقف خدہ ایک طرف غسل خانہ آب دست خانہ ہے اور چبوترہ کے پاس جوتا اتارنے کیلئے کچھ جگہ ہے غرض کہ مسجد کے لوازمات میں سے جو چیزیں ہوتی ہیں وہ سب ہیں۔ مذکورہ عمارت کو پیش نظر رکھتے ہوئے عرض یہ ہے کہ مسجد کے ان چبوتروں وغسلخانہ وآب دست خانہ کی جگہ کو دنیوی رفاہ عام کے لئے یعنی سڑک وغیرہ کے لئے دے سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ واضح رہے کہ یہ چبوتریاں وغیرہ سب مسجد کی زمین میں ہیں۔ اہل محلہ کی خواہش

کہ ان چبوتریوں کو مسجد کے اندر لے لیا جائے تا کہ کشادگی ہو جائے اور بعض آدمیوں نے اپنا دنیاوی مفاد پیش نظر رکھتے ہوئے سڑک کے لئے ان کا فیصلہ کرلیا۔ شریعت کا اس کے لئے کیا حکم ہے اور مسجد کے وقف شدہ زمین کو سڑک بنانے کے لئے دینے والوں کو شرع شریف کیا حکم دیتی ہے؟۔

المستفتی　قاضی بخش اللہ راجستھان

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

جب یہ ہر دو موقعہ پر چبوترے مسجد ہی کے اس سے متصل ہیں تو صحن مسجد یا اس کے لواحق کو شرعا سڑک کیلئے دینا جائز نہیں۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ان ارادوا ان یجعلوا شیئا من المسجد طریقا للسلمین فقد قیل لیس لهم ذلك وانه صحیح كذا فی المحیط۔

اور خاص کر جب مسجد نمازیوں کیلئے تنگ ہو چکی ہو تو ان چبوتروں سے مسجد وسیع کر لینا ہے یہاں تک کہ اگر مسجد لوگوں پر تنگ ہو رہی ہو اور مسجد کے پڑوس میں کسی کی زمین پڑی ہو تو اس سے زبردستی وہ زمین بقیمت لیکر مسجد کو وسیع کرنے کا حکم ہے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

لو ضاق المسجد علی الناس وبجنبه ارض الرجل توخذ ارضه بالقیمة كرها كذا فی الفتاویٰ قاضی خاں۔

تو یہاں تو جو حاجت مسجد کے پورا ہونے کیلئے ہے اسی کے متصل اس کے موقوفہ مسجد کے ان چبوتروں کو سڑک میں دیدینا مسجد کی سخت حق تلفی ہے جس کا استحقاق کسی متولی یا اہل محلّہ کو ہرگز نہیں حاصل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۳ ذی القعدہ ۱۳۷۴ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۹۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ

ایک شخص نے ایک مکان کہ جس میں صرف ایک کوٹھہ ہے اور کچھ صحن ہے، ایک مسجد کے واسطے وقف کیا کہ اس مکان کی آمدنی اس مسجد میں خرچ ہوتی [illegible]

شکستہ ہوا۔ زید متولی نے درستی بھی اسی مسجد کے روپے سے کرائی جس مسجد کیواسطے وہ مکان وقف کیا گیا ہے، وہ کوٹھہ موجود ہے۔ اب کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اس مکان کو خود مسجد بنائیں اور اس کوٹھہ کو گرا کر مسجد پختہ تعمیر کردی جائے۔ اجازت تعمیر لی گئی ہے، مسجد تعمیر نہیں ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے صرف ایک دروازہ تعمیر کیا ہے اور ایک غسلخانہ بنایا ہے اور نل لگا ہے۔ اور اس موقوفہ مکان میں نماز پڑھنی شروع کی ہے، مراد آباد جامعہ نعیمہ وغیرہ سوال بھیجا گیا، جواب آیا کہ مسجد نہیں تعمیر ہوسکتی۔ یہ مکان دوسری مسجد کی ملکیت ہے۔ لہذا عرض یہ ہے کہ صورت مذکور میں شرعاً کیا حکم ہے مسجد تعمیر ہوسکتی ہے یا نہیں؟۔

ضروری نوٹ۔۔ اس سے قبل آپ کے پاس ایک سوال قصبہ راجا کا سہسپور سے بھیجا گیا تھا اس میں کیا سوال کیا گیا تھا یہی سوال تھا یا کچھ اور تھا، اس کا جواب بھی مرحمت فرمائیں۔ کچھ لوگ آپ کا نام لے کر شہرت لے رہے ہیں کہ مسجد بنانا جائز ہے، ہم مسجد بنائیں گے۔

مولوی صاحب نے حکم دے دیا ہے، ہر دو سوالوں کا جواب مرحمت فرمائیں۔ یہاں اختلاف بڑھ رہا ہے جلد سے جلد جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

جب مکان ایک مسجد خاص کے لئے وقف ہے اور اس کی آمدنی بھی اس مسجد میں صرف ہورہی ہے۔ اس مکان کا کسی کو نہ مسجد بنالینا جائز ہے نہ اس مسجد کو نقصان پہنچانا درست کہ کسی کو ایسی تغیرات کا شرعاً اختیار حاصل نہیں۔ جامعہ نعیمیہ کا جواب صحیح ہے کہ اس مکان کی جگہ مسجد نہ تعمیر کی جائے۔ شریعت کا یہ نہایت کھلا ہوا حکم ہے، اس کے خلاف کوئی حکم نہ دیگا۔

راجہ کے سہس پور سے جو سوال آیا تھا غالباً اسکا یہ مفہوم تھا کہ اس مکان کو مسجد تعمیر کرلیا گیا ہے تو اس کی مسجدیت کو برقرار رکھا جائے یا نہیں، تو اس کا جواب جس کے پورے الفاظ تو محفوظ نہیں لیکن اس کا خلاصہ حکم یہ تھا کہ اس مکان کو ہرگز مسجد نہ بنانا تھا لیکن جب ناواقفی سے اس مکان کی جگہ مسجد تعمیر کرکے اس کو مسجد بنالیا گیا ہے تو اب احترام مسجد کے لحاظ سے اس کی مسجدیت باقی رکھنی چاہیے۔ جواب کی اگر نقل ہوتی تو اس کو بلفظہ نقل کردیا جاتا۔ لیکن میری طرف یہ نسبت غلط ہے کہ میں نے اس میں آئندہ کے لئے یہ حکم دیا کہ اس مکان موقوفہ کو مسجد تعمیر کرلینا اور متولی کا اسکو مسجد بنادینا جائز ہے۔ وہ فتوی جب موجود ہے تو اس کو پڑھ لیا جائے۔ بلاوجہ آپس میں اختلاف پیدا کرنا اور محض اپنی غرض کے ماتحت حکم شرع کو غلط

طور پر استعمال کرنا شان مسلم کے خلاف ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۹۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بیان میں کہ

ہمارے یہاں مسجد میں اس جگہ جہاں پنج گانہ باجماعت نماز امام صاحب پڑھاتے ہیں وہاں مٹی کا تیل کی بتی روشن کیجاتی ہے، یہ کیا بتی جلانا مسجد کے لئے جائز ہے یانہیں۔کتاب کے حوالے سے مفصل طور پر ازراہ کرم مطلع فرمائیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مٹی کے تیل میں بو ہوتی ہے، اور مسجد کو ہر بدبو کی چیز سے پاک رکھا جائے۔ردالمحتار میں ہے۔

علة النهى عن حدبان آكل الثوم و البصل المسجد) اذى الملئكة و اذى المسلمين و لا يختص بمسجد ه عليه الصلوة والسلام بل الكل سواء لرواية مساجد نا بالجمع خلافا لمن شذ ويلحق بما نص عليه فى الحديث كل ماله رائحة كريهة ما كو لا او غيره۔

لہذا مسجد میں مٹی کی تیل جلانا ممنوع ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۹۲)

کیا فرماتے ہیں علماء اہل سنت وجماعت ذیل کے اندر کہ

زید نے عرصہ دو سال گزرے حکومت موجودہ کے جنگل سے کچھ لکڑیاں بلا اجازت ذمہ داران حکومت کے حاصل کرلیا، اور بیشتر کڑی کا حصہ اپنے مکان کی تعمیر کے اندر صرف کر دیا، کچھ لکڑی مثلا ایک دروازہ کی تیاری کے لئے مسجد کو دے دیا، بروقت دینے منتظمین مسجد سے دریافت نہ کیا کہ وہ اس لکڑیوں کو لینگے یانہیں، اور نہ تو منتظمین کو پتہ چلا کہ کیسی لکڑی ہے بلکہ منتظمین حضرات نے یہ جانا کہ زید کی

ملکیت ہے اور زید خانہ خدا میں دیتا ہے۔اور دروازہ تیار کرایا گیا۔ بعد کو پتہ چلا کہ یہ لکڑی چرا کر بلا اجازت مالک لائی گئی ہے۔اب سوال یہ ہے کہ اگر مالک لکڑی سے کہا جاوے تو زید کی عزت کو نقصان پہونچے اور سزا پاوے۔اور ادھر مشکل ہے کہ اثاثہ سے دروازہ تیار کرایا گیا تو کیا یہ ممکن ہے کہ دروازہ کسی غریب محتاج کو دے دیا جاوے۔اور اس سے بقیمت خرید کر مسجد کے اندر نصب کرا دیا جاوے۔ یا کون سی شکل ایسی ہے کہ وہ دروازہ مسجد کے اندر کام آسکے۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

مسجد میں پاک حلال مال لگایا جاسکتا ہے، اور ناپاک حرام خبیث مال چاہے وہ خود خبیث مال اس کا سبب خبیث ہو ایسے مال کا مسجد میں لگانا مکروہ ہے۔

ردالمحتار میں ہے: لو انفق فی ذالک ای المسجد، مالا خبیثا و مالا له سببه الخبیث و الطیب فیکره لان الله تعالیٰ لایقبل الا الطیب فیکره تلویث بیته بما لا یقبله۔ اور ظاہر ہے کہ جب وہ لکڑی چوری کی ہے اجازت مالک کے بغیر حاصل کی گئی ہے تو وہ خود مال خبیث ہوگئی۔اور جب اس کو کسی چیز سے بدلہ جائے گا، تو اس کا سبب پھر وہی خبیث قرار پایا جائے گا۔لہذا اس دروزہ کو ہرگز مسجد میں نصب نہ کیا جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۹۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین

زید نے ایک زمین چھوڑی جس کے ورثا عبدالمجید، مجیدا، سعیدا، شبیر، کلو، قدیر، آل رسول، بابو، کلو، قدیر، آل رسول، بابو، رشیدا، کنیزا، اکبری، عرصہ دراز سے پاکستان چلے گئے اور وہیں پر مقیم ہیں۔ بقیہ ورثہ یہاں موجود ہیں۔جس میں عبدالمجید، مجیدا، شبیرا، محمد زادی، بسم اللہ، یہ یہاں موجود ہیں۔ اور اس میں بحکم قانون شرعی عبدالمجید، سعید، مجیدا، گیارہ آنہ کے حقدار ہیں۔تو اہل محلہ عبدالمجید، سعیدا، مجیدا، کو بجائے، گیارہ آنہ کے سات آنہ کو حصہ دینا چاہتے ہیں اور بقیہ زمین شبیرا سے مسجد کو لکھوا

رہے ہیں۔ تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں۔ بغیر اجازت اور ورثا کے لکھوا رہے ہیں، تو اہل محلہ کو کیا یہ حق حاصل ہے، کہ بغیر اجازت ورثا کے ایک ورثا سے مسجد شریف کو لکھوا سکتے ہیں،۔ آپکا خادم، حافظ عبد المجید،

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ظاہر ہے کہ خطہ زمین یا کوئی پیسہ بلا اجازت مالک کے ناپاک خبیث مال ہے۔ تو ایسا مال سوائے مضطر کے کسی کے لئے جائز نہیں۔ چہ جائیکہ وہ ناپاک وخبیث مال مسجد جیسی پاک چیز کے لئے جائز ہو سکے۔ کہ مسجد میں تو نہایت پاک اور طیب مال صرف کیا جاتا ہے۔ ردالمحتار میں ہے۔ لو انفق مالا خبيثا ومالا سببه الخبيث والطيب فيكره لان الله تعالیٰ لا يقبل الا الطيب فيكره تلويث بيته بما لا يقبله ۔ تو جب یہ زمین بنابر حصہ شرعی کے عبد المجید، وسعید اوغیرہ کی ملک ہے۔ تو نا مسماۃ بشیرن، کو اس ملک غیر کو بند کے لکھ دینے کا حق حاصل نہ اہل محلہ کو بغیر اجازت مالکان انکی مملوکہ زمین کے کسی حصہ کا لکھوانا جائز۔ نہ مسجد کے لئے ایسے ناپاک مال کا لکھنا درست۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۹۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ

چھوٹی مسجد سیتاپلڈی ناگپور کا اندرونی حصہ ۲۔۱۔۲ فٹ اور مسجد کا صدر دروازہ جس پر اذان دی جاتی ہے۔ اور مسجد سے ملحق اس کی چار دو کانیں جن کی آمدنی مسجد کے لئے وقف ہے۔ ان سب کو کارپوریشن ناگپور منہدم کرا کے سڑک چوڑی کرنا چاہتی ہے۔ اور اس کے بدلہ میں دوسری زمین کا وعدہ کرتی ہے۔ کیا از روئے شرع شریف مسجد کے کسی حصہ کا توسیع سڑک کے لئے منہدم کرانا اور اس کے بدلے میں دوسری زمین لینا جائز ہے۔ جواب مع حوالہ کتب جلد عنایت فرمائیں کہ نوٹس میں ۳۱ جنوری تک کی مدت ہے۔ حوالہ قرآن کریم کی آیتوں سے بھی ہو تو زیادہ مناسب ہوگا۔ فقط

السائل حاجی عبد البشیر خاں متولی چھوٹی مسجد سیتاپلڈی ناگپور

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد کے کسی حصہ کا توسیع سڑک کے لئے منہدم ہونا بلاشبہ تخریب مسجد ہے۔ اور تخریب مسجد کی ممانعت خود وحی جلی قرآن کریم میں ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ومن اظلم ممن منع مسجد الله ان يذكر فيها اسمه وسعى فى خرابها ط اولئك ماكان لهم ان يدخلوها الا خائفين ط لهم فى الدنيا خزى ولهم فى الآخرة عذاب عظيم۔

(سورہ بقرہ ع ۱۴ ج ۱)

اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ کی مسجدوں کو روکے ان میں نام خدا لئے جانے سے اور ان کی تخریب میں کوشش کرے۔ ان کو نہیں پہونچتا تھا کہ مسجدوں میں جائیں مگر ڈرتے ہوئے ان کے لئے دنیا میں رسوائی اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

تفسیر احمدی میں اس آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں:

المقصود من ذكر الاية انها تدل على ان هدم المساجد وتخريبها ممنوع۔

(تفسیرات احمدیہ مطبوعہ برقی پریس دہلی ج ۱ ص ۳)

مقصود اس آیت کے ذکر کا یہ ہے کہ آیت نے اس بات پر دلالت کی کہ مسجدوں کا گرانا اور ان کی تخریب کرنی ممنوع ہے۔

اس آیت اور اس کی تفسیر سے ثابت ہو گیا کہ مسجد کا انہدام و تخریب ممنوع و ناجائز ہے۔ اور مسجد کا انہدام و تخریب کرنے والا ظالم اور خدا سے نڈر شخص ہے اور وہ دنیا میں رسوائی کی سزا اور آخرت میں عذاب عظیم کا مستحق ہے۔ پھر مسجد کا انہدام و تخریب بھی کس حقیر و دنی چیز کے لئے عام راستہ اور سڑک کے لئے جس کو ہمارے نبی کریم ﷺ نے علامت قیامت قرار دیکر اس کی برائی و مذمت۔ اور قباحت و ممانعت کی طرف تنبیہ کی چنانچہ وحی خفی یعنی حدیث نبوی شریف میں وارد ہے جس کو طبرانی حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من اقتراب الساعة ان تتخذ المساجد طرقا۔ (جامع صغیر۔ ج ۲ ص ۱۳۸)

علامات قرب قیامت سے یہ ہے کہ مسجدوں کو راستے اور سڑک بنایا جائے گا۔

دیکھو مسجد کو راستہ اور سڑک بنانے کی مذمت و ممانعت خود شارع علیہ الصلوۃ والسلام کی حدیث سے بھی ثابت ہو گئی۔ تو جب قرآن و حدیث جیسے اصول سے مسجد کو راستہ اور سڑک بنانے کی ممانعت

ثابت ہوگئی تو اب کسی فقہ کی کتاب پیش کرنے کی حاجت باقی نہیں رہی مگر چونکہ سوال میں مسجد کے دروازہ اور ملحقہ دوکانوں کا ذکر بھی ہے تو شرعا وعرفا دروازہ وملحقہ دوکانات احاطہ مسجد سے علیحدہ نہیں بلکہ یہ دونوں اتصال مسجد کی بنا پر شرعا فناء مسجد میں داخل ہیں۔

چنانچہ فتاوی قاضی خاں وفتاوی عالمگیری میں ہے:

یصح الاقتداء لمن قام علی الدکاکین اللتی تکون علی باب المسجدلا نہامن فناء المسجد متصلة بالمسجد کذا فی قاضی خاں۔ (عالمگیری ج۱ ص۵۷)

اقتداء اس شخص کی بھی صحیح ہے جوان دوکانوں پر کھڑا ہو جو دروازۂ مسجد پر ہیں کیونکہ وہ دکانیں مسجد سے متصل ہونے کی بنا پر فناء مسجد میں ہیں

اس عبارت سے ثابت ہوا کہ اتصال مسجد کی بنا پر مسجد کا دروازہ اس کی ملحقہ دوکانات فنائے مسجد قرار پائیں اور یہ طے شدہ قول ہے کہ مسجد کے لئے جو حکم ہے وہی حکم فنائے مسجد کا ہے۔

چنانچہ اسی فتاوی عالمگیری میں ہے:

فناء المسجد لہ حکم المسجد۔ (عالمگیری ج۱ ص۵۷)

توجب مسجد کو راستہ وسڑک بنانا ممنوع وناجائز ہے تو اب فنائے مسجد یعنی دروازہ مسجد اور اس کی ملحقہ دوکانات کا بھی راستہ اور سڑک بنانا ممنوع وناجائز ثابت ہوا۔ لہذا کسی متولی یا اہل محلّہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مسجد کے صحن یا دروازہ یا ملحقہ دوکانات کو راستہ اور سڑک بنانے کے لئے دیں۔ اور اسکے بدلے میں کسی دوسری زمین کو لیں۔

اسی فتاوی عالمگیری میں ہے: ان ارادوا ان یجعلوا شیئا من المسجد طریقا للمسلمین فقد قیل لیس لھم ذلک وانہ صحیح کذا فی المحیط۔ (عالمگیری قیومی کانپورج ۲ ص ۳۴۷)

اگر قوم یہ ارادہ کرے کہ مسجد کے کسی حصہ کو مسلمانوں کے لئے راستہ بنادیں تو حکم دیا گیا کہ انہیں اس بات کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہی قول صحیح ہے اسی طرح محیط میں ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ متولی یا اہل محلّہ دروازۂ مسجد یا اس کی ملحقہ دوکانات کو یا مسجد یا فنائے مسجد کے کسی حصہ کو ہرگز ہرگز راستہ اور سڑک کی توسیع کے لئے نہ دیں۔ نہ مسجد کی اس موقوفہ زمین سے کسی دوسری زمین کا تبادلہ کرسکیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۲۸ ؍ جمادی الاخری ۱۳۷۸ھ

کتبہ : الفقیر الی اللہ عزوجل ، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۴۹۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

مسجد کلاں محلہ ممونی شہر فتحپور رعرصہ تخمینا دوتین سو سال کی تعمیر ہے اور اسی وقت سے منبر جس پر جمعہ یا عیدین کے پیش امام صاحب کھڑے ہوکر خطبہ پڑھتے ہیں منبر محراب کے باہر جانب شمال تعمیر ہے اور اسی زمانہ سے اب تک اسی منبر پر پیش امام صاحب کھڑے ہوکر خطبہ پڑھتے چلے آئے ہیں اور اب اسی سابق منبر سے ملاکر محراب کے اندر جدید منبر اور بنا کر شامل کردیا گیا ہے اور اب اسی جدید منبر پر کھڑے ہوکر محراب کے اندر پیش امام صاحب کھڑے ہوکر خطبہ پڑھتے ہیں مطلع فرمائیے کہ جبکہ ایک منبر سابق محراب کے باہر بنا ہوا تھا اور ہے تو دوسرا جدید منبر محراب کے اندر بنانا سنت ہے یا نہیں لہذا جو امر مسنون ہو اسی سے ازروئے حدیث وفقہ آگاہ کیا جاوے۔

المرقوم ۳۰ رمارچ ۱۹۵۹ء سلامت اللہ خاں ولد عبدالکریم خاں ساکن محلہ ممونی شہر فتحپور

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

منبر کا باہر داہنی طرف ہونا سنت ہے۔ چنانچہ طحطاوی میں ہے:

وذکر البدر العینی فی شرح البخاری ان من السنة اتخاذ المنبر عن یمین المحراب،

تو سابق منبر جب محراب کے باہر جانب شمال میں تھا تو وہ سنت کے موافق تھا۔ اس کو بلاحاجت شرعی کے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ ہاں اگر اس کے چھوڑ دینے میں کوئی مقصد صحیح ہو مثلا۔ (۱) سابق ستون کے مقابل تھا۔ خطبہ کی اذان خارج مسجد میں کہنے میں ستون مانع ہوتا تھا اور خطیب کا صحیح طور پر مقابلہ نہیں ہوتا تھا اس لئے محراب کے اندر جدید منبر بنایا گیا ہے۔

(۲) یا اسکی سیڑھیاں اتنی جگہ گھیر رہی تھیں کہ اس سے صف کی کمی ہورہی تھی اور اس کے جدا کرنے سے مزید ایک صف کا اضافہ ہوجائے گا اور جمعہ وعیدین مین نمازیوں کی کثرت کی بنا پر اس کے علیحدہ کرنے کی ضرورت تھی تو محراب میں منبر بنا کر ایک صف کی جگہ اور نکل آتی۔

(۳) یا منبر بہت بڑا ہے اور مسجد تنگ ہے تو ایسا منبر خود مکروہ ہے۔

اسی طحطاوی میں ہے: ویکره المنبر الکبیر جدا اذا لم یکن المسجد متسعا۔

تو اگر ان امور میں سے کوئی بات ہو تو اس جدید منبر کا محراب میں بنالینا صحیح ہے۔ واللہ تعالی

اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۴۹۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں۔

زید کہتا ہے مسجد کے اندر درود شریف اور مولود شریف پڑھنا حرام وناجائز ہے اور بکر کہتا ہے مسجد کے اندر درود شریف پڑھنا جائز وثواب ہے۔مسائل کیا کہتے ہیں مدلل جواب سے مشکور وممنون فرمائیے ۔فقط

السائل ادریس حسین

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

مسجد اعمال آخرت ہی کے لئے بنائی جاتی ہے۔

چنانچہ علامہ حلبی کبیری میں فرماتے ہیں:ان المساجد بنیت لاعمال الاخرۃ ۔

(کبیری ص ۵۶۷)

اور درود شریف اعمال آخرت میں سے ہے جس کی نہایت روشن دلیل یہ ہے کہ وہ نماز جس کی جماعت مساجد میں قائم کیجاتی ہے ۔ یہ درود شریف اس نماز میں داخل ہے ۔تو اگر یہ درود شریف عمل آخرت نہ ہوتا تو نماز جیسے عمل آخرت میں ہرگز داخل نہ ہوتا۔درود شریف کو عمل دنیا کون کہہ سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی یایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔

بیشک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی پر اے ایمان والوان پر درود اور خوب سلام بھیجو۔

اس آیہ کریمہ سے ثابت ہوگیا کہ درود شریف وہ ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ کس قدر تاکید سے دیتا ہے اور اس درود شریف کو خود اپنا اور اپنے مقربین فرشتوں کا عمل بتاتا ہے ۔تو پھر اس درود شریف کو کون عمل دنیا کہہ سکتا ہے۔لہذا جب درود شریف کا عمل آخرت سے ہونا خود قرآن شریف سے ثابت ہوگیا تو جو مساجد اعمال آخرت کے لئے بنائی گئی ہیں ان میں اس درود شریف کا پڑھنا کس طرح حرام وناجائز ہوسکتا ہے۔اور جو اس کو حرام کہتا ہے وہ فضیلت درود سے جاہل۔اور اس کے محبوب خدا ہونے سے جاہل اور اس

کے حکم قرآنی ہونے سے جاہل۔ اور اس کے عمل آخرت ہونے سے جاہل۔ اور مسجد کی بنا کی غرض سے جاہل۔ اس کو جلد از جلد توبہ کرنی چاہئے۔ کہ وہ درود شریف جیسی محبوب چیز سے عداوت ودشمنی رکھتا ہے۔ اسی طرح ذکر مولود شریف یقیناً ذکر رسول ﷺ اور ذکر رسول بلاشبہ ذکر الٰہی ہے کہ حدیث قدسی میں ہے۔

قاضی عیاض نے شفا شریف میں ان الفاظ میں روایت کیا۔

جعلتك ذكرا من ذكرى فمن ذكرك ذكرني۔

یعنی اللہ فرماتا ہے کہ اے رسول میں نے تمہیں اپنا ذکر بنا دیا ہے جس نے تمہارا ذکر کیا اس نے میرا ذکر کیا۔ تو جس نے ذکر مولود کو حرام وناجائز کہا تو اس نے ذکر خدا اور رسول کو حرام وناجائز قرار دیا۔ اور اس کو کوئی مسلمان تو کہہ نہیں سکتا۔

بخاری ومسلم وغیرہ کی احادیث میں وارد ہے کہ خود نبی کریم ﷺ حضرت حسان رضی اللہ تعالی عنہ کے لئے مسجد نبوی شریف میں منبر رکھواتے تھے اور وہ اس پر کھڑے ہو کر حضور کے فضائل کا ذکر کرتے تھے تو ذکر رسول کا مسجد میں ہونا خود فعل رسول ﷺ سے ثابت ہے۔ اور یہ ذکر رسول کو مسجد میں حرام وناجائز کہتا ہے۔ ذکر رسول تو قرآن میں مذکور۔ احادیث میں مذکور۔ نماز میں مذکور۔ خطبہ میں مذکور۔ اذان میں مذکور۔ تو یہ مسجد میں قرآن وحدیث پڑھنے کو بھی ناجائز وحرام قرار دیگا۔ نماز وخطبہ کو بھی ناجائز وحرام ٹھہرائے گا۔ تو ذکر مولود کی مخالفت میں قرآن کی مخالفت۔ حدیث کی مخالفت۔ کس قدر دینی احکام کی مخالفت لازم آ رہی ہے۔ لہذا یہ شخص جلد توبہ کرے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۵ شوال المکرم ۱۳۷۸ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

سجود التلاوۃ

مسئلہ (۴۹۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ان مسائل مفصلہ ذیل میں۔ مگر یہ عرض ہے کہ بحوالہ کتب فقہیہ واحادیث نبویہ جوابات مرحمت ہوں بلکہ سطر وصفحہ کا بھی حوالہ ہو تو بہتر ہے مع ترجمہ اردو کے۔

آپ کا نیازمند ممتاز علی محافظ دفتر میونسپلٹی سنبھلی

اول: تمام کلام مجید میں جو سجدے ۱۴/ یا ۱۵/ واجب ہیں۔ ان سجدے تلاوت واجب کا ماہ رمضان شریف میں حفاظ کو نماز تراویح میں فوراً ادا کرنا اولی وافضل ہے یا نہیں؟۔

دوم: ان سجدوں کے فوراً ادا کرنے کا کچھ ثواب بھی ملتا ہے یا نہیں؟۔

سوئم: ان سجدوں کے نہ کرنے کا کچھ عذاب بھی ملے گا یا نہیں؟۔

چہارم: اگر کسی امام صاحب نے برعکس اس کے جملہ سجدوں میں سے مع مقتدیوں ایک بھی سجدہ تلاوت فوراً ادا نہ کیا ہو تو ان کا بروز حساب کیا نتیجہ ہوگا؟۔

پنجم: ادائیگی تمام سجدوں کی کس طرح ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جناب مولوی صاحب دریافت پر ایسا فرماتے ہیں کہ درمیان نماز تراویح آیت سجدہ ختم ہونے پر امام نیت ادائیگی سجدہ قبل رکوع یا درمیان رکوع کرلے تو ادائیگی سجدہ ہو جاتی ہے؟ پس ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ درمیان نماز جب کہ دو رکعت نماز تراویح کی نیت امام نے باندھ لی ہو اس درمیان میں خواہ قبل از رکوع یا درمیان رکوع نیت ادائیگی سجدہ مکرر یعنی بحالت نیت تراویح کے امام صاحب کریں تو کچھ نقص نماز میں پیدا ہوگا یا نہیں؟ اور مقتدیوں کو اس کا علم کس طرح ہوگا؟ اور فوراً سجدہ کر لینے پر جس قدر ثواب ملنے کا مستحق ہوتا وہ اس طرح کرنے پر ثواب کا مستحق ہوگا یا نہیں؟۔

بعدہ مقتدیوں کو علم ادائیگی سجدہ تلاوت نہ ہو تب بھی سجدہ تلاوت کلام مجید ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

اسی طرح تمام کلام مجید ختم ہو جائے اور ایک بھی سجدہ فوراً ادا نہ کیا جائے بلکہ مقتدیوں کی تعداد بھی صرف ۸ ر یا ۱۰ ر تک روزانہ ہوتی ہو، گویا مسجد میں ایک پوری جماعت بھی نہ ہو ایسی صورت میں کیا سجدے بطریق مذکورہ ادا ہو جائیں گے یا نہیں؟ اور کن مجبوریوں پر ان سجدوں کی ادائیگی بشمول رکوع و دونوں سجدوں نماز کے سجدہ تلاوت کلام مجید ادا ہو جائیگی اور کچھ ثواب بھی حاصل ہوگا یا نہیں؟۔ یا صرف بار سجدوں کا اتر جائے گا۔

ششم: اولا طریقہ سجدہ تلاوت کلام مجید کیا ہے؟ اور ان دونوں طریقوں میں سے کس طریقہ میں زیادہ ثواب ملتا ہے؟۔

ہفتم: مقتدیوں کو یہ بھی نہ بتلایا جائے کہ امام نے نیت ادائیگی سجدہ تلاوت کلام مجید بشمول دو رکعت نماز تراویح کر لی ہے یا نہیں بلکہ امام صاحب اس قدر جلدی رکوع و سجدوں میں نماز کے خود کرتے ہوں کہ پورے طریقہ پر مقتدی ارکان ورکوع و سجدوں کے ادا بھی نہ کر چکے ہوں اور امام صاحب ارکان کوع و سجدوں سے فراغ حاصل کر لیں۔ پھر کس طرح یہ باور کر لیا جا سکتا ہے کہ امام صاب نے نیت ادائیگی سجدہ تلاوت کلام مجید بھی کر لی تھی یا نہیں۔ البتہ امام صاحب فوراً سجدہ تلاوت کلام مجید کر لیتے تو اس کی ادائیگی کا اظہار آسانی سے ہو جاتا۔ یا امام صاحب بالغ ہوتے تب بھی مان لینے کے قابل ہوتا کہ نیت ادائیگی سجدہ کر لی ہوگی۔ پھر بھی شبہ والی بات تھی۔ اور شبہ جس ارادہ میں پیدا ہو وہ کس قدر نقص نماز میں پیدا کرتا ہے۔ الا ایسی حالت میں کس طرح مان لیا جاوے کہ حافظ صاحب نے ضرور نیت ادائیگی سجدہ تلاوت کلام مجید کر لی ہوگی۔ جن کی عمر بھی اس وقت ۱۴ ر سال سے کم ہو۔ پس ایسی صورتوں میں حافظ صاحب کے سرپرست والد صاحب جو ایک مشہور عالموں میں کہلائے جاتے ہوں تو یا جنہوں نے شروع رمضان شریف سے ختم کلام مجید عشاء کی نماز فرض کی پیش امامی بھی کی ہو اور ان کے ہی صاحب زادہ نے کلام مجید تراویح میں سنایا ہو۔ وہ صاحب ایسا فرماتے ہیں کہ تلاوت کلام مجید کے بحالت نیت امام قبل رکوع یا درمیان رکوع کر لینے پر سجدے واجب تلاوت کلام مجید ادا ہو جاتے ہیں اور دریافت پر حوالہ ادائیگی سجدوں کا کتاب بہشتی گوہر حصہ یازدہم بہشتی زیور صفحہ ۸۳ ر متعلقہ بیان سجدہ تلاوت نظیر میں پیش کرتے ہیں۔ اور یہ کتاب مولوی اشرفعلی تھانوی مقام تھانہ بھون کی تصنیف شدہ ہے اور اس میں درمختار ورد المحتار کا حوالہ دیا ہے۔

ہشتم: یہ فعل مولوی صاحب کا کس حد تک جائز و ناجائز ہے؟ کہ انھوں نے باوجود مولوی ہونے اور عالم ہونے کے اس قدر معلومیت پر بھی قصداً تمام کلام مجید کے فوراً سجدے ادا نہ کئے اور نہ کرائے۔ بلکہ جو ثوابات فوری سجدے کرنے پر ملتے ان کو ترک کی اور کرایا گیا یا نہیں؟ اور مقتدیوں کو ایسے متبرک ماہ رمضان شریف میں جب کہ ایک سال بعد بہ تندرستی حیات مستعار نصیب ہوتا ہے اس نعمت مترقبہ ثوابات سے محروم رکھا یا نہیں؟ اور اس ترک کئے ثوابات کا ان پر کچھ بار ہوا یا نہیں کیا رعایت پسری شرع کے معاملہ میں ان کے کچھ ادائیگی یا نہیں۔

نہم: اب فرض نماز کی ادائیگی میں مولوی صاب کا یہ فعل کہ شروع الحمد شریف کرنے کے درمیان میں رحیم پر سانس کا توڑنا اور بجائے ''ایاك نعبد'' کے ''اِیاك نعبد'' بلا تشدید کے پڑھنا اور ''مستقیم'' پر سانس کا توڑنا یا ''مستقیم میم'' یعنی دو میم میں ایک میم ادا کرنا اور ''غیر المغضوب'' کی بجائے ''غیر المغضوبی'' پڑھنا اور ''ولا الضالین'' کی بجائے ''ولا الضالین'' پڑھنا اور سلام پھیرتے وقت سلام میں ''اسلام وعلیکم ورحمة الله'' پڑھنا۔ آیا صحیح ہے یا غلط؟ اگر غلط ہے تو جرم خداوندی بہ احادیث نبویہ وکتب فقہیہ کیا ہوگا؟ اور فرض کی ادائیگی ہوئی یا نہیں؟۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

اول: مصلی نے جب چودہ سجدہ تلاوت سے کوئی آیت نماز میں تلاوت کی تو اس کے لئے فوراً سجدہ کرنا واجب ہے۔ چنانچہ مراقی الفلاح کے صفحہ ۷۷ا میں ہے: وصفتها الوجوب علی الفور فی الصلاة ۔ یعنی سجدہ تلاوت کی صفت نماز میں علی الفور واجب ہوتا ہے۔

شامی جلد اول کے صفحہ ۵۴۰ میں ہے: فان کانت صلوتیة فعلی الفور۔

یعنی اگر سجدہ تلاوت نماز میں بسبب قرأت کے واجب ہوا ہو تو اس کا حکم فوراً ادا کرنا ہے۔

دوم وسوم و چہارم: سجدہ کے فوراً ادا کرنے میں یقیناً ثواب ہوگا اور تاخیر میں گناہ۔

طحطاوی صفحہ ۲۷۸ رمیں ہے: حتی لو اطال التلاوة تصیر قضاء ویاثم فیکره تحریما تاخیر الصلوة عن وقت القرأة۔

درمختار میں ہے: ویاثم بتاخیرها۔

خلاصہ مطلب ان عبارات کا یہ ہے کہ سجدہ صلوتیہ میں تاخیر کرنا مکروہ تحریمی ہے یہاں تک کہ اگر

تلاوت کو طویل کر دیا تو وہ سجدہ قضا ہو جائے گا اور وہ شخص گنہگار ہوگا۔ لہذا اگر مصلی نے آیت سجدہ کے بعد چار آیتیں اور تلاوت کیں تو فوراً منقطع ہو جائے گا۔

چنانچہ کبیری کے صفحہ ۴۷۲ رمیں ہے: فان قرء بعدها اربع آيات انقطع الفور بلاخلاف۔

شامی جلد اول کے صفحہ ۵۴۰ رمیں ہے: ثم تفسير الفورى هدم طول المدة بين التلاوة والسجدة بقرأة اكثر من آيتين او ثلث۔ یعنی سجدہ تلاوت کے فوراً ادا کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اس سجدہ اور تلاوت کے درمیان دو یا تین آیتوں سے زائد کا فاصلہ نہ ہو۔

اب ان عبارات سے واضح ہو گیا کہ سجدہ تلاوت کو فوراً ادا کیا جائے اور اگر اس آیت سجدہ کے بعد دو یا تین آیات سے زیادہ تلاوت کر لیں تو یہ سجدہ قضا ہو گیا اور اب اس سجدہ کا ادا کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ اور وہ شخص گنہگار رہوا۔ اب اگر وہ امام ہے اور اس نے قصداً ایسی حرکت کی تو اس نے نہ فقط اپنا گناہ بلکہ تمام مقتدیوں کا گناہ اپنے ذمہ لے لیا۔

پنجم و ششم: سجدہ تلاوت کی اگر رکوع یا سجدہ میں نیت کی جائے تو ادا ہو جاتا ہے لیکن اس آیت سجدہ اور اس رکوع سجدہ میں دو آیتوں سے زیادہ آیات کا فاصلہ نہ ہو۔ چنانچہ درمختار کے صفحہ ۵۴۱ رمیں ہے۔ تودی (بركوع صلوة) اذ كان الركوع (على الفور من قرائة اية) او آيتين۔

یعنی سجدہ تلاوت نماز کے رکوع میں ادا ہو جاتا ہے جب رکوع فوراً ایک یا دو آیات کے بعد کر لیا جائے۔

کبیری کے صفحہ ۴۷۲ رمیں ہے اسی مسئلہ کو لکھ کر فرماتے ہیں: يشترط نيتها ايضا ويشترط فی ذالك كله ان لا ينقطع الفور بل يكونالركوع والسجود عقيب تلاوتها او بعد آية او آيتين۔

یعنی سجدہ تلاوت کے رکوع یا سجدہ میں ادا ہونے کے لئے نیت شرط ہے اور یہ بھی شرط ہے کہ فوراً منقطع نہ ہوا ہو۔ بلکہ رکوع یا سجدہ اس آیت سجدہ کی تلاوت کے ایک یا دو آیت کے بعد کر لیا جائے۔

خلاصہ کلام کا یہ ہے کہ فقہائے کرام نے سجدہ تلاوت کے رکوع یا سجدہ میں ادا ہونے کی یہی شروط لکھی ہیں جو ان عبارات سے ظاہر ہوئیں۔ لیکن اگر آیت سجدہ کے بعد تین آیات پڑھ کر رکوع یا سجدہ میں نیت ادائیگی سجدہ تلاوت کی جائے گی تو وہ سجدہ تلاوت ادا نہ ہوگا اور اس سجدہ تلاوت کے لئے اب مستقل سجدہ کرنا لازم ہوگا۔

چنانچہ شامی جلد اول کے صفحہ ۵۴۱ رمیں ہے فلو انقطع الفور لا بد لها من سجود خاص۔

یعنی اگر فوراً منقطع ہو گیا تو اس کے لئے سجدہ خاص ضروری ہے۔

بالجملہ حقیقت سجدہ تلاوت کی یہی ہے کہ اس کے لئے ایک مستقل سجدہ کیا جائے۔ اگر چہ رکوع یا سجدہ میں نیت کرنے سے وہ ادا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مراقی الفلاح کے صفحہ ۱۸۱ر میں ہے:

(وتؤدی برکوع او سجود) کائنین (فی الصلوۃ غیر رکوع الصلاۃ (سجودھا) والسجود افضل۔

شامی جلد اول کے صفحہ ۵۴۱ر میں ہے: والا صل فی ادائھا السجود وھو الافضل۔

خلاصہ مطلب ان عبارات کا یہ ہے کہ سجدہ تلاوت نماز کے رکوع سجدہ میں ادا ہو جاتا ہے، اور اصل اس کی ادائیگی میں سجدہ ہی ہے اور یہی افضل ہے۔

بالجملہ رکوع یا سجدہ میں نیت کرنے سے وہ ادا ہو جاتا ہے۔ اور سجدہ میں نیت کرنا رکوع سے افضل ہے۔ لیکن کتب فقہیہ پر غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لئے مستقل سجدہ کرنا اولیٰ وافضل ہے ۔

ہفتم وہشتم: جواب پنجم وششم سے یہ تو ظاہر ہو چکا کہ رکوع یا سجدہ میں اگر سجدہ تلاوت کی نیت کی جائے تو وہ ادا ہو جاتا ہے لیکن اگر کسی مقتدی نے اپنے رکوع میں سجدہ تلاوت ادا ہونے کی نیت نہیں کی اور امام نیت کر چکا ہے تو امام کا نیت کرنا اس مقتدی کے لئے کافی نہیں ہے۔ چنانچہ طحطاوی کے صفحہ ۲۸۹ر پر ہے: ولو لم ینوھا المؤتم لم یجزہ۔

یعنی اگر اس سجدہ تلاوت کی مقتدی نے نیت نہیں کی تو مقتدی کو امام کی نیت کافی نہیں ہے۔

درمختار کے صفحہ ۵۴۲ر پر ہے: ولو نواھا فی رکوعہ ولم ینوھا الموتم لم یجزہ۔

یعنی اگر امام نے سجدہ تلاوت کی اپنے رکوع میں نیت کی اور مقتدی نے نیت نہیں کی تو یہ مقتدی کے لئے کافی نہیں ہے۔

فقہائے کرام اس مقتدی کے لئے یہ طریقہ تحریر فرماتے ہیں۔

طحطاوی میں ہے: ویسجد اذا سلم مع الامام ویعید القعدۃ۔

درمختار میں ہے: فلو لم ینو المقتدی لا ینوب علی رای فیسجد بعد سلام الامام ویعیدا لقعدۃ الاخیرۃ۔

خلاصہ مطلب ان عبارات کا یہ ہے کہ اگر امام نے رکوع سجدہ میں سجدہ تلاوت کی نیت کی اور

مقتدی نے نہیں کی تو امام کا نیت کرنا مقتدی کی لئے قائم مقام نہ ہوگا اور مقتدی امام کے سلام پھیرنے کے بعد سجدہ تلاوت کرے اور اس کے بعد قعدہ کرے۔

خلاصہ ان جوابات کا یہ ہے کہ سجدہ تلاوت شروط مندرجہ فی السوال کو مدنظر رکھتے ہوئے رکوع یا سجدہ میں ادا ہو جاتا ہے پھر اگر امام نے اپنی نیت کا مقتدیوں میں اظہار نہیں کیا ہے تو اس کا بار امام ہی کی گردن پر ہے اور مقتدیوں کو ترک سجدہ پر استغفار کرنا چاہئے۔لیکن امام کی نیت ظاہر کرنے کے بعد پھر شبہ کو کوئی دخل نہیں۔

اب رہا امام کا نابالغ ہونا تو نابالغ کی امامت ہی مکروہ ہے۔کتاب بہشتی زیور اغلاط کا مجموعہ ہے۔ اگر چہ اس میں یہ اور متعدد مسائل صحیح بھی نکل آئیں۔لہٰذا مسلمانوں کو اس کتاب سے پرہیز کرنا بہت ضروری ہے۔

نہم: سورہ فاتحہ میں بالاتفاق سات آیات ہیں لہٰذا ''رحیم و مستقیم'' پر وقف کرنا صحیح ہے۔ اور ''ایاك'' کو بلاتشدید پڑھنا ہماری قرأت کے ضرور خلاف ہے لیکن مفسد صلاۃ نہیں۔اور ''غیر المغضوب'' میں ''ضاد'' کی جگہ ''ظا'' پڑھنا نماز کو فاسد کر دیتا ہے۔

چنانچہ کبیری صفحہ ۴۴۸ رمیں ہے:

اما اذا قراء مكان الذال المعجمة ظاء معجمة او الظاء المعجمة مكان الضاد المعجمة او على القلب ـ مثال الاول ما لو قرء تلظ الاعين مكان تلذ و مما ظرء مكان ذرء۔ ومثال الثانى المغظوب مكان المغضوب۔ ومثال الثالث ظعف الحيوة مكان ضعف الحيوة ـ فتفسد صلوة وعليه اى على القول بالفساد اكثر الائمة ـ

خلاصہ مطلب ان عبارات کا ہمارے مسئلہ کے متعلق یہ ہے کہ اگر کسی نے ''ظا'' کی ''ضاد'' یا ''ضاد'' کی جگہ ''ظا'' پڑھا۔مثلاً ''مغضوب'' کی جگہ ''مغظوب'' تو اکثر ائمہ کے نزدیک اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔

نیز محیط برہانی میں ہے: سئل الامام الفضلى عمن يقرأ الظاء المعجمة مكان الضاد المعجمة او على العكس فقال لا تجوز امامته ـ

یعنی امام فضلی سے اس شخص کا حکم دریافت کیا گیا جو ''ضاد'' کی جگہ ''ظا'' یا ''ظا'' کی جگہ ''ضاد'' پڑھتا ہے۔فرمایا: اس کی امامت ناجائز ہے۔

اور اسی طرح عالمگیری وغیرہ کتب فقہیہ میں مذکور ہے۔

آخر میں عرض کرتا ہوں کہ سائل کے سوالات کے تو یہ جوابات ہیں لیکن ان سوالات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مولانا جن کا تذکرہ سوالات میں کیا گیا ہے غیر مقلد معلوم ہوتے ہیں۔ اگر چہ وہ بظاہر حنفیت کا جامہ پہنے ہوئے ہوں۔ اس لئے "ضاد" کو "ظا" پڑھنا۔ اور آئے دن اس قسم کے مسلمانوں میں نئے نئے فسادات پیدا کرنا انھیں غیر مقلدوں کے رات دن کے کرشمے ہیں۔ لہذا مسلمانوں کو ایسے امام کے اس ظاہری جامہ حنفیت کے لباس پر دھوکہ نہ کھانا چاہئے اور ایسے امام کی اقتدا سے پرہیز کرنا لازم ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۴۹۸)

کیا فرماتے ہیں علماء دین مسائل مندرجہ ذیل میں

نماز کے علاوہ اگر کوئی شخص لاؤڈ اسپیکر میں آیت سجدہ تلاوت کرے تو سامعین پر سجدہ تلاوت واجب ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

لاؤڈ اسپیکر کیا عمل کرتا ہے اس کی تحقیق ضروری ہے۔ لہذا اگر اس کی وساطت سے قرع اول ہی منتقل ہوتا ہوا پہونچا تو وجوب سجدہ میں شک ہی نہیں۔ اور اگر آلہ نے اعادہ کیا جیسا کہ گرامفون میں ہوتا ہے تو سجدہ واجب نہیں کما حقه هو حکم الصدی۔

تنویر الابصار میں ہے: لاتجب بسماعه من الصدی۔ (شامی ج ۱ ص ۵۴)

مراقی الفلاح میں ہے: لاتجب بسماعها من الصدی وما هو یجبك مثل صوتك فی الجبال والصحاری ونحوها۔ (طحطاوی ص ۲۸۱)

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے: فانه لا اجابة فی الصدی وانما هو محاکاة۔ (طحطاوی ص ۲۸۱)

غنیۃ شرح منیہ میں ہے: ولو سمعها من الطائر والصدی لاتجب لانه محاکاة ولیس بقراة۔ (غنیۃ ص ۴۶۸) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

باب الدعاء

مسئلہ (۴۹۹)
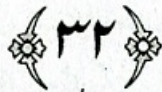
کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک امام صاحب ہر فرض نماز کے بعد دعا مانگتے ہیں مگر سنت اور نفل کے بعد دعا مانگنے کو منع کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سنت اور نفل کے بعد دعا نہیں مانگی ہے۔ کہیں اس کا ثبوت بھی نہیں ملتا۔ لہذا برائے کرم سنت اور نفل ادا کرنے کے بعد دعا مانگنے کا ثبوت احادیث وفقہ سے تحریر فرمائیں اور ساتھ ہی معیار سنیت تحریر فرمائیں کہ عوام کو معلوم ہوجائے کہ مذکور امام صاحب کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟۔ بینوا توجروا۔ ۲۳ محرم الحرام ۱۳۵۵ھ

المستفتی غلام نظام الدین قادری برکاتی عفی عنہ

کھارواواڑ متصل بالا پیر علیہ الرحمۃ۔ سورت

الجواب

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم۔

جن فرض نمازوں کے بعد سنن ونوافل ہیں ان فرائض کے بعد صرف وہ دعا مانگ کر جو حدیث شریف میں مروی ہے سنن ونوافل کو فرائض سے متصل کردینا چاہئے۔

مراقی الفلاح میں ہے۔

کل صلوة بعدها سنة یکره القعود بعدها والدعاء بل یشتغل بالسنة کی لایفصل بین السنة والمکتوبة۔ وعن عائشة ان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم کان یقعد مقدار مایقول: اللّٰهم انت السلام الخ کماتقدم فلایزید علیه اوعلی قدره۔

ہر نماز جس کے بعد سنت ہو تو اس کے بعد دعا اور بیٹھنا مکروہ تنزیہی ہے بلکہ سنت پڑھنے میں مشغول ہوجائے تاکہ سنت اور فرض میں فصل نہ ہو۔ اور حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مقدار۔ اللّٰھم انت السلام ومنک السلام

والیك یرجع السلام تبارکت یاذالجلال والاکرام۔ پڑھنے کے بیٹھتے تھے۔

تو اس پر یا اس مقدار پر زیادہ نہ کرے۔ لہذا اب اس حدیث اور عبارات فقہ کی بنا پر ظہر اور مغرب اور عشاء کی نمازوں میں اوراد یا طویل دعا بعد سنت ونفل ہونی چاہئے کہ سنت کا فرض سے متصل کرنا مستحق ہے۔

نورالایضاح میں ہے: القیام الی السنة متصلا بالفرض مسنون ۔

یعنی فرض سے سنت کی طرف متصل کھڑا ہونا مسنون ہے۔

تو سنن ونوافل سے بعد دعا کا انکار سخت جہالت ہے۔

اولاً: یہ دعا جو سنن ونوافل کے بعد کی جائے گی وہ حقیقۃً فرض ہی کے بعد ہے۔

شامی میں ہے: اما ما ورد من الاحادیث فی الاذکار عقیب الصلوۃ فلا دلالة فیه علی الاتیان بها قبل السنة بل یحمل علی اتیان بها بعدها ۔ لان السنة من لواحق الفریضة وتوابعها ومکملاتها فلم تکن احنبیة عنها فمایفعل بعدها یطلق علیه انه عقیب الفریضة ۔

مراقی الفلاح میں ہے: لایقتضی وصلها بالفرض بل کونها عقیب السنة ۔

خلاصہ مضمون ان عبارات کا یہ ہے کہ احادیث میں جن اذکار وادعیہ کا بعد فرض نماز پڑھنا وارد ہوا تو ان کو قبل سنت پڑھنے پر کوئی دلالت نہیں اور ان کو فرض سے ملانے کا حکم نہیں بلکہ ان کا پڑھنا مابعد سنت پر محمول ہے۔ اس لئے کہ سنت فرض کے توابع اور لواحق اور مکملات سے ہے تو سنت فرض سے اجنبی نہیں ہوئی۔ پس جو ذکر ودعا سنت کے بعد کیا جائے گا اس پر یہی اطلاق کیا جائے گا کہ وہ بعد فرض ہے۔

ثانیاً: دعا کو فرض کے ساتھ خاص کر دینا۔ یا کسی وقت کے ساتھ ایسا معین کر دینا کہ اس کے سوا اور کسی وقت میں منع کرے یہ خود مکروہ وممنوع ہے۔

ثالثاً۔ نوافل کے بعد دعا کرنا مستجب ہے کہ وقت اجابت ہے۔

شامی میں ہے: اذا ابتلی المسلم بالقتل یستحب ان یصلی رکعتین یستغفر اللّٰہ تعالیٰ بعدها۔

یعنی جب کوئی مسلمان قتل میں مبتلا ہو جائے تو اسے یہ مستحب ہے کہ دو رکعت نفل پڑھ کر اس کے بعد استغفار کرے، اگرچہ فرض کے بعد کی دعا نفل کے بعد کی دعا سے ضرور افضل ہے۔

مواہب لدنیہ میں ہے: اخرج الطبرانی من روایة جعفربن محمد الصادق ۔ فالدعاء

بعدالمکتوبة افضل من الدعاء بعدالنافلة کفضل المکتوبة علی النافلة۔

یعنی طبرانی نے بروایت حضرت جعفر بن محمد صادق تخریج کی کہ فرض کے بعد کی دعا نفل کے بعد کی دعا سے افضل ہے جس طرح فرض کو نفل پر فضیلت ہے۔

لہذا یہ امام سخت ناواقف ہے۔ سنت ونوافل کے بعد کی دعا کا انکار کرتا ہے اور فرض کے ساتھ دعا کو خاص کرتا ہے اور شریعت کے مسائل میں اپنی رائے کو دخل دیتا ہے۔

اب باقی رہا اس کا یہ کہنا کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سنت ونوافل کے بعد دعا نہیں مانگی ہے۔ کہیں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ یہ اس کی مذہب سے ناواقفی کی بین دلیل ہے۔

اولاً: اس جاہل کو یہ قاعدہ معلوم نہیں ہے کہ۔

الفعل یدل علی الجواز وعدم الفعل لایدل علی المنع کما فی المواھب اللدنیه۔

یعنی کرنا جواز کی دلیل ہے اور نہ کرنا منع کی دلیل نہیں۔ لہذا وہ عدم فعل کو منع کی دلیل کس طرح قرار دیتا ہے۔

ثانیا: مراقی الفلاح میں ہے: کان علیه السلام اذا سلم یمکث قدر مایقول اللّٰھم انت السلام الخ۔ ثم یقوم الی السنة۔

یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب سلام پھیرتے تو اس دعا ''اللّٰھم انت السلام'' کے پڑھنے کی مقدار ٹھہرتے پھر سنت کی طرف قیام فرماتے۔ تو یہ امام صاحب اس حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے فرمائیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وہ ادعیہ واذکار جو بمواظبت ان اوقات میں حضور سے ثابت ہیں وہ قبل سنت ثابت ہونگی یا بعد سنت۔ ہمارے نزدیک تو اس کا وہی جواب ہے جس کو علامہ شامی نے بیان کیا جس کی پوری عبارت اوپر منقول ہوئی۔

ثالثا: اگر یہ امام صاحب مطلق نوافل کے بعد دعا کو منع کرتے ہیں تو بکثرت احادیث اس امر پر دال ہیں۔ بنظر اختصار چند احادیث پیش کی جاتی ہیں۔

بخاری شریف میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ سے مروی ہے:

کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه تعالیٰ علیه وسلم یعلمنا الاستخارة فی الامور کما یعلمنا السورة من القرآن ویقول اذا ھم احدکم بالامر فلیرکع رکعتین من غیر الفریضة ثم یقول اللّٰھم انی استخیرك ۔ **الحدیث**

یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہم کو تمام امور میں استخارہ کی تعلیم دیتے تھے جس طرح ہم کو قران کی سورۃ سکھاتے تھے۔ فرماتے جب تم کسی امر کا قصد کرو تو علاوہ فرض کے دو رکعتین پڑھو! پھر یہ کہو۔

اللّٰھم انی استخیرک۔

پوری دعا استخارہ ترمذی شریف میں ہے:

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم: من کانت لہ حاجۃ الی اللہ او الی احد من بنی ادم فلیتوضأ فلیحسن الوضوء ثم یصلی رکعتین ثم یثنی علی اللّٰہ تعالیٰ ویصلی علی النبی صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم ثم یقول: لا الہ الا اللّٰہ الحلیم الکریم ۔الحدیث۔

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف یا کسی آدمی کی طرف کوئی حاجت ہو تو وہ اچھی طرح وضو کرے پھر دو رکعتیں پڑھے پھر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرے پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھے۔ پھر **لا الہ الا اللّٰہ الحلیم الکریم**. پوری دعا پڑھے۔

ان احادیث میں نماز نوافل کے بعد دعا کرنے کا خود حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکم فرمایا۔ اگر یہ امام وہابیہ کی کفری عبارات کو کفر نہیں جانتا۔ یا ضروریات دین سے کسی چیز کا انکار کرتا ہے۔ تو اس کی اقتداء درست نہیں، اس کو امام بنانا صحیح نہیں۔ بحمد اللہ منصف کے لئے یہ مختصر تحریر کافی ہے ۔مولیٰ تعالیٰ قبول حق کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب وعلمہ جل مجدہ اتم واکمل واحکم۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۰۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

نماز عشاء میں دعائے قنوت بوقت نزول حوادث عظیمہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں اور اس کا ثبوت حدیث وفقہ سے ہے یا نہیں اور بصورت عدم جواز جو ایسا کرے وہ کس حکم کا مستحق ہے۔ بینوا توجروا

السائل ملا نذیر حسین۔ ساکن محلہ دیپا سرائے بلد سنبھل ضلع مرادآباد

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

حنفیوں کے نزدیک علاوہ وتر کے پنجوقتہ کسی نماز میں دعائے قنوت پڑھنا جائز نہیں ہے۔ کتب فقہ میں یہ مسئلہ صاف طور پر موجود ہے۔

نورالایضاح میں ہے: لایقنت فی غیر الوتر۔

(نورالایضاح ص ۴۰)

غیر وتر میں قنوت نہ پڑھی جائے۔

غنیۃ شرح منیہ میں ہے: لایقنت فی صلوۃ غیرالوتر عندنا۔

(غنیۃ ص ۳۹۸)

حنفیوں کے نزدیک سواوتر کے نماز میں قنوت نہ پڑھی جائے۔

درمختار میں ہے: لایقنت لغیرہ ای غیرالوتر۔ (ردالمحتار مصری ص ۴۷۱)

وتر کے علاوہ قنوت نہ پڑھی جائے۔

ہاں اگر کوئی حادثہ عظیمہ ومصیبت شدیدہ نازل ہوتو اس وقت صرف نماز فجر میں قنوت پڑھ سکتا ہے۔ اسکے علاوہ اور کسی نماز جمعہ۔ ظہر۔ عصر۔ مغرب۔ عشاء میں اس کا پڑھنا جائز نہیں۔

فقہ کی مشہور کتاب شامی میں ہے: ان قنوت النازلة عندنا مختص بصلاة الفجر دون غيرها من الصلوات الجهرية او السرية۔ (شامی ص ۴۷۱)

حنفیہ کے نزدیک قنوت نازلہ نماز فجر کے ساتھ خاص ہے اس کے علاوہ اور نمازوں جہری اور سری میں نہیں۔

کبیری شرح منیہ میں ہے:

قال الحافظ ابو جعفر الطحاوی انما لایقنت عندنا فی صلوة الفجر من غير بلية فاذا وقعت فتنة او بلية فلاباس به فعله رسول الله صلی الله تعالیٰ عليه وسلم واما القنوت فی الصلوات كلها عند النوازل فلم يقل به الا الشافعی وكانهم حملوا ماروی عنه عليه الصلوة والسلام انه قنت فی الظهر والعشاء علی مافی مسلم وانه قنت فی المغرب ايضا علی مافی البخاری علی النسخ۔ (کبیری ص ۴۰۰)

حافظ امام ابو جعفر طحاوی نے فرمایا: حنفیہ کے نزدیک بغیر بلا کے نماز فجر میں قنوت نہ پڑھی جائے۔ اور جب کوئی فتنہ یا بلا نازل ہوتو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

نے کیا۔ لیکن وقت نوازل قنوت کا تمام نمازوں میں پڑھنا تو اسے سوا امام شافعی کے اور کسی نے نہیں کہا اور فقہا نے (جو مسلم شریف میں حضور علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضور نے نماز ظہر اور عشاء میں قنوت پڑھی اور بخاری شریف میں مروی ہے کہ حضور نے نماز مغرب میں بھی قنوت پڑھی) ان احادیث کو منسوخ ہونے پر محمول کیا۔

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ علاوہ فجر کے جو اور نمازوں میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی ہے وہ منسوخ ہے بلکہ نماز فجر میں بھی عموم حکم منسوخ ہے صرف بوقت نزول حوادث اجازت ہے۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے:

قولهم بان القنوت فی الفجر منسوخ معناه نسخ عموم الحکم لانسخ اصله۔

(ردالمحتار۔ ص ۴۷۱)

فقہاء کا یہ قول کہ فجر میں قنوت منسوخ ہے اسکے معنی یہ ہیں کہ عموم حکم منسوخ ہے اصل حکم منسوخ نہیں۔

اب جن مفتیوں نے علاوہ فجر کے اور اوقات مغرب عشاء وغیرہ میں دعا قنوت کے جواز کا غلط فتوی دیا ہے، اگر یہ ان کی کم علمی اور کتب فقہ سے نافہمی کی بنا پر ہے تو وہ مذہب حنفیہ سے ناواقفیت اور احادیث سے لاعلمی کی دلیل ہے اور حنفیوں کے لئے قول امام شافعی و امام احمد و امام سفیان ثوری کو پیش کر کے خلاف مذہب حنفیہ عمل کرنے کی تجویز ہے باوجودیکہ۔

درمختار میں تصریح موجود ہے: الحکم والفتیا بالقول المرجوح خرق للاجماع۔

(ص ۵۳)

ردالمحتار میں ہے:

الثبات علی مذهب ابی حنیفة خیر و اولی و اقول لهم کما فی البحر والعجب کیف یختارون خلاف ظاهر المذهب مع انه الاتباع علی مقلد ابی حنیفة۔

اگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مفتی وہابی ہیں اور وہابی در پردہ غیر مقلد ہوتا ہے اور ایک معین امام کی تقلید کو شرک بتاتا ہے جیسا کہ ان کے امام اسمعیل دہلوی تنویر العینین میں تقلید شخصی کو شرک قرار دیا ہے۔ لہذا یہ حنفیوں سے علاوہ فجر کے اور اوقات میں قنوت پڑھوا کر خلاف مذہب حنفی کی ترغیب دیتے ہیں اور ہمارا مذہب ہمیں تبدیل مذہب کی اجازت نہیں دیتا اور ایک امام کے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے امام کے مذہب

پر عمل کرنے کا اختیار نہیں دیتا۔

فقہ کی مشہور کتاب شامی میں ہے:

لیس للعامی ان یتحول من مذھب الی مذھب ویستوی فیه الحنفی والشافعی۔

حاصل جواب یہ ہے کہ نماز عشاء میں دعائے قنوت پڑھنا ناجائز ہے اور کتب فقہ حنفی اور احادیث کے خلاف ہے اور جو یہ فعل لاعلمی سے کرے وہ فعل ناجائز کا مرتکب ہے اور جو مذہب حنفیہ کو جانتے ہوئے بالقصد ایسا کرے وہ مستوجب تادیب وتعزیر ہے اور وقت نزع اس کے ایمان سلب ہونے کا خوف ہے اور وہ مذاہب ائمہ کے ساتھ استہزا و مذاق کرتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۰۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

اس زمانے میں جب کہ ہر جگہ مسلمانوں کو ستایا جارہا ہے اور طرح طرح مظالم کا شکار بنایا جارہا ہے ایسی حالت میں صبح کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھنا جائز ہے کہ نہیں؟۔ اور اس کی ممانعت ہو تو تفصیل سے جواب دیں۔ مولوی حسین احمد ٹانڈوی آج کل قنوت نازلہ پڑھنے کے بارے میں زوروں سے تاکید کررہے ہیں۔ لہذا سنیوں کو بھی لائحہ عمل بتایا جائے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

قنوت نازلہ برائے دفع مصیبت وحفاظت مسلمین وہلاکت اعداء صرف نماز فجر میں بعد رکوع جائز ہے مگر خلاف اولیٰ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ بعد نماز اس مقصد کے لئے دعاء کرے۔ رہا مولوی حسین احمد ٹانڈوی کا حکم تو وہ فریب سے خالی نہیں۔ کہ ہندوستان میں تو وہ قنوت نازلہ پڑھنے کی تاکید کرکے قوم کو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر مظالم ہورہے ہیں۔ اور عرب میں جاکر مسلمانان عالم میں یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ مسلمانان ہند نہایت امن اور آرام میں ہیں۔ تو مسلمانو فیصلہ کرو کہ اس کی کونسی بات سچی ہے اور کونسی جھوٹی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۰۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام مسئلہ ذیل میں
عرض خدمت میں یہ ہے کہ وہ ذکر عطا فرمایا جاوے جو عنداللہ وعندالرسول (جل جلالہ وصلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم) محبوب ترین ہو اور اس کے پڑھنے کی اجازت مع دعاء برکات۔
ایک مسئلہ اور حضور حل فرمادیں کہ کھانا کھانے کے بعد دعا مانگنا سنت ہے یا نہیں؟۔ اور اگر سنت ہے تو کھانے کے بعد بغیر ہاتھ دھوئے مانگے یا ہاتھ دھو کر مانگے اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگے یا یونہی دل سے دعا ماثور پڑھے؟۔

آپکا کفش بردار محمد عبداللہ نعیمی رضوی کھیری محلہ ڈہ پور۔ ضلع و پوسٹ آفس کھیری ٹاؤن ۴ دسمبر ۱۹۵۸ء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم
کھانے کے بعد حمد ودعا کرنا مسنون ہے فتاوی عالمگیری میں ہے
وسنن الطعام البسلمة فی اولہ والحمد فی اٰخرہ"
اب رہی یہ تفصیل کہ دعا بغیر ہاتھ دھوئے مانگے یا ہاتھ دھو کر مانگے تو فتاوی میں ہے
"اما دعا کردن بعضے احادیث مشعراند باینکہ بعد از غسل دست سنت باشد وبعضے مشعراند باینکہ قبل از غسل سنت باشد"
یعنی بعض احادیث میں تو دعا کرنا ہاتھ دھونے کے بعد آیا ہے اور بعض میں ہاتھ دھونے سے قبل سنت ہونا مروی ہے۔ لیکن میں نے اپنے اکابر کو یہ دیکھا کہ وہ ہاتھ دھونے سے قبل دعا کرتے تھے اسی کا میں بھی عامل ہوں۔ رہا دعا میں ہاتھ کا اٹھانا تو یہ دعا کی سنت ہے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے۔ واللہ تعالٰی اعلم بالصواب۔
اعمال میں میرے نزدیک سب سے محبوب ترین درود شریف ہے کہ ترمذی کی حدیث حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ میں آپ پر بکثرت درود پڑھتا ہوں تو کس قدر پڑھوں؟۔ فرمایا: تو جتنا چاہے۔ میں نے عرض کیا: چوتھائی اوقات میں؟ فرمایا: تو جتنا چاہے اس سے زیادہ ہو تو اور بہتر ہے۔ میں عرض کیا: دو تہائی اوقات میں؟۔ فرمایا: جتنا چاہے اگر اس پر

زیادہ کرے تو تیرے لئے اور بہتر ہے۔ تو میں نے عرض کیا: تو علاوہ فرائض وحوائج کے سب اوقات درود کے لئے مقرر کرلوں فرمایا: "اذا یکفی همك ویکفر لك ذنبك " تو یہ اس وقت تیرے غم کے لئے کفایت کریگا اور تیرے گناہ کے لئے کفارہ ہو جائیگا۔ اس حدیث شریف سے ثابت ہو گیا کہ درود شریف محبوب ترین اعمال سے ہے۔ ۵ جمادی الاخریٰ ۸۷ھ ۱۳

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۰۳)

کیا فرماتے ہیں علماء دین وشرع متین اس مسئلہ میں کہ
اگر کوئی شخص تراویح کے اندر ہر ترویحہ پر دعاء مسنون سبحان ذی الملك والملكوت الخ پڑھنے کے بعد صلوۃ خمسہ کی طرح ہاتھ اٹھا کر دعا مانگے تو از روئے قرآن وحدیث وفقہ جائز و درست ہوگا یا نہیں؟۔ کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ بدعت و ناجائز ہے کس حد تک صحیح ہے اگر اس کو غلط قرار دیا جائے تو "الدعاء مخ العبادة" کے کیا مطلب ہونگے۔ اس لئے التماس ہے کہ مسئلہ مذکورہ کا جواب جواز وعدم جواز کی حیثیت سے مدلل ومشرح معہ حوالہ کتب وعبارات تحریر فرمایا جاوے۔ تا کہ ہر خاص وعام کے لئے دلیل وحجت قاطعہ بن سکے والسلام

السائل عبد الرزاق امام مسجد سرائے ترین سنبھل

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم علی رسوله الكريم

ہر نماز فرض ونفل کے بعد دعا کرنا سنت ہے اور حدیث سے ثابت ہے۔
حافظ ابونعیم کتاب عمل الیوم واللیلۃ میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی:
قال ما يفوت النبي صلى الله تعالىٰ عليه سلم في دبر صلوة مكتوبة ولا تطوع الا سمعته يقول: اللهم اغفر لي خطا يا ی كلها، اللهم اهد نی لصالح الاعمال والاخلاق الخ "

اس حدیث سے ثابت ہو گیا کہ جس طرح فرائض کے بعد دعا سنت ہے اسی طرح سنن ونوافل کے بعد بھی سنت ہے اور آداب ومستحبات دعا سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا ہے۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے

" ان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ سلم کان اذا دعا فرفع یدیہ۔ (مشکوۃ شریف)

ان احادیث سے ثابت ہوگیا کہ سنت ونوافل کے بعد بھی ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا سنت ہے اور تراویح کا سنت ہونا کس پر پوشیدہ ہے تو ہر ترویحہ پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا سنت ہونا انہیں احادیث سے ثابت ہوگیا۔ جو اس کو بدعت کہتا ہے وہ تا قیامت اس کا بدعت ہونا ثابت نہیں کر سکتا بلکہ اس جاہل نے محض اپنی عقل سے سنت کو بدعت قرار دیا۔ بلکہ یہ ستم کیا کہ حدیث شریف کے جائز کردہ عمل کو فقط اپنی رائے ناقص سے ناجائز ٹھہرادیا۔ اور مسلمانوں کو غلط مسئلہ بتا کر اہل اسلام میں اختلاف وفساد پیدا کردیا۔ لہذا مسلمان ایسے کم علم وجاہل مفتی کی بات پر ہرگز ہرگز عمل نہ کریں اور اس سے کوئی دینی مسئلہ دریافت نہ کریں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۵ / رمضان المبارک ۷۷ھ۱۳

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۰۴)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ان مسائل میں

(۱) بعد فراغ پنجگانہ نماز فرائض وسنن ونوافل امام بالجہر دعا مانگتا ہے اور مقتدی آمین کہتے ہیں جمعیت کے ساتھ جیسا کہ رواج گجرات میں اکثر ہے یہ دعا مانگنا گناہ ہے یا کیسا؟۔ عند الاحناف۔

ثانیا۔ نماز تراویح کے ہر ترویحہ کے بعد تسبیح یا دورد شریف یا کلمہ شریف وغیرہ اذکار بالجہر پڑھتے ہیں یہ جائز ہے یا ناجائز ہے؟۔

ثالثا۔ بزرگان دین کے مزار پر پھولوں کا رکھنا شرعا جائز ہے یا ناجائز مدلل طور سے کتاب کے حوالے کے ساتھ اس کا جواب باصواب عنایت فرمادیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

امام فرائض ونوافل سے فارغ ہونے کے بعد بآواز دعا مانگ سکتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی انہوں نے فرمایا:

ما یفوت النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ سلم فی دبرصلوٰۃ مکتوبۃ ولا تطوع الا سمعتہ یقول: اللھم اغفر خطا یا ی کلھا اللھم اھد نی لصالح الاعمال والا خلاق الخ (رواہ ابو نعیم الحافظ فی کتاب عمل الیوم واللیلۃ)

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ سلم بعد نماز دعا فرماتے اور دعا بھی اتنی آواز سے ہوتی کہ صحابہ کرام سن لیتے تھے۔ لہذا اس دعا کا بالجہر پڑھنا خود فعل نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ سلم سے ثابت ہے۔

اب باقی رہا امام کا مقتدیوں کو شریک کر کے دعا مانگنا اس میں کوئی حرج نہیں اور مجمع عام میں دعا کا یہی قاعدہ ہے کہ قوم کا ایک شخص دعا کے الفاظ بالجہر کہتا ہے اور لوگ آمین کہتے ہیں۔

چنانچہ مراقی الفلاح میں ہے: واذ ادعا یو منو ن علی دعائہ۔ لہذا گجرات کا یہ طریقہ دعا نہ گناہ ہے، نہ ناجائز واللہ تعالی اعلم۔

ہر ترویحہ پر تسبیح وصلوۃ اور ادعیہ واذ کار کا باآواز پڑھنا بھی جائز ہے کہ بالجہر پڑھنے میں نشاط کا زائد ہونا، نیند کا دفع ہونا، سامعین کو فائدہ پہونچنا فکر وسمع کا ایک سا ہوجانا وغیرہ وغیرہ فوائد ہیں، اسلئے اس کو بعض فقہاء نے افضل تک قرار دیا۔

ردالمحتار میں ہے: قال بعض اھل العلم ان الجھر افضل لا نہ اکثر عملا۔

تو جو بلا کسی وجہ شرعی کے اور ادعیہ واذ کار کے جہر کو ناجائز قرار دیتا ہے تو وہ تصریحات فقہاء کے مخالف کرتا ہے۔ اجمع العلاء سلفا وخلفا علی استحبا ب ذکر الجھر فی الجماعۃ فی المساجد وغیر ھا الا ان یشوش جھر ھم علی قائم او مصل او قاری الخ۔ واللہ تعالی اعلم۔

قبروں پر پھولوں کا رکھنا نہ فقط جائز بلکہ حسن ہے۔ فتاوے عالمگیری میں ہے۔ وضع الورد الریا حین علی القبو رحسن۔ (عالمگیری مطبوعہ مجیدی کان پورص ۱۱۰ ج ۴)

تو جب عامۃ المسلمیں کی قبور پر پھولوں کا رکھنا حسن ہے تو بزرگان دین کے مزارات پر پھولوں کا رکھنا بدرجہ اولی حسن ہوا۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۰۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ

بعد نماز فرض جماعت پنج وقتہ بآواز بلند سہ مرتبہ کلمہ طیب پڑھنا کیسا ہے، بعض علماء منع کرتے ہیں اور مثال دیکر کہتے ہیں کہ عید الاضحیٰ میں تکبیر جو پڑھتے ہیں اس میں کلمہ بھی ہے اس کے پڑھنے کا روزانہ کیوں حکم نہیں ہوا، میں نے اس پر یہ کہا کہ آپ کے کہنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح قربانی کا تین یوم حکم ہے کہ تین یوم قربانی کرو اس کو روزانہ تمام عمر کرنے کا حکم کیوں نہیں ہوا۔ برائے کرم جواب سے مطلع فرمائے کہ کلمہ طیبہ کا بعد نماز جماعت فرض کے بآواز بلند پڑھنا درست ہے یا درست نہیں ہے؟۔ فقط والسلام

نیاز مند حافظ عبد الحمید رنگساز سنبھل محلہ چمن سرائے۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۵۰ء۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

اذکار کے بعد جماعت فرض بآواز بلند پڑھنا سنت ہے اور کلمہ طیبہ افضل ذکر ہے۔

چنانچہ مسلم شریف میں حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی:

کان رسول الله ﷺ اذا سلم من صلوته یقول بصوته الا علی لااله الا الله وحده لاشریك له الملك وله الحمد وهو علی کل شئ قدیر الحدیث۔

(مشکوۃ شریف ص ۸۸)

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ سلم جب اپنی نماز کا سلام پھیرتے تو بلند آواز سے یہ فرماتے تھے:

لا اله الا الله وحده لا شریك له الخ۔

اس حدیث شریف سے ثابت ہو گیا کہ کلمہ شریف۔ لا الہ الا اللہ کا بعد نماز بآواز بلند پڑھنا خود حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ سلم کا فعل ہے بلکہ یہ زمانہ اقدس میں جماعت فرض کے ختم ہو جانے کی علامت تھا:

چنانچہ مسلم شریف ہی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

ان رفع الصوت بالذکر حین ینصرف الناس من المکتوبة کان علی عهد النبی صلی الله تعالیٰ علیه سلم، قال ابن عباس: کنت اعلم اذا انصرفو بذلك اذا سمعته۔

(مسلم شریف معہ نووی مجتبائی۔ ص ۲۱۷ ج ۱)

زمانہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ سلم میں جب لوگ نماز فرض سے فارغ ہوتے تو بلند آواز سے ذکر کرتے تھے، حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب میں ذکر کی آواز سن لیتا تو جان لیتا تھا کہ لوگ نماز سے فارغ

ہو چکے۔

اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ صحابہ کرام فرضوں کی جماعت سے فراغت کے بعد بہ التزام بآواز بلند ذکر کیا کرتے تھے، جبھی تو یہ ختم جماعت کی علامت قرار پایا تھا۔ اسی بنا پر علامہ سیدی احمد طحطاوی نے حاشیہ مراقی الفلاح میں یہ استدلال کیا:

ویستفاد من الحدیث الاخیر جواز رفع الصوت بالذکر والتکبیر عقب المکتوبات بل من السلف من قال باستحبابه وجزم به ابن حزم۔

(طحطاوی مصری۔ ص ۱۸۱)

فرضوں کے بعد ذکر وتکبیر کے بلند آواز سے پڑھنے کا جواز حدیث اخیر سے مستفاد ہوا بلکہ سلف میں سے بعض انے اسکا مستحب ہونا بیان کیا اور ابن حزم نے اسی پر جزم کیا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ روز روشن کیطرح ثابت ہو گیا کہ کلمہ طیبہ کا بعد جماعت فرض بآواز بلند پڑھنا خود حضور اقدس صلی اللہ تعالی علیہ سلم کا فعل ہے اور ان کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا فعل ہے، تو یہ سنت رسول علیہ السلام بھی قرار پایا اور سنت صحابہ بھی ٹھہرا۔

اب وہابی اس کو بدعت نا جائز کہکر اور اسکو منع کر کے سنت کو بدعت و نا جائز کہتا ہے اور سنت کی مخالفت کرتا ہے۔ بظاہر تو اسکا دعوے یہ ہے کہ ہم سنت پر عمل کرتے ہیں، لیکن در حقیقت کلمہ طیبہ کے دشمن ہیں۔ سنت کو بدعت کہتے ہیں۔ فعل رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ سلم کو نا جائز قرار دیتے ہیں۔

ہم مسلمانوں کا عمل یہ ہے کہ کلمہ طیبہ کا بعد جماعت فرض بآواز بلند پڑھنا سنت جانتے ہیں۔ اور اسکا التزام کرنا موجب اجر و ثواب سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کی تصریحات سے ظاہر ہو چکا۔ مولی تعالی ان مخالفین کو چشم بینا عطا فرمائے اور انہیں قبول حق کی توفیق دے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۰۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ

(۱) نماز و دعا و نفل سے فارغ ہو کر آخر میں امام و مقتدی کا دعائے ثانی کرنا کیسا ہے؟۔

(۲) نماز و دعا سے فارغ ہو کر متوسط آواز سے کلمہ شہادت پڑھنا کیا ہے؟۔

(۳) ہر نماز کے بعد یا عشاء و فجر کے بعد باداموں پر درود شریف پڑھنا جائز ہے یا ناجائز؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) سنن ونوافل سے فراغت کے بعد بھی دعا کرنا حدیث شریف سے ثابت ہے جس کے حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ راوی وہ فرماتے ہیں:

ما یفوت النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی دبر صلوٰۃ مکتوبۃ ولا تطوع الا سمعتہ یقول اللھم اغفر خطایای کلھا اللھم اھدنی لصالح الاعمال والاخلاق الخ۔

(رواہ ابو نعیم فی کتاب عمل الیوم واللیلۃ)

یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فرض نماز کے بعد اور اسی طرح نفل نماز کے بعد یہ دعا فوت ہی نہیں ہوتی میں نے حضور کو وہ دعا اسی طرح کرتے سنا۔ اے اللہ میری سب خطاؤں کو بخش دے۔ اے اللہ مجھے بہتر اعمال واخلاق کی ہدایت کر الخ۔

اس حدیث سے واضح طور پر ثابت ہوگیا کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جس طرح فرائض کے بعد دعا کیا کرتے تھے۔ تو یہ دعا تو دعا اول ہوئی اسی طرح حضور نفل نمازوں کے بعد دعا کرتے تھے۔ تو جو نوافل فرائض کے بعد میں ہوں ان کے بعد کی دعا کیا ثانی دعا نہ ہوئی۔ پھر جب اس دعائے ثانی کا بھی سنت ہونا ثابت ہوگیا تو کون ایسا امتی ہے جو سنن ونوافل کے بعد کی دعائے ثانی کو ترک کردیگا۔ لہٰذا جو امام سنن ونوافل کے بعد بموافق اس حدیث کے اس قدر آواز سے دعا کرے جس کو مقتدی بھی سن رہے ہوں تو بمطابق آداب دعا کے ان مقتدیوں کو اس کی دعا پر آمین کہنا چاہئے۔ جیسا کہ صلوٰۃ کسوف واستسقا کے بعد امام بلند آواز سے دعا کرتا ہے تو مقتدیوں کو آمین کہنے کا حکم ہے۔

مراقی الفلاح میں ہے: اذا دعا یومنون علی دعائہ۔

(طحطاوی مصری ص ۳۱۷)

یعنی جب امام دعا کرے تو مقتدی اس کی دعا پر آمین کہیں۔ لہٰذا سنت ونفل کے بعد امام ومقتدیوں کا دعائے ثانی کرنا بلاشک جائز ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) نماز فرض کے بعد باآواز بلند ذکر حدیث شریف سے ثابت ہے۔ حدیث شریف میں حضرت معبد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے ان ابن عباس اخبرہ ان رفع الصوت بالذکر حین

ینصرف الناس من المکتوبۃ کان علی عھد النبی صلی اللہ تعالی علیہ وسلم و انہ قال قال ابن عباس کنت اعلم اذا انصر فوابذلک اذا سمعتہ۔

(مسلم۔ ج ۱۔ ص ۲۱۷)

یعنی حضرت ابن عباس نے انہیں خبر دی کہ لوگوں کا فرض سے فارغ ہونے کے وقت ذکر کا بلند آواز سے کرنا زمانہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں تھا اور حضرت ابن عباس نے فرمایا جب میں ذکر کی آواز سن لیتا تو اسی سے انکا نماز سے فارغ ہونا جان لیتا۔

اور طحطاوی میں ہے: فی مسلم عن عبد اللہ بن الزبیر کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اذا فرغ من صلوتہ قال بصوتہ الا علی لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ۔

ویستفاد من الحدیث الاخیر جواز رفع الصوت بالذکر والتکبیر عقیب المکتوبات بل من السلف من قال باستحبابہ ملخصا۔ (طحطاوی ص ۱۸۱)

یعنی مسلم میں حضرت عبد اللہ بن زبیر سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی نماز سے فارغ ہوتے تو بلند آواز سے لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ الخ فرماتے۔ علامہ طحطاوی نے فرمایا اس حدیث سے فرائض کے بعد ذکر اور تکبیر کا بلند آواز سے جائز ہونا مستفاد ہوا بلکہ بعض سلف نے اسکا مستحب ہونا بیان کیا۔

ان احادیث اور عبارات فقہ سے فرض نمازوں کے بعد ذکر کلمہ شریف کا بآواز بلند کہنا نہ فقط جائز بلکہ مستحب بلکہ سنت صحابہ بلکہ سنت نبی علیہ السلام ثابت ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۵) درود شریف کا وظیفہ ہر نماز کے بعد یا عشا وفجر کے بعد۔ باداموں پر یا تسبیحوں پر نہ فقط جائز بلکہ سنت ہے۔ خود حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے بکثرت ورد کا حکم فرمایا۔

ترمذی شریف میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی: قال: قلت: یارسول اللہ! انی اکثر الصلوۃ علیک فکم اجعل لک من صلوتی؟۔ فقال: ماشئت قلت: الربع، قال: ماشئت فان زدت فھو خیر لک، قلت: النصف قال: ماشئت فان زدت فھو خیر لک، قلت: فالثلثین قال: ماشئت فان زدت فھو خیر لک، قلت: اجعل لک صلوتی کلھا قال: اذا یکفی ھمک و یکفرلک ذنبک رواہ الترمذی۔ (مشکوۃ۔ ص ۸۶)

کہ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ میں آپ پر بکثرت درود بھیجتا ہوں تو کس قدر اپنا درود آپ

کے لئے کروں؟ تو حضور نے فرمایا تو جس قدر چاہے۔ میں نے عرض کیا: چوتھائی وقت؟ فرمایا تو جتنا چاہے۔ پس اگر چوتھائی سے زیادہ کرے تو وہ تیرے لئے زیادہ بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا: آدھا وقت معین کروں؟۔ فرمایا تو جتنا چاہے۔ پس اگر نصف سے زیادہ کرے تو وہ تیرے لئے زیادہ بہتر ہے۔ میں عرض کیا: کہ دو تہائی وقت معین کروں؟۔ تو فرمایا تو جتنا چاہے۔ پس اگر دو تہائی سے زیادہ کرے تو وہ تیرے لئے بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا: کہ وقت دعا کا کل وقت آپ کے لئے معین کروں؟۔ فرمایا جب کل وقت دعا درود میں گزار دیگا تو یہ تیرے غم کی کفایت کرے گا۔ اور تیرے لئے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔

اس حدیث شریف سے ثابت ہوگیا کہ بعد فرائض کے درود شریف کا بکثرت پڑھنا حصول مقاصد دینی و دنیوی اور کفارہ گناہوں کے لئے بہتر وظیفہ ہیں اور کفالت مہمات وحصول فیوضات کے لئے عمدہ ترین ذریعہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۰۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ملک دکھن میں اکثر شہر اور دیہات میں زمانہ دراز سے پنجوقتہ نمازوں میں بعد نماز نفل جو امام اور مقتدی سب مسجد میں ادا کرتے ہیں ثانی دعا امام معہ مقتدی پڑھکر کبھی درود کبھی فاتحہ معہ درود کرتے ہیں، اور جمعہ کی نفل نماز کے بعد بھی اور عیدین کی نفل نماز کے بعد بھی اس کا دستور ہے۔ بعد جمعہ اور عیدین امام سے مصافحہ کرتے ہیں اور باہم مقتدی بھی مصافحہ کرتے ہیں۔ اب ایک مفتی صاحب دیوبندی وعظ بیان کرتے ہیں، کہ یہ چاروں عمل یعنی دعائے ثانی معہ امام، درود بعد دعا، فاتحہ معہ درود بعد دعا، اور مصافحہ بعد نماز جمعہ وعیدین، یہ سب عمل خلاف سنت رسول وصحابہ ہیں، بدعت ضلالت ہیں، جہنمی ہیں۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت ان بدعتیوں کو نہوگی۔ یہ سنکر سب لوگ متوحش ہیں متردد اور متفکر ہیں، کہ یہ عمل ہم ایصال ثواب برائے رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور دیگر اہل بزرگان دین کے لئے کرتے تھے، اب مفتی صاحب گناہ کے کام بتا رہے ہیں۔ آپ یہ چاروں کام بدعت حسنہ ہیں یا بدعت سیہ ہیں، بتا کر ہماری صحیح رہنمائی فرمائیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

فرض اور نفل سے فارغ ہونے کے بعد دعا کرنا حدیث شریف سے ثابت ہے جس کو حافظ ابونعیم نے اپنی کتاب عمل الیوم واللیلۃ میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے تخریج کی کہ انہوں نے کہا: ما یفوت النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی دبرصلوۃ مکتوبۃ ولا تطوع الاسمعتہ یقول اللھم اغفرخطایای کلھا اللھم اھدنی لصالح الاعمال و الاخلاق الحدیث۔

میں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کونماز فرض ونفل کے بعد یہ دعا کرتے ہوئے سنا اور حضور یہ دعا ترک نہ فرماتے: اے اللہ میری سب خطاؤں کی مغفرت فرما۔ اے اللہ مجھے اچھے اعمال واخلاق کی طرف ہدایت کر۔

اس حدیث سے ثابت ہوگیا کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نہ فقط نماز فرض کے بعد بلکہ نماز نفل کے بعد بھی دعا کرتے اور دعا بھی اس قدر بلند آواز سے کرتے کہ صحابہ کرام اس کو سن لیتے، تو دعا کا کرنا جس طرح بعد فراغت نماز فعل رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت اسی طرح نوافل کے بعد بھی فعل رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ صورت مسئولہ میں جس دعا کا ذکر ہے وہ بعد نوافل ہی تو ہے۔ تو یہ دعا خلاف سنت کس طرح ہوئی اور جب حدیث میں بعد نوافل کے دعا کرنا فعل رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت ہے تو اس کو بدعت کہنا کیسے روا ہوگیا، تو جو اس دعا بعد نوافل کو خلاف سنت اور بدعت کہے وہ خود بدعتی وجہنمی ہے، اور فعل رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ناواقف ہے۔ مولی تعالیٰ اس کو قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔

اسی طرح درود شریف کا دعا کے ساتھ پڑھنا، یہ بھی کیسے ناجائز و بدعت ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں درود شریف پڑھنے کا اس طرح حکم فرماتا ہے۔

ان اللہ و ملئکتہ یصلون علی النبی یا ایھا الذین امنوا اصلوا علیہ و سلموا تسلیما۔

بیشک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم ان پر درود بھجو اور سلام بھیجو۔

اس آیت کریمہ میں درود شریف کے لئے کوئی خاص وقت معین نہیں کیا تو جس وقت بھی درود پڑھی جائے، وہ اسی حکم کی تعمیل ہوگی تو جو درود دعا پڑھا جائے گا، وہ اسی عموم حکم آیت کے تحت میں داخل

ہے اور حدیث شریف سے بھی جس طرح درود شریف کا نماز کے اندر پڑھنا ثابت ہے اسی طرح بعد نماز اس کا دعا کے ساتھ پڑھنا بھی ثابت ہے۔

چنانچہ ترمذی شریف، ابوداؤد اور نسائی میں حضرت فضالہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی انہوں نے کہا:

بینما رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم قاعد اذ دخل رجل فصلی فقال اللهم اغفرلی و ارحمنی فقال رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم عجلت ایها المصلی اذا صلیت فقعدت فاحمد الله بما هو اهله وصل علی ثم ادعه ثم صلی رجل آخر بعد ذلك فحمد الله وصلی علی النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم فقال له النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم ایها المصلی دع تجب۔ (مشکوۃ۔ص ۱۸۶)

اس درمیان کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اچانک ایک شخص آیا اور اس نے نماز پڑھی پھر کہا اے اللہ میری مغفرت کر اور مجھ پر رحم فرما تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اے نمازی تو نے عجلت کی جب تو نماز پڑھ چکے تو بیٹھ اور اللہ کی حمد کر جس کا وہ اہل ہے اور مجھ پر درود پڑھ، پھر خدا سے دعا کر، راوی نے کہا پھر ایک دوسرا شخص اس کے بعد آیا اس نے اللہ کی حمد کی اور نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر درود پڑھا تو اس سے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اے نمازی دعا طلب کر قبول کی جائے گی۔

اس حدیث سے ثابت ہو گیا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب آداب دعا تعلیم فرمائے تو یہ ترتیب بتائی کہ پہلے حمد وثنا ہو پھر درود شریف پڑھا جائے اس کے بعد دعا کی جائے۔ نیز یہ درود شریف قبول دعا کا ذریعہ اور حصول مقاصد کا وسیلہ ہے، جیسا کہ ترمذی کی حدیث شریف میں ہے کہ حضرت امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

ان الدعاء موقوف بین السماء والارض لا یصعد منها شی حتی تصلی علی نبیك۔

بیشک دعا آسمان وزمین میں روک دی جاتی ہے اس کا کوئی حصہ اوپر نہیں چڑھتا، یہاں تک کہ تم اپنے نبی پر درود پڑھو۔

تو درود شریف کا قبل دعا کیلئے زیادہ مناسب ہوا اسی بنا پر اہل اعمال درود شریف کو دعا سے پہلے بھی پڑھتے ہیں اور بعد میں بھی پڑھتے ہیں، ۔ لہذا درود شریف کا فاتحہ کے ساتھ پڑھنا جو خود دعا بھی ہے

اور حمد پر بھی مشتمل ہے۔ اسی طرح اس کا بعد دعا پڑھنا نہ خلاف سنت ہوا نہ بدعت ضلالت تو جو اس کو باوجود ان روشن دلائل آیت واحادیث کے محض اپنی ناقص عقل سے خلاف سنت اور بدعت کہتا ہے وہ خود جہنمی ہونے کی تیاری کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو بدعتی قرار دیتا ہے، اب باقی رہا جمعہ وعیدین کے بعد کا مصافحہ اس میں کوئی مسلمان تو کوئی بحث کر نہیں سکتا، کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے: تصا فحو یذ ھب الغل۔ (مشکوۃ ص ۴۰۱)

یعنی مصافحہ کرو کہ وہ حسد کو دور کرتا ہے۔

فقہ کی مشہور کتاب طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے۔ المصافحة سنة فی سائر الاوقات۔ یعنی مصافحہ سنت تمام اوقات میں ہی سنت ہے، تو جمعہ اور عیدین کے بعد کا وقت بھی منجملہ اوقات کے ایک وقت ہی تو ہے۔ اس میں مصافحہ کس طرح مخالف سنت ہوسکتا ہے، چنانچہ "وشاح الجید فی معانقة العید" میں بحوالہ تکمیل شرح اربعین منقول ہے۔

مشروعية المصافحة مطلقا اعم من ان تکون عقيب الصلوات الخمس والجمعة و العيدين وغير ذالك لان النبی صلی الله تعالیٰ عليه وسلم لم يقيد ها لوقت دون وقت۔

مطلقا مصافحہ کا جائز ہونا اس کو اعم ہے، کہ وہ پانچوں نمازوں اور جمعہ اور عیدین کے بعد ہو۔ اس لئے کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو کسی خاص وقت کے ساتھ مقید نہیں کیا۔

ان دلائل سے ثابت ہوگیا کہ پنج وقتہ نمازوں اور جمعہ وعیدین کے بعد کا مصافحہ بلاشک جائز و فعل سنت ہے اور عموم حکم حدیث شریف کے تحت میں داخل ہے، تو جو اس کے خلاف سنت اور بدعت ضلالت قرار دیتا ہے وہ مخالف سنت اور بدعتی ہے، اور وہ جائز امور کو محض اپنی رائے سے ناجائز ٹھہرا کر خود جہنمی بنتا ہے۔

بالجملہ ان چاروں امور کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔ انکے ناجائز و بدعت کہنے والے کے پاس عدم جواز کی کوئی صریح دلیل موجود نہیں ہے، محض اپنی ناقص عقل سے ان چار امور کو ناجائز اور بدعت کہتا ہے، مولی تعالیٰ اس کو قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل
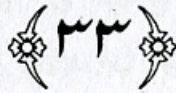
باب القران والتفسیر

هوالقادر

مسئلہ (۵۰۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس شخص کے بارے میں جس نے تفسیر قرآن کے نام پر بلغۃ الحیوان نامی ایک کتاب لکھی اوراس کے صفحہ۲ پر

فاتوا بسورۃ من مثلہ

کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا

(۱) اس جگہ مفسرین یہ معنی کرتے ہیں کہ قرآن بلیغ وفصیح کلام ہے اس کی مثل کوئی ایسا بلیغ اور فصیح کلام لاؤ۔ لیکن خیال کرنا چاہئے کہ کفار کو عاجز کرنا کوئی فصاحت سے نہ تھا کیونکہ قرآن خاص واسطے کفار فصحاء وبلغاء کے نہیں آیا تھا۔ اور یہ کمال بھی نہیں ہے انتہی بلفظہ۔ تو کیا احناف اہل سنت کے مذہب میں قرآن کریم کی فصاحت کا اس طرح انکار جائز ہے؟۔

(۲) صفحہ ۱۵ سطر ۳ پر لکھا

وادخلو الباب سجدا

میں باب سے مراد مسجد کا دروازہ ہے جو کہ نزدیک تھا اور باقی تفسیروں کا کذب ہے انتہی بلفظہ۔
کیا مفسرین کرام کو کاذب کہنا درست ہے اور اگر نہیں تو قائل کا کیا حکم ہے؟۔

(۳) صفحہ ۱۵ سطر ۲۰ پر سورہ بقرہ میں

فقلنا اضربوہ ببعضھا

کی تفسیر میں لکھا مفسرین نے تو یہ کہا ہے کہ انہوں نے نفس کو قتل کیا تھا اور قاتل معلوم نہ ہوا تھا لہذا امر کیا کہ ایسے بقرہ کو ذبح کر کے اس قتیل کو مارو تو وہ زندہ ہو جائیگا اور پھر اپنے قاتل کا نام بتائیگا۔ اس وقت بعضھا کی ضمیر بقرہ کی طرف راجع ہوگی۔ لکھا اصل میں یہ بات غلط ہے چونکہ حکم ذبح اور ذبح کے درمیان چالیس برس کا فاصلہ آ گیا تھا۔ تو وہ قتیل اتنی مدت کس طرح پڑا رہ سکتا ہے۔ انتہی بلفظہ

کیا یہ تفسیر درست ہے اور اگر نہیں تو اس مفسر کا کیا حکم ہے۔

(۴) صفحہ ۴۳ پر آیۃ الکرسی کی تفسیر کے بعد لکھا۔ اور طاغوت کا معنیٰ کلما عبد من دون الله فهو الطاغوت معنیٰ کے بموجب طاغوت جن اور ملائکہ اور رسولوں کو بولنا جائز ہوگا۔

پھر صفحہ ۲۴۳ پر لکھا کہ عبادت کے لائق ایک اللہ تعالیٰ ہے اور رسولوں کا کمال عذاب الٰہی سے نجات پالینا ہے انتہیٰ بلفظہ۔

کیا یہ مرسلین کی توہین وتنقیص نہیں ہے۔ اور کیا عام صالح امتی عذاب الٰہی سے نجات نہ پائینگے

(۵) صفحہ ۱۵۷ پر سورۂ ھود کی تفسیر میں لکھا: کل فی کتاب مبین۔ یہ علیحدہ جملہ ہے ماقبل کے ساتھ متعلق نہیں تاکہ یہ لازم آئے کہ اولاً تمام باتیں کتاب میں لکھی ہوئی ہیں جب کہ اہل سنت وجماعت کا مذہب ہے بلکہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تمہارے تمام اعمال لکھ رہے ہیں فرشتے۔

پھر اس کے بعد معتزلہ کا مذہب بیان کر کے لکھا: اور اللہ کو پہلے اس سے کوئی علم نہیں کہ کیا کریں گے بلکہ اللہ کو ان کے کرنے کے بعد معلوم ہوگا۔ اور آیات قرآنیہ جیسا کہ ولیعلم الذین وغیرہ بھی اور احادیث کے الفاظ بھی اس مذہب پر منطبق ہیں انتہیٰ بلفظہ۔

کیا یہ علم باری تعالیٰ کی تنقیص وآیات قرآنیہ واحادیث نبویہ کی تکذیب اور تمام کتب عقائد کی تغلیط نہیں؟۔

(۶) صفحہ ۲۰۵ پر سورۂ کہف میں یاجوج ماجوج کا قصہ بیان کر کے آخر میں لکھا: باقی امور یاجوج کی پوری تفصیل آگے ذکر کی جائیگی اور معلوم ہوتا ہے کہ کافر اور انگریز مراد ہیں۔ انتھیٰ بلفظہ۔

کیا یہ مرزائوں کی موافقت اور یاجوج ماجوج کے متعلق وارد روایات کے خلاف نہیں ہے۔

(۷) صفحہ ۶۶ سورۂ احزاب میں لکھا

ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی سے لیکر اثماً مبینا تک اول تو مؤمنوں کو کو کہا گیا کہ تم آفریں آفریں کرو۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اور ملائکہ آفریں کر رہے ہیں کہ یا رسول تو نے اپنے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی ہے یہ معنیٰ مثنوی والا نے کئے ہیں انتھیٰ بلفظہ

کیا آیت مذکورہ کی یہ تفسیر درست ہے۔

(۸) صفحہ ۲۶۷ سورۂ احزاب میں لکھا: اے مومنو! اگر نکاح کرو مومنات کے ساتھ خواہ متبنیٰ کی عورت ہو یا نہ ہو اور قبل الدخول طلاق دو تو اس عورت پر عدت لازم نہ ہوگی جیسا کہ زینب کو طلاق قبل

الدخول دی گئی اور رسول اللہ نے اس کو بلاعدت نکاح کرلیا انتھیٰ بلفظہ

کیا یہ احناف اہل سنت کی کھلی ہوئی مخالفت نہیں اور حضور پر غلط الزام نہیں لگایا گیا؟۔

جواب طلب امر یہ ہے کہ اس مصنف کے شاگرد مولوی اور معتقدین اس کتاب کی اشاعت کرتے اور اپنی تقریر وتحریر میں ہر طرح اس کا پروپیگندہ کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اہل سنت وجماعت کا صحیح مذہب یہی ہے اور ہم لوگ حنفی سنی ہیں تو کیا حقیقتاً ایسے نظریات رکھنے والے لوگ حنفی سنی کہلائے جانے کے مستحق ہیں یا کچھ اور؟۔ بینوا بالدلیل توجروا عند الجلیل والسلام خیر ختام

محمد احمد قادری ۸/۱۰ انائٹ روڈ لاسلگرتی راولپنڈی ۲۳ اپریل ۱۹۵۷ء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

الحمد للہ وکفیٰ والصلوۃ علی من اصطفیٰ وعلی آلہ وصحبہ وعلی من اجتبیٰ

امابعد سوالات کے جوابات سے پہلے چند مقدمات پیش کیئے جاتے ہیں جن کے سمجھ لینے کے بعد جوابات کے سمجھنے میں بہت کچھ آسانی ہوجائے گی۔

مقدمہ اولیٰ: تفسیر باب تفعیل کا مصدر ہے اس کے لغوی معنیٰ بیان کرنے اور کھول دینے کے ہیں اور یہ فسر سے مشتق ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی اتقان فی علوم القرآن میں فرماتے ہیں:

التفسیر من الفسر وھو البیان والکشف " (اتقان المصریٰ صفحہ ۱۸۳)

تفسیر خازن میں ہے: اما التفسیر فاصلہ فی اللغة من الفسر وھو کشف ما غطی وھو البیان المعانی المعقولہ فکل مایعرف بہ الشئی ومعناہ فھو تفسیر

تو لغت میں تو تفسیر کے معنیٰ پوشیدہ معانی کا بیان کردینا ہے تو وہ ہر شئی جس سے معنیٰ کی معرفت حاصل ہو تو وہ لغۃً تفسیری کہلائیگی۔ اور شرعاً تفسیر کے معنیٰ جامع العلوم میں ہے۔

وفی الشرع توضیح معنیٰ کی معنی الآیة وشانھا وقصتھاو السبب الذی نزلت فیہ بلفظ یدل علیہ دلالة ظاھرة التفسیربیان مرادا لمتکلم۔ (جلد ا صفحہ ۳۳۰)

جلالین کے حاشیہ جمل میں ہے:

التفسیر تعین معنیٰ اللفظ بواسطة نقل من قرآن او سنہ او اثر او بواسطة التخریج علی القواعد الادبیة (وفیہ ایضا) التفسیر کشھادة علی اللہ وقطع بانہ عنی بھذا اللفظ ھذا

المعنیٰ ولایجوز الابتوقیف ولذا جزم الحاکم بان تفسیر الصحابی مطلقا فی حکم المرفوع۔

اشعۃ اللمعات میں ہے: تفسیر آنکہ جزم کند کہ مراد حق ہمیں است ایں معنی جز بنقل از ائمہ اہل تفسیر کہ برسد سند آنحضرت رسالت درست نباشد۔ (اشعہ جلد اصفحہ ۱۶۵)

ان عبارات کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ شریعت میں تفسیر کے یہ معنیٰ ہیں کہ آیات کے معنیٰ کو اور اس کی شان اور قصہ کو اور اس سبب کو جس میں وہ نازل ہوئی اسے الفاظ میں واضح کرنا جو ظاہر طور پر دلالت کریں۔ یا بتوسط قرآن وحدیث واثر کے یا بواسطہ تخریج بقواعد عربیہ لفظ کے معنیٰ کو متعین کرنے اور مراد متکلم کے بیان کرنے کو تفسیر کہتے ہیں۔ تو تفسیر اللہ تعالیٰ پر شہادت کے مثل ہے اور اس پر یقین کر لینا ہے کہ اللہ نے اس لفظ کے یہی معنیٰ مراد لئے ہیں تو تفسیر بلا توقیف کے جائز ہوئی۔ اور وہ ائمہ تفسیر کی بغیر اور سند کے درست نہیں ہوسکتی بالجملہ تفسیر کے لغوی وشرعی معنیٰ سلف وخلف نے یہ بیان فرمائے ہیں جس میں کسی کو مجال سخن وجائے رفتن باقی نہیں ہے۔

مقدمہ ثانیہ: اتقان میں ہے:

یجوز تفسیره لمن کان جامعا للعلوم التی یحتاج المفسر الیها وهی خمسة عشر علما احدها اللغة الثانی النحو الثالث التصریف الرابع الاشتقاق الخامس المعانی السادس البیان السابع البدیع الثامن علم القرأت التاسع اصول الفقه العاشر اسباب النزول الحادی العشر القصص الثانی عشر الناسخ والمنسوخ الثالث عشر الفقه الرابع عشر الاحادیث الخامس عشر علم الموهبة فهذه العلوم التی هی لازمة للمفسر ولا یکون مفسراً الا بتحصیلها۔ (ملخصاً اتقان جلد۲ صفحہ ۱۸۱)

اس عبارت سے ظاہر ہوگیا کہ جب تک ان پندرہ علوم لغت، نحو، صرف، اشتقاق، معانی، بیان، بدیع، علم قرأت، اصول فقہ، جامع اسباب نزول، قصص، ناسخ منسوخ، فقہ، حدیث علوم موہبہ کا تفسیر کرنے والا جامع نہ ہو اس کو تفسیر کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

مقدمہ ثالثہ: جو مفسر ان پندرہ علوم کا جامع بھی ہو جو مقدمہ ثانیہ میں مذکور ہوئے لیکن وہ بدمذہب مخالف سنت ہو تو شرعاً نہ وہ مفسر قرآن ہوسکتا ہے اور نہ اس کی تفسیر قابل اعتماد ہوسکتی ہے کہ شرائط مفسر سے اہم شرط عقیدہ کا صحیح ہونا ہے۔ اتقان میں ہے:

قال الامام ابو طالب الطبری فی اوائل تفسیرہ القول فی آداب المفسر اعلم ان من شرطہ صحۃ الاعتقاد اولا ولزوم سنۃ الدین فان من کان مغموصا علیہ فی دینہ لا یؤتمن علی الدنیا فکیف علی الدین ثم لا یؤ تمن فی الدین علی الاخبار عن عالم فکیف یوتمن فی الاخبار عن اسرار اللہ تعالیٰ ولا نہ لا یومن ان کان متھما بالالحاد ان یبغی الفتنۃ ویغر الناس بلیہ وخداعہ کداب الباطنیۃ وغلاۃ الرافضۃ وان کان متھما بھوی لم یومن ان یحملہ ھواہ کلما یوافق بدعتہ کداب القدریۃ فان احدھم یصنف الکتاب فی التفسیر ومقصودہ منہ الایضاح الساکن لیصدھم عن اتباع السلف وطریق الھدیٰ۔

(اتقان جلد۲ صفحہ ۱۷۶)

اس عبارت سے ظاہر ہوگیا کہ جو شخص بدعقیدہ ہو اور دین میں مطعون ہو تو جب وہ دین ہی میں معتمد نہیں ہوتا تو عین میں کیسے معتمد ہوگا اور وہ احکام قرآنی واسرار الٰہی میں کس طرح امین ہوسکتا ہے اور اس کی یہ تفسیر لوگوں کو محض دھوکہ دینے اور فتنہ میں مبتلا کرنے اور اتباع سلف سے روکنے کے لئے ہے تو اس سے فرق باطلہ مثلا رافضی، قادیانی چکڑالوی، دیوبندی، غیر مقلد، مودودی، نیچری کے مفسرین اور ان کی تفسیروں کا حکم ظاہر ہوگیا کہ وہ اپنی بدعقیدگی وگمراہی کی بناپر شرعا نہ تو وہ مفسر ہوسکتے ہیں نہ ان کی تفسیرین اہل اسلام کے لئے قابل استناد ولائق اعتماد ہوسکتی ہیں۔

مقدمہ رابعہ: قرآن کریم کی صحیح تفسیر وہ ہے جو قرآن وحدیث واقوال صحابہ وتابعین سے روایۃ ثابت ہو۔ اور بمقتضائے قواعد ادبیہ لغت، نحو، صرف، معانی، بیان، بدیع اور اصول اسلامی کے موافق ہو۔ اور جو تفسیر اپنے ناقص اجتہاد اور اپنی خواہش اور رائے سے ہو تو وہ شرعا تفسیر قرآن نہیں اسی کو تفسیر بالرائے بھی کہتے ہیں۔

اتقان میں ہے: قال الماتریدی التفسیر القطع علی ان المراد من اللفظ ھذا والشھادۃ علی اللہ انہ عنی باللفظ ھذا فان قام دلیل مقطوع بہ فصحیح والا فتفسیر بالرائے وھو المنھی عنہ۔

اسی میں ہے: لا یجوز تفسیر القرآن بمجرد الرائے والاجتہاد ومن غیر اصل

بلکہ اس تفسیر بالرائے کی ممانعت میں احادیث مروی ہیں۔

حدیث (۱) ترمذی میں ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی کہ رسول اللہ صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:"من قال فی القرآن برأیه فلیتبوأ مقعده من النار"
(مشکوۃ صفحہ ۳۵)

جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کہا تو چاہئے کہ وہ اپنے بیٹھنے کی جگہ دوزخ میں بنائے۔

حدیث (۲) من فسر القرآن برأیه فلیتبوأ مقعده من النار"
(رواہ فی مسند احمد از کنوز جلد۲ صفحہ ۱۷۵)

جس نے قرآن کی اپنی رائے سے تفسیر کی تو وہ دوزخ میں اپنی جائے نشست بنائے۔

علامہ محی السنۃ علاء الدین علی خازن لباب التاویل فی معانی التنزیل میں اسی حدیث کے تحت میں فرماتے ہیں:

قال العلماء المنهی عن القول فی القرآن بالرائے انما ورد فی حق من یتاول القرآن علی مراد نفسه وما هو تابع لهو اه وهذا لا یخلوا ما ان یکون من علم اولا فان کان بمن علم کمن یحتج ببعض آیات القرآن علی تصحیح بدعته وهو یعلم ان افرادا من الآیات غیر ذالکن غرضه ان یلبس علی خصمه بما یقوی حجته علی بدعته کما یستعمله الباطنیة والخوارج وغیر هم من اهل البدع فی المقاصد الفاسدة لیغروا بذلك الناس وان کان القول فی القرآن بغیر علم لکن عن جهل وذلك بان تکون الآیة محتملة لوجوه فیفسرها بغیر ما تحتمله من المعانی والوجوه فهذا ن القسمان مذمومان وکلا هما داخل فی النهی والوعید الوارد فی ذالك۔ (تفسیر خازن مصری جلد ۱، ۶)

یہاں تک کہ اس تفسیر بالرائے کی ممانعت میں ترمذی وابوداؤد میں حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

حدیث (۳) من قال فی القرآن برائیه فاصاب فقد اخطأ۔ (مشکوۃ شریف)

جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کہا اور درست وحق بات اس نے کہی تو بلاشبہ اس نے جب بھی خطا کی۔

اتقان میں اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

من قال فی القرآن قولا یوافق هواه ولم یاخذه عن ائمة السلف واصاب فقد اخطأ لحکمه علی القران بمالا یعرف اصله ولا یقف علی مذاهب اهل الاثر والنفل فیه۔

(اتقان جلد ۲ صفحہ ۸)

ان عبارات سے ظاہر ہوگیا کہ ایسی تفسیر بالرائے جو تفاسیر سلف کے خلاف ہو وہ نامقبول اور غیر معتمد ہے اور جس نے ایسی تفسیر بالرائے کی وہ گمراہ بدعتی بلکہ کافر ہے۔

اتقان میں ہے: من عدل عن مذاهب الصحابة والتابعين وتفسير هم الى ما يخالف ذلك كان مخطيا فى ذالك بل مبتدعا لانهم كانوا اعلم بتفسيره ومعانيه۔

(اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۷۸)

تفسیر حضرت محی الدین بن العربی میں ہے "من فسر برأيه فقد كفر"

ملا علی قاری کے شرح فقہ اکبر میں یہ حدیث مذکور ہے "من فسر القرآن برائيه فقد كفر"

(شرح فقہ اکبر صفحہ ۱۵۴)

یعنی جس نے قرآن کی تفسیر بالرائے کی تو وہ کافر ہوگیا۔

تو اب تفسیر بالرائے کرنے والے کا حکم حدیث شریف سے ثابت ہوگیا کہ وہ کافر ومرتد ہے۔ ان مقدمات کے سمجھ لینے کے بعد سوالات کے جوابات خود ہی سمجھ میں آجانے چاہئیں۔ لیکن مزید اطمینان کے لئے ہر سوال کا جواب تفصیلی طور پر بھی لکھدیا جاتا ہے۔

جواب سوال اول: قرآن کریم کی آیۃ فأتو بسورة من مثله کی تفسیر میں جو مفسرین سلف وخلف نے فرمایا کہ قرآن کریم اپنی فصاحت وبلاغت میں معجزہ ہے اور اس کا فصیح وبلیغ ہونا ہی ہمارے نبی کی نبوت کی روشن دلیل اور زبردست حجت ہے۔

تفسیر بیضاوی میں ہے: الحجة على نبوة محمد صلى الله تعالىٰ عليه وسلم هو القرآن المعجز بفصاحته التى بدت فصاحة كل منطق واقحامه من طولب بمعارصته من مصاقع الخطباء من العرباء مع كثرتهم وافر اطهم فى المضادة والمعارضة وتهالكهم على المعزة والمعارة وعرف ما يتعرف به اعجازه ويتقين انه من عند الله كما يدعيه۔

اور متحدی یہ حقیقۃً قرآن کا فصاحت وبلاغت میں بلاغت ہونا ہی ہے۔

تفسیر مدارک میں ہے: فيه دليلان على اثبات النبوة صحة كون المتحدى به معجزا والا خبار بانهم لن يفغلوا وهو غيب لا يعلمه الا الله۔

تو اس آیۃ کریمہ کی تفسیر تو یہی ہے جو ان مفسرین کرام نے تحریر فرمائی۔ اور اسی پر ہمیشہ سے اہل

اسلام کا اعتقاد رہا اور آج تک ہے۔

اب باقی رہا اس نام نہاد مفسر کا ان سب کے خلاف یہ کہنا ''لیکن خیال کرنا چاہئے کہ کفار کو عاجز کرنا کوئی فصاحت سے نہ تھا الخ'' خود نص قرآنی کے خلاف ہے کہ آیت میں (مثلہ) فرمایا گیا یعنی اسکی سورت لاؤ جو فصاحت و بلاغت میں حسن و ترتیب میں سورۂ قرآن کے مثل ہو۔ پھر اگر اس میں فصاحت و بلاغت ہی کا اعتبار نہ کیا جائے تو اس مفسر کے نزدیک ''مثلہ'' کا کلمہ ہی بیکار اور زائد قرار پاتا ہے اور کلام الٰہی میں یہ بات ممکن نہیں۔ پھر جب بقول اس کے کفار کا عاجز کرنا فصاحت کی بنا پر نہ تھا تو اگلی آیۃ میں ''لن تفعلوا'' کا ہمیشہ کے لئے دعوی کون سے عجز کی بنا پر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دعوی فصاحت و بلاغت میں مثل قرآن کے عاجز ہو جانے کی بنا ہی پر تو ہے تو اس جری مفسر نے قرآن کریم کا بھی مقابلہ کیا بلکہ اللہ عز وجل کی مخالفت بھی کی۔ اور جب یہ عجز دلیل نبوت اور سبب ظہور معجزہ بھی تھا تو یہ گمراہ مفسر نہ فقط فصاحت قرآن کا منکر بلکہ دلیل نبوت اور سبب ظہور معجزہ کا بھی منکر قرار پایا۔ لہٰذا جمہور مفسرین کی مخالفت کا یہ نتیجہ نکل آیا کہ وہ اپنا دین بھی کھو بیٹھا۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

جواب سوال دوم: آیۂ کریمہ وادخلو الباب سجدا میں باب کے متعلق چند اقوال منقول ہیں۔ اور ایک چیز میں مفسرین کے چند اقوال خصوصاً قصص میں اکثر اختلاف روایات کی بنا پر ہوتے ہیں کی قصہ میں رائے واجتہاد کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ سماعت پر موقوف ہوتا ہے۔

چنانچہ اتقان میں ہے: الثالث علوم علمها الله نبيه مما اودع كتابه من المعانى الجلية والخفية وامره بتعليمها وهذا ينقسم الى قسمين منه لا يجوز الكلام فيه الا بطريق السمع وهو اسباب النزول والناسخ والمنسوخ والقرأت واللغات وقصص الامم الماضية واخبار ما هو كائن من الحوادث وامورا لحشر والمعاد ومنه ما يوخذ بطريق النظر والاستدلال والاستنباط والاستخراج من الالفاظ الخ۔

(اتقان جلد۲ صفحہ۱۸۳)

تو جوبات سماعت بالروایت سے ثابت ہے اس کو اس نام نہاد مفسر کا کذب کہنا گویا اس روایت کو کذب قرار دینا ہے اور ثابت بالروایت کی تکذیب کرنے والے کے گمراہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لہذا یہ گمراہ مفسر حضرات مفسرین کرام کو کاذب کہہ کر خود کاذب و گمراہ قرار پایا بلکہ روایات کا منکر اور سلف وخلف کا مخالف ٹھہرا۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

جواب سوال سوم: مفسرین کرام نے فقلنا اضربوہ ببعضها کی تفسیر میں جو قصہ تفصیلی تحریر فرمایا ہے وہ درست اور صحیح ہے اور اس کو روایات سے اخذ کیا گیا ہے۔ اور اجمالی قصہ تو خود قرآن میں بھی موجود ہے جس کا مطلقا انکار کوئی مسلمان تو کر ہی نہیں سکتا۔ اور یہ نام نہاد مفسر اسکا انکار محض اپنی ناقص رائے سے کرتا ہے۔ اور یہ کہتا ہے کہ وہ قتیل چالیس برس کی مدت تک کس طرح رہ سکتا ہے تو یہ مفسر نہ فقط روایت ہی کا انکار کرتا ہے بلکہ خود منصوص فی القرآن کا بھی انکار کر رہا ہے۔ نیز جب اس کے نزدیک چالیس سال کے فاصلہ کے بعد مردہ کا زندہ ہونا قابل انکار ہے تو وہ سو برس کے پڑے رہنے کے بعد مردے کے زندہ ہوجانے پر کس طرح ایمان لائیگا۔ لہٰذا اس گمراہ مفسر کے نزدیک حضرت عزیر علیہ السلام اور ان کے گدھے کا سو برس کے بعد زندہ ہونا بدرجہ اولیٰ غلط ہوگا۔ اور حضرت مسیح علیہ السلام کا صدہا برس پڑے رہنے کے بعد مردوں کا زندہ کرنا بالکل ہی غلط قرار پائیگا باوجودیکہ ایسے احیاء موتی کے واقعات قرآن کریم میں موجود ہیں۔ تو یہ مفسر بلاشبہ گمراہ و بیدین ہوا کہ ثابت الروایت بلکہ منصوص فی القرآن کو وہ کس دلیری وجرأت سے غلط کہتا ہے اور محض اپنی رائے سے ان کی تغلیط کرتا ہے العیاذ باللہ تعالیٰ

جواب سوال چہارم:۔ مفسرین نے طاغوت کے معنی کل عبد من دون اللہ بیان کر کے شیطان وبت مراد لئے ہیں۔

تفسیر جلالین میں ہے: فمن یکفر بالطاغوت الشیطان او الاصنام

تفسیر مدارک التنزیل میں ہے: فمن یکفر بالطاغوت بالشیطان او الا الصنام

حضرات ملائکہ کرام ومرسلین عظام پر تو کسی طرح لفظ طاغوت کا اطلاق جائز نہیں ہوسکتا کہ آیۃ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے "فمن یکفر با لطاغوت ویومن باللہ فقد استمسك بالعروۃ الوثقی یعنی تو جو شیطان کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے بڑی محکم گرہ تھامی۔

تو اس آیۃ کریمہ میں کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ میں صفت تقابل ہے اور کفر بالطاغوت ایمان باللہ پر مقدم ہے۔ اور دوسری آیت میں یہ فرمایا گیا:

یا ایها الذین آمنو آمنو باللہ ورسوله والکتاب الذی نزل علی رسوله والکتب الذی انزل من قبل ط ومن یکفر باللہ وملکته وکتبه ورسله والیوم الآخر فقد ضل ضلالا بعیدا۔

(سورۃ النساء ع ۲۰)

یعنی اے ایمان والو ایمان رکھو اللہ اور اس کے رسول پر اور اس کی کتاب جو اپنے ان رسولوں پر

اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جو اللہ اور اس کے فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں اور قیامت کے ساتھ کفر کرے تو وہ دور کی گمراہی میں ضرور پڑا۔

اس آیت کریمہ سے یہ ثابت ہوا کہ ایمان بالملٰئکۃ والرسل ایمان باللہ ہی میں داخل ہے تو وہ کفر بالطاغوت پر مقدم قرار پایا اور اس کا مقابل ٹھہرا۔ اب ٹھنڈے دل سے فیصلہ کیجئے کہ اگر بقول اس گمراہ مفسر کے لفظ طاغوت ملائکہ اور رسولوں کو بھی شامل ہوتا تو نہ ایمان بالملٰئکۃ والرسل ایمان باللہ ہی میں داخل ہوتا نہ کفر بالملٰئکۃ والرسل کفر باللہ قرار پاتا بلکہ ایمان بالملائکہ والرسل کفر باللہ کے ساتھ جمع ہوتا اور کفر بالملائکہ والرسل ایمان باللہ کے ساتھ پایا جاتا جسا کہ کفر بالطاغوت ایمان باللہ کے ساتھ آیۃ اولیٰ میں جمع ہے بلکہ ایمان باللہ کا مقابل کفر بالملائکہ والرسل ہوتا۔ اور ایمان باللہ پر کفر بالملائکہ والرسل مقدم ہوتا۔ تو اس صورت میں کس قدر ایمانیات وعقائد اسلام وآیات قرآن سے انکار لازم آتا ہے علاوہ بریں حضرات ملائکہ کرام ومرسلین عظام کو طاغوت میں داخل کر کے ان کا شیاطین واصنام کے ساتھ ذکر سخت بے ادبی وگستاخی ہے اور ملائکہ ورسل کی تنقیص شان کو مستلزم ہے اور رسولوں میں صرف اس قدر کمال ماننا کہ وہ عذاب الٰہی سے نجات پا لیتے ہیں ان کے علو مراتب اور فضائل خاصہ سے صاف انکار ہے۔ لہٰذا اس گمراہ مفسر نے مرسلین کی نہ صرف ایک توہین وتنقیص شان کی بلکہ چند توہینیں اور تنقیصیں کیں تو یہ مفسر شان ملائکہ ومرسلین کا سخت گستاخ وبے ادب ثابت ہوا۔

جواب سوال پنجم: ۔ کتاب مبین کو تمام باتوں کا جامع نہ ماننا قرآن کریم کی تکذیب ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ولا حبۃ فی ظلمٰت الارض ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین

یعنی کوئی دانہ نہیں زمیں کی اندھیریوں میں اور نہ کوئی تر اور خشک جو ایک کتاب مبین میں لکھا ہو۔

اس آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہے کہ ہر تر اور خشک کتاب مبین میں لکھا ہوا ہے تو اس مفسر نے اس طرح کثیر آیات کا انکار کیا۔ اور اس سے زیادہ بدتر اس کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اعمال ان کے کرنے سے پہلے کا کوئی علم نہیں کہ لوگ کیا عمل کریں گے بلکہ اللہ کو ان کے کرنے کے بعد معلوم ہوگا۔ لہٰذا اس بیدین مفسر نے اپنے اس قول میں علم الٰہی کی صریح توہین وتنقیص کی اور کثیر آیات واحادیث سے صاف انکار کیا۔ اور کتب عقائد کی تکذیب کی تو اس مفسر کے کافر وبیدین ہونے میں کیا شبہ باقی رہا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

جواب سوال ششم: ۔ یاجوج ماجوج سے کافر اور انگریز مراد لینا بھی تفسیر بالرائے ہے اور اسکی

تفسیر سے بلاشک ان تمام آیات واحادیث کی تکذیب اور انکار لازم آتا ہے جن میں ان کے نام اور پھر ان کے احوال وارد ہیں اس سے اس مفسر کی دلیری وجرأت کا پتہ چلا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

جواب سوال ہفتم:۔ آیہ کریمہ ان اللہ و ملئکتہ یصلون علی النبی الآیۃ
کی جو تفسیر اس نام نہاد مفسر نے لکھی یہ بھی تفسیر بالرائے ہے میری نظر سے کسی تفسیر میں نہیں گذرا تو اس تفسیر کے نادرست ہونے کے لئے اس قدر بات کافی ہے کہ یہ تفسیر بالرائے معلوم ہوتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

جواب سوال ہشتم:۔ سورۂ احزاب میں یہ فرمایا گیا:

یا ایھا الذین آمنوا اذا نکحتم المؤمنٰت ثم طلقتموھن من قبل ان تمسوھن فما لکم علیھن من عدۃ تعتدونھا

یعنی ایمان والو جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو پھر انہیں بے ہاتھ لگائے چھوڑ دو تو تمہارے لئے ان پر کچھ عدت نہیں جسے گنو اس آیہ کریمہ سے یہ معلوم ہوا کہ عورت کو اگر قبل قربت یا خلوت صحیحہ کے طلاق دی تو اس پر عدت واجب نہیں۔ لیکن اس مفسر کا کس بے ادبی سے یہ کہنا بلکہ یہ اقرار کرنا کہ زینب کو طلاق بالدخول دی گئی۔ اولاً اس نے حضرت ام المؤ منین زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا اسم گرامی کس گستاخی کے ساتھ لکھا کہ تعظیم کا کوئی کلمہ اول وآخیر کہیں نہیں لکھا ثانیاً یہ صریح کذب ہے کہ ان کو طلاق قبل دخول دی گئی کتب سیر میں ہے کہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت زینب سے نکاح ہجرت سے اٹھ سال قبل کیا تھا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حضرت زینب سے نکاح ہجرت کے پانچ یا چار یا تین سال بعد کیا ہے۔ تفسیر جمل میں ہے:

و کان تزوج زید بزینب قبل الھجرۃ بنحو ثمان سنین

اور مواہب لدنیہ اور زرقانی میں ہے:

و کان تزوجھا لہ صلی اللہ علیہ و سلم فی سنۃ خمس من الھجرۃ و قیل سنۃ اربع وقیل سنۃ ثلث۔

تو اس بنا پر حضرت زینب حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ۱۱ یا ۱۲ یا ۱۳ سال کی مدت تک رہیں۔ چنانچہ مواہب میں ہے "فمکثت عندہ مدۃ ثم طلقھا" یعنی حضرت زینب حضرت زید کے پاس ایک مدت تک رہیں پھر حضرت زید نے انہیں طلاق دی تو کیا اس دراز مدت تک ان میں زن وشوہر

کے تعلقات نہ رہے اور دخول یا خلوۃ صحیحہ کی نوبت ہی نہیں آئی ۔ یہ کس قدر بعید از عقل بات کہی۔ اور حقیقت یہ تھی کہ ان کے مابین ایسی نوبت آئی اور بار و بار آئی ۔ چنانچہ تفسیر خازن و جمل وغیرہ تحت آیہ کریمہ فلما قضی زید منها و طرا کے تحت میں فرماتے ہیں:

و طلقها و انقضت عدتها و ذکر قضاء الوطر یعلم ان زوجة المتبنی تحل بعد دخول بها۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہو گیا کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق بعد دخول دی گئی اب ملاحظہ ہو کہ یہ مفسر کیا سخت کاذب اور افترا پرداز اور بہتان طراز ثابت ہوا۔

ثالثا: اس مفسر کا یہ قول (اور رسول صلعم نے آپ کو بلا عدت نکاح کر لیا) کیا صریح افترا اور بہتان اور کتنا جیتا جھوٹ ہے بلکہ تمام مفسرین واصحاب سیر کی تصریحات کے خلاف ہے واقعہ یہی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب سے عدت گذر جانے کے بعد عقد کیا ہے تو اس بیدین مفسر نے احکام دینیہ کی کیسی کھل کر مخالفت کی ۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا ناپاک الزام اور صریح افترا اور بہتان لگایا۔ اور بموجب حدیث شریف " من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعده من النار " کے وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنایا۔

بالجملہ یہ گمراہ مفسر ہرگز ہرگز نہ سنی ہے نہ حنفی بلکہ مذہب اہل سنت سے خارج اور سخت گمراہ وضال ومضل ہے۔ اور اس کی یہ تفسیر سخت گمراہ اور مخالف عقائد واحکام اسلام ہے ۔ اور سلف وخلف مفسرین کے خلاف تفسیر بالرائے ہے۔ تو اس کی اشاعت کرنا اور اس کے متعلق پروپیگنڈہ کرنا یقیناً گمراہی اور بیدینی کی اشاعت کرنا ہے۔ اور عقائد واحکام اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا ہے۔ اہل اسلام ایسی غلط و باطل تفسیر کو ہرگز ہرگز نہ دیکھیں ۔ اور اس کے مطالعہ سے انتہائی اجتناب و پرہیز کریں ۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب ۲۸ شوال المکرم ۱۳۷۶ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۰۹)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

بعض روایات میں ہے کہ رزق، عمر، موت، حیات وغیرہ شعبان کی پندرہویں شب میں

امور ملائکہ کو اللہ تعالیٰ تقسیم کرتا ہے اور مغرب کے بعد سے رحمت الٰہی بندوں کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور بعض روایات میں ہے کہ رمضان شریف کی ستائیسویں تاریخ کی رات ہے دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان دونوں تاریخوں میں کونسی تاریخ ہے کہ جس میں سال بھر کا حساب ملا کر سونپ دیا جاتا ہے۔

﴿انا انزلناه فی لیلة القدر﴾ کی تفسیر میں لیلۃ القدر اس لئے نام رکھا گیا کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ امور رزاق احکام کی تقدیر ملائکہ پر ظاہر کر دیتا ہے اور احادیث میں بھی اس شب کو رمضان المبارک میں آخری عشرہ میں بیان کیا ہے۔

اور پچیسویں پارے سورۂ دخان میں ﴿حم الکتاب المبین انا انزلناه فی لیلة مبارکة﴾ کی تفسیر میں بھی کہا ہے کہ ھی لیلۃ النصف من شعبان۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ کی حدیث آگے بیان کی ہے رحمت باری آسمان دنیا پر نازل ہوتی ہے اور ندا کرتی ہے بندوں کو نیز قرآن کریم کے نازل کرنے کو فرمایا ہے کہ اس رات میں جملہ واحدۃ آسمان دنیا پر نازل کر دیا گیا پھر ضرورت کے مطابق حضور پر اترتا رہا (لیلۃ المبارک اور لیلۃ القدر کو ایک ہی کہا گیا ہے نیز اس شب میں جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عبادت مروی ہے وہ بھی تحریر کی جائے جیسا کہ بعض روایات میں ہے۔ دس بھی ہیں دو نفل بھی ہیں سو نفل بھی ہیں۔ بینوا توجروا

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

سورہ دخان کی آیۃ کریمہ ﴿حم والکتاب المبین انا انزلناه فی لیلة مبارکة﴾ میں لیلۂ مبارکہ کی تفسیر میں مختلف اقوال وارد ہیں بعض کے نزدیک اس سے مراد شب برائت ہے لیکن جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے مراد لیلۃ القدر ہے۔

تفسیر مدارک میں ہے ﴿لیلة مبارکة﴾ ای لیلة القدر او لیلة النصف من شعبان والجمھور علی الاول "

تفسیر جمل میں ہے " اختلف فی قوله تعالیٰ فی لیلة مبارکة فقال قتادة وابن زید واکثر المفسرین وھی لیلة القدر وقال عکرمة وطائفة انھا لیلة البرأة وھی لیلة النصف من شعبان۔

تفسیر صاوی میں ہے:

" ان انزلناه فی لیلة مبارکة " هی لیلة القدر هذا قول قتادة و ابن زید واکثر المفسرین ثم قال بعد ادلة هذا القول) هذا ادلة ظاهرة واضحة علی انها لیلة القدر وهو المعتمد "

ان تفاسیر سے یہ ثابت ہوگیا کہ وہ قول معتمد جس پر جمہور مفسرین ہیں وہ یہی ہے کہ لیلۃ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہے پھر جب اس کا لیلۃ القدر ہونا ثابت ہوگیا تو پھر رزق، عمر، موت، حیات سال بھر کے حساب کا ملائکہ کو سونپ دینا اس شب کے لئے بھی ثابت ہوگیا۔

چنانچہ تفسیر خازن میں ہے "قال ابن عباس یکتب من ام الکتاب فی لیلة القدر مع ہو کائن فی السنة من الخیر و الشر والارزاق والآجال حتی الحجاج'

'نیز بعض روایات سے ان امور کا شب برأت میں سونپنا بھی ثابت ہے چنانچہ ماثبت من السنۃ میں ہے "قال عکرمة فی لیلة نصف من شعبان یبرم امر السنة وینسخ الاحیاء ویکتب الحاج فلا یزاد فیهم احد ولا ینقص منهم احدا "

تو سلف وخلف نے ان مختلف روایات میں اس طرح تطبیق کردی ہے کہ ان امور کے سونپنے کی ابتدا تو شب برأت سے کردی جاتی ہے اور اس سے فراغت لیلۃ القدر میں حاصل ہوجاتی ہے۔

چنانچہ ماثبت من السنۃ میں ہے " اکثر اهل العلم الیٰ ان ذالك یکون فی لیلة القدر والابتداء فیه یکون من لیلة النصف من شعبان "

تفسیر جمل میں ہے " وقیل یبدأ فی استنساخ ذالك من اللوح المحفوظ فی لیلة البرأة ویقع الفراغ فی لیلة القدر ۔

بالجملہ ان امور کا سونپنا ان دونوں شبوں کے لئے ثابت ہوگیا اگر چہ یہ امر محقق ہے کہ شب قدر شب برأت سے افضل ہے۔ شب برأت میں نوافل کی تعداد میں مختلف احادیث وارد ہیں بعض میں چودہ رکعات ہیں بعض میں ایک سو رکعات ہیں پھر محدثین نے خود ان روایات میں کلام کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۱۰)

هل يجوز للصبيان ان تهدى ثواب قرأة القرآن للميت وان يو مر وابه ا م لا ۔

الجواب

نحمده ونصلى ونسلم على رسوله الكريم

قرآة القرآن للصبى حسنة اذلا ذنوب عليه حتى تكفر بها فيثاب على الحسنات ولا جل ذلك صرح فى الفتا وىٰ السرا جية والخانية اذا فعل الصغير شيًا من الحسنات تكو ن لـه واهـدا ئه للميت ثواب قرآة القرآن ايضا حسنة له اذ هو فعل الصحابة كما اخرج الخلال فى الجامع عن الشعبى قال كانت الانصار اذامات لهم ا لميت اختلفوا الى قبره بقر ؤن له القرآن ووقع عليه اجما ع المسلمين كما نقله العلا مة السيوطى فى شرح الـصـدوران المسلمين مازا لوافى كل عصر يجتمعون ويقرؤن لمو تاهم من غير نكير فكان ذلك اجماعا بل ورد فى الحديث ان هدية الا حياء الى الا موات الا ستغفار لهم ورائه البيهقى فى شعب الايمان و الد يلمى عن ابن عباس وروى الطبرانى فى الا وسط و البيهقى فى السنن عن ابى هريرة قال: قال رسو ل الله تعا لىٰ صلى الله تعالىٰ عليه وسلم ان الله لير فع الدر جة للعبد الصالح فى الجنة فيقو ل يارب انى لى هذه فيقـول با ستغفار ولدك لك ولفظ البيهقى بد عاء ولد ك لك فظهر لك ان اهدا ء الصبى ثواب القرا ء ةوالدعا ء والاستغفار للميت حسن له وثابت من عمل الصحابة و الاجما ع والا حاديث ونافعة للاموات على ان فى هذه لا ضرر عليه بل له منفعة عظيمة لحديث مروى فى الفتا وى الخانية حسناته تكون لابويه لما روى عن انس بن مالك انه قال من جملة ما ينتفع به المرء بعد موته ان يترك ولدا علمه القر آن والعلم فيكو ن لـوالـده اجر ذالك من غير ان ينقص من اجر الولد شىء واخرج ابو محمد السمر قندى فى فضا ئل قل هوالله احدعن على مرفوعا من مر على المقا بر وقرأ قل هوالله ا حد احدى عشرة مرة ثم وهب اجره للاموات اعطى من الاجر بعد دالاموات وايضا ان الصبي يومر باهداء ثواب القرأة للميت لانه حسنة له ويومر الصبى للحسنات كما فى رد المحتار انه يومر بجميع الماموارات وينهى عن جميع المنهيات

فهذا غاية التحقيق فی هذه المسئلة : والله تعالی اعلم بالصواب ؛

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۱۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

اگر زید بکر سے کہے کہ ایک قرآن شریف پڑھ کر میرے باپ کی روح کو اس کا ثواب بخش دیجئے میں آپ کی کچھ خدمت کروں گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ زید نے بکر سے کہا کہ آپ ایک قرآن شریف پڑھ کر میرے والد کی روح کو اس کا ثواب بخش دیجئے اور فلاں روز ان کا چہلم ہے اور فاتحہ میں بھی شریک ہو جایئے جب فاتحہ کے بعد بکر اپنے مکان کو آنے لگا تو زید نے معافی وغیرہ مانگی جیسا کہ عام رواج ہے اور مصافحہ کرتے ہوئے بکر کو دس بارہ یا پانچ چھ روپیہ دیے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ زید نے بکر سے کہا میرے والد کا انتقال ہو گیا ہے ان کے لئے ایک قرآن پڑھ کر ثواب بخش دیجئے۔ بکر نے قرآن شریف پڑھ کر مردہ کی روح کو اس کا ثواب بخش دیا۔ اس کے بعد بکر زید کو ملا تو پوچھا کیوں صاحب آپ نے قرآن ختم کر لیا یا ابھی نہیں؟ بکر نے کہا جی ہاں فلاں روز ختم ہو گیا ہے تو زید نے شیرینی دی کہ اسے بچوں میں تقسیم کر دینا اور چھ روپیہ دیے کہ یہ آپ کے لئے ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے ان تمام صورتوں میں بکر کو کچھ لینا جائز ہے یا نا جائز۔ بینوا توجروا۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الكريم

ان تینوں صورتوں میں اگر زید بغرض اجرت دے رہا ہے اور بکر بھی بخیال اجرت لے رہا ہے تو ایسی اجرت ناجائز ہے نہ میت کو اس تلاوت کا ثواب پہنچے۔

ردالمحتار میں ہے:

لا يصح الاستيجار على القرأة واهدائها الى الميت لا نه لم ينقل عن احد من الائمة الا ذن فی ذلك وقد قال العلماء ان القاری اذا قرأ لا جل المال فلا ثواب له فای شیئ يهديه الى الميت وانما يصل الى الميت العمل الصالح والا ستيجار على مجرد التلاوة لم

ینقل بہ احد من الائمۃ ۔ (ردالمحتار ص ۳۷ ج ۵)

قرأت پر اجرت لینا اور اسکا ثواب میت کیطرف ہدیہ کرنا صحیح نہیں کیونکہ اس کی اجازت ائمہ میں سے کسی سے منقول نہیں اور علماء نے فرمایا کہ جب قاری مال کیلئے پڑھے تو اسے ثواب نہیں ہوتا پھر وہ کس چیز کا میت کیلئے ہدیہ کرتا ہے اور میت کو تو عمل صالح پہنچتا ہے اور صرف تلاوت پر اجرت کو ائمہ میں سے کوئی بھی نہیں کہتا۔

اور اگر زید بکر میں نہ اجرت طے ہوئی نہ اس پر کچھ گفتگو ہوئی لیکن وہاں کے عرف ورواج میں دینے والا اسی نیت سے دیتا ہے اور پڑھنے والا اسی نیت سے پڑھتا ہے اور ختم قرآن کریم پر لینے دینے کا دستور ہے تو اسکا بھی یہ حکم ہے کہ یہ ناجائز ہے۔ فقہاء کرام کا مشہور قاعدہ ہے۔ المعروف کالمشروط (ردالمحتار ص ۳۶ ج ۵)

ہاں اگر پڑھنے والا بہ نیت ثواب پڑھے اور دینے والا بلا لحاظ اجرت مشروطہ ومعروفہ کے محض صدقہ کی نیت سے دے تو اس کے جواز میں کوئی شک نہیں نہ لینے والے کیلئے کوئی قباحت نہ دینے والے کے لئے کوئی قباحت اور میت کیلئے باعث اجر وثواب ہے۔

درمختار میں ہے: ولا یکرہ الدفن لیلا ولا اجلاس القارئین عند القبر وھو المختار۔

(شامی ص ۶۳۳ ج ۱)

شب میں دفن کرنا اور قبر کے نزدیک قاریوں کا بٹھانا مکروہ نہیں۔ یہی قول مختار ہے۔
لہذا بکر کو اس آخر صورت میں لینا جائز ہے اور پہلی ہر دو صورتوں میں ناجائز ہے، واللہ تعالے اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۱۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
دفن کے بعد قبر میت پر کسی عالم یا حافظ سے تین یا چار دن یا جمعرات یا جمعہ تک قرآن شریف کا پڑھوانا جائز ہے یا نہیں؟۔ بعض عالم دن معین کرنا جائز نہیں سمجھتے اور بعض تین یا چار دن یا جمعرات یا جمعہ تک تلاوت کلام پاک کرنا حرام کہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ کسی کتاب میں نہیں ہے اس کا جواب مع

دلائل شرعیہ کے تحریر فرمائیں۔

المستفتی رحیم الدین نعیمی ساکن پڑاگنہ پوسٹ جلدی ضلع چاٹگام۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بعد دفن قبر پر قرآن کا پڑھنا یا پڑھوانا بلاشک جائز ہے بلکہ سنت صحابہ ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی اپنی کتاب شرح الصدور بشرح حال الموتے والقبور میں اس کے لئے باب تحریر فرماتے ہیں:۔

اخرج الخلال فی الجامع عن الشعبی قال کانت الانصار اذامات لهم المیت اختلفوا الی قبرہ یقرؤن له القرآن ۔ (شرح الصدور مصری ص ۱۳۰)

خلال نے اپنی جامع میں شعبی سے روایت کی کہ امام شعبی نے فرمایا کہ انصار میں جب کوئی مرجاتا تو اس کی قبر کی طرف جاتے تھے اور اس کے لئے قرآن شریف پڑھتے تھے۔

فقہ کی مشہور کتاب درمختار میں ہے:

لا یکرہ الدفن لیلا ولا اجلاس القارئین عند القبر وهو المختار۔

(شامی مصری ص ۶۳۳ ج ۱)

نہ شب میں دفن کرنا مکروہ ہے نہ قاریون کا قبر کے پاس بٹھانا مکروہ یہی قول مختار ہے۔ یعنی مفتی بہ ہے۔

غنیۃ شرح منیہ میں ہے: واختلف فی اجلاس القارئین لیقرؤا عند القبر والمختار عدم الکراهة۔ (غنیۃ مطبوعہ لکھنو ص ۵۶۴)

قبر کے پاس قاریوں کے پڑھنے کیلئے بٹھانے میں اختلاف ہوا تو قول مختار اور مفتے بہ مکروہ نہ ہونا ہے۔

فتاوے عالمگیری میں ہے:

وقرأة القرآن عندالقبور عند محمد رحمه الله لا یکرہ ومشائخنا رحمهم الله اخذ واقوله وهل ینتفع والمختار انه ینتفع هکذا فی المضمرات ۔ (عالمگیری ص ۸۵ ج ۱)

امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک قبر کے پاس قرآن شریف پڑھنا مکروہ نہیں جانا اور ہمارے فقہا

علیہ الرحمہ نے اسی قول کو اختیار کیا اور کہا تلاوت سے میت کو نفع پہنچتا ہے تو قول مختار یہ ہے کہ نفع پہنچتا ہے ایسا ہی مضمرات میں ہے۔

نورالایضاح متن مراقی الفلاح میں ہے:

ولا یکرہ الجلوس للقرأۃ علی القبر فی المختار۔ (نورالایضاح ص ٦٦)

مختار مذہب میں قبر پر قرآن پڑھنے کیلئے بٹھانا مکروہ نہیں۔

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے" واخذ من ذالک جواز القرأۃ علی القبر وقال محمد تستحب لورود الآثار وھو المذھب المختار ملخصا۔ (طحطاوی ص ٣٦٣)

حدیث سے قبر پر قرآن پڑھنے کا جواز حاصل ہوا۔ امام محمد علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ آثار وارد ہونے کی وجہ سے مستحب ہے اور یہی مذہب مختار ہے۔

بدرالمنتقی شرح الملتقی میں ہے:

اختلف فی اجلاس القارئین عند القبر والمختار عدم الکراھۃ۔

(بدرالمنتقی مصری ص ١٨٨ ج ١)

قبر کے پاس قرآن پڑھنے والوں کے بٹھانے میں اختلاف ہوا تو قول مختار یہ ہے کہ یہ مکروہ نہیں

فتاوے قاضی خاں میں ہے:

وان قرأۃ القرآن عند القبور ان نوی بذلک ان یونسھم صوت القرآن فانہ یقرأ فان لم یقصد ذلک فاللہ تعالی یسمع قراۃ القرآن حیث کانت۔ (قاضی خاں ص ٣٧٦ ج ٤)

اگر قبر کے پاس قرآن شریف پڑھا اور نیت یہ کی کہ قرآن کی آواز سے مردہ کو انس حاصل ہوگا تو وہ قرآن شریف پڑھے اور اگر یہ قصد نہیں تو اللہ تعالیٰ جہاں کہیں قرآن پڑھا جاتا ہے سنتا ہے۔

شرح الصدور میں ہے "وان ختموا القرآن علی القبر کان افضل۔

(شرح الصدور ص ١٣٠)

اگر لوگ قبر پر قرآن شریف ختم کریں تو افضل ہے۔

فتاوی برہنہ میں ہے۔ ص ٣٦٣ ج ١:

در کنز گفتہ کہ مستحب است تصدق بروے تافت روز واگر نماز یا روزہ یا عتاق یا عبادتے دیگر کند تا

ثواب او بمیت رسد رواست۔

کنز میں کہا ہے کہ مردہ کے لئے سات دن تک صدقہ کرنا مستحب ہے اور اگر نماز روزہ غلام آزاد کرنا یا کوئی عبادت کرے اور اسکا ثواب مردہ کو پہچائے تو جائز ہے۔

ان عبارات سے واضح ہو گیا کہ مذہب مفتی بہ اور قول مختار کی بنا پر قبر میت پر قرآن شریف پڑھنا جائز و مستحب ہے بلکہ سنت صحابہ اور حدیث شریف سے ثابت ہے اور تلاوت کلام اللہ سے میت کو نفع پہنچتا ہے اور انس حاصل ہوتا ہے اور ایک قرآن شریف کا ختم ہونا افضل ہے اور ایک ہفتہ تک صدقات وعبادات کا ثواب پہنچانا مستحب ہے۔

یہ وہ دلائل ہیں جن کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اب باقی رہے یہ تعینات سوم ہفتم دہم بستم چہلم وغیرہ تو یہ تعینات شرعی نہیں بلکہ وقتی مصلحتوں کی بنا پر ہیں جنکے عدم جواز پر کوئی دلیل شرعی نہیں ہے۔ اس قسم کے تعینات ہر زمانہ میں ہوئے اور اب بھی موجود ہیں۔

جیسے اوقات نماز پنجگانہ کے تعینات۔ اذان کے اوقات معینہ۔ تنخواہ امام وموذن کا تعین۔ درس قرآن کا تعین۔ درس حدیث کا تعین۔ درس نظامی کا تعین۔ نصاب درجات کے تعین۔ ہر درجہ کے استاذ کا تعین۔ تنخواہ مدرسین کے تعینات۔ تعلیم مدرسہ کے لئے دن کا تعین۔ ہر کتاب کے وقت کا تعین۔ ہر مدرس کیلئے کتابوں کا تعین۔ ایام تعطیل کا تعین۔ دستار بندی کے لئے ماہ شعبان کا تعین۔ تعلیمی سال کے ابتدا اور انتہا کا تعین۔ وعظ کیوقت کا تعین۔ اوراد و وظائف کے تعینات۔ اعمال کے تعینات۔ عقیقہ ونکاح کیلئے تعین۔ کھانے ودعوت کا تعین۔ اور اس کے علاوہ بکثرت تعینات نہ فقط عامۃ المسلمین میں بلکہ علماء وفضلا ومشائخ وصلحا میں جاری وساری ہیں۔ تو کیا ان تعینات کو معترضین نے کسی معتبر ومستند کتاب میں دیکھا ہے اور کسی شرعی دلیل سے ثابت پایا ہے۔ اگر یہ تعینات ثابت ہیں فتوی پیش کرو۔ ورنہ ان تعینات کیوجہ سے اس سب امور خیر کو بدعت وناجائز ٹھہراؤ۔ اور عاملان تعینات کو گمراہ وبیدین قرار دو۔ تعجب ہے کہ جو خود تعینات کے پابند ہوں انہیں کیا حق حاصل ہے کہ سب کے ایصال ثواب کے تعینات پر زبان اعتراض کھول سکیں اور لوگوں کو امور خیر کے ایصال ثواب سے روکیں۔ بالجملہ مندرجہ فی السول کے تعینات نہ شرعا ممنوع وناجائز نہ ان کے عدم جواز پر کوئی دلیل شرعی قائم۔ لہذا ان تعینات کی وجہ سے قبر پر تلاوت قرآن کریم ناجائز نہیں ہوسکتی۔ مولے تعالے منکرین کو قبول حق کی توفیق عطا فرمائے واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۱۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

عمر کہتا ہے کہ قرآن شریف ہرشئی کا بیان ہے اور اس آیت سے ثابت ہے۔" وکذلك تبیا نا لکل شئی " اس سے حضور کا عالم الغیب ہونا ثابت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حضور کائنات کے ذرہ ذرہ کے عالم ہیں کوئی دانہ زمین کی خشکی اور تری میں ایسا نہیں جو قرآن کریم مین بیان نہ ہو' ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین" اس آیت سے ثابت ہوا کہ حضور کے احاطہ علم سے کوئی چیز باہر نہیں۔ اور زید کہتا ہے کہ قرآن شریف ہرشئی کا بیان نہیں ہے، بہت سی باتیں دنیا کی تو درکنار سب دین کی باتیں بھی نہیں ہیں۔ جیسے نماز کی رکعات اور سجدہ سہو واجب ہونے کی صورتیں، زکوۃ کا سونے چاندی کا نصاب، بکری گائے بھینس اونٹ کی تعداد، پھر انکی مقدار زکوۃ، روزہ کیسے ٹوٹ جاتا ہے، احرام باندھنا وغیرہ۔ ہزاروں وہ مسائل ہیں جو احادیث میں ملتے ہیں قرآن شریف میں ان کا کہیں پتہ بھی نہیں ہے۔

آگے چل کر وہ احکام مستنبطہ ائمہ مجتہدین نے نکالے ہیں۔ جیسے حضرت ابوبکر کا خلیفہ اول ہونا، اور پھر حضرت عمر کا ولی عہد ہونا، اور حضرت عثمان کا شہید ہونا، اور حضرت علی کا شہید ہونا، انبیاء کی تعداد، فرشتوں کی تعداد، اصحاب نبی کی تعداد، ستاروں کی تعداد، اور ہزاروں ایسے واقعات ہیں جن کا قرآن شریف میں سراغ نہیں ملتا۔ زید اپنے مضمون کو ان آیات سے ثابت کرتا ہے۔

" واوتیت من کل شئی " (سورۃ نمل رکوع ۱)

بلقیس کے لئے ثابت کرتا ہے اور کہتا ہے دینی امور کا تعلق علم نبوت سے ہوتا ہے۔

(سورۃ اعراف رکوع ۱۷/۱) "وکتبن له فی الالواح من کل شئی مو عظة تفصیلا لك لشئی۔

(سورۃ انعام ع ۱۹) ثم آتینامو سی الکتاب تماما علی الذی احق لکل تفصیلا لکل شئی وهد ی ورحمة"

ان آیات مذکورہ سے ثابت کرتا ہے کہ قرآن شریف میں ہرشئی کا بیان نہیں تو حضور بھی ہرشئی کے عالم نہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان دونوں میں کون حق پر ہے۔ بغیر توبہ کے دینی تعلیم حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔ اس کا جواب براہ کرم قرآن وحدیث سے اور فقہ سے ہونا چاہئے۔ بینوا توجروا۔

المستفتی عبد الحفیظ سرائے ترین سنبھل ضلع مراد آباد رمضان المبارک ۷۱ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بلاشک قرآن کریم ہر شئی کا بیان ہے اور علوم کا جامع اور غیوب پر مشتمل ہے۔

شیخ الاسلام علامہ ابراہیم باجوری شرح قصیدہ بردہ شریف میں تحریر فرماتے ہیں:

لھا (ای آیات القرآن) معان کموج البحر فی الکثرۃ التی لا غایۃ لھا (فیہ ایضا) انھا لا تعد ولا تحصی وما فیھا العجیبۃ لعدم تناھیھا (فیہ ایضا) حکی عن بعضھم من انہ قال لکل آیۃ ستون الف فھم وما بقی من فھمھا اکثر (وفیہ ایضا) اقل ما قیل فی العلوم التی فی القرآن من ظواھر المجموعۃ فیہ اربعۃ وعشرون الف علم وثمان مأۃ علم"

(شرح بردہ مصری ص۵۲)

آیات قرآنی کے معانی کثرت میں سمندر کی موج کی طرح ہیں جن کی کوئی انتہا نہیں (اسی میں ہے) بیشک آیات کے عجیب معنی انگنت اور بے شمار ہیں کیونکہ وہ غیر متناہی ہیں (اسی میں ہے) بعض علماء سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہر آیت کے لئے ساٹھ ہزار فہم ہیں اور جو فہم باقی ہے وہ بہت زیادہ ہیں (اسی میں ہے) بلحاظ ظاہری معنی کے علوم قرآن میں کم سے کم یہ قول ہے کہ ان کا مجموعہ آٹھ سو چوبیس ہزار علم ہیں۔

علامہ علی قاری شرح شفا میں فرماتے ہیں:

اشتمالہ (القرآن) علی اخبار الاولین وآثار الآخرین وتضمنہ الامور الغیبیہ الواقعۃ سابقا ولا حقا فھو معجزۃ۔ (شرح شفا مصری ص۵۳۴ ج۱)

قرآن کا اولین وآخرین کی خبروں پر مشتمل ہونا اور ان امور غیبیہ پر شامل ہونا جو پہلے گزر چکے اور آئندہ واقع ہونے والے ہیں یہی تو معجزہ ہے۔

علامہ قسطلانی مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں: "السادس ان وجہ اعجازہ ھو کونہ جامعا للعلوم الکثیرۃ لم تتکلم العرب فیھا الکلام ولا یحیط بھا من علماء الامم واحد منھم ولا یشتمل علیھا کتاب بین اللہ فیہ خبر الاولین والآخرین وحکم المتخلفین وثواب المطیعین وعقاب العاصین"

(مواہب لدنیہ ص۳۵۳ ج۱)

چھٹی وجہ اعجاز قرآن کی وہ علوم کثیرہ کا جامع ہونا ہے جس میں نہ تو عرب نے تکلم کیا نہ پہلی امتوں کے علماء سے کسی نے اس کا احاطہ کیا نہ اس پر کوئی کتاب مشتمل ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اولین و آخرین کی خبریں اور متخلفین کے حکم اور نیکوں کا ثواب اور بدوں کا عذاب بیان فرمایا۔

علامہ قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں اور علامہ زرقانی نے اس کی شرح میں فرمایا:

الخامس ان وجه اعجازه هو ما فيه من علم الغيب وهو شامل لما سبق مما لم يدركه هو ولا اهل عصره اما يقع بعد ذلك مما لا يعلمه الا الله۔

(زرقانی مصری ص ۹۸ ج ۵)

پانچویں بات وجہ اعجاز قرآن کی یہ ہے کہ اس میں علم غیب کا بیان ہے کہ قرآن غیب کے ان امور کو شامل ہے جو پہلے گزر چکے جنہیں نہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پایا نہ آپ کے اہل زمانہ نے اور جو بعد کو واقع ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

بخیال اختصار اس وقت صرف اسی قدر تصریحات علمائے کرام پر اکتفا کیا گیا مگر ان سے بھی یہ ظاہر ہو گیا کہ معانی قرآن سمندر کی موج کی طرح ہیں جن کی انتہا نہیں اور وہ معانی غیر متناہی ہیں جن کی نہ گنتی نہ شمار اور ہر آیت کے لئے ساٹھ ہزار فہم ہیں اور علوم قرآن باعتبار معنی کے چوبیس ہزار آٹھ سو علوم ہیں اور قرآن کریم اولین و آخرین کی خبریں دیتا ہے اور امور غیبیہ ماضیہ و مستقبلہ پر مشتمل ہے اور قرآن جامع العلوم ہے اور یہ خود حدیث شریف سے بھی ثابت ہے جس کی دیلمی نے روایت کی کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: " من اراد علم الاولين والآخرين فليتدبر القرآن

(کنوز الحقائق فی احادیث خیر الخلائق ص ۱۶۴)

جو اولین و آخرین کے علم کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ وہ قرآن میں غور کرے۔ اس حدیث شریف سے نہایت واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ قرآن کریم میں اولین و آخرین کے علوم ہیں۔ پھر یہی مضمون کثیر آیات سے ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (۱) " ما فرطنا فی الكتاب من شئی " (سورۃ انعام ع ۴)

ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھا نہ رکھا۔

(۲) " و تفصيل الكتاب لا ريب فيه من رب العالمين " (سورۃ یونس ع ۴)

اور لوح میں جو کچھ لکھا ہے سب کی تفصیل ہے اس میں کچھ شک نہیں پروردگار عالم کی طرف سے

(۳)"ولکن تصدیق الذی بین یدیه وتفصیل کل شئی "(سورۃ یوسف ع ۱۲)
لیکن اپنے سے اگلے کلاموں کی تصدیق ہے اور ہر چیز کا مفصل بیان ہے۔
(۴)"ونزلنا علیك الکتاب تبیانا لکل شئی "(سورۃ نحل ع ۱۲)
اور ہم نے تم پر قرآن اتارا کہ ہر چیز کا روشن بیان ہے۔
(۵)"وکل شئی فصلناہ تفصیلا " (سورۃ اسراء ع ۲)
اور ہم نے ہر چیز خوب جدا جدا ظاہر فرمادی۔

علامہ محی السنہ ناصر الشریعہ علاء الدین بغدادی تفسیر خازن میں آیت نمبر تین (۳) کے تحت فرماتے ہیں: "وتفصیل کل شئی "یعنی ان هذا القرآن المنزل علیك یا محمد تفصیل کل شئی تحتاج الیه من الحرام والحلال والحدود والاحکام والقصص والمواعظ والامثال وغیرہ ذلك مما یحتاج الیه العباد فی امر دینهم ودنیاهم "
(تفسیر خازن مصری ص ۲۶۴ ج ۳)

اور ہر چیز کا مفصل بیان یعنی یہ قرآن جو اے اللہ کے رسول آپ پر نازل ہوا ہر اس چیز کا مفصل بیان ہے جس کی طرف آپ کو احتیاج ہے حلال وحرام۔ حدود واحکام۔ قصص اور نصیحتوں اور مثالوں سے اوران کے علاوہ ان امور سے جن کی طرف بندے اپنے دین ودنیا کے کام میں محتاج ہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی تفسیر جلالین میں آیت نمبر پانچ (۵) کے تحت فرماتے ہیں:
"(وکل شئی)یحتاج الیه(فصلناہ تفصیلا بینه تبیینا "
اور ہر چیز کی طرف احتیاج ہے ہم نے اس کو خوب مفصل بیان کردیا۔

علامہ جمل اس کے حاشیہ الفتوحات الالھیہ میں فرماتے ہیں: " یحتاج الیه ای فی الدین والدنیا قوله بینه تبیینا بلا التباس فهو کقوله ما فرطنا فی الکتاب من شئی وقوله ونزلنا علیك الکتاب تبیانا لکل شئی " (جمل مصری ص ۶۱۸ ج ۲)

یعنی دین ودنیا میں جس کی طرف احتیاج ہے ہم نے اسے بلا اشتباہ خوب بیان کردیا تو یہ اللہ تعالی کے اس کلام کی طرح ہے کہ ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھا نہ رکھا اور اللہ تعالی کے اس فرمان کے مانند ہے کہ ہم نے تم پر یہ کلام اتارا کہ ہر چیز کا روشن بیان ہے۔

عارف باللہ شیخ احمد تفسیر صاوی میں آیت (۵) کے تحت فرماتے ہیں: " (تفصیلاً مصدر مو

کد لعامله اشارة الی ان الله لم یترك شئی من امور الدین والدنیا الا بینه نظیره قوله تعالی ما فرطنا فی الکتاب من شئی" (صاوی مصری ص ۲۹۱ ج ۲)

تفصیلا مصدر اپنے عامل کی تاکید ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بیشک اللہ تعالی نے امور دین و دنیا سے کوئی چیز نہیں چھوڑی مگر اس کو اپنے حبیب سے بیان فرمادیا۔ یہ نظیر ہے اللہ کے اس کلام کی کہ ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھا نہ رکھا۔

"الطبقات الکبریٰ میں ہے: کہ عارف باللہ حضرت ابراہیم دسوقی آیت نمبر (۱) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:" لو فتح الحق تعالی من قلوبکم اقفال السدد لا طلعتم علی ما فی القرآن من العجائب والحکم والمعانی والعلوم واستغنیتم عن النظر فی سواه فان فیه جمیع ما رقم فی صفحات الوجوب ـ قال تعالی: ما فرطنا فی الکتاب شئی"

(طبقات کبریٰ مصری ص ۱۴۹ ج ۱)

اگر حق تعالی تمہارے دلوں کے موانع کے قفل کھول دے تو تم قرآن کے عجائب اور حکمتوں اور معانی وعلوم پر مطلع ہو جاؤ اور اس کے غیر میں نظر کرنے سے مستغنی ہو جاؤ۔ بیشک قرآن میں صفحات وجود پر جو کچھ ہے مرقوم ہے کہ اللہ تعالی نے فرمایا ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھا نہ رکھا۔ بخیال اختصار تفاصیل عبارات اور زیادہ پیش نہیں کیں کہ منصف کے لئے تو اسی قدر بہت کافی اور معاند کے لئے دفتر ناکافی۔ بالجملہ ان آیات وتفاسیر اور حدیث شریف اور تصریحات کتب سے نہایت روشن طور پر ثابت ہو گیا کہ قرآن کریم ہر شئی کا روشن بیان ہے، اور علوم کا جامع اور غیب کی خبروں پر مشتمل ہے، اور علوم اولین وآخرین کو حاوی ہے اور ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان کے رب تبارک وتعالی نے علوم قرآن تعلیم فرمائے۔

قرآن کریم میں ہے۔" الرحمٰن علم القرآن خلق الانسان علمه البیان"

(سورۂ رحمٰن ع ۱)

رحمٰن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا انسانیت کی جان محمد کو پیدا کیا" ما کان وما یکون کا بیان انہیں سکھایا۔

تو اب کائنات کا ذرہ ذرہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے احاطہ علمی سے باہر نہیں کہ آپ عالم قرآن کریم ہیں۔ تو قول عمر تو حدیث قرآن کے مطابق ثابت ہوا۔ اب باقی رہا قول زید اور اس کا

استدلال وہ سراسر غلط اور باطل ہے اور وہ یہ کہ قرآن ہر شئی کا بیان نہیں ہے کہ یہ قرآن تمام تصریحات علماء و آیات وحدیث کی مخالفت اور انکار کرتا ہے اور قرآن کریم اور نبی رحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سخت توہین کرتا ہے اور اپنا منکر قرآن اور عدو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہونے کا اظہار کرتا ہے۔ اب باقی رہا زید کا استدلال کہ قرآن میں نماز وزکوۃ وغیرہ کے مسائل اور دین کی بہت سی باتیں نہیں ہیں۔ تو آج یہ نیا اعتراض نہیں ہے۔ ہمارے علمائے کرام اس کا پہلے جواب دے چکے ہیں۔ چنانچہ ہماری پیش کردہ آیت نمبر (۴) ونزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شئی'' کی تفسیر میں حضرت عارف باللہ شیخ احمد تفسیر صاوی میں اس سوال کو نقل کر کے جواب دیتے ہیں۔

ان قلت انا نجد كثير امن احكام الشريعة لم يعلم من القرآن تفصيلا كعدد ركعة الصلاة ونصاب الزكوة وغير ذلك فكيف يقول الله تبيانا لكل شئى ـ اجيب بان البيان اما فى ذا ت الكتاب او با حالته على السنة قال تعالى وما اتكم الرسول فخذوه وما نهكم عنه فانتهوا اوباحالته على الاجماع قال تعالى ومن يشاقق الرسول من بعدما تبين له الهدى ويتبع غير سبيل المومنين الآية او على القياس قال تعالى فاعتبروا يا اولى الابصار والاعتبار النظر والاستدلال اللذان يحصل بهم القياس فهذه اربعة طرق لا يخرج شئى من احكام شريعة عنها فكلها مذكورة فى القرآن فكان تبيانا لكل شئى بهذا الاعتبار''

(تفسیر صاوی مصری ص ۲۷۲ ج ۲)

اگر تو یہ اعتراض کرے کہ ہم احکام شریعت بہت سے پاتے ہیں جن کی تفصیل قرآن سے نہیں معلوم ہوتی جیسے نماز کی رکعتوں کی تعداد اور زکوۃ کا نصاب اور اس کے سوا اور مسائل تو اللہ تعالیٰ نے اسے کیسے فرمایا کہ وہ ہر شئی کا بیان ہے پس اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ بیشک اس کا بیان ہونا یا تو خود قرآن ہی میں ہے۔ یا سنت پر حوالہ کرنے میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: تمہیں جو رسول دیں اس کو لو اور جس چیز سے منع فرمائیں باز رہو۔ یا اجماع پر حوالہ کرنے میں ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ ''جس نے رسول کی مخالفت کی ہدایت کے ظاہر ہونے کے بعد اور مسلمانوں کی راہ کے سوا اتباع کی آخر آیت تک''۔ یا قیاس پر کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''پس عبرت حاصل کرو اے عقل والو:: اور اعتبار سے مراد وہ نظر و استدلال ہیں جن سے قیاس حاصل ہو۔ تو یہ چار طریقے ہیں جن سے احکام شریعت کا کوئی مسئلہ خارج نہیں ہوسکتا۔ پس یہ کل قرآن ہی میں مذکور ہے تو اس اعتبار سے قرآن ہر شئی کا بیان ہوگیا۔

علامہ جمل ''الفتوحات الالٰہیہ'' میں اسی آیت کی تفسیر میں یہ سوال وجواب اس طرح تحریر فرماتے ہیں جس کے الفاظ تو مختلف ہیں لیکن مضمون واحد ہے۔ تو ان ہر دو تفاسیر سے ثابت ہوگیا کہ زید کا یہ استدلال نیا نرالہ نہیں ہے بلکہ منکرین کا پرانہ اعتراض ہے جس کا بارہا جواب دیا جاچکا ہے۔

پھر زید کا آیت " واو تیت من کل شئی " سے استدلال کرنا بھی غلط ہے۔

تفسیر جلالین میں اس آیت کریمہ کے متعلق فرمایا " واوتیت من کل شئی " یحتاج الیه الملوك من الآلة والعدة " اور بلقیس کو وہ ہر شئی جس کی طرف بادشاہ آلات اور اسباب وسامان کے محتاج ہوتے ہیں عطا کی۔

علامہ جمل ''الفتوحات الالٰہیہ'' میں اسی آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں: (من کل شئی) عام ارید به الخصوص کما اشار له بقوله تحتاج الملوك من الآلة والعدة "

(جمل مصری ص ۳۰۹ ج ۳)

کلمہ ''کل شئی'' کا عام ہے اور اس سے خاص مراد ہے جس کی طرف مفسر نے اشارہ کردیا کہ وہ بادشاہوں کا آلات واسباب کی طرف محتاج ہونا ہے۔

علامہ خازن تفسیر خازن میں اسی آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں:" یعنی ما تحتاج الیه الملوك من المال والعدة "

(تفسیر خازن مصری ص ۱۱۸ ج ۵)

یعنی وہ چیزیں جن کی طرف بادشاہ مال واسباب سے محتاج ہوتے ہیں۔

ان تفاسیر سے ثابت ہوگیا کہ آیت کریمہ میں ''کل شئی'' اپنے عموم پر نہیں ہے بلکہ وہ خاص چیزیں مراد ہیں جن کی طرف بادشاہوں کو احتیاج ہوا کرتی ہے۔ اور آیت میں بلقیس کا ذکر ہے تو اس آیت سے قرآن کے ہر شئی کے بیان نہ ہونے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نفی علم پر استدلال کرنا تحریف قرآن کریم ہے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عداوت کی دلیل ہے اور قرآن کریم اور اللہ تعالیٰ پر افتراء ہے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

اسی طرح زید کا آیت '' وکتبن له فی الالواح من کل شئی موعظة وتفصیلا لکل شئی " اور آیت "ثم اتینا موسی الکتاب تماما علی الذی احسن تفصیلا لکل شئی " سے استدلال کرنا بھی غلط ہے کہ ان ہر دو آیات میں توریت شریف کا بیان ہے جو سیدنا موسی علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ تو ان آیات میں " تفصیلا لکل شئی " اپنے عموم پر نہیں ہے

چنانچہ تفسیر خازن میں آیت اولی کے تحت ہے۔ (وتفصیلا لکل شئی) یعنی تبیانا لکل شئی من الامر والنھی والحلال والحرم والحدود والاحکام مما یحتاج الیہ فی امور الدین"۔ (خازن ص ۲۳۶ ج ۲)

یعنی ہر شئی کا بیان کرنا امر، نہی، حلال، حرام، حدود، اور احکام سے وہ جن کی طرف امور دین میں احتیاج ہوتی ہے۔

اسی تفسیر خازن میں آیت ثانیہ کے تحت ہے" وتفصیل لکل شئی "یعنی وفیہ بیان لکل شئی یحتاج الیہ من شرائع الدین واحکامہ" (خازن ۱۶۶ ج ۲)

یعنی اس میں ہر اس شئی کا بیان ہے جس کی طرف احکام دین میں محتاج ہیں۔

تفسیر جلالین میں آیت اولی کے تحت ہے"" یحتاج الیہ فی الدین "اس پر جمل فرماتے ہیں: محتاج الیہ فی الدین ای دینھم" (جمل مصری ص ۱۸۹ ج ۲)

جس کی طرف بنی اسرائیل کے دین میں احتیاج تھی۔

اسی طرح آیت ثانیہ کے تحت تفسیر جلالین میں ہے" یحتاج الیہ فی الدین"

ان تفاسیر سے ثابت ہو گیا کہ توریت شریف دین بنی اسرائیل کے احکام کی تفصیلی کتاب ہے۔ اب زید کا ان ہر دو آیات کو قرآن شریف کی ہر شئی کے بیان کے خلاف اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نفی علم پر استدلال کرنا تحریف آیات قرآنی ہے اور اللہ تعالی پر افتراء ہے۔ بالجملہ ان ہر سہ آیات سے نہ قرآن کریم کے ہر شئی کے بیان کرنے کی نفی ثابت ہوئی نہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہر شئی کے عالم ہونے کا انکار ظاہر ہوا۔ تو زید کا استدلال غلط و باطل قرار پایا۔ زید کی پیش کردہ پہلی آیت میں بلقیس کا ذکر تھا تو یہ واقعہ ہے کہ بلقیس کو جہان کی ہر شئی نہیں دی گئی تھی۔ اور اس کی پیش کردہ پچھلی ہر دو آیات میں سیدنا موسی علیہ السلام کا تذکرہ ہے تو ہمارا حضرت موسی علیہ السلام کے لئے یہ دعوی نہیں ہے کہ انہیں بھی کائنات کے ذرے ذرے کا علم دیا گیا ہے بلکہ ہمارا یہ دعوی تو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے ہے کہ وہ کائنات کے ذرے ذرے کے عالم ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم توریت شریف سے افضل ہے۔ اسی بنا پر دیکھو کہ " تفصیلا لکل شئی "کی تفسیر توریت شریف کے لئے صرف امور دین کے ساتھ خاص کی۔ اور قرآن کریم کیلئے اس کو اپنے عموم پر برقرار رکھا کہ امور دین و دنیا ہر دو مراد لئے۔ زید کی یہ بے ایمانی ہے کہ اس نے ان آیات کی صحیح مراد چھوڑ کر اپنے دل سے غلط مراد گڑھ کر اپنے غلط عقیدہ کی تائید کرنے کی

ناپاک سعی کی ہے، تو زید پر اس جرات کی بنا پر توبہ لازم اور بغیر توبہ کے اس سے دینی تعلیم حاصل کرنا جائز نہیں کہ وہ اس میں اپنا باطل عقیدہ سکھائے گا۔ اور قول عمر بالکل صحیح اور حق ہے۔ فقط واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۱۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کثرھم اللہ تعالیٰ مسطورہ ذیل مسائل میں کہ

(۱) ہمارے محلّہ کی مسجد میں ہر سال شبینہ ہوا کرتا ہے اور اس طرح پر کہ پانچ یا چھ حفاظ تراویح میں ایک ہی شب میں پورا قرآن مجید ختم کرتے ہین لیکن ابھی دو چار رکعتیں باقی رہ جاتی ہیں کہ صبح صادق طلوع کر آتی ہے اور نماز وتر وغیرہ صبح صادق ہی کے وقت پڑھی جاتی ہے۔ بہت سے مقتدی ایک ہی رکعت مین چند بار اٹھتے بیٹھتے رہتے ہیں۔ بعض لوگ چھوڑ کر بھاگ جاتے اور بعض دوسری میں بیٹھ کر پہلی میں کھڑے ہو کر ادا کرتے ہیں۔ کیا ایسا شبینہ جائز ہے؟۔

(۲) اگر نفل نماز کی جماعت سے شبینہ پڑھا جائے تو اس کا شرعا کیا حکم ہے؟۔

(۳) کسی طرح کا شبینہ شرعاً جائز ہے یا نہیں اگر ہے تو اس کی کیا صورت ہے؟۔

(۴) بعض علمائے کرام کا قول ہے کہ تین روز سے پہلے قرآن مجید کا ختم کرنا مکروہ ہے۔ اگر مسئلہ صحیح ہے تو شبینہ کے جواز کی کیا صورت ہے؟ بینوا توجروا۔

المستفتی محمد قمر الزماں سکریٹری جامع مسجد ٹیٹا گڑھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ایک شب یا ایک دن میں ختم قرآن کریم کر لینا سلف کرام سے ثابت ہے۔ حضرت امام وکیع بن جراح ہر شب میں ایک ختم قرآن کرتے۔

ردالمحتار میں ہے:

وکیع بن الجراح بن ملیح بن عدی الکوفی شیخ الاسلام واحد الائمۃ الاعلام قال یحیٰ بن اکثم کان وکیع یصوم الدھر ویختم القران کل لیلۃ۔

(ردالمحتار مصری ج ۱ ص ۴۲)

خود ہمارے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ رمضان مبارک میں اکسٹھ قرآن کریم ختم فرماتے۔ ایک ہر دن میں اور ایک ہر رات میں اور ایک ختم لوگوں کے ساتھ یہاں تک کہ حضرت امام نے تو صرف دو رکعتوں میں ایک ختم قرآن کریم کیا ہے۔

مراقی الفلاح میں ہے:

عن ابی حنیفة رحمه الله انه كان يختم فی رمضان احد و ستين ختمة فی كل يوم ختمة و فی كل ليلة ختمة و فی كل التراويح ختمة و صلی بالقران فی الركعتين۔

(ہامش طحطاوی مصری ص ۲۴۱)

تو ایک شب میں ختم قرآن کریم کرنے کا جواز فعل سلف سے ثابت ہوا اور نوافل میں خصوصا تراویح میں قرآن کریم کا پڑھنا مسنون بھی ہے۔

کبیری میں ہے: و فی النوافل بالليل له ان يسرع بعد ان يقرا كما يفهم و ذلك مباح الا يری ان ابا حنيفة رحمه الله كان يختم القران فی ليلة واحدة۔

(کبیری ۴۶۳)

ردالمختار میں ہے: قراءة الختم فی صلاة التراويح سنة۔

(ردالمحتار ج ۱ ص ۴۹۶)

لیکن نوافل میں صرف تنہا پڑھ سکتا ہے کہ نوافل کی جماعت جائز نہیں۔

ردالمحتار میں ہے: النفل بجماعة وهو غير جائز۔

اور تراویح کی جماعت سنت کفایہ ہے۔

نورالایضاح میں ہے: وصلاتها بالجماعة سنة كفاية۔

تو اب ثابت ہو گیا کہ ایک شب میں ختم قرآن کریم صرف تراویح کی جماعت میں کر لینا بلاشبہ جائز ہے۔ اسی کا نام شبینہ ہے۔ اب اس میں بجائے ایک حافظ کے چند حافظوں کے ختم کر لینے میں کوئی حرج لازم نہیں آتا۔ ہاں موسم گرما کی شبیں چونکہ بہت چھوٹی ہوتی ہیں ان میں صبح صادق سے قبل اگر ختم ہو سکے تو جب صبح صادق قریب ہو جائے تو اس سے پہلے بعجلت باقی رکعات تراویح کو چھوٹی چھوٹی سورتوں سے پوری کریں اور آخر میں وتر پڑھ لیں۔ صبح صادق کے طلوع ہونے کے بعد نہ تراویح پڑھ سکتے ہیں اور

نہ وتر بہ نیت ادا پڑھ سکتے ہیں۔ پھر مقتدی بھی بذوق وشوق اگر سب نہیں تو بعض کھڑے ہو کر اور بعض بیٹھ کر آخر تک شریک جماعت رہیں تو ایسا شبینہ جائز ہے۔ اور جو شبینہ نفل کی جماعت میں ہو اور اس کو صبح صادق کے طلوع ہو جانے کے بعد بھی پڑھتے رہیں اور وتر کو قضا کر دیں، اس میں نہ حفاظ میں صحت عقیدہ کا لحاظ ہو، نہ دینداری کا خیال ہو، نہ صحیح خوانی کی رعایت ہو۔ نہ اس کی تیز رفتاری سے کلمات سمجھ میں آتے ہوں، نہ فہم معنیٰ حاصل ہوتے ہوں۔ اور مقتدیوں میں شوق ہی نہ ہو، ان پر جماعت کی شرکت بار ہو، ایک رکعت میں کبھی اٹھیں کبھی بیٹھیں، کوئی بیٹھ کر باتیں کرے، کوئی لیٹے، کچھ چائے پینے میں مشغول رہیں، کچھ مسجد کے باہر پان کھانے اور حقہ بیڑی پینے مین وقت گذارتے رہیں، اگر کسی کے دل میں آ گیا تو ایک آدھ رکعت میں شامل ہو گیا۔ بعض دور ہی سے رونق دیکھ کر اپنے مکان کو بھاگ جائیں تو ایسے شبینہ کو کون جائز کہہ سکتا ہے۔

اب باقی رہا وہ قول کہ تین روز سے پہلے ختم قرآن کریم مکروہ ہے۔ تو یہ قول میری نظر سے نہیں گذا۔ ہاں ایک دن میں ختم قرآن کریم کو بعض نے مکروہ کہا ہے۔ تو اس قول کی بناء پر اس صورت میں ہے کہ قاری اس تیز رفتاری سے پڑھے جس میں رعایت ترتیل اور فہم معنی کا لحاظ نہ ہو ورنہ ایک ہی دن میں ختم قرآن کریم کرے اور اس میں رعایت ترتیل اور فہم معنی کو ملحوظ رکھے تو وہ مکروہ نہیں جیسا کہ سلف کرام کا ایک شب میں ختم قرآن کریم کرنا شروع جواب میں منقول ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۹/ ذیقعدہ ۱۳۷۲ء

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۱۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

زید کہتا ہے کہ بجلی کا گرجنا جو کہ بوقت بارش ہوتا ہے، تو ایک فرشتہ بادلوں کے کوڑا مارتا ہے اور اس کوڑے کی آواز کو گرج کہتے ہیں، آیا یہ کس حد تک درست وصحیح ہے۔ اور بجلی اور گرج کی اصل حقیقت کیا ہے۔ تفصیل وار جواب مرحمت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بعض مفسرین نے گرج کی حقیقت بیان کی ہے جو سوال میں ہے کہ فرشتہ بادلوں کو چلانے کیلئے جب کوڑا مارتا ہے تو یہ آواز اس کوڑے کے مارنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی کو گرج کہتے ہیں۔ جیسا کہ جمل حاشیہ تفسیر جلالین تحت آیۃ کریمہ ویسبح الرعد بحمدہ میں مذکور ہے۔ قیل ھو صوت الآلۃ التی یضرب بھا السحاب ای الصوت الذی یتولدعند الضرب۔ (جمل ج ۱۔ص ۱۹۵)

تو اس قول کی بنا پر قول زید صحیح ثابت ہوا۔ لیکن اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ رعد ایک فرشتہ ہے اور گرج اسکی تسبیح کی آواز ہے۔

تفسیر خازن اسی آیۃ کریمہ کے تحت میں ہے۔: اکثر المفسرین علی ان الرعد اسم ملك الذی یسوق السحاب والصوت المسموع من تسبیحہ۔ (خازن، ج ۴ ص ۹)

اور حدیث شریف میں ہے کہ گرج رعد فرشتہ کے بادلوں کی ڈانٹنے کی آواز ہے۔ ترمذی شریف میں ہے۔

اقبلت یھود الی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فقالوا اخبرنا عن الرعد ماھو قال ملك من الملائکۃ مؤکل بالسحاب معہ مخاریق من نار یسوقہ بھا حیث شاء اللہ قالوا فما ھذا الصوت الذی یستمع قال زجر السحاب حتی ینتھی حیث امرت قالوا صدقت۔ (خازن ج ۴۔ص ۸)

اور بجلی ایک روشنی ہے جو بادل کے درمیان سے ظاہر ہوتی ہے۔ تفسیر خازن میں ہے۔ البرق ھو لمعان یظھر من خلال السحاب۔ (خازن ج ۴۔ص ۸)

اور دوسرا قول یہ ہے کہ بادلوں کے چلانے کے لئے جو کوڑا آگ کا ہے اس کوڑے کی چمک کو بجلی کہتے ہیں۔ البرق لمعان سوطہ آلۃ من یزجرہ بھا السحاب۔ (جمل ج ۱ ص ۲۳)

اور تیسرا قول یہ ہے کہ جب رعد فرشتہ کا غصہ شدید ہو جاتا ہے تو اس کے منہ سے آگ نکلتی ہے وہی بجلی ہے۔ تفسیر خازن میں ہے: اذا اشتد غضبہ یخرج من فیہ النار فھی البرق (خازن)

یہ مفسرین کے اقوال بجلی اور گرج کی حقیقت کے بیان میں ہیں، جو شارع علیہ السلام سے بروایات ثابت ہیں مسلمان کیلئے ان سے بہتر اور معتبر کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ : الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۱۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
سائنسداں سمجھتے ہیں کہ بادل جب گرجتے ہیں جب یہ آپس میں ٹکراجاتے ہیں تب بادل گرجتا ہے، آیا یہ قول صحیح ہے، یا غلط؟۔ جواب تسلی بخش دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

تفاسیر کی بعض روایات میں یہ بھی وارد ہے کہ جب فرشتہ کا بادلوں پر غصہ شدید ہوتا ہے تو اس کے منہ سے آگ یا نور اڑنے لگتا ہے تو بادل لرزتے ہیں اور گرجتے ہیں۔

حاشیہ جلالین جمل میں ہے: روی ان اذا اشتد غضبه علی السحاب طارت من فيه النار فتضطرب اجرام السحاب و ترتعد۔ (جمل ج ۱ ص ۲۳)

اور یہ ممکن ہے کہ بادلوں میں آپس میں ٹکرا کر بھی گرج کی آواز پیدا ہوجاتی ہو۔ سائنسدانوں کی بات بھی صحیح ہوسکتی ہے۔ لیکن اسی کو صرف گرجنے کا سبب متعین کرلینا یہ اسباب منقولہ عن الشرع سے صاف انکار ہے، اور تحقیق شرعی کے خلاف ہے۔ کہ گرجنے کے وہ وجوہ واسباب بھی ہیں جو جواب سوال اول میں بہ تفصیل منقول ہوئے۔ سائنسدانوں کی زبردست غلطی یہ ہے کہ انکی جو ناقص سمجھ میں آیا اس پر تو جزم ویقین کرلیا اور جو شرعی تحقیقات ہیں، اس پر جزم ویقین نہیں ۔ مولی تعالی ان کو فہم صائب عطا فرمائے اور قبول حق کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

کتاب الجنائز

مسئلہ (۵۱۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک شخص موت سے قبل وصیت کر گیا کہ میرے انتقال کے بعد میری ملکیت کا ثلث ۱-۳ حصہ اللہ کے لئے نکالا جائے اور اسی اللہ کے لئے نکالی ہوئی رقم میں سے یا اللہ کے لئے نکلی ہوئی رقم کی یافت کر کے اتنی رقم فلاں کو دینا، مگر مرحومہ کی وصیت کے موافق اب تک ایک ثلث رقم علیحدہ نہیں نکالی گئی اسی طرح اللہ رقم کی کچھ یافت نہیں کی گئی ہے اسی طرح جس شخص کو اللہ کے لئے رقم کی مد میں سے جو رقم مرحومہ کی وصیت کے موافق دینے کی تھی انتقال ہو گیا اس واقعہ کو مدنظر رکھتے ہوئے انتقال شدہ مرحومہ کا حق مرحومہ کے ورثہ کو حاصل کرنے کا حق شرع شریف کے موافق باقی رہتا ہے یا کہ فوت ہو جاتا ہے۔

بینوا توجروا المستفتی سیٹھ غلام حسین حاجی ابراہیم مورخہ ۳ / اگست ۱۹۳۸ء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اگر مرحومہ موصی لہا یعنی جس کے لئے وصیت کی گئی ہے شرعا قابل وصیت تھی اور شخص موصی (یعنی وصیت کرنے والا) کی موت کے بعد مقرر رقم کی وصیت کو بغیر ادا کئے ہوئے فوت ہوگئی تو مرحومہ موصیٰ لہا کے وارث اس مقررہ رقم کے بعد اسی وصیت کی بنا پر حقدار ہیں۔

در مختار میں ہے:

وانما تملك بالقبول الا اذا مات موصیه ثم هو بلاقبول فهو ای المال الموصیٰ به لورثته بلاقبول استحسانا ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۱۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین زاد اللہ برکاتہم ۔

صورت مسئولہ میں ایک شخص مسمی اللہ بخش متوفی جس کے کوئی بیوی بچہ نہیں ہے اپنا حصہ زمینداری ۴ پائی ۷ اکرانت دوم جو اتل واقع محال خدا بخش پکسر انوان پرگنہ و تحصیل سلون ضلع رائے بریلی ذریعہ دستاویز وقف نامہ رجسٹری شدہ بحق جامع مسجد پکسر انوان مورخہ ۲۷ رفروری ۱۹۴۰ء وقف کیا اور مسمی شیخ مولوی عبدالوہاب ولد خدا بخش و عبدالحکیم و عبدالجبار و محمد علیم پسران عبدالسبحان کو متولی تاحیات وہ اس کے بعد ان کے وارث جائز کو مقرر کیا مسمیان رحیم بخش و عبدالشکور پسران عبداللہ جو چچازاد بھائی وصاحب اولاد ہیں جن کا خورد و نوش و جملہ کاروبار دو پشت سے علیحدہ ہے رحیم بخش و عبدالشکور سے اور اللہ بخش ہمیشہ ناراض رہا اور نہیں چاہتا تھا کہ چھوڑے چنانچہ پہلے اس نے چند نمبر مزروعہ آراضی اپنے حصہ کی بیع کرڈالا بقیہ بحق جامع مسجد وقف کیا مسمی اللہ بخش وقف کنندہ بعارضۂ دق عرصے سے بیمار تھا اور دن بدن اس کی حالت خراب ہورہی تھی یہ وقف ڈیڑھ ماہ قبل انتقال کیا اور اپنا مکان مسکونہ چھوڑ کر مسمی پسران بخش کے مکان میں اٹھایا تھا یہیں عارضہ میں اس کا انتقال ہوا اسے یہ شکایت تھی کہ رحیم بخش و عبدالشکور رات کو گلا دباتے ہیں اللہ بخش کو یہ معلوم ہوا کہ عبدالحکیم و عبدالجبار متولیان نے درخواست داخل خارج دیا ہے اور ان لوگوں نے یہ چالاکی کی ہے کہ متولی ہمیشہ یہی رہیں گے ان کے بعد ان کے وارث متولی ہوں گے لہذا مسمی سراج الدین جو رحیم بخش کا سمدھی ہے اللہ بخش کو کچہری میں لیجا کر عذرداری نسبت اخراج متولی کرائیں لیکن بجائے موقوفی متولیان درخواست منسوخی وقف نامہ لکھوا کر داخل کردیا اللہ بخش محض ان پڑھ تھا انتقال کے چار روز قبل اللہ بخش نے کل بستی کے اشخاص کو بلا کر جو تقریبا پچاس ساٹھ کے تھے سب کو مخاطب کر کے کہا کہ میں نے اپنی کل جائداد جامع مسجد کے نام وقف کردی ہے سب بھائی ملکر انتظار کرو اور منشی عبداللہ صاحب ہیڈ ٹیچر اسکول پکسر انوان اور مولوی عبدالوہاب صاحب کو متولی کیا تم لوگ ذمہ دار ہو ہم حشر میں دامن گیر ہوں گے جو اس کے خلاف ہوگا بعد انتقال اللہ بخش رحیم بخش و عبدالشکور عذر دار مقدمہ داخل خارج ہیں کہ ہم لوگ وارث وحقدار ہیں اللہ بخش نے ہماری حق تلفی کی ہے اب دریافت طلب امر یہ ہے از روئے شرع شریف یہ جائداد ملک مسجد کی ہوئی یا رحیم بخش و عبدالشکور کی وارثا ملنی چاہئے۔ امور ذیل قابل لحاظ ہیں۔

(۱) مسمی اللہ بخش عرصہ ڈیڑھ سال سے بعارضہ دق بیمار اس مرض میں اس کا انتقال ہوا اور حالت بیماری ہی میں یہ وقف ڈیڑھ ماہ قبل از انتقال کے۔

(۲) بعد تحریر کے وقف اس کے متولی مولوی عبدالوہاب و عبدالحکیم تھے مسمی اللہ بخش تحریر وقف

نامہ سے لیکر انتقال کے وقت تک مولوی عبدالوہاب و مولوی عبداللہ صاحب کو متولی کہتا رہا۔

(۳) مولوی عبدالوہاب و منشی عبداللہ کی تولیت کو سب اہل بستی پسند کرتے ہیں ناپسند نہیں کرتے

(۴) نقل مسودہ وقف نامہ بجہت لفظ بالفظ ارسال ہے بندہ نواز من بعد سلام اصلا گذارش یہ ہے کہ بنظر بندہ نوازی جواب جلد عنایت فرمائیں کہ عدالت میں سات ۷ / رجون ۱۹۴۰ء کو پیشی مقرر ہے اگر قبل از پیشی جواب آجائے گا تو اس کے مطابق صلح نامہ داخل کر دیا جائے گا۔

المستفتی عبدالوہاب از پکسر انوان ڈاکخانہ پکسر انوان ضلع رائے بریلی

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اگر یہ واقعہ ہے کہ اللہ بخش نے مرض الموت میں اپنی کل جائداد جامع مسجد موضع پکسر انوان پرگنہ ملون ضلع رائے بریلی کے لئے وقف کی ہے اور اس کے صرف چچازاد دو بھائی رحیم بخش وعبدالشکور وارث موجود تھے اور انہوں نے اس وقف کو جائز نہیں رکھا تو شرعا ایک تہائی کی قدر کا وقف درست ہے اور باقی دو تہائی کا باطل ہے۔ ان دونوں کی ملک ہے اس لئے کہ مرض الموت کا وقف وصیت کا حکم رکھتا ہے جو تہائی میں نافذ ہوگا۔

ردالمحتار میں ہے: ولاشك ان الوقف فی مرض الموت وصية ۔

(ردالمحتار ج ۳ ص ۴۷۴)

اور اس بات میں شک نہیں کہ مرض الموت میں وقف کرنا وصیت ہے۔

فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے:

لو وقف فی مرض موته قال الطحطاوی هو بمنزلة الوصية بعد الموت والصحيح انه لايلزمه عند ابی حنيفة وعندهما يلزمه الا انه يعتبر من الثلث والوقف فی الصحة من جميع المال ۔

(ہدایہ اولین ص ۶۱۸)

اگر مرض موت میں وقف کیا تو امام طحاوی نے فرمایا کہ یہ وقف بمنزلہ وصیت کے ہے بعد موت کے اور صحیح مذہب یہ ہے کہ امام اعظم علیہ الرحمہ کے نزدیک وہ لازم نہیں اور صاحبین کے نزدیک لازم ہے لیکن وہ وقف تہائی میں معتبر ہوگا اور تندرستی کے زمانہ کا وقف پورا مال ہوتا ہے (اور قول صاحبین زیادہ معتمد ہے)

لہذا ایک تہائی جائداد جامع مسجد مذکور کے لئے وقف ثابت ہوئی اور دو تہائی رحیم بخش وعبدالشکور کی بطریق ارث مملوکہ ہوئی۔ اس کی نظیریں کتب فقہ میں بکثرت موجود ہیں چنانچہ علامہ شامی بحرالرائق سے ناقل ہیں۔

والحاصل ان المریض اذا وقف علی بعض ورثته ثم علی اولادھم ثم علی الفقراء فان جاز الوارث الاخر کان الکل وقفا واتبع الشرط والا کان الثلثان ملکا بین الورثة والثلث وقفا۔ (ردالمحتار ج ۳ ص ۳۷۴)

اور حاصل یہ ہے کہ مریض نے جب اپنے بعض وارثوں پر وقف کیا پھر ان کی اولاد پر پھر فقراء پر تو دوسرے وارث نے اس کو جائز رکھا تو کل وقف ہو جائے گا اور شرط کی متابعت ہوگی ورنہ دو تہائی وارثوں کی ملک ہو جائے گا اور ایک تہائی وقف۔

شامی میں بحر وفتاوی ظہیریہ سے ناقل ہیں:

رجل وقف دارا له فی مرضه علی ثلث بنات له ولیس له وارث غیرھن قال الثلث من الدار وقف والثلثان مطلق یصنعن بھما ماشئن قال الفقیه ابو اللیث ھذا اذا لم یجزن اما اذا اجزن صار الکل وقفا علیھن۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۳۷۴)

ایک شخص نے مرض الموت میں اپنے مکان کو اپنی تین لڑکیوں پر وقف کیا اور لڑکیوں کے علاوہ اس کا کوئی اور وارث نہیں ہے تو فرمایا کہ تہائی مکان وقف ہے اور دو تہائی مطلق تو وہ لڑکیاں اس دو تہائی کا جو چاہیں کریں فقیہ ابواللیث نے فرمایا کہ یہ جب ہے کہ انہوں نے اس کو جائز رکھا ہو لیکن جب انہوں نے ناجائز رکھا تو کل مکان ان پر وقف ہو جائے گا۔

اور جب تہائی جائداد جامع مسجد مذکور کے لئے وقف ہو چکی تو اب واقف کو اس کے بالقصد باطل ومنسوخ کرانے کا حق حاصل نہیں چہ جائے کہ کسی قریب سے بلاقصد واقف نامہ کی منسوخی عمل میں لائی جائے۔

درمختار میں ہے: فلایجوز له ابطاله ولا یورث عنه وعلیه الفتوی۔
(ردالمحتار ج ۳ ص ۲۶۹)

واقف کو وقف کے باطل کرنے کا حق حاصل نہیں اور نہ اس میں ارث جاری ہو سکے اسی قول پر فتوی ہے۔

بالجملہ اللہ بخش کی تہائی جائداد جامع مسجد مذکور کے لئے وقف ہے اس پر احکام وقف جاری ہوں گے یہ تہائی حصہ یا اس کا جز رحیم بخش وعبدالشکور کو ہرگز ہرگز بذریعہ وراثت نہیں مل سکتا اور باقی دو تہائی ان دونوں وارثوں کی ملک ہے انہیں اس پر ہر طرح کا اختیار حاصل ہے۔ اور وقف نامہ کے مقرر شدہ متولیان سے جن کی خیانت اور خود غرضی ظاہر ہو جائے وہ تولیت سے معزول ہو گئے باقی اپنے حال پر متولی رہے اور واقف کو متولی کے معزول کرنے کا حق حاصل ہے اور اگر کسی اور کا نام واقف یا اہل بستی زائد کریں تو وہ متولی ہو جائے گا لیکن یہ سب متولیان شرکت سے کام کریں گے کوئی متولی تنہا اپنی رائے سے تصرف نہیں کر سکتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

(۳۵)

باب صلوۃ الجنائز

مسئلہ (۵۱۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے اپنے آپ کو بطور خودکشی کے مار ڈالا تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں؟ اور مسلم شریف کی حدیث میں جو آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایسے شخص کی نماز پڑھنے سے انکار فرمادیا تو یہ آپ کا انکار فرمانا کس بنا پر تھا؟ بینوا توجروا

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

بلاشبہ ایسے شخص کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ چنانچہ در مختار میں ہے "من قتل نفسه ولو عمدا یغسل ویصلی علیه وبه یفتی وان کان اعظم وزرا من قتل غیره" یعنی جس شخص نے اپنے آپ کو عمداً قتل کیا تو اس کو غسل دیا جائے اور اس کی نماز پڑھی جائے اسی پر علماء نے فتوی دیا اگرچہ یہ دوسرے کے قتل کرنے سے زیادہ گناہ ہے۔ اور مسلم شریف کی حدیث کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کیا گیا جس نے خودکشی کی تھی تو آپ نے اس پر نماز پڑھنے سے انکار کردیا۔

اولا: اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ اس پر کسی نے نماز ہی نہ پڑھی ہو۔

ثانیا: ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نماز نہ پڑھنا زجر وتوبیخ کے لئے ہو، جیسے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مقروض پر نماز پڑھنے سے انکار فرمایا تھا۔ تو کیا صرف اتنی وجہ سے مقروض کے جنازہ کی نماز بھی نہ پڑھی جائیگی، بلکہ حقیقتاً حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے افعال بے شمار فوائد پر مبنی ہوتے تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۲۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
قبر پر اذان دینا کیسا ہے اور اگر کوئی شخص قبر اذان دینے کو برا سمجھے منع کرے اس کے لئے کیا حکم ہے؟۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

میت کو قبر میں اتارنے کے بعد قبر پر اذان کہنا یقیناً جائز ہے اذان سے میت کے لئے سات فائدے ہیں جو احادیث سے ثابت ہیں۔

(۱) میت اذان کی وجہ سے شیطان کے شر سے محفوظ رہیگا۔

(۲) کلمہ اللہ اکبر کہنے کی وجہ سے میت عذاب نار سے مامون رہے گا۔

(۳) میت کو کلمات اذان سے منکر نکیر کے سوالات کے جوابات یاد آجائینگے۔

(۴) اذان میں ذکر اللہ ہونے کے باعث میت عذاب قبر سے نجات پائیگا۔

(۵) اذان میں ذکر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہونے کی وجہ سے میت پر نزول رحمت ہوگی۔

(۶) میت کو اس تنگ وتاریک گڑھے میں سخت وحشت اور گھبراہٹ ہوتی ہے اذان کی بدولت دفع وحشت ہوگی اطمینان خاطر ہوگا۔

(۷) میت قبر میں غمگین وپریشان ہوتی ہے اذان کے سبب سے غم وپریشانی دفع ہوگی اور سرور وفرحت حاصل ہوگا اسی لئے بعض علمائے کرام نے اذان علی القبر کو مستحب فرمایا چنانچہ شامی میں مستحبات اذان کی شمار میں لکھا۔ وعند انزال الميت القبر۔

یعنی میت کے قبر میں اتارنے کے وقت اذان کہنا مستحب ہے۔ اور بعض علماء نے اسے سنت فرمایا ہے۔ اب جو شخص اس کو برا کہتا ہے وہ ایک مستحب وسنت کو برا کہتا ہے اور میت کو احادیث کے ثابت شدہ منافع سے محروم رکھتا ہے اور محض اپنی ناقص فہم سے جائز کو ناجائز قرار دیتا ہے ایسے شخص کو توبہ واستغفار کرنی چاہیئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۲۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

جس مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ہوتی ہو اس جگہ نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟۔ برائے مہربانی ان سوالوں کے جواب معتبر کتابوں کے حوالہ کے ساتھ اور مہر کے ساتھ اور دوسرے علمائے کے دستخط کے ساتھ روانہ فرمائیں آپ کی بہت بڑی مہربانی ہوگی۔

المستفتی دستخط میمن اللہ رکھا حاجی سلیمان چوکسی جامع مسجد کے پاس بمقام راج پیرا

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مطلقا مکروہ تحریمی ہے خواہ میت مسجد کے اندر ہو یا باہر خواہ نمازی مسجد میں ہوں یا باہر خود حدیث شریف میں ہے۔

من صلى على ميت فی المسجد فلاصلوة له ـ رواه ابن ابی شیبہ وفی روایۃ احمد وابی داؤد وفلا شئ لہ وفی روایۃ ابن ماجہ فلیس له شئ۔ (شامی ج اص ۶۲)

یعنی جس نے میت پر مسجد میں نماز پڑھی تو اس کی نماز ہی نہیں دوسری روایت میں ہے کہ اُسے کچھ اجر نہیں۔

تنویر الابصار و درمختار میں ہے:

وكرهت تحريما وقيل تنزيها (في مسجد جماعة هو) اى الميت (فيه) وحده او مع القوم (واختلف فی (الخارجة) عن المسجد وحده او مع القوم (والمختار الكراهة) مطلقا۔ (درمختار ج اص ۶۱۹)

شامی میں ہے: ان الحديث مؤيد للقول المختار من اطلاق الكراهة الذى هو ظاهر الرواية كما قدمناه فاغتنم هذا التحرير الفريد ـ (شامی ص ۶۲)

مولوی خرم علی غایۃ الاوطار ترجمہ درمختار میں لکھتے ہیں:

حدیث مذکور مؤید قول مختار کی ہے کہ نماز (جنازہ) مسجد کے اندر ہر صورت میں مکروہ ہے"۔

(غایۃ الاوطار ج اص ۴۱۶)

اس حدیث اور فقہ کی عبارات سے صاف طور پر ثابت ہوگیا کہ مسجد میں نماز جنازہ مطلق مکروہ

تحریمی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۲۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین شرع متین اس مسئلہ میں

(۱) کہ زید کی زوجہ کے شکم سے بچہ مردہ پیدا ہوا یعنی پیدا ہونے پر نہ تو رویا اور نہ اس میں زندگی کے کوئی آثار سانس وغیرہ نہیں پائے گئے اب زید مذکور کے اس بچہ کی نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں اور اس کو قبرستان میں دفن کیا جاوے تو کس طرح یا کیا صورت اختیار کی جائے استدعاء ہے کہ اس مسئلہ کے جواب میں قرآن وحدیث کا ثبوت ضرور دیا جاوے۔ بینوا توجرو

(۲) ہمارے قصبہ کے اندر مرض ہیضہ وبائی صورت میں پھیل رہا ہے جس کے دفعیہ کے واسطے ہم لوگوں نے رات کے وقت اپنے اپنے گھروں کے اندر باآواز بلند اذانیں دیں جس پر زید نے اعتراض کیا اور کہا کہ یہ بالکل ناجائز ہے۔ گھر گھر مسجد بنالی ہے ہم لوگوں نے ایک جلوس بھی مرتب کیا جس میں نعرۂ تکبیر نعرۂ رسالت نعرۂ غوثیہ لگاتے ہوئے اور صلوۃ وسلام بحضور سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے ہوئے گلی کوچوں میں گشت کیا لہٰذا درخواست ہے کہ مذکورۂ بالا جملہ مسائل کا جواب مفصل عنایت فرمایا جائے کہ شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے اور جو شخص ان کاموں سے منع کرے اس کیلئے کیا حکم ہے بینوا توجروا

المستفتی، ڈاکٹر تحسین بریلوی ضلع بریلی

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) جو بچہ شکم مادر ہی سے مردہ پیدا ہوا ہو۔ یہاں تک کہ بعد پیدائش نہ وہ رویا نہ اس میں آثار زندگی سے کوئی اثر پایا گیا تو اس کی ہرگز نماز جنازہ نہ پڑھی جائیگی۔ ابن ماجہ، نسائی شریف، بہ روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ حدیث مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اذا استھل الصبی صلے علیہ وورث "، بیہقی شریف، دار قطنی، حاکم کی حدیثوں میں مروی ہے " اذا استھل الصبی صلی علیہ وورث واذا لم یستھل لم یصل علیہ ولا یورث " ان احادیث کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ نبی کریم

علیہ الصلاۃ والتسلیم نے فرمایا: کہ جب بچہ نہ رویا تو نماز جنازہ نہ پڑھی جائے اور اس کو وارث نہ بنایا جائے تو جس نے اس حدیث کے خلاف کیا اور مردہ بچہ کی نماز جنازہ پڑھ لی تو وہ حکم حدیث شریف سے کتنا بے خبر اور جاہل قرار پایا بلکہ اس کا اپنے آپ کو اہل حدیث کہنا ہی غلط ثابت ہوا ان کو چاہئے کہ وہ بالاعلان اپنی غلطی کی بناء پر توبہ کرے ورنہ اپنے فعل کے ثبوت میں کوئی حدیث پیش کرے باقی رہا اس کا قبرستان میں دفن کرنا تو یہ صحیح ہے کہ وہ جز مسلم ہے لہٰذا مسلمانوں کے قبرستان میں ہی دفن ہوگا اس کیلئے کسی دلیل کی حاجت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) طبرانی کی حدیث شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی " اذااذن فی قریة امنها الله من عذابه ذالك اليوم " یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب کسی آبادی میں اذان کہی جائے تو اللہ اس آبادی کو اس دن امن میں رکھے گا۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ آبادی کو عذاب الٰہی سے بچانے کے لئے اذان کا کہنا بہترین ذریعۂ امن ہے۔ اور وبائی امراض عذاب الٰہی میں داخل ہیں۔

بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ کی حدیث میں وارد ہے " الطاعون بقية رجز او عذاب ارسل علي طائفة من بني اسرائيل فاذا وقع بارض وانتم بها فلا تخرجوا منها فراراً منه "

تو وبائی امراض سے امن کے لئے روزانہ اذان کہنا خود حدیث ہی سے ثابت ہوگیا۔ تو یہ مدعیان اہل حدیث خود حدیث سے کتنے بے خبر اور جاہل نکلے کہ حدیث کے خلاف کہہ دیا۔ پھر مزید جہالت ملاحظہ ہو کہ جہاں اذان ہو وہ مسجد ہو جاتی ہے۔ ان نادانوں کو یہ بھی خبر نہیں کی اذان کا خود مسجد میں کہنا تو مکروہ ہے۔ احادیث میں ہے قرون ثلثہ میں اذان دروازہ مسجد پر ہوتی تھی اور اذان جمعہ مقام زوراء پر ہوتی۔ تو کیا دروازہ مسجد اور زوراء شرعاً مسجد تھے۔

نیز حدیث شریف میں ہے " من ولدله ولد فاذن في اذنه اليمنى واقام في اذنه اليسرى لم يضره ام الصبيان "۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بچہ ہونے کے بعد اس کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جائے تو اس کو مرض ام الصبیان کا ضرر نہ ہوگا۔ تو اذان کا دافع مرض ہونا بھی ثابت ہوا اور یہ بھی ثابت ہوا کہ جس گھر میں بچہ پیدا ہوا ہے وہاں جا کر اذان واقامت کہی جائے گی۔ تو ان جہال اہل حدیث کے نزدیک تو ہر ایسا گھر مسجد ہو جائیگا۔ پھر ان کی یہ نادانی بھی دیکھئے کہ گلی کوچوں میں جلوس کا گشت کرنا اور اس میں درود شریف کا پڑھنا نعرۂ رسالت و نعرۂ غوثیت کا لگانا سبب نزول رحمت ہے۔

حدیث شریف میں ہے " عند ذکر الصالحین تنزل الرحمة "

تو کون نہیں جانتا ہے کہ درود شریف اور نعرۂ رسالت میں نبی الصالحین حضور علیہ السلام کا ذکر ہے اور نعرۂ غوثیت میں مرجع الصالحین حضور غوث پاک کا ذکر ہے اور ان کے ذکر کو حدیث نے سبب نزول رحمت قرار دیا تو جہاں رحمت کا نزول ہوگا وہاں سے عذاب دفع ہوگا اور وبائی امراض سے حفاظت وامن حاصل ہوگا بالجملہ۔ وبائی امراض کے دفع کرنے کے لئے اذان کا گھر گھر کہنا گلی کوچوں میں ایسے جلوس کا گشت کرنا احادیث ہی سے ثابت کر دیا گیا۔ غیر مقلدین ناجائز وممنوع ہونے پر کوئی صریح حدیث پیش نہیں کر سکتے بلکہ ان کا ان چیزوں کو ناجائز محض کہنا اپنی ناقص عقل سے ہے۔ شرم نہیں آتی کہ احادیث کی کھلی ہوئی مخالفت کرتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو اہل حدیث بھی کہتے ہیں اپنی ناقص رائے پر عمل کرتے ہیں اور براہ فریب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم حدیث پر عامل ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ ان کو ہدایت کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۱۰ صفر المظفر ۶۷/۱۳ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۲۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

حاجی صاحبان حج سے فارغ ہوکر اپنے ساتھ ایک سادہ چادر جس پر قرآن کریم کی آیات نقشی ہوتی ہیں لاتے ہیں وہ چادر میت کے اوپر ڈال کر قبرستان لے جاتے ہیں۔ نماز جنازہ پڑھتے وقت اس چادر کو ہٹا دینا چاہئے کہ نہیں؟۔ المستفتی تفضل حسین فرخ آباد

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

میت کے جنازے پر آیات کی لکھی ہوئی جو چادر ڈالی جاتی ہے اس کا بوقت نماز جنازہ ہٹا دینا ضروری نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۲۳)

حضرت اقدس مفتی اعظم صاحب قبلہ سنبھل سلام مسنون۔ مزاج گرامی۔
معروض ہو کہ مندرجہ ذیل مسائل کا جواب براہ کرم جلد ہی عنایت فرمائیں عین احسان ہوگا
(۱) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ ہوئی یا نہیں؟۔ ہوئی تو کس نے پڑھائی، نماز جنازہ جو تمام مسلمانوں کی ہوا کرتی ہے ویسی ہوئی یا اور طرح سے ہوئی؟ یہ مسئلہ عرصہ سے جھگڑے کا باعث بنا ہوا ہے شک رفع فرمائیں۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

حضور نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کے نماز جنازہ ہونے اور نہ ہونے میں مختلف اقوال ہیں، ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ حضور کی نماز جنازہ نہیں ہوئی فرشتے جن انس کے گروہ آتے اور درود وسلام عرض کرتے اور دعا کر کے واپس ہو جاتے۔ لیکن صحیح قول جس پر جمہور اہل سنت ہیں یہی ہے کہ حضور کی نماز جنازہ جیسے آج ہوتی ہے پڑھی گئی، گروہ کے گروہ اور تنہا متفرق طور پر لوگ آتے اور نماز جنازہ پڑھتے۔ مگر اس پر سب علماء بلا اختلاف متفق ہیں کہ نماز جنازہ کا نہ تو کوئی امام بنا نہ جماعت ہوئی کما حققه العلامه الزرقانی فی شرح المواهب والعلامة علی قاری فی شرح الشفا والمحقق الدهلوی فی ما ثبت من السنة و اشعة اللمعات۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۲۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں کہ
(۱) کیا حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ پڑھی گئی یا نہ پڑھی گئی یا صرف درود وسلام ہی پڑھا گیا۔ میزان شعرانی جلد اول صفحہ ۴۸۹ مسئلہ بارہویں میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز پڑھی ہے۔

ترجمہ ابن ماجہ کی پانچویں کتاب ابواب الجنائز صفحہ ۴۳۷ حدیث نمبر ۱۶۴۹ بروایت ابن عباس رضی اللہ شمائل ترمذی عربی باب ماجاء فی وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: یا صاحب رسول اللہ ﷺ

قبض رسول الله ﷺ قال نعم فعلموا ان قد صدق قالوا یا صاحب رسول الله ﷺ اتصل علی رسول الله ﷺ قال نعم و کیف قال یدخل قوم فیکبرون ویدعون ویصلون ثم یخرجون ثم یدخل قوم فیکبرون ویصلون ویدعون ثم یخرجون حتی یدخلو الناس

اور متعدد حدیث مشکوۃ وغیرہ میں موجود ہے۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ نماز جنازہ بموجب حوالہ بالا بغیر امامت ہوئی اور دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ حضور پر صرف درود وسلام ہی پڑھا گیا نماز نہیں ہوئی اور جو یہ کہے حضور ﷺ کی نماز جنازہ ہوئی وہ کافر ہے اس سے سلام جائز نہیں اس کو توبہ لازم ہے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

حضور علیہ السلام کی وفات پر بالفعل کوئی امام المسلمین اور امیر متعین نہیں تھا ہر مسلمان مستقل ولی تھا مسلمانوں نے نماز جنازہ فرداً فرداً بھی اور ایک ایک قوم نے جمع ہو کر بھی متفرق بہت سی نمازیں پڑھیں جیسا کہ آپ حدیثوں میں دیکھ رہے ہیں۔

فیکبرون ویدعون ویصلون ثم یخرجون۔ سے نماز جنازہ ہی مراد ہے نہ محض درود وسلام پڑھنا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) حضور نبی کریم کی نماز جنازہ کا مسئلہ مختلف مسائل سے ہے اس میں علماء سلف وخلف کے دو قول ہیں ایک جماعت اہل حق کا یہ قول ہے کہ حضور علیہ السلام کی نماز جنازہ نہیں ہوئی بلکہ فرشتے جن وانس تنہا یا گروہ کے گروہ حاضر ہوتے اور درود وسلام پیش کرتے پھر دعاء کر کے واپس ہوتے علامہ زرقانی شرح مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں:

ذهب الیه جماعة انه لم یصل علیه الصلوه المعتادة وانما کان الناس یا تون فیدعون۔ (زرقانی مصری جلد ۸ صفحہ ۹۴)

سیرۃ حلبی میں ہے:

ذکر انه دخل علیه ابو بکر وعمر ومعهما نفر من المهاجرین والانصار بقدر مایسع البیت فقال السلام علیك ایهاالنبی ورحمته وبرکاته وسلم والمهاجرون والانصار

کما سلم ابو بکر وعمر رضی الله عنهم ثم صفوا صفو فا لا یوأمهم احد و کانا ابو بکر وعمر فی الصف الاول الذی حیال رسول الله ﷺ فقالا اللهم انا نشهد انه بلغ ما انزل اليه ونصح لا متہ (الی اخر الدعاء) فیقول الناس آمین امیں وهذا یدل علی المراد بالصلاۃ علیه ﷺ الدعاء لا الصلاۃ علی الجنازۃ المعروفۃ عندهم ۔

(سیرۃ حلبی مصری جلد ۳ ۳۹۴)

لیکن اس میں وہ صحیح قول جو جمہور کا قول ہے یہی ہے کہ آپ کے جنازہ کی نماز اسی طرح ہوئی جس طرح کہ پڑھی جاتی ہے۔ تنہا تنہا شخصوں نے بھی پڑھی اور گروہ گروہ نے بھی پڑھی، لیکن اس نماز کی نہ باقاعدہ جماعت ہوئی، نہ کسی نے اس کی امامت کی۔ اور اس بات پر تو سب متفق ہیں کسی کا اختلاف نہیں کہ کسی نے حضور کے جنازہ کی نماز کی امامت ہرگز ہرگز نہیں کی۔ زرقانی میں ہے:

الصحیح الذی علیه الجمهور ان الصلوۃ علی النبی ﷺ کانت صلاۃ حقیقۃ لا مجر د الدعاء نعم لا خلاف انه لم یؤمهم احد علیه کما مر لقول علی هو امامکم حیاو میتا فلا یقوم علیه احد الحدیث رواه ابن سعد واخرج الترمذی ان الناس قالوا لابی بکر اتصل علی رسو ل الله ﷺ قال نعم قالوا و کیف نصلی قال یدخل قوم فیکبرون ویصلون ویدعون ثم یدخل قوم فیصلون فیکبرون ویدعون فرادی۔

(ملخصا زرقانی جلد ۸ صفحہ ۲۹۴)

خصائص کبریٰ میں ہے:

اخرج ابن اسحاق والبیهقی عن ابن عباس قال :لمامات رسول الله و ادخل الرجال فصلوا علیه بغیر امام ارسالا حتی 'فر غوا ثم ادخل النساء فصلین علیه ثم ادخل الصبیان فصلوا علیه ثم ادخل العبید فصلوا اعلیه ارسا لا لم یؤمهم علی رسول الله احد

(خصائص جلد ۲ صفحہ ۲۸۶)

علامہ علی قاری شرح شفا شریف میں اقوال نماز جنازہ نقل کرنے کے بعد خلاصہ تحقیق اس طرح لکھتے ہیں۔

اقول الاظهر انهم صلوا علیه فی محله وما کان یسع ذلك المحل اماما لقومه کله فصلوا فرادی لادراك فضله وتکرار الصلوۃ علیه من خصوصیات حکمه هذا ومن زعم ان

المراد بالصلوۃ ھنا دعاء فقد عدل عن الحقیقۃ من غیر قرینۃ صارفۃ۔

(شرح شفا مصری جلد ا صفحہ ۴۵۷)

سیرۃ حلبی میں ہے:

کانت صلاتھم علیہ ﷺ کصلاتھم علی غیرہ ای بتکبیرات اربع لا مجرد الدعا من غیر تکبیرات (وفیہ ایضا) والصحیح الذی علیہ الجمھور انھم صلوا علیہ اراد فکان یدخل علیہ فوج یصلون فرادی ثم یخرجون ثم یدخل فوج آخر فیصلون کذلک

(سیرۃ حلبی جلد ۳ صفحہ ۴۰۴)

اسی سیرۃ حلبی میں ہے:

والصحیح ان ھذا الدعاء کان ضمن الصلاۃ المعروفۃ التی باربع تکبیرات فقد جاء ان ابا بکر رضی اللہ عنہ دخل علیہ ﷺ فکبر اربع تکبیرات ثم دخل عمر رضی اللہ عنہ فکبر اربعا ثم دخل عثمان رضی اللہ عنہ فکبر اربعا ثم طلحۃ بن عبیداللہ والزبیر بن العوام رضی اللہ عنھما ثم تتابع الناس ارسالا یکبرون علیہ و قال ابن کثیر رحمہ اللہ وھذا الامر ای صلاتھم علیہ فرادی من غیر امام یؤمھم لجمع علیہ

(سیرۃ حلبی جلد ۳ صفحہ ۳۹۴)

حضرت شیخ محقق عبدالحق محدث دہلوی نے ماثبت من السنۃ میں فرمایا:

روی عن محمد انہ صلی علی النبی بغیرامام فی روایۃ فرادیٰ لا یؤمھم احد یدخل المسلمون زمرا فیصلون علیہ و یخرجون۔　(ماثبت من السنۃ ص ۱۴۰)

یہی شیخ مدارج النبوۃ میں فرماتے ہیں:

''اما نماز گذاردن بر آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم بجماعت نبود و جماعۃ می در آمدند بروے ونماز گذاردند بے جماعت و بیرون می آمدند وی گذاردند۔ ہمچنانکہ ترتیب صفوف است در جماعت و امامت نہ کرد بر جنازہ شریف رسول خدا ﷺ ہیچ یکے از امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ منقول است کہ فرمودہ در جنازہ رسول اللہ ہیچ کس امامت نہ کرد زیرا کہ آں حضرت علیہ السلام در حیات و ممات امام شماست و ایں از خواص آنحضرت علیہ السلام کہ نماز ہا متعدد کردند و تنہا تنہا گذاردند و روایت آمدہ اول کسے کہ نماز گذارد بروے اہل بیت وے بود علی و عباس و بنو ہاشم پس ازاں در آمدند مہاجرین بعد ازاں انصار پس تر می آمدند و مردم

فوج فوج ونمازمی گذاردند۔ (مدرج النبوۃ صفحہ ۵۶۶ جلد ۲)

تو ان عبارات سے روز روشن کی طرح ثابت ہو گیا کہ بنا بر قول صحیح کے حضور نبی کریم ﷺ کی نماز جنازہ حسب دستور چار تکبیروں کے ساتھ حضرات اہل بیت کرام وصحابہ عظام مہاجرین وانصار زنان ومردان نے تنہا تنہا بھی ادا کی اور گروہ کے گروہ نے بھی پڑھی۔ لیکن اس نماز جنازہ کی نہ جماعت ہوئی نہ کسی نے اس کی امامت کی۔ بالجملہ منکرین نماز جنازہ بھی علمائے سلف اور اہل حق کی ایک جماعت ہی ہے جن کا یہ قول نہ غلط ہے نہ باطل اور ان کے مقابلہ میں قائلین نماز جنازہ جمہور سلف وخلف ہیں۔ ان کا قول بہ نسبت ان کے قول کے زیادہ صحیح اور معتمد ہے تو جو قائلین نماز جنازہ کو اپنی جہالت سے کافر کہتا ہے اس پر خود ہی توبہ لازم ہے اور وہ خود ہی اسلام کا اہل نہیں رہا۔

اب باقی رہے مجیب مدرسہ امینیہ دہلی کے اول جواب میں یہ الفاظ" حضور علیہ السلام کی وفات پر بالفعل کوئی امام المسلمین اور امیر المؤمنین متعین نہیں تھا" غلط اور تصریحات کتب کے خلاف ہیں۔

چنانچہ سیرۃ حلبی میں اسی بحث میں صاف طور پر لکھا ہے:

قال ابن کثیر وھذا الامرای صلاتھم علیہ ﷺ فرادی من غیر امام یؤمھم مجمع علیہ و یقال لان المسلمین لم یکن لھم حینئذ امام لانھم لم یشرعوا فی تجھیز علیہ الصلاۃ والسلام الا بعد تمام البیعۃ لابی بکر رضی اللہ عنہ لانہ لما تحقق موتہ ﷺ اجتمع غالب المھاجرین علی ابی بکر الحدیث۔

تو ظاہر ہو گیا کہ حضور کی نماز جنازہ سے پہلے پہلے حضرت ابو بکر کی بیعت تمام ہو چکی تھی تو بوقت نماز جنازہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے امیر وامام متعین ہو چکے تھے۔ تو اس مجیب کے قول کا بطلان اور اس کی جہالت آشکار ہو گئی۔ پھر اس مجیب نے آخر جواب میں یہ کہا" اور جو لوگ کہتے ہیں کہ نماز نہیں ہوئی۔ اور جو یہ کہے کہ نماز جنازہ ہوئی وہ کافر ہے" مجیب نے ان دونوں کے لئے یہ حکم دیا" بالکل جاہل ناواقف ہیں" تو آخر الذکر کے لئے تو یہ حکم صحیح ہے لیکن اول الذکر کے لئے یہ حکم دینا یعنی جو لوگ کہتے ہیں کہ نماز نہیں ہوئی وہ بالکل جاہل ناواقف ہیں مجیب کی کس قدر جرأت ودلیری ہے کہ ہم نے ابتدائے جواب میں عبارات سے علماء سلف وخلف کا یہ قول پیش کر دیا ہے کہ حضور علیہ السلام کی نماز جنازہ نہیں ہوئی۔ تو اس جاہل مجیب نے ان سب علماء سلف وخلف کو ناواقف اور بالکل جاہل بنا ڈالا۔ لہٰذا یہ اس مجیب کے خود سخت ناواقف اور بالکل جاہل ہونے کی روشن دلیل ہے۔ مولیٰ تعالیٰ اس کو قبول حق کی

توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفر لہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۲۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

بعالی خدمت فیض درجت محبوب ملت حضرت مولینا مولوی رئیس المفتین الحاج الشاہ محمد اجمل صاحب قبلہ مفتی ہند دامت برکاتہم القدسیہ۔ بعد سلام مسنون معروض۔

کہ حضور پرنور حی قیوم ﷺ کی نماز جنازہ کس نے پڑھی اور کس نے پڑھائی؟ اگر نماز جنازہ نہ پڑھی گئی اور نہ پڑھائی گی اور صرف درود وسلام عرض کیا گیا تین روز تک، تو ایسی حالت میں ایک پیش امام جو اس بات کا قائل ہے کہ نماز جنازہ پڑھی گئی، اس شخص نے ایسا بیان کر کے سرور عالم ﷺ پر اتہام لگایا یا نہیں؟ اور آپ کے خصائص کبریٰ میں تنقیص کی یا نہیں؟ اگر کی تو پھر ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا اہل سنت والجماعت کو جائز ہے یا مکروہ اور ایسے ہی قاضی سے نکاح پڑھانا جو خود بدعقیدہ ہے جائز ہے یا نہیں؟۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حضور نے حرمین شریفین میں جا کر ایک نجدی غیر مقلد سے اس مسئلہ پر بحث وتمحیص بصورت مناظرہ فرمائی اور شکست فاش دی، اس مناظرہ کے دلائل بھی جو آپ نے وہاں پیش فرمائے تھے ارقام فرمائیں نیز اور دلائل کتب شرعیہ مستندہ سے ثابت فرمائیں کہ نماز جنازہ پڑھی گئی یا نہیں ؟ فتویٰ کا جواب تفصیل سے عنایت فرمائیں کیونکہ جناب کا تفصیل سے جواب دینا مشہور ہے۔ بینوا توجروا

آپ کا خادم العلماء والمشائخ محمد ظہور الدین گاؤ قصابان ٹونک راجستھان

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

الحمد للہ وکفی والصلوۃ والسلام علی حبیبہ المصطفیٰ وعلی آلہ وصحبہ وحزبہ وعلی کل من اجتبیٰ

امابعد: سوال کے جواب سے پہلے فریقین کا بنیادی اختلاف جس کا ذکر سوال میں تو نہیں ہے لیکن سوال کے ساتھ جو واقعات کا خط آیا ہے اس میں صراحۃ وہ مذکور ہے تو اس بنیادی اختلاف کا حل کر

دینا اس مسئلہ مجوثہ کے حل کے لئے ضروری ہے۔ لہٰذا ہم پہلے بنیادی اختلاف یعنی مسئلہ حیات النبی ﷺ پر دلائل قائم کرتے ہیں۔

دلیل اول: خود اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا ط بل احیاء عند ربھم یر زقون۔

(سورہ ال عمران)

اور جو اللہ کی راہ میں قتل کردیئے گئے ہرگز انہیں مردہ نہ خیال کرنا بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں روزی پاتے ہیں۔

اس آیۃ کریمہ سے ثابت ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ شہدائے کرام کو موت کے بعد ہی حیات عطا فرمادیتا ہے یہاں تک کہ ان پر رزق پیش کیا جاتا ہے تو شہداء کے لئے حیات کا اثبات تو نص قرآنی سے ثابت ہو گیا۔ اور ہمارے نبی ﷺ بلاشبہ شہید ہوئے۔

چنانچہ بخاری شریف میں حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

کان النبی ﷺ یقول فی مرضہ الذی مات فیہ یا عائشۃ ما ازال اجدالم الطعام الذی اکلت بخیبر فھذا اوان وجدت انقطاع ابھری من ذالک السم۔

(بخاری مصطفائی جلد ۲ صفحہ ۶۳۷)

یعنی نبی کریم ﷺ اپنے اس مرض میں جس میں آپ نے وفات پائی فرماتے تھے اے عائشہ میں اس کھانے کی تکلیف جس کو میں نے خیبر میں کھایا ہمیشہ پاتا رہا پس اس وقت تو میں اس زہر سے اپنی رگ دل کے کٹ جانے کا اثر پاتا ہوں۔

علامہ سبکی شفاء السقام میں اس حدیث شریف سے اس طرح استدلال فرماتے ہیں:

ان النبی ﷺ شھید فانہ ﷺ لماسم بخیبر واکل من الشاۃ المسمومۃ وکان ذالک سماقاتلا من ساعتہ مات منہ بشر بن البراء رضی اللہ عنہ وبقی النبی ﷺ وذالک معجزۃ فی حقہ صارالم السم یتعاھدہ الی ان مات بہ ﷺ فی مرضہ الذی مات فیہ ما زالت اکلۃ خیبر تعاونی حتی کان الا ن کان قطعت ابھری قال العلماء فجمع اللہ لہ بذالک بین النبوۃ والشھادۃ"

(شفاء السقام صفحہ ۱۲۱)

بیشک نبی ﷺ شہید ہیں، کہ جب خیبر میں حضور کو زہر دیا گیا اور آپ نے زہر آلود بکری کا کچھ گوشت کھایا اور وہ ایسا سم قاتل تھا کہ اس سے اسی وقت حضرت بشر بن براء رضی اللہ عنہ کی موت ہوئی اور نبی ﷺ باقی رہے اور یہ آپ کے لئے معجزہ تھا کہ زہر کی تکلیف یہاں تک سہتے رہے کہ جس مرض میں وفات پائی اسی زہر سے موت واقع ہوئی خیبر کے لقمہ کا اثر ہمیشہ عود کرتا رہا یہاں تک کہ اس وقت میری رگ دل کو کاٹ دیا۔ علماء نے فرمایا: اسی بنا پر اللہ نے حضور کیلئے نبوت اور شہادت کو جمع فرمادیا۔

علامہ قسطلانی مواهب لدنیہ میں اور علامہ زرقانی اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

واذا ثبت بشهادة قوله تعالیٰ: ولا تحسبن الذين قتلوا فی سبيل الله امواتا بل احياء عند ربهم يرزقون ،حياة الشهداء ثبت للنبی ﷺ بطريق الاولیٰ لانه فوقهم درجات قال السيوطی: وقل نبی الاوقد جمع مع النبوة وصف الشهادة فيدخلون فی عموم الآية۔

(زرقانی مصری جلد ۸ صفحہ ۳۱۲)

اللہ تعالیٰ کے اس قول (اور جو اللہ کی راہ میں قتل کردیئے گئے ہرگز انہیں مردہ نہ خیال کرنا بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں روزی پاتے ہیں) کی شہادت سے شہداء کی حیات ثابت ہوئی تو نبی ﷺ کے لئے بطریق اولیٰ ثابت ہوئی اس لئے کہ وہ ان سے درجوں بلند ہیں۔ علامہ سیوطی نے فرمایا کہ فقط نبی تو کم ہوئے ورنہ نبوت کے ساتھ وصف شہادت جمع کردیا گیا تو وہ انبیاء آیت کے عموم میں داخل ہوجائینگے۔

علامہ قاضی عیاض شفا شریف میں اور علامہ علی قاری اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

(وكان المسلمون) ای الصحابة والتابعون (ليرون) ای ليعتقدون (ان رسول الله ﷺ مات شهيدا)

(شرح شفا مصری جلد ۱ صفحہ ۶۲۲)

صحابہ وتابعین یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ بیشک رسول اللہ ﷺ کی شہید ہو کر موت واقع ہوئی۔ ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ ہمارے نبی ﷺ شہید ہوئے۔ اور جب آپ کا شہید ہونا حدیث بخاری اور اقوال صحابہ وتابعین وعلماء متقدمین ومتاخرین سے ثابت ہو چکا تو آیت مذکور سے آپ کے لئے حیات ثابت ہوئی لہٰذا حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا حیات النبی ہونا نہ فقط قرآن بلکہ احادیث سے بھی ثابت ہوا۔

بحث اول: شہداء کے جسم گلتے سڑتے نہیں ہیں۔

چنانچہ علامہ امام سبکی شفاء السقام میں فرماتے ہیں:

ذکر القرطبی ان اجساد الشھداء لا تبلی ۔ (شفاء السقام صفحہ ۱۴۵)

امام قرطبی نے ذکر کیا کہ بیشک شہداء کے اجسام گلتے سڑتے نہیں۔

علامہ شیخ احمد تفسیر صاوی میں تحریر فرماتے ہیں:

ولا تاکل الارض اجساد الشھداء ۔ (صاوی مصری جلد ا صفحہ ۶۴)

زمین شہداء کے اجسام کو نہیں کھاتی ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ شہداء کے اجسام گلتے سڑتے نہیں، زمیں ان کے جسموں کو کھاتی نہیں ۔ علامہ امام سبکی نے اسی سلسلہ میں چند شہداء صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعات احادیث سے اسی شفاء السقام میں نقل کئے ہیں:

وقد صح عن جابر ان اباہ وعمرابن الجموع رضی اللہ عنھم وھما ممن استشھد باحد ودفنا فی قبر واحد، حفر السیل قبر ھمافوجدا لم یتغیرا وکان احدھما قد جرح موضع یدہ فوضع علی جرحہ فدفن وھو کذلک فامیطت یدہ عن جرحہ ثم ارسلت فرجعت کما کانت وکان بین ذلک وبین احدست واربعون سنۃ ولما اجری معاویۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ العین اللتی استنبتھابالمدینۃ وذالک بعد احد بنحو من خمسین سنۃ ونقل الموتیٰ اصابت المسمارقدم حمزۃ رضی اللہ عنہ فسال منہ الدم وجد عبداللہ بن حرام کانما دفن بالامس وروی کافۃ اھل المدینۃ ان جدار قبر النبی ﷺ لما انھدم فی ایام الولید بدت لھم قدم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ وکان قتل شھیدا۔

(شفاء السقام صفحہ ۱۴۵)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بروایت صحیح مروی ہے کہ ان کے والد اور عمر بن جموع رضی اللہ عنہم ان صحابہ سے ہیں جو احد میں شہید ہوئے اور یہ دونوں ایک ہی قبر میں دفن کئے گئے پانی کے بہاؤ نے ان کی قبر کو کھول دیا تو ان کے جسم ایسے پائے گئے جن میں کسی طرح کا تغیر نہ ہوا تھا۔ اور ان کا ایک ہاتھ زخمی ہوا تھا اور اس نے اپنا ہاتھ زخم پر رکھ لیا تھا تو ان کو اسی طرح دفن کر دیا گیا تھا اب ان کا ہاتھ ان کے زخم سے علیحدہ کیا گیا۔ پھر اس کو جب چھوڑ دیا تو ہاتھ اپنے پہلے حال کی طرف لوٹ گیا اور اس واقعہ کے اور جنگ احد کے درمیان ۴۶ سال کی مدت گذری اور جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے لئے پانی کی نہر کھدوائی جو جنگ احد کے پچاس سال کے بعد شروع ہوئی اور مردوں کو منتقل کیا اسی

میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قدم پر پھاوڑا لگ گیا تو اس سے خون بہنے لگا اور عبداللہ بن حرام کو ایسا پایا گیا کہ انہیں کل ہی دفن کیا گیا ہے اور تمام اہل مدینہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے روضہ کی دیوار زمانہ ولید میں منہدم ہوگئی تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قدم ظاہر ہوگیا اور وہ شہید ہوئے تھے تو ان احادیث سے یہ ثابت ہوگیا کہ شہداء کے اجسام گلتے سڑتے نہیں اور زمین ان کے اجسام کو کھاتی نہیں۔ تو شہداء کی حیات جب ثابت ہوگئی اور ہمارے نبی ﷺ کا شہید ہونا پہلے ثابت ہو چکا۔ لہذا مسئلہ حیات النبی کا ثبوت اس سے ظاہر ہوگیا۔

بحث دوم: حضرات انبیائے کرام کے اجسام بعد وفات نہ گلتے سڑتے ہیں نہ انہیں زمیں کھا سکتی ہے۔ تو ان کے لئے حیات ثابت ہے۔

علامہ سیوطی نے شیخ الشافعیہ ابو منصور بغدادی کا یہ قول نقل کیا: " ان الانبیاء لا یبلون ولا تاکل الارض منهم شیئا" (انباء الاذکیا صفحہ ۸)

بیشک انبیاء گلتے سڑتے نہیں اور نہ زمین ان کا کچھ کھا سکے۔

امام بیہقی کتاب الاعتقاد میں فرماتے ہیں:

الانبیاء بعد ما قبضوا ردت الیهم ارواحهم فهم احیاء عند ربهم کالشهداء۔

(انباء الاذکیاء صفحہ ۷)

انبیاء کی روحیں قبض ہو جانے کے بعد پھر اجسام کی طرف واپس کر دی جاتی ہیں تو وہ شہداء کی طرح اپنے رب کے پاس زندہ ہیں۔ نیز حیات انبیاء علیہم السلام پر بکثرت احادیث دلالت کرتی ہیں۔

ابوداؤد، نسائی، دارمی، بیہقی میں مروی ہے:

ان الله حرم علی الارض اجساد الانبیاء" (مشکوۃ شریف صفحہ ۱۲۰)

بیشک اللہ نے زمیں پر انبیاء کے جسموں کو حرام کر دیا ہے۔

ابن ماجہ میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ان الله حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء فنبی الله حی یرزق"

(مشکوۃ صفحہ ۱۲۱)

اللہ نے زمین پر انبیاء کے جسموں کا کھانا حرام کر دیا ہے تو اللہ کا نبی زندہ ہے رزق دیا جاتا ہے۔

ابو یعلی نے اپنی "مسند" میں اور ابن عدی نے "کامل" میں اور بیہقی نے "کتاب حیاۃ الانبیاء"

میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون" (جامع صغیر جلد ا صفحہ ۱۰۳)

انبیاء زندہ ہیں قبروں میں اپنی نماز پڑھتے ہیں۔

ابونعیم نے حلیہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

مررت بقبرہ موسیٰ علیہ السلام وھو قائم یصلی فیہ ۔

(انباء الاذکیاء للسیوطی صفحہ ۲)

میں موسیٰ علیہ السلام کی قبر پر گذرا تو وہ اس میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔

ابونعیم دلائل النبوۃ میں حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے راوی:

قال لقد رأیتنی (لیالی الحرۃ) وما فی مسجد رسول اللہ ﷺ غیری وما یاتی وقت صلاۃ الا وسمعت الاذان من القبر۔ (انباء الاذکیاء صفحہ ۳)

انہوں نے فرمایا: میں نے زمانہ حرہ میں دیکھا اور مسجد نبوی میں میرے سوا اور کوئی نہ تھا کہ نماز کا جو وقت آتا تو میں قبر شریف سے اذان کی آواز سنتا۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں، ان کے جسموں کو نہ زمین کھا سکتی ہے نہ وہ گلتے سڑتے ہیں۔ تو ہمارے نبی تو نہ فقط نبی بلکہ نبی الانبیاء ہیں تو ان کے حیات النبی ہونے میں کسی شبہ وشک کو راہ نہیں۔

بحث سوم: ہمارے نبی ﷺ میں نبوۃ وشہادت دونوں باتیں جمع ہیں۔

چنانچہ علامہ سبکی شفاء السقام میں فرماتے ہیں:

فجمع اللہ بذالک بین النبوۃ والشھادۃ" (شفاء السقام صفحہ ۱۴۱)

تو حضور کے لئے اسی بنا پر اللہ نے نبوت اور شہادت کو جمع فرما دیا۔

حضرت احمد اور ابو یعلی اور طبرانی اور حاکم مستدرک میں بیہقی دلائل النبوۃ میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے راوی جس میں یہ الفاظ بھی ہیں" ان اللہ اتخذہ نبیا واتخذہ شھیدا ۔

(انباء الاذکیاء صفحہ ۶)

بیشک اللہ نے حضور علیہ السلام کو نبی اور شہید بنایا۔ تو جب ہمارے نبی ﷺ کے لئے نبوت اور شہادت دونوں فضل ثابت ہوئے تو ان کی حیات بنا بر شہادت نص قرآنی سے ثابت ہو گئی۔ اور حضور اکرم

ﷺ کی حیات بنابر نبوت احادیث کثیرۃ متواتر سے ثابت۔

چنانچہ یہی علامہ سیوطی اس میں فرماتے ہیں:

فاقول حیاۃ النبی ﷺ فی قبرہ ہو وسائر الانبیاء معلومۃ عندنا حتما قطعیا لما قام عندنا من الادلۃ فی ذالک و تواترت بہ الاخبار الدالۃ علی ذالک۔

پس میں کہتا ہوں کہ نبی ﷺ کی قبر میں حیات اور تمام انبیاء کی ہمارے نزدیک قطعی حتمی طور پر معلوم ہے کہ اس میں دلیلیں قائم ہوچکیں اور اس پر دلالت کرنے والی خبریں بہ تواتر ثابت ہوچکیں۔

علامہ قسطلانی اپنی کتاب مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں:

ولا شك ان حیاۃ الانبیاء علیہم السلام ثابتۃ معلومۃ مستمرۃ ثابتۃ ونبینا ﷺ افضلہم واذا کان کذالك فینبغی ان تکون حیاتہ اکمل واتم من حیاۃ سائرہم

(شرح الزرقانی جلد ۸ صفحہ ۳۰۹)

اور بیشک بلاشبہ انبیاء علیہم السلام کی حیات مستمر اور معلوم اور ثابت ہے اور ہمارے نبی تو افضل الانبیاء ہیں۔

اور جب یہ حقیقت ہے تو حضور کی حیات ان تمام انبیاء کی حیات سے تمام تر اور کامل تر ثابت ہو گئی۔ علامہ علی قاری شرح شفا شریف میں تحریر فرماتے ہیں:

فمن المعتقد المعتمد انہ ﷺ حی فی قبرہ کسائر الانبیاء فی قبورہم وہم احیاء عند ربہم وان لا رواحہم تعلقا بالعالم العلوی والسفلی کما کانوا فی العالم الدنیوی۔

(شرح شفا جلد ۲ صفحہ ۱۲۶)

اور معتمد عقیدہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ اپنی قبر میں زندہ ہیں جیسا کہ تمام انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں تو انبیاء اپنے رب کے حضور زندہ ہیں ان کی روحوں کا تعلق عالم علوی و سفلی سے اسی طرح ہے جس طرح دنیوی حال میں تھا۔ تو حضور نبی کریم ﷺ کا حیات النبی ہونا قرآن کریم سے بھی ثابت۔ بکثرت احادیث سے بھی ثابت۔ اقوال سلف و تصریحات خلف سے بھی ثابت لہٰذا اب حیات النبی کا منکر کوئی مسلمان تو ہو نہیں سکتا۔ وللہ الحمد والمنۃ

بحث چہارم: حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے جو یہ حیات ثابت کی گئی ہے اس سے صرف حیاۃ ارواح مراد نہیں کہ روح کو موت نہیں بلکہ وہ زندہ رہتی ہے۔

چنانچہ علامہ سبکی شفاء السقام میں فرماتے ہیں: " والروح باقیة لم تمت ۔

(شفاء السقام صفحہ ۱۲۲)

اور روح باقی رہتی ہے وہ مرتی نہیں۔

تو اب اس حیات سے مراد روح مع جسم کی حیات ہے اور ایسی حیات سوائے شہداء کے اور مؤمنین کے لئے ثابت نہیں ۔ چنانچہ حضرت علامہ سیوطی شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور میں فرماتے ہیں۔

الفرق بین حیاة الشهداء وغیرهم من المؤمنین الذین ارواحهم فی الجنة من وجهین احدهما ان ارواح الشهداء تخلق لها اجساد فان الشهداء بذلوا اجسادهم للقتل فی سبیل الله فعوضوا عنها بهذه الاجساد فی البرزخ والثانی انهم یرزقون من الجنة وغیرهم لم یثبت فی حقه مثل ذالك ۔ ملخصا ۔ (شرح الصدور صفحہ ۱۰۶/ ۱۰۷)

شہداء کی حیات اور ان کے سوا ان مؤمنین کی حیات میں فرق جن کی روحیں جنت میں ہیں دو وجہ پر ہے۔ایک وجہ یہ ہے کہ شہداء کی روحوں کے لئے اجسام پیدا کردیئے جاتے ہیں اس بنا پر کہ شہداء نے اللہ کے راستہ میں قتل کے لئے اپنے جسموں کو پیش کردیا تو برزخ میں انہیں ان جسموں کے عوض یہ دوسرے اجسام عطا فرمائے گئے دوسری وجہ یہ ہے کہ شہداء کو جنت میں رزق دیا جاتا ہے۔اور غیر شہداء کے حق میں یہ خصوصیت ثابت نہیں ۔تو اگر شہداء اور مؤمنین کی حیات میں ایسا بین فرق نہ ہوتا تو قرآن کریم اور احادیث ان کی حیات کو اس خصوصیت کے ساتھ ہرگز ذکر نہ کرتیں ۔لہٰذا شہداء کے لئے حیات روح مع جسم کے ثابت ہوگئی جس کے ثبوت بحث اول میں کافی گذرے ۔اور یہی جمہور کا قول ہے۔

چنانچہ علامہ سبکی شفاء السقام میں فرماتے ہیں:

ان الشهداء احیاء حقیقة وهو قول جمهور العلماء ۔

(شفاء السقام صفحہ ۱۲۲)

بے شک شہداء حقیقۃً زندہ ہیں اور یہی جمہور علماء کا قول ہے۔

اب باقی رہی حیات انبیاء علیہم السلام تو اس حیات سے بھی روح مع جسم کی حیات مراد ہے۔مگر حیات انبیاء حیات شہداء سے بدرجہا کامل ترین وافضل ترین ہے۔

علامہ سبکی شفاء السقام میں فرماتے ہیں:

حیاۃ الشھداء اکمل واعلیٰ فھذا النوع من الحیاۃ والرزق لا یحصل لمن لیس فی رتبتھم اما حیاۃ الانبیاء اعلیٰ واکمل واتم من الجمیع لانھا للروح والجسد علی الدوام علی ماکان فی الدنیا علی ما تقدم من جماعۃ من العلماء۔

(شفاء السقام صفحہ ۱۵۴)

شہداء کی حیاۃ اکمل اور اعلیٰ ہے اور ایسی حیات اور رزق اس کے لئے حاصل نہیں جو ان کا ہمرتبہ نہیں لیکن انبیاء کی حیات سب سے اعلیٰ اور اکمل اور تمام تر ہے اس لئے کہ ان کے لئے جیسی کہ دنیا میں روح وجسم کے لئے حیات حاصل تھی وہ ہمیشہ تک حاصل ہے جیسا کہ جماعت علماء کا قول گذرا۔

شیخ الاسلام علامہ سمہودی وفاء الوفا میں فرماتے ہیں:

ولا شک فی حیاتہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد وفاتہ و کذا سائر الانبیاء علیھم الصلاۃ والسلام احیاء فی قبورھم حیاۃ اکمل من حیاۃ الشھداء التی اخبر اللہ تعالیٰ بھا فی کتابہ العزیز و نبیینا ﷺ سید الشھداء۔ (وفاء الوفاء مصری جلد۲ صفحہ ۴۰۵)

اور حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد حیاۃ میں کوئی شک نہیں۔ اسی طرح تمام انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں ان کی حیاۃ شہداء کی اس حیاۃ سے کامل تر ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں خبر دی ہے اور ہمارے نبی ﷺ کی وفات کے بعد حیاۃ میں کوئی شک نہیں۔ اسی طرح تمام انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں ان کی حیاۃ شہداء کی اس حیاۃ سے کامل تر ہے جسکی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں خبر دی ہے اور ہمارے نبی ﷺ تو شہداء کے سردار ہیں۔ اسی میں ہے۔

واما ادلۃ حیاۃ الانبیاء فمقتضاھا حیاۃ الابدان کحالۃ الدنیا مع الا ستغناء عن الغذاء ومع قوۃ النفوذ فی العالم۔ (وفاء الوفا مصری جلد۲ صفحہ ۴۰۷)

لیکن حیاۃ انبیاء کی دلیلیں تو ان کا مقتضی یہ ہے کہ دنیا کے حال کی طرح اجسام انبیاء کو حیات حاصل ہے باوجود اس کے کہ وہ غذا سے مستغنی ہیں اور انہیں عالم میں نفوذ کی قوت حاصل ہے۔ حضرت شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی مدارج النبوۃ میں فرماتے ہیں:

"بدانکہ حیاۃ انبیاء صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہم اجمعین متفق علیہ است میان علماء ملت و ہیچ کس خلاف نیست دراں کامل تر وقوی تر از وجود حیات شہداء ومقتولین فی سبیل اللہ کہ آں معنوی اخروی است عند اللہ وحیاۃ انبیاء حیات حسی دنیاوی است" (مدارج النبوۃ جلد۲ صفحہ ۲۷۵)

حق سبحانہ حرام گردانیدہ است بر زمیں کہ بخورد اجساد انبیاء علیہم السلام واز ینا معلوم میشود کہ حیاۃ انبیاء حیات حسی دنیاوی است نہ مجرد لقائے ارواح چنانچہ شہداء را ہم دراجوف طیورے اندازند''

(صفحہ ۵۷۶)

جانو کہ انبیاء علیہم اسلام کی حیات کا مسئلہ علماء ملت میں ایسا متفق علیہ ہے کہ اس میں پانچ شخص بھی مخالف نہیں۔ ان کی حیات شہداء اور مقتولین فی سبیل اللہ کی حیات سے بہت کامل اور زائد قوی ہے کہ حیات شہداء تو عند اللہ معنوی اخروی ہے اور حیات انبیاء حسی و دنیوی حیات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمیں پر انبیاء علیہم السلام کے جسموں کا کھانا حرام کر دیا ہے تو اسی سے معلوم ہو گیا کہ انبیاء کی حیات حسی و دنیوی حیات ہے، نہ فقط روحوں کی ملاقات جیسا کہ ارواح شہداء پرندوں کے جوف میں داخل ہو جاتی ہیں۔

ان کثیر عبارات سے آفتاب سے زائد روشن طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ شہداء کی حیات سے بھی اعلیٰ واقویٰ اور تمام تر وکامل تر انبیاء علیہم السلام کی حیات حسی دنیوی حقیقی حیات ہے ان کی ارواح واجسام کو دنیا میں جیسی حیات حاصل تھی اسی طرح ان کی وفات کے بعد ان کی ارواح ان کے اجسام میں واپس کر دی جاتی ہیں۔ تو ان کے اجسام کو نہ مٹی کھاتی ہے نہ وہ گلتے سڑتے ہیں۔ لہٰذا انبیا کرام اپنے اجسام کے ساتھ اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور عالم میں تصرف کرتے ہیں۔ الحاصل اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ اہل سنت و جماعت کا متفقہ عقیدہ یہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے لئے حسی دنیوی حقیقی حیات قرآن کریم اور احادیث اور اقوال سلف وخلف سے ثابت ہے۔ اس پر کافی دلائل پیش کر دیئے گئے لیکن اس مسئلہ میں وہابیہ دیو بندیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ فرقہ حیات النبی ہی کا قائل نہیں ان کے نزدیک اجسام انبیاء کو مٹی کھا لیتی ہے اور وہ گلتے سڑتے ہیں تو اس گمراہ فرقہ نے ہماری پیش کردہ آیت کریمہ اور احادیث اور تمام اقوال سلف وخلف کو ٹھکرا دیا اور ان کے خلاف اپنا ناپاک عقیدہ گڑھا۔ چنانچہ اس فرقہ کے پیشوا امام الوہابیہ مولوی اسمٰعیل دہلوی نے تقویۃ میں صاف صاف لکھ دیا اور محض اپنی دیدہ دلیری سے اس کو حدیث بنا کر اس طرح پیش کیا کہ گویا حضور کریم ﷺ نے یہ فرمایا:

''یعنی میں بھی ایک دن مر کر مٹی میں ملنے والا ہوں''

(تقویۃ الایمان مطبوعہ مرکنٹائل دہلی صفحہ ۶۹)

اس عبارت میں امام الوہابیہ نے اپنا صاف طور پر یہ عقیدہ بتا دیا کہ نبی مر کر مٹی میں مل جاتا ہے یعنی نبی کے جسم کو زمین کھا لیتی ہے اور اسکا جسم گلتا سڑتا ہے۔ تو اس میں حیات النبی کا صاف انکار نہیں ہے؟

تو اور کیا ہے۔

اب باقی رہا حضور نبی کریم ﷺ کی نماز جنازہ کا مسئلہ تو اہل سنت میں یہ مسئلہ خود مختلف فیہ ہے اہل سنت کی ایک جماعت علماء تو یہ فرماتی ہے کہ حضور کی نماز جنازہ نہیں ہوئی فرشتے جن ۔انس حجرہ شریف میں حاضر ہوئے اور درود وسلام پڑھ کر دعا کر کے واپس ہو جاتے۔

چنانچہ علامہ زرقانی شرح مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں:

ذهب اليه جماعة انه لم يصل عليه الصلوة المعتادة وانما كان الناس ياتون فيدعون ۔ (زرقانی مصری جلد ۸ صفحہ ۹۴)

ایک جماعت اس طرف گئی کہ حضور کی نماز جنازہ معروف نہیں پڑھی گئی سوا اس بات کے کہ لوگ حاضر ہوتے اور دعا کرتے سیرۃ حلبی میں ہے:

وذكر انه دخل عليه ﷺ ابو بكر وعمر ومعهما نفر من المهاجرين والانصار بقدر مايسع البيت فقالا السلام عليك ايها النبى ورحمة الله وبركاته وسلم المهاجرون والانصار كما سلم ابو بكر وعمر رضى الله عنهم ثم صفوا صفو فالايؤ مهم احد وكان ابو بكر وعمر فى الصف الاول الذى حيال رسول الله فقال: اللهم انانشهد انه قد بلغ ما انزل به ونصح لا مته وجاهد فى سبيل الله حتى اعز الله دينه وتمت كلمته (الى آخر الدعا) يقول آمين آمين وهذايدل على المراد بالصلوة عليه ﷺ الدعاء لاالصلاة على الجنازة المعروفة عندهم۔ (سیرۃ حلبی مصری جلد ۳ صفحہ ۳۹۴)

اور مذکور ہے کہ حضور ﷺ کے حجرہ میں حضرت ابوبکر اور عمر اور ان کے ساتھ مہاجرین وانصار کا ایک گروہ داخل ہوا بمقدار گنجائش حجرہ شریف کے تو حضرت ابوبکر وعمر نے عرض کیا تم پر سلام ہو اے نبی اور اللہ کی رحمت وبرکتیں اور مہاجرین وانصار نے بھی انہیں کی طرح سلام پیش کیا۔ پھر انہوں نے صفیں بنالیں اور کوئی ان کا امام نہیں تھا اور ابوبکر وعمر پہلی صف میں حضور رسول اللہ ﷺ کے مقابل تھے انہوں نے یہ دعا کرنی شروع کی اے اللہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بیشک حضور ﷺ نے تبلیغ فرمادی جو ان کی طرف نازل ہوا اور اپنی امت کو نصیحت فرمائی اور اللہ کے راستہ میں جہاد کیا یہاں تک کہ اللہ نے اپنے دین کو عزت دی اور اس کے کلمہ کو تمام کیا۔ (اخیر دعا تک) لوگوں نے آمین آمین کہی تو یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ صلاۃ سے مراد حضور کے سامنے دعا کرنا ہے نہ وہ نماز جنازہ جو لوگوں میں معروف ہے۔ لیکن

اہل سنت کے جمہور علماء کا قول معتمد وصحیح یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی نماز جنازہ اسی طرح ہوئی جس طرح وہ ہوا کرتی ہے۔ مگر اس نماز جنازہ کی نہ تو باقاعدہ جماعت ہوئی نہ اس کی کسی نے امامت کی۔

چنانچہ علامہ زرقانی شرح مواہب میں فرماتے ہیں:

الصحیح الذی علیه الجمهور ان الصلاة علی النبی کانت صلاة حقیقة لامجرد الدعاء نعم لا خلاف انه لم یؤ مهما احد علیه ملخصا

(زرقانی مصری جلد ۸ صفحہ ۲۹۴)

وہ صحیح قول جس پر جمہور ہیں کہ نبی ﷺ کی صلاۃ حقیقۃ نماز ہی تھی وہ فقط دعا نہ تھی ہاں اس بات میں تو خلاف ہی نہیں ہے کہ اس نماز کی کسی نے امامت نہیں کی۔ علامہ علی قاری شرح شفا شریف میں اقوال نماز جنازہ نقل کر کے خلاصہ تحقیق اس طرح لکھتے ہیں۔

اقول الا ظهر انهم صلوا علیه فی محله وما کان یسع ذالك المحل اما مالقومه کله فصلوا افرادی لا دراك فضله وتکرار الصلوة علیه من خصوصیات حکمه هذا ومن زعم ان المراد بالصلاة هنا الدعا فقدعدل عن الحقیقة من غیرقرینة صار فة۔

(شرح شفا مصری جلد ۱ صفحہ ۷۵۴)

میں کہتا ہوں کہ ظاہر تو قول یہ ہے کہ لوگوں نے حجرہ حضور میں نماز جنازہ پڑھی اور وہ حجرہ تمام قوم کی امامت کا گنجائش نہیں رکھتا تھا تو لوگوں نے تنہا تنہا نماز جنازہ پڑھی کہ فضل کا پانا اور نماز جنازہ کا بار بار ہونا یہ حضور علیہ السلام کے خصوصی احکام سے ہے۔ اور جس شخص نے یہ خیال کیا کہ یہاں صلاۃ سے مراد دعا ہے تو اس نے بلا کسی قرینہ صارفہ کے حقیقی معنیٰ سے عدول کیا۔ علامہ علی حلبی سیرۃ حلبی میں فرماتے ہیں

کانت صلاتهم علیه کصلاتهم علی غیر ای بتکبیرات اربع لامجرد الدعاء من غیر تکبیرات' (وفیه ایضا) والصحیح الذی علیه الجمهور انهم صلوا علیه فراد فکان یدخل علیه فوج اخر فیصلون کذالك۔

(سیرۃ حلبی مصری جلد ۳ صفحہ ۲۰۴)

اور حضور اکرم ﷺ کی نماز جنازہ ایسی ہی تھی جیسی دوسرے کی نماز جنازہ ہوتی ہے یعنی چار تکبیروں کے ساتھ نہ بغیر تکبیروں کے فقط دعا کرنا اور وہ صحیح قول جس پر جمہور علماء ہیں کہ لوگوں نے حضور کی نماز جنازہ تنہا تنہا پڑھی۔ تو ایک گروہ حجرہ میں داخل ہوتا اور تنہا نماز پڑھتے پھر وہ باہر آجاتے پھر دوسری جماعت اندر آتی اور وہ اسی طرح نماز پڑھ لیتی۔

(وفیہ ایضاً) والصحیح ان ھذا الدعا کان ضمن الصلاۃ اربع تکبیرات فقد جاء ان ابا بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دخل علیہ الصلوۃ والسلام فکبر اربع تکبیرات ثم دخل عمر رضی اللہ عنہ فکبر اربعا ثم دخل عثمان رضی اللہ عنہ فکبر اربعا ثم طلحۃ ابن عبید اللہ والزبیر بن العوام رضی اللہ عنھم ثم تتابع الناس ارسالا یکبرون علیہ وقال ابن کثیر رحمہ اللہ وھذا الامرای صلاتھم علیہ فرادی من غیر امام یومھم مجمع علیہ۔

(سیرۃ حلبی مصری جلد۳ صفحہ ۳۹۲)

اور صحیح قول یہ ہے کہ یہ دعا اس نماز کے ضمن میں تھی جو چار تکبیروں کے ساتھ معروف ہے اور وارد ہوا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کے حجرہ میں داخل ہوئے اور انہوں نے چار تکبیریں کہیں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ داخل ہوئے اور انہوں نے چار تکبیریں کہیں۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ داخل ہوئے اور انہوں نے چار تکبیریں کہیں۔ پھر حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور زبیر بن العوام رضی اللہ عنہم داخل ہوئے۔ پھر لوگوں کا بھیجنا پے در پے جاری رہا تو وہ بھی تکبیریں کہتے۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ باتیں یعنی لوگوں کا بغیر امام کے حضور ﷺ کی نماز جنازہ کا تنہا تنہا پڑھنا متفق علیہ اجماعی مسئلہ ہے۔

حضرت شیخ محقق عبد الحق محدث دہلوی ماثبت من السنۃ میں فرماتے ہیں:

روی عن محمد انہ صلی علی النبی بغیر امام وفی روایۃ فرادی لا یومھم احد یدخل المسلمون زمرافیصلون علیہ ویخرجون۔

(ماثبت من السنۃ صفحہ ۱۲۰)

حضرت امام محمد سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کی نماز جنازہ بغیر امام کے پڑھی گئی اور ایک روایت میں ہے تنہا تنہا ہوئی کسی نے ان کی امامت نہیں کی مسلمانوں کے متفرق گروہ داخل ہوئے اور نماز پڑھتے اور حجرہ سے باہر آجاتے۔

یہی شیخ محقق مدارج النبوۃ میں فرماتے ہیں:

''امانماز گذاردن بر آنحضرت ﷺ بجماعت نہ بود جماعۃ می در آمدند بروے ونماز گذاردند بے جماعت وبیرون می آمدند پس جماعت دیگری در آمدند ومی گذاردند ہمچنانکہ ترتیب صفوف است در جماعت وامامت نہ کرد بر جنازہ شریف رسول خدا ویچ یکے۔ از امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ منقول است

کہ فرمودہ در جنازہ رسول ﷺ ہیچ کس امامت نہ کرد زیرا کہ آنحضرت علیہ السلام در حیات و ممات امام شماست و ایں از خواص آنحضرت علیہ السلام کہ نماز متعدد کردند و تنہا تنہا گذاردند و روایتے آمدہ اول کسے کہ نماز گذارد بروے اہل بیت وے بود۔ علی و عباس و بنو ہاشم پس ازاں در آمدند مہاجران بعد ازاں انصار پس تر می در آمدند مردم فوج فوج و نماز می گذاردند۔ (مدارج النبوۃ کشوری جلد۲ صفحہ ۵۶۶)

لیکن آنحضرت ﷺ کی نماز جنازہ جماعت کے ساتھ نہیں ہوئی ، ایک گروہ آتا اور بے جماعت کے نماز ان پر پڑھتا اور حجرہ سے باہر آجاتا پھر دوسرا گروہ آتا اور نماز پڑھتا رسول خدا ﷺ کے جنازہ پر کسی نے نہ امامت کی نہ جماعت کی صفوں کی ترتیب دی جیسا کہ صفوں کی ترتیب کا قاعدہ ہے ۔ حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے جنازہ پر کسی نے اس لئے امامت نہیں کی کہ حضور اس حیات میں اور بعد وفات کے تمہارے امام ہیں اور آنحضرت ﷺ کے یہ خصوصیات سے ہے کہ آپ کی لوگوں نے بار بار نماز پڑھی اور تنہا تنہا سب نے ادا کی۔ اور ایک روایت میں آیا کہ حضور کی سب سے پہلے نماز پڑھنے والے آپ کے اہل بیت حضرت علی اور عباس اور بنی ہاشم تھے۔ ان کے بعد مہاجرین آئے۔ ان کے بعد انصار۔ اس کے بعد لوگ گروہ گروہ آتے اور نماز جنازہ پڑھتے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ بنا بر قول صحیح کے اور مسلک جمہور علماء اہل سنت کے حضور اکرم ﷺ کے جنازے پر نماز ہوئی ، لیکن اس بات پر سب کا بلا اختلاف کے اتفاق و اجماع ہے کہ کسی نے اس نماز جنازہ کی امامت نہیں کی۔

الحاصل قائلین نماز جنازہ اگر ادھر جمہور علماء اہل سنت ہیں تو منکرین نماز جنازہ کا شمار بھی علمائے حق اور اہل سنت میں ہوتا ہے ، یہ تو اس مسئلہ کی تحقیق تھی۔

اب باقی رہا سوال کے پیش کردہ امام کا قول تو اگر وہ امام بد عقیدہ وہابی دیوبندی وغیرہ نہیں ہے بلکہ خوش عقیدہ اہل سنت و جماعت ہے اور نماز جنازہ کا قائل بنا بر قول صحیح جمہور علماء کے اتباع میں کہتا ہے تو وہ امام نہ مورد الزام ہے نہ تنقیص کنندۂ رسول علیہ السلام ہے۔ لہٰذا اس کے پیچھے نماز پڑھنا بھی جائز ہے اور اس سے نکاح پڑھوانا بھی درست ہے۔

اور اگر وہ امام مذکور بد عقیدہ وہابی ، دیوبندی ، مودودی وغیرہ ہے جو ان اکابر علماء دیوبند کو مسلمان جانتا ہے جن کی شائع شدہ کتابوں کی کفری عبارات پر علماء حرمین شریفین ۔ عرب و عجم ۔ ہند و سند وغیرہ

نے فتاوی تکفیر یہ صادر فرمائے ہیں۔ نیز وہ امام اپنا پیشوا صاحب تقویۃ الایمان مولوی اسمٰعیل دہلوی کو مانتا ہے اوران کے اتباع میں وہ حیات النبی کا ہی قائل نہیں اور یہ مانتا ہے کہ اجسام انبیاء کرام گلتے سڑتے ہیں ان کو زمیں کھالیتی ہے پھر تو اس نماز جنازہ کا قائل ہونا حضور ﷺ کے میت اور مردہ ہونے کی تائید میں ہوسکتا ہے تو پھر تو اس امام کا بدعقیدہ اور مخالف اہل سنت و جماعت ہونا ظاہر ہے تو اس صورت میں یہ امام ضرور مورد الزام بنا اور اپنی وہابیت کی بنا پر یقیناً تنقیص کنندۂ رسول علیہ السلام ثابت ہوا لہٰذا اہل سنت کو ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز وحرام ہے اور ایسے شخص سے نکاح پڑھوانا بھی ناجائز ہے۔

میں نے مدینہ طیبہ میں غیر مقلدین کے زبردست مناظر حافظ محمد پنجابی سے اسی مسئلہ حیات النبی پر مناظرہ کیا تھا۔ میں نے یہی دلائل اس کے سامنے پیش کئے تھے جو اوپر مسئلہ حیات انبیاء علیہم السلام میں مذکور ہوئے۔ بحمدہ تعالیٰ وہ مناظر ان کے جوابات سے عاجز وقاصر رہا، اس مناظرہ میں ہندوستان، پاکستان، حرمین، مصر، شام وغیرہ مقامات کے کافی علماء کرام شریک تھے، دو دن تک یہ مناظرہ ہوتا رہا، دوسرے دن اس غیر مقلد مناظر کو شکست فاش ہوئی، باطل کا منہ کالا ہوا، اور حق کا بول بالا ہوا۔ کشمیر کے وزیر مالیات جناب سرور وزیر محمد صاحب اور پاکستان کے افسر ملک عبدالرشید صاحب اس مناظرہ کے بانی تھے۔ انہوں نے فیصلہ میرے حق میں فتح وکامیابی کا دیا اور نذرانے پیش کئے۔ غیر مقلد مناظر نہات ذلت کے ساتھ مناظرہ سے بھاگا۔ پھر مدینہ طیبہ میں چند فتح کے جلسہ ہوئے، مولیٰ تعالیٰ نے وہاں وہ عزت دی جو وہم وخیال میں بھی نہیں آسکتی۔ اس وقت میں بیمار ہوکر اُٹھا ہوں، کمزور ہوں، زائد محنت نہیں کرسکتا، اس لئے یہ مسئلہ زیادہ مفصل طور پر نہ لکھ سکا۔ لیکن پھر بھی منصف کے لئے نہایت وافی وکافی ہے، مولیٰ تعالیٰ مخالف ومعاند کو حق قبول کرنے کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

۲۵ / ذی الحجہ / ۶ ۷ ۱۳ھ

کتبہ : الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۲۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں کہ جزامی کی نماز جنازہ ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جزامی جب مسلمان ہے تو اس کی نماز جنازہ اہل اسلام پر ضروری ہے کہ حدیث شریف میں ہے: "صلوا علی کل بر و فاجر" یعنی نماز جنازہ ہر ایک نیک و بد پر پڑھو۔ اور جزام منجملہ اور بیماریوں کے ایک بیماری ہے تو جس طرح اور بیماروں کی نماز جنازہ فرض کفایہ ہے اسی طرح جزامی کی نماز جنازہ ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۲۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں کہ
جزامی کو کفن دفن کیا جائے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اسی طرح جزامی کو کفن دینا اور دفن کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ بحیثیت مسلم حقوق مسلمین کا حقدار ہے" کماھو فی کتب الفقہ۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۲۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں کہ
جزامی کو شریعت و حدیث جدا کرتی ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جزامی سے عوام ضعیف اعتقاد والے اجتناب و پرہیز کر سکتے ہیں اور اہل صدق و یقین متوکلین اس سے کسی طرح کا اجتناب و پرہیز نہیں کرتے، یہاں تک کہ حدیث شریف میں ہے:

ان رسول اللہ ﷺ اخذ بید مجزوم فوضعھا معہ فی القصعۃ وقال کل ثقۃ باللہ

وتو کلا علیہ ۔ (مشکوۃ شریف: ص ۳۹۲)

یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جزامی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ کھانے کے پیالے میں رکھدیا اور حکم دیا کہ کھا میں تو اپنے خدا پر اعتقاد و توکل کرتا ہوں۔

اس حدیث شریف سے ظاہر ہو گیا کہ جزامی سے جب ساتھ کھانے میں بھی پرہیز نہیں کیا گیا تو پھر اور کس چیز میں پرہیز کیا جائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۲۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں کہ
جزامی کو سلام و کلام اور اس سے ہم کلام ہونا صحیح ہے یا نہیں؟۔

الجواب

جزامی سے سلام و کلام میں پرہیز کرنے کی کسی کو اجازت نہیں کہ وہ بحیثیت مسلم تمام حقوق مسلمین کا حقدار ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۱۲ ربیع الآخر ۱۷ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل
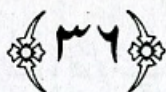
باب تلقین المیت وسوالات النکیرین

مسئلہ (۵۳۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ

بعد دفن کے میت کو تلقین کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو اس کا کیا طریقہ ہے؟ اس کا جواب احادیث وکتب فقہ سے تحریر فرمائیے!۔

اس سوال کے جواب میں ایک مولوی صاحب یہ جواب لکھتے ہیں کہ فتاوی عالمگیری میں ہے" ویستحب اذا دفن المیت ان یجلسوا ساعة عند القبر بعد الفراغ بقدر ما ینحر جزورو یقسم لحمها یتلون القرآن ویدعون للمیت کذا فی الجوهرة النیرة" یعنی میت کے دفن کرنے کے بعد مستحب ہے کہ کچھ لوگ ایک ساعت قبر کے پاس بیٹھے رہیں اندازاً اتنی دیر کہ جس میں ایک اونٹ ذبح کیا جائے اور اس کا گوشت تقسیم کردیا جائے اور یہ لوگ قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہیں اور میت کے لئے دعائے مغفرت وغیرہ کرتے رہیں۔ کتبہ سعید احمد اسرائیلی

دوسرے مولوی صاحب اس کے جواب میں یوں لکھتے ہیں کہ حالت نزع میں قبل غرغرہ کے تلقین بالشہادتین کرنا بالاجماع مستحب ہے، اور تلقین بعد الموت کو بعضے علمائے متاخرین نے جائز کہا ہے، لیکن ظاہر الروایۃ میں تلقین کرنے کو نا جائز کہا ہے۔ اور ظاہر الروایۃ کے مقابلہ میں بعض علمائے متاخرین کے قول کا بقاعدہ رسم المفتی کچھ اعتبار نہیں، وہ قول ضعیف ہے اور قول ضعیف پر عمل نا جائز۔

عالمگیری صفحہ ۱۰۰ جلد اول " واما التلقین بعد الموت فلا تلقن عندنا فی ظاهر الروایة کذا فی العینی شرح هدایه ومعراج الدرایه۔

درمختار۔ ولا یلقن بعد تلحیده ۔

شامی۔ قوله ولا یلقن بعد تلحیده ذکر فی المعراج انه ظاهر الروایة "

اور برہان الدین حلبی نے کبیری میں اس قول کو لفظ "قیل" کے ساتھ بیان کیا ہے جو ضعف پر دال ہے" وهو هذا واما التلقین بعد الدفن فقیل یفعل لحقیقة ما روینا ـ وقیل یومر به ولا ینهی

عنه كذاذ كر ابن الهمام "

اور جمہور علماء نے حدیث تلقین کو معنی مجاز پر محمول کیا ہے۔ یعنی قریب موت کے تلقین کی جائے اور یہی مذہب جمہور ہے۔

کبیری" والذی علیه الجمهور ان المراد من الحديث مجازة كما ذكر نا " اور صاحب ہدایہ نے بھی اس حدیث کواسی معنی پر محمول کیا ہے "ولقن الشهادتين لقوله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم: لقنوا موتاكم شهادة ان لا اله الا الله۔ والمرا دالذی قرب عن الموت ۔ اور اہل متون اور اکثر شراح نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے اور قول جمہور کے مقابلہ میں اس قول کا کچھ اعتبار نہیں" لقوله عليه السلام: وعليكم بالجماعة والعامة رواه احمد عن معاذبن جبل۔

(مشکوه المصابیح)

اس تلقین کا ثبوت کسی حدیث سے نہیں اور اس کا التزام بدعت سے خالی نہیں اور بدعت کے موجد کے بارے میں یہ فرمایا گیا ہے:

عن عائشة رضى الله عنها قالت: قال رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم :من احدث فی امرنا هذا ما ليس منه فهو رد متفق عليه " (مشکوۃ) والله تعالىٰ اعلم بالصواب وعندنا ام الكتاب ۔ حررہ کریم محشر غفرلہ درس اول اشرع سنبھل مورخہ ۱۴رشعبان المعظم صفحہ ۱۳۴۵

اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ یہ دونوں جواب صحیح ہیں یا نہیں؟ اگر غلط ہیں تو اس کا صحیح جواب کیا ہے؟ اس مسئلہ کا جواب مفصل طریقہ سے نہایت مدلل تحریر کیا جائے۔ بینواوتو جروا

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

تلقین بعد الدفن جائز ہے، علماء اس کے فرض یا واجب یا سنت ہونے کے مدعی نہیں، ہاں اس کی اباحت کے ضرور قائل ہیں اور مدعی اباحت کو کسی دلیل کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اظہار حق مقصود ہے اس وجہ سے چند تائیدات پیش کی جاتی ہیں۔ منصف کے لئے انشاءاللہ یہی بہت کافی ہیں۔

حدیث: حیات الموات میں طبرانی معجم کبیر وکتاب الدعا وکتاب الاحکام وکتاب اتباع الاموات وکتاب الشافی وصایۃ العلماء عند الموت وکتاب ذکر الموت وغیرہا سے ناقل ہیں، ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اذا مات احد من اخوانکم فسویتم التراب علیه فلیقم احد کم علی راس قبره ثم لیقل: یا فلان ابن فلانة! فانه یسمعه ولایجیب ثم یقول :یا فلان بن فلانة! فانه یستوی قاعدا ثم یقول: یا فلان بن فلانة! فانه یقول: ارشد نا رحمك الله ولکن لا تشعرون فلیقل: اذ کر ما خرجت علیه من الدنیا شهادة ان لا اله الا الله وان محمدا عبده ورسوله وانك رضیت بالله ربا وبالاسلام دینا وبمحمد نبیا وبالقرآن اماما فان منکر او نکیر ایا خد کل واحد منهمابید صاحبه ویقول انطلق بنا ما نقعد عند من القن حجته الخ ۔

یعنی جب تمہارا کوئی مسلمان بھائی مرے اوراس کی قبر پرمٹی برابر کر چکو تو تم میں کوئی اس کے سرہانے کھڑا ہو اور فلاں ابن فلاں کہہ کر پکارے، کہ بیشک وہ سنے گا اور جواب نہ دے گا۔ ہمیں ارشاد کر اللہ تجھ پر رحم کرے۔ مگر تمہیں اس کے جواب کی خبر نہیں ہوتی، اس وقت کہے یاد کر وہ بات جس پر تو دنیا سے نکلا تھا۔ گواہی اس کی کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اور یہ کہ تو نے پسند کیا اللہ تعالیٰ کو پروردگار اور اسلام کو دین اور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نبی اور قرآن کو پیشوا۔ منکر نکیر ہر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کہیں گے چلو ہم کیا بیٹھیں اس کے پاس جسے لوگ اس کی حجت سکھا چکے۔

تنبیہ: امام ابن صلاح وغیرہ محدثین اس حدیث کی نسبت فرماتے ہیں:

اعتضد بشواهد وبعمل اهل الشام قدیما۔

یعنی اسے دو وجہ سے قوت ہے۔ ایک حدیثیں اس کی تائید کرنے والی۔ دوسرے زمانہ سلف سے علمائے شام اس پر عمل کرتے آئے (اس کو علامہ ابن امیر الحاج نے حلیہ میں نقل کیا)

علامہ ابن حجر مکی کی شرح مشکوۃ میں ہے:

اعتضد بشواهد یر تقی بها الی درجة الحسن۔

یعنی یہ حدیث بوجہ شواہد کے درجہ حسن تک ترقی کر گئی۔

اثر: جو باعتبار راویوں کے اور دو کو شامل ہیں اسی میں سنن امام سعید بن منصور (جو امام مالک کے شاگرد اور امام احمد کے استاذ ہیں) سے ناقل ہیں کہ راشد بن سعد وضمرہ بن حبیب وحکم بن عمیر سے راوی ان سب نے فرمایا:

اذا سوی علی المیت قبره وانصرف الناس عنه کان یستحب ان یقال للمیت عند

نیرہ یا فلان قل لا الٰہ الا اللّٰہ ثلث مرات یا فلان قل ربی اللّٰہ ودینی الاسلام ونبیی محمد صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم"

یعنی جب میت پر مٹی دے کر قبر درست کر کے پھر اور لوگ واپس جائیں تو مستحب سمجھا جاتا تھا کہ مردے سے اس کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر کہا جائے اے فلاں کہہ لا الٰہ الا اللہ تین بار۔ اے فلاں کہہ میرا رب اللہ ہے اور میرا دین اسلام اور میرے نبی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔

درمختار میں ہے:

یکفی قولہ یا فلان ابن فلان ! اذکر ما کنت علیہ وقل رضیت باللّٰہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد نبیا قیل یا رسول اللّٰہ فان لم یعرف اسمہ قال ینسب الی آدم وحواء

غایۃ الاوطار میں اسی فرقہ وہابیہ کے پیشوا مولوی محمد احسن نانوتوی اس عبارت کا ترجمہ لکھتے ہیں:

اور کافی ہے یہ کہنا تلقین کرنے والے کا اس طرح کہ تلقین کرنے والا اس طرح کہے: اے فلاں اے فلاں کے بیٹے! یاد کر ان باتوں کو جن پر تو تھا یعنی اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان کو یاد کر۔ اور جب فرشتے سوال کریں تو یوں کہنا کہ میں راضی ہوں اس سے کہ اللہ میرا رب اور اسلام میرا دین اور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نبی ہیں۔ کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم! اگر مردے کا نام معلوم نہ ہو۔ آپ نے فرمایا کہ منسوب کیا جائے آدم اور حوا علیہما السلام کی طرف یعنی اگر مرد ہو تو یوں کہنا چاہئے اے آدم کے بیٹے اور عورت ہو تو یوں کہے اے حوا کی بیٹی۔

اسی درمختار میں جوہرہ نیرہ سے ناقل ہیں: انہ مشروع عند اھل السنۃ

یہی مولوی محمد احسن اس کا ترجمہ لکھتے ہیں:

تلقین مشروع ہے اہل سنت کے نزدیک۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ مردہ کو قبر میں زندہ کرتا ہے۔ چنانچہ احادیث میں وارد ہے ایسے ہی طحطاوی میں ہے۔

اسی درمختار میں ہے: ان فعل لا ینھی عنہ

مولانا مذکور اس کا ترجمہ لکھتے ہیں۔ اگر کوئی تلقین کرے تو منع نہ کیا جائے کیونکہ حدیث میں آیا ہے: لقنوا موتاکم۔ یعنی تلقین کرو اپنے مردوں کو۔

تو بعض محققین نے اس حدیث میں معنی حقیقی مراد لے کر تلقین بعد موت کی جائز رکھی ہے

غایۃ الاوطار میں ہے: یہی مولوی محمد احسن نانوتوی لکھتے ہیں: فتح القدیر میں بعد کلام طویل کے

کہا کہ تلقین بعد دفن سے کچھ ضرر نہیں بلکہ اس سے فائدہ ہے کہ مردوں کو ذکر سے انس ہوتا ہے چنانچہ آثار میں وارد ہے۔

نور الایضاح مطبوعہ دیو بند میں ہے: تلقینه فی القبر مشروع ۔

یعنی مردہ کو قبر میں تلقین کرنا مشروع ہے:۔

بنایہ شرح ہدایہ میں ہے: کیف لا یفعل وقد روی عنه علیه الصلوة والسلام انه امر بالتلقین بعد الدفن۔

یعنی تلقین کیونکر نہ کی جائے گی حالانکہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی ہوا حضور نے بعد دفن تلقین کا حکم دیا۔

بنایہ میں ہے کہ امام شمس الائمہ حلوائی نے فرمایا: لا یومر به ولا ینهی عنه۔

یعنی نہ تلقین کا حکم دیں نہ اس سے منع کریں۔

حلیہ میں اسے نقل کر کے فرمایا: ظاهره انه یباح۔

یعنی اس قول سے ظاہر اباحت ہے۔

صاحب عباب فرماتے ہیں: انی سمعت استاذی قاضی خاں یحکی عن الامام ظهیر الدین انه لقن بعض الائمة واوصانی بتلقینه فلقنته فیجوز۔

یعنی میں نے اپنے استاذ قاضی خاں کو سنا کہ امام اجل ظہیر الدین کبیر مرغینانی سے حکایت فرماتے تھے کہ بعض ائمہ نے تلقین فرمائی اور مجھے اپنی تلقین کرنے کی وصیت کی کہ میں نے انھیں تلقین کی پس جواز ہوا۔ اسی کو شارح نقایہ اور صاحب حقائق نے نقل کیا۔ مضمرات میں ہے۔

نحن نعمل بهما عند الموت وعند الدفن۔

یعنی ہم دونوں تلقینوں پر عمل کرتے ہیں۔ وقت نزع بھی اور وقت دفن بھی۔ اس کو نقل کیا عالمگیری نے۔

علامہ طحطاوی حاشیہ درمختار میں ''کتاب التجنیس والمزید'' سے ناقل ہیں۔

التلقین بعد الموت فعله بعض مشائخنا۔

یعنی ہمارے بعض مشائخ نے موت کے بعد تلقین فرمائی۔

جامع الرموز میں جواہر سے منقول: سئل القاضی مجد الکرمانی عنه قال ماراه

المسلمون حسنا فهو عند الله حسن وروی فی ذالک حدیثین۔

یعنی قاضی مجد کرمانی سے دربارہ تلقین سوال ہوا۔ فرمایا: جو بات مسلمان اچھی سمجھیں خدا کے نزدیک بھی اچھی ہے۔ اور اس بارے میں دو حدیثیں روایت کیں۔

طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح میں علامہ حلبی سے منقول ہے؛

کیف لا یفعل مع انه لاضرر فیه بل فیه نفع للمیت

یعنی تلقین کیونکر نہ کی جائیگی حالانکہ اس میں کوئی نقصان نہیں بلکہ میت کے لئے فائدہ ہے۔

کشف الغطا میں ہے: بالجملہ بمقتضاے مذہب اہل سنت و جماعت تلقین مناسب۔

پھر امام صفار کا ارشاد۔ سزاوار آنست کہ تلقین کردہ شود میت بر مذہب امام اعظم و ہر کہ تلقین نمی کند ونمی گویند بآن پس او بر مذہب اعتزال است کہ گویند کہ میت جماد محض است و روح در قبر معاد نمی شود۔

یعنی مذہب اہل سنت و جماعت کے اعتبار سے تلقین مناسب ہے اور بنا بر مذہب امام اعظم ابوحنیفہ کے لائق ہے کہ مردہ تلقین کیا جائے اور جو تلقین کو نہیں کہتا اور نہیں کرتا ہے وہ بنا بر مذہب معتزلہ ہے کہ معتزلہ کا یہ خیال ہے کہ مردہ بالکل پتھر ہے اور قبر میں روح لوٹائی نہیں جاتی۔

امام حاکم شہید نے **کافی** اور امام خبازی نے **خبازیہ** میں امام زاہد صفار سے نقل کیا۔

ان هذا (ای منع التلقین) علی مذهب المعتزله لان الاحیاء بعد الموت عندهم مستحیل اما عنداهل السنة فالحدیث ای لقنوا موتاکم لا اله الا الله محمول علی حقیقة لان اللّٰه تعالیٰ یحییه علی ما جاءت به الاثار وقد روی عنه علیه الصلوة والسلام انه امره بالتلقین بعد الدفن۔

یعنی بیشک یہ یعنی تلقین کا منع کرنا مذہب معتزلہ پر ہے۔ اس لئے کہ بعد موت کے ان کے نزدیک زندہ ہونا محال ہے۔ لیکن مذہب اہل سنت کے نزدیک پس یہ حدیث یعنی تلقین کرو اپنے مردوں کو لا الہ الا اللہ کے ساتھ اپنی حقیقت پر حمل کی گئی ہے اور بیشک حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے تلقین کرنے کا بعد دفن کے حکم فرمایا۔ نقل کیا اس کو شامی میں معراج الدرایہ سے۔

بالآخر حوالے تو بہت سے نقل کئے جاتے۔ لیکن طوالت کے سبب سے اتنے ہی پر اکتفا کیا گیا اور واقعی منصف کے لئے یہی کافی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہونا موقع کے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جن جن علمائے کرام نے اس مسئلہ کی صراحت فرمائی ہے ان کے اسمائے گرامی شمار کرائے جائیں۔

(۱) تمام علماء کے سردار تمام مخلوق کے آقا سید عالم نور مجسم فخر بنی آدم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

(۲) حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ صحابی (۳) راشد ابن سعد تابعی (۴) ضمرہ بن حبیب تابعی (۵) حکیم بن عمر تابعی (۶) امام سعید بن منصور محدث (۷) امام احمد (۸) امام نقاد الحدیث ضیائی مقدسی (۹) امام بن حجر عسقلانی (۱۰) امام شمس الائمہ سخاوی (۱۱) امام ابو بکر ابن العربی (۱۲) علامہ ابن حجر مکی (۱۳) محمد طاہر احمد آبادی صاحب مجمع بحار الانوار (۱۴) ابن مندہ (۱۵) ابراہیم حربی (۱۶) ابو بکر غلام الظلال (۱۷) ابن رہبرہ (۱۸) ابن شاہین (۱۹) امام ابن صلاح (۲۰) علامہ امیر الحاج (۲۱ امام سیوطی (۲۲) امام زاہد صفار (۲۳) امام حاکم شہید (۲۴) امام خبازی (۲۵) ابن عابدین شامی صاحب ردالمحتار (۲۶) صاحب معراج الدرایہ (۲۷) محمد علاء الدین حصکفی صاحب درمختار (۲۸) امام ابو بکر بن محمد بن علی صاحب جوہرہ نیرہ (۲۹) شمس الائمہ حلوائی (۳۰) صاحب بنایہ (۳۱) صاحب عباب (۳۲) امام ظہیر الدین صاحب شرح نقایہ (۳۴) محمد بن محمد صاحب حقائق (۳۵) یوسف بن عمر صاحب مضمرات (۳۶) علامہ حسن بن عمار شرنبلالی صاحب نور الایضاح (۳۷) علامہ طحطاوی (۳۸) امام شیخ الاسلام علی بن ابی بکر برہان الدین فرغانی صاب التجنیس (۳۹) قاضی مجد کرمانی صاحب جامع الرموز (۴۰) علامہ حلبی (۴۱) فاضل شیخ الاسلام دہلوی صاحب کشف الغطار رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

یہ ان علمائے کرام کے اسمائے گرامی ہیں جن کے اقوال میرے پیش نظر ہیں۔ اتنی تصریحات کے ہوتے ہوئے اب کسی شخص کو بھی گفتگو کی گنجائش باقی نہیں رہی اور جوابات مندرجہ فی السوال کے رد وابطال کی بھی اصلا ضرورت نہ رہی لیکن مزید براں سرسری نظر ڈال کر اول جوابات کی حقیقت سے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔

اقول وباللہ التوفیق: مولوی سعید احمد صاحب مجیب اول نے تو اپنے جواب میں تلقین بعد الدفن کا جواب ہی نہیں دیا۔ نہ معلوم مولوی صاحب ایسے ہی سوال سے غیر متعلق جواب دیا کرتے ہیں، یا سوال ہی کو نہ سمجھے، یا سوال تو سمجھے مگر اس کا جواب دینا دشوار سمجھا، یا ان کو اپنے مقصد کے موافق تصریحات نہ مل سکیں، یا ان کا اظہار غیر مناسب سمجھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جواب سے پہلوتہی اختیار کی۔ لہٰذا ان کی تحریر سے تلقین بعد دفن کا کوئی حکم ہی نہیں معلوم ہوا باوجودیکہ جس عبارت کو عالمگیری سے نقل کر کے لائے اس کے متصل تلقین کی بحث موجود تھی جیسا کہ ہم نے اس کو پیش کر دیا۔ الغرض مولوی صاحب کا فتوی تلقین بعد الدفن کو ناجائز و بدعت ثابت نہیں کرتا ہے۔

مجیب دوم مولوی کریم بخش صاحب کے کل فتوے کا رد ہی مختصر طریقہ سے پیش کیا جاتا ہے۔

لہذا وہ کہتے ہیں:

حالت نزع میں قبل غرغرہ کے تلقین بالشہادتین کرنا بالاجماع مستحب ہے۔

اس عبارت میں مجیب نے جو فرمایا وہ اپنے محل پر بالکل درست ہے لیکن یہ اجماع تلقین بعد الدفن پر کیا اثر ڈال سکتا ہے۔ ہاں جب تلقین نہ کر کے ثبوت کا حصر لقنوا موتاکم الحدیث کے ساتھ ثابت کر دیں تو کچھ ان کے مقصد کے لئے مفید بن جائے گی۔ یعنی تلقین بعد الدفن کا اس حدیث کے سوا کسی دوسری حدیث یا کسی قول صحابی وتابعی سے فقہاء نے جواز مستنبط نہیں کیا اور حدیث مذکور کے حقیقی معنی لینے پر کوئی تائید کسی دوسری حدیث یا قول صحابی سے نہیں ملتی ہے۔ مجیب صاحب اس مقدمہ کے لئے عرق ریزی کریں اور جب یہ امر بھی ثابت نہ کر سکیں تو پھر باقی تقریر لاحاصل ٹھہرتی ہے۔ پھر کہتے ہیں۔

اور تلقین بعد الموت کو بعضے علمائے متاخرین نے جائز کہا ہے۔

افسوس کہ مجیب صاحب نے نہ اس کے لئے کوئی عبارت پیش کی نہ ان علمائے متاخرین کے اسمائے گرامی ظاہر کئے کہ وہ فلاں طبقہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اپنی بات کی پچ کرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ باوجودیکہ علمائے متاخرین ہی کیا بلکہ متقدمین بلکہ خود امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بلکہ تابعین اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اقوال ہم سے سن چکے۔ کہ ۲۲ کتب فقہ سے اس کا جواز اور ۴۵ رفقہائے عظام اس کے قائل ہیں۔ پھر اس پر مجیب کے یہ الفاظ۔

بعضے علمائے متاخرین۔ نے جائز کہا ہے۔

کہاں تک صحیح ہیں۔ دیکھو اسے کہتے ہیں دن کو رات بنانا۔ پھر لکھتے ہیں:

لیکن ظاہر الروایت میں تلقین کرنے کو ناجائز کہا ہے اور ظاہر الروایت کے مقابلہ میں بعض علمائے متاخرین کے قول کا بقاعدہ رسم المفتی کچھ اعتبار نہیں وہ قول ضعیف ہے اور قول ضعیف پر عمل ناجائز

اتنا تو صحیح ہے کہ مسئلہ میں اختلاف ہے لیکن مختلف فیہ کے لئے یہ کلیہ نہیں۔ چنانچہ بعضے وہ مسائل ہیں کہ ظاہر الروایت میں صراحۃ موجود لیکن علمائے متاخرین نے اس کا خلاف کیا اور فتوی ظاہر الروایت کے ہوتے ہوئے قول متاخرین پر دیا گیا۔ جن میں اجرت علی تعلیم القرآن تو بہت ہی زیادہ مشہور ہے رہی تلقین بعد الدفن تو اس میں متاخرین ہی کیا بلکہ متقدمین کے اقوال بلکہ کشف الغطا سے خود امام صاحب کا مذہب سن چکے۔ لہذا یہ قاعدہ اس پر کس طرح منطبق ہوا؟ علاوہ بریں ذرا پہلے اپنے عمائدین

کے کلام تو ملاحظہ کیجئے۔ چنانچہ مولوی محمد احسن نانوتوی کے اقوال ہم نے متعدد مقامات سے نقل کئے کہ انھوں نے غایۃ الاوطار میں تلقین بعد الدفن پر نہایت محققانہ تقریر کے بعد اس کو جائز رکھا اور آپ کے بڑے پیشوا مولوی رشید احمد گنگوہی نے تو آپ کی اس ساری عمارت کا قلع قمع ہی کر دیا۔

فتاوی رشیدیہ جلد اول کے صفحہ ۷۳ میں ہے۔

سوال: سماع موتی ثابت ہے یا نہیں؟ درصورت جواز یا عدم جواز قول راجح کیا ہے اور تلقین بعد دفن ثابت ہے یا نہیں فقط۔

الجواب: یہ مسئلہ عہد صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مختلف فیہا ہے۔ اس کا فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ تلقین کرنا بعد دفن کے اس پر ہی مبنی ہے جس پر عمل کرے درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مجیب صاحب نہایت ہی حیرتناک بات ہے کہ جب آپ کے ایسے سرگروہ ہی اس کا فیصلہ اور راجح قول نہ بتا سکے اور آخر انھیں کہنا ہی پڑا کہ جس پر عمل کرے درست ہے۔ تو جناب کیا ان سے علم وفضل میں زیادہ ہیں اور کیا ان کو اس قاعدہ کی خبر نہیں تھی اور کیا ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ جواز تلقین بعض متاخرین کا قول ہے۔ اور ظاہر الروایت کے مقابلہ میں بعض علماء متاخرین کے قول کا بقاعدہ رسم المفتی کچھ اعتبار نہیں وہ قول ضعیف ہے اور قول ضعیف پر عمل ناجائز۔ تو نہایت ہی تعجب ہے کہ آپ تو عمل ناجائز کہیں اور آپ کے قبلہ وکعبہ درست بتائیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ خود غرضی ایسی ہی ان کہی کہلوا دیتی ہے۔ پھر اپنے مدعی پر ثبوت پیش کرتے ہیں۔

عالمگیری صفحہ ۱۰۰ جلد اول: واما لتلقین بعد الموت فلا تلقن عندنا فی ظاهر الروایة کذ فی العینی شرح هدایه ومعراج الدرایه۔

اولا: اس عبارت میں نفی اباحت کی ہونا یقینی نہیں۔ چونکہ اباحت کی اکثر کتب فقہ میں نہایت شد ومد کے ساتھ تصریح ہے۔

ثانیا: اسی عالمگیری میں اسی عبارت کے متصل مضمرات سے منقول ہے۔

ونحن نعمل بهما عندالموت وعند الدفن کذا فی المضمرات۔

یعنی ہم دونوں پر عمل کرتے ہیں موت کے وقت بھی اور دفن کے وقت بھی۔

ثالثا: آپ کی شان سے یہ بہت بعید ہے کہ جو عبارت آپ کے مدعا کے موافق ملی اس کو آپ

نے نقل کر دیا اور جو آپ کے مقصد کے خلاف تھی اس سے آپ نے چشم پوشی کر لی۔ مجیب صاحب کیا اسی کو دیانت کہتے ہیں؟ اور کیا مذہب کے مفتی کے یہی شان ہونی چاہئے اور ایک منصف آپ کے متعلق کیا رائے قائم کریگا؟ پھر اتنے ہی پر اکتفا نہیں اس سے زیادہ اور دیانت ملاحظہ ہو۔

درمختار: ولا یلقن بعد تلحیدہ۔

اولا: یہ عبارت درمختار کی نہیں بلکہ تنویر الابصار کی ہے۔

ثانیا: اپنی خود مطلبی سے اس کی تفصیل کو چھوڑ دیا مسئلہ کی پوری عبارت یہ ہے۔

ولا یلقن بعد تلحیدہ وان فعل لا ینھی عنہ۔

یعنی بعد دفن کے تلقین نہ کی جائے اور اگر کی جائے تو روکا نہ جائے۔ لہذا ایک تھوڑی عقل والا بھی جان لے گا کہ ایسی قطع و برید کاٹ چھانٹ آخر کوئی مجبوری کرا رہی ہے۔ اور واقعی زبان کی پاسداری اپنی بات کی بچے برابر ایسی ہی ذلیل باتوں تک پہنچا دیتی ہے۔

پھر کہتے ہیں:

شامی: فی قولہ ولا یلقن بعد تلحیدہ ذکر فی المعراج انہ ظاھر الروایۃ۔

اولا: عبارت شامی میں بھی اپنی ایسی ہی دیانت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ چنانچہ شامی کی کئی عبارتیں جواز تلقین میں نقل ہوئیں۔

ثانیا: ظاہر الروایت کی روایت کا چند کتابوں سے نقل کرنا جواز تلقین مذکور کو باطل نہیں کر دے گا۔

ثالثا: جب صاحب معراج نے منع تلقین کو مذہب معتزلہ اور تلقین کو مذہب اہل سنت ٹھہرا کر حدیث "لقنو امو تاکم" کو حقیقت پر محمول کیا۔ اور نیز یہ روایت کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تلقین بعد الدفن کا حکم فرمایا پیش کی۔ جس کو اسی شامی نے نقل کیا تو پھر یہ معراج آپ کو کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

رابعا: شامی میں جب ایسی تصریحات بھی موجود ہیں تو ان کو چھوڑتے ہوئے اپنے مقصد کے چند الفاظ اٹھا لینا مجیب کی کتنی بڑی صداقت اور راست گوئی کی دلیل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی ناحق کے در پے ہوتا ہے تو اس کو اسی طرح کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں اور وہ ایسے ہی عبارتوں میں کتر بیونت کرنے کے لئے مضطر ہو جاتا ہے۔ پھر مجیب کی مایوسی یہاں تک پہنچتی ہے کہ نہایت سنبھل سنبھل کر لکھتے ہیں۔

اور برہان الدین حلبی نے کبیری میں اس قول کو لفظ قیل کے ساتھ بیان کیا ہے جو ضعف پر دال

ہے" وھو ھذا واما التلقین بعدالدفن فقیل یفعل لحقیقة ما روینا وقیل یو مر بہ ولاینھی عنہ کذا ذکرہ ابن الھمام۔

اولا: یہ قاعدہ مجیب ہی کے لئے وبال جان بن جائے گا کہ جب لفظ قیـــل ضعف پر دال ہے تو آپ کا مزعومہ مذہب جمہور یہ بھی اسی قاعدہ سے ضعیف ہوگا۔ چنانچہ دیوبند کی مطبوعہ نور الایضاح میں ہے

وتلقینہ فی القبر مشروع وقیل لا یلقن۔

ملاحظہ ہو کہ لفظ قیـل سے جناب ہی کے مذہب کو بیان کیا گیا اور لفظ قیـل ضعف پر دال تھا۔ لہذا جناب کا مذہب ضعیف انہی کی زبان سے ہوگیا۔ اب مجیب صاحب کہئے اقبالی ڈگری ہوئی یا نہیں۔

ثانیا: جب دیگر کتب فقہ میں اُس کو بغیر قیل بھی بیان کیا ہے تو کیا فقط کبیری کا لفظ قیل سے بیان کرنا اس کو ضعیف کردے گا۔

ثالثا: آپ ہی کے پیشوا مولوی محمد احسن نانوتوی غایۃ الاوطار میں لکھتے ہیں:

فتح القدیر میں بعد کلام طویل کے کہا کہ تلقین بعد الدفن سے کچھ ضرر نہیں۔ بلکہ اس سے فائدہ ہے کہ مردوں کو ذکر سے انس ہوتا ہے چنانچہ آثار میں وارد ہے۔

تو کیا انھوں نے ابن ہمام کے کلام کو نہیں سمجھا۔ پھر مجیب لکھتے ہیں۔

اور جمہور علماء نے حدیث تلقین کو معنی مجازی پر محمول کیا ہے۔ یعنی قریب موت کے تلقین کی جائے اور یہی مذہب جمہور ہے۔

کبیری: والذی علیہ الجمھور ان المراد من الحدیث مجازہ کما ذکر۔

اولا عبارت میں قطع وبرید کردینا تو جناب کا قدیمی شیوہ ہے۔

چنانچہ اسی کبیری کی پوری عبارت پیش کرتا ہوں۔

والـذی علیہ الجمھور ان المراد من الحدیث مجازہ کما ذکر نا حتی من استحب التلقین بعدا لموت لم یستدل بہ الاعلیٰ تلقینہ عند الاحتضار مع انھم قائلون بجواز الجمع بین الحقیقة والمجاز۔

یعنی وہ جس پر جمہور ہیں کہ تحقیق حدیث سے مراد معنی مجازی ہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا۔ اور جس نے تلقین بعد الموت کو مستحب جانا وہ اس سے دلیل نہیں لایا مگر قبل الموت پر۔ باجودیکہ جمع بین الحقیقة والمجاز کے جواز کے قائل ہیں۔

ثانیا: جمہور کا حدیث کے معنی مجازی کو متعین کر لینا تلقین بعد الدفن کو تو باطل نہیں کرتا اس لئے کہ تلقین مذکور کو مستحب کہنے والے اس حدیث کو کب استدلال میں پیش کرتے ہیں باجودیکہ اگر پیش کرتے تو کوئی استحالہ بھی لازم نہیں آتا۔

ثالثا: جب تلقین قبل الموت پر جمہور کا اتفاق کرنا تلقین بعد الدفن کو ناجائز کر دیتا ہے پھر فقہاء کی (جن میں ہر طبقہ کے افراد ہیں) تلقین بعد الدفن کی اباحت پر تصریحات کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔

رابعا: آپ کی اس پیش کردہ کبیری میں اسی عبارت کے متصل یہ تصریح ہے۔

وانما لا ینهی عن التلقین بعد الدفن لا ضررفیه بل فیه نفع فان المیت یستانس بالذکر علی ما ورد فی الآ ثار۔

یعنی تلقین بعد الدفن سے منع نہ کیا جائے کہ اس میں کوئی نقصان نہیں بلکہ اس میں نفع ہے کہ مردہ کو ذکر سے انس ہوتا ہے چنانچہ آثار میں وارد ہے۔

تو کیا آپ کے قطع و برید کرنے سے یا مسئلہ کو چھپانے سے حق مسئلہ کا اظہار نہیں ہوگا اور پھر بعد اظہار کے ہر ذی عقل جناب کے متعلق کیا رائے قائم کرے گا۔ پھر مجیب یہی مضمون ہدایہ سے نقل کرتے ہیں۔

اور صاحب ہدایہ نے بھی اس حدیث کو اسی معنی پر محمول کیا ہے" ولقن الشهادتین لقوله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم لقنو موتاکم شهادة ان لا اله الا الله والمراد الذی قرب عن الموت "اور اہل متون اور اکثر شراح نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

صاحب ہدایہ نے جب ہدایہ میں تلقین بعد الدفن کی بحث ہی نہیں کی تو ان کا کلام آپ کے لئے کچھ مفید نہیں ہوسکتا۔ اور صرف حدیث مذکور کے معنی مجازی نقل کرنا ہمارے مسئلہ تلقین پر کچھ اثر نہیں ڈال سکتا۔ اور پھر ان کا تصریح نہ کرنا اسی امر کی بھی دلیل نہیں ہوسکتی کہ وہ اس کے قائل نہیں تھے۔ لہذا ان کا کلام یا دیگر اہل متون وشراح کا قول ہمارے خلاف نہیں۔ جبکہ ابھی تقریر بالا سے ظاہر ہو چکا تو اب مجیب کا یہ نتیجہ نکالنا۔

اور قول جمہور کے مقابلہ میں اس قول کا کچھ اعتبار نہیں" لقوله علیه السلام وعلیکم بالجماعه والعامه رواه احمد عن معاذبن جبل" (مشکوۃ المصابیح)۔

کیسی اپنی خود مطلبی کی دلیل ہے۔

اولا: اگر یہ حدیث تلقین بعد الدفن کے ثبوت میں پیش کی جائے تو اس میں کیا نقصان ہے باوجودیکہ جمع بین الحقیقۃ والمجاز کا قول موجود ہے۔ جیسا کہ ابھی کبیری سے سن چکے۔

ثانیا: اسی کبیری سے معلوم ہوا کہ تلقین مذکور کے مجوزین اس حدیث کو استدلال میں ہی جب پیش نہیں کرتے تو پھر مقابلہ کیسے ہوا۔

ثالثا: جواز جمع بین الحقیقۃ والمجاز کی صورت میں کیا ایک قول ایسا غیر معتبر ہوسکتا ہے کہ وہ اس حدیث کا مصداق ہوجائے۔

رابعا: جب (۴۰) فقہائے عظام اس کی اباحت کے قائل ہوں تو اس حدیث کا چسپاں کرنا معصیت ہے یا نہیں؟ پھر مجیب کی مزید بے با کی ملاحظہ ہو۔

اس تلقین کا ثبوت کسی حدیث سے نہیں۔

اولا: کبیری سے معلوم ہوا کہ مجوزین تلقین اس کا ثبوت احادیث سے پیش کرتے ہیں اور منصف کے لئے علی ما ورد فی الاثار کے الفاظ ہی بہت کافی ہیں۔

ثانیا: معراج الدرایہ میں کتنی صریح حدیث موجود ہے۔

انه امر بالتلقین بعدالدفن۔

ونیز بنایہ ودرمختار وطبرانی ومعجم کبیر سے کچھ پیش کی گئیں۔

ثالثا: جو حدیث آپ کو باوجود تتبع اور تلاش کے نہ ملے تو کیا اس کی مطلقا نفی ہوسکتی ہے۔

رابعا: کیا عدم ذکر عدم کو مستلزم ہے۔ لیکن جب ہٹ دھرمی پر کمر باندھی تو پھر حق گوئی سے کیا تعلق۔ آخر میں تو مجیب نے اپنا اصلی مقصد ہی ظاہر کردیا۔

اور اس کا التزام بدعت سے خالی نہیں اور بدعت کے موجد کے بارے میں یہ فرمایا گیا:

عن عائشة رضی اللہ عنه قالت قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو رد متفق علیه ۔ واللہ اعلم بالصواب وعندنا ام الکتاب ۔

اولا: کیا ہر مستحب کو مستحب جان کر دواما کرنا بدعت ہے؟۔

ثانیا: بدعت کی جامع مانع کیا تعریف ہے؟۔

ثالثا: ہم نے سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی احادیث سے اس کا ثبوت پیش کیا اور صحابہ اور

فقہاء کے اقوال بھی نقل کئے تو کیا نعوذ باللہ حضور بدعتی ہوئے؟ تو حدیث کا لفظ "من" حضور کو بھی شامل ہے؟ اور کیا یہ صحابہ اور فقہا بھی بدعتی ٹھہریں گے؟ اگر ہیں تو جب انھوں نے یہ احداث کیا تو انکے مقلدین اور ان کے مسائل کو صحیح جاننے والے کس حکم کے مستحق ہوں گے۔

الحاصل مجھ کو فقط یہ ظاہر کرنا منظور تھا کہ ایسے ہی نام کے علماء نے شریعت میں اپنی خود غرضی سے طرح طرح کے فرقے پیدا کر دیئے۔ عبارتوں میں قطع و برید کر کے حلال کو حرام کر دیا۔ اس مختصر سی تنقید میں مجیب صاحب پر تیس سوالات جو حقیقۃ اعتراضات ہیں پیش کئے گئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۳۱)

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین حسب ذیل مسئلہ میں

میت کو قبر میں دفن کرنے کے بعد اذان دینا جائز ہے کہ نہیں اکثر لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کیا یہ معترض وہابی تو نہیں؟ صفر حسین ہزاری باغ۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

بعض فقہاء نے تو میت کے دفن کے بعد اذان کہنے کو سنت کہا ہے اور بعض نے مستحب بتایا ہے چنانچہ ردالمختار نے مستحب اذانوں میں اس کو شمار کیا ہے "عند انزال المیت القبر" یعنی میت کو قبر میں اتارنے کے وقت اذان کہنا مستحب ہے تو اس کے جواز میں کیا کلام ہے وہابی اس کو محض اپنی ناقص رائے اور عقل سے ناجائز کہتا ہے اور اس کے عدم جواز کے ثبوت میں کوئی صریح دلیل پیش نہیں کر سکتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ : الفقیر الی اللہ عز و جل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۳۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین حسب ذیل مسئلہ میں۔ بینوا توجروا

(۱) بہار شریعت حصہ چہارم صفحہ ۱۶۲ مسئلہ دفن کے بعد قبر کے پاس اتنی دیر تک ٹھہرنا مستحب ہے جتنی دیر میں اونٹ ذبح کر کے گوشت تقسیم کر دیا جائے کہ ان کے رہنے سے میت کو انس ہوگا اور اتنی دیر تک تلاوت قرآن اور میت کے لئے دعاؤ استغفار کریں اور یہ دعا کریں کہ سوال نکرین کے جواب میں ثابت قدم رہے (جوہرہ وغیرہ) کتاب الاذکار میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ صفحہ ۱۴۷ میں تحریر فرماتے ہیں "ویستحب ان یقعد عنده بعد الفراغ ساعة قدر ما ینحر جزورو تقسم لحمها ویشتغل القاعدون بتلاوة القرآن والدعاء للمیت والوعظ وحکایت اهل الجنة واحوال الصالحین" اس میں اس میں غرض یہ ہے کہ قبرستان میں میت کو قبر میں رکھنے کے بعد جب تک قبر کی مٹی درست نہ ہو جاوے ہمراہی جنازہ کے سب لوگ ٹھہرے رہتے ہیں۔ اسی وقفہ میں اگر ذکر خیر البشر سرکار دو عالم ﷺ وصالحین دعاء میت عوام سے پڑھا دی جاوے اور بعد واپسی عوام کے کچھ دیر تک خاص چند آدمی ذکر قرآن پاک قبر کے پاس پڑھ دیں اور اذان وتلقین کر دیں تو مطابق سنت مستحب کے ہوگا یا نہیں۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

اس وقفہ میں عوام سے تلاوت بعض سور قرآن واذکار کا پڑھوانا اور لوگوں کی واپسی کے بعد خواص کا تلاوت واذکار میں مشغول رہنا اور اذان وتلقین کرنا بلاشبہ مستحب ہے اور ان امور سے میت کو انس اور کثیر منافع حاصل ہوتے ہیں۔ والتحقیق فی فتاونا الاجملیہ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۳۳)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان کہنے کا حکم ہے یا نہیں۔ کیونکہ یہاں پر بہت آدمی منع کرتے ہیں اللہ رحم فرما کر مفصل جواب عنایت ہو۔ اس پر آپکی مہر ہونا ضروری ہے۔

المستفتی عظمت خاں ونور خاں شیوالا پوسٹ ولینگر وایا میانہ گجرات

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

بعض فقہاء نے قبر میں میت کو اتارتے وقت اذان کہنے کو سنت قرار دیا ہے۔ علامہ ابن حجر نے اسکی سنیت میں کلام فرمایا ہے۔ ردالمحتار میں ہے: ''قیل وعند انزال المیت القبور قیاسا علی اول خروجه للدنیا ولکن رده ابن حجر فی شرح العباب۔ (ردالمحتار مصری ۲۲۹ ج ۲)

علماء کرام کا یہ اختلاف تو اس اذان قبر کے سنت ہونے نہ ہونے میں تھا۔ اب باقی رہا اذان قبر کا جائز ہونا تو اس میں فقہاء کرام کا کوئی اختلاف نظر سے نہیں گزرا۔ تو بعد دفن میت قبر پر اذان کہنا یقیناً جائز قرار پایا کہ شریعت سے اسکی ممانعت کی کوئی دلیل صریح ثابت نہیں ہوئی۔ پھر جو اسکو منع کرتا ہے وہ اسکی ممانعت پر کوئی صریح دلیل شرعی قائم کرے، ورنہ شرع پر افتراء کرنے سے باز آئے۔ احادیث پر نظر کرنے کے بعد اس اذان سے میت کے لئے چند منافع مستفاد ہوتے ہیں۔

(۱) اذان کی وجہ سے شر شیطان سے پناہ حاصل ہوگی۔

(۲) تکبیر اذان کی بدولت عذاب نار سے امان پائیگا۔

(۳) اذان سے جوابات سوالات منکر نکیر یاد آجائیں گے۔

(۴) ذکر اذن کے باعث عذاب قبر سے نجات پائیگا۔

(۵) اذان میں ذکر رسول اللہ ﷺ کی برکت سے نزول رحمت ہوگی۔

(۶) اذان کی بدولت دفع وحشت قبر ہوگا۔

(۷) اذان کے سبب سے زوال غم اور حصول سرور و فرحت حاصل ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۱۰ شوال المکرم ۱۳۷۱ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۳۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین دامت برکاتہم القدسیہ مسائل ہذا میں کہ

(۱) قبر میں بوقت سوال و جواب نکیرین کے جناب آقائے دو عالم احمد مجتبی شافع روز جزا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جلوہ افروز ہوتے ہیں یہ صحیح ہے یا نہیں؟۔ اگر صحیح ہے تو کس ثبوت سے اور کیا آپ صرف مسلمان ہی کی قبر میں جلوہ افروز ہوتے ہیں یا سب کی قبر میں؟ قبر خواہ مرتد و مشرک رافضی قادیانی وہابی دیوبندی وغیرہ کی ہو۔ کیا حکم شرعی ہے اور کافروں کو جب مرگھٹ پر جلا دیا جاتا ہے تو ان سے بھی نکیرین

سوال و جواب ان کے مرگھٹ پر جا کر کرتے ہیں یا نہیں؟ کیا نکیرین کے سوال و جواب صرف مسلم ہی سے ہوتا ہے یا ہر شخص سے خواہ وہ کافر ہو یا مرتد۔ مشرک ہو یا رافضی، قادیانی ہو یا وہابی دیوبندی وغیرہ ہوں اور جو لوگ جلائے جاتے ہیں ان سے بھی نکیرین سوال و جواب کرتے ہیں یا نہیں؟ اور حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بوقت سوال جواب نکیرین کافروں کے مرگھٹ پر بھی جلوا افروز ہوتے ہیں یا نہیں کیا حکم ہے؟۔ بینوا توجروا۔

(۲) بوقت سوال ... یرین قبر میں شیطان پہنچ جاتا ہے اور صاحب قبر کو بہکاتا ہے۔ یہ صحیح ہے یا غلط؟۔ اگر صحیح ہے تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ جہاں اللہ کے محبوب کا نزول ہوتا ہے وہاں شیطان دور بھاگتا ہے۔ لہٰذا جب حضور علیہ الصلاۃ والسلام قبر میں جلوہ افروز ہوتے ہیں تو شیطان کا گذر کس طرح ممکن ہو جاتا ہے اور پھر آپ کی موجودگی میں وہ صاحب قبر کی بہکاتا بھی ہے یہ کس طرح ممکن ہے کیا حکم شرعی ہے؟۔ بینوا توجروا۔

المستفتی فقیر محمد عمران قادری رضوی مصطفوی غفرلہ ربہ محلہ منیر خاں پیلی بھیت شریف

۳ محرم الحرام ۱۳۷۳ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) قبر میں سوالات نکیرین میں سے 'ما کنت تقول فی ھذا الرجل' کے وقت خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا تشریف لانا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔

علامہ سیوطی شرح الصدور میں حضرت شیخ الاسلام ابن حجر کا قول نقل فرماتے ہیں:

سئل ھل یکشف لہ حتی یری النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فاجاب انہ لم یرد فی حدیث و انما ادعاہ بعض من لا یحتج بہ لغیر مستند سوی قولہ فی ھذا الرجل ولا حجۃ فیہ لان الاشارۃ الی الحاضر فی الذھن۔ (شرح الصدور ص / ۶۰)

سوال کیا گیا کہ میت کیلئے پردۂ حجاب اٹھا دیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھ لیتا ہے تو جواب دیا کہ کسی حدیث میں تو یہ وارد نہیں ہوا۔ اس کا بعض ایسے علماء نے دعویٰ کیا ہے جن کو حجت میں نہیں لایا جاتا ہے ان کی دلیل سوائے قول فی ہذا الرجل اور کچھ نہیں اور اس میں کوئی حجت نہیں اس لئے کہ اشارہ فی الذہن کی طرف ہے۔

اور شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات ترجمہ مشکوۃ میں اس کلمہ حدیث کے تحت میں فرماتے ہیں:

واشارت بہذا بآنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یا از جہت شہرت امر وحضور اوست دراذہان ما اگر چہ غائب ست یا باحضار ذات شریف وے درعیاں بایں طریق کہ در قبر مثالے از حضرت وے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم می ساختہ باشند۔ (اشعۃ اللمعات ج ۱ رص ۱۱۵)

ہذا کا اشارہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف یا اس بات کی شہرت ہونے اور ہمارے ذہنوں میں ان کے حاضر ہونے کی بنا پر ہے اگر چہ وہ غائب ہیں یا ان کی ذات شریف کے ظاہر میں اس طریق پر حاضر کردینے کی بنا پر ہے کہ قبر میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مثال لیکر حاضر ہوتے ہیں۔

ان عبارات سے واضح ہوگیا کہ سوالات نکیرین کے لفظ ھذا کا اشارہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف یا تو ان کے حاضر فی الذہن ہونے کی جہت سے ہے یا قبر میں آپ کی مثال کے حاضر ہونے کی بنا ہے۔تو حضور کی صورت مثالی کا کی قبر میں سوال نکیرین کے وقت جلوہ افروز ہونا بھی صحیح ثابت ہوا گیا۔

اب باقی رہا یہ امر کہ قبر میں سوالات نکیرین صرف مسلم ہی سے ہوتے ہیں یا کافروں ومرتدوں سے بھی تو علامہ سیوطی نے شرح الصدور میں حضرت ابن عبدالبر کا قول نقل فرمایا ہے:

قال ابن عبد البر لا یکون السوال الا لمومن او منافق کان منسوبا الی دین الاسلام بظاهر الشهادة بخلاف الکافر فانه لا یسئل۔ (ص ۵۹)

ابن عبدالبر نے فرمایا کہ سوال قبر یا تو مومن ہی سے ہوتا ہے یا اس منافق سے ہوتا ہے جو اپنے آپ کو کلمہ شہادت پڑھ کر دین اسلام کی طرف نسبت کرتا ہے بخلاف کافر کے کہ اس سے سوال نہ کیا جائے گا۔

علامہ ابن حجر فتاویٰ حدیثیہ میں فرماتے ہیں:

و جزم الترمذی الحکیم بان المعلن بکفره لا یسئل و وافقه ابن عبد البر و رواه بعض کبار التابعین۔ (فتاوی حدثیه مصری ص ۷)

امام حکیم ترمذی نے اس بات پر جزم کیا کہ کفر کو باعلان کرنے والے سے سوال نہ کیا جائے گا ان کی ابن عبدالبر نے موافقت کی ہے اور اس کی بعض کبار تابعین نے روایت کی ہے۔

ان عبارات سے یہ ظاہر ہوگیا کہ قبر میں سوالات نکیرین یا تو مسلمانوں سے ہوتے ہیں یا مدعی اسلام منافق سے اور کافر مردے سے یہ سوالات نہیں کئے جاتے تو پھر مرگھٹ پر سوالات کرنے اور وہاں حضور کے جلوہ افروز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں جو مسلم یا منافق جلا دیا جائے یا اس کو جانور کھا جائے اس سے نکیرین کے سوالات ہونگے۔

فتاویٰ حدیثیہ میں ہے: و سوال الملکین یعم کل میت و لو جنینا و غیر مقبور کحریق و غریق و اکیل سبع کما جزم به جماعة من الائمة ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) یہ بھی صحیح ہے کہ بوقت سوالات نکیرین میت کو شیطان نظر آتا ہے اور صاحب قبر کو بہکانے کی سعی کرتا ہے۔

شرح الصدور میں ہے: عن سفیان الثوری قال اذا سئل المیت من ربك ترآی له الشیطان فی صورة فیشیر الی نفسه انی انا ربك ۔

اور یہ بھی صحیح بخاری شریف کی حدیث ہے کہ نکیرین کے سوالات میں تیسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ ما کنت تقول فی هذا الرجل ۔ تو اس حدیث میں ہذا کا مشارالیہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف ہے اور اشارہ حاضر کی طرف کیا جاتا ہے تو قبر میں میت کو مشاہدہ جمال انور کا شرف حاصل ہوا۔ اور آپ کی صورت مثالیہ کی جلوہ افروزی ثابت ہوئی۔

اب باقی رہا یہ امر کہ حضور کی جلوہ افروزی کے باجود وہاں شیطان کا آنا اور میت کو بہکانا کس طرح ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں رحمۃ العالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رحمت کا ہر دو کو صدقہ ملا۔ شیطان کو تو یہ ہے کہ وہ قبر میں اس وقت آکر بہکانے کی جرأت کرتا ہے۔ اور میت پر یہ رحمت خاص ہے کہ وہ اس کے فریب سے محفوظ رہتا ہے بہکتا نہیں۔ یعنی اس مشاہدہ جمال پاک نے دشمن کے فریب دینے اور بہکانے کے وقت میت کی یہ مشکل کشائی فرمائی کہ ایسے سخت مخالف کو خائب و نامراد واپس کر دیا اور اس کے لئے راہ نجات روشن فرمادی۔

چنانچہ حضرت شیخ محقق نے اشعۃ اللمعات میں ان کلمات حدیث کی شرح میں ایسا لطیف اشارہ فرمایا:

واشارت بہذا بآنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یا از جہت شہرت امر وحضور اوست در اذہان ماا گر چہ غائب ست یا باحضار ذات شریف وے درعیاں بایں طریق کہ در قبر مثالی از حضرت وے صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم حاضری ساختہ باشند تا بمشاہدہ جمال جاں افروزی او عقیدہ اشکالی کہ در کار افتادہ کشادہ شود و ظلمت فراق بنور لقائے دلکشائے او روشن گردد۔

لہٰذا یہ حضور علیہ السلام کی رحمت عامہ کا صدقہ ہے کہ شیطان کا اس وقت قبر میں گذر ہو گیا اور وہ صاحب قبر کو بہکانے کی سعی کرنے لگا ورنہ اس آقائے کریم کے صدقہ میں ان کے غلاموں کی ایسی ہیبت ہے کہ شیطان ان کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ ان کے راستہ پر بھی چل نہیں سکتا۔ چنانچہ حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق صحاح ستہ میں یہ احادیث مروی ہیں:

قال علیه السلام ان الشیطا ن لیخا ف منك یا عمر (وفی روا یة) انی لا نظر الی شیا طین الجن و الا نس قد فروا من عمر (و فی روا یة) یا ابن الخطا ب و الذ ی نفسی بیده ما لقیك شیطا ن سا لکا فجا قطا لا سلك فجا غیر فجك اخر جها المشکوٰۃ ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) نکیرین قبر میں چھوٹے بچوں سے سوالات نہیں کرتے۔

شرح الصدور میں ہے: الا نبیا ء و اطفا ل المو منین لیس علیهم حسا ب ولا عذا ب القبر و لا سوال منکر و نکیر ۔

علامہ سیوطی بشری الکتب میں فرماتے ہیں: قد و ردت الا حا دیث و نصو ص العلما ء باستثنا ء جماعة من السوا ل منهم الشهدا ء والصد یقو ن والمطیعو ن و کذالك الا طفا ل فی ار جح الا قوا ل ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۱۵ ربیع الاخر شریف ۱۳۷۱ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

﴿۳۷﴾

باب حرمة القبور

مسئلہ (۵۳۵)
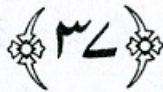
از حسن پور محلہ لال باغ ضلع مراد آباد جناب غلام نبی خاں صاحب رضوی

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

کتاب مستطاب ''رکن الدین'' میں حضرت مولانا شاہ رکن الدین صاحب نقشبندی مجددی الوری بحوالہ عالمگیری لکھتے ہیں۔ کہ مردوں کی ہڈیاں گلنے سڑنے پر قبر سے نکال کر اس پر مکان بھی بنا سکتے ہیں اور کھیتی بھی کر سکتے ہیں۔ اور قریب قریب اس کے موافق ''فلاح دارین'' میں بھی لکھا ہے کہ چار سال گذرنے پر نشان قبر مٹنے پر کھیتی بھی کر سکتے ہیں اور مکان بھی بنا سکتے ہیں۔ کیا ایسی صورت میں وہابیہ نجدیہ دیوبندیہ خذلہم اللہ تعالیٰ کو موقع نہ ملے گا؟ جو نعوذ باللہ اولیاء کرام کو بھی مردہ جانتے ہیں اور ان کے مزارات طیبہ کی تعظیم کو شرک وکفر قرار دیتے ہیں کہ وہ مزارات طیبہ کو بھی شہید کر کے وہاں پر مکان بنا دیں، یا کھیتی کرا دیں۔ چنانچہ مقامات مقدسہ میں ابن سعود نجدی ملعون خزلہم اللہ تعالیٰ ایسا کر چکا اور کر رہا ہے۔ برائے عنایت وکرم جواب شافی وکافی بحوالہ کتب عنایت فرمائیں۔ والسلام

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

مسلمان کی عزت جس طرح زندگی میں ہے اسی طرح بعد موت کے ہے۔

چنانچہ محقق علی الاطلاق فتح القدیر میں فرماتے ہیں۔ ''الاتفاق علی ان حرمة المسلم میتا کحرمته حیا'' پھر مسلمان کو جس چیز سے حیات میں ایذا پہنچتی ہے بعد موت بھی اس سے ایذا پہنچتی ہے۔

چنانچہ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اذی المؤمن فی موته کاذاه فی حیاته۔

یعنی مسلمان مردہ کوایذا دینا ایسا ہے جیسے زندہ کو۔

شیخ محقق دہلوی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ ''اشعۃ اللمعات'' میں فرماتے ہیں:

از ینجا مستفاد میگر دد کہ میت متالم میگر دد بتمام آنچہ متالم میگر دد بداں حی ولازم ایں است کہ متلذ ذگرددو بتمام آنچہ متلذ ذمی شود بداں زندہ۔

لہذا سوال کا جواب تو یہیں سے معلوم ہو گیا کہ مردہ کی ہڈیوں کو قبر سے نکالنے اور وہاں کھیتی کرنے یا کوئی مکان بنانے میں کیا اس کو ایذا نہیں ہوگی؟ ضرور ہوگی۔ اور پھر اس کی اہانت بھی ہوگی اور یہ ممنوع ہے۔ جیسا کہ ان عبارتوں سے واضح ہو چکا۔ لیکن مزید براں اب میں ایک حوالہ اسی عالمگیری کا پیش کرتا ہوں جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے:

سئل القاضی الامام شمس الائمة محمود الاوزجندی فی المقبرة اذا اندرست ولم یبق فیها اثر الموتی لا العظم ولا غیره هل یجوز زرعها واستغلالها قال لا ولها حکم المقبرة ۔

یعنی قاضی امام شمس الائمہ محمود اوزجندی سے ایسے مقبرہ کے بارے میں سوال ہوا کہ جب نہ قبروں کا نشان باقی رہا ہو، اور نہ ہڈی وغیرہ ہو تو کیا اس میں کھیتی اور غلہ حاصل کر سکتے ہیں؟ فرمایا: نہیں۔ اور اس کے لئے مقبرہ کا حکم ہے۔ اس عبارت میں تو مسئلہ کی خاص صورت کا ہی حکم بیان کر دیا گیا۔ اور پھر ہڈیاں نکلوا کر کھیتی یا مکان بنوانا تو بڑی چیز ہے احادیث کریمہ اور کتب فقہیہ میں تو یہاں تک احتیاطیں ہم کو تعلیم کی ہیں کہ قبر پر تکیہ لگانا، جوتا پہن کر چلنا، قبرستان میں پرانے راستہ کو چھوڑ کر نئے راستہ پر گذرنا، قبر پر پاؤں رکھنا، اس کے پاس سونا، قبر کی تر گھاس یا درخت کو کاٹنا، قبر پر بیٹھنا، تمام ممنوع و ناجائز ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی کے اعزہ اور اقربا کی قبریں ایسی جگہ ہیں کہ ان تک پہنچنے کے لئے چند مسلمانوں کی قبروں کو کودنا پڑے گا۔ تو اس شخص کو وہاں پہنچ کر فاتحہ پڑھنا مکروہ ہے۔ بلکہ وہ باہر ہی سے فاتحہ پڑھے۔ الحاصل اب اگر اس میں کھیتی کی جائے گی یا مکان بنایا جائے گا، تو اس میں چلنا پھرنا بیٹھنا لیٹنا قبور کو پاؤں سے روندنا ان پر پاخانہ پیشاب کرنا سب کچھ ہی ہوگا اور کوئی دقیقہ بے حیائی اور اموات مسلمین کی ایذا رسانی کا باقی نہ رہے گا۔ اور قاضی خاں میں تو یہاں تک مرقوم ہے۔

مقبرة قدیمة بمحلة لم یبق فیها آثار المقبرة هل یباح لاهل المحلة الانتفاع بها قال ابو النصر رحمة الله تعالیٰ علیه لا یباح ۔

یعنی کسی محلہ میں کوئی پرانا مقبرہ ہے جس میں قبروں کے نشان باقی نہیں رہے ہیں تو آیا اہل محلہ اس سے نفع حاصل کر سکتے ہیں؟ ابو النصر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ مباح نہیں ہے۔ اور یہی فتاوی ظہیریہ وخزانۃ المفتین وغیرہ میں ہے۔ ہدایہ میں ہے:

فی غایۃ القبح ان یقبری فیه الموتی سنة ویزرع سنة۔

یعنی یہ بہت ہی قبیح ہے کہ کسی جگہ ایک سال قبر بنالیا کریں اور ایک سال کھیتی کرلیا کریں۔

بالجملہ اگر فقہ کی عبارات اسی طرح پیش کی جائیں تو جواب میں بہت طول ہو جائے لیکن اب یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ عالمگیری کی عبارت مندرجہ فی السوال کے متعلق سائل کے شکوک رفع کروں۔ وباللہ التوفیق۔

مسائل شرع میں ذرا سی صورت بدل جانے سے ایک ناجائز جائز، اور جائز ناجائز ہو جاتا ہے۔ مثلاً شراب کی حرمت قطعی ہے لیکن عند الضرورت کہ ایک شخص کی شدت تشنگی سے جان لبوں پر آگئی ہے اور وہاں شراب کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے تو اس کے لئے شریعت بقدر ضرورت شراب حلال کر دیتی ہے۔ لہذا ضرورت شریعت میں ایک بہت بڑا عذر ہے۔ اسی لئے ایک قبر میں دوسرے مردہ کا دفن جائز رکھا اور اگر ضرورت نہ ہو تو یہ حرام ہے۔

چنانچہ تاتارخانیہ میں ہے: اذا صارت المیت ترابا فی القبر یکرہ دفن غیرہ فی قبرہ لان الحرمة باقیه۔

کبیری میں یہ قید صراحۃً موجود ہے: الا عند الضرورۃ بان لم یوجد مکان سواء۔

اور یہی مضمون مولانا رکن الدین صاحب دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

ایک وقت میں بلا ضرورت ناجائز ہے اور ضرورت کے وقت جائز ہے۔

اب رہا کھیتی یا مکان بنانا اور اس کا صحیح محل یہ ہے کہ کسی کی ملک میں کوئی میت دفن کر دیا گیا تو جب وہ بالکل خاک ہو جائے مالک کو روا ہے کہ وہاں کھیتی کرلے یا گھر بنائے یا کچھ اور کرے۔

چنانچہ درمختار میں ہے: لا یخرج منه بعد اهالة التراب الالحق آدمی کان تکون الارض مغصوبة او اخذت بشفعة یخیر المالك بین اخراجه ومساواته بالارض کما جاز زرعه والبناء علیه اذا بلی وصارا ترابا۔

یعنی مردہ قبر سے مٹی ہو جانے کے بعد بھی نہ نکالا جائے۔ ہاں کسی آدمی کے حق یا زمین کے

مغصوب ہونے یا شفعہ کے اعتبار سے مالک کو اس کے نکالنے اور زمین کو برابر کرنے کا اختیار ہے۔ جیسا کہ اس کے لئے جب وہ مٹی ہو جائے تو کھیتی کرنے اور مکان بنانا جائز ہے۔

اب آپ کو نہایت واضح طریقہ سے معلوم ہو گیا کہ عالمگیری کا وہ حکم اس وقت میں ہے جب دوسرے کی زمین میں میت دفن کر دیا گیا۔ تو یہ حق شریعت نے اس کو مالک ہونے کے اعتبار سے دیا ہے۔ نہ اس لئے کہ مسلمانوں کی قبروں پر ہر کوئی شخص کھیتی کر سکے، یا مکان بنا سکے۔ یہ بات ابتدا میں پیش کر دی گئی۔

اب رہا اولیاء کرام کے ساتھ ایسا فعل تو یہ بھی اسی سے معلوم ہو گیا کہ جب عوام مومنین کی قبور کو مٹی ہونے سے قبل تغیر نہیں کر سکتے تو ان کے اجسام تو ویسے ہی محفوظ رہتے ہیں۔ لہٰذا ان کے لئے تو کوئی صورت ہی متصور نہیں۔ صدہا کتب اور واقعات اس کے شاہد ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۳۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ

میت کو لکڑی کا پٹاؤ دیا جائے یا پتھر کا پٹاؤ بھی دے سکتے ہیں یا نہیں اور جس طرح اینٹ لگانے کی ممانعت بنائی جاتی ہے اسی طرح پتھر کی تو ممانعت نہیں ہے؟۔ بینوا توجروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

میت کیلئے پختہ اینٹ یا لکڑی کا پٹاو اگر محض بغرض استحکام دیا جائے تو مکروہ ہے۔

جوہرہ نیرہ میں ہے: ویکرہ الآجر الخشب لانهما لا حكام البناء وهو لا يليق بالميت لان القبر موضع البلى فعلى هذا تكره الاحجار۔

اور اگر اس غرض سے نہیں تو عند الحاجت جو دستیاب ہو اس کا پٹاؤ کیا جا سکتا ہے پختہ اینٹ کو بعض نے اس بنا پر مکروہ کہا ہے کہ اس کو آگ پہنچ چکی ہے تو اسکا قریب میت ہونا مناسب نہیں۔

ہدایہ میں ہے: ثم بالآجر اثر النار فیکرہ تفاولا"

اور پتھر میں کوئی اثر نار نہیں تو پتھر اینٹ کی طرح نہیں واللہ تو تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۳۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) قبر پر بیٹھنا۔ چلنا، قبر کا تکیہ لگا کر بیٹھنا کیسا ہے قبر کو پیٹھ کرنا کیسا ہے؟۔

(۲) مزار شریف پر فاتحہ پڑھنا کس جگہ کھڑے ہوکر اور کس طرح چاہئے؟۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ صاحب مزار کا رخ قبلہ کو ہے فاتحہ صاحب مزار کے سینہ کے مقابل صاحب مزار کے رخ کی طرف اپنا مونھ کر کے اور قبلہ کو پیٹھ کر کے فاتحہ پڑھنا چاہئے کیونکہ اس کا یعنی صاحب مزار کا رخ قبلہ کو ہے اور اگر اس کے پیٹھ کی طرف اس کے الٹے ہاتھ کو کھڑے ہوکر فاتحہ پڑھے گا یا سرہانے یا پائیتانے صاحب مزار کے کھڑے ہوکر فاتحہ پڑھے گا۔ تو اس صورت میں صاحب مزار کو فاتحہ پڑھنے والے کی طرف اپنا مونھ کرنا ہوگا جس سے صاحب مزار کو تکلیف مونھ پھیرنے کی ہوگی۔ اس لئے سیدھی طرف قبلہ کو پیٹھ کر کے فاتحہ پڑھے اور کسی طرف کھڑے ہوکر فاتحہ نہ پڑھے کیا شخص مذکور کا قول صحیح ہے یا نہیں؟۔

(۳) قبر میں طاق کھدوانا اور اس میں عہدنامہ یا شجرہ شریف اور اس شخص کا نام جس کی قبر تیار کی گئی ہے لکھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

(۱) بلا حاجت قبر پر بیٹھنا یا چلنا یا اس کا تکیہ لگانا مکروہ ہے۔

عالمگیری میں ہے: یکره ان یبنی علی القبر او یقعد او ینام او یوطأ علیه۔

اور آداب زیارت سے قبر کی طرف مونھ کرنا ہے۔

اشعۃ اللمعات میں ہے: واز جملۂ آداب زیارت ست روئے بجانب قبر۔

اور خاص کر کسی بزرگ یا عالم دین کی قبر کی طرف پیٹھ کرنا بے ادبی اور فیوض سے محرومی کا باعث ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) مزار پر فاتحہ پڑھتے وقت قبر کی طرف مونھ کر کے اور قبلہ کی جانب پشت کر کے کھڑا ہونا اور میت کے چہرہ کے مقابل کھڑا ہوا جائے۔

اشعۃ اللمعات میں ہے: واز جملۂ آداب زیارت ست کہ روئے بجانب قبر و پشت بجانب قبلہ

مقابل روئے میت بایستند۔

باقی شخص مذکور کا قول صحیح ہے۔ چنانچہ ردالمختار جلد اول میں بحث زیارت قبور میں اس کی تصریح موجود ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) عہد نامہ کو میت کے کفن یا پیشانی پر لکھنے سے اس کی مغفرت ہو جانے کی امید کی تصریح در مختار میں ہے: کتب علی جبهة الميت او عمامته او كفنه عهد نامه يرجى ان يغفر الله للميت۔

تو بعض اکابر نے بخوف ان کلمات کے نجاست میں ملوث ہونے یا اندیشہ اہانت کی بنا پر یہ حل تجویز فرمایا کہ قبر میں طاق کھدوا کر اس میں عہد نامہ یا شجرہ رکھ دیا جائے تو اس میں ان اندیشوں سے بھی حفاظت ہو جائے اور میت کو ان کلمات اور سند صالحین سے امداد بھی حاصل ہو جائے۔ لہٰذا طاق قبر میں عہد نامہ یا شجرہ رکھنے میں کونسا ممنوع شرعی لازم آتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۳۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

قبر کے تختے گل سڑ کر کل یا چند دو ایک نکل گئے نیچے دھنس گئے ہوں تو نئے دوسرے تختے ڈال کر قبر کی درستی کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔ المستفتی محمد عرفان پیلی بھیت۔

الجواب

قبر کے تختے اگر گل سڑ جائیں تو ان تختوں کو اکھاڑ کر نئے تختے ڈال کر قبر درست کرانا ممنوع ہے بلکہ اس میں جہاں نشیب ہو یا سوراخ ہو جائے تو اسکو مٹی سے بند کر دینا چاہیے۔

طحطاوی میں ہے: ولا يباح نبشه بعد الدفن اصلا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۱۵ صفر المظفر

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

****

مسئلہ (۵۳۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں۔ سوال کا جواب مدلل اومفصل دیجئے گا؟۔

زید کے پاس انتخاب صحاح ستہ کتاب ہے جس کا ترجمہ اردو میں ہے اس کے صفحہ ۸۶ پر احکام قبر میں دو حدیثیں ہیں۔ جن کے ترجمہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے، کہ سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مزارات کو پختہ بنوانے کو اور فقیر بنکر مزارات پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ اولیا عظام کے مزارات پختہ بنے ہوئے ہیں اور انکی قبروں پر لوگ مجاور بنے بیٹھے ہے۔ زید کا کہنا ہے کہ میں نے بہت سے علماء سے اس کا مطلب دریافت کیا، مگر میری تسکین نہ ہوئی اور نہ کافی جواب ملا۔ حدیث کا ترجمہ نقل کرتا ہوں جواب سے آگاہ کیجئے گا۔

حدیث۔ وعن ابی الهیاج الاسدی قال قال علی الا ابعثك علی مابعثنی علیه رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم ان لاتدع تمثا لا الا طمسته ولا قبر امشرفا الا سویته رواه مسلم۔

ابوالھیاج نے فرمایا حضرت علی نے کہا میں تمہیں اس کام کو انجام دینے کے بھیج رہا ہوں جسے انجام دینے کے لئے سرکار نامدار نے مجھے بھیجا تھا وہ کام یہ ہے کہ تم کوئی تصویر بغیر مٹائے اور کوئی اونچی قبر بغیر نیچی کئے ہوئے نہ چھوڑو۔ (مسلم شریف)

حدیث۔ عن جابر قال نهی رسول الله ﷺ ان یجصص القبر وان یبنی وان یقعد علیه رواه مسلم

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضور سید عالم ﷺ نے قبر کو گچ کرنے اور اس پر عمارت بنانے اور اس پر فقیر ہو کر بیٹھنے سے منع فرمایا۔

المستفتی محمد یونس رضا خاں مدرس مدرسہ تعلیم القرآن بلند پور۔ فرخ آباد

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

اس کتاب کا ترجمہ کسی بدمذہب وہابی نے کیا ہے کہ اس نے ترجمہ میں تصرف کیا ہے۔

چنانچہ پہلی حدیث کے الفاظ ولا قبرا مشرفا الا سویته کا یہ غلط ترجمہ کیا کہ تم کوئی اونچی قبر کو

نیچی کئے ہوئے نہ چھوڑو حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ تھا کہ تو کسی اونچی قبر کو بغیر برابر کئے ہوئے نہ چھوڑنا۔ تو اس نے تسویۃ کے معنی بجائے برابر کرنے کے نیچا کرنا اپنی طرف سے گڑھا ہے۔ اور اس تصرف کے لئے مجبوری یہ لاحق ہوئی کہ قبر مسلم کو زمین کی برابر کرنا خلاف سنت ہے۔ تو اس نے قبر کو برابر کرنے کے بجائے نیچا لکھ دیا۔ اور ظاہر ہے کہ جب قبر کی اونچائی کو نیچا کیا جائے گا، تو وہ پھر زمین سے بلند ہی ہوگی، اور جب وہ زمین سے کچھ بلند ہی رہی تو تسویہ کے معنی کب متحقق ہوئے کہ وہ زمین کے برابر نہیں ہوئی، اور مقصود حدیث تصویر اور قبر کا بالکل میٹ دینا تھا، اسی اہم مقصد کیلئے انکو بھیجا تھا۔ علاوہ بریں وہابیہ کی بے ایمانی یہ ہے کہ حدیث کا زمانہ نہیں بتایا اور نہ یہ ظاہر کیا کہ وہ کس کی قبریں تھیں۔

ترمذی شریف میں اسی حدیث کے بین السطور میں ہے۔ بعثه النبی فی اسواق مکة ومقابرها عام الفتح۔ یعنی حضور نبی کریم نے انہیں فتح مکہ کے سال بازاری قبروں کے لئے بھیجا تھا۔ تو اب ہر مسلمان غور کرسکتا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے وہاں مسلمانوں کی قبریں کہاں تھیں۔ تو اب ظاہر ہوگیا کہ قبور مشرکین تھیں انکو برابر کرنے اور میٹنے کیلئے انہیں بھیجا تھا۔ تو اب وہابیہ کا تصرف دیکھو کہ حدیث قبور مشرکین کے میٹنے کے لئے تھی ان بیدینوں نے قبور مسلمین اور مزار اولیا پر چسپاں کردیا۔ نیز اس حدیث میں نہ قبر کو پختہ کرنے کی ممانعت ہے نہ اسکے مجاور بننے کی حرمت کا ذکر ہے۔

دوسری حدیث کا تصرف دیکھو کہ الفاظ یہ تھے۔ ان یقعد علیہ۔ جس کا یہ غلط ترجمہ کیا وراس پر فقیر ہوکر بیٹھنے، سے منع فرمایا، باوجود کہ صحیح ترجمہ یہ تھا قبر پر بیٹھنے سے منع فرمایا کہ قبر پر چڑھ کر بیٹھنے سے یقیناً قبر کی بے حرمتی ہے، اس کی ممانعت فرمائی ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ قعود کے معنی بیٹھنے کے ہیں، اس میں ''فقیر ہوکر'' کا کلمہ اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔ اس جاہل نے یہ کلمہ بڑھا کر مضمون حدیث ہی کو بدل دیا اور مضمون لازم ہوگیا کہ قبر پر فقیر ہوکر بیٹھنا ممنوع ہے اور بغیر فقیر ہوکر بیٹھنا ممنوع نہیں۔ حالانکہ قبر پر ہر حال میں بیٹھنا ممنوع ہے۔ اور پھر یہ بھی تو نتیجہ نکلا کہ اگر فقیر ہوکر قبر پر تو نہ بیٹھا، بلکہ اس کے قریب بیٹھا تو یہ ممنوع نہ ہوا۔ وہابیہ نے حدیث میں تصرف بھی کیا اس کا ترجمہ بھی غلط کیا لیکن مدعا پھر بھی حاصل نہ ہوا۔ لہذا ان ہر دو حدیث سے مزارات اولیا کرام کے پختہ بنوانے اور انکے مجاور بننے کی ممانعت پر استدلال کرنا غلط ثابت ہوا۔ پھر اگر ان احادیث سے یہ امور ناجائز ہوتے تو محدثین وفقہاء کرام انکو ہرگز ہرگز جائز نہ لکھتے۔ اس حدیث اول ہی کی شرح میں علامہ محمد طاہر مجمع البحار میں فرماتے ہیں

قد اباح السلف ان یبنی علی قبور المشائخ و العلماء المشاهیر لیزورهم الناس و یستریحون بالجلوس فیه (مجمع البحار۔ ج۲ص۱۸۷)

یعنی سلف نے مشائخ اور مشہور علماء کی قبروں پر تعمیر مکان کو جائز رکھا ہے تا کہ زیارت کرنے والے آئیں اور اس میں بیٹھ کر آرام پائیں۔

درمختار میں ہے: ولا یجصص للنهی عنه ولا یطین ولا یرفع علیه بناء وقیل لا باس به وهو المختار۔ (شامی۔ ج۱ص۶۲۷)

اسی طرح طحطاوی میں ہے۔ ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ قول مختار کی بنا پر قبر پر گچ کرنے، اس پر عمارت بنانے میں شرع میں کوئی حرج نہیں ہے، تو اگر یہ امور حدیث میں ممنوع ہوتے تو ہمارے سلف ہرگز ہرگز جائز نہیں لکھتے۔ تو وہابیہ کا ان احادیث سے استدلال کرنا غلط و باطل ہے۔ اور تصریحات مذہب کے خلاف ہے۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

باب الصدقات للمیت

مسئلہ (۵۴۰)
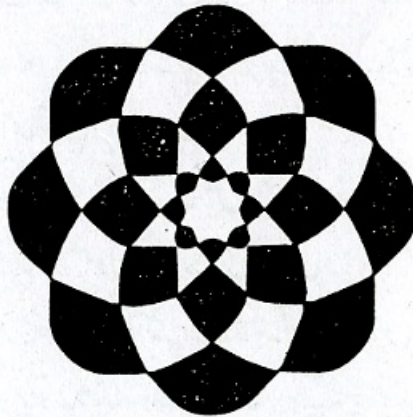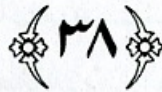
ماقولکم یاساداة العلماء رحمکم الله تعالیٰ مندرجہ ذیل مسائل میں

میت کودفن کرنے کے بعدروپیہ پیسہ لوجہ اللہ خیرات کرنا کیسا ہے؟۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

میت کے لئے لوجہ اللہ خیرات کرنے کے مستحب اور مندوب ہونے کا حکم قرآن کریم سے ثابت ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: واذا حضر القسمة اولو القربیٰ والیتمی والمساکین فارزقوهم منه وقولوالهم قولا معروفا۔ (سورہ نساء)

اور بانٹتے وقت اگر رشتے داراور یتیم اور مسکین آجائیں تو اس میں سے انہیں بھی کچھ دواوران کو اچھی بات کہو۔

علامہ ابوالبرکات نسفی تفسیر مدارک میں اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

واذا حضر القسمة لترکة اولوالقربیٰ ممن لایرث والیتمی والمساکین من الاجانب فارزقوهم فاعطوهم منه مماترك الوالدان والاقربون وهو امر ندب وهو باق لم ینسخ۔

(مدارک مصری ج۱ص۱۶۲)

اورترکہ کی تقسیم کے وقت اگر غیروارث رشتہ داراوراجنبی یتیم اور مسکین آجاویں توانہیں ماں باپ اوراقارب کے ترکہ سے کچھ دو، یہ دینا مستحب کام ہے اور یہ حکم باقی ہے جومنسوخ نہیں ہوا۔

علامہ ناصرالسنۃ علاءالدین بغدادی تفسیر خازن میں اس آیت کریمہ کے تحت میں فرماتے ہیں:

القول الثانی ان هذا الامر ندب واستحباب لا علی سبیل الفرض والایجاب وهذا القول هو الاصح الذی علیه العمل الیوم۔ (خازن مصری ص۴۰۴ج۱)

دوسرا قول یہ ہے کہ غیر وارث رشتہ داروں اوراجنبی تیموں اور مسکینوں کو دینا مندوب ومستحب

ہے فرض وواجب نہیں ہے یہ قول ایسا صحیح ہے جو آج بھی معمول ہے۔

علامہ احمد جیون تفسیر احمدی میں اسی آیۃ کریمہ کے تحت فرماتے ہیں:

المآل ان اللّٰہ تعالیٰ امرنا باعطاء شئ من الترکۃ بغیر الورثۃ فھو اما ان یکون تطیبا بقلوبھم او تصدقا علیھم فحینئذ یکون ذلک ندبا باقیا علی حالہ ۔

(احمدی مطبوعہ دہلی ۔ ج ا ص ۱۳۵)

اور مآل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں غیر وارثوں کے لئے ترکہ سے کچھ دینے کا حکم فرمایا پس یہ یا تو ان کے دل خوش کرنے کے لئے ہے یا ان پر صدقہ کرنا تو یہ دینا مستحب ہوا اور اپنے حال پر باقی رہا۔

اس آیت کریمہ اور اس کی تفاسیر سے یہ ثابت ہو گیا کہ ترکہ سے غیر وارث رشتہ داروں اور اجنبی یتیموں مسکینوں کی تقسیم ترکہ سے پہلے کچھ صدقہ اور خیرات دینا مستحب ہے ان تفاسیر نے اس آیت کریمہ کو غیر منسوخ قرار دیا اور اسی کو صحیح قول اور معمول امت بتایا۔ تفسیر خازن نے کہا ہے کہ حضرت امام زہری اور امام نخعی حضرت مجاہد، حضرت سعید بن جبیر، حضرت عطاء، حضرت امام شعبی، حضرت ابو العالیہ، حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی قول ہے، اور سید المفسرین حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے۔

آیت کریمہ کے بعد اب کسی حدیث کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن مزید اطمینان کے لئے احادیث بھی پیش کر دوں۔

طبرانی میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ان الصدقۃ لتطفئی عن اھلھا حر القبور۔ (شرح الصدور مصری ص ۱۲۸)

بیشک صدقہ مردوں سے قبر کی حرارت کو دور کر دیتا ہے۔

طبرانی اوسط میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے سرکار رسالت میں عرض کی: یارسول اللّٰہ توفیت امی ولم توص ولم تصدق فھل ینفعھا ان تصدقت عنھا قال نعم ولو بکراع شاۃ محرق ۔ (شرح الصدور مصری ص ۱۲۹)

یارسول اللہ! میری والدہ وفات پا گئیں اور انہوں نے نہ صدقہ کیا وصیت کی نہ خود صدقہ دیا اگر میں ان کی طرف سے دوں تو کیا انہیں نفع دیگا فرمایا ہاں نفع دیگا اگرچہ بکری کے جلے ہوئے پائے ہی دیں،

طبرانی نے اوسط میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

مامن اهل ميت يموت منهم ميت فيصدقون بعد موته الا اهدا هاله جبرئيل على طبق من نور ثم يقف على شفير القبر فيقول ياصاحب القبر العميق هذه هدية اهلها اهداها اليك اهلك فاقبلها فتدخل عليه فيفرج بها يستبشرويحزن جيرانه الذين لايهدى بهم شئ ۔

(شرح الصدور مصری ۱۲۹)

اہل میت سے جو اپنی میت کی جانب سے اس کے مرنے کے بعد صدقہ کریں تو جبریل امیں نور کے طبق میں وہ ہدیہ لیجاتے ہیں اور کنارہ قبر پر کھڑے ہوکر فرماتے ہیں کہ اے گہرے گڑھے والے یہ ہدیہ ہے جسے تیرے اہل نے تیری طرف بھیجا ہے تو اسے قبول کر تو وہ اس پر داخل ہوتا ہے اور اس کے وہ پڑوسی جن کی طرف کوئی چیز نہیں بھیجی گئی رنجیدہ ہوتے ہیں۔

احادیث سے بھی یہ ثابت ہوگیا کہ میت کے لئے صدقات جائز ہیں اور اس کے لئے بہت نافع ہیں اور باعث فرح وسرور ہیں یہ حکم بکثرت آیات واحادیث سے ثابت ہے اور اہل سنت و جماعت کا اتفاقی واجماعی مسئلہ ہے۔ عقائد کی مشہور کتاب شرح فقہ اکبر میں ہے:

عنداهل السنة ان للانسان ان يجعل ثواب عمله صلوة اوصوما او حجا او صدقة او غيرها۔ (شرح فقہ اکبر مصری ۱۱۸)

اہل سنت کے نزدیک انسان اپنے عمل۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ صدقہ وغیرہ کا ثواب اپنے غیر کو پہنچا سکتا ہے۔ بحر الرائق وبدائع میں ہے:

من صام او صلى او تصدق وجعل ثوابه لغيره من الاموات والاحياء جاز ويصل ثوابها اليهم عند اهل السنة والجماعة ۔ (شامی مصری ج ا ص ۶۳۱)

جس نے روزہ رکھا یا نماز پڑھی یا صدقہ دیا اور اس کا ثواب اپنے مردوں اور زندوں کو پہنچائے تو جائز ہے اور ان اعمال کا ثواب اہلسنت والجماعت کے نزدیک انہیں پہونچتا ہے۔

علامہ حسن شرنبلالی مراقی الفلاح شرح نور الایضاح میں علامہ زیلعی سے ناقل ہیں:

فللانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره عند اهل السنة والجماعة صلوة كان او صوما او حجا او صدقة اوقرأة للقرآن او الاذكار او غير ذلك من انواع البر ويصل ذلك الى الميت وينفعه۔ (طحطاوی مصری ص ۳۶۳) ۔

انسان اپنے عمل کا ثواب اپنے غیر کے لئے اہل سنت و جماعت کے نزدیک پہنچا سکتا ہے اب وہ عمل نماز ہو یا روزہ حج ہو یا صدقہ قرآن کی تلاوت ہو یا اذکار یا اس کے سوا اور نیکیوں کے اقسام وہ میت کی طرف پہنچتا ہے اور اس کو نفع دیتا ہے۔

بالجملہ آیات واحادیث اور کتب عقائد وفقہ سے ثابت ہو گیا کہ میت کے لئے صدقہ وخیرات بوجہ اللہ دینا نہ فقط جائز بلکہ مستحب ہے اور یہ صحابہ اور تابعین۔ ائمہ ومجتہدین۔ فقہا ومحدثین، عامۃ المسلمین اہل سنت و جماعت کا معمول ہے اور اموات کے لئے یہ بہت نافع اور باعث فرح وسرور ہے اور جو اس کا مخالف ومنکر ہے وہ آیات واحادیث کا انکار کرتا ہے مذہب اہل سنت و جماعت کے اتفاقی مسئلہ کی مخالفت کرتا ہے اور اموات کے ساتھ دشمنی وعداوت کرتا ہے اور مسلمانوں کو ایک نیک کام سے روکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ

اگر صدقہ اور خیرات اس طور پر تقسیم کیا جائے کہ علماء کو زیادہ دیں اور طالب علموں کو اس سے کم اور ملازموں کو اس سے کم اور فقراء ومساکین کو اس سے کم تو اس طور کی تقسیم جائز ہے یا نہیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اس طرح کی تقسیم میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ہر صاحب حاجت کو اس کی منزلت ملحوظ رکھتے ہوئے دینا ہے حدیث شریف میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: انزلوا الناس منازلھم۔ (مشکوۃ شریف ص ۴۲۴)

لوگوں کا ان کی منزلتوں کے اعتبار سے اکرام کرو۔

جب منزلت کا لحاظ ثابت ہوا تو دینی منزلت ضرور دنیوی منزلت سے افضل ہے اور دینی منزلت میں بھی فرق مراتب ہیں صورت مسئلہ میں یہ ظاہر بات ہے کہ فقراء ومساکین سے ملانے افضل ہیں۔ اور ملانوں سے طالب علم افضل ہیں اور طلباء سے علماء افضل ہیں چنانچہ علما کی افضلیت کے متعلق تو خاص اسی

مسئلہ تصدق میں تصریح موجود ہے۔

طحطاوی میں معراج اور قہستانی سے ناقل ہیں:

التصدق على العالم الفقير افضل من الجاهل الفقير۔

(طحطاوی علی مراقی الفلاح مصری ص ۴۱۹)

عالم فقیر پر صدقہ کرنا جاہل فقیر پر صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

اس عبارت سے جاہل فقراء و مساکین پر عالم کی افضلیت تو صراحۃ ثابت ہوگئی۔ اب باقی رہے طلبہ اور ملانے ان پر بھی عالم کا فضل ضمنا ثابت ہوا کہ یہ دونوں بھی بہ نسبت عالم کے جاہل کے حکم میں ہیں اب باقی رہے طلبہ تو یہ مصارف صدقات کی ساتویں قسم فی سبیل اللہ میں داخل ہیں در مختار میں فی سبیل اللہ کی تفسیر نقل کی: (وفى سبيل الله وهو منقطع الغزاة) وقيل الحاج وقيل طلبة العلم۔

(شامی مصری ج ۲ ص ۶۳)

فی سبیل اللہ میں وہ لشکری محتاج ہیں کہ جہاد میں جانا چاہتا ہے اور سامان حرب پاس نہ ہو اور بعض نے کہا وہ جو حج کرنا چاہتا ہے اور خرچ نہ رکھتا ہو اور بعض نے کہا کہ طالب علم ہیں۔

ردالمحتار میں شرنبلالی سے ناقل ہیں: فالتفسير بطالب وجيه خصوصا۔

(شامی مصری ج ۲ ص ۶۳)

فی سبیل اللہ کی تفسیر طالب علم کے ساتھ کرنا خصوصاً بہت وجیہ ہے۔

اور قرآن کریم نے مصارف کو بایں ترتیب بیان فرمایا ہے:

انما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم وفى الرقاب والغارمين وفى سبيل الله وابن السبيل فريضة من الله۔ (سورہ توبہ ع ۷ ج ۱)

صدقہ تو انہیں لوگوں کے ہیں (۱) محتاج۔ (۲) اور نرے نادار۔ (۳) اور جو اسے تحصیل کر کے لائیں۔ (۴) اور جنکے دلوں کو اسلام سے الفت دی جائے۔ (۵) اور گردنیں چھڑانے میں (۶) اور قرض داروں کو۔ (۷) اور اللہ کی راہ میں۔ (۸) اور مسافر کو۔ یہ اللہ کی طرف سے فریضہ ہے۔

علامہ ابوالبرکات نسفی تفسیر مدارک میں اس آیت کریمہ کے تحت میں فرماتے ہیں:

وعدل عن اللام الى فى فى الاربعة الاخيره للايذان انهم ارسخ فى استحقاق التصدق عليهم ممن سبق ذكره لان فى للوعاء فيه على انهم احقاء بان توضع فيهم

الصدقات ویجعلوا مظنۃ لها وتکریر فی فی قوله فی سبیل اللّٰه وابن السبیل فیه فضل وترجیح لهذان علی الرقاب والغارمیں ۔ (مدارک ص ۱۰۱ ج ۲)

آخر کے چاروں مصارف میں بجائے معرف بلام کے حرف فی لایا گیا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ پہلے چاروں مصارف سے یہ اخیر کے چاروں صدقہ کے حق دار ہونے میں زیادہ راسخ ہیں کیونکہ فی ظرفیۃ کے لئے ہے پس متنبہ کیا گیا کہ اخیر کے چار مصارف صدقہ دیئے جانے کے زیادہ حقدار ہیں اور انہیں اس کے لئے راجح قرار دیا جائے اور فی سبیل اللہ اور ابن سبیل میں لفظ فی دوبارہ لانے میں ان دونوں کی مکاتب اور مدیون پر فضلیت اور ترجیح کی طرف اشارہ ہے۔

اس عبارت سے ثابت ہوا کہ آخر کے چاروں مصارف یعنی مکاتب، مدیون، فی سبیل اللہ، مسافر، صدقہ کے لئے پہلی چاروں اقسام یعنی فقراء، مساکین، عاملین، مؤلف قلوب پر افضل اور زیادہ حق دار ہیں اور آخر کے چاروں مصارف میں فی سبیل اللہ۔ اور مسافر کو صدقہ کے لئے مکاتب اور مدیوں پر زیادہ ترجیح اور فضیلت ہے۔

اور یہ امر ثابت ہو چکا کہ طلبا فی سبیل اللہ میں داخل ہیں تو طلباء کو فقراء و مساکین پر فضیلت حاصل ہوئی پھر طلباء کی ملانوں پر فضیلت بہت ظاہر ہے کہ طلباء کسب علم میں مشغول ہیں۔

شامی میں ہے: لاشتغاله من الکسب بالعلم ۔

لہذا ان ملانوں سے افضل ہوئے۔ اب باقی رہے ملانے تو یہ بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہیں۔

چنانچہ علامہ شامی ہدایہ سے ناقل ہیں:

فی سبیل اللّٰه جمیع القرب فیدخل فیه کل من سعی فی طاعة اللّٰه وسبیل الخیرات اذا کان محتاجا۔ (شامی ج ۲ ص ۶۳)

فی سبیل اللہ سے تمام نیک کام مراد ہیں تو اس میں ہر وہ شخص جو طاعت الٰہی اور راہ خیرات میں کوشش کرے داخل بشرطیکہ صاحب حاجت ہو۔

اسی عبارت کے اعتبار سے ملانے بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہوے کہ وہ بھی طاعت الٰہی میں ساعی ہوتے ہیں۔ لہذا ان کی فضیلت بھی تقریر بالا سے فقراء و مساکین پر ثابت ہوتی۔

حاصل جواب یہ ہے کہ صدقہ میں اگر ایسا فرق کر دیا جائے کہ علما کو زیادہ دیں اور طلبا کو اس سے کم اور ملانوں کو اس سے کم اور فقراء و مساکین کو اس سے کم تو اس میں کوئی ممانعت شرعی لازم نہیں آتی۔

جیسا کہ تحقیق بالا سے ثابت ہوا جو اسے ناجائز کہے کسی دلیل سے ثابت کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ
تونگر کو مردہ کا صدقہ یا خیرات لینا جائز ہے یا نہیں:۔

الجواب

نحمده ونصلى ونسلم على رسوله الكريم

صدقات واجبہ زکوۃ وفطرہ وغیرہ تو اغنیا اور تونگروں کو لینا ممنوع ہے ترمذی شریف وابوداؤد شریف دارمی شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: لا يحل الصدقة لغنى ۔ (مشکوۃ شریف ص ۱۶۱)

صدقہ مالدار کے لئے حلال نہیں۔

اور مردے کے لئے صدقہ وخیرات کیا جاتا ہے ظاہر یہ ہے کہ وہ صدقہ واجبہ نہیں بلکہ صدقہ نافلہ میں داخل ہے اور صدقہ نفل تونگر اور غنی کے لئے ممنوع نہیں اب چاہے وہ غنی ہو یا غیر عالم چنانچہ۔

جوہرنیرہ میں ہے: ولو دفع الى الغنى صدقة التطوع جاز له اخذها۔

(جوہرنیرہ مطبوعہ مجتبائی دہلی ص ۱۳۲)

اگر مالدار کو صدقہ نفل دیا جائے تو اسے لینا جائز بھی ہے۔

لہذا ثابت ہو گیا کہ مردے کے لئے جو صدقہ وخیرات کی جاتی ہے وہ تونگر عالم کو لینی جائز ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ

مردے کی خیرات ہر شخص لے سکتا ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

جب یہ ثابت ہو چکا کہ مردے کے لئے جو صدقات کئے جاتے ہیں وہ صدقہ نافلہ ہیں اور صدقہ نافلہ فقیر وغنی ہر ایک کے لئے جائز ہے۔ البتہ اولیٰ یہ ہے کہ فقیر کو دیں اور اغنیاء اس کو نہ لیں۔

ردالمحتار میں ہے: صرح فی الذخیرة بان فی التصدق علی الغنی نوع قربة دون قربة الفقیر۔ (ردالمحتار مصری ص ۳۶۸)

ذخیرہ میں تصریح کی کہ مالدار پر صدقہ کرنا ثواب کا کام ہے مگر فقیر پر صدقہ کرنے کے ثواب سے کم۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی فتاوی عزیزیہ میں خاص فاتحہ کے متعلق فرماتے ہیں:

گر فاتحہ بنام بزرگی دادہ شد بس اغنیارا ہم خوردن ازاں جائز است۔ از فتاوی عزیزیہ ص ۴۱

اگر کسی بزرگ کے نام پر فاتحہ دی گئی تو مالداروں کو بھی اس میں سے کھانا جائز ہے۔

لہذا مردے کی خیرات اور صدقات ہر ایک کے لئے جائز ہے غنی کے لئے بھی ہے مگر غنی کے لئے اولیٰ یہ ہے کہ وہ اس سے اجتناب و پرہیز کرے لیکن غنی کے دینے میں بھی ثواب ہوتا ہے۔ اگرچہ فقیر کے دینے سے کم ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ

میت کی تجہیز وتکفین کے بعد فقط اتنی رقم اور سامان ہے کہ جس سے اس کی اہلیہ اور یتیم بچوں کی گذر اوقات ہو سکتی ہے اگر اس میں کم از کم بقدر حیثیت خیرات کی جائے جب بھی محتاج الی غیر ہم ہونے کا خوف ہے تو ایسی حالت میں اس کے مال متروکہ سے اس کے لئے صدقہ خیرات کریں یا کھانا کھلائیں یہ جائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

سوال اول کے جواب میں آیت کریمہ اوراس کی تفاسیر سے یہ ثابت ہو چکا کہ ترکہ کی تقسیم سے پہلے غیر وارث رشتہ داروں یتیموں۔ مسکینوں کو مال میت سے کچھ بطور صدقہ اور خیرات کے دینا مستحب ہے زمانہ صحابہ میں اس پر عمل رہا ہے۔

محدثین نے اس پر عمل کیا چنانچہ حضرت محمد بن سیرین سے مروی ہے جس کو علامہ محی السنۃ امام بغوی نے تفسیر معالم التنزیل آیت مذکورہ کے تحت میں نقل کیا: روی محمد بن سیرین ان عبیدۃ السلمانی قسم اموال الیتام فامر بشاۃ فذبحت فصنع طعاما لاجل ھذہ الایۃ وقال لولا ھذہ الایۃ لکان ھذا من مالی۔ (حامش خازن مصری ج ا ص ۴۰۴)

حضرت امام سیرین سے مروی ہے کہ حضرت عبیدہ سلمانی نے یتیموں کا مال تقسیم کرتے ہوئے ایک بکری کے ذبح کرنے کا حکم فرمایا اور فقراء کے لئے کھانا تیار ہوا بموجب اس آیت کریمہ کے اور فرمایا کہ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو یہ میرے مال سے ہوتا۔

بالجملہ تجہیز و تکفین کے بعد اور تقسیم ترکے سے قبل میت کے مال سے صدقات وخیرات کرنے کا استحباب آیت کریمہ سے ثابت ہوا۔ اور صحابہ کرام اور محدثین عظام کے عمل سے ثابت ہوا البتہ اس صدقہ وخیرات کی کوئی مقدار ثابت نہیں تو جتنا اس وقت مناسب حال ہو۔ اسی قدر فقراء ومساکین کو دیں یا کھانا کھلائیں۔ ہاں اگر بعض وارث نابالغ ہیں یا مال متروکہ قلیل ہو یا بعض وارث اس وقت موجود نہ ہوں اور ان کی اجازت نہ ہو تو ان صورتوں میں ترکہ سے صدقہ وخیرات ممنوع ہے۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے آیت مذکورہ کی تفسیر میں ہے:

عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کان المال کثیرا یرضخ لھم وان کان قلیلا اعتذر الیھم۔ (تفسیر احمدی مطبوعہ جید پریس دہلی ص ۱۴۳)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ اگر مال زاید ہو تو فقرا کو کچھ دیا جائے اور اگر قلیل ہو تو ان سے عذر کر دیا جائے۔

علامہ ناظر الشریعۃ علی بغدادی تفسیر خازن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت نقل فرماتے ہیں:

قال ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان کان الورثۃ کبارا رضخوالھم وان کان الورثۃ صغاراً اعتذر الیھم فیقول الولی او الوصی انی لااملک ھذا المال وانما ھو للصغار

ولو كان لي منه شئ لاعطيكم وان يكبروا فسيعرفوا حقكم هذا هو القول المعروف ـ

(خازن مصر ج ا ص ۴۰۴)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اگر وارث بالغ ہوں تو فقراء کو کچھ دیں اور اگر وارث نابالغ ہوں تو ان سے عذر کر دیا جائے اور ولی یا وصی یہ کہے میں اس مال کا مالک نہیں یہ تو نابالغوں کا مال ہے اگر مجھے اس میں کچھ اختیار ہوتا تو میں تمہیں ضرور دیتا یہ بالغ ہو کر عنقریب تمہارا حق پہچان لینگے یہی وہ لفظ ہیں جن کو آیت میں قول معروف فرمایا۔

ردالمحتار حاشیہ درمختار میں ہے:

ان كانت الورثة فقراء ولا يستغنون بما يرثون فالترك اولىٰ لمافيه من الصدقة على القريب وقد قال عليه الصلاة والسلام افضل الصدقة على ذى الرحم الكاشح ولان فيه رعاية حق الفقراء والقرابة جميعا ـ (ردالمحتار ج ۵ ص ۴۳۱)

اگر وارث فقراء ہیں اور اپنے ترکہ کے حصوں سے مستغنی نہیں ہوں گے تو فقراء کو نہ دینا بہتر ہے کہ اس میں بھی رشتہ دار پر صدقہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ افضل صدقہ ذی حاجت رشتہ دار کو دینا ہے اور اس لئے کہ رشتہ دار کو دینے میں فقر اور قرابت دونوں کے حقوق کی رعایت ہے۔

البتہ بالغ ورثہ اپنے اپنے حصہ سے یا اپنی طرف سے اپنے مال سے میت کے لئے جس قدر چاہیں صدقہ اور خیرات کر سکتے ہیں۔

شامی میں ہے: اذا جاز بعض الورثة جاز عليه بقدر حقه ـ

(شامی ج ۵ ص ۴۳۰)

وذكرت فيما قبل مفصلا واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ

بروز سوم تہلیل اور قرآن کریم کے ختم کے بعد سب شرکاء کا سوم کو اگر میت کی طرف سے بطور

خیرات لوجہ اللہ پیسے دیئے جائیں یا کچھ اور دیا جائے تو یہ فعل جائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

بروز سوم قرآن مجید اور کلمہ شریف میت کے لئے پڑھنا باعث اجر جزیل ہے میت کے لئے قرآن مجید کا پڑھنا تو اجماع امت سے ثابت ہے کہ بلا انکار ہمیشہ سے اہل اسلام ہر زمانہ میں اموات کے لئے قرآن کریم کی تلاوت کرتے رہے۔ چنانچہ حضرت علامۃ الدہر جلال الدین سیوطی شرح الصدور میں فرماتے ہیں۔

ان المسلمیں مازالوا فی کل عصر یجتمعون و یقرؤن لموتاهم من غیر نکیر فکان ذلك اجماعا۔ (شرح الصدور مصری ۱۳۰)

مسلمان ہمیشہ سے ہر زمانے میں بلا کسی انکار کے اپنے مردوں کے لئے جمع ہوتے اور قرآن کریم پڑھتے تو یہ اجماع ہو گیا۔

اسی طرح کلمہ شریف کا میت کے لئے پڑھنا سنت اجر جلیل اور باعث ثواب جزیل ہے۔ چنانچہ امام ابو القاسم جیلی نے دیباج میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اخبرنی جبریل ان لا اله الا اللّٰه انس للمسلم عند موته وفی قبره و حین یخرج من قبره۔ (شرح الصدور ص ۷۸)

مجھے جبریل امیں نے خبر دی کہ لا اله الا اللّٰه محمد رسول اللّٰه مسلمان کے لئے اس کی موت کے وقت اور اسکی قبر میں اور جس وقت وہ قبر سے اٹھیگا انس ہو گا۔

علامہ علی قاری علیہ رحمۃ الباری شرح شفاء شریف میں فرماتے ہیں:

حکی عن العارف باللّٰه محی الدین بن عربی رحمة اللّٰه تعالیٰ علیه انه قال بلغنی عن النبی صلی اللّٰه تعالیٰ علیه وسلم انه من قال لا اله الا اللّٰه سبعین الف مرة غفر و کنت ذکرت هذا العدد وما عینته لاحد حتی اجتمعت فی ضیافة مع شباب مشتهر بالمکاشفة فبکی اثناء اکله فسألته عن حالة فقال اری امی وابی یعذبان فقلت فی نفسی وهبت ثواب التهلیل الجلیل لمیت هذا الرجل الجمیل فضحك فسألته فقال ارتفع عنهما العذاب

فعرفت صحة الحدیث بکشفه وصحة کشفه بثبوت الحدیث واصله۔

(شرح شفاء ج ۲ ص ۳۹۹)

حضرت عارف باللہ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا مجھ تک نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث پہنچی کہ حضور نے فرمایا کہ جس نے کلمہ شریف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ستر ہزار بار پڑھا تو اس کی مغفرت کردی جائے گی۔ میں نے اتنی مقدار کلمہ شریف پڑھا اور کسی خاص شخص کو نہیں بخشا یہاں تک کہ میں ایک دعوت میں اس نوجوان کے ساتھ جمع ہوا جو مکاشفہ میں مشہور تھا وہ کھاتے کھاتے رونے لگا۔ میں نے اس سے اس کا حال دریافت کیا اس نے جواب دیا کہ اپنے ماں باپ کو عذاب میں دیکھ رہا ہوں تو میں نے اپنے دل ہی دل میں اس کلمہ شریف کا ثواب اس نیک جوان کے ماں باپ کو بخشدیا تو وہ نوجوان ہنسنے لگا میں نے اس سے اس کا سبب دریافت کیا اس نوجوان نے کہا کہ دونوں سے عذاب اٹھ گیا پس میں نے اس حدیث کی صحت کو اس کے کشف سے پہچانا اور اس کے کشف کی صحت کو حدیث کے ثبوت واصل سے جانا۔

بالجملہ قرآن کریم اور کلمہ شریف میت کے لئے نہایت ہی نافع چیز ہے اسی لئے بروز سوم یہ اہل اسلام کا معمول قرار پایا۔ باقی رہا اہل اسلام میت کا قرآن وکلمہ خوان کو کچھ دینا تو اگر دینے والا بغرض اجرت دے اور لینے والا بھی بخیال اجرت لے رہا ہے تو نہ ایسی اجرت جائز نہ میت کو اس سے ثواب پہنچے اور لینے دینے والا دونوں گنہگار۔

چنانچہ علامہ شامی عینی شرح ہدایہ سے ناقل ہیں:

ویمنع القاری للدنیا والاخذ والمعطی اثمان فالحاصل ان ماشاع فی زماننا من قرأة الاجزاء بالاجره لایجوز۔

(ردالمحتار ج ۵ ص ۳۶)

قرآن خواں کو بغرض دنیا قرآن پڑھنا ممنوع ہے لینے والا اور دینے والا دونوں گنہگار ہیں حاصل کلام یہ ہے کہ ہمارے زمانہ میں جو پاروں کا اجرت پر پڑھنا رائج ہے یہ جائز نہیں۔

اسی میں حضرت شیخ الاسلام امام تقی الدین کا قول منقول ہے:

ولا یصح الاستیجار علی القرأة واهدائها الی المیت لانه لم ینقل عن احد من الائمة الاذن فی ذلک وقد قال العلماء ان القاری اذا قرأ لاجل المال فلا ثواب له فای شئ یهدیة الی المیت وانما یصل الی المیت العمل الصالح والاستجار علی مجرد التلاوة لم

بقل به احد من الائمة وانما تنازعوا فی الاستیجار علی التعلیم ۔ (ردالمحتار مصری ج۵ ص ۳۷)

قرآن پڑھنے پر اجرت لینا اور اسے میت کو ہدیہ کرنا صحیح نہیں کیونکہ اس میں ائمہ سے کسی امام سے بھی اجازت منقول نہیں اور فقہاء نے فرمایا کہ جب قرآن خواں نے مال کے لئے پڑھا تو اسے ثواب نہیں ملتا پس وہ میت کی طرف کس چیز کا ہدیہ کرتا ہے اور میت کو صرف نیک عمل پہنچتا ہے اور صرف قرآن پڑھنے پر اجر لینا اس کا ائمہ میں سے کوئی قائل نہیں اور ائمہ کا اختلاف تعلیم قرآن پر اجرت لینے کے متعلق ہے۔

یہ حکم تو اس صورت میں ہے جب ان میں اجرت طے ہو جائے اور دام ٹھہر جائیں اور اگر نہ اس میں اجرت طے ہوئی اور نہ کوئی گفتگو آئی لیکن وہاں کے عرف ورواج میں دینے والا اسی نیت سے دیتا ہے اور پڑھنے والا اسی نیت سے پڑھتا ہے اور بعد ختم دینے لینے کا دستور ہے تو اس صورت کا بھی بعینہ وہی حکم ہے جو صورت اول مذکور ہوئی ۔فقہائے کرام کا مشہور قاعدہ ہے۔ المعروف کالمشروط ۔

(شامی ج۵ ص ۳۶)

اور اگر پڑھنے والا بہ نیت ثواب پڑھتا ہے اور اہل میت لوجہ اللہ بطور صدقہ دیتے ہیں تو یہ صورت جائز ہے اس میں نہ دینے والے کے لئے کوئی قباحت نہ لینے والے کو ممانعت اور میت کے لئے باعث اجر وثواب ہے۔

علامہ ابراہیم حلبی کبیری میں فتاوی بزازیہ سے ناقل ہیں:

وان اتخذوا طعاما للفقراء کان حسنا۔ (کبیری مطبوعہ لکھنؤ ص ۵۶۵)

اگر اہل میت فقراء کے لئے کھانا تیار کریں تو بہتر ہے۔

بالجملہ صورت مسؤلہ کا مختصر الفاظ میں یہ جواب ہے کہ شرکاء سوم کو بلا لحاظ اجرت مشروط ومعروف کے بطور خیرات لوجہ اللہ کھانا کھلانا یا پیسے دینا یا کچھ اور چیز دینا جائز ودرست ہے نہ اس میں اہل میت پر کچھ مواخذہ نہ شرکاء سوم پر کچھ معاقبہ نہ اس میں شان مواجرہ نہ میت کے لئے اہداء ثواب میں کچھ مضائقہ ۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل ، الفقیر الی اللہ عز وجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ

دام ٹھرا کر چند شخصوں کو قرآن خوانی کے لئے مقرر کرنا چاروں روز برابر اجرت طے کر کے قبر پر اس طرح پڑھوانا کہ کوئی شخص رات میں پڑھے کوئی دن میں پڑھے یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمده ونصلى ونسلم على رسوله الكريم

قبر پر قرآن کریم دام ٹھرا کر پڑھنا اور پڑھوانا ناجائز ہے جیسا کہ جواب سابق میں گذرا۔

نیز شامی میں ہے کہ علامہ خیر الدین رملی نے حاشیہ بحر میں فرمایا ہے:

اقول المفتى به جواز الاخذ استحسانا على تعليم القران لا على القراة المجردة كما صرح به فى التاتارخانية حيث قال لا معنى لهذه الوصية ولصلة القارى بقراته وهى بدعة ولم يفعلها احد من الخلفاء وقد ذكرنا مسئلة تعليم القرآن على استحسان اه تعنى للضرورة ولا ضرورة فى الاستيجار على القراة على القبر۔ (ردالمحتار مصری ج ۵ ص ۳۶)

میں کہتا ہوں کہ مفتی بہ قول تعلیم قرآن پر اجرت لینے کا جواز واستحسان ہے صرف قرآن پڑھنے پر اجرت لینا جائز نہیں جیسے کہ تاتارخانیہ میں اس کی تصریح کی فرمایا کہ قرآن پڑھنے کی وصیت اور قرآن خواں کی تلاوت پر اجرت کے کوئی معنی نہیں اس لئے کہ یہ دینا بمنزلہ اجرت کے ہیں کہ اس میں اجارہ باطل ہے اور یہ بدعت ہے اس کو خلفاء میں سے کسی نے نہیں کیا اور ہم نے جو مسئلہ تعلیم قرآن کی اجرت واستحسان کا ذکر کیا تو وہ ضرورت کے لئے ہے اور قبر پر قرآن پڑھنے کی اجرت میں کوئی ضرورت نہیں۔

ردالمحتار حاشیہ درمختار میں ہے:

انما اجازوه فى محل الضرورة كالاستيجار لتعليم القرآن او الفقه او الاذان او الامامة خشية التعطيل لقلة رغبة الناس فى الخير ولاضروره فى استيجار شخص يقرء على القبر او غيره اه رحمتى اقول هذا هو الصواب وقد اخطاء فى مسئلة جماعة ظنا منهم ان المفتى به عندالمتاخرين جواز الاستيجار على جميع الطاعات۔ (ردالمحتار ص ۴۵۷)

نیکیوں پر اجرت کی جو فقہاء نے اجازت دی ہے وہ صرف محل ضرورت میں ہے جیسے تعلیم قرآن یا فقہ یا اذان یا امامت کی اجرت لینا یہ بخوف معطل ہونے کے ہے کہ لوگوں کو جس کی طرف رغبت کم ہے قبر یا غیر قبر کسی شخص کے پڑھنے پر اجرت لینے میں کوئی ضرورت نہیں (رحمتی)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی قول درست ہے اور اس مسئلہ میں ایک جماعت نے اس گمان پر خطا کی

ہے کہ متاخرین کے نزدیک مفتی بہ قول تمام نیکیوں پر اجرت لینے کا جواز ہے۔

باقی اس کی ایک یہ صورت ہوسکتی ہے کہ حفاظ کو اپنے کاموں کے لئے ملازم رکھے اور ایک وقت انسے یہ کام بھی لے لے۔ کما لایخفی لمن یطالع کتب الفقه۔

بلا اجرت مشروط و معروف کے قرآن مجید کا پڑھنا جائز ہے صحابہ کرام کے عمل سے ثابت ہے۔

چنانچہ خاتم المحققین حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شرح الصدور میں جامع خلال ۔سے روایت نقل فرمائی ہے:

عن الشعبی قال کانت الانصار اذامات لهم المیت اختلفواالی قبره یقرؤن له القرآن (شرح الصدور ص ۱۳۰)

امام شعبی سے مروی ہے کہ انصار میں سے جب کوئی مرجاتا تو اس کی قبر کی طرف جاتے اور اس کے لئے قرآن کریم پڑھتے۔

علامہ حسن شرنبلالی نور الایضاح میں فرماتے ہیں: لایکره الجلوس للقرأة علی القبر فی المختار۔ (نور الایضاح ص ٦٦)

مذہب مختار میں قبر پر قرآن پڑھنے کے لئے بیٹھنا مکروہ نہیں۔

علامہ ابراہیم غنیۃ المستملی میں فرماتے ہیں:

واختلفوا فی اجلاس القارئین لیقروا عندالقبرو المختار عدم الکراهة۔

(غنیۃ لکھنؤ ص ۵٦۴)

قبر پر قرآن پڑھنے کے لئے قرآن خواں کے بٹھانے میں فقہاء نے اختلاف کیا ہے اور مذہب مختار عدم کراہت ہے۔

علامہ محمد علاء الدین حصکفی درمختار میں فرماتے ہیں:

لایکره الدفن لیلا ولااجلاس القارئین عند القبر هو المختار۔

(شامی ج ا ص ٦۳۳)

میت کا رات میں دفن کرنا اور اس کی قبر کے پاس قرآن پڑھنے والوں کا بٹھانا مذہب مختار میں مکروہ نہیں۔

حاصل جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کا قبر پر پڑھنا یا پڑھوانا ممنوع نہیں یہ تو ایسا ہے جو صحابہ کرام

رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا معمول ہے ہاں ممنوع اس نیک کام پر اجرت طے کرنا ہے اور دام ٹھرانا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ

تعین ماہ بغرض جلسہ میلاد شریف یوم سوم وغیرہ بغرض ایصال ثواب موتے قولاً یا فعلاً رسول اللہ یا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے باسناد صحیحہ سے ثابت ہے یا نہیں؟۔ اگر ثابت ہے تو حوالہ کتب مع صفحہ کے تحریر فرمائیے، اور اگر ثابت نہیں تو بدعت ہے یا نہیں؟۔ اگر بدعت ہے تو مرتکب بدعت کا کیا حکم ہے؟ اور اگر بدعت نہیں تو بدعت کی شرعاً کیا تعریف ہے؟ مقصود سائل جواب مختصر ہے۔

بینوا توجروا

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

وہابیہ نے میلاد شریف فاتحہ سوم عرس وگیارہویں شریف وغیرہ امور مستحبہ کے انکار میں جس قدر کوششیں کی ہیں اتنی کسی حرام ومکروہ بلکہ کسی شعار کفریہ کے لئے بھی نہیں کیں۔ لیکن ان کی انتہائی کوششیں ان امور کے استحباب کو نہ میٹ سکیں اور ان کو ناجائز وحرام نہ کرسکیں۔ ہمیشہ اہلسنت نے ان کی فریب کاریوں کا پردہ فاش کیا اور ان کے لغو اور بیہودہ اعتراضات کے ایسے دندان شکن جوابات دیئے جنہیں آج تک وہابیہ کو ایک حرف لکھنے کی جرات نہ ہوسکی۔ چنانچہ خود میری کتاب سبیل الرشاد میں اور میلاد شریف فاتحہ۔ سوم۔ عرس۔ گیارھویں شریف۔ کے جواز واستحباب پر بکثرت دلائل اور منکرین کے کلمات کے مسکت جوابات طبع ہوچکے ہیں اور یہ کتاب ہزاروں کی تعداد میں ہندوستان کے ہر ایک گوشہ میں موجود ہے مگر کسی وہابی نے آج تک اس کے جواب کی ہمت نہ کی میلاد شریف کی اصل۔ یعنی واقعات پیدائش کے مسائل معجزات مسلمانوں کی مجلس میں بیان کرنا خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے۔

عن واثلة قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه تعالىٰ عليه وسلم :ان اللّٰه اصطفى من ولد ابراهيم اسمعيل واصطفىٰ من ولد اسمعيل بنو كنانه واصطفىٰ من بنى كنانة قريشا واصطفىٰ من قريش بنى هاشم واصطفانى من بنى هاشم ۔

(شرح شفاء وترمذی ومسلم ص ۱۹۸)

حضرت واثلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم (علیہ السلام) سے اسمعیل (علیہ السلام) کو منتخب کیا اور اولاد اسمعیل (علیہ السلام) سے بنی کنانہ کو منتخب کیا اور بنی کنانہ سے قریش کو منتخب کیا اور قریش سے بنی ہاشم کو منتخب کیا اور بنی ہاشم سے مجھے منتخب فرمایا۔

وعن العباس انه جاء الى النبى صلى اللّٰه تعالىٰ عليه وسلم فكانه سمع شيئا فقام النبى صلى اللّٰه تعالىٰ عليه وسلم فقال من انافقالوا انت رسول اللّٰه قال انا محمد بن عبداللّٰه بن عبدالمطلب ان اللّٰه خلق الخلق فجعلنى فى خيرهم ثم جعلهم فرقتين فجعلنى فى خيرهم فرقة ثم جعلهم قبائل فجعلنى فى خيرهم قبيلة ثم جعلهم بيوتا فجعلنى فى خيرهم بيتا فاناخيرهم نفسا وخيرهم بيتا ۔ (رواہ الترمذی، مشکوۃ شریف ص ۵۱۳)

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے نسب شریف پر اعتراض سنا تھا تو حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ممبر پر قیام کیا اور فرمایا میں کون ہوں صحابہ نے عرض کیا آپ رسول اللہ ہیں۔ فرمایا میں ابن عبداللہ بن عبدالمطلب ہوں اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی پیدائش کی اور مجھے خیر الخلق کیا پھر ان کے دو گروہ کئے تو مجھے ان کے بہتر فرقہ میں پیدا کیا پھر انہیں قبیلہ قبیلہ کیا تو مجھے ان کے بہتر قبیلہ میں مخلوق کیا۔ پھر اس کو خاندان کیا تو مجھے ان کے بہتر خاندان میں کیا پس میں باعتبار ذات کے بہترین بنی آدم ہوں اور باعتبار خاندان کے خیر البشر ہوں۔

اسی طرح سوم وفاتحہ کی اصل یعنی ایصال ثواب بھی خود حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول وفعل سے ثابت ہے چنانچہ طبرانی اوسط میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ انہوں نے سرکار رسالت میں عرض کیا!

يارسول اللّٰه توفيت امى ولم توص ولم تصدق فهل ينفعها ان تصدقت عنها قال

نعم ولو بکراع شاۃ محرق۔ (شرح الصدور مصری ص ۱۲۹)

یارسول اللہ میری والدہ وفات پاگئیں، انہوں نے نہ صدقہ کی وصیت کی نہ خود صدقہ دیا۔ اگر میں ان کی طرف سے صدقہ دوں تو کیا انہیں نفع دیگا؟ فرمایا: ہاں نفع دیگا اگرچہ بکری کے جلے ہوئے پائے ہی ہوں۔

طبرانی نے اوسط میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے سنا۔

مامن اهل میت یموت منهم میت فیتصدقون عنه بعد موته علی احداها له جبرئیل علی طبق من نور ثم یقف علی شفیر القبر فیقول یاصاحب القبر العمیق هذه هدیة اهداها الیك اهلك فاقبلها فتدخل علیه فیفرح بهاو یستبشر و یحزن جیرانه الذین لایهدی الیه شیئا۔

(شرح الصدور مصری ۱۲۹)

اہل میت سے جو اپنی میت کی جانب سے اس کے مرنے کے بعد صدقہ کریں تو جبریل امین نور کے طبق میں وہ ہدیہ لے جاتے ہیں اور کنارہ قبر پر کھڑے ہوکر فرماتے ہیں اے گہرے گڑھے والے یہ ہدیہ ہے جسے تیرے اہل نے تیری طرف بھیجا ہے تو اسے قبول کر تو وہ اس پر داخل ہوتا ہے پس وہ اس کی وجہ سے خوش ہوتا ہے اور بشارت حاصل کرتا ہے اور اس کے وہ پڑوسی جن کی طرف کوئی چیز نہیں بھیجی گئی رنجیدہ ہوتے ہیں۔

اب باقی رہی میلاد شریف وسوم فاتحہ کی قیودات وتخصیصات وتعینات واہتمامات وہ اسی طرح ہیں جس طرح مدرسہ کی اصل یعنی تعلیم حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول وفعل سے ثابت ہے اور مدرسے کے تعینات وتخصیصات۔ قیودات واہتمامات یعنی تعلیم کے لئے مخصوص کتابیں مقرر کرنا فلسفہ ومنطق اور معانی وغیرہ کا داخل کرنا درجہ بندیاں کرنا۔ ہر درجہ کے لئے مستقل استاد مقرر کرنا۔ ہر کتاب کے لئے گھنٹے مقرر کرنا۔ جمعہ عیدین رمضان المبارک کے ایام کو تعطیل کے لئے مقرر کرنا۔ ماہ شعبان کو امتحان کے لئے مقرر کرنا۔ خاص نصاب ختم ہونے پر سند دینا۔ دستار بندی کرنا۔ اور تقسیم اسناد دستار بندی کے لئے جلسہ کی تاریخیں مقرر کرنا۔ اشتہار چھاپنا۔ بذریعہ خطوط تداعی کرنا۔ مخصوص علماء کو بلانا۔ بلائے ہوئے علماء کو کرائے دینا جلسوں کے لئے پروگرام معین کرنا۔ بہت سے ہاتھوں سے طلبا کے سروں پر دستار باندھنا۔ جلسے گاہ کو مزین کرنا۔ اس میں روشنی کرنا۔ شامیانے لگانا مدرسے کے لئے مخصوص عمارت بنانا۔

دار الحدیث اور دار الاقامہ کے لئے علیحدہ عمارت مخصوص کرنا۔ دینی تعلیم پر مدرسین کو معین تنخواہ دینا۔ بخاری شریف کے ختم پر مٹھائی تقسیم کرنا۔ یہ ساری باتیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول وفعل سے ثابت نہیں تو میلاد شریف اور سوم وغیرہ کے منکرین مدرسہ کی ان تخصیصات وقیودات تعینات واہتمامات کی بنا پر کیا مدرسہ کو بدعت گمراہی قرار دیں گے اور بانیان مدرسہ پر مرتکب بدعت اور گمراہ وبیدین ہونے کے فتوی صادر کریں گے اگر نہ کہیں گے تو مدرسے کی ساری تخصیصات وتعینات قیودات واہتمامات کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول وفعل سے باسناد صحیحہ ثابت کریں لیکن انشاء اللہ تعالیٰ وہ قیامت تک ثابت نہیں کر سکیں گے تو کس منہ سے میلاد شریف کے تعینات وتخصیصات پر اعتراضات کرتے ہیں اور عوام مسلمیں کو مغالطہ وفریب دیتے ہیں اب میں وہابیہ کے لئے خود ان کے امام الطائفہ مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کا فتوی پیش کرتا ہوں چنانچہ فتاوی رشیدیہ حصہ اول ص ۱۰۱ پر ہے۔

سوال پچیسواں: صوفیائے کرام کے یہاں جو اکثر اشغال اور اذکار مثل رگ کیماس کا پکڑنا کرنا اور ذکر ارہ اور حلقہ پر قبور نہیں بلکہ ویسے ہی اور حبس دم وغیرہ جو قرون ثلثہ سے ثابت نہیں بدعت ہے یا نہیں؟۔

جواب: اشغال صوفیہ بطور معالجہ کے ہیں سب کی اصل نصوص سے ثابت ہے جیسا اصل علاج ثابت ہے مگر شربت بنفشہ حدیث صریح سے ثابت نہیں ایسا ہی سب اذکار کی اصل ثابت ہے جیسا توپ بندوق کی اصل ثابت ہے اگر چہ اس وقت نہ تھی سو یہ بدعت نہیں ہاں ان ہیئات کو سنت ضروری خاصہ جاننا بدعت ہے اور اس کو علماء نے بدعت لکھا ہے۔

گنگوہی صاحب نے اس جواب میں نہایت واضح الفاظ میں فرمایا کہ اشغال صوفیہ ان تخصیصات وتعینات کے ساتھ قرون ثلثہ میں نہیں تھے مگر چونکہ ان کی اصل نصوص سے ثابت ہو رہی ہے تو ان کو محض ان تخصیصات وقیودات کی بنا پر بدعت مان کر انہیں بدعت سے خارج کر کے اس قاعدہ کو اور واضح کر دیا لہذا اسی طرح میلاد شریف سوم وغیرہ کی اصلیں چونکہ نصوص سے ثابت ہیں تو محض تخصیصات وتعینات کی بنا پر میلاد شریف وسوم وغیرہ کو باقرار گنگوہی صاحب کے بدعت نہیں کہہ سکتے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۸)

کیافرماتے ہیں علماء دین شرع متین نسبت مسائل کے حوالہ جات قرآن واحادیث سے جواب عنایت فرمایا جائے

بعض اضلاع میں میت کو دفن کرتے وقت قبر میں قل ھواللہ پڑھ کر دم کر کے مٹی مردے کے سرہانے ڈالتے ہیں اور بعد دفن اذان پڑھتے ہیں کیا شرعا یہ دونوں جائز ہیں؟۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

یہ دونوں فعل جائز ہیں۔قل ھواللہ شریف پڑھ کر میت کے لئے ایصال ثواب کرتے ہیں اور اس پر مٹی کو گواہ بنا دیتے ہیں کوئی محذور شرعی لازم نہیں آیا لہٰذا اس کے ناجائز ہونیکی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی اور اذان سے میت کو چند فائدے ہوتے ہیں کہ شیطان جب قبر میں اگر مردوں کو دھوکہ دیتا ہے تو اذان کی وجہ سے اس کو شر شیطان سے پناہ حاصل ہو جاتی ہے اور نیز اذان کی وجہ سے دفع وحشت قبر سے ہو جاتی ہے و نیز اذان کی وجہ زوال غم وحصول سرور فرحت حاصل ہوگئی جب احادیث سے مستفاد ہے تو اذان علی القبر کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی لہٰذا یہ دونوں امور جائز وموجب اجر وثواب ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ، المتوسل بالنبی المرسل العبد الارذل محمد اول بن المفتی مولینا الحاج محمد اجمل
نائب مفتی اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل یکم جمادی الاخرہ ۷۷ ۱۳ھ

ھذ االجوب صحیح محمد اجمل غفراللہ عز وجل سنبھل

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۴۹)

کیافرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں

عرض یہ ہے کہ میت کے وارث قرآن مجید کا واسطے کفارہ گناہوں کے کراتے ہیں ور اور کچھ رقم نقد اور گندم وغیرہ ایک تھیلی میں ڈال کر اور ساتھ لیکر میت کے کفارہ میں دیتے ہیں اور اس کے گناہ فرض واجب وغیرہ دینے والے کو سناتے ہیں اور وسیلہ قرآن پاک کا کر کے دیتے ہیں اور بعض لوگ صرف رقم ھدیہ کر کے دیتے ہیں۔بعض لوگ صرف کلام پاک ہی کفارہ میں دیتے ہیں تو چند علماء اس کو ناجائز اور

بدعت کہتے ہیں اور علم فقہ کے مسائل کو نہیں مانتے اور یہ کہتے ہیں کہ علم فقہ کیا چیز ہے ہم اس کو نہیں مانتے آیا یہ علم فقہ قابل اعتبار ہے یا نہیں اس پر عمل کرنا کیسا ہے اور یہ اسقاط کا طریقہ کہاں سے شروع ہوا ہے اور اسقاط کرنے کا ثبوت قرآن حدیث سے ہے یا نہیں مفصل تحریر فرمادیں اس عبارت میں اگر کوئی غلطی ہوتو معاف فرما کر اصلاح فرمائی جائے۔

السائل عمرالدین جی لوہار پورہ ناگور مارواڑ

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

اسقاط کا یہ طریقہ بالکل ناکافی اور بے اصل ہے تو قرآن وحدیث سے کیسے ثابت ہوسکتا ہے اس کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین سے ناواقف اور جاہل لوگوں نے محض اپنی منفعت اور غرض حاصل کرنے کے لئے اپنے دل سے گڑھ لیا ہے دیندار آدمی کم از کم اتنا جانتا ہے کہ ہر روزے ہر وقت کی نماز کے بدلے میں ساڑھے تین سیر جو یا پونے دو سیر گندم یا آٹا یا ان کی قیمت میت کی طرف سے اگر ادا کی جائے تو صرف اس کی نمازوں کا فریضہ ذمہ سے ساقط ہوجاتا ہے۔ چہ جائیکہ اس کے عمر بھر کے فرائض وواجبات صرف کلام پاک کے دینے یا رقم دیدینے سے ادا ہوسکتی ہے لہذا ثابت ہوگیا کہ یہ طریقہ اسقاط بالکل جاہلانہ طریقہ ہے۔

علم فقہ شریعت کے فروعی وتفصیلی احکام ومسائل کے جاننے کا نام ہے جو قرآن وحدیث اور اجماع وقیاس چاروں دلائل شرع میں سے کسی ایک دلیل سے ثابت ہوتے ہیں۔ تو علم فقہ کا انکار کرنا اور نہ ماننا گویا قرآن وحدیث کا انکار کرنا اور نہ ماننا ہے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔ واللہ تعالیٰ اعلم

۱۴ محرم الحرام ۱۳۷۸ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۵۰)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

(۱) قرآن پاک کی تلاوت بغیر فہم معانی موجب اجر وثواب ہے یا نہیں؟۔ اگر ہے تو کیا کسی امام نے ائمہ حنفیہ میں سے اس کی صراحت کسی اپنی کتاب میں کی ہے؟ یا کسی فقیہ حنفی نے؟ کونسی

کتاب میں کس باب میں؟۔

(۲) زید نے اپنی تمام عمر میں کسی عمل خیر کا ثواب کسی میت کو نہیں بخشا اور نہ تلاوت کا، درود شریف ہمیشہ پڑھتا ہے اور میتوں کے لئے سلام اور دعائے استغفار کرتا ہے۔ تو کیا زید گنہگار ہے؟ اور بروز قیامت اس سے مواخذہ ہوگا؟۔

(۳) کسی عمل خیر کا ثواب عامل کے بخشد ینے سے غیر عامل کو ملجاتا ہے اور اور وہ غیر عامل اس ثواب کا مستحق ہوجاتا ہے؟ اس کی صراحت امام ابوحنیفہ یا امام ابویوسف یا امام محمد یا امام زفر نے اپنی کسی کتاب میں کی ہے یا نہیں؟ اگر کی ہے تو کس کتاب میں، کونسے باب میں؟ سوال صرف ائمہ کی کتاب کا ہے، جوابات صرف ائمہ وفقہا حنفیہ کے اقوال سے دیا جائے۔ بینوا توجروا یوم الحساب بارک اللہ لنا ولکم فی الدنیا والآخرہ۔

المستفتی حکیم محمد ایوب بقلم خود محلّہ دیپا سرائے بلدہ سنبھل۔ ۱۲ ربیع الثانی ۶۲ ۱۳ھ ضلع مراد آباد

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

شریعت کے وہ مشہور مسائل جو ہر مسلم کی نوک زبان پر ہیں جنہیں گاؤں کے رہنے والے ناخواندہ لوگ بھی خوب جانتے ہیں لیکن سائل کو باوجود ادعاء علم کے آج ان مسائل میں شک وترددواقع ہورہا ہے، نہیں نہیں بلکہ ان کی مخالفت اور انکا کرنے کا ان کو ہیضہ ہوگیا ہے، لطف یہ ہے کہ سائل ان مسائل میں صرف سائل ہی نہیں ہے بلکہ مدعی ہے اور اپنے دلائل رکھتا ہے مگر چونکہ اپنے استدلال کی کمزوریاں وہ خوب اچھی طرح جانتا ہے اسلئے وہ مدعی کی شکل میں نہیں آسکا اور سائل کی صورت میں پیش ہوا۔

پھر اگر سوالات ہی کرنے تھے تو ان کے لئے سوالات ہی کا انداز اختیار کیا جاتا اور مذہب کی معتبر مستند کتابوں کی عبارت کا مطالبہ ہوتا۔ اور اس میں یہ پابندی نہ ہوتی کہ سوال صرف ائمہ کی کتاب کا ہے۔ لیکن جب سائل نے اپنی حد سے تجاوز کر کے اپنی مناظرانہ شان کا بھی اظہار کیا تو ہمیں بھی مجبورا اسی میدان کو اختیار کرنا پڑا۔ اور ابتدائے جوابات میں مناظرانہ شان کو پیش کرنا ضروری ہوگیا۔

لہذا سائل پہلے تو یہ بتائے کہ علم عقائد اور علم فقہ کا ایک ہی موضوع ہے یا ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ موضوع ہے؟۔

اگر ایک ہی موضوع ہے تو یہ دو علم کیوں کہلاتے ہیں؟۔
اور وہ ایک موضوع کیا ہے؟۔
اور اگر ہر ایک کا موضوع علیحدہ ہے تو کیا فقہ کے مسائل کا کتب عقائد سے اور عقائد کے مسائل کا کتب فقہ سے مطالبہ جہل یا فریب نہیں؟۔
نیز یہ بھی بتائے کہ عقائد وفقہ کے ایک ہی ائمہ ہیں یا ہر ایک کے علیحدہ علیحدہ؟۔
اگر ایک ہی ہیں تو وہ کون کون ہیں اور اگر ہر ایک کے علیحدہ ہیں تو فقہ کے کس قدر ہیں اور ان کے کیا کیا اسماء ہیں؟۔
اور عقائد کے کتنے ہیں اور ان کے کیا کیا نام ہیں؟۔
اور یہ بھی ظاہر کیجئے کہ ائمہ عقائد وائمہ فقہ کے اختلافوں کا کیا معیار ہے؟۔
اور بصورت اختلاف کس امام کے قول کو اختیار کیا جائے اور صواب کو خطا سے کس طرح ممتاز کیا جائے؟۔
اور صراحت قول امام کی کیا حد ہے؟۔
اور یہ بھی صاف طور پر واضح کر دیجئے کہ آپ کے سوالات فقہ کے تحت داخل ہیں یا نہیں؟۔
اگر آپ کہیں نہیں تو ان کے لئے ائمہ حنفیہ اور کتب فقہ حنفی سے نقول طلب کرنا آپ کا دجل وفریب یا جہل ونادانی ہوگا یا نہیں؟۔
اور اگر آپ کہیں کہ ہیں تو اس کو ثابت کیجئے؟۔
اور ائمہ حنفیہ اور کتب حنفیہ سے اپنے دعوی کی تائید میں عبارات پیش کیجئے۔ نیز آپ کا ایک مطالبہ تو یہ ہے کہ سوال صرف ائمہ کی کتاب کا ہو، دوسرا اس کے بعد یہ ہے کہ جوابات صرف ائمہ وفقہاء حنفیہ کے اقوال سے کیا جائے۔ ان دونوں عبارتوں کو ملا کر دریافت طلب امور یہ ہیں کہ جب سوال صرف ائمہ کی کتاب کا ہے تو جواب میں ائمہ کا قول بلا ان کی کتاب کے کیسے مطالبہ پورا کر دیگا، اور جس کتاب میں وہ قول ائمہ ہو تو کیا وہ کتاب ائمہ کی کتاب کا افادہ کریگی۔ اسی طرح جب سوال ائمہ کی کتاب کا ہے تو فقہائے حنفیہ کا قول کیا قول ائمہ ہو جائیگا اور فقہائے حنفیہ کے اقوال کی کتاب کیا ائمہ کی کتاب ہو جائیگی۔ تو اب اپنی ان عبارات کا مفہوم بیان کیجئے، پھر ثبوت کیلئے اقول ائمہ اور فقہائے حنفیہ پر حصر کر دینا کس بنا پر ہے؟۔ کیا قرآن وحدیث اور اقوال مفسرین ومحدثین اور اقوال سلف وخلف آپ کے نزدیک قابل

استدلال و حجت نہیں ؟۔ اگر ہیں تو ان کو کس لئے ذکر نہیں کیا؟۔ اس کی معقول وجہ پیش کیجئے۔ علاوہ برین بلا کسی آیت و حدیث کے صرف ائمہ اور فقہائے حنفیہ کے اقوال کیا آپ کے نزدیک قابل عمل اور لائق اتباع ہیں؟۔ اگر ہیں تو جو اسے شرک کہے تو آپ اسے گمراہ جانتے ہیں یا نہیں؟۔

یہ چند استفسار تو سوالات کی بنیادی ساخت پر ہیں۔ اب اپنے سوالات کے جوابات سنئے۔

جواب سوال اول

اس سوال میں بھی چند باتیں قابل استفسار ہیں

(۱) تلاوت قرآن کی جامع مانع تعریف کیا ہے؟۔

(۲) تلاوت قرآن کے ثواب کے لئے فہم معنی کا ضروری ہونا کس معتبر و مستند کتاب سے ثابت ہے؟۔

(۳) احادیث میں جو تلاوت پر ثواب کا ترتب بیان کیا گیا ہے اس پر فہم معنی کی زیادتی کس نص سے ثابت ہے؟۔

(۴) ائمہ حنفیہ کے نزدیک مطلق کو اپنے اطلاق پر رکھا جاتا ہے یا نہیں؟۔

(۵) ایسے عوام جو معنی نہ سمجھتے ہوں کیا انہیں تلاوت قرآن کرنا عبث و بیکار ہے؟۔

(۶) ایسے عوام کو قرآن کریم کا سیکھنا سکھانا کیا حکم رکھتا ہے؟۔

(۷) قرآن کریم کے فہم معنی کیلئے کس قدر علوم سے واقف ہونا ضروری ہے؟۔

(۸) تلاوت قرآن کے ثواب مرتب ہونے کیلئے معنی کا کس حد تک حاصل ہونا ضروری ہے۔

یہ چند امور تو وہ ہیں جن کا حل کرنا بذمہ سائل ہے۔

اب رہا سوال کا اصل جواب وہ اس تفصیل سے ظاہر ہے۔

اقول: قرآن کریم کا فقط دیکھنا بھی موجب اجر و ثواب ہے۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی اتقان فی علوم القرآن میں فرماتے ہیں:

(مسئلہ) القرأة فی المصحف افضل من القرأة من حفظه لا ن النظر فیه عبا دة مطلو بة وقال النووی هکذا قال اصحابنا و السلف ایضا ولم ارفیه خلا فا۔

(اتقان مصری ص ۱۰۸ ج ۱)

پھر علامہ موصوف نے اس کی تائید میں چند احادیث نقل فرمائیں:

اخرجه الطبرانی والبیهقی فی الشعب من حدیث اوس الثقفی مرفوعا ۔قرأة الرجل فی غیر المصحف الف درجة وقرأته فی المصحف تضاعف الفی درجة واخرجه ابو عبید بسند صحیح فضل قرأة القران نظرا علی ما یقرؤه ظاهرا کفضل الفریضة علی النافلة واخرج بسند حسن عن ابن مسعود موقوفا ادیموا النظر فی المصحف ۔

اسی طرح قرآن کریم کا چھونا اور اٹھانا بھی موجب اجر وثواب ہے۔

چنانچہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں حدیث حضرت اوس کے ان الفاظ وقرأته فی المصحف تضاعف علی ذالك الی الفی درجة۔ کے تحت میں فرماتے ہیں۔

وثواب خواندن در مصحف زیادہ کردہ میشود بر ثواب خواندن از بر تا دو ہزار درجہ از جہت زیارت کردن مصحف ومساس کردن وبرداشتن آن وبہ تحقیق وارد شدہ است کہ نظر کردن در مصحف عبادت ست

(اشعۃ اللمعات ص ۱۴۱ ج ۲)

لہذا جب قرآن کریم کا صرف دیکھنا۔ چھونا۔ اٹھانا موجب اجر وثواب ہے تو اس کی تلاوت کیونکر موجب اجر وثواب نہ ہوگی۔

علامہ جلال الدین سیوطی اتقان فی علوم القرآن میں تلاوت قرآن کو بہ ترتیل پڑھنے کے استحباب کے بیان میں فرماتے ہیں:

ویستحب للاعجمی الذی لا یفهم معناه ۔ (اتقان ص ۱۰۶ ج ۱)

اس عبارت میں صاف تصریح ہے کہ جو عجمی معنی نہ سمجھتا ہو اس کے لئے بھی قرآن بہ ترتیل پڑھنا مستحب ہے اور جب فعل مستحب ہوا تو اسپر اجر وثواب کیونکر نہیں ملے گا۔ لہذا تلاوت کے موجب اجر وثواب ہونے کے لئے فہم معنی کی قید سائل نے کہاں سے زائد کی؟۔ خود احادیث میں فہم معنی کی قید نہیں۔ چنانچہ خاتم المحدثین علامہ شہاب الدین ابن حجر فتاوی حدیثیہ میں اس مسئلہ کی مبسوط بحث میں یہ احادیث نقل فرماتے ہیں۔

قال افضل العبادة قرأة القرآن (رواه ابن قانع) قال افضل عبادة التی تلاوة القرآن رواه البیهقی و روی السنجری والحطیب انه ﷺ قال اقرأو القرآن فانکم توجرون علیه۔ اما انی لا اقول الٓمٓ حرف ولکن الف عشر ولام عشر و میم عشر فثلاث ثلثون (رواه الترمذی والحاکم وغیرهما) فتاوی حدیثیه مصری ص ۴۲)

اور علامہ جلال الدین سیوطی اتقان میں یہ احادیث نقل فرماتے ہیں:

اخرج احمد من حدیث معاذبن انس من قرأالقرآن فی سبیل الله کتب مع الصدیقین والشهداء والصالحین وحسن اولئك رفیقا۔

واخرج الطبرانی فی الاوسط من حدیث ابی هریره ما من رجل یعلم ولده القران الا توج یوم القیامة بتاج فی الحنة۔

واخرج الشیخان من حدیث عثمان خیرکم وفی روایة افضلکم من تعلم القرآن وعلمه۔

و روی الترمذی من حدیث ابن مسعود من قرأ حرفا من کتاب الله فله به حسنة بعشر امثالها۔

و اخرج مسلم مبن حدیث ابی امامة اقرؤاالقران فانه یاتی یوم القیامة شفیعا لاصحابه۔

و اخرج من حدیث انس نو رو امنا زلکم با لصلاة وقرأة القرآن۔

بخیال اختصار یہ دس احدیث نقل کیں۔ان میں کہیں فہم معنی کی قید مذکور نہیں۔تو کیا سائل محض اپنی رائے ناقص سے احادیث میں فہم معنی کی قید زائد کرتا ہے اور نصوص مطلقہ کو مقید کرتا ہے اور شریعت میں اپنی عقل سے مداخلت کرنا ہے۔

سائل حضرات محدثین کی کمال احتیاط کو ہی کو دیکھ کر سبق حاصل کرے کہ مشکوۃ شریف کے کتاب العلم میں یہ حدیث منقول ہے۔

من حفظ علی امتی اربعین حدیثا فی امر دینها بعثه فقیها وکنت له یوم القیامة شافعا وشهیدا۔

علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں اس کے متعلق محدثین کا کلام نقل فرماتے ہیں۔

گفتند کہ مراد و مقصود رسانیدن چہل حدیث ست بایشاں اگرچہ یاد نداشتہ باشد و معانی آن نفہمیدہ۔ (اشعۃ اللمعات ص ۱۷۳ ج ۱)

اب سائل آنکھیں کھول کر دیکھے کہ محدثین تو چالیس احادیث پہونچانے والے کے اجر و ثواب

کیلئے نہ حفظ کی قید لگاتے ہیں نہ فہم معنی کی قید کا اضافہ کرتے ہیں۔ اور سائل کی یہ جرأت ودلیری اور یہ شرمناک زیادتی کہ قرآن کریم کی تلاوت کے اجر وثواب کو فہم معنی کی قید محض اپنی رائے ناقص سے لگا کر اجر وثواب کا دائرہ محدود کرتا ہے، اگر فی الواقع یہ سوال لاعلمی کی بنا پر ہے تو یہ جواب بہت کافی ووافی ہے اور سائل کے لئے محدثین کا یہ طرز عمل زبردست سبق ہے۔ واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

جواب دوم وسوم

زید نے جو اپنی تمام عمر میں کسی عمل خیر کا ثواب کسی میت کو نہیں بخشا تو سائل یہ ظاہر کرے کہ زید کا یہ فعل کس بنا پر ہے آیا اس لئے کہ زید کا عقیدہ ہی یہ ہے کہ غیر کے عمل کا ثواب میت کو پہنچتا ہی نہیں؟۔

یا اس لئے کہ زید یہ خیال کرتا ہے کہ عامل اپنے عمل خیر کا ثواب دوسرے کو دینے کا اختیار نہیں رکھتا؟۔

یا اس لئے کہ زید کے زعم میں یہ ہے کہ عامل اگر اپنے عمل خیر کا ثواب دوسرے کو بخشے گا تو خود عامل اس ثواب سے محروم ہو جاتا ہے؟۔

یا اس لئے کہ زید کے وہم میں صاحب عمل اگر کسی کو اپنے عمل کا ثواب بخشے تو خود اس کے ثواب میں کمی ہو جاتی ہے اور ثواب تقسیم ہو جائگا؟۔

یا اس لئے کہ زید اپنے گمان میں اپنے اعمال کو قابل ثواب ہی نہیں جانتا۔

بالجملہ سائل یہ بتائے کہ زید کس وجہ سے یہ فعل نہیں کرتا تا کہ جواب میں اسی پہلو پر کافی روشنی ڈالدی جائے۔ پھر سائل اسی سوال میں یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ زید امیتوں کیلئے سلام اور دعائے استغفار کرتا ہے تو کیا یہ چیزیں عمل خیر ہیں یا نہیں؟۔ اگر ہیں تو میت کیلئے انہیں کس لئے کرتا ہے اور ان کی کیا بنا ہے۔

الحاصل جب زید کے عمل کا سوال ہے تو سائل کے ذمہ اس کے عمل کی بنا اور نیت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اعمال کا دارومدار نیات پر ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہے۔ انما الاعمال بالنیات۔ تو جب سائل کا سوال اتنے استفسارات اور احتمالات کو شامل ہے تو سائل کو اگر واقعی جواب کی جستجو ہے تو وہ ان کے احتمالات میں سے کوئی پہلو مقرر کرے انشاء اللہ کافی ووافی تحقیقی جواب دیا جائگا۔ علاوہ بریں خود اسی سوال دوم کا ایک پہلو سوال سوم بھی ہے تو یہ جواب دونوں کو مشتمل ہے۔ لہذا جواب سوال سوم کو

بتفصیل بیان کرتے ہیں اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ غیر عامل کو یقیناً عامل کے عمل خیر کا ثواب پہونچتا ہے ۔یہ بات نہ فقط اقوال فقہائے عظام سے بلکہ ائمہ وصحابہ کرام سے بلکہ خیر الانام سے بلکہ خود آیات سے ثابت ہے ۔لہذا بخوف طوالت اس وقت چند دلائل پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ مولی تعالی سائل کو قبول حق کی توفیق دے اور اس مسئلہ کی حقانیت کو خوب واضح اور روشن کردے۔

آیت۔ وصل علیهم ان صلوٰتك سكن لهم والله سميع عليم ۔

(سورہ توبہ ع ۱۳ ج ۱۲)

یعنی آپ ان کے حق میں دعائے خیر کریں بیشک تمہاری دعا ان کے دلوں کا چین ہے اور اللہ تعالی سنتا جانتا ہے۔

تفسیر معالم وتفسیر خازن میں ہے: ای ادع لهم واستغفر لهم لا ن الصلاة فی اللغة الدعا ء (سكن لهم) ای ان دعا ئك رحمة لهم۔ (خازن ص ۱۱۸ ج ۳)

تفسیر مدرک میں ہے: (وصل عليهم واعطف عليهم با لدعا ء لهم وترحم (ان صلواتك سكن لهم) يسكنو ن اليه وتطمئن قلو بهم با ن الله قد تاب عليم (والله سميع عليم) لدعائك۔ (مدارک ص ۱۱۰ ج ۲)

تفسیر صاوی علی الجلالین میں ہے:

وردفی الحديث حيا تی خير لكم ومما تی خير لكم تعرض علی اعما لكم فی الصبا ح وفی المساء فا ن وجدت خير احمد ت الله وان وجدت سوء ا استغفر ت لكم فدعاء رسول الله حاصل فی حيا ته وبعد موته ولا عبرة بمن ضل وزا غ عن الحق وخالف فی ذالك۔ (صاوی ص ۱۴۰ ج ۲)

آیت۔ واستغفر لذنبك وللمو منين والمو منا ت ۔

(سورہ محمد ع ۲ ج ۲۶)

یعنی اے محبوب آپ اپنے خاصوں اور عام مسلمان مرد اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگو۔
تفسیر معالم وتفسیر خازن وتفسیر صاوی سب میں یہی مضمون مختلف الفاظ میں ہے۔

معنی الآية استغفر لذنبك ای لذنو ب اهل بيتك وللمو منين والمو منا ت يعنی من غير اهل بيته وهذا اكرام الله عزوجل لهذه الامة حيث امر نبيه ﷺ ان يستغفر لذنوبهم وهو

الشفیع المحاب فیهم (وفیها ایضا) قیل الخطاب له والمراد به الامة وعلى هذا القول توجب الآیة استغفار الانسان لجمیع المؤمنین۔

(معالم وخازن ص ۱۵۱ ج ۶ وجمل ص ۱۴۸ ج او صاوی ص ۶۷ ج ۴)

آیت ۔رب اغفرلی ولو الدی ولمن دخل بیتی مو منا وللمو منین وللمو منٰت

(سورہ نوح ع ۹۲ ج ۲۹)

یعنی اے میرے رب مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور اسے جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں ہے اور سب مسلمان مردوں اور سب مسلماں عورتوں کو۔

تفسیر معالم ص ۱۳۱ او تفسیر خازن ص ۱۳۱ ج ۷ وتفسیر جمل ص ۴۱۵ ج ۴ میں ہے:

هذا ادعاء عام فی كل مو من آمن بالله وصدق الرسول وانما بدأ بنفسه لا نها اولی با لتخصیص والتقدیم ثم ثنی با لمتصلین به لا نهم احق بد عائه من غیر هم ثم عمم جمیع المو منین والمو منت لیكو ن ابلغ فی الدعاء فهو دعاء عام لكل مو من ومو منة فی سائر الامم۔

آیت ۔ربنا اغفرلی ولوالدی وللمو منین یو م یقوم الحساب۔

(سورہ ابراہیم ع ا ج ۱۳)

اے ہمارے رب مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور سب مسلمانوں کو جس دن حساب قائم ہوگا۔

تفسیر خازن ص ۴۳ ج ۴ وتفسیر جمل ص ۵۳ ج ۲ وتفسیر صاوی ص ۲۴۳ ج ۲ میں ہے:

هذا دعاء للمو منیں با لمغفرة والله تعالے لا یرددعاء خلیله ابراهیم ففیه بشارة عظیمة لجمیع المو منین با لمغفرة۔

آیت ۔الذین یحملو ن العرش ومن حوله یسبحون بحمد ربهم ویو منون به ویستغفرو ن للذین امنو ربنا وسعت كل شی رحمة وعلما فاغفر للذین تا بوا واتبعوا سبیلك وقهم عذاب الجهنم۔

(سورہ مومن ۔ع ا ج ۲۴)

یعنی جو فرشتے عرش اٹھاتے ہیں اور جو اس کے گرد ہیں اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اس کی پا

کی بولتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے اور مسلمانوں کی مغفرت مانگتے ہیں اے ہمارے رب تیری رحمت وعلم میں ہر چیز کی سمائی تو انہیں بخش دے جنہوں نے توبہ کی اور تیری راہ پر چلے اور انہیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔

تفسیر خازن ص ۵۷ ج ۶ وتفسیر جمل ص ۶ ج ۴ وتفسیر صاوی ص ۴ ج ۴ میں ہے:

"ای یسالو ن الله تعالے المغفر ة لهم (وفیها ایضا) اذادخل المو من الجنة قال این ابی و این امی و این ولدی و این زوجتی فیقال انهم لم یعملوا عملك فیقول انی کنت اعمل لی ولهم فیقال ادخلو هم الجنة فاذا اجتمع باهله فی الجنة کا ن اکمل سروره ولذته۔

آیت۔ والملئکة یسبحون بحمد ربهم و یستغفرون لمن فی الارض

(سورہ شوری ع ۱ ج ۲۵)

یعنی فرشتے اپنے رب کی تعریف کیساتھ پاکی بولتے ہیں اور زمین والوں کیلئے معافی مانگتے ہیں

تفسیر خازن ص ۲۵ ج ۵ میں ہے:

ای من المو منین دو ن الکفار لا ن الکا فرلا یستحق ان تستغفرله الملا ئکة۔

تفسیر جمل ص ۵۲ ج ۴ میں ہے:

ای یشفعون لمن فی الارض من المو منین فالمر اد بالاستغف ر الشفاعة۔

آیت۔ وقل رب ارحمهما کما ربیانی صغیر ا۔ (بنی اسرائل ع ۳ ح ۱۵)

یعنی اور عرض کر کہ میرے رب تو ان دونوں پر رحم کر جیسا کہ ان دونوں نے مجھے چھٹپن میں پالا

تفسیر خازن ص ۱۲۴ میں ہے:

ای ادع لهما ان یرحمهما یر حمته البا قیة وارادبه اذاکا نا مسلمیں۔

تفسیر مدراک ص ۲۴۰ ج ۲ میں ہے:

ولا تکتف برحمتك علیهما اللتی لا بقاء لها وادع الله تعالی یرحمهما رحمة البا قیة واجعله ذلك جزاء رحمتهما علیك فی صغرك و تربیتهما لك والمراد غیره علیه الاسلام۔

تفسیر جمل ص ۶۴۴ ج ۲، وتفسیر صاوی ص ۲۹۳ ج ۲ میں ہے:

ادع لهما بالرحمة ولوفى كل يو م وليلة خمس مرات ـ

آیت۔ والذين جاؤ امن بعد هم يقولون ربنا اغفرلنا ولا خواننا الذين سبقونا بالايما ن۔ (سورہ حشر ع۱ ج۲۸)

یعنی اور وہ جوان کے بعد آئے عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں بخش دے اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے۔

تفسیر خازن ص ۵۴ ج ۱ میں ہے:

اخبر انهم يدعون لا نفسهم بالمغفرة ولا خوانهم الذين سبقوهم بالايما ن ـ

تفسیر روح البیان میں ہے:

وفى الآيا ت دليل على ان الترحم والاستغفار واجب على المؤمنين الآخرين للسابقين منهم لاسيما لآ بائهم ومعلميهم امو ر الدين ـ

تفسیر جمل وتفسیر صاوی میں ہے:

(قوله الذين سبقو نا با لايمان) اى با لمو ت عليه فينبغى لكل واحد من القائلين بهذا القول ان يقصد بمن سبقه من انتقل قبله من زمنه الى غصر النبى ﷺ فيدخل جميع من تقد مه من المسلمين لاخصوص المهاجرين والانصار۔

. (جمل ص ۳۱۷ ج ۴ وصاوی ص ۱۶۲ ج ۴)

آیت۔ والذين امنوا واتبعتهم ذريتهم با لايما ن الحقنا بهم ذر يتهم وما التناهم من عملهم من شئ۔ (سورہ طور ع۱ ج۲۷)

یعنی اور وہ جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ پیروی کی ہم نے ان کی اولاد ان سے ملادی اور ان کے عمل میں انہیں کوئی کمی نہ دی۔

تفسیر مدارک میں ہے:

(الحقنا بهم ذريتهم) اى تلحق الاولا دبايما نهم واعما لهم درجات الآباء وان قصرت اعمال الذرية عن اعمال الآباء۔ (مدارک ص ۱۴۵ ج ۴)

تفسیر معالم ص ۲۰۸ ج ۶ وتفسیر خازن ص ۲۰۸ ج ۴) میں ہے:

الحقتابهم ذريتهم يعنى المو منين فى الجنة بدرجات ابا ئهم ان لم يبلغو اباعمالهم

درجات آبائهم تكرمة لا بائهم لتقر بذلك اعينهم (ما التنا هم من عملهم من شئ)وما نقصنا الآباء من اعما لهم شيئا۔

تفسیر جمل ص ۲۴۶ ج ۴۔ و تفسیر صاوی ص ۱۱۱ ج ۴ میں ہے:

والمعنى ان المو من اذا كا ن عمله اكثر الحق به من دونه فى العمل ابنا كا ن او ابا ويلحق بالذرية من النسب الذرية بالسبب وهو المحبة فان حصل مع المحبة تعليم علم اوعمل كان احق با للحوق كا لتلا مذة فا نهم يلحقون باشيا خهم واشيا خ الاشيا خ يلحقون بالاشيا خ ان كا نوا دونهم فى العمل والاصل فى ذلك قوله ﷺ اذادخل اهل الجنة الجنة سال احدهم عن ابويه عن زوجته وولده فيقال انهم لم يدركو ا ما ادركت فيقول يا رب انى عملت لى ولهم فيو مر بالحاقهم به ۔وقوله لا يزاد فى عمل الاولا د اى لم نا خذ من عمل الاباء شئ نجعله للاولا د فيسقحقون به هذاالاكرام بل عمل الآباء با ق لهم بتما مه والحاق الذرية بهم بمحض الفضل والكرم ۔

آیت ۔والذين صبروا ابتغاء وجه ربهم واقاموا الصلوٰة وانفقوا مما رزقنا هم سرا وعلا نية ويد رؤن بالحسنة السيئة اولئك لهم عقبى الدارجنت عدن يدخلونها ومن صلح،من ابا ئهم وازواجهم وذريتهم۔ (سورہ رعد ع ۳ ح ۱۳)

یعنی اور وہ جنہوں نے صبر کیا اپنے رب کی رضا چاہنے کو اور نماز قائم رکھی اور ہمارے دئے ہوئے سے ہماری راہ میں چھپے اور ظاہر کچھ خرچ کیا اور برائی کے بدلے بھلائی کر کے ٹالتے ہیں انہیں کیلئے پچھلے گھر کا نفع ہے بسنے کے باغ جن میں وہ داخل ہونگے اور جو لائق ہوں ان کے باپ دادا اور بیوی اور اولاد میں۔

تفسیر خازن میں ہے:

والصحيح ما قاله ابن عبا س لا ن الله تعالى جعل ثواب المطيع سروره بما يراه فى اهله حيث بشره بدخول الجنة مع هؤ لا ء فد ل على انهم يدخلو نها كرامة للمطيع العامل الآتى بالاعمال الصالحة ولو كان دخولهم الجنة باعمالهم الصالحة لم يكن ذلك كرامة للمطيع لا فائدة فى الوعد به اذ كل من كا ن صالحا فى عمله فهو يدخل الجنة۔

(خازن ص ۱۶ ج ۴)

تفسیر جلالین ص ۴۴۲ میں ہے:

(من صلح) امن (من ابائهم وازواجهم وذريا تهم) وان لم يعملو ابعملهم يكونون في درجاتهم تكرمة لهم۔

تفسیر جمل ص ۵۰۴ ج ۴، وتفسیر صاوی ص ۴۳۰ ج ۴ میں ہے:

(قوله من آبائهم) اى اصولهم وان علو اذكو راوانا ثا (قوله وازواجهم) اى اللاتى متن فى عصمتهم (قوله وذريا تهم) اى فروعهم وان سفلوا (اقوله وان لم يعملوا) اى الآباء والا زواج والذريات (قوله تكرمة لهم) اى لا ن اللد جعل من ثواب المطيع سروره بما يراه فى اهله ولوكا ن دخولهم الجنة با عمالهم الصالحة لم تكن فى ذالك كرامة للمطيع اذكل من كا ن صالحافي عمله فله الدرجا ت العلية استقلا لا۔

بالجملہ ان دس آیات اوران کی ۳۶ تفاسیر سے روز روشن کے طرح ثابت ہوگیا کہ غیر عامل کو عامل کے عمل خیر کا ثواب پہنچتا ہے اور بروز قیامت آباء کو اولاد کے اعمال کا ثواب اور اولاد کو آباء کے اعمال کا ثواب اور زوجات کو شوہروں کے اعمال کا ثواب دیا جائے گا اور عاملوں کے ثواب میں کچھ کمی نہ ہوگی۔ اور مسلمانوں کو اپنے لئے اور اپنے سے پہلے تمام مسلمانوں کے لئے اور خاص کر اپنے مسلمان ماں باپ کیلئے دعائے رحمت واستغفار کرنے کا حکم ہے۔ فرشتے اور حاملان عرش ایمان والوں کیلئے استغفار کرتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے مسلمانوں کیلئے استغفار فرمائی۔ سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنے والدین اور مومنین اور مومنات کیلئے دعائے مغفرت کی۔ خود حضور سید عالم ﷺ کو مومن مردوں اور عورتوں کیلئے دعائے رحمت اور مغفرت کرنے کا حکم اللہ تعالی نے دیا۔ تو اب ان قرآنی شہادتوں کے ہوتے ہوئے کیا کسی مسلمان کو کچھ تردد وشک باقی رہ سکتا ہے۔ حاشاللہ۔

اب چند احادیث بھی سنئے اور یہ وہ احادیث ہیں جن کو حضرت خاتم المحدثین علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور میں نقل فرمایا۔

حدیث (۱)۔ عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: ما لميت فى قبره الاشبه الغريق المتغوث ينتظر دعوة من اب اوام اوولد او صديق ثقة فاذا لحقته كا ن احب اليه من الدنيا وما فيها وان الله عزوجل ليد خل على اهل القبو ر من دعا ء اهل الدنيا امثال الجبا ل وان هدية الاحياء الى الاموات الاستغفار لهم وصدقة عليهم (رواه الديلمى والبيهقى فى

شعب الایما ن)

حدیث (۲) عن ابی ہریر ۃ قال :قال رسول اللہ ﷺ اذاما ت الانسان انقطع عملہ الا من ثلث صدقۃ جا ریۃ او علم یتفع بہ اوولد صالح ید عولہ (رواہ البخاری فی الادب ومسلم) (جامع الصغیر ص ۳۹ ج ۱)

حدیث (۳) عن ابی ہریرۃ قال :قال رسول اللہ ﷺ: ان مما یلحق المومن من حسانتہ بعد مو تہ علما نشرہ او ولدا صالحا ترکہ او مصحفا ورثہ او مسجدا بناہ او بینا لا بن السبیل بنا ہ او نہر ا اجراہ او صد قۃ اخرجھا من ما لہ فی صحتہ تلحقہ بعد مو تہ (رواہ ابن ما جہ وابن حزیمہ) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث (۴) عن ابی ہریرۃ قال:قال رسول اللہ ﷺ :ان اللہ یر فع درجۃ للعبد الصالح فی الجنۃ فیقول یا رب انیّٰ لی ہذہ؟ فیقول با ستغفار ولدک لک ۔(زواہ الطرانی فی الاوسط والبیہقی فی مسندہ ولفظہ بدعاء ولد ک لک (اخرجہ البخاری فی الادب مو قوفا) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث (۵) عن انس عن النبی ﷺ :امتی مر حومۃ تدخل قبور ھا بذنو بھا وتخرج من قبورھا لا ذنو ب علیھا یمحص عنھا با ستغفا ر المو منین لھا ۔(رواہ الطبرانی فی الاوسط) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث (۶) عن انس ان رسول اللہ ﷺ قال: من دخل المقابرۃ فقرأ سورۃ یٰس خفف اللہ عنھم و کا ن لہ بعد دمن فییھا حسنا ت۔ (رواہ عبد العزیزصاحب الخلال بسندہ) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث (۷) عن الحجا ج ابن دینا ر قال: قال رسول اللہ ﷺ ان من البر بعد البران تصلی عنھما مع صلو تک وان تصوم عنھما مع صیا مک وان تصدق عنھما مع صدقتک (رواہ ابن ابی شیبہ) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث (۸) عن ام المؤ منین الصدیقۃ رضی اللہ تعالیٰ عنھا قالت: قال رسول اللہ ﷺ :من ما ت وعلیہ صیا م صام عنہ ولیہ (رواہ البخاری و مسلم)

(شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۹) عن عقبة ابن عامر ان امرأة جاء ت الی رسول اللہ ﷺ فقالت: احج عن امی وقد ماتت قال ارأیت لو کان علی امك دین فقضیته الیس کان مقبولا منك قالت: نلیٰ۔ فامر ان تحج۔ (رواہ الطبرانی) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۱۰) عن سعد بن عبادة قال: یا رسول اللہ ان امی ماتت فای الصدقة افضل؟ قال؟ الماء، فحفر بیرا وقال هذہ لام سعد (رواہ احمد والترمذی وابو داؤد والنسائی وابن ماجه۔ (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۱۱) عن عطاء وزید بن اسلم قال: جاء رجل الی النبی ﷺ فقال: یا رسول اللہ! اعتق عن ابی وقد مات قال نعم (رواہ ابن ابی شیبه)

(شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۱۲) عن عمرو بن العاص انه قال: یا رسول اللہ! ان العاص أوصی ان یعتق عنه مائة نسمة فاعتق هشام منها خمسین قال لا انما یتصدق ویحج ویعتق عن المسلم لو کان مسلما بلغه (رواہ ابن حبان) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۱۳) عن ام المؤمنین الصدیقة رضی اللہ عنها ان رجلا قال للنبنی ﷺ ان امی افتلتت نفسها واظنها لو تکلمت تصدقت فهل لها اجر ان تصدقت عنها قال: نعم۔ (رواہ البخاری) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۱۴) عن ابن عباس ان سعد بن عبادة توفیت امد وهو عائب عنها فقال یا رسول اللہ ان امی توفیت وانا غائب عنها اینفعها شیء ان تصدقت به عنها؟ قال: نعم۔ قال فانی اشهدك علی ان حائطی المخراف صدقة علیها (رواہ البخاری)

(شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۱۵) عن ابی قتادة قال: سمعت النبی ﷺ یقول: خیر ما یخلف المرء بعد موته ولد صالح ید عوله وصدقة تجری یبلغه اجرها وعلم یعمل به مبن بعده (رواہ الطبرانی فی الصغیر) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث(۱۶) عن عقبة بن عامر قال: قال رسول اللہ ﷺ: ان الصدقة لتطفی عن اهلها حر القبور (رواہ الطبرانی) (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث (۱۷) عن سعد بن عبادة قال :قلت یا رسول الله! تو فیت امی ولم تو صه ولم تنصد ق فهل ینفعها ان تصدقت؟ قال :نعم ولو یکراع شاة محرق (رواه الطبرانی)

(شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث (۱۸) عن ابن عمر قال:قال رسول الله ﷺ: اذاتصد ق احد کم بصدقة تطوعا فیجعلها عن ابو یه فیکو ن لهما اجر ها ولا یتنقص من اجره شیئا (رواه الطبرانی)

(شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث (۱۹) عن انس سمعت رسول الله ﷺ یقول: ما من اهل یمو ت منهم میت فلیتصد ق عنه بعد مو ته الا اهداها له جبرئیل علی طبق من نو رثم یقف علی شفیر القبر فیقول یا صاحب القبر العمیق هذه هدیة اهداها الیك اهلك فاقبلها فتدخل علیه فیفرح بها و یستبشرویحزن جیر انه الذین لا یهدی الیهم شیئ۔ (رواه الطبرانی فی الاوسط)

(شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث (۲۰) عن جا بر قال: شهدت مع رسول الله ﷺ الا ضحی فی المصلی فلما قضا خطبته نزل من منبر ہ واتیٰ بکبش فذبحه رسول الله ﷺ بیدیه وقال بسم الله الله اکبر هذا عنی وعمن لم یضح من امتی (رواه ابو داؤ دوالترمذی)

(شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

بخوف طوالت اسوقت صرف ۲۰/احادیث پیش کی گئیں جن سے آفتاب کی طرح ثابت ہوگیا کہ غیر عامل کو عامل کے عمل خیر کا ثواب پہنچتا ہے اور اس سے عامل کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور زندوں کا ہدیہ اموات کیلئے استغفار ودعاء اور تمام انواع صدقات وخیرات ہیں اور میت اپنے ماں باپ اعزاء اقارب دوست احباب سے ان امور کا منتظر رہتا ہے۔اور یہ تمام امور خیر اس کے لئے سبب مغفرت اور باعث رفع درجات ہوتے ہیں۔

الحاصل دوسرے کو عمل کا ثواب پہنچانا خود شارع علیہ الصلوۃ السلام کے نہ صرف قول سے بلکہ فعل سے بھی ثابت ہے۔اب صحابہ کرام کے قول اور فعل بھی ملاحظہ ہوں۔

اثر (۱)۔عن ابن مسعود قال: اربع یعطهن الرجل بعد مو ته ثوابها ما له اذاکان فیه قبل ذلك مطیعا والولد الصالح یدعوله بعد مو ته والسنة الحسنة یسنها الرجل فیعمل بها

بعد مو ته والما نه اذا شفعو اللرجل شفعوا فیه۔ (رواه الدارمی فی المسند)

اثر (۲)۔عن عبد الرحمن ابن العلاء بن الحلاج عن ابیه قال: قال لی ابی الحلاج ابو خالد یا بنی اذا انا مت فالحد نی واذا وضعتنی فی لحدی فقل بسم الله وعلی ملة رسول الله ثم سن علی التراب سنا ثم اقرأ عند راسی بفاتحة البقرة وخاتمتها فانی سمعت رسول الله ﷺ یقول ذلك (رواه الطبرانی فی المعجم الکبیر واسنا ده صحیح)

اثر (۳)۔عن الشعبی قال: کا نت الانصار اذاما ت لهم المیت اختلفو الی قبره یقرؤن القرآن (رواه ابن لا ل فی الجامع)

اثر (۴)عن ابی اما مة البا هلی قال: اقرؤا القرآن فانه یاتی یو م القیمة شفیعا لا صحابه ثم یسبح ویدعوبا لرحمة والمغفرة لنفسه وللمو منین (رواه مسلم)

اثر (۵)۔عن ا بی جعفر ان الحسن والحسین رضی الله تعالی عنهما کانا یعتقان عن علی رضی الله تعالیٰ عنه بعد مو ته (رواه ابن ابی شیبه)

اثر (۶)۔عن القاسم بن محمد ان عائشة رضی الله عنها اعتقت عن اخیها عبد الرحمن رقیقا من عبا ده ترجوان ینفعه بذلك بعد مو ته (رواه ابن سعد)

اثر (۷)عن علی رضی الله عنه انه کا ن یضحی کبشین احدهما عن النبی ﷺ والآ خر عن نفسه فقیل له فقال امر نی یعنی النبی ﷺ فلا ادعه ابدا (رواه الترمذی)

بخیال اختصار سات آثار حضرات صحابہ کرام کے منقول ہوئے جن سے واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ غیر عامل کو عمل خیر کا ثواب پہنچتا ہے۔اب تابعین کرام وائمہ سلف وخلف کے بھی چند اقوال اور دیکھ لیجئے۔

(۱)عن سفیا ن قال: کا ن یقال الا موات احوج الی الدعاء من الاحیاء الی الطعام والشراب ۔(رواه ابن ابی الدنیا)

(۲) عن بعض السلف قال رأیت اخالی فی النو م بعد مو ته فقلت اتصل الیك دعاء الاحیاء قال ای والله بتزخرف مثل النو ر ثم نلبسه (رواه ابن ابی الدنیا)

(۳) عن عمر بن جریر قال : اذا دعا العبد لا خیه المیت اتاه بها الی قبر ه ملك فقال یا صاحب القبر الغریب هذه هدیة من اخ لك علیك شفیق (رواه ابن ابی الدنیا)

(٤) عن ابی قلابة قال اقبلت من الشام الی البصرة فنزلت الخندق فتطهرت وصليت ركعتين بالليل ثم وضعت راسی علی قبر فنمت ثم انتبهت فاذاانا بصاحب القبر یشتکی ويقول لقدآذيتنى منذ الليلة ثم قال انكم لا تعلمو ن ونحن نعلم ولا نقدر على العمل ان الركعتين اللتين ركعتهما خيرمن الدنيا وما فيها ثم قال سل جزى الله اهل الدنيا خير ا فاقرأ هم منى السلام فانه يدخل علينا من دعائهم نو ر مثل الجبا ل (رواه ابی الدنیا)

(٥) حدثنا العباس بن يعقوب بن صالح الانبارى سمعت ابی يقول رای بعض الصالحين ابا ه فی النو م فقال له يا بنی لم قطعتم هديتكم عنا قال ياابت وهل تعرف الاموات هدية الاحيا ء قال يا بنى لولا الاحياء لهلكت الاموات ۔(رواه ابن رجب)

(٦) عن ما لك بن دينا ر قال دخلت المقبرة ليلة الجمعة فاذابنو ر مشرق فيها فقلت لا اله الاالله نرى ان الله عزوجل قد غفرلا هل القبور فاذا انا بها تف يهتف من البعد وهو يقول يا مالك بن دينا ر هذه هدية المو منين الى اخوانهم من اهل المقابر قلت بالذى انطقك الااخبرتنى ما هو قال رجل من المو منين قام فى هذاه الليلة فاسبغ الوضوء وصل ركعتين واقرء فيهما فاتحة الكتاب وقل يا ايها الكفرون وقل هوالله احد وقل اللهم انى قد وهبت ثوابها لاهل المقابر من المو منين فادخل الله علينا الضيا ء والنو ر والفسحة والسرور فى المشرق والمغرب قال ما لك: فلم ازل اقرأها فى كل جمعة فرأيت النبی ﷺ فى منا مى يقول لى يا ما لك قد غفر الله لك بعد دالنو ر الذى اهديته الى ا متى ولك ثواب ذلك ثم قال لى وبنى الله بيتا لك فى الجنة فى قصر يقال له المنيف قلت ماالمنيف قال المظل على اهل الجنة (رواه البخارى فى تاريخه)

(٧) عن بشاربن غالب قال رأيت رابعة فى النو م وكنت كثير الدعاء لها فقالت لى يا بشار هدايا ك تاتيناعلى اطبا ق من نو رمحمد بمنا ديل الحرير قلت وكيف ذلك قالت هكذادعا ء المو منين الاحيا ء اذادعو اللمو تى فاستجيب لهم جعل ذلك الدعاء على اطباق النو ر ثم خمر بمنا ديل الحيرير ثم اتى الذى دعى له من المو تى فقيل هذه هدية فلا ن عليك (رواه ابن ابی الدنيا)

(٨) عن سلمة بن عبيد قال: قال حما د المكى خرجت ليلة الى مقابر مكة

فوضعت راسی علی قبر فنمت فرأیت اهل المقا بر حلقة حلقة فقلت قامت القیا مة قالو الا ولکن رجل من اخواننا قرأقل هو الله احد وجعل ثوابها لنافنحن نقسمة مند سنة (رواه القاضی ابو بکر بن عبد الباقی الانصاری فی مشیخته)

(۹) عن طاؤ س قال ان المو تی یفتنو ن فی قبورهم سبعا فکا نو ایستحبو ن ان یطعم عنهم بتلك الایام (رواه احمد فی الذهد وابو نعیم فی الحلیة)

(۱۰) عن احمد بن حنبل قال: اذادخلتم المقابر فاقرؤ ابفاتحة الکتاب والمعوذتین وقل هو الله احد واجعلواذلك لاهل المقابر فانه یصل الیهم۔

بسبب اپنی عدیم الفرصتی کے اس وقت تابعین وائمہ سلف وخلف کے صرف دس اقوال پیش کئے گئے جن سے صریح طور پر ثابت ہوگیا کہ غیر عامل کو عامل کے عمل خیر کا ثواب پہنچتا ہے ل۔

ہذاجب یہ مسئلہ قرآن عظیم واحادیث نبی کریم اور اقوال صحابہ کرام وتصریحات ائمہ عظام سے ثابت ہو چکا تو اب اس میں کسی کو مجال دمزدن وجائے سخن باقی نہ رہی۔لیکن دلائل شرع سے ایک دلیل اجماع امت بھی ہے تو اتمام حجت کیلئے اس کی بھی چند نقول اور پیش کردی جائیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی شرح الصدور میں فرماتے ہیں:

(۱۱) ان المسلمین ما زالوا فی کل عصر بجمتعو ن ویقرؤ ن لمو تاهم من غیر نکیر فکا ن ذلك اجما عا ۔

یہی علامہ اسی میں فرماتے ہیں:

وقد نقل غیر واحد الاجما ع علی ان الدعاء ینفع المیت۔ (ص ۱۲۷)

عقائد کی مشہور کتاب شرح عقائد میں ہے۔وفی دعاء الاحیا ء للاموات او صدقتهم ای صدقة الاحیاء عنهم ای عن الاموات نفع لهم ای للاموات۔ (ص ۲۴۰)

عقائد کی مشہور کتاب شرح فقہ اکبر میں ہے:

عند اهل السنة ان للانسان ان یجعل ثواب عمله لغیره صلوة او صوما اوحجا او صدقة او غیر ها۔ (شرح فقہ اکبر مصری ص ۱۱۸)

علامہ دمشقی ''رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمۃ'' میں فرماتے ہیں:

واجمعوا علی ان الاستغفار والصدقة والحج والعتق تنفع المیت ویصل الیه ثوابه۔

(رحمۃ الامۃ مصری ص ۱۰۲)

اسی رحمۃ الامہ میں ہے:

ومذهب اهل السنة ان للانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره۔

مواہب لدنیہ میں شیخ شمس الدین عسقلانی کا قول نقل فرماتے ہیں:

ان وصول ثواب القرأة الى الميت من قريب او اجنبى هو الصحيح كما تنفعه الصدقة والدعاء والاستغفار با لاجماع۔ (مواہب مصری ص ۴۳۲ ج ۱)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں:

ومستحب است کہ تصدق کردہ شود از میت بعد از رفتن او از عالم تا ہفت روز وتصدق از میت نفع میکند اورا بے خلاف میان اہل علم وارد شدہ است دراں احادیث صحیحہ خصوصا۔

(اشعۃ اللمعات ص ۷۱۷ ج ۱)

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی تذکرۃ الموتی میں فرماتے ہیں:

حافظ شمس الدین ابن عبدالواحد گفتہ از قدیم در ہر شہر مسلمانان جمع می شوند و برائے اموات قرآن میخوانند پس اجماع شدہ۔ (تذکرۃ الموتی ص ۳۶)

حضرت علامہ اسمعیل حقی تفسیر روح البیان میں شیخ تقی الدین ابوالعباس کا قول نقل فرماتے ہیں:

من اعتقدان الانسان لا ينتفع الا بعمله فقد خرق الاجماع۔

ان عبارات سے نہایت صریح طور پر ثابت ہوگیا کہ عامل کے عمل کا ثواب غیر عامل کو پہنچنے پر امت کا اجماع ہو چکا۔ بالجملہ جب اس مسئلہ پر شریعت کے اصول۔ آیات۔ احادیث اور اجماع امت کے کافی دلائل منقول ہوئے اور صحابہ وتابعین اور ائمہ سلف وخلف کی تصریحات پیش ہو چکیں اور آفتاب سے زیادہ روشن طور پر یہ مسئلہ ثابت ہو چکا کہ عامل کے عمل کا ثواب غیر عامل کو پہنچتا ہے تو اس مسئلہ میں اب کوئی مسلمان تو شک یا شبہ کر ہی نہیں سکتا۔ اب رہے مخالفین ومنکرین انہیں بھی اس کی حقانیت میں تردد وتامل کی گنجائش باقی نہیں ہے لیکن ہمیں سائل کی بیجا ضد اور ہٹ کا پورا کرنا بھی ضروری ہے اسی لئے چند فقہاء حنفیہ کے اقوال بھی پیش کئے جاتے ہیں۔

ہدایہ ص ۱۰۷ میں ہے:

ان الانسان له ان يجعل ثواب عمله لغيره صلوة او صوما او صدقة او غيرها عند

اهل السنة والجماعة۔ (ہدایہ مجتبائی ص ۲۷۶ ج ۱۱)

مراقی الفلاح میں علامہ زیلعی سے ناقل ہیں:

فللانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره عند اهل السنة والجماعة صلوة كان او صوما او حجا او صدقة او قراءة القرآن او الاذكار او غير ذلك من انواع البر ويصل ذلك الى الميت وينفعه قاله الزيلعى فى باب الحج عن الغير۔ (طحطاوی ص ۳۶۳)

ہدایہ و بحر الرائق میں ہے:

من صام او صلى او تصدق وجعل ثوابه لغيره من الاموات والاحياء جاز ويصل ثوابها اليهم عند اهل السنة والجماعة۔ (ردالمحتار مصری ص ۶۳۱ ج ۱)

درمختار میں ہے:

الاصل ان كل من اتى بعبادة ما له جعل ثوابها لغيره و ان نواها عند الفعل لنفسه لظاهر الادلة۔ (حاشیہ ردالمحتار مصری ص ۲۴۲ ج ۲)

فتاوی سراجیہ میں ہے:

من حج عن غيره بغير امره وجعل ثوابه له يصل الثواب الى ذلك الغير۔

(حاشیہ فتاوی خانیہ مصطفائی ص ۱۹۵ ج ۱)

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

فللانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره عند اهل السنة والجماعة سواء كان المجعول له حيا او ميتا من غير ان ينقص من اجره شیء۔ (طحطاوی ص ۳۶۳)

عینی شرح کنز الدقائق میں ہے:

ان للانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره صلوة كان او صوما او حجا او صدقة او قرأة القرآن او قرأة ذكر الى غير ذلك من جميع انواع البر و كل ذلك يصل الى الميت وينفعه عند اهل السنة والجماعة۔ (عینی مصری ص ۱۱۱ ج ۱)

علامہ شامی تتارخانیہ سے اور تتارخانیہ محیط سے ناقل ہیں:

الافضل لمن يتصدق نفلا ان ينوى لجميع المومنين والمومنات لانها تصل اليهم ولا ينقص من اجره شیء۔ (ردالمحتار ص ۷۳)

سائل بچشم انصاف دیکھے کہ فقہ کی ان دس کتابوں میں کیسی صاف تصریحات موجود ہیں کہ مذہب اہل سنت میں عامل اپنے عمل کا ثواب غیر عامل کو پہنچا سکتا ہے اور غیر عامل تک وہ ثواب پہنچتا بھی ہے اور اس کے لئے نافع بھی ہوتا ہے اب چاہے وہ غیر عامل زندہ ہو یا مردہ پھر عامل کے اس ایصال ثواب سے اس کے اجر میں بھی کچھ کمی نہیں ہوتی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ غیر کو اپنے عمل کا ثواب پہچانا اب چاہے وہ عمل نماز ہو یا روزہ۔حج ہو یا صدقہ تلاوت قرآن ہو یا ذکر کلمہ شریف اور صدقات میں نقد دینا ہو یا غلہ عطا کرنا۔کھا کھلانا ہو یا شیرینی تقسیم کرنا۔چھوارے دینا ہو یا چنے بانٹنا۔شربت کی سبیل لگانا ہو یا پانی پلانا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی نیک کام کوئی عمل خیر ہو کوئی نوع بر ہو اسکا ایصال ثواب کرنا ایسا بہتر اور افضل واعلیٰ عمل ہے کہ اس کو آیات قرآنی واحادیث نبوی ثابت کرتی ہیں اور اس کے جواز پر امت کا اجماع منعقد ہو چکا۔اور بکثرت صحابہ کرام وتابعین عظام وائمہ علماء وسلف وخلف تمام کے اقوال واعمال اس کے شاہد ہیں۔اسوقت بخوف طوالت اور بوجہ قلت فرصت کے ہمنے صرف (۱۱۷) کتابوں کی عبارات پیش کیں، اور اگر جامعیت کا لحاظ کیا جائے تو صدہا بلکہ ہزارہا اور عبارات پیش کی جاسکتی ہیں اور ایک مبسوط رسالہ تیار ہو سکتا ہے۔

بالجملہ اس ایصال ثواب میں مخالف ومنکر کو بحث کرنے کی کیا ہمت ہو سکتی ہے اور اس کے جواز بلکہ استحباب میں کیا کسی کو اعتراض وکلام کرنے کی جرأت ہو سکتی ہے۔اس کے پاس نہ کوئی آیت ہے نہ حدیث، نہ کوئی قول ائمہ ہے نہ خلف وسلف کی تصریح۔منکر صرف اپنے زعم باطل اور رائے ناقص اور محض کم عقلی ونافہمی کی بنا پر غلط تاویلات کرتا ہے اور عوام کو مغالطہ اور فریب میں ڈالتا ہے۔ہم دعا کرتے ہیں کہ مولی تعالی اس کو قبول حق کی توفیق عطا کرے اور اس کے قلب میں انصاف پسندی کی لہر پیدا کرے اور بیدینی کی خطرناک راہوں سے بچائے اور باطل کی حمایت وپاسداری سے محفوظ رکھے۔واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۵۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دیں مسائل ذیل میں۔

(۱) بغرض ایصال ثواب جو روپیہ نقد یا کھانا یا شیرینی یا کپڑا دیا جائے وہ صدقہ ہے یا نہیں ؟۔

(۲) یہ کہ اگر وہ صدقہ ہے تو اس کا استعمال کرنا یا کھانا پینا امراء یا صاحب ثروت لوگوں کو جائز ہے یانہیں؟۔

(۳) یہ جانتے ہوئے کہ مذکورہ بالا اشیاء بغرض ایصال ثواب دی جارہی ہیں کوئی امیر یا صاحب ثروت لے یا کھائے یا استعمال کرے تو وہ گناہ گار ہے یانہیں؟۔ اور اگر ہے تو یہ گناہ کبیرہ ہے یا صغیرہ؟۔

(۴) جو کھانا شیرینی یا کپڑا یا نقد روپیہ بغرض ایصال ثواب دیا جائے اس پر فاتحہ دینی ضروری ہے یانہیں؟ اور اس کے مستحق امیر ہیں یا غریب؟۔

(۵) اگر فاتحہ دینا ضروری ہے تو فاتحہ دینے کا طریقہ مسنون کیا ہے۔

(۶) نذر و نیاز بزرگوں کی بعض برآمد کار اور بعض از راہ نزدیکی حاصل کرنے ان بزرگ سے کرتے ہیں ایسی نذر و نیاز جائز ہے یانہیں؟۔ اور کھانا اسکا روا ہے یا ناروا۔ مہربانی فرما کر ہر سوال کا جواب نمبروار تحریر فرما کر اور کتب معتبرہ اور فقہ کی رو سے عنایت فرمادیں۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الكريم

(۱) صدقہ کی تعریف المغرب میں ہے: الصدقة العطية التی بها يبتغی مثوبة من الله تعالی۔

جامع العلوم میں ہے: الصدقة تمليك العين بلا عوض ابتغاء لوجه الله تعالی۔

ان عبارات کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ صدقہ اس عطیہ کو کہتے ہیں جس میں بغیر عوض کے تملیک عین ہو اور لوجہ اللہ دے کر ثواب مطلوب ہو۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ایصال ثواب کیلئے جو نقد یا کھانا یا کپڑا دیا جاتا ہے۔ تو وہ بلا عوض تملیک عین ہے اور لوجہ اللہ ایسا عطیہ ہے جس سے ثواب مطلوب ہے۔ لہذا ان چیزوں پر صدقہ کی تعریف صادق آگئی۔ بلاشبہ یہ چیزیں صدقہ ثابت ہونگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲۔۳) جب ان چیزوں کا صدقہ ہونا ثابت ہوگیا۔ اور یہ امر طے شدہ ہے کہ یہ صدقات مفروضہ یا واجبہ تو نہیں ہو سکتے۔ لہذا ان صدقات کا نافلہ ہونا قرار پایا۔ اور صدقہ نافلہ بلاشبہ اغنیاء اور مالداروں کو بھی لینا اور کھانا جائز ہے۔

چنانچہ جوہرہ نیرہ شرح قدوری میں ہے۔ لو دفع الی الغنی صدقة التطوع جاز له اخذها

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی فتاوی عزیزیہ میں فرماتے ہیں: اگر فاتحہ بنام

بزرگے دادہ شدہ پس اغنیاء راہم خوردن جائز است۔ (فتاوی عزیزیہ ص ۴۱)

ان دونوں عبارات سے ثابت ہو گیا کہ اغنیاء کو صدقہ نافلہ کا لینا اور کھانا جائز ہے۔ اور شاہ صاحب نے تو خاص فاتحہ کے کھانے کو اغنیاء کے لئے جائز بتایا ہے۔ اور جب یہ اغنیاء کیلئے جائز ہے تو اس کے لئے گناہ کس طرح ہو سکتا ہے اور ان کے لینے یا کھانے پر اغنیاء گناہ گار کیونکر ہو سکتے ہیں۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

(۴) جس کھانے یا شیرنی کو بغرض ایصال ثواب دیا جائے اس پر قل فاتحہ پنج آیات کا پڑھنا ان چند امور پر مشتمل ہے:

(۱) اس میں جمع بین العبادتین ہے۔ (۲) قبولیت دعاء کی بھی امید ہے۔ (۳) مزید اجر وثواب کا بھی موجب ہے۔ (۴) وہ شئی متبرک بھی ہو جاتی ہے۔

چنانچہ شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی فتاوی عزیزیہ میں اپنی مجلس شہادت حسین کی تفصیل ذکر کرتے ہوئے یہ بھی فرماتے ہیں:

بعد از ان ختم قرآن مجید وپنج آیت خوانده بر ماحضر فاتحہ نمودہ می آید۔ (فتاوی عزیزیہ۔ ص ۱۱۱)

یہی شاہ صاحب اسی فتاوی کے ص ۷۵۔ پر فرماتے ہیں:

طعامیکہ ثواب آں نیاز حضرات امامین نمایند بر آں فاتحہ وقل و درود خوانند تبرک میشود خوردن او بسیار خوب است۔

اب باقی رہا یہ امر کہ اسکا مستحق کون ہے، اس کے متعلق مولوی اشرف علی تھانوی کا مطبوعہ فتوی موجود ہے جو فتاوی امدادیہ حصہ اول کے ص ۱۶۳۔ پر ہے۔

سوال۔ رواج اس ملک کا یہ ہے کہ ثواب رسانی مردہ کے لئے وارثین اپنی اپنی ہمت کے موافق طعام پختہ کھلاتے ہیں اور روپیہ پیسہ وغیرہ صدقہ کرتے ہیں۔ تو اب اس طعام پختہ و روپیہ وغیرہ کے مستحق کون ہیں؟۔ فقیر، غریب، مسکین وغیرہ غریب وغربا۔ تو انگر سود خور بے نمازی کی دعوت کھلانا کیسا ہے؟۔

الجواب۔ یہ صدقہ نافلہ ہے ہر ایک کیلئے جائز ہے لیکن زیادہ اولی مساکین کے لئے ہے۔

لہذا جب اس نمبر میں اس قدر فتوے خود مانعین کے مطبوعہ موجود ہیں، جو اس میں مزید حوالوں کی حاجت نہیں واللہ تعالی اعلم۔

(۵) فاتحہ دینے کا طریقہ یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ آیۃ الکرسی کم از کم تین تین بار سورۃ اخلاص اول وآخر ۳۔۳۔ بار دورد پڑھا جائے اس کے بعد ہر دو ہاتھ اٹھا کر کہیں کہ الٰہی میرے اس پڑھنے پر اور ان چیزوں پر جو ثواب مجھے عطا ہوا اسے میری طرف سے تمام انبیاء کرام اور خاص کر سید الانبیاء علیہ السلام اور تمام مشائخ واولیائے کرام اور علماء کرام اور میرے فلاں فلاں عزیز واحباب اور سب مسلمانوں مرد وعورت جو گذرے یا ہیں یا ہونگے سب کو پہونچا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۶) مسلمان جو بزرگون کیلئے نذر ونیاز کرتے ہیں نہ اس نذر سے انکا تقرب بہ نیت عبادت مقصود ہوتا ہے۔ بلکہ یہ نذر تو حقیقۃ اللہ تعالیٰ کیلئے ہوتی ہے اور اس کا ثواب کسی بزرگ کی روح کو پہونچا تے ہیں اور جس چیز کی نذر کی ہے اس کو ان بزرگ کے خدام ومتوسلین پر خرچ کرتے ہیں تو بلاشبہ ایسی نذر بہتر ہے۔ فقہ کی مشہور کتاب ردالمحتار میں ہے:

ان قال یا اللہ انی نذرت لك ان شفیت مریضی اورددت غائبی او قضیت حاجتی ان اطعم الفقراء الذین ببا ب السیدۃ نفسیۃ او الفقراء الذین بباب الشافعی اوا لامام لیث او اشتری حصیر المساجدھم او زیتا لوقود ھا او دراھم لمن یقوم لسائر ھا الی غیر ذلك یکو ن فیہ تقع للفقراء والنذ رللہ عزوجل و ذکر الشیخ انما ھو محل لصرب النذر لمستحقیہ القائمیین لربا طہ او مسجدہ او جا معہ فیجو ز بھذا الاعتبار۔

(ردالمحتار مصری جلد دوم۔ ص ۱۳۱)

اگر یہ کہا کہ اے اللہ میں نے تیری نذر کی اگر تو میرے مریض کو تندرست کردے۔ یا تو میری گمشدہ چیز کو واپس کردے۔ یا تو میری حاجت کو پورا کردے۔ تو ان فقراء کو کھانا کھلاوں گا جو سیدہ نفیسہ یا امام شافعی یا امام لیث علیہ الرحمۃ کے آستانوں پر رہتے ہیں۔ یا انہی بزرگوں کی مساجد کے لئے بوریا یا ان کی جلانے کے لئے تیل خریدوں گا۔ یا اس کو روپے دوں گا جو ان مساجد کی خدمت کرے۔ یا اس کے سوا اور چیزیں۔ تو اس میں نفع فقراء کے لئے ہے اور نذر اللہ تعالیٰ کیلئے ہے۔ اور ان بزرگوں کا ذکر صرف اس لئے ہے کہ وہ مسجد وخانقاہوں کے مستحقین پر نذر کے خرچ کرنے کا محل ہے تو یہ نذر جائز ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فتاوی عزیزیہ میں فرماتے ہیں:

حقیقت ایں نذر آنست کہ اہداء ثواب طعام وانفاق وبذل حال بروح میت کہ امریست مسنون واز روئے حدیث صحیح ثابت ست۔ مثل ما وردفی الصحیحین من حال ام سعد وبیرہ۔ ایں نذر

مستلزم میشود۔ پس حاصل ایں نذر آنست کہ ان نسبت مثلا اہدائے ثواب ھذا النذر الی روح فلاں۔ وذکر ولی برائے تعیین عمل منذور ست، نہ برائے مصرف۔ ومصرف ایشاں متوسلان آں ولی می باشند از اقارب وخدمہ وہم طریقاں وامثال ذلک، ہمیں ست مقصود نذر کنندگان بلاشبہ۔ وحکمہ انہ صحیح یجب الوفاء بہ لانہ قربۃ معتبرۃ فی الشرع۔ (فتاوی عزیزیہ)

اس نذر کی حقیقت کھانے اور مال خرچ کرنیکا ثواب میت کی روح کو پہنچانا ہے اور یہ امر مسنون ہے اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے جیسا کہ صحیح بخاری ومسلم میں حضرت ام سعد وغیرہ کی حدیث میں وارد ہے۔ یہ نذر لازم ہو جاتی ہے تو اس نذر کا حاصل طعام وغیرہ کی ایک مقدار کا ثواب کسی بزرگ کی روح کو پہنچاتا ہے اور ولی کا ذکر عمل منذور کی تعیین کیلئے ہے نہ مصرف کیلئے۔ اور مصرف اس نذر کرنے والوں کے نزدیک اسی ولی کے اقارب خدام اور ان کے طریقے والے اور متوسلین ہیں اور بلاشبہ نذر کرنے والوں کا یہی مقصود ہے اور اس نذر کا حکم یہ ہے کہ یہ نذر صحیح ہے اس کی وفا واجب ہے۔ اس لئے کہ یہ شریعت میں قربت معتبرہ ہے۔

ان عبارات سے آفتاب کی طرح ثابت ہوگیا کہ مسلمان جو بزرگوں کیلئے نذریں اور نیازیں کر کے ان کا ایصال ثواب ان کی ارواح کو کرتے ہیں وہ بلاشبہ جائز ودرست ہیں اور احادیث وفقہ سے ثابت ہیں۔ اور جب اس نذر ونیاز کا کرنا ثابت ہوا تو اسکا کھانا کیسے ناجائز وناروا ہوسکتا ہے واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۵۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

بنگال میں یہ رواج ہے کہ جب کوئی شخص انتقال کرجاتا ہے تو اس کے متعلقین علماء اور مشائخ کو اور غریب لوگوں کو اور فقیروں کو میت کی طرف سے روپیہ پیسہ صدقہ کردیتے ہیں (میت کو دفن کرنے سے پہلے یا بعد میں) لہذا اس طرح روپیہ پیسہ صدقہ کرنے کو دیوبندی شیطانوں نے حرام قرار دیا اور ایسا ہی فتوی دیدیا ہے اس کے متعلق شرع شریف میں کیا حکم ہے؟۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

میت کی طرف سے روپیہ پیسہ وغیرہ صدقہ کرنا بلا شبہ جائز بلکہ مستحب ہے۔ اللہ تعالیٰ خود قرآن کریم میں فرماتا ہے:

واذا حضر القسمة او لو القربی والیتمی والمساکین فارز قوهم منه وقوا ولهم قولا معرفا۔ (سورۃ النساء ع ا ج ۴)

جب بانٹتے وقت رشتہ دار اور اجنبی یتیم و مسکین آجایں تو انہیں بھی کچھ دو اور ان کو اچھی بات کہو۔

علامہ ابوالبرکات نسفی تفسیر مدارک وحقائق التاویل میں اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہیں:

واذ حضر القسمة ای قسمة الترکة (اولو القربی) ممن لا یرث (والیتمی والمساکین) من الا جانب (فارز قوهم) فاعطوهم (منه) مما ترك الوالدان والاقربون وهو امر ندب وهو باق لم ینسخ۔ (مدارک مصری ص ۱۶۲ ج ۱)

اور تقسیم ترکہ کے وقت غیر وارث رشتہ دار اور اجنبی یتیم و مساکن آجائیں تو انہیں ماں باپ اور اقارب کے ترکہ سے کچھ دو یہ دینا مستحب کام ہے اور حکم باقی ہے جو منسوخ نہیں ہوا۔

علامہ احمد جیون تفسیر احمدی میں اسی آیت کریمہ کے تحت میں فرماتے ہیں:

الما ل ان الله تعالی امر نا باعطاء شئی من الترکة لغیر الورثة فهو اما ان یکون تطیبا لقلو بهم او تصدقا علیهم فحینئذ یکون ذلك ندیا باقیا علی حاله۔

(تفسیر احمدی ص ۸۷ ج ۲)

نتیجہ بحث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں غیر وارثوں کیلئے ترکہ کے کچھ دینے کا حکم فرمایا۔ پس یہ دینا یا تو ان کے دل خوش کرنیکے لئے ہے۔ یا ان پر صدقہ کرنے کے لئے ہے۔ تو یہ دینا مستحب ہو گیا اور اسی حال پر باقی رہا۔

حضرت حجۃ الاسلام امام ابوبکر رازی تفسیر احکام القرآن میں اس آیت کریمہ کے تحت میں اقوال مختلفہ نقل کرنے کے بعد آخر میں فرماتے ہیں:

وهذا کله یو جب ان یکون اعطاء هو لاء الحاضرین عند القسمة استحبابا لا ایجابا۔

(تفسیر احکام القران مصری ص ۸۷ ج ۲)

یہ کل بحث ثابت کرتی ہے کہ تقسیم ترکہ کیوقت ان حاضرین غیر وراث رشتہ داروں اور اجنبی یتیموں مسکینوں کو دینا مستحب ہو، واجب نہو۔

علامہ ناصر السنہ علاؤ الدین بغدادی تفسیر خازن میں وعلامہ محی السنہ حسین فراو بغوی تفسیر معالم التنزیل میں تحت آیت فرماتے ہیں:

القول الثانی ان ھذا الامر ندب واستحباب لا علی سبیل الفرض والا یجاب وھذا القول ھو الاصح الذی علیه العمل الیوم (وفی معالم) ھو اولی الاقاویل۔ (خازن ومعلم مصری ص ٤٠٤ ج ١)

دوسرا قول یہ ہے کہ غیر وارث رشتہ دار اور اجنبی یتیم ومسکین کو دینا مندوب ومستحب ہے، فرض وواجب نہیں۔ یہی قول ایسا صحیح تر ہے جس پر آج بھی عمل ہے اور تفسیر معالم میں ہے کہ یہی قول بہترین اقوال ہے۔

اس آیت اور اس کی تفاسیر سے ثابت ہو گیا کہ میت کیلئے کچھ صدقہ وخیرات کرنا مستحب ہے یہاں تک کہ میت کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل کچھ اس سے دیا جائے۔ آیۂ کریمہ کے بعد کسی حدیث کے پیش کرنے کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن مزید اطمینان کیلئے چند احادیث نقل کی جاتی ہیں۔

بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

ان رجلا قال للنبی ﷺ ان امی افتلتت نفسا واظنھا لو تکلمت تصدقت فھل لھا اجران تصدقت عنھا قال نعم۔

(بخاری مصطفائی ص ١٨٢ ج ٦ ـ کتاب الجنائز باب موت الفجأة

(وفی روایة) نعم تصدق عنھا۔ (ص ٣٨٦ ـ ج ١)

ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا میری ماں اچانک انتقال ہو گئیں اور ان کے متعلق میں گمان کرتا ہوں کہ اگر وہ بات چیت کرتیں تو صدقہ کرتیں۔ یا صدقہ کی وصیت کرتیں۔ تو کیا انہیں ثواب ملے گا اگر میں انکی طرف سے صدقہ کروں؟ حضور نے فرمایا کہ ہاں انہیں ثواب پہونچے گا۔ تو ان کی طرف سے صدقہ کردے۔

اسی بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

ان سعدبن عبادة توفیت وھو غایب عنھا فقال یا رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیه

وسلم ان امی توفیت وانا غائب عنها ۔أ ینفعها شئ ان تصدقت به عنها؟ ۔قال نعم ۔قال فانی اشهد ك ان حائطی المخراف صدقة علیها۔

(بخاری مصطفائی ص ۳۸۶ ج ۱) کتاب الوصایاباب الاشهاد)

سعد ابن عبادہ کی والدہ فوت ہوگئیں اور وہ غائب تھے۔تو انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ میری والدہ فوت ہوگئیں اور میں ان کے پاس موجود نہ تھا۔اگر میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ کروں تو کیا وہ انہیں نفع دیگا؟ ۔حضور نے فرمایا: ہاں ۔تو انھوں نے کہا: میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میرا باغ منخراف ان کے لئے صدقہ ہے۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

ان رجلا اتی النبی ﷺ فقال یارسول الله !ان امی افتتلت نفسها ولم تو ص واظنها لو تکلمت تصدقت اولها اجران تصدقت عنها قال نعم۔ (مسلم شریف مجتبائی دہلی ص ۳۲۴ ج ۱)

بیشک نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ !میری والدہ اچانک فوت ہوگئیں اور انہوں نے وصیت نہیں کی اور میں انہیں یہ گمان کرتا ہوں کہ اگر وہ کلام کرتیں تو صدقہ کرتیں ۔اب میں اگر ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا ان کیلئے ثواب ہے؟ حضور نے فرمایا: کہ ہاں ہے۔

طبرانی اور بیہقی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

قال رسول الله ﷺ اذا تصدق احد کم بصدقة تطوع فلیجعلها عن ابو یه فیکو ن لهما اجرها ولا ینتقص من اجره شئ۔

(شرح الصدور مصری ص ۱۲۹ وطحطاوی علی مراقی ص ۳۶۳)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم میں کوئی شخص صدقہ نفل دے تو اسے اپنے ماں باپ کی طرف سے دے تو وہ صدقہ ان دونوں کیلئے باعث ثواب ہے۔اور خود اس کے ثواب میں کچھ کمی نہوگی۔

ان احادیث سے ثابت ہوگیا کہ میت کیلئے صدقات وخیرات کرنا حکم رسول ﷺ سے ثابت ۔اور صدقہ کا ثواب میت کو پہونچتا ہے اور صدقہ کا میت کیلئے نافع ہونا بکثرت احادیث سے ثابت ہے "کما فصلنا فی فتاوٰنا الاجملیه ۔

علاوہ ازیں یہ اہلسنت کا اجماعی واتفاقی مسئلہ ہے بخوف طوالت اس وقت چند عبارات پیش کی

جاتی ہیں۔

شرح فقہ اکبر میں ہے:

عند اهل السنة ان للانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره صلوة او صوما او حجا او صدقه او غير ها۔ (شرح فقہ اکبر مصری۔ص ۱۱۸۔)

اہل سنت کے نزدیک انسان اپنے عمل نماز و روزہ حج وصدقہ وغیرہ کا ثواب اپنے غیر کو پہونچا سکتا ہے۔

حضرت امام نودی شرح مسلم شریف میں فرماتے ہیں:

ان الصدقة عن الميت تنفع الميت ويصل ثوابها وهو كذلك باجماع العلماء وقد اجمعوا على وصول الدعاء وقضاء الدين بالنصوص الواردة فى الجميع۔

(مسلم شریف مع شرح مجتبائی دہلی ص ۳۲۴ ج ۱)

بیشک میت کی طرف صدقہ کرنا اس کو نفع پہونچاتا ہے۔ اور اس کا ثواب اسے ملتا ہے۔ یہ بات اسی طرح اجماع علماء سے ثابت ہے۔ اور ایسے ہی دعا اور ادائے قرض کے پہونچنے پر علماء نے اجماع کیا کہ ان سب میں نصوص وارد ہیں۔

علامہ ابن عابد بن بحر الرائق وبدائع سے ناقل ہیں:

من صام اوصلى او تصدق وجعل ثوابها لغيره من الاموات والاحياء جاز ويصل ثوابها اليهم عند اهل السنة والجماعة۔ (ردالمحتار مصری ص ۱۳۱ ج ۱)

جس نے روزہ رکھا یا نماز پڑھی یا صدقہ دیا اور اسکا ثواب اپنے غیر مردوں یا زندوں کو پہونچائے تو جائز ہے اور ان اعمال کا ثواب اہل سنت وجماعت کے نزدیک انہیں پہونچتا ہے۔

علامہ حسن شرنبلالی مراقی الفلاح میں قول علامہ زیلعی ناقل ہیں:

فللانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره عند اهل السنة والجماعة صلوة كان او صوما او حجا او صدقة او قرأة القرآن او الاذكار او غير ذلك من انواع البر ويصل ذلك الى الميت۔ (طحطاوی مصری ص ۳۶۳۔ ج ۱)

اہل سنت کے نزدیک انسان اپنے عمل کا ثواب اپنے غیر کو پہنچا سکتا ہے۔ اب وہ عمل نماز ہو یا روزہ۔ حج ہو یا صدقہ۔ یا تلاوت قرآن یا اذکار ہوں۔ یا اسکے سوا اور نیکیوں کے اقسام ہوں۔ یہ سب

میت کو پہنچتے ہیں اور نفع دیتے ہیں۔

بالجملہ یہ آیت کریمہ اور احادیث صحیحہ اور کتب عقائد وفقہ سے ثابت ہو گیا کہ میت کیلئے روپیہ پیسہ وغیرہ سے صدقہ کرنا نہ فقط جائز بلکہ مندوب ومستحب ہے اور اس کے لئے نفع مند۔ اور سبب خوبی آخرت ہے اور اس صدقہ کا ثبوت انہیں کتاب وسنت اور اجماع امت سے ظاہر ہو چکا تو یہ بات نا قابل انکار ہے۔ کہ صدقات کے مصارف فقراء ومساکین بھی ہیں۔ علماء ومشائخ بھی اگر ضرورت مند ہیں تو اس کا دینا بہ نسبت جاہل فقراء کے زیادہ بہتر ہے۔

علامہ طحطاوی معراج اور قہستانی سے ناقل ہیں:

الصدقه علی العالم الفقیر افضل من الجاهل الفقیر۔ (طحطاوی مصری علی مراقی ص ۴۱۹)

جاہل فقیر کو صدقہ دینے سے عالم فقیر کو صدقہ دینا زیادہ بہتر ہے۔ اور اگر وہ علماء مشائخ مالدار وغنی ہیں جب بھی جائز ہے کہ میت کیلئے جو صدقات کئے جاتے ہیں یہ صدقہ نافلہ ہیں اور صدقہ نافلہ غنی ومالدار کیلئے بھی جائز ہے۔

جوہرہ نیرہ میں ہے:

ولو دفع الی الغنی صدقة التطوع جاز له اخذها (از جوہر نیرہ شرح قدوری ص ۱۳۲)

اور اگر مالدار کو صدقہ نفل دیا گیا تو اسے لینا جائز ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ میت کی طرف سے جو روپیہ پیسہ وغیر بطور صدقہ غریبوں فقیروں اور علماء ومشائخ کو دیا جاتا ہے وہ بلا شبہ جائز ہے۔ دیوبندیوں نے اگر اس کے حرام ہونے کا فتوی دیا تو قرآن کریم اور احادیث کی مخالفت کی۔ اجماع کے خلاف فتوی دیا۔ کتب عقائد وفقہ کی تصریحات کے مقابل غلط حکم لکھا۔ لہذا انکا یہ فتوی غلط وباطل ہے اس کو ہرگز ہرگز نہ مانا جائے۔ مولی تعالی انہیں ہدایت فرمائے واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۵۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

زید کے انتقال کے بعد اس کے دو بچے اور ایک بیوی باقی رہے۔ تو اس طرح سے روپیہ پیسہ

صدقہ کرنا میت کیلئے جائز ہے یا نہیں؟۔ اور اسکے جواز کی کیا صورت ہے کیا اسکی بیوی اور بچے اس طریقہ سے صدقہ کر سکتے ہیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

میت کیلئے بالغ ورثہ یا غیر وارث اجنبی لوگ اپنے مال سے جس قدر چاہیں صدقہ کر سکتے ہیں۔

علامہ ابن عابدین کتاب خانیہ سے اور وہ محیط سے ناقل ہیں:

الافضل لمن یتصدق نفلا ان ینو ی لجمیع المو منین والمو منا ت لا نها تصل الیهم ولا ینقص من اجر ہ شئی وهو مذهب اهل السنة والجماعة۔

(ردالمحتار مصری ص ۶۳۱ ج ۱)

جو شخص صدقہ نفل کرے تو اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ تمام مسلمان مرد و عورتوں کی نیت سے کرے اس لئے کہ وہ انہیں پہونچتا ہے اور اس کے ثواب میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔ یہی اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے۔

مواہب لدنیہ میں ہے

ان وصول ثواب القرآن الی المیت من قریب او اجنبی هو الصحیح کما تنفعه الصدقة والدعاء و الاستغفار بالاجماع۔ (مواہب لدنیہ مصری ص ۴۳۲ ج ۱

صحیح قول یہ ہے کہ رشتہ داروں اور اجنبی کی طرف سے میت کو تلاوت کا ثواب پہونچنا ایسا ہے جیسے میت کو صدقہ اور دعائے استغفار باجماع نفع دیتے ہیں۔

یہی علامہ قسطلانی امام رافعی وامام نووی کا قول نقل فرماتے ہیں:

یستو ی فی الصدقة والدعا ء الوارث والاجنبی۔

(مواہب۔ ج ۱)

صدقہ اور دعا میں رشتہ دار و اجنبی دونوں برابر ہیں۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ اہلسنت و جماعت کا یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ میت کے لئے صدقات واعمال صالحہ کا ایصال ثواب ورثہ اور اجانب سب کی طرف سے بلاشبہ جائز و درست ہے اور انہیں یہ ثواب پہونچتا ہے۔

اب باقی رہا یہ امر کہ خود میت کے ترکہ سے بھی اسے ایصال ثواب کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟۔ تو اس میں اصح قول یہ ہے کہ اگر ورثہ بالغ ہوں اور کل ورثہ موجود ہوں اور سب اس ترکہ سے صدقہ کرنے کی اجازت دیں تو بلا شک جائز ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

وفی کل موضع یحتاج الی الاجازۃ انما یجوز اذا کان المجیز من الاجازۃ نحو ما اذا اجازہ وھو بالغ عاقل صحیح ۔ (فتاوی عالمگیر مجیدی کانپور ص ۲۲۳)

ہر اس مقام میں جس میں اجازت کی حاجت ہو تو جائز ہے جب کہ اجازت دینے والا اجازت کا اہل ہو۔ جیسے کسی شی کی اجازت دی اور اجازت دینے والا عاقل بالغ ہے تو صحیح ہے۔

حضرت امام برہان الدین مرغینانی ہدایہ میں فرماتے ہیں:

ان الامتناع لحقھم فتجوز باجازتھم ولو اجاز بعض ورد بعض تجوز علی المجیز بقدر حصتہ لو لایتہ علیہ وبطل فی حق الراد۔ (ہدایہ ص ۳۵۸ ج ۴)

بیشک منع کرنا حق ورثہ کیوجہ سے ہے تو ان کی اجازت سے جائز ہے اور اگر بعض ورثہ نے اجازت دی اور بعض نے انکار کیا تو اجازت دینے والے کے مقدار حصہ میں جائز ہے کہ وہ اپنے حصہ کا مالک ہے۔ اور انکار کرنے والے کے حق میں باطل ہے۔

اور اگر ورثہ بالغ ہیں لیکن بعض نے ترکہ سے صدقہ کرنیکی اجازت دی اور بعض نے اجازت نہیں دی تو جن بعض نے اجازت دی ان کے حصہ سے ہدیہ کرنا بھی بلا شبہ جائز ہے۔

عالمگیری میں ہے:

ولو اجاز البعض ورد البعض یجوز علی المجیز بقدر حصتہ وبطل فی حق غیر۔
(عالمگیری ص ۲۲۳ ج ۴)

اگر بعض ورثہ نے اجازت دی اور بعض نے انکار کیا تو اجازت دینے والے کے حصے کی مقدار نیز جائز ہے اور دوسرے کے حق میں باطل ہے۔

علامہ ابن عابدین ردالمحتار میں علامہ سائحانی سے اور علامہ مقدسی سے ناقل ہیں:

اذا اجاز بعض الورثۃ جاز علیہ بقدر حصتہ۔ (ردالمحتار مصری ص ۴۳۰)

جب بعض ورثہ نے اجازت دی تو اس کے حصہ کی مقدار میں اس پر تصرف جائز ہے۔

اور اگر بعض ورثہ بالغ تو ہیں لیکن موجود نہیں بلکہ غائب ہیں۔ یا نابالغ صغیر ہیں، تو پھر ترکہ سے صدقہ کرنا جائز نہیں۔

حجۃ الاسلام امام ابوبکر رازی احکام القرآن میں فرماتے ہیں:

ان حضر بعض الورثة وفيهم غائب او صغير انه يعطى الحاضر نصيبه من الميراث ويمسك نصيب الغائب والصغير۔ (احکام القرآن جلد دوم ص ۸۶)

اگر بعض ورثہ موجود ہیں اور ورثہ میں بعض غائب یا نابالغ ہیں تو موجود ترکہ سے اپنے حصے کو دے سکتا ہے۔ اور غائب ونابالغ کے حصے کو نہ دیگا۔

عالمگیری میں ہے:

ان اتخذ طعاما للفقراء كان حسنا اذا كانت الورثة بالعين فان كان فى الورثة صغير لم يتخذ واذلك من التركة۔ (عالمگیری جلد دوم ص ۱۰۶۔

اگر فقراء کے لئے کھانا پکوایا تو حسن ہے۔ جب کے ورثہ بالغ ہوں اور اگر ورثہ نابالغ ہوں تو کھانا نہ تیار کرائیں یہ حکم جب ہے کہ ترکہ سے کھانا تیار کرایا جائے اس تفصیل کے بعد صورت مسئولہ میں ترکہ زید کے وارث اگر یہی دو بچے اور ایک بی بی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ دو بچے نابالغ ہونگے تو ان کے حصوں سے میت کے لئے صدقہ نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ جب بالغ وارث ہوں اور وہ ترکہ میں اپنے حصہ سے یا اپنے اور مال سے میت کے لئے صدقہ کریں تو اس کو ناجائز وحرام کون کہہ سکتا ہے۔ دیوبندی اکثر غلط مسائل بتا کر عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔ مولی تعالی انہیں عقل وفہم عطا فرمائے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۵۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

بنگال میں محفل میلا دوتقاریر کی مجالس میں بآواز بلند سرکار دوعالم نور مجسم حبیب کبریا ﷺ پر دورد وسلام پڑھا جاتا ہے۔ اس طریقے سے بآواز بلند پڑھنے کو فتوی حدیثیہ اور تفسیر روح البیان میں جائز لکھا ہے۔ لیکن دیوبندی ملعونوں نے اس کو بدعت وناجائز قرار دیا ہے۔ اس کے واسطے کیا حکم ہے؟۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

حضور نبی کریم ﷺ پر درود وسلام پڑھنے کا حکم قرآن کریم میں خود اللہ تعالی دیتا ہے۔ اور اس کو خود اپنا فعل اور فرشتوں کا فعل ظاہر فرماتا ہے۔

ان اللہ وملئکته یصلون علی النبی یا یها الذین اٰمنو ا صلو اعلیه وسلمو اتسلیما ۔
(سورہ احزاب ع ۷ ح ۲۲)

بیشک اللہ اور اس کے فرشتے اس نبی پر درود وسلام بھیجتے ہیں اے ایمان والوتم بھی ان پر درود وسلام بھیجو۔ اور خوب سلام بھیجو۔

آیت کریمہ کے تحت علامہ سلیمان جمل الفتوحات الالہیہ حاشیہ تفسیر جلالین میں فرماتے ہیں۔

هذه الآية دليل على وجو ب الصلوة و السلام عليه مطلق۔ (جمل جلد سوم ص ۴۵۴)

یہ آیت مطلقا درود وسلام کے واجب ہونے پر دلیل ہے۔

تحت آیت کریمہ علامہ عارف باللہ شیخ احمد صادری مالکی صاوی حاشیہ جلالین میں فرماتے ہیں:

اعلم ان العلماء اتفقوا على وجوب الصلاة والسلام على النبي ﷺ ثم اختلفوا فی تعین الوجوب فعند مالك تجب الصلاة والسلام فی العمر مرة وعند الشافعی تجب فی التشهد الاخیر من کل فرض وعن غیر هما تجب فی کل مجلس مرة وقیل تجب عند ذکر ہ وقیل تجب فی الاکثار منها من غیر تقیید بعد دفالصلوة علی النبی ﷺ امرها عظیم وفضلها جسیم وهی من افضل الطاعات واجل القربات ۔ (صاوی مصری ص ۲۳۸ ج ۳)

جانو کہ علماء نے حضور نبی کریم ﷺ پر درود وسلام کے واجب ہونے پر اتفاق کیا ہے۔ پھر انہوں نے تعیین واجب میں اختلاف کیا۔ تو امام مالک کے نزدیک درود وسلام عمر میں ایک بار واجب ہے۔ اور امام شافعی کے نزدیک ہر فرض کے اخیر تشہد میں واجب ہے۔ اور ان کے سوا اور علماء کے نزدیک ہر مجلس میں ایک مرتبہ واجب ہے۔ اور بعض نے کہا کہ حضور ﷺ کے ذکر کیوقت واجب ہے۔ اور بعض نے کہا کہ بغیر قید عدد کے اس کی کثرت کرنا واجب ہے۔ پس حضور پر درود بھیجنا بڑا امر اور زبردست فضل ہے۔ اور وہ بہتر طاعتوں اور اعلی قربتوں میں سے ہے۔

حجۃ الاسلام ابوبکر رازی احکام القرآن میں اس آیت کے تحت میں فرماتے ہیں:

قد تضمن الامر بالصلاۃ علی النبی ﷺ وظاھرہ یقتضی الوجوب وھو فرض عندنا۔ (حکام القرآن مصری ص ۴۵۶ ج ۳)

حضور نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجنے کے امر پر مشتمل ہے۔ اسکا ظاہر وجوب کا تقاضا کرتا ہے۔ اور وہ ہمارے نزدیک فرض ہے۔

علامہ ابوالبرکات عبداللہ نسفی تفسیر مدارک التنزیل وحقائق التاویل میں فرماتے ہیں:

صلوا علیہ۔ ای قولوا اللھم صل علی محمد او صلی اللہ علی محمد۔ وسلموا تسلیما ۔ ای قولوا اللھم سلم علی محمد ۔ثم ھی واجبۃ مرۃ عند الطحطاوی و کلما ذکر اسمہ عندالکرخی وھو الاحتیاط وعلیہ الجمہور۔ (ملخصا تفسیر مالک مصری ص ۲۳۹ ج ۳)

(تم نبی پر درود بھیجو) یعنی تم کہو اے اللہ تو حضور محمد ﷺ پر درود بھیج ۔ یا اللہ حضرت محمد ﷺ پر درود بھیج ۔ اور تم خوب سلام بھیجو۔ یعنی کہو اے اللہ تو حضرت محمد ﷺ پر سلام بھیج ۔ پھر درود وسلام امام طحاوی کے نزدیک ایک مرتبہ واجب ہے۔ اور امام کرخی کے نزدیک جب حضور ﷺ کا نام ذکر کیا جائے اور احتیاط اسی میں ہے اور اسی پر جمہور ہیں۔

حضرت شیخ احمد ملا جیون نے تفسیر احمدی میں قول امام کرخی کو مفتے بہ کہا اور اسی پر اجماع کو نقل کیا۔

واجمعو اعلی ان الاخیر ھو الاحتیاط علیہ الجمھور۔ (احمدی ص ۳۴۹ ج ۲)

علماء نے اجماع کیا ہے کہ اخیر قول (یعنی قول امام کرخی) احتیاطی قول ہے اور اسی پر جمہور ہیں۔

اس آیت کریمہ اور اس کی تفاسیر سے ثابت ہو گیا کہ حضور اکرم ﷺ پر درود وسلام پڑھنا واجب ہے یہ اتفاقی اجماعی مسئلہ ہے۔ اتنی بات میں علماء مختلف نہیں۔ اور علما کا جو اختلاف منقول ہے وہ درود وسلام کے وقت اور عدد میں ہے اور ان اقوال میں امام کرخی کے قول میں بہت احتیاط ہے۔ یہی جمہور کا مسلک ہے۔ اسی پر علماء کا اتفاق ہوا۔ اور وہ یہ ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ کا نام نامی ذکر کیا جائے یا سنا جائے تو درود وسلام پڑھا جائے۔ محافل میلاد شریف ومجالس وعظ میں چونکہ بکثرت نام نامی ذکر کیا جاتا ہے اور سنا جاتا ہے تو ان میں درود وسلام کو بکثرت ہی پڑھا جائے گا۔ اور درود شریف کو ہر مجلس میں پڑھنے اور ذکر شریف پر ہر مرتبہ پڑھنے اور اس کی کثرت کرنے کا حکم احادیث میں ہے۔

بخاری ومسلم میں حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قلنا یا رسول اللہ کیف الصلوۃ علیکم اھل البیت فان اللہ قد علمنا کیف نسلم

علیك قال: قولو ا اللهم صلی علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراهیم وعلی آل ابراهیم انك حمید مجید الحدیث ۔ (مشکوۃ شریف ۔ص ۸٦)

ہم نے عرض کیا یارسول اللہ! اے اہل بیت نبوت ہم تم پر درود کس طرح بھیجیں کہ اللہ نے ہمیں آپ پرسلام بھیجنے کی کیفیت تعلیم کی ۔ فرمایا: تم یوں کہو اللھم صل علی محمد ۔ الخ ۔ اے اللہ حضرت محمد اوران کی آل پر درود بھیج جیسا کہ تو نے حضرت ابراہیم اوران کی آل پر دورد بھیجا، بیشک تو حمد کیلئے ہے اور بزرگی والا ہے۔

صحیح مسلم شریف حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے۔

قال رسول الله ﷺ :من صلی علی واحدة صلی الله تعالیٰ علیه عشرا۔
(مشکوۃ شریف ص ۸٦)

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جوشخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا تو اللہ تعالی اس پر دس بار رحمت بھیجے گا۔

ترمذی شریف میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ ۔سے مروی ہے کہ۔

قال رسول الله ﷺ اولی النا س بی یوم القیمة اکثرهم علی صلو ة۔
(مشکوۃ شریف ص ۸٦)

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: روز قیامت مجھ سے قریب تر لوگوں کا ان میں مجھ پر زیادہ درود پڑھنے والا ہوگا۔

ترمذی شریف میں حضرت ابن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال قلت یا رسول الله! انی اکثر الصلوة علیك فکم اجعل لك من صلو تی فقال ماشئت قلت الرابع، قال ما شئت ۔ فان زدت فهو خیر لك۔ قلت النصف، قال ما شئت فان زدت فهو خیر لك، قلت ما فالثلثین ، قا ل ما شئت فان زدت فهو خیر لك ۔قلت اجعل لك صلو تی کلها قال اذا یکفی همك ویکفرلك ذنبك۔
(مشکوۃ ص ۸٦)

حضرت ابن کعب رضی اللہ تعالی عنہ نے کہا میں نے عرض کیا یارسول اللہ میں آپ پر بکثرت درود بھیجنا چاہتا ہوں ۔تو آپ پر درود بھیجنے کیلئے کتنا وقت مقرر کروں؟ ۔حضور نے فرمایا جس قدر چاہے۔ میں

نے عرض کیا: چوتھائی تو فرمایا جتنا چاہے۔ اگر چوتھائی سے زائد وقت صرف کرے تو وہ تیرے لئے اور بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا: دو تہائی وقت فرمایا: جتنا چاہے اور اگر اس پر اور زیادہ کرے تو وہ تیرے لئے اور بہتر ہے۔ میں عرض کیا: کہ میں آپ پر درود بھیجنے کیلئے اپنے تمام اوقات دعا صرف کردوں۔ فرمایا: جب تو تیرے مقدر دینی ودنیوی کو کافی ہے۔ اور تیرے ظاہر وباطن گناہوں کو میٹ دیگا۔

ترمذی شریف میں حضرت مولیٰ علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول الله ﷺ البخيل الذی من ذكر ت عنده فلم يصل علیّ۔

(مشکوۃ شریف ص ۸۷)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سخت بخیل وہ ہے جسکے سامنے میرا ذکر کیا جائے تو وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔

ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول الله ﷺ رغم انف رجل ذكر عنده فلم يصل علی الحديث۔

(مشکوۃ ص ۸۶)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ذلیل وہلاک ہو وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے پس وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔

ابن السنی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی:

من ذكر ت عنده فلم يصل علی فقد شقی ۔ (جامع صغیر مصری ص ۱۵۴ ج ۲)

جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے وہ مجھ پر درود نہ بھیجے تو وہ بد بخت ہوگیا۔

طبرانی میں حضرت ابن عباس اور حضرت انس اور حضرت عبد اللہ بن حارث اور کعب ابن عجرہ اور مالک ابن حویرث رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اور بزار نے حضرت جابر اور حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عمار سے روایت کی۔

ان النبی ﷺ صعد المنبر فقال آمين، ثم صعد درجة فقال آمين، ثم صعد درجة فقال آمين، فسا له معاذ عن ذلك فقال ان جبرائيل أتانی فقال يا محمد من سميت بين يديه فلم يصل عليك فما ت فدخل النا ر فابعد ه الله تعالی ـ قل آ مين فقلت آمين ـ الخ۔

(شفا قاضی عیاض وشرح لعلی القاری مصری ص ۱۳۹ ج ۲)

بیشک نبی اکرم ﷺ منبر پر رونق افروز ہوئے اور فرمایا آمین ۔ پھر ایک سیڑھی پر چڑھے اور فرمایا

آمین۔ اور سیڑھی پر چڑھے اور فرمایا آمین۔ تو حضرت معاذ نے آمین کہنے کا سبب دریافت کیا تو حضور نے فرمایا کہ جبرئیل نے میرے پاس آکر کہا کہ اے محمد ﷺ جس کے سامنے آپ کا نام ذکر کیا جائے اور وہ آپ پر درود نہ پڑھے پھر وہ مرجائے تو وہ جہنم میں داخل ہوگا اور اللہ تعالی اس کو اپنی رحمت سے دور رکھے گا۔ آپ آمین کہیں تو میں نے آمین کہا۔

ترمذی شریف وابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ وابوسعید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

ما حبس قوم مجلسا لم يذكر واالله تعالى فيه ولم يصلوا على نبيهم الاكان عليهم ترة فان شاء عذبهم وان شاء غفر لهم۔

(جامع صغیر مصری ص۱۲۲ ج۱۔ شرح شفا ۱۴۱ ج۲)

کوئی قوم کسی محفل میں بیٹھے اور اس میں ذکر الہی نہ کرے اور اپنے نبی کریم ﷺ پر درود نہ پڑھے تو نقصان وخسارہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اسے عذاب دیگا اور چاہے گا تو اس کی مغفرت کریگا

ابوداؤد طیالسی اور ضیاء مقدسی حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی اور بیہقی میں بھی انھیں سے روایت کی ہے:

ما اجتمع قوم ثم تفرقوا عن غير ذكر الله وصلاة على النبى ﷺ قاموا عن انتن من جيفة۔

(جامع صغیر مصری ص۱۱۹ ج۲ شرح شفا مصری ص۱۴۱ ج۲)

ایک قوم کسی مجلس میں جمع ہوئی پھر وہ بغیر ذکر الہی اور بغیر نبی کریم ﷺ پڑ درود پڑھے مجلس سے جدا ہوئی وہ گویا بہت بدبودار مردار سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ان احادیث سے ثابت ہوگیا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے بھی درود وسلام پڑھنے کا حکم دیا۔ اور انہیں وصول رحمت الہی کا سبب ٹھرایا اور اپنے قرب کا وسیلہ ٹھیرایا اور ان کی کثرت کو حصول مقاصد کیلئے کافی بتایا۔ اور کفارہ ذنوب کیلئے بہترین ذریعہ ٹھرایا اور بوقت ذکر صلاۃ وسلام بہ پڑھنے والے کو بخیل کہا اور ذلیل وبدبخت فرمایا اور جسکی نظر میں درود کی قدر منزلت نہو وہ رحمت حق سے بعید اور مستحق عذاب شدید قرار پایا۔ اور جس مجلس میں ذکر الہی اور درود شریف نہ پڑھا جائے اس کو ناقص اور قابل ملامت قرار دیا اور ان اہل مجلس کو خاسر وبدبودار مردار کے پاس سے کھڑا ہونیوالا ٹھرایا۔

بالجملہ آیۃ کریمہ اور تفاسیر واحادیث سے یہ ثابت ہوا کہ مجالس وعظ ومیلاد شریف میں جب

جس قدر نبی کریم ﷺ کا نام نامی اور ذکر پاک کیا جاتا ہے تو ان مجالس کے حقوق و آداب میں یہ ہیں کہ ان میں بکثرت درود وسلام کا ورد رکھا جائے۔ ذاکرین وسامعین سب اس میں مشغول رہیں کہ اہل مجلس بخل وذلت اور نقصان وشقاوت کے وبال سے بچیں اور رحمت الہی قرب رسالت پناہی کی نعمت کے حقدار بنیں اور عفو معاصی وحصول مقاصد کی دولت سے سرفراز ہو جائیں۔ اسی بناء پر ذاکر وواعظ اہل مجلس کو درود وسلام کی بکثرت بار بار ترغیب دیتا ہے۔

چنانچہ الاشباہ والنظائر میں ہے:

العالم اذاقال فی المجلس صلواعلی النبی فا نه یثاب علی ذلک ۔

(الاشباہ والنظائر مع شرح حموی س ۳۹)

جب عالم نے مجلس میں کہا تم نبی ﷺ پر درود بھیجو تو اسے اس حکم کرنے پر ثواب دیا جائیگا۔

الحاصل آیت کریمہ اور اس کی تفاسیر اور کثیر احادیث سے مجالس میں درود پڑھنے کی کس قدر اہمیت ثابت ہوئی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ وعظ ومیلاد شریف کی محافل بھی مجالس ہی ہیں تو ان میں بھی درود وسلام پڑھنا انہیں نصوص سے ثابت ہوا۔ اور فقہ کی کتاب الاشباہ والنظائر سے تو یہ بھی ثابت ہو گیا کہ مجلس میں عالم وذاکر درود شریف کا حکم بھی دے سکتا ہے۔ تو اب دیوبندی ناجائز وبدعت کس چیز کو قرار دیتا ہے۔ اگر اس کو ناجائز وبدعت کہتا ہے تو کیا اس کے نزدیک ناجائز وبدعت وہ ہے جس کا قرآن وحدیث نے حکم دیا ہے۔ مولی تعالی انہیں قبول حق کی توفیق دے۔

اور اگر یہ کہے کہ مجلس میں درود وسلام کی کثرت کو ناجائز وبدعت نہیں کہتا بلکہ اس کے بلند آواز سے پڑھنے کو بدعت وناجائز کہتا ہوں تو اسکا یہ قول بھی غلط وباطل ہے کہ احادیث میں قرآن واذکار کا بلند آواز سے پڑھنا مروی ہے۔

ابوداؤد شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

کانت قرأة النبی ﷺ باللیل یر فع طورا ویخفض طورا۔ (ابوداؤد شریف ص ۱۹۴ ج ۱)

حضور نبی کریم ﷺ رات میں قرآت کبھی بلند آواز سے پڑھتے۔ کبھی پست آواز سے پڑھتے یعنی نماز تہجد میں)

ترمذی شریف میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ان النبی ﷺ قال لا بی بکر مررت بک وانت تقرأوانت تخفض من صوتک فقال

انی اسمعت من نا جیت قال ارفع قليلا وقال لعمر مررت بك وانت تقرأ وانت ترفع صوتك ،فقال انی او قظ الوسنا ن واطرد الشيطان قال اخفض قليلا۔

(ترمذی ص ۶۹ ج ۱)

بیشک نبی ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: میں تمہارے قریب ہو کر گذرا، اور تم پست آواز سے قرأت کرر ہے تھے۔ عرض کیا: میں جس سے مناجات کرر ہا تھا اسی کو سنا رہا تھا ،فرمایا: تم کچھ بلند آواز سے پڑھو، حضور نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: میں تمہارے پاس سے گذرا اور تم بلند آواز سے قرأت کرر ہے تھے، عرض کیا: میں سونے والوں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا۔ فرمایا: تم کچھ پست آواز کرو۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ رعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

کان رسول الله ﷺ اذا سلم من صلوته يقول بصوته الاعلیٰ :لا اله الا الله وحده لا شيك له ،له الملك وله الحمد وهو على كل شئ قدير الحديث۔ (مشکوۃ شریف ص ۸۸)

حضور نبی کریم ﷺ جب اپنی نماز کا سلام کرتے تھے تو بلند آواز سے یہ فرماتے تھے **لا الــه الا الله وحده لا شريک له الخ۔**

اسی مسلم شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ عبد بن عباس رضی اللہ عنہ نے روایت کی۔

ان رفع الصوت بالذكر حين ينصرف النا س من المكتوبة كا ن على عهد النبی ﷺ قال ابن عبا س كنت اعلم اذاانصرفوا بذلك اذا سمعته۔

(مسلم شریف مع نووی ص ۲۱۷)

زمانۂ حضور نبی کریم ﷺ میں جب لوگ اپنی نماز فرض سے فارغ ہوتے تو بلند آواز سے ذکر کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب میں ذکر کی آواز سن لیتا تو جان لیتا تھا کہ لوگ نماز سے فارغ ہو چکے (یعنی ذکر کی آواز سے جماعت فرض کا ختم ہونا معلوم ہو جاتا)

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ تنہا نماز پڑھنے والے کو بھی بلند آواز سے قرآت کرنا چاہیے خود حضور ﷺ نے بلند آواز سے قرأت پڑھی۔ اسی طرح نماز سے فراغت کے بعد حضور نبی کریم ﷺ بلند آواز سے ذکر پڑھتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ زمانہ اقدس میں جب میں بلند آواز سے ذکر سن لیتا تو سمجھ لیتا کہ لوگ جماعت سے فارغ ہو گئے۔

علامہ شیخ احمد طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح میں اسی حدیث مسلم شریف نقل فرما کر لکھتے ہیں:

ویستفاد من الحدیث الاخیر جواز رفع الصوت بالذکر والتکبیر عقیب المکتوبات بل من السلف من قال باستحبا به۔ (طحطاوی مصری ص ۱۸۱۔)

فرضوں کے بعد ذکر وتکبیر کے بلند آواز سے پڑھنے کا جواز حدیث اخیر سے مستفاد ہوا بلکہ سلف میں سے بعض نے اسکا مستحب ہونا بیان فرمایا۔

علامہ سید احمد حموی شرح الاشباہ والنظائر میں عبدالوہاب شعرانی کی کتاب بیان ذکر الذاکر للمذکور سے ناقل ہیں:

اجمع العلماء سلفا وخلفا علی استحباب ذکر اللہ تعالی جماعۃ فی المساجد وغیرہ من غیر نکیر الا ان یشوش جھرھم بالذکر علی نائم او مصل او قاری کما ھو مقرر فی کتب الفقہ۔ (حموی کشوری ص ۵۶۰)

علماء سلف وخلف نے مسجد وغیر مسجد میں جمع ہوکر ذکر اللہ کے بجہر مستحب ہونے پر بلاخلاف اجماع کیا۔ہاں جب انکا بآواز بلند ذکر کرنا سونیوالے یا نماز پڑھنے والے یا قرأت کرنے والے کیلئے خلل انداز ہو جیسا کہ کتب فقہ میں موجود ہے۔

علامہ ابن عابدین ردالمحتار میں فتاوی بزازیہ سے ناقل ہیں:

امارفع الصوت بالذکر فجائز کما فی الاذان والخطبۃ والجمعہ والحج۔
(درالمختار ص ۲۶۳ ج ۵۔)

ذکر کا باآوز بلند کرنا جائز ہے جیسے اذان وخطبہ وجمعہ وحج میں۔

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ ذکر کا بلند آواز سے کرنا نہ فقط جائز بلکہ سلف وخلف کے علماء نے بلاخلاف اس امر پر اجماع کیا ہے کہ مساجد وغیر مساجد میں ذکر کا بلند آواز سے کرنا مستحب ہے۔ہاں اگر سونے والے یا نماز پڑھنے والے یا قرات کرنیوالے کیلئے مخل ہو تو پست آواز سے کیا جائے۔

اب باقی رہی یہ بحث کہ ذکر جہر افضل ہے یا ذکر خفی۔ تو اسکا فیصلہ شیخ الاسلام علامہ خیر الدین رملی نے اس طرح فرمایا۔

فتاوی خیریہ میں ہے:

وھناک احادیث اقتضت طلب الاسرار والجمع بینھما بان ذلک تختلف با

ختلاف الا شخاص والا حوال كما جمع بين الاحاديث الطالبة للجهر با لقرأة والطالبة للاسرار بها ولا يعارض ذلك خيرالذ كر الخفى لانه جيث خيف الريا او تا ذى المصلين او النيا م والجهر ذ كر بعض اهل العلم انه افضل حيث خلامما ذ كر لا نه اكثر عملا ولتعدى فائدته الى السامعين ويو قظ قلب الذاكر فيجمع همه الى الفكر ويصرف سمعه اليه ويطرد النوم ويزيد النشاط ۔

(خیریہ مصری ص ۱۸۱ ج ۲)

اور یہاں ایسی احادیث بھی ہیں جو پست آواز کا مطالبہ کرتی ہیں اور ہر دو قسم کی احادیث میں توافق یہ ہے کہ حکم شخصوں اور حالتوں کے اختلاف سے مختلف ہو جاتا ہے جس طرح کے قرأت کی بلند آواز سے طلب کرنے والی اور پست آواز سے طلب کرنے والی حدیثوں میں توافق کیا جاتا ہے۔ اس کا معارضہ نہ کیا جائے۔ یا نمازیوں یا سونے والوں کو اذیت دے۔ اور جس جگہ یہ باتیں نہ ہوں تو بعض اہل علم نے فرمایا کہ وہاں بلند آواز سے ذکر کرنا افضل ہے کہ اس میں یہ کثیر اعمال ہیں کہ اس کا فائدہ سامعین تک پہونچتا ہے اور قلب ذاکر کو بیدار رکھتا ہے اور اس کی توجہ فکر کو جمع رکھتا ہے اور نیند کو دور کرتا ہے اور نشاط کو زائد کرتا ہے۔

علامہ ابن حجر مکی کے فتاوی حدیثیہ میں ہے:

بعضهم يختار الجهر لد فع الوسواس الردية والكيفيا ت النفسانية ولايقاظ الغافلة واظها ر الاعما ل الكاملة ۔ (حدیثیہ مصری ص ۵۶)

بعض نے بلند آواز کی وسوسوں اور نفسانی کیفیتوں کے دفع کرنے کے لئے اور غافل قلبوں کے بیدار کرنے اور کامل عملوں کے ظاہر کرنے کے لئے اولی قرار دیا۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ خلاصہ تحقیق یہ ہے۔ جب بلند آواز سے ذکر کرنے میں ریا کا خوف اور نمازیوں اور سونے والوں کو تشویش نہ ہو تو ذکر خفی سے ذکر جلی ہی افضل ہے کہ اس میں کثیر منافع ہیں اور اس ذکر جلی کا فائدہ تمام سامعین کو پہونچتا ہے۔ اور ذاکر کے قلب کو بیدار کرتا ہے۔ اس کی فکر کو منتشر نہیں ہونے دیتا۔ سماعت کو اپنی طرف متوجہ رکھتا ہے۔ نیند کو دور کرتا ہے۔ خوشی کو زائد کرتا ہے۔ ردی وسوسوں اور نفسانی کیفیتوں کو دفع کرتا ہے۔ غافل قلبوں کو جگاتا ہے۔ کامل عملوں کو ظاہر کرتا ہے۔ لہذا ان وجوہ کی بنا پر بلند آواز سے ذکر کرنا افضل ثابت ہوا۔

اب یہ امر اور باقی رہتا ہے کہ مجمع میں بھی بلند آواز سے ذکر کیا جائے یا نہیں۔ تو حضرت شیخ الاسلام علامہ خیر الدین رملی نے یہ فتوی دیا۔

فتاوی خیریہ میں ہے:

والذکر فی الملاء لا یکون الاعن جہر وکذا حلق الذکر وطواف الملائکۃ بہا وما ورد فیہا من الاحادیث فان ذلک انما یکون فی الجہر بالذکر۔

(خیریہ مصری ص ۱۸۱ ج ۲)

مجمع میں تو ذکر بلند آواز سے ہی ہو۔ اسی طرح ذکر کے حلقے اور ملئکہ کا جو طواف احادیث میں وارد ہوا تو وہ بلند آواز ہی کے ذکر پر ہوتا ہے۔

علامہ ابن عابدین نے رد المحتار میں اور سید احمد حموی نے شرح الاشباہ میں حجۃ الاسلام امام غزالی کا یہ قول نقل کیا:

قد تبیہ الامام الغزالی ذکر الانسان وحدہ وذکر الجماعۃ باذان المنفرد واذان الجماعۃ کما قال فکما ان اصوات المؤذنین جماعۃ تقطع جرم الھواء اکثر من صوت المؤذن الواحد کذالک ذکر الجماعۃ علی قلب واحد اکثر تاثیرا فی رفع الحجب الکثیفۃ من ذکر شخص واحد۔ (رد المحتار مصری ص ۲۶۳ ج ۵ (حموی ص ۵۶۰)

امام غزالی نے ایک شخص کے ذکر کرنے اور جماعت کے ذکر کرنے کی تشبیہ ایک شخص کی اذان اور جماعت کی اذان سے دی۔ فرمایا جبکہ چند اذان کہنے والوں میں آوازیں ایک موذن کی آواز سے جرم ہوا کو زیادہ قطع کرتی ہیں۔ اسی طرح جماعت کا ذکر کرنا ایک شخص کے ذکر کرنے سے زیادہ قلب کے کثیف حجابات اٹھانے میں مؤثر ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ مجمع میں تو بلند آواز ہی سے ذکر کیا جائے۔ اور ایک شخص کے ذکر سے جماعت کا بلند آواز سے ذکر کرنا قلب کے کثیف حجابات کے رفع کے لئے زیادہ مؤثر ہے۔

حاصل کلام یہ لے کہ درود وسلام بھی منجملہ اذکار کے ایک ذکر ہی ہے۔ تو جب ذکر کا بلند آواز سے کرنا جائز ومستحب قرار پایا اور یہ خفی سے افضل ثابت ہوا۔ اور مجمع میں بلند آواز ہی سے ذکر کرنا تصریح سے ظاہر ہوا تو درود وسلام کا بھی بلند آواز ہی سے پڑھنا جائز ومستحب ٹھہرا۔ اور اس کا بلند آواز سے پڑھنا

افضل قرار پایا۔ اور اس کو مجمع میں تو بلند ہی آواز سے پڑھا جائے۔ تو اب دیوبندی مجالس وعظ ومحافل میلاد شریف میں درود وسلام کے بلند آواز سے پڑھنے کو ان تصریحات کے مقابلہ میں کس دلیل سے ناجائز وبدعت کہتا ہے۔ کیا دیوبندیوں کے نزدیک بدعت وناجائز وہ ہے جو احادیث سے جائز ثابت ہو جس کو سلف وخلف افضل قرار دیں۔ جس کے استحباب پر فقہاء اجماع منعقد کریں۔ جس کے علماء اکثر منافع وفوائد شمار کرائیں۔ مولی تعالی ان کو قلب سلیم وفہم مستقیم عطا فرمائے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۵۵)

بنگال میں رواج ہے کہ سال میں ایک مرتبہ یا کئی مرتبہ مولویوں وغیرہ کو قبرستان میں لیجا کر مردہ کے واسطے ایصال ثواب کیا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد ان کو کھانا بھی کھلایا جاتا ہے اور روپیہ پیسہ بھی صدقہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح ایصال ثواب کرنا۔ مولویوں وغیرہ کو کھانا کھلانا اور صدقہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔ دیوبندی حضرات اس کو بھی ناجائز بتلاتے ہیں۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

قبرستان میں جانے کا حکم اور زیارت قبور کی ترغیب خود کثیر احادیث میں وارد ہے۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول الله ﷺ نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها (الحديث)۔

(مشکوۃ شریف ص ۱۵۴)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے تمہیں پہلے زیارت قبور سے منع کیا تھا پس اب تم زیارت قبور کیا کرو۔

سنن ابن ماجہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ان رسول الله ﷺ قال كنت نهيتكم عن زيارة القبر فزوروها فانها تزهد فى الدنيا وتذكر الاخره۔

(مشکوۃ ص ۱۵۴)

بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے تمہیں پہلے زیارت قبور سے منع کیا تھا پس اب تم

زیارت قبور کرو کہ وہ دنیا میں زہد پیدا کرتی ہیں اور آخرت کو یاد دلاتی ہیں۔

بیہقی شریف میں حضرت ابن نعمان رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے:

قال رسو ل اللہ ﷺ من زار قبر ابو یه او احدهما فی کل جمعة غفر له و کتب برا۔

(مشکوۃ شریف۔ ص ۱۵۴)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اپنے ہر دو ماں باپ یا ایک کی قبر کی زیارت کرے ہر جمعہ کو تو اس کی مغفرت کردی جائیگی اور ماں باپ کو رضا مند کرنے والا لکھا جائیگا۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

کان رسول ﷺ کلما کا ن لیلتها من رسو له ﷺ یخرج من آخر الیل الی البقیع فیقول السلام علیکم دار قوم مومنین واتا کم ما تو عدون غداوانا انشاء الله بکم لا حقون اللهم اغفرهالا هل بقیع الغرقد (مسلم مع نووی ص ۳۱۳ ج ۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جب حضور ﷺ کی میری رات ہوتی تو آخر رات میں بقیع تشریف لیجاتے تو فرماتے السلام علیکم دار قوم مو منین تمہیں جو وعدہ کیا گیا تھا کل کیلئے وہ مل گیا اگر اللہ چاہے گا تو ہم تمہارے ساتھ لاحق ہونیوالے ہیں۔ اے اللہ تو اہل بقیع غرقد کی مغفرت فرما۔

مسلم شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک طویل حدیث مروی ہے جس میں حضور علیہ السلام کے بقیع شریف جانے کا واقعہ ہے اور وہ ان کی مقررہ شب تھی، حضور نے اپنی جانیکی وجہ یہ بیان فرمائی۔

فان جبرئیل علیه السلام اتانی حین رأیت فتادانی فا خفاه منك فا جبته فا خفیته منك ولم یکن یدخل علیك وقد وضعت ثیابك وظننت ان قد ر قدت فکرهت ان او قظك وخشیت ان تستوحشی فقال ان ربك یا مر ك ان تاتی اهل البقیع فتستغفر لهم قالت قلت کیف اقول لهم یار سول الله صلی الله تعالی علیه وسلم، قال قولی السلام علیکم علی اهل الدیا ر من المو منین۔الحدیث (مسلم۔ص ۳۱۴ ج ۱)

بیشک جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آئے جس وقت تو نے اے عائشہ دیکھا تھا تو انہوں نے تجھے پکارا۔ پس میں نے اس کو تم سے چھپایا اور اس کی اجابت کی تو اس نے اس کو تم سے پوشیدہ رکھا اور

چونکہ تو اپنے کپڑے اتار چکی تھی اسلئے تمہارے پاس نہیں آئے اور میں نے خیال کیا کہ تم سوگئی ہو۔تو میں نے تمہارا جگانا مناسب نہیں جانا اور تمہاری وحشت کا خوف کیا۔پس جبرئیل نے کہا کہ آپکا رب آپکو حکم دیتا ہے کہ آپ اہل بقیع کے نزدیک تشریف لیجائیں اوران کیلئے مغفرت طلب کریں۔حضرت عائشہ نے عرض کیا کہ میں اہل قبور سے کیا کہوں فرمایا: تم یہ کہو اے اہل دیار مومنین تم پر سلام ہو۔

جامع ترمذی شریف میں انہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

قالت فقدت رسو ل الله ﷺ ليلة فخرجت فا ذا هو بالبقيع فقال اكنت تخافين ان يحيف الله عليك ورسوله قلت يا رسول الله ظننت انك اتيت بعض نسائك فقال ان الله تبارك وتعالى نزل ليلة النصف من شعبا ن الى سماء الدنيا فغفر لا كثر من عددشعر غنم كلب۔ (ترمذی شریف مجیدی۔ص ۱۰۴ ج ۱)

حضرت عائشہ نے فرمایا ایک رات میں نے رسول اللہ ﷺ کو نہ پایا تو میں نکلی تو حضور بقیع میں تشریف فرما ہیں۔حضور نے فرمایا کیا تو یہ خوف کرتی تھی کہ اللہ کے رسول تجھ پر ظلم کرینگے؟۔میں نے عرض کیا یارسول اللہ میں نے یہ خیال کیا کہ کسی دوسری بی بی کے پاس تشریف لے گئے۔فرمایا بیشک اللہ تبارک وتعالی شعبان کی پندرہویں شب میں پہلے آسمان کی طرف نزول فرماتا ہے تو قبیلہ کلب کی بکریو ں کے بالوں کی مقدار سے زائد لوگوں کی مغفرت فرماتا ہے۔

خاتم المحدثین حضرت جلال الدین سیوطی نے شرح الصدور میں بیہقی کی روایت ذکر کی:

كان النبي ﷺ يزور شهدا ا حدفي كل حول واذا بلغ الشعب رفع صوته فيقول سلام عليكم بما صبر تم فنعم عقبى الدار ثم ابو بكر رضي الله عنه كل حول يفعل مثل ذلك ثم عمربن الخطا ب ثم عثما ن رضي الله عنهما وكا نت فا طمة بنت رسول الله ﷺ تا تيهم وتد عو وكا ن سعد بن ابي وقاص يسلم عليهم ثم يقبل على اصحابه فيقول الا تسلمون على قوم يردو ن عليكم السلام۔ (شرح الصدور۔ص ۸۷۔)

حضور اکرم ﷺ ہر سال میں شہداء احد کی قبور کی زیارت کرتے تھے اور جب شعب میں پہونچتے تو بلند آواز سے فرماتے تمہارے اوپر سلام ہو تمہارے صبر کرنے کے عوض تو یہ پچھلا گھر کیا اچھا ہے۔پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہر سال ایسا ہی کرتے۔پھر حضرت فاروق اعظم پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضور علیہ السلام کی صاحبزادی حضرت فاطمہ قبور شہداء کی زیارت کرتیں اور دعاء مانگتی تھیں اور حضرت

سعد بن ابی وقاص بھی قبور شہداء پر سلام کہتے پھر اپنے ہمراہوں کی طرف متوجہ ہو کر فرماتے تم ایسی قوم پر سلام کیوں نہیں کرتے جو تمہیں سلام کا جواب دیں۔

ان احادیث سے ثابت ہوگیا کہ حضور ﷺ نے قبرستان میں جانیکا حکم کیا اور زیارت قبور کے فوائد ذکر فرمائے کہ یہ زیارت دنیا میں زہد پیدا کرتی ہے اور آخرت کو یاد دلاتی ہے اور ہر جمعہ کو ماں باپ کی قبور پر جانیکی ترغیب دی۔ اور خود حضور علیہ السلام مدینہ کے قبرستان بقیع شریف میں تشریف لیجاتے اور اہل قبر کو سلام کرتے ان کیلئے دعاء مغفرت فرماتے۔ ہر سال شہداء احد کی زیارت قبر کیلئے تشریف لیجاتے خلفاء راشدین سالانہ احد میں تشریف لیجاتے اور صحابہ کرام بھی مزارات شہداء پر حاضر ہوتے اور دوسروں کو زیارت قبور کی ترغیب دیتے بلکہ اس زیارت قبور کی ترغیب کے لئے حضرت جبرئیل امین نازل ہوئے اور اللہ تعالی نے اسکا حکم دیا۔ لہذا قبرستان میں جانا حدیث قولی وفعلی دونوں سے مسنون ثابت ہو۔ لہذا اگر تنہا جائے جب سنت ہے اور دوسروں کو رغبت دیکر اپنے ساتھ لیجائے جب بھی سنت ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا فعل گزرا کہ وہ قبرستان جانے کیلئے اپنے اصحاب کو ترغیب دیتے تھے۔

اب باقی رہی یہ بات کہ قبرستان میں پہونچ کر کیا کرے تو اتنا تو ان احادیث سے ثابت ہوگیا کہ وہاں دعا کرنا سلام کرنا مسنون ہے۔ اب رہا ایصال ثواب کرنا تو کبھی تو ایصال ثواب قرآن کریم پڑھکر کیا جاتا ہے اور یہ بھی حدیث شریف سے ثابت ہے۔

چنانچہ ابوالقاسم اپنے فوائد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

قال رسول الله ﷺ من دخل المقابر ثم قرأ فاتحه الكتاب وقل هو الله احد والهكم التكاثر ثم قال اللهم انى قد جعلت ثواب ما قرأت من كلامك لا هل المقابر من المومنين والمومنات كانوا شفعاء له الى الله تعالى۔ (شرح الصدور مصری ص ۱۳۰)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص قبرستان میں داخل ہو پھر سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص اور سورہ تکاثر پڑھے پھر کہے اے اللہ میں نے جو تیرے کلام پاک کی قرأت کی اسکا ثواب قبرستان کے سب مسلمان مرد عورت کو پہونچا تو اموات اس کے لئے اللہ تعالی کے حضور شفیع ہونگے۔

اس حدیث سے ثابت ہوگیا کہ خود حضور علیہ السلام نے ثواب قرأت قرآن کے ایصال کا حکم دیا۔ صحابہ کرام بھی قرآن پڑھکر ایصال ثواب کیا کرتے تھے۔

اخرج الخلال فی الجامع عن الشعبی قال کانت الانصاراذامات لهم المیت اختلفواالی قبره یقرؤن له القران۔

(شرح الصدور ص ۱۳۰)

خلال نے جامع میں امام شعبی سے روایت کی کہ انصار میں جب کسی شخص کا انتقال ہو جاتا تو وہ قبر کی طرف جاتے اور اس کے لئے قرآن پڑھتے تھے۔

بلکہ قرأت قرآن اموات کا ایصال ثواب کرنا اہل اسلام کا اجماعی مسئلہ ہے۔

چنانچہ شرح الصدور میں ہے:

ان المسلمین ما زالوافی کل عصر یجتمعون ویقرؤن لموتاهم من غیر نکیر فکان ذلك اجماعا۔

(شرح الصدور ص ۱۳۰)

بیشک مسلمان ہر زمانہ میں جمع ہوتے رہے اور اپنے میت کیلئے بغیر کسی اختلاف کے قرأت کرتے رہے تو یہ اجماع ہو گیا۔

فتاوی عالمگیری میں ذخیرہ سے ناقل ہیں:

یستحب عند زیارة القبور قرأة سورة الاخلاص سبع مرات فانه بلغنی ان من قراها سبع مرات ان کان ذلك غیر مغفور له یغفرله وان کان مغفوراله اغفرلهذا القاری ووهب ثوابه للمیت۔

(عالمگیری مجید کانپوری ص ۱۰۹ ج ۴)

بالجملہ قرآن کریم کی قرأت کا ایصال ثواب کرنا حضور نبی کریم ﷺ کے حکم سے بھی ثابت ہوا۔ اور صحابہ کرام کے فعل سے بھی ثابت ہوا۔ اور اجماع مسلمین سے بھی ثابت ہوا۔ اور فقہ کی کتاب سے بھی ثابت ہوا۔ لہذا اب اسکا کوئی مسلمان تو انکار نہیں سکتا۔

اب باقی رہا صدقات سے کھانا کھلا کر ایصال ثواب کرنا تو یہ بھی احادیث سے ثابت ہے۔

ابوداؤد ونسائی میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال یا رسول الله ان ام سعد ماتت فای الصدقه افضل قال الما فحفر بیرا قال هذه لام سعد۔

(مشکوۃ شریف ص ۱۶۹)

حضرت سعد نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ام سعد کا انتقال ہو گیا تو کونسا صدقہ افضل ہے حضور نے فرمایا پانی۔ تو کنواں کھودا گیا فرمایا: کنوں ام سعد کیلئے ہے۔

طبرانی میں حضرت عقبہ ابن عامر رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے:

قال رسول اللہ ﷺ ان الصدقة لتطفی عن اهل القبور :

(جامع صغیر مصری ص ۶۹ صرح صدور ص ۱۴۸)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بیشک صدقہ اہل قبور سے اس کی حرارت کو بجھا دیتا ہے۔

طبرانی نے اوسط میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے:

یقول رسول اللہ ﷺ مامن اهل میت یموت منهم میت فیصد قون عنه بعد مو ته الااهداها لهجبرئیل علی طبق من نو ر ثم یقف علی شفیر القبر فیقول با صاحب القبر العمیق هذه هدیة اهدا ها الیك اهلك فاقبلها فتدخل علیه فیفرح بها یستبثر ویحزن جیر انه الذ ین لا یهدی لهم شئی ۔ (شرح الصدور ص ۱۲۹)

رسول اللہ ﷺ فرماتے: اہل بیت جن میں کوئی شخص مر جائے اور وہ اس کے مرنے کے بعد اس کی طرف صدقہ کرے تو جبرئیل اس میت کیلئے اس صدقہ کو نور کے طبق میں لیجاتے ہیں اور کنارہ قبر پر کھڑے ہو کر کہتے ہیں کہ عمیق قبر والے یہ وہ سب یہ ہے کہ جس کو تیرے اہل نے تیری طرف بھیجا ہے پس میت پر داخل ہوتا ہے اور میت اس سے فرحت وسرور حاصل کرتا ہے اور اس کے وہ پڑوسی جن کو کچھ نہیں آیا ہے وہ رنجیدہ ہوتے ہیں ۔

علامہ زرقانی شرح مواہب لدنیہ میں حدیث کے جملہ افضل الصدقه الماء کے تحت میں فرماتے ہیں:

هذا فی مو ضع یقل فیه الما ء ویکثر العطش والافسقی الما ء علی الانهار القنی لایکو ن افضل من اطعام الطعام عند الحاجة۔

(زرقانی مصری۔ص ۴۵۰ ج ۵)

پانی کا افضل صدقہ ہونا اس مقام میں ہے جہاں پانی کی قلت ہو اور پیاس کی زیادہ خواہش ہو ورنہ نہروں اور ذخائر پر پانی پلانا بوقت ضرورت کھانا کھلانے سے افضل نہ ہوگا۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ اموات کو ایصال ثواب صدقات سے بھی کیا جاتا ہے۔ اور صدقات کا ثواب میت کو پہونچتا ہے۔ اور اس سے اس کو فرحت وسرور حاصل ہوتا ہے۔ اور کھانا کھلانا و افضل صدقات میں سے ہے اسی بنا پر علماء کا اس پر اجماع ہوا۔

علامہ قسطلانی مواہب میں اور علامہ زرقانی اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

وذكر الشيخ شمس الدين ابن قطان العسقلا نی ان وصول ثواب القران الى الميت من قريب اواجنبى هو الصحيح مع النية وهو المعتمد عند متاخر الشافعية كما تنفع الصدقة عنه والدعاء والاستغفارله بالاجماع المؤيد بصريح كثير من الاحاديث ۔

(زرقانی مصری ص ۷۰۴ ج ۵)

شیخ شمس الدین ابن قطان عسقلانی نے ذکر کیا کہ رشتہ دار یا اجنبی کا سنت کیساتھ میت کے لئے قرآت کا ثواب پہونچانا متاخرین شافعیہ کے نزدیک صحیح و معتمد ہے جیسے کہ میت کے طرف سے صدقہ کرنا اور اس کے لئے دعاء و استغفار کرنا اس کو نفع پہونچاتا ہے اور یہ اس اجماع سے ثابت ہے جسکی تائید کثیر احادیث کی صراحت کرتی ہے۔

علامہ شیخ محمد دمشقی رحمۃ الامہ فی اختلاف الائمہ میں فرماتے ہیں:

اجمعوا على ان الاسستغفار والدعاء والصدقه والحج والعتق تنفع الميت ويصل اليه ثوابه ۔

(رحمۃ الامہ مصری ص ۱۰۲ ج ۱)

علماء نے اس پر اجماع کیا کہ استغفار اور دعاء اور صدقہ اور حج اور غلام آزاد کرنا میت کو نفع دیتا ہے اور انکا ثواب اسے پہونچتا ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں:

ومستحب است کہ تصدق کردہ شود از میت بعد از رفتن او از عالم تا ہفت روز وتصدق از میت نفع میکند اورا بے خلاف بیان اہل علم و وارد شدہ است دراں احادیث صحیح خصوصا۔

(اشعۃ اللمعات کشوری)

اور مستحب ہے کہ میت کیلئے اس کے اس عالم سے جانے کے بعد سے سات روز تک صدقہ کیا جائے اور اہل علم اس میں مختلف نہیں کہ میت کیلئے صدقہ کرنا اسے نفع دیتا ہے اس کے ثبوت میں خاص طور پر صحیح حدیثیں وارد ہوئیں۔

امام احمد نے زہد میں اور ابونعیم نے حلیہ میں حضرت طاوس رضی اللہ عنہ سے راویت کی:

ان المو تى يفتنو ن فى قبورهم سبعا فكانوا يستحبون ان يطعم منهم بتلك الايام ۔

(صحیح بہاری ص ۱۵۹ ج ۲)

بیشک مردے اپنے قبروں میں سات روز تک آزمائش کئے جاتے ہیں تو لوگ ان دنوں میں مردو
ں کیلئے کھانا کھلانا مستحب جانتے تھے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ میت کیلئے ایصال ثواب صدقات سے کرنے پر اجماع ہوا۔
اہل علم میں کوئی اسکا مخالف نہیں اور کثیر احادث صحیحہ اس کی تائید کرتی ہے اور کھانا کھلانا بھی صدقات ہی
میں داخل ہے بلکہ زرقانی کی عبارت سے ثابت ہوا کہ کھانا کھلانا افضل صدقہ ہے۔ اس بنا پر مسلمان ہفتہ
بھر تک میت کی طرف سے کھانا کھلاتے ہیں۔

الحاصل میت کیلئے ایصال ثواب جس طرح تلاوت قرآن کریم کرنا مسنون و جائز ہے اسی طرح
صدقات اور کھانا کھلا کر ایصال ثواب کرنا بھی بلاشبہ جائز بلکہ مسنون ہے۔ دیوبندی اس کو ناجائز کہہ کر
دین پر افترا کرتا ہے اور فعل مسنون کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ اور محض اپنی رائے ناقص سے حلال کو حرام
ٹھراتا ہے۔ مولی تعالی انہیں ہدایت کرے۔ واللہ تعالی علم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۵۶)

بنگال میں تقریر کیلئے عالموں کو دعوت دیجاتی ہے اور صاحب دعوت کے طرف سے عالموں
وفاضلوں کو نذرانہ بھی پیش کیا جاتا ہے اور کھانا بھی کھلایا جاتا ہے اور یہ بھی رواج ہے کہ ختم قرآن کے بعد
قاریوں کو روپیہ پیسہ صدقہ کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ سے نہ تو دینے والا اس کو اجرت سمجھتا ہے اور نہ لینے والا
بلکہ اس کو صدقہ خیال کیا جاتا ہے۔ دیوبندی اس کو ناجائز اور حرام قرار دیتے ہیں اور حرام۔ ہ شامی میں ختم
قرآن کے بعد ۴۱ درم لینا جائز لکھا ہے اور الاشباہ والنظائر میں مطلق طاعت میں جائز قرار دیا ہے جواب
مع الدلیل مرحمت فرمایا جائے۔ بینوا توجروا۔ احقر سید الخیر نعیمی اسلام آباد۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

عالموں کو بعد تقریر نذرانہ دینا اور کھانا کھلانا اسی طرح قاریوں کو ختم قران کریم پر روپیہ پیسہ صدقہ
کرنا جب اسطرح پر ہے کہ دینے والا اس کو اجرت سمجھ کر نہ دیتا ہے اور نہ لینے والا اس کو اجرت جان کر لیتا
ہے تو وہاں کے عرف ورواج میں دینے والا بہ نیت اجرت دیا کرتا ہے نہ لینے والا بخیال اجرت لیا کرتا ہے

بلکہ ہر دو صدقہ لیتے دیتے ہیں تو یہ بلاشبہ جائز ہے۔

بخاری شریف و مسلم شریف میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالی عنہ سے یہ حدیث مروی ہے

یقول کان رسول الله ﷺ یعطینی العطاء فا قول اعطه افقراليه منی فقال رسول الله ﷺ خذوا واذاجاءك من هذا المال وانت غير مشرف ولا سائل فخذوه وما لافلا تتبعه نفسك ۔ (بخاری مصری ص ۱۹۸ ج ۴)

حضرت عمر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مجھ کو عطیہ دیتے تھے تو میں عرض کرتا کہ اس کو ایسے شخص کو دیجئے جو مجھ سے زیادہ محتاج ہو تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو لے اور تیرے پاس اس مال میں سے جو آئے اور تو اسکا جمع کرنیوالا اور سوال کرنے والا نہ ہو تو اس کو لے۔ اور جو اس طرح کا نہ ہو تو اس کے لئے اپنے دل میں خواہش نہ کر۔

مسلم شریف میں حضرت ابن ساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے

قال استعملنی عمر بن الخطاب على الصد قة فلما فرغت عنها واديتها اليه امر لی بعمالة فقلت له انما عملت لله اجری على الله فقال خذ ما اعطيت فانی عملت على عهد رسول الله ﷺ وسلم فعملنی فقلت مثل قولك فقال لی رسو ل الله ﷺ اذا اعطيت شيئا من غير ان تسال فكل تصدق ۔ قال سالم فمن اجل ذلك كان ابن عمر لايسا ل احداشيأ ولا يرد شيئا اعطيه ۔ (مسلم شریف مع نوری ص ۳۳۴ ج ۱)

حضرت ابن ساعدی نے کہا کہ حضرت عمر بن خطاب نے مجھے صدقہ وصول کرنے کیلئے عامل بنایا پس جب میں اس سے فارغ ہو گیا اور اس صدقہ کو انہیں دیدیا تو حضرت عمر نے میرے لئے اجرت عمل دینے کا حکم فرمایا، تو میں نے ان سے عرض کیا کہ میں نے تو اللہ ہی کیلئے کام کیا ہے۔ میرا اجر تو اللہ ہی پر ہے تو حضرت عمر نے فرمایا تجھے جو دیا جاتا ہے لے، میں بھی زمانہ اقدس میں یہ کام کیا کرتا تھا تو حضور نے مجھے اجرت عمل دی پس میں نے بھی تیری بات کہی تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب تجھے کوئی چیز بغیر سوال کے دیجائے پس تو کھا اور صدقہ کر۔ حضرت سالم نے کہا اسی وجہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کسی سے کبھی خرچ کی بابت سوال نہیں کیا کرتے تھے۔ اور جو چیز انہیں دیجاتی تو اسے رد نہیں کرتے تھے

مسند امام احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

من اتا ہ اللہ من ھذا الما ل شیامن غیر ان یسأل فلیقبلہ فا نما ھو رزقا قدر اللہ الیہ

(جامع صغیر مصری ص ۱۳۹ ج ۱)

اللہ جسے کچھ اس مال سے بغیر سوال کے دے تو وہ اس کو قبول ہی کر لے کہ وہ رزق ہے جس کو اللہ نے اسکی طرف بھیجا۔

ان احادیث سے ثابت ہوگیا کہ جو مال بلا طلب اور بغیر طمع کے ملے تو اس کو لے لیا جائے۔ اور اس کو رد نہ کیا جائے کہ وہ رزق ہے جو اللہ تعالی نے اسے دیا ہے۔ اب اس کو خود بھی کھا سکتا ہے اور صدقہ بھی کر سکتا ہے۔

بالجملہ جب دینے والا اور لینے والے دونو ں کا قصد عوض اجرت نہیں تو پھر اسے جواز میں کیا کلام ہے بلکہ اس صورت میں. درحقیقت عالم وعظ کہہ کر اور قاری قرآن کریم پڑھکر لوگوں میں صدقہ کرتے ہیں کہ حدیث شریف میں ہے:

من الصدقة ان تعلم الرجل العلم رواہ الحسن مرسلاد۔

(جامع صغیر ص ۱۳۸)

صدقہ سے ہے کہ تو ایک شخص کو علم سکھائے۔

مسلم شریف میں حضرت ابوذر رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے:

ان نـا مسـا من اصحاب النبی ﷺ قالو ا للنبی ﷺ یا رسول اللہ ذھب اھل الدثور بالاجو ریصلو ن کما نصلی یصومون کما نصوم ویتصد قون بفضول اموالھم قال اولیس قد جعل اللہ لکم ما تصدقون بہ ان بکل تسبیح صدقة و کل تکبیر صدقة و کل تحمید صدقہ و کل تھلیل صدقة وامر بالمعروف صدقة ونھی عن منکر صدقة (وفی روية والکلمة الطيبة صدقة ۔ (مسلم مع نودی ص ۳۲۴ ج ۱)

حضور نبی کریم ﷺ سے بعض صحابہ کرام نے عرض کیا اے رسول ﷺ مالدار زیادہ ثوابوں کے حقدار ہوئے کہ جس طرح ہم نماز پڑھتے وہ بھی نماز پڑھتے ہیں۔ جیسے ہم روزہ رکھتے ہیں وہ بھی روزے رکھتے ہیں۔ نیز وہ اپنے زائد مالوں سے صدقہ کرتے ہیں۔ تو حضور نے فرمایا کہ اللہ نے تمہارے لئے ایسی چیزیں نہ کیں جن سے تم بھی تصدق کرو۔ بیشک ہر تسبیح پر صدقہ ہے اور ہر تکبیر پر صدقہ ہے اور ہر حمد کرنا صدقہ ہے اور ہر بار لا الہ الا اللہ پڑھنا صدقہ ہے اور نیکی کا حکم کرنا صدقہ ہے۔ ہر گناہ سے منع

کرنا صدقہ ہے۔ پاکیزہ کلمہ صدقہ ہے۔

ان احادیث سے ثابت ہوگیا کہ عالم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور تعلیم علم کیساتھ صدقہ کرتا ہے۔ اسی طرح قاری قرآن کریم پڑھکر اور تسبیح وتحمید اور کلمہ طیبہ سے صدقہ کرتا ہے۔ تو اب اس کے جواب میں از روے مروت سامعین کو خاص کر داعی کو بھی ان پر صدقہ کرنا چاہیے کہ احسان کا بدلہ احسان ہے۔

چنانچہ حضرت شیخ الاسلام والمسلمین علامہ خیرالدین رملی استاذ صاحب درمختار نے فتوی دیا۔

سوال وجواب دونوں نقل کئے جاتے ہیں:

(سئل) فی رجل علم صغیرا القرآن ولم یشترط له ابو ه اجرة هل یقضی له بالا جرة ام لا لعدم تسمیتها (اجاب) لا یقض له بالاجرة حیث لم تقعد بشروطها ولکن مجا زاة الاحسان من غیر شرط مروة والله تعالی اعلم ۔ (خیریہ مصری ص ۱۱۰ ج ۲)

ایک شخص کے متعلق سوال کیا گیا جس نے بچے کو قرآن کی تعلیم دی اور اس کے والد نے اس سے اجرت شرط نہیں کیا تو کیا اسکے لئے اجرت کا حکم دیا جائیگا۔ یا طے نہو نیکی بنا پر نہیں۔ علامہ نے جواب دیا کہ ایسے عقد نہ ہونے کی بنا پر اجرت کا حکم نہ دیا جائیگا لیکن از روئے مروت بغیر شرط کے بھی احسان کا بدلہ احسان تو ہے یعنی اس کو بطور احسان دے۔

لہذا ثابت ہوگیا کہ اس مخصوص صورت میں عالم وقاری کو بطور صدقہ دینا بلا شبہ جائز ہے بلکہ بہ نسبت جاھل کے عالم کو صدقہ دینا افضل ہے۔

طحطاوی میں ہے:

التصدق علی العالم الفقیر افضل من الجا هل الفقیر۔ (طحطاوی مصری۔ ص ۴۱۹)

عالم فقیر پر صدقہ کرنا جاہل فقیر سے افضل ہے۔ فقہاء کرام نے یہ تصریح کی کہ صدقہ ایسے شخص کو نہ دے جو اس کو کسی گناہ میں صرف کرے یا فضول باتوں اور اسراف میں خرچ کرے بلکہ نیک آدمی نمازی کو دے۔

طحطاوی میں ہے:

لا ینبغی دفعها لمن علم انه ینفقها فی اسرف او معیثة وقال ابو حفص الکبیر انه لا یصرفها لمن لا یصلی الااحیا نا وان اجزأه ۔ (طحطاوی ص ۴۱۹)

جس کو یہ جانتا ہے کہ یہ صدقہ کو گناہ یا اسراف میں صرف کریگا تو اسے صدقہ دینا مناسب نہیں ابو حفص کبیر نے فرمایا کہ صدقہ اسے نہ دیا جائے جو نماز کا پابند نہیں کبھی پڑھ لیتا ہو اور اگر دیدیا تو ادا ہو جائے گا۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ عالم وقاری اکثر بیشتر دیندار ونیک ہوتے ہیں نماز کے پابند ہوتے ہیں کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں تو ان کو صدقہ دینا بلاشبہ افضل و بہتر ہے۔ اگر دیوبندی اس کو ناجائز وحرام کہتے ہیں تو ان کے قول کا باطل وغلط ہونا ظاہر ہے۔

اب باقی رہا سائل کا اور الاشباہ والنظائر کی عبارت کی طرف اشارہ کرنا تو تحقیق مقام یہ ہے کہ متاخرین کے نزدیک معلم قرآن وتعلیم فقہ وامامت واذان واقامت ووعظ کی اجرت لینا جائز اور یہی مفتی بہ قول ہے۔

چنانچہ علامہ ابن عابدین نے ردالمحتار میں ان اقوال کو جمع فرمایا اور متون کے اقوال صرف اس لئے نقل کئے کہ فتوے کیلئے متون ہی وضع کئے گئے ہیں:

قال فی الهدایه وبعض مشائخنا رحمهم الله تعالی استحسنوا الاستیجاز علی تعلیم القرآن الیوم لظهور التوانی فی الامور الدینیه ففی الامتناع تضیع حفظ القرآن وعلیه الفتوی اه وقد اقتصر علی استثاء تعلیم القرآن ایضا فی متن الکنز ومتن مواهب الرحمٰن وکثیر من الکتب وزاد فی مختصر الوقایة ومتن الاصلاح تعلیم الفقه وزاد فی متن المجمع الامامة ومثله فی متن الملتقی ودررا لبحار وزاد بعضهم الاذان والاقامه والوعظ ۔(درمختار جلد ۵ صفحہ ۳۲)

ہدایہ میں کہا کہ ہمارے بعض مشائخ نے اب تعلیم قرآن پر اجرت لینے کو اچھا جانا کہ دینی امور میں سستی ظاہر ہے تو منع کرنے میں حفاظت قرآن کو ضائع کرنا ہے۔ اس پر فتوی ہے اور متن کنز اور مواہب الرحمٰن اور کئی کتب میں صرف تعلیم قرآن کا استثناء کیا۔ اور مختصر وقایہ اور اصلاح میں تعلیم فقہ کو اور زائد کیا اور متن مجمع اور ملتقی اور دررالبحار میں امامت کو اور زیادہ کیا اور بعض فقہاء نے اذان واقامت اور وعظ کا اور اضافہ کیا۔

شیخ محقق ابن نجیم نے الاشباہ والنظائر میں فرمایا:

افتی المتقدمون بان العبادات لاتصح الاجارة علیها کالامامة والاذان وتعلیم

القرآن والفقه لكن المعتمد ما افتى به المتاخرون من الجواز۔

(الاشباہ والنظائر مع حموی کشوری۔ ص ۵۶۔ ج ۱)

متقدمین نے فتوی دیا کہ ان عبارتوں میں اجرت صحیح نہیں جیسے امامت اذان، تعلیم قرآن، تعلیم فقہ، لیکن متاخرین نے ان کے جواز پر فتوی دیا اور یہ قول مفتی بہ ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ تعلیم قرآن و تعلیم فقہ و امامت و اذان و اقامت و وعظ پر اجرت لینا جائز ہے اور یہی قول معتمد و مفتی بہ ہے۔ اب رہا قرأت و تلاوت قرآن پر اجرت لینا یہ جائز نہیں۔

حضرت علامہ خیر الدین رملی حاشیہ بحر میں فرماتے ہیں:

المفتى به جواز الاخذ استحسانا على تعليم القرآن لا على القراة المجردة۔

(ردالمحتار مصری ص ۶ ۷ ج ۵)

مفتی بہ استحسانا اجرت لینے کا جواز صرف تعلیم قرآن پر ہے نہ فقط تلاوت قرآن پر۔

علامہ عینی نے شرح ہدایہ میں فرمایا:

ويمنع القارى للدنيا والآخذ والمعطى آثمان فالحاصل ان ما شاع فى زماننا من قرأة الاجزاء بالاجرة لا يجوز۔

(درمختار مصری ص ۳۶ ج ۵)

حصول دنیا کے لئے پڑھنے والوں کو منع کیا جائے لینے والا اور دینے والا دونوں گنہ گار ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ہمارے زمانہ میں جو سپاروں کو باجرت پڑھنا شائع ہوگیا ہے یہ جائز نہیں۔

شیخ الاسلام تقی الدین نے فرمایا:

ولا يصح الاستيجار على القرأة واهدائها الى الميت لانه لم ينقل عن احد من الائمة الاذن فى ذلك وقد قال العلماء ان القارى اذا قرأ لاجل المال فلا ثواب له فاى شئ يهديه الى الميت وانما يصل الى الميت العمل الصالح والاستيجار على مجرد التلادة فلم يقل به احد من الائمة وانما تنازعوا فى الاستيجار على التعليم۔

(ردالمحتار مصری ص ۳۷ ج ۵)

اجرت پر پڑھنا اور اسکا ثواب میت کو پہونچانا صحیح نہیں اسلئے کہ اس کی اجازت ائمہ میں سے کسی سے منقول نہیں۔ علماء نے فرمایا کہ جب پڑھنے والا مال کیلئے پڑھتا ہے تو اس کو ثواب نہیں ملتا، پھر وہ میت

کو کس چیز کا ہدیہ کرتا ہے کہ میت کو تو صرف عمل صالح پہونچتا ہے۔ اور صرف تلاوت قرآن پر اجرت لینے کو ائمہ میں سے کسی نے حکم نہیں دیا۔ انہوں نے تو صرف تعلیم پر اجرت لینے میں اختلاف کیا ہے۔

صاحب ردالمختار رحمتی سے ناقل ہیں:

ما اجازوہ انما اجازوہ فی محل الضرورۃ کا لاستیجار لتعلیم القرآن او الفقہ او الاذان او الامامۃ خشیۃ التعطیل لقلۃ رغبۃ الناس فی الخیر ولا ضرورۃ فی استیجار شخص یقرأ علی القبر او غیرہ۔ (ردالمختار مصری ص ۴۵۷ ج)

اجرت پر پڑھانا اور اسکا ثواب میت کو پہونچانا صحیح نہیں، اس لئے کہ اس کی اجازت ائمہ میں کسی سے منقول نہیں علماء نے فرمایا کہ جب پڑھنے والا مال کیلئے پڑھتا ہے تو اس کو ثواب نہیں ملتا پھر وہ میت کو کس چیز کا ہدیہ کرتا ہے کہ میت کو تو صرف عمل صالح پہونچتا ہے اور صرف تلاوت قرآن پر اجرت لینے کو ائمہ میں سے کسی نے حکم نہیں دیا انہوں نے تو صرف تعلیم پر اجرت لینے میں اختلاف کیا ہے۔

علامہ ابن عابدین ردالمختار میں فرماتے ہیں:

والذی افتی بہ المتاخرون جوازا لاستیجار علی تعلیم القرآن لا علی تلاوتہ۔

(ردالمختار مصری س ۴۵۷ ج ۵)

متاخرین نے جو فتوی دیا ہے وہ تعلیم قرآن پر اجرت لینے کے جواز پر ہے نہ کہ تلاوت قرآن پر اجرت لینے کے جواز پر۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ تلاوت قرآن کریم پر اجرت لینا جس طرح متقدمین کے نزدیک ناجائز ہے اسی طرح متاخریں کے نزدیک بھی ناجائز ہے۔ دینے والا اور لینے والا دونوں گنہگار ہیں۔ اور نہ اجرت سے پڑھوا کر ایصال ثواب ہو سکتا ہے کہ جب پڑھنے والے نے روپیہ پیسہ لیا تو اس کو ثواب کیا ملا اور جب اسے ثواب ہی نہیں ملا تو وہ ایصال ثواب کس طرح کر سکتا ہے۔

اسی طرح جہاں کے عرف ورواج میں دینے والا بہ نیت اجرت دیتا ہے اور لینے والا بخیال اجرت پڑھتا ہے اگر چہ ان میں کچھ طے نہ ہوا ہو لیکن وہاں کے عرف میں بعد ختم اس طرح دینے کا دستور ہے تو یہ بھی ناجائز ہے۔ کہ فقہاء کا مشہور قاعدہ ہے۔ المعروف کالمشروط۔

علامہ ابن عابدین ردالمختار میں فرماتے ہیں:

ولو لا الاجرۃ ما قرأ احد فی ہذا الزمان بل جعلوا القرآن العظیم مکسبا و وسیلۃ

الی جمع الدنیا انالله وانا الیه راجعون ۔ (درالمختار ص ۳۷ ج ۵)

اگر اجرت نہو تو اس زمانہ میں کوئی شخص کسی کیلئے نہ پڑھے بلکہ انھوں نے قرآن کریم کو دنیا جمع کرنے کیلئے وسیلہ اور کسب پھرالیا۔ انا لله وانا الیه راجعون ۔

اب باقی رہا سائل کا یہ قول کہ۔ شامی میں ختم قرآن کے بعد۔ ۴۱ درم لینا جائز لکھا۔ غالبا سائل نے اس سے شامی کے اس عبارت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لا یجوز الاستیجار علی الختم باقل من خمسة واربعین درهما۔
(شامی مصری ص ۳۷ ج ۵)

ختم قرآن پر ۴۵ درہم سے کم اجرت لینا جائز نہیں۔

لہذا یہ مسئلہ جواز اجرت تعلیم قران کی بنا پر ہے کہ اس سے کم مقدار عظمت قرآن کے مناسب نہیں ۔اسی لئے علامہ شامی اس عبارت کے بعد یہ تحریر فرماتے ہیں:

فخارج عما اتفق علیه اهل المذهب قاطبة ۔

اسکا مطلب یہ ہے کہ اہل مذہب نے تلاوت قرآن کریم کی اجرت کے ناجائز ہونے پر اتفاق کیا ہے تو یہ مسئلہ اس بنا پر نہیں ہے بلکہ اسی اجرت تعلیم قرآن کی بنا پر ہے۔ لہذا اس عبارت سے تلاوت قرآن کریم کی اجرت کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔

پھر سائل نے کہا: اور الاشباہ والنظائر میں مطلق طاعت میں جائز قرار دیا ہے۔ غالبا یہ اس عبارت کی طرف اشارہ ہے جو اسی کے جواب میں اشباہ سے نقل کی گئی ہے۔ اس میں اگر چہ بظاہر مطلقا عبارات کو لیا ہے لیکن جب اس کے الف لام کو عہد کا قرار دیا جائے تو یہ انہیں خاص عبارات کیلئے ہے جن کی تصریح متاخرین سے ثابت ہے، جن کو اسی عبارت میں بہ تصریح ذکر کیا گیا کہ وہ امامت واذان واقامت وتعلیم قرآن وفقہ ہے ورنہ اسکا جواب ردالمحتار میں مذکور ہے۔

وقد اخطأ فی هذه المسئلة جماعة ظنا منهم ان المفتی به عند المتاخرین جواز الاستیجار علی جمیع الطاعات مع ان الذی افتی به المتاخرون انما هو التعلیم والاذان والامامة وصرح المصنف فی المنح فی کتاب الاجارات وصاحب الهدایة وعامة الشراح واصحاب الفتاوی بتعلیل ذلك بالضرورة وخشیة الضیاع کما مر ولو جاز علی کل طاعة لجاز علی الصوم والصلوة والحج مع انه باطل بالاجمع ۔

(ردالمحتار مصری ص ۴۵۷ ج ۵)

اس مسئلہ میں ایک جماعت نے اس گمان سے خطا کی کہ متاخرین کے نزدیک اجرت کا جواز تمام طاعتوں کے لئے ہے باوجودیکہ متاخرین نے جوفتوی دیا ہے وہ صرف تعلیم اور اذان واقامت ہی کے لئے ہے اور مصنف منح نے کتاب الاجارات میں اور صاحب ہدایہ اور تمام شارحین اور اصحاب فتاوی نے اس کی علت ضرورت اور ضائع ہونیکا خوف بیان کیا جیسا کہ پہلے ذکر کردیا۔ اور اگر اجرت ہر طاعت پر جائز ہوتی تو روزے نماز اور حج پر بھی جائز ہوتی باوجودیکہ باتفاق باطل ہے۔

یہی علامہ ابن عابدین شامی اسی ردالمحتار کے کتاب الاجارات میں فرماتے ہیں:

وقد اتفقت کلماتهم جميعا فى الشروح والفتاوى على التعليل بالضرورة وهى خشية ضياع القرآن كما فى الهداية وقد نقلت لك ما فى مشاهير متون المذهب الموضوعة للفتوىٰ فلا حاجة الى نقل ما فى الشروح والفتاوى وقد اتفقت كلماتهم جميعا على التصريح باصل المذهب من عدم الجواز ثم استثنوا بعده ما علمته فهذا دليل قاطع وبرهان ساطع على ان المفتى به ليس هو جواز لاستيجار على كل طاعة بل على ماذكروه فقط مما فيه ضرورة ظاهرة تبيح الخروج عن اصل المذهب۔ (ردالمحتار جلد ۵ ص ۳۶)

شرحوں اور فتاووں میں سب ہی اقوال اس بات پر متفق ہوئے کہ علت ضروری ہے اور وہ قرآن کے ضائع ہونے کا خوف ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے اور اس نے تیرے لئے مذہب کے ان مشہور متون کی عبارت نقل کیں جو فتوے کے لئے موضوع ہیں تو اب شرحوں اور فتاؤں کی عبارات کے نقل کرنے کی حاجت نہیں اور سب کے اقول اس تصریح پر متفق ہوئے کہ اصل مذہب عدم جواز ہے پھر متاخرین نے اس کے بعد صرف ان طاعتوں کا استثناء کیا جن کو تو نے جان لیا کہ تو یہ ہر طاعت پر اجرت جائز نہ ہونے کی مفتی بہ قول پر یقینی دلیل اور روشن برہان ہے بلکہ صرف ان طاعتوں پر ہو جن کی متاخرین نے تصریح کی جن میں یعنی ظاہر ضرورت ہے جس اصل مذہب کے خروج کو مباح کردیا

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ مطلق عبادات اور تمام طاعات پر متاخرین نے جواز اجرت کا فتوی نہیں دیا ورنہ نماز۔ روزے۔ حج۔ وغیرہ میں بھی اجرت جائز ہو جاتی بلکہ متاخرین نے اذان و اقامت وامامت وتعلیم قرآن وتعلیم فقہ ووعظ پر جواز کا فتوی دیا۔ اور ان میں علت ضرورت اور خوف تضیع

قرآن بیان کیا۔ لہذا تلاوت قرآن پر اجرت کے جائز ہونے کیلئے متاخرین کا فتوی ہی نہیں کہ اس میں یہ علت ہی نہیں پائی جاتی تو اس کی اجرت کس طرح جائز ہوسکتی ہے اور یہ عبارت الاشباہ والنظائر میں موجود ہے تو یہ دلیل نہیں بن سکتی۔

خلاصہ جواب یہ ہے کہ تلاوت قرآن کریم پر اجرت لینا اور دینا بالکل ناجائز ہے اسی طرح جس مقام کے عرف میں اس پر لیا دیا جاتا ہے تو حسب دستور تلاوت پر لینا اور دینا بھی ناجائز ہے۔ ہاں جہاں نہ ایسا عرف ورواج ہو نہ دینے والا اور نہ لینے والا بہ نیت اجرت لیتے دیتے ہوں تو وہ وہاں صدقہ وصلہ ہے اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔ دیوبندی اگر اس کو بھی اجرت قرار دیکر ناجائز وحرام کہتا ہے تو یہ اس کی جہالت ولاعلمی ہے اور فقہ سے ناواقفی کی پوری دلیل ہے۔ مولی تعالی انہیں قبول حق کی توفیق دے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔ والیہ المرجع والمآب بعون الملك الوهاب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۵۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کہ ایک شخص کوڑھ کے مرض میں مرگیا۔ اس کے گھر والوں نے چاہا کہ محلّہ یا پڑوس کے کچھ لوگ جمع ہوکر میرے لڑکے کو باقاعدہ غسل دیں اور پہلے کچھ نعت حضور کی شان میں پڑھواؤں تاکہ میت کو ثواب ہو، اور پھر دفن کریں۔ بعد دفن کرنے کے باقاعدہ (سویم) فاتحہ ہو۔ اور چہلم کی فاتحہ ہو۔ لیکن اس کے مرنے کی خبر سنکر محلّہ اور پڑوس کے لوگ ایک بھی نہیں گیا، اس نے بہت کوشش کی تو لوگوں نے جواب دیا کہ ہم اس میت میں نہیں جائیں گے۔ کیونکہ تمہارا لڑکا کوڑھی ہوکر مرا ہے۔ لہذا کوڑھی کو غسل وکفن ونماز جنازہ ودفن کرنا علماؤں نے منع کیا ہے۔ یہ الفاظ محلّہ والوں کے صحیح ہیں؟ اس کو غسل وکفن ونماز جنازہ ودفن وسویم چہلم وغیرہ ہونا چاہئے یا نہیں اور اس کو جو کوڑھ کے مرض میں حیات ہو نماز جمعہ میں جماعت میں شامل کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اور وہ ہر نماز میں شریک ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر کوئی شریک کرنے سے انکار کرے تو انکار کرنے والے کا کیا حکم ہے؟۔

صاف صاف لکھئے اور اگر کوئی بات جناب کی طرف ہو تو لکھ دیجئے۔ فقط بینوا وتوجروا۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

جزامی سے مسلمین متوکلین اہل صدق ویقین تو کسی طرح کا پرہیز واجتناب نہیں کیا کرتے یہاں تک کہ حدیث شریف میں ہے جو ابن ماجہ شریف میں حضرت جابر رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے۔

”ان رسول اللہ ﷺ اخذ بید مجزوم فو صعها معه فی القصعة وقال کل ثقة باللہ وتو کلا علیه“ (مشکوۃ شریف ص ۳۹۲)

حضور ﷺ نے جزامی کا ہاتھ پکڑ کر کھانے کے پیالے میں رکھ دیا اور حکم دیا کہ کھا میں تو اپنے خدا پر اعتماد وتوکل رکھتا ہوں۔

اس حدیث شریف سے ظاہر ہو گیا کہ جزامی سے جب ایک ہی پیالے میں ساتھ کھانا کھانے تک میں بھی پرہیز نہیں کیا تو پھر اور کس چیز میں پرہیز ہوگا۔ ہاں ضعیف اعتقاد والے عوام اس سے عدم توکل کی بنا پر پرہیز کر سکتے ہیں۔ لیکن احکام شریعہ میں جزامی سے پرہیز نہیں کیا جائے گا۔ اور حقوق مسلمین مثلا سلام کلام کرنے میں اور مرنے کے بعد غسل وکفن میں۔ نماز جنازہ میں۔ دفن میں۔ پھر سویم چہلم۔ فاتحہ وغیرہ ایصال ثواب میں وہ دیگر مسلمانوں کی طرح حق دار ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ جزام بھی منجملہ اور بیماریوں کے ایک بیماری ہے تو جس طرح اور بیماریوں میں میت کا غسل، نماز جنازہ۔ دفن۔ سوم۔ فاتحہ وغیرہ کرنا اپنے اوپر حق جانتے ہیں اسی طرح مسلمانوں کو اسے بھی اپنے اوپر حق جاننا چاہئے۔ اس کی ممانعت کوئی عالم دین تو کر نہیں کر سکتا۔ لہذا یہ محلہ والے اپنی لاعلمی سے ان چیزوں کا انکار کر کے گنہگار ہوئے اور حق کے ترک کرنے والے قرار پائے۔ اور اس میت کے گھر والوں کو اذیت وتکلیف دینے والے ٹھہرے۔ انہیں چاہئے کہ اب علم ہونے کے بعد کم از کم اس کے ورثہ سے اپنی غلطی کی معافی طلب کریں۔ اب باقی رہا جزامی کا جمعہ وجماعت میں شریک کرنا، یہ نمازیوں کی خوشنودی پر موقوف ہے اس میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

کتاب الزکوۃ

(۳۹)

باب نصاب الزکوۃ

مسئلہ (۵۵۸)
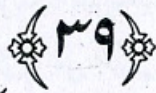
کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین نسبت مسائل کے، حوالہ جات قرآن واحادیث سے جواب عنایت فرمایا جائے

زید ۱۹۵۰ء میں صاحب زکوۃ ہوا اور اسی سال اس نے پانچسو روپے کی زکوۃ ادا کی ۱۹۵۱ء میں وقت زکوۃ وہی پانچسو روپیہ اس کے پاس ہے اور سال بھر کے عرصہ میں آمدنی سے کچھ حصہ فاضل بچت نہیں ہوئی۔ کیا ۱۹۵۱ء میں پھر زید کو پھر اسی رقم پانچسو پر زکوۃ ادا کرنا ہوگی جس کی زکوۃ وہ ۱۹۵۰ء میں ادا کر چکا ہے۔

الجواب

نحمده ونصلى ونسلم على رسوله الكريم

صورت مسئولہ میں بذمہ زید اس رقم پر جب سال گذر جائیگا زکوۃ دینا فرض ہو جائیگی چاہے اس کو تجارت میں اس رقم پر کچھ فائدہ حاصل ہو یا نہ ہو جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔

"تجب على الفور عند تمام الحول" (جلد ا صفحہ ۸۷)

یعنی سال کے گذر جانے پر زکوۃ فوراً ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے تو بیشک زید پر ۱۹۵۱ء میں بھی پھر اسی رقم پر زکوۃ کا ادا کرنا فرض ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۵۹)

کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین نسبت مسائل کے حوالہ جات قرآن واحادیث سے جواب عنایت فرمایا جائے۔

(۱) زیورات جن کی زکوۃ ایک سال ادا کردی گئی ہے کیا ان کی زکوۃ ہر سال ادا کرنا لازمی ہے؟۔

(۲) زید کے پاس ایک ہزار روپیہ ہے جس کی زکوۃ اس نے ادا کی اور وہ ان میں اس رقم کا آدھا حصہ یعنی پانچسو تجارت کے لئے کسی دوسرے شخص کو شریک تجارت کرکے دیدیا چار ماہ بعد ایام زکوۃ زید کے پاس پھر ایک ہزار روپیہ آگیا اب زید کو کس رقم پر زکوۃ ادا کرنی چاہئے؟۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

(۱) زیورات کی زکوۃ ہر سال دینا فرض ہے جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں:

تجب فی کل مائتی درهم خمسة دراهم وفی کل عشرین مثقال ذهب نصف مثقال مضروبا کان اولم یکن مصوغا او غیر مصوغ حلیا کان للرجال او للنساء تبرا کان او سبیکة کذا فی الخلاصة۔ (ص۱۹۱ج۱)

زکوۃ دینا واجب ہے ہر دوسو درہم میں پانچ درہم ہر بیس مثقال سونے میں آدھا مثقال ٹھپے والا ہو یا نہ ہو گھڑے ہوے یا نہ ہو زیور ہوں واسطے مردوں کے یا واسطے عورتوں کے ہوں سلاخیں ہوں یا اینٹیں لہذا زیورات پر ہر سال گزرنے پر زکوۃ فرض ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم

(۲) زید کو دونوں رقموں پر زکوۃ دینا فرض ہے ان پانچسو پر بھی جو زید کے پاس رکھے ہیں اور ان پانچ سو پر بھی جو تجارت میں لگے ہوئے ہیں اور ان پانچ سو پر جس قدر منافع ہوا اس منافع پر بھی لہٰذا زکوۃ اس کل رقم کی دی جائے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۶۰)

کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین نسبت مسائل کے حوالہ جات قرآن واحادیث سے جواب عنایت فرمایا جائے

زید نے حج کے لئے کچھ زادراہ جمع کرکے رکھا اور اس رقم کو کسی کام میں نہیں لیتا صرف حج کے لئے رکھی ہوئی ہے مگر حج کے لئے روانہ نہیں ہوسکا گوارادہ کرتا رفتار زمانہ روک لیتی ہے کیا ایسی رقم پر زکوۃ ادا کرنا چاہئے؟۔ بینوا توجروا

المستفتی محمد عبدالغنی صدیقی وکیل ڈیڈوالا راجستھان

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صورت مسئولہ میں اس رقم پر بھی سال کے گذر جانے پر زکوۃ واجب ہو جائیگی یہ رقم اب چاہے کسی کام کے لئے رکھی ہو بہر کیف اس رقم پر بھی زکوۃ ادا کرنا واجب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ، المتوسل بالنبی المرسل العبد الارذل محمد اول بن المفتی مولینا الحاج محمد اجمل

نائب مفتی اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل یکم جمادی الاخرہ ۱۳۷۷ھ

ھذہ الاجوبۃ کلھا صحیحۃ محمد اجمل غفراللہ عز وجل فی بلدہ سنبھل

مسئلہ (۵۶۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک شخص کے پاس صرف نوٹ ہوں جو آجکل رائج ہیں، یا صرف ریزگاری ہو، چاندی سونیکا سکہ ہو تو بقدر نصاب ہونے پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟۔ زید کہتا ہے کہ صرف نوٹ میں یا ریزگاری میں زکوۃ واجب نہیں ہے۔ زید کا قول صحیح ہے یا نہیں؟۔ مفصل جواب دیا جائے۔

المستفتی۔ مولوی عبدالسلام از محلہ شرئے ترین از بلدہ سنبھل ضلع مراد آباد۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

شریعت میں مال کی یہ تعریف ہے کہ جسکی طرف طبیعت کا میلان ہو اور وہ حاجت کے وقت کیلئے اٹھار کھنے کے قابل ہو اور مصالح ومنافع کیلئے اسے جمع کر کے محفوظ رکھیں اور باختیار خود اس میں تصرف کریں اور وہ قیمت والا ہو۔

چنانچہ ردالمختار میں ہے: المال ما یمیل الیه الطبع ویمکن ادخارہ لوقت الحاجة۔

اسی میں تلویح سے ناقل ہیں: المال ما من شانه ان ید خر للا نتفاع وقت الحاجت والتقویم یستلزم المالیة۔

اسی میں بحر سے اور وہ حادی قدسی سے ناقل ہیں: المال اسم لغیر الآدمی خلق لما لمصالح الادمی وامکن احرازہ والتصرف فیه علی وجه الاختیار۔ (ردالمختار مصری ص ۳ ج ۴)

تو نوٹ ۔ پیسے ۔ اکنی ۔ دوانی ۔ چونی ۔ اٹھنی ۔ جب چاندی سونیکی نہ ہوں تو بھی ان سب پر مال کی یہی تعریف صادق آرہی ہے کہ لوگوں کی طبیعت ان کی طرف میل کرتی ہے اور انھیں وقت کیلئے اٹھا یا جاتا ہے اور انہیں مصالح ومنافع کے لئے جمع کر کے محفوظ کیا جاتا ہے اور باختیار خود ان میں تصرف کرتے ہیں اور یہ قیمت والی چیزیں ہیں ۔ لہذا نوٹ ۔ پیسے وغیرہ بحکم شرعی یقیناً حتماً جزماً بلا شبہ مال قرار پائے ، اس میں نہ کسی طرح کا شک واشتباہ ۔ نہ کچھ تردد و تامل کو راہ ۔ اور جو اس کا منکر ہو وہ جہل وحمق کا مخزن اور عقل وفہم کا دشمن ہے ۔ اور جب نوٹ پیسے وغیرہ کا مال ہونا آفتاب سے زیادہ روشن ہے تو یہ ظاہر ہے کہ مالیت خود زکوۃ کے فرض ہونے کا سبب ہے جب نصاب کی مقدار کو پہنچ جائے ۔

ردالمحتار میں ہے: السبب ھو المال لانھا وجبت شکر النعمة المال ولذا تضاف الیه ویقال زکوة المال ۔ (ردالمحتار مصری ص ۴ ج ۲)

تو نوٹ وغیرہ ریزگاری میں زکوۃ اپنی شرطوں کے ساتھ واجب ، بلکہ ان میں نیت تجارت کی بھی حاجت نہیں کہ یہ ثمن اصطلاحی ہیں اور ثمن اصطلاحی جب تک وہ رائج ہے اس میں بلانیت تجارت زکوۃ واجب ہے ۔

چنانچہ فتاوی سراجیہ میں اس کی صاف طور پر تصریح موجود ہے:

الزکوة فی الفلوس الرائجة کما فی دارھمنا الیوم لا تجب مالم یکن قیمتھا مائتی درھم من الدراھم التی تغلب النقرة فیھا علی الغش او عشرین مثقالا من الذھب ولا یشترط فیھا التجارة اذا کان النصاب کاملا فیما بین طرفی الحول فنقصانه فیما بین ذلك لا یضر وان عاد الی شئ قلیل ۔ (فتاوے سراجیہ کشوری ص ۲۴)

ردالمحتار میں شرنبلالیہ سے ناقل ہیں: الفلوس ان کانت اثمانا رائجا ۔ اور فلوس میں بلا نیت تجارت بھی جب تک یہ رائج ہیں زکوۃ یقیناً واجب ہے ۔ اور زید کا قول غلط ہے اور ان عبارات کے خلاف ہے بلکہ مقاصد اسلام کے خلاف ہے ۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۶۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

زید کے پاس دس بیگہ نہری زمین بعوض کرایہ ہے جو سالانہ کرایہ ادا کیا جاتا ہے اگر اس میں کاشت کی جاتی ہے تو بھی کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے اگر نہ کی جائے تب بھی کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ کاشت کاری بیلوں سے کرائی جاتی ہے۔ اگر پانی دیا جائے تو پانی کا معاوضہ دیا جاتا ہے پانی نہیں لیا جائے تو بھی معاوضہ دیا جاتا ہے۔ زمین کاشت سے بیکار ہو چکی ہے پیداوار میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ زید نے امسال اس زمین میں مبلغ دو سو روپے کی کھاد ڈلوا کر زمین تیار کروائی گئی اور اس میں کاشت کروائی گئی کاشت کاری میں تمام کام کرایا پر ہوا ہے۔ فضل خدا سے اس زمین میں پیداوار دو چند ہو گئی۔ کیا زید اس تمام خرچہ کو وضع کر کے ابتدائی پیداوار سے زکوۃ ادا کرے یا پیداوار دو چند کی کاشت کے خرچہ کو وضع کر کے زکوۃ ادا کرے؟۔ اس کا مفصل حالات بحوالہ کتب حدیث وفقہ سے تحریر فرمائیں فقط نور محمد۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

زمین کی زکوۃ سے عشر مراد ہوتا ہے تو اگر زید کی یہ زمین عشری ہے اور اس میں ایسی چیز کی کاشت ہے جس سے مقصود منافع حاصل کرنا ہے تو اگر اس کی آبپاشی چرسے یا ڈول سے یا بہ قیمت کی گئی ہے تو اس میں سے بغیر مصارف کاشت وضع کئے کل پیداوار کا بیسواں حصہ دینا واجب ہے۔ اور اگر آبپاشی ایسی نہ ہو بلکہ بارش سے یا بلا قیمت نہر اور نالے سے اس کو سیراب کیا گیا تو بغیر مصارف کاشت وضع کئے ہوئے اس کی کل پیداوار کا دسواں حصہ دینا واجب ہے، عالمگیری میں ہے: ولا تحسب اجرۃ العمال ونفقۃ البقر وکراء الانھار واجرۃ الحافظ وغیر ذلک فیجب اخراج الواجب من جمیع ما خرجتہ الارض عشرا او نصفا کذا فی البحر الرائق۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۶۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) کم از کم کتنے روپیہ پر قربانی، صدقہ فطر، زکوۃ، واجب ہے؟۔

(۲) زید نے بکر سے کہا کہ تم نے رمضان المبارک کے روزہ نہیں رکھے ہیں تم کو صدقہ فطر نہیں دینا چاہیے۔ کیا زید کا یہ قول صحیح ہے؟۔

(۳) میاں بیوی نے روزے نہیں رکھے، کیا بیوی کو اپنے نابالغ بچوں کی طرف سے صدقہ فطر ادا کرنا ہوگا یا نہیں؟۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم علی رسوله الکریم

سال بھر میں حوائج اصلیہ واخراجات ضروریہ سے جب کم از کم ساڑھے باون تولہ چاندی بچ جائیں، تو صاحب نصاب ہوگا۔ اس پر زکوۃ واجب ہے، اور صدقہ فطر قربانی بھی واجب ہے،۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

زید کا قول باطل ہے، بکر جب صاحب نصاب ہے، اگر چہ اس نے روزہ رمضان نہ رکھے ہوں لیکن اس پر صدقہ فطر واجب ہے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

شوہر جب صاحب نصاب ہو اگر چہ اس نے روزے رمضان کے نہ رکھے ہوں، تو صدقہ فطر نابالغ بچوں کا اسی پر واجب ہے، نہ ان کی ماں پر۔ واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۶۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

فطرہ ماہ رمضان کے بعد ہی واجب ہوتا ہے اور شاید اس عید کا نام اسی وجہ سے عید الفطر ہے۔ تو یہ فطرہ ماہ رمضان میں سب خورد و کلاں پر کیوں واجب ہے جب کہ اطفال نے روزے نہیں رکھے ہیں۔ اور اگر روزوں پر فطرہ نہیں ہے تو ماہ رمضان کے بعد ہی فطرہ کیوں واجب ہوتا ہے اس میں کیا حکم شریعت ہے۔

ح۔م۔ اشرفی ۲۵ / اکتوبر

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم علی رسوله الکریم

بلاشبہ عید الفطر کا نام اسی بنا پر ہے کہ اس میں فطرہ ادا کیا جاتا ہے۔ فطرہ عید کے دن بعد صبح صادق کے واجب ہو جاتا ہے اور ان لوگوں پر واجب ہے جو صاحب نصاب ہوں ان پر اپنی طرف

سے اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے واجب ہے ہر خورد و کلاں پر واجب نہیں ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

باب مصارف الزکوۃ

مسئلہ (۵۶۵)

کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین نسبت مسئلہ ذیل کے، حوالہ جات قرآن واحادیث سے جواب عنایت فرمایا جائے۔

زید صاحب زکوۃ ہے اور اس کا حقیقی بھائی بکر مقروض ہے، کیا زید اپنے بھائی بکر کا قرضہ اپنی زکوۃ سے ادا کرسکتا ہے؟۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

زید کا بھائی بکر جب صاحب نصاب نہ ہوتو زید اپنے بھائی بکر کو زکوۃ دے سکتا ہے بلکہ ایسی ضرورت کے وقت اس کو زکوۃ کا دینا افضل ہے، جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

والافضل فی الزکوۃ والفطر والنذور الصرف اولا الی الاخوة والاخوات ثم الی اولادهم ثم الی الاعمام والعمات ثم الی اولادهم ثم الی الاخوال والخالات ثم الی اولادهم ثم الی ذوی الارحام ثم الی الجیران ثم الی اهل حرفته ثم الی اهل مصره او قریته۔ (جلد اصفحہ ۹۷)

زکوۃ اور صدقہ فطر اور نذر کا افضل ترین مصرف بھائی پھر ذوی الارحام پھر پڑوسیوں پر پھر اپنے ہم پیشوں پر پھر اپنے اہل شہر یا اہل قریہ پر خرچ کرنا افضل اور بہتر ہے، تو زید اپنی زکوۃ اپنے بھائی کو دیدے اور وہ اپنا قرضہ اس سے ادا کردے خود زید اس کے قرضہ کو اپنے زکاتی مال سے ادا نہ کرے کہ تملیک اسی شکل میں پائی جائیگی کہ بکر کو اس رقم کا مالک بنادے۔ اور ادائے زکوۃ کے لئے تملیک کا پایا جانا ضروری شرط ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ، المتوسل بالنبی المرسل العبد الارذل محمد اول بن المفتی مولینا الحاج محمد اجمل نائب مفتی اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل یکم جمادی الاخرہ ۱۳۷۷ھ الجواب صحیح محمد اجمل غفر اللہ عزوجل فی بلدہ سنبھل

مسئلہ (۵۶۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

زید نے مال زکوۃ کی رقم اکھٹی بذریعہ چندہ وصول کی۔ نیت زید کی یہ ہے کہ اس رقم کو شرعی حیلہ کر کے اس سے مدرسہ یا مسجد بنائی جائے۔ چندہ مذکورہ حیلہ کے لئے کیا زید بکر کو انتخاب کر کے یہ ظاہر کر سکتا ہے کہ تم کو یہ رقم دی جاتی ہے اس رقم میں اتنا روپیہ تم اپنے صرف کے لئے لے لینا باقی ماندہ رقم مجھکو واپس اللہ کے نام کر دینا۔ کیا زید بکر سے یہ اقرار کرا سکتا ہے یا نہیں؟۔ یہ رقم اس طرح واپس لینا جائز ہے یا نہیں؟۔ اس کا مفصل احوال بکتب حدیث وفقہ کہ تحریر فرمائیں۔ فقط۔ عثمان غنی۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

رقم زکوۃ بعد حیلہ شرعی کے مدرسہ میں صرف کی جاسکتی ہے۔ عالم گیری میں ہے: وکذلك من علیہ الزکوۃ لو اراد صرفھا الی بناء المسجد او القنطرۃ لا یجوز فان اراد الحیلۃ فالحیلۃ ان یتصدق بہ المتولی علی الفقراء ثم الفقراء یدفعونہ الی المتولی ثم المتولی یصرف الی ذلك۔

لیکن حیلہ میں یہ طے کرنا یا یہ اقرار کرالینا کہ اتنا روپیہ اپنے صرف میں کرلے اور باقی اللہ کے نام پر واپس کر دے ہرگز ہرگز نہیں چاہئے اور نہ اس طرح اس رقم کو واپس کیا جائے بلکہ علاوہ متولی کے کوئی شخص اس کو سمجھا دے اور متولی اس پر بہ نیت تملیک تصدق کرے اور وہ فقیر اس رقم کے کل یا جز کو اپنی طرف سے متولی کو مسجد یا مدرسہ کے کسی کام میں صرف کرنے کے لئے دیدے جب وہ متولی اس کو مسجد یا مدرسہ میں صرف کرسکتا ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۶۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان شرع عظام دامت برکاتہم النور مسائل حسب ذیل کی بابت

(۱) زکوۃ کے روپے سے دینی کتابیں خرید کر کسی مدرسہ میں دی جائیں، کہ طلبہ پڑھیں اس سے

زکوۃ ادا ہو جائے گی؟۔

(۲) زکوۃ کی رقم یکمشت ادا کی جائے یا وقتا فوقتا تھوڑی تھوڑی جمعہ کو دے دی جائے۔ مثلا محرم الحرام میں زکوۃ نکالی اور ربیع الآخر یا اس سے بعد تک یا پہلے تھوڑی تھوڑی ہر جمعہ کو فقیروں کو دے دی جائے یا علاوہ جمعہ کے اور دنوں میں بھی دے دی جائے۔ زکوۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الكريم

(۱) زکوۃ کی رقم سے کتابیں خرید کر بطور تملیک طلبہ کو دینے سے تو زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ اور اگر ان کو مدرسہ میں وقف کر دیا گیا تو زکوۃ ادا نہیں ہوتی کہ اس میں تملیک ہی متحقق نہیں ہوئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) بہتر ہے کہ ساری زکوۃ کی رقم حساب کر کے اپنے مال سے جدا کر کے علیحدہ رکھدی جائے پھر اختیار ہے کہ اس کو یکمشت ادا کر دیا جائے یا متفرق طور پر مختلف اوقات و ایام میں تھوڑی تھوڑی ادا کرتے رہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اہل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۶۸)

کیا فرماتے علمائے کرام ان مسائل میں کہ

(۱) حیلہ شرعیہ کے ساتھ صدقہ فطر کو دینی مدارس میں صرف کر سکتے ہیں کہ نہیں۔ اور حیلہ کرنا کس حدیث سے ثابت ہے۔ لك صدقة ولنا هدية۔ سے ثابت ہوتا ہے کہ نہیں؟۔

(۲) صدقہ فطر تو عید کے دن صبح صادق کے بعد واجب ہوتا ہے، تو اگر کسی نے قبل وجوب ادا کر دیا تو ادا ہوا کہ نہیں۔ مثلا رمضان ہی میں ادا کر دے۔ فطرہ ادا کرنا قبل نماز عید مسنون ہے۔ لیکن اگر کسی نے بعد نماز عید یا دو چار دن کے بعد ادا کیا تو صحیح ہوا کہ نہیں۔ حدیث میں جو یہ فرمایا گیا کہ جب تک فطرہ ادا نہیں کیا جاتا اسکے نماز و روزے آسمان و زمین کے درمیان معلق رہتے ہیں تو جب تک ادا نہ کیا معلق ہی رہیں گے تو اگر کسی نے مدرسہ کو دے دیا اور جب تک اس کا حیلہ نہ ہوا معلق ہی رہے گا یا ادا کرنے والے کے نماز روزے آسمان پر چلے جائیں گے؟۔

(۳) دور حاضر میں جب کہ لوگ دینی باتوں اور دینی مدارس کی امداد سے بالکل یا اکثر الگ تھلگ رہنے لگے ہیں ایسے وقت میں مدارس کا اجراء اور کوشش سے مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کر کے، زکوۃ اور فطرہ کو حیلہ کر کے اس کام میں صرف کرنا فقیروں اور رشتہ داروں کو دینے سے افضل ہوگا۔ کہ نہیں، جو لوگ دینی مدارس میں ایک پیسہ بھی دینا گوارہ نہیں کرتے اور فطرہ اور زکوۃ تو کچھ دے بھی دیتے ہیں۔ دینی مدارس میں ضرورتا ہندی وانگریزی کی تعلیم دلانا تا کہ بچے لکھنے پڑھنے کے قابل ہو جائیں اپنی ضرورت میں کسی کے محتاج نہ رہیں۔ مسلمانوں کے بچے انگریزی اسکولوں میں نہ جائیں، اور جو وہاں خباثت ہوتی ہے۔ اس سے بچانے کی غرض ہو تو بہتر ہے کہ نہیں۔ جبکہ اسی زکوۃ اور فطرہ ہی کو حیلہ کر کے، مدرسین کی تنخواہ میں دیا جاتا ہو۔ ایک مدرسہ ایسا ہے جس میں صرف یا اکثر مالداروں کے بچے پڑھتے ہیں اس مدرسہ میں فطرہ اور زکوۃ کا روپیہ حیلہ کر کے لگایا جا سکتا ہے کہ نہیں۔

(۴) اور حیلہ قرآن وحدیث کے موافق کرنے کا طریقہ کیا ہے اور اعلان کرنا کہ فطرہ اور زکوۃ مدرسہ میں دو اس اعلان پر جس کی بنتی ہوئی اس نے لا کر دیا ور جس کی مرضی نہیں ہوئی اس نے نہیں دیا جس طرح آجکل تمام مدارس دینیہ کے لئے اشتہار کے ذریعہ اعلان کیا جاتا ہے۔ خطوط لکھے جاتے ہیں ان سے کہا جاتا ہے، کہ فطرہ اور زکوۃ سے مدارس کی امداد کرو تو یہ اعلان جائز ہے کہ نہیں۔ اب اس صورت میں جس نے لا کر مدارس کو دیا تو جائز ہوا کہ نہیں اور دینے والے کا فطرہ اور زکوۃ ادا ہوا کہ نہیں اور اعلان تو اسی واسطے ہوتا کہ لوگ اس طرف متوجہ ہوں۔ سوالات مذکورہ کے جوابات بڑی تفصیل سے درکار ہیں۔ حیلہ کی تعریف کیا ہے؟۔

محمد عالم اعظمی پالی مارواڑ

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

(۱) بلاشک حیلہ شرعیہ کے بعد مال زکوۃ، صدقہ فطر کو دینی مدارس میں صرف کرنا جائز ہے۔

درمختار میں ہے۔ و قدمنا ان الحیلة ان یتصدق علی الفقراء ثم یا مر بفعل هذه الاشیاء ای الصرف الی کل مالا تملیك فیه کمسجد و مدرسه و قنطرة۔)

فتاوی عالمگیری میں ہے: و کذالك من علیه الزکوة لو اراد صرفها الی بناء المسجد او القنطرة لا یجوز فان اراد الحیلة ففی الحیلة ان یتصدق به المتولی علی الفقراء ثم الفقرا ء ید فعون الی المتولی ثم المتولی یصرف الی ذالك کذافی الذخیره۔

الاشباہ والنظائر میں ہے: والحیلة فی التکفین بها التصدق بها علی فقیر ثم هو یکفن فیکون الثواب لهما و کذا فی تعمیر المساجد۔

حموی شرح الاشباہ والنظائر میں ہے: (قوله والحیلة فی التکفین بها ای الزکوة و المراد الذی وجب تملیکه لا داء فرض الزکوة قوله فیکون الثواب لهما له ثواب الصدقة وللفقیر ثواب التکفین و کذالك جمیع ابواب البر التی له یتاتی التملیك فیها کعمارة المساجد و بناء القناطیر والرباطات۔ (حموی کشوری)

اب باقی رہا یہ امر کہ حیلہ کا جواز کس نص سے ثابت ہے تو خود قرآن کریم میں ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام ۔نے اپنے زمانہ مرض میں اپنی بیوی کے بسبب ان کے دیر میں آنے پر سو ضربیں مارنے کی قسم کھائی تھی۔ پھر جب اچھے ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی قسم پوری کرنے کے لئے یہ حیلہ تعلیم فر جس کو قرآن کریم میں نقل فرمایا:

و خذ بیدك ضغثا فاضرب به و لا تحنث۔ (سورہ ص۔ رکوع۔۳)

اور فرمایا کہ اپنے ہاتھ میں جھاڑو لے کر اس سے مار دے اور قسم نہ توڑے۔

حضرت حجۃ الاسلام امام ابو بکر رازی تفسیر احکام القرآن میں تحت آیہ کریمہ فرماتے ہیں،

و فیها دلیل علی جواز الحیلة فی التوصل الی ما یجوز فعله و دفع المکروه بها عن نفسه وعن غیره لا ن الله تعالیٰ امره بضربها بالضغث لیخرج به من الیمین ولا یصل الیها کثیر ضرر۔ (احکام القرآن ج۔۳ص ۲۷۳)

آیت میں حیلہ کے جائز ہونے پر دلیل ہے کہ وہ حیلہ اپنے نفس سے اور غیر کی طرف سے دفع مکروہ اور جواز فعل کی طرف ذریعہ ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب کو جھاڑو لیکر اپنی بیوی کے مارنے کا حکم فرمایا تا کہ وہ اس کے سبب قسم پوری کرے اور اسکو زیادہ ضرر نہ پڑے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے۔ اس آیت کریمہ سے جواز حیلہ پر اس طرح استدلال فرمایا گیا:

وهذا تعلیم المخرج لا یوب النبی علیه و علی نبینا الصلوة و السلام عمن یمینه اللتی حلف لیضربن امرأته مائة عود و عامة المشائخ علی ا ن حکمها لیس بمنسوخ وهو الصحیح من المذهب کذا فی الذخیرة۔ (فتاوی عالمگیری، ج۴ص ۳۷۶)

یہ حضرت ایوب علی نبینا علیہ الصلوۃ والسلام کو انکی اس قسم سے خلاصی کی تعلیم ہے کہ انہوں نے اپنی

بیوی کی سو لکڑی مارنے کی قسم کھائی تھی۔ تو عام مشائخ کا یہی قول ہے۔ کہ آیت کا حکم منسوخ نہیں ہے۔ اور یہی صحیح حدیث ہے۔ اسی طرح ذخیرہ میں ہے۔

اس آیہ کریمہ اور اس کی تفسیر سے ثابت ہو گیا کہ حیلہ جائز ہے اور اسکا جواز قرآن کریم سے ثابت ہے۔ اسی طرح اس حیلہ کا جواز حدیث شریف سے بھی ثابت ہے۔ بخاری شریف میں ہے۔

ان رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم استعمل رجلا على خيبر فجائه بتمر جنيب فقال رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم آكل تمر خيبر هكذا قال لا والله يارسول الله ـ انالناخذا لصاع من هذا بالصاعين، والصاعين بالثلاثة، فقال رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم لا تفعل ـ بع الجمع بالدراهم تم ابتع بالدراهم جنبيا۔

(بخاری، ج ا۔ ص ۲۹۳)

بے شک رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک شخص کو خیبر پر عامل بنایا تو وہ دربار رسالت میں جنیب نامی کھجور لیکر حاضر ہوئے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خیبر کی ہر کھجور ایسی ہی ہوتی ہے۔ عرض کیا نہیں یا رسول اللہ۔ ہم یہ کھجور ایک صاع دو صاع دیکر لیتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ایسا مت کرنا، اپنی کھجوروں کو درہم سے بیچنا، پھر ان درہموں سے یہ جنیب کھجور خریدنا۔

و فى مسلم ويلك اربيت اذا اردت ذلك فبع تمرك بسلعة ثم اشتر بسلعتك اى تمر شئت ـ (مسلم شریف،، ج ۲ص ۴۷)

مسلم شریف میں ہے، تیرے لئے خرابی ہو، تو نے سود لے لیا۔ جب تو ایسا ارادہ کرے تو اپنی کھجور کو سامان سے بیچنا، پھر اپنے اس سامان سے جو کھجور چاہے خرید لینا۔

تو اس حدیث شریف سے حیلہ کا جواز ثابت ہو گیا۔ لہذا حیلہ کا جواز قرآن و حدیث سے ثابت ہو گیا۔ لہذا اب کوئی مسلمان اس کے خلاف نہ کہہ سکتا ہے نہ اس کے جواب میں تامل کر سکتا ہے۔ اب رہی سائل کی پیش کردہ حدیث کے یہ الفاظ (لك صدقة ولنا هدية)۔

تو اس سے تبدیل ملک کا تبدیل حکم پر استدلال کیا ہے۔ علامہ نووی شرح مسلم میں اس کی شرح میں فرماتے ہیں: ان الصدقة اذا قبضها المتصدق عليه زال عنها وصف الصدقة وحلت لكل احد ممن كانت الصدقة حرمت عليهم۔ (شرح مسلم، ص ۳۴۵)

بے شک صدقہ جب اس پر صدقہ لینے والے کا قبضہ ہو گیا، تو پھر اس سے صدقہ کا وصف زائل ہو جاتا ہے، اور اب وہ ہر اس شخص کے لئے حلال ہو گیا جس پر پہلے حرام تھا۔

تو اس حدیث کے کلمات سے جواز حیلہ پر استدلال نہیں کیا جاتا ہے بلکہ استدلال اس حدیث سے کیا گیا ہے، جس کو ہم نے پیش کیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۴) صدقہ فطر یوم عید الفطر میں صبح صادق سے واجب ہو جاتا ہے۔ تو جس نے قبل وجوب رمضان المبارک ہی میں دے دیا تو اس کا ادا کرنا درست ہو گیا۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: وان قدموها على يوم الفطر جاز۔

اور فطرہ کا قبل نماز عید ادا کرنا مستحب ہے۔

اسی عالمگیری میں ہے۔ والمستحب للناس ان يخرجوا الفطرة بعد طلوع الفجر يوم الفطر قبل الخروج الى المصلى،

پھر جس نے بعد نماز عید یا دو چار دن کے بعد یا دو چار ماہ کے بعد ادا کیا تو وہ صدقہ فطر ادا ہی ہو گا کہ اس کے ادا کا وقت تمام عمر ہے۔

اسی عالمگیری میں ہے: و اما وقت ادائها فجميع العمر عند عامة مشائخنا رحمهم الله، اسی لئے صدقہ فطرہ بغیر ادا کئے ذمہ سے ساقط ہی نہیں ہو گا۔ اسی عالمگیری میں ہے وان اخروه عن يوم الفطر لم تسقط و كان عليهم اخراجها كذا فى الهداية ۔ اور جب اس نے کسی مدرسہ کے متولی کو دے دیا، تو اس نے تو ادا ہی کر دیا تو پھر تعلیق صوم وصلوۃ کی وعید اس سے متعلق نہیں ہو سکتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۳) فی الواقع دور حاضر میں دینی مدارس کس مپرسی کے احوال میں ہیں۔ تو بغرض اعانت دین واحیاء علم۔ زکوۃ وصدقہ فطرہ کا بعد حیلہ شرعیہ کے دینی مدارس میں دینا اور امور میں دینے سے افضل ہونا چاہیے کہ عالمگیری میں ہے: التصدق على الفقير العالم افضل عن التصدق على الجاهل الفقير ۔ اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ اعانت علم سبب افضلیت ہے۔ اب باقی رہا ہندی انگریزی، کے وہ مدارس جن میں صرف زبان کی تعلیم مقصود ہو، اور ان میں وہ کتابیں نہ پڑھائی جاتی ہوں، جن میں خلاف شرع اور مخرب اخلاق مضامین ہوں، اور انکو محض اس غرض کے حصول کے لئے جاری رکھنا ہے، کہ مسلمان بچے غلط تعلیم وخلاف شرع مضامین سے بچ جائیں تو ایسے مدارس میں زکوۃ وصدقہ فطر کو حیلہ کرنے کے

بعد تنخواہ مدرسین میں دینا جائز ہے۔ پھر چاہے ان مدارس میں مالداروں کے بچے تعلیم پاتے ہوں یا غربا وفقرا کے۔ عبارات جواب نمبر ایک میں منقول ہوئیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۴) حیلہ کا جواب قرآن وحدیث سے جواب نمبر ایک میں پیش کر دیا گیا۔ نیز اس کا طریقہ بھی گزر چکا کہ مال زکوۃ وصدقہ فطر اسی بنا پر اس فقیر کو مال کے دینے کا ثواب ملے گا۔ کہ وہ اپنا مملوکہ مال بغیر عوض کے اعانت وحمایت علم میں دیتا ہے۔ اور زکوۃ وفطرہ دینے والے کو ایک ثواب تو صدقہ دینے کا ملے گا، اور دوسرا ثواب اس فقیر کے اعانت علم دین میں دینے کا سبب ہونے کا۔ کہ یہ اگر اس فقر کو نہ دیتا تو وہ فقیر امداد علم دین میں کہاں سے دیتا، تو یہ اس کے دینے کا سبب بنا اور حدیث شریف میں وارد ہے: الدال علی الخیر کفا علہ۔ تو اس زکوۃ وفطرہ دینے والے کو نہ فقط ایک ثواب، بلکہ دوگنہ ثواب ملنے کی قوی امید ہے۔

بالجملہ مال زکوۃ وفطرہ کا بعد حیلہ شرعی کے مدارس دینیہ میں دینا بلاشبہ جائز ودرست ہے۔ بلکہ مدارس میں اخراجات طلبہ کی امداد ہے۔ جس میں زکوۃ فطرہ بغیر حیلہ کے بھی جائز ہے۔ کہ یہ طلبہ مصارف زکوۃ وفطرہ کا بہترین مصرف ہیں۔

درمختار میں ہے: ان طالب العلم یجوز لہ اخذا لزکوۃ و لو غنیا اذا فرغ نفسہ لا قادۃ العلم واستفادتہ لعجزہ عن الکسب۔ پھر جب زکوۃ وفطرہ کی مدارس کی بعض مدات میں بغیر حیلہ کے اور بعض میں حیلہ کے بعد دینا جائز ثابت ہوا تو ان کے لئے اعلان یا اشتہار دینا اور امداد کی ترغیب اور اپیل کرنا کس طرح ناجائز ہوسکتا ہے۔ الاشباہ والنظائر میں حیلہ کی یہ تعریف لکھی ہے،۔ وھی تقلیب الفکر حتی یھتدی الی المقصود۔ یعنی حیلہ فکر کا گردش کرنا ہے یہاں تک کہ وہ مقصود تک راہ پا جائے۔ اسی بنا پر حیلہ کی دو قسم ہیں۔ تو ہر وہ حیلہ جو غیر کا حق باطل کرنے یا حق غیر میں شبہ پیدا کرنے یا باطل کو آراستہ کرنے کے لئے کیا جائے وہ ناجائز یا مکروہ تحریمی ہے۔ اور ہر وہ حیلہ جو حرام سے خلاصی کے لئے یا حلال کا ذریعہ بنانے کے لئے کیا جائے، وہ جائز و مستحسن ہے۔

اسی الاشباہ اور فتاوی عالمگیری میں ہے: فنقول مذھب علمائنا ان کل حیلۃ یحتال بھا الرجل لا بطال حق الغیرا ولا دخال شبھۃ فیہ اولتمویہ باطل فھی مکروھۃ تحریما و کل حیلۃ یحتال بھا الرجل لیتخلص بھا عن حرام اولیتو صل بھا الی حلا ل فھی حسنۃ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۶۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) ہمارے پاس دو قسم کی زمین ہے ایک ایسی ہے کہ ہم مالک ہیں جس کو ہم بیع وہبہ سب کچھ کر سکتے ہیں صرف اس کا محصول گورنمنٹ کو دینا پڑتا ہے۔ اس میں عشر واجب ہے یا نہیں۔ دوسری زمین ایسی ہے کہ ہم کسی پارسی بنئے سے سالانہ رقم دیکر جس کو پٹکا کہتے جوتنے بونے کے لئے لے لیتے ہیں اس کو محصول خود پارسی بنیا حکومت کو ادا کرتا ہے ہم فقط سالانہ مقرر کردہ رقم بنئے کو دیتے ہیں اس میں عشر واجب یا نہیں۔

(۲) ۵۰ من اناج پیدا ہوتا ہے اور ۶۰۔۷۰ من خرچ ہوتا ہے تو اس میں عشر واجب ہے یا نہیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) جو زمین اپنی مملوکہ ہے اور خود اپنی کاشت میں ہو اور وہ بارش کے پانی سے پرورش ہوا ہو تو بلا شبہ اس کی پیداوار میں عشر واجب ہے۔

لان النماء له مع ملكه فكان اولى بالايجاب عليه كما صرح به الشامی۔

اور گورنمنٹ کے محصول کے ادا کرنے سے عشر شرعی ادا نہیں ہوتا۔ اور جو زمین مسلم کی مملوکہ نہیں بلکہ کافر کی ہے اور مسلمان نے اس کو بطور اجارہ لیکر کاشت کی تو وہ عشری زمین تو ہے نہیں کہ کافر کی مملوکہ تو وہ جب قابل زراعت ہے اسکے مالک پر خراج واجب ہے مسلم کاشتکار پر نہ عشر واجب نہ خراج۔

ردالمحتار میں ہے: والحاصل انه يجب الخراج على الموجر والمعيران بقيت الارض صالحة لزراعه ۔

تو مسلم پر قسم اول کی زمین میں یقیناً عشر واجب ہے اور قسم دوم میں نہ عشر واجب نہ خراج۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) عشر پیداوار پر ہوتا ہے اس کے وجوب کے لئے نہ تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس میں مصارف

زراعت کس قدر ہوتے ہیں نہ یہ ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ خراج کتنا ہے بلکہ اس میں نہ سال گذرنے کی شرط ہے نہ اس چیز کے باقی رہنے کی شرط ہے نہ اس میں نصاب کی شرط ہے یہاں تک کہ ایک صاع میں بلکہ نصف صاع بھی پیداوار ہو تو اس میں عشر واجب ہے۔

ردالمحتار میں ہے: فیجب فیما دون النصاب بشرط ان یبلغ صاعاوقیل نصفه وفی الخضروات اللتی لاتبقی وهذا قول الامام وهو الصحیح۔

تو ۵۰ من اناج کی پیداوار ہو تو بہت ہے۔ لہذا اگر یہ ۵۰ من بارش سے پیدا ہوئے تو اس میں عشر یعنی ۵ من اناج واجب ہے اور اگر آب پاشی سے پیدا ہوئے تو نصف عشر یعنی اڈھائی من اناج واجب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۷۰)

خدمت حضرت فیض درجت محبوب ملت حضرت مولانا مولوی رئیس المفتیین الحاج الشاہ محمد اجمل صاحب قبلہ مفتی ہند دامت برکاتہم بعد سلام مسنون

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ان مسائل میں

(۱) اگر امام مسجد مالک نصاب نہ ہو تو اس کو فطرہ لینا جائز ہے یا نہیں؟۔

(۲) اگر امام مسجد قرضدار ہو اور وہ اگر اپنے قرض کے لئے فطرہ لے تو دینا جائز ہے یا نہیں؟۔

(۳) اگر امام مسجد قرضدار ہو اور آدمی اس کو دینا نہ چاہیں اور دوسرے شہر سے کسی امام مسجد کو بلا کر اس کو دینا چاہیں تو یہ امام مسجد کی حق تلفی ہے یا نہیں۔ بینوا توجروا

مرسلہ نظام الدین الرضوی الحامدی غفرلہ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) امام اگر سید یا مالک نصاب ہے تو اس کو زکوۃ اور صدقہ فطر کا لینا جائز نہیں۔ ہاں جب وہ سادات سے نہ ہو اور مالک نصاب بھی نہ ہو تو وہ زکوۃ اور فطرہ لے سکتا ہے اگر یہ زکوۃ اور فطرہ امامت کے عوض اور اجرت میں نہ ہو اسی بنا پر جن مقامات میں امامت کی تنخواہ نہیں ہوتی اور بجائے تنخواہ کے ان کو

سال بھر میں زکوۃ وصدقہ فطرہ دیا جاتا ہے۔ یا امامت کی تنخواہ تو مقرر ہے لیکن وہ اس قدر قلیل ہے کہ اس سے امام کی ضروریات پوری نہیں ہوسکتیں تو اس کمی کے پورا کرنے کے لئے وہ لوگ امام کو زکوۃ وصدقہ وفطرہ دیدیا کرتے ہیں۔ یا وہاں کے عرف ورواج میں امام کو زکوۃ وصدقہ فطر امامت کے عوض واجرتت سمجھ کر دیا جاتا ہے۔ تو ایسے مقامات میں امام اگرچہ غیر سید ہو اور مالک نصاب نہ ہو اس کو زکوۃ وصدقہ فطر جائز نہیں۔

(۲) جب امام غیر سید ہو اور قرضدار ہو تو اس کے قرض ادا کرنے کے لئے صدقہ فطر دینا اس صورت میں تو جائز ہے جو اوپر کی تفصیل کے اعتبار سے کسی طرح امامت کی اجرت عوض میں نہ ہو اور اگر صدقہ فطر کا دینے والا امامت کی اجرت سمجھکر دیتا ہے تو ہرگز جائز نہیں۔

(۳) امام مسجد کا بلحاظ عوض امامت اہل مسجد پر زکوۃ وصدقہ فطر میں شرعا کوئی حق نہیں۔ ہاں جب امامت کی اجرت کا کوئی شائبہ بھی نہ ہو اور دوسرے شہر کے امام سے کوئی رشتہ نہ ہو۔ یا وہ زیادہ حاجتمند اور پرہیزگار نہ ہو تو اپنے امام مسجد کے مقابلہ میں دوسرے شہر اور غیر کو دینے میں اس کی حق تلفی ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب ۳۰ رشوال المکرم ۱۳۷۸ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۷۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
ضلع کمروپ میں انجمن کمیٹی نے ایک مدرسہ بنانے کے لئے ارادہ کیا ہے لیکن مجبوری کیوجہ سے صدقہ فطر اور قربانی اور زکوۃ کے پیشہ کو جمع کیا ہے اور مدرسہ بنانے کو پوری امید ہے، لیکن ایک مولوی صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ مدرسہ بنانے سے پہلے اس میں صدقہ فطر اور قربانی اور زکوۃ کا پیسہ جمع کرنا حرام اور ناجائز ہے تو پھر اسے جمع کرنے کا شریعت میں کیا حکم ہے جائز ہے یا نہیں؟۔ دلیل کے ساتھ بیان فرمادیں۔　عریض الدین مدرسہ اسکول علی کاش کمروپ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صدقۂ فطر۔ قربانی۔ زکوۃ کا پیسہ جمع کرنا حرام وناجائز نہیں، ہاں مدرسہ میں صرف کرنے سے

پہلے اس رقم کا حلالہ کرنا ضروری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۷۹ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

کتاب الصوم

الجواب

(۴۳)

باب رویت الہلال

مسئلہ (۵۷۲)
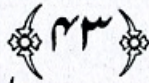
قبلہ جناب مولوی صاحب............................دام اقبالہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گذارش احوال آنکہ ایک خط آپ کے پاس روانہ کیا گیا پچھّم تھوک سے جس میں شاید ہی ہمارے متعلق باتیں لکھی ہونگی اور جہاں تک خیال ہے کہ عید کی نماز کے بابت لکھا ہوگا۔لہٰذا یہ مسئلہ ہے کہ میں نے چاند نہیں دیکھا اور نہ ہمارے پاس کوئی شرعی ثبوت ملا۔ایک داڑھی منڈھے نے لکھنؤ میں دیکھا ہوگا اس نے آکر کے کہا سب لوگوں نے اس کی بات پر یقین کرلیا تو جمعرات کے دن عید منائی۔مجھ سے کہا گیا کہ آپ عید کی نماز پڑھا دیجئے میں نے انکار کردیا کہ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں آیا اور نہ ہم نے چاند دیکھا اس لئے میں مجبور ہوں۔اس حالت میں نماز پڑھنا چاہئے یا نہیں۔لہٰذا میں آپ کے پاس خط روانہ کرتا ہوں جلد از جلد جواب سے مطلع کرے گا۔اور اسی خط کی پشت پر جواب روانہ کردیجے گا اور داڑھی منڈے کی گواہی بشریعت مانی جاتی ہے یا نہیں یہ بھی لکھئے گا تاکہ سب کو معلوم ہوجائے بس یہی قصہ ہے اور قبلہ مولوی خلیل احمد صاحب بجنوری بھی موجود تھے اس دن انہوں نے عید کی نماز جمعہ کو پڑھی تھی قریباً سو آدمی تھے جمعہ کے دن نماز پڑھنے والے تھے۔میں نے صرف اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے نماز نہیں پڑھائی کہ کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہم سے پوچھے کہ تم نے چاند نہیں دیکھا کوئی شرعی ثبوت نہیں پہونچا تم نے نماز کیوں پڑھائی تو کیا جواب دیتے اس وجہ سے نماز نہیں پڑھائی اس پرچہ کی پشت پر فتویٰ دیجئے گا باقاعدہ مہر یا دستخط آپ کے موجود ہوں۔

از گنج ڈونڈوارہ طرف پیش امام پچھّم تھوک بتاریخ ۷ اگست ۱۳۵۶ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جب آپ کے قصبہ میں چاند نہیں دیکھا گیا نہ باہر سے کوئی شرعی طور پر بطریق موجب کوئی

ثبوت رویت ہلال کامل سکا تو آپ کے اہل قصبہ پرتیس کے چاند کے حساب سے جمعہ کے دن ہی نماز عید کا پڑھنا ضروری تھا اس بنا پر آپ کا جمعہ کو نماز عید پڑھانا بالکل صحیح اور موافق شرع ہے۔ اوران احوال کے ماتحت جن لوگوں نے زبردستی بلا ثبوت شرعی کے جمعرات کو نماز عید پڑھی ان کی ہرگز ہرگز نماز عید نہیں ہوئی۔ اور بلا شک داڑھی منڈانے والا فاسق ہے شرعاً اس کی گواہی وخبر غیر معتبر ونا مقبول ہے۔

طحطاوی میں ہے: لا یقبل خبر الفاسق اتفاقا وفی البحر قول الفاسق فی الدیانات التی یمکن تلقیها من العدول غیر مقبول کالهلال وروایة الاخبار ولو تعدو کفاسقین فاکثر۔ (طحطاوی مصری صفحہ ۳۸)

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ رویت ہلال میں فاسق کا قول مقبول نہیں اگرچہ فاسق ہو یا ان سے زائد۔ حضرت مولینا خلیل احمد صاحب نے بالکل حکم شرع کے موافق عمل کیا۔ اہل قصبہ کو بھی ایسا ہی کرنا تھا میں نے جو وہاں کے لئے فتویٰ لکھا اس کو بعینہ نقل کر کے روانہ کیا جاتا ہے اس فتوے میں بھی یہی حکم ہے جیسا کہ آپ کو اس کے مطالعہ سے ظاہر ہو جائیگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

۱۹ محرم الحرام / ۱۳۷۶ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۷۳)

کیا فرماتے ہیں علماء دین مندرجہ ذیل مسائل میں ہر ایک سوال کا جواب مع حوالہ وحدیث وفقہ بیان کریں۔

(۱) ڈاک سے آئے ہوئے خط کی خبر اور ریڈیو ٹیلی ویژن فون ٹیلی گراف۔ تار وغیرہ کی خبریں قابل اعتبار ہیں یا نہیں؟۔

(۳) عینی شہادت سے کیا معنیٰ ہیں اور کن شرائط سے اسے قابل قبول کیا جا سکتا ہے؟۔

(۴) شہادت علی الشہادت کے کیا معنیٰ ہیں اس کو جائز قرار دینے کے لئے کیا کیا شرائط ہیں؟۔

(۵) خط القاضی الی القاضی کے کیا معنی ہیں اور کن شرائط سے اسے قابل اعتبار سمجھا جا سکتا ہے؟

(۶) ایک جگہ کے قاضی کا دوسری جگہ کے قاضی کے علاوہ کسی غیر کے نام دستخط ومہر والا خط دوسری جگہ کا قاضی قبول کر سکتا ہے یا نہیں؟۔

(۷) کسی کی گواہی یا خط کو قبول کرنے کا قاضی کو اختیار ہے یا نہیں؟۔

(۸) ایک جگہ سے دوسری جگہ کی خبر کے لئے کتنے میل کا فاصلہ ہونا ضروری ہے یا شرعاً اس کی کوئی حد ہے یا نہیں؟۔

(۹) قاضی کے اعلان کے خلاف عید وغیرہ تہوار منانا جائز ہے یا نہیں؟۔

(۱۰) اجماع کے کیا معنیٰ ہیں۔عوام کا اتفاق یا صرف علماء کا اتفاق۔اور اجماع کے خلاف کرنے والوں کے لئے شرعا کیا حکم ہے؟۔

(۱۱) زمانہ حال میں جب کہ اسلامی حکومت نہیں ہے قاضی بننے کے لئے کون شخص مستحق ہے؟۔

(۱۲) یہ آج کے نکاح خوانی موروثی قاضی جن میں اکثر تو شرعی مسائل سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔اگر یہ اپنا نائب کسی عالم دین کو بنا کر شرعی مسائل میں ان کے فیصلہ پر عمل کر کے اعلان کر سکتے ہے یا نہیں؟۔

(۱۳) اسی طرح وہ اپنے نائب اور قضاۃ کمیٹی بنا کر ان کے فیصلہ پر اعلان کر سکتا ہے یا نہیں؟۔

المستفتی، امین الدین سراج الدین سگرام پور سورت گجرات۔

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

(۱) رویت ہلال کے متعلق احادیث میں یہ آیا ہے، مسلم شریف میں ہے:

قال رسول الله ﷺ اذارائيتم الهلال فصوموا واذا رأيتموه فافطروا فان غم عليكم فصوموا ثلثين يوماً (وفی رواية) فان غم عليكم فاكملو العدة ثلاثين يوماً (وفی رواية) فان غم عليكم فاتموا ثلاثين (وفی رواية) فان غم عليكم الشهر فعدوا ثلاثين (وفی رواية) فان غم عليكم فعدوا ثلاثين ثم افطروا (وفی رواية) فان غم عليكم فانها ليست تغمیٰ عليكم العدة رواها البيهقی فی السنن الكبریٰ

ان احادیث کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تم چاند دیکھ لو تو روزے رکھو اور جب تم اس کو دیکھو تو افطار کرو۔تو اگر چاند تم پر پوشیدہ ہو جائے تو تیس دن تک روزہ رکھو۔

(ایک روایت میں ہے) اگر چاند تم پر پوشیدہ ہو جائے تو تیس دن کی مقدار کو کامل کرو۔

(ایک روایت میں ہے) اگر چاند تم پر پوشیدہ ہو جائے تو تیس کو تمام کرو۔

(ایک روایت میں ہے) اگر چاند تم پر پوشیدہ ہو جائے تو تیس گن لو پھر افطار کرو۔

(ایک روایت میں ہے) اگر چاند تم پر پوشیدہ ہو جائے تو بیشک تم پر مقدار تو پوشیدہ نہیں ہے۔

ان احادیث میں انتیس تاریخ میں چاند پوشیدہ ہو جانے کی صورت میں بھی حکم فرمایا کہ تیس دن کے روزے پورے کرلو۔ اور اس کا حکم مختلف الفاظ وعبارت میں فرمایا۔ لیکن کسی حدیث میں یہ نہ فرمایا کہ اگر تمہارے شہر میں انتیس تاریخ کو چاند نہیں دیکھا ہے تو اسکی تحقیقات کے لئے کسی دوسرے شہر کو جاؤ تو رویت ہلال ہی کی تحقیق کرنے کے لئے اپنے شہر سے دوسرے شہر کو سفر کر کے جانا اب تک کسی حدیث میں تو دستیاب نہیں ہوا۔ پھر قرون ثلثہ کا بھی کوئی ایسا واقعہ نہیں مل سکا جس میں یہ ہوتا کہ حضرات خلفاء نے محض چاند کی تحقیق کے لئے کسی کو اپنے شہر سے دوسرے شہر کو روانہ کیا ہو۔ تو احادیث پر غور کرنے اور قرون ثلثہ کے عمل کو دیکھنے بلکہ کتب فقہ پر نظر کرنے سے اس امر کا ثبوت نہیں ملتا کہ دور سلف میں فقط رویت ہلال ہی کی تحقیق کرنے کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف سفر کیا گیا ہو۔ تو محض اسی غرض کے لئے اس قدر اہتمام کرنا فقط اسی مقصد کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرنا نہ واجب ثابت ہو انہ سنت و مستحب۔ بلکہ بہ تصریح محدثین انتیس کو رویت ہلال بطریق موجب ثابت نہ ہونے کی صورت میں تیس دن کی مقدار کا کامل کرنا واجب ہے علامہ نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

حاصله ان الاعتبار بالهلال فقد يكون تاماثلثين وقد يكون ناقصا تسعا وعشرين وقدلا يرى الهلال فيجب اكمال العدد ثلثين۔

تو جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ رویت ہلال کی تحقیق کرنے کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر جانا ضروری ہے تو وہ کوئی دلیل شرعی پیش کرے۔ اب باقی رہا یہ امر کہ اس تحقیق کے لئے جانے والوں کے قابل اعتبار ہونے کے لئے کتنے شرائط چاہئیں تو اس کا تفصیلی بیان یہ ہے

(۱) دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کا ہونا۔

(۲) ان کا عاقل و بالغ ہونا۔

(۳) ان کا مسلمان ہونا۔

(۴) ان کا عادل ہونا یعنی وہ کبیرہ گناہ نہ کرتے ہوں اور صغیرہ پر اصرار نہ کرتے ہوں۔

(۵) بینا ہونا۔

(۶) بولنے والا ہونا۔

(۷) دوسرے شہر میں بغرض تہادت علی الشہادت گئے ہوں تو شاہدان اصل کے نام ولدیت نہ
باپ بلکہ دادا کے ناموں کا یاد ہونا۔

(۸) شاہدان اصل کے اعلام عقل و بلوغ اور عدالیت سے خوب واقف ہونا۔

(۹) شاہدان اصل کا ان شاہدان فرع کو گواہ بنانا اور تحمیل شہادت کرنا۔

(۱۰) خود شاہدان اصل کی اس شہر میں حاضری کا دشوار ہونا۔

(۱۱) شاہدان فرع سے ہر ایک کا یہ گواہی دینا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ فلاں بن فلاں بن
فلاں اور فلاں بن فلاں بن فلاں نے سال فلاں ماہ فلاں دن فلاں کی شام کو انتیس کا چاند دیکھا اور ہر
ایک نے ہمیں اپنی اپنی گواہی پر گواہ کیا۔

(۱۲) اگر دوسرے شہر میں خط قاضی یا مفتی حاصل کرنے کے لئے جائیں تو اس شہر کے قاضی یا
مفتی سے شہادت رویت ہلال کا خط لکھنا۔

(۱۳) اس خط میں وہ قاضی یا مفتی اپنا نام ولدیت، پتہ لکھے پھر مکتوب الیہ قاضی یا مفتی کے نام
۔ولدیت۔ پتہ کر لکھ کر یہ تحریر کرے کہ میرے سامنے فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں نے فلاں سال
فلاں ماہ کا چاند فلاں دن کی شام کو دیکھنے کی شہادتیں دیں میں نے شاہدین کے تزکیہ وعدالت کے بعد
ثبوت رویت ہلال کا حکم دیا۔

(۱۴) اس خط کا ان شاہدان عادل کو سنانا۔

(۱۵) خط کو لفافہ میں بند کرنا۔

(۱۶) اس کو سربمہر کرنا۔

(۱۷) اس قاضی یا مفتی کا اس خط کو مجلس قضا یا افتا میں ان گواہوں کو سونپنا۔

(۱۸) ان گواہوں کا سربمہر خط کو باحتیاط اپنے قاضی یا مفتی شہر کے پاس لانا۔

(۱۹) اس سربمہر خط کو مجلس قضا یا افتاء میں دینا۔

(۲۰) یہ شہادت دینا کہ آپ کہ نام فلاں بن فلاں قاضی یا مفتی فلاں شہر کا خط ہے اس نے اس
خط کو ہمیں سنایا اور اسپر ہمیں گواہ بنایا اور مجلس قضاء یا افتاء میں ہمارے سامنے اس کو لفافہ میں بند کیا
اور سربمہر کیا اور ہم کو سونپا۔ یہ اسی کا خط ہے۔ اسی کا مضمون ہے ہم ان امور کی گواہی دیتے ہیں۔

(۲۱) بوقت ادائے شہادت یہ کہنا کہ میں شہادت یا گواہی دیتا ہوں۔

(۲۲) ادائے شہادت کیے لئے مجلس قضاء یا افتاء کا ہونا۔

(۲۳) گواہان کی عدالت کی تحقیق وتزکیہ کرنا۔ لہٰذا جو لوگ رویت ہلال کی تحقیق کرنے کے لئے دوسرے شہر میں جائیں تو ان کے قابل اعتبار ہونے اور ان کی شہادتوں کے معتبر ہونے کے لئے یہ شرائط ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) خط اور لفافہ جو ڈاک سے آئیں ان کی خبر نا قابل اعتبار اور غیر مقبول ہے۔ چنانچہ ہدایہ۔ الاشباہ والنظائر۔ درمختار۔ ردالمحتار۔ مجمع الانہر۔ عینی۔ فتاوے قاضی خاں۔ عالمگیری وغیرہ میں ہے " الخط يشبه الخط فلا يعمل به"۔ ریڈیو۔ ٹیلی فون۔ تار کی خبریں بھی نا قابل اعتبار ہیں۔

ہدایہ میں ہے: ولو سمع من وراء الحجاب لا يجوز له ان يشهد لوفسر للقاضی لايقبله لان النغمة تشبه النغمة فلم يحصل العلم۔

اور ان کے تفصیلی جواب میرے رسالہ "اجمل المقال" میں ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) عینی شہادت کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ شاہد نے اسکو خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہو۔ تو وہ بوقت ادائے شہادت یہ کہہ سکے کہ میں نے اسکو خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے لہٰذا عینی شہادت کے قابل قبول ہونے کے لئے یہ شرائط ضروری ہیں۔

(۱) ہر شاہد کا بوقت ادائے شہادت یہ کہنا کہ میں گواہی دیتا ہوں۔

(۲) شہادت کے لئے مجلس قضاء یا افتاء کا ہونا۔

(۳) گواہوں کا دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا۔

(۴) ان کا عاقل و بالغ ہونا۔

(۵) ان کا مسلمان ہونا۔

(۶) بینا ہونا۔

(۷) اپنی آنکھ سے خود دیکھنا۔

(۸) بولنے والا ہونا۔

(۹) عادل ہونا۔

(۱۰) شہادت رویت ہلال میں سال کا نام لینا۔

(۱۱) اور ماہ کا نام لینا۔

(۱۲) اور دن کا نام لینا۔

(۱۳) وقت رویت کا بتانا۔

(۱۴) مقام رویت کا نام لینا یہ سب عینی شہادت کے شرائط ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۴) شہادت علی الشہادت کے یہ معنیٰ ہیں کہ اس نے خود تو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا ہے۔ لیکن ان کے سامنے دو دیکھنے والوں نے گواہی دی۔ اور انہوں نے ان کو اپنی شہادت پر گواہ بنایا۔ تو اصل دیکھنے والے شاہدان اصل کہلاتے ہیں۔ اور ان گواہان فرع شہادت کو شہادۃ علی الشہادۃ کہتے ہیں۔ لہٰذا شہادۃ علی الشہادۃ کے یہ شرائط ہیں۔

(۱) گواہان فرع کو بوقت ادائے شہادت یہ کہنا کہ میں گواہی دیتا ہوں۔

(۲) شہادت کے لئے مجلس قضاء یا افتاء کا ہونا۔

(۳) ان گواہوں کا دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا۔

(۴) ان کا مسلمان ہونا۔

(۵) ان کا عاقل و بالغ ہونا۔

(۶) عادل ہونا۔

(۷) بولنے والا ہونا۔

(۸) گواہان اصل کے نام۔ ولدیت کا یاد ہونا۔

(۹) گواہاں اصل کے اسلام و عقل و بلوغ و عدالت سے واقف ہونا۔

(۱۰) گواہان اصل کا ان گواہان فرع کو گواہ بنانا۔

(۱۱) یہاں ان گواہان اصل کی حاضری کا دشوار ہونا۔

(۱۲) گواہان فرع سے ہر ایک کا اسطرح گواہی دینا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ فلاں بن فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں نے فلاں سال فلاں ماہ فلاں دن کی شام کو انتیس کا دیکھا اور ہر ایک نے مجھے اپنی اپنی گواہی پر گواہ کیا۔ تو شہادت علی الشہادۃ کے یہ شرائط ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۵) خط القاضی الی القاضی اس طرح ہوتا ہے۔ اس نے ثبوت ہلال کا حکم دیا پھر اس قاضی یا مفتی نے ایک خط لکھا جس میں اپنا نام و پتہ لکھ کر دوسرے شہر کے قاضی یا مفتی کے نام۔ ولدیت پتہ لکھ کر یہ تحریر کیا کہ میرے سامنے فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں نے فلاں سال فلاں ماہ کے چاند فلاں کی

شام کو دیکھنے کی شہادتیں دیں میں نے ان شہادتوں کولیکر شاہدین کے تزکیہ کے بعد انتیس کے چاند کا حکم دیا۔ اس خط کو دو گواہان عدل کو سنا کر ان کے سامنے ہی لفافہ میں بند کر دیا۔ پھر لفافہ کو سر بمہر کیا۔ اور ان کو اس خط پر گواہ بنا کر دیا۔ پھر یہ گواہ اسے سر بمہر خط دیں کہ آپ کے نام یہ فلاں بن فلاں قاضی یا مفتی فلاں شہر کا خط ہے۔ اس نے ہمیں اس خط کو سنایا اور اس پر ہمیں گواہ کیا اور ہمارے سامنے اس خط کو لفافہ میں بند کیا اور سر بمہر کیا۔ یہ اسی کا خط ہے۔ اس کا مضمون اسی کا ہے ہم ان امور پر گواہی دیتے ہیں لہٰذا اس خط کے قابل اعتبار ہونے کے لئے یہ شرائط ہیں۔

(۱) گواہان کا دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا۔

(۲) ان کا مسلمان ہونا۔

(۳) ان کا عاقل و بالغ ہونا۔

(۴) ان کا عادل ہونا۔

(۵) ان کا بینا ہونا۔

(۶) ان کا بولنے والا ہونا۔

(۷) گواہان کا مضمون خط خود سننا۔

(۸) ان کے سامنے خط کا لفافہ میں بند ہونا۔

(۹) لفافہ کا سر بمہر ہونا۔

(۱۰) ان گواہان کا خط پر گواہ ہونا۔

(۱۱) گواہوں کا اس خط کو مجلس افتا یا قضاء میں دینا۔

(۱۲) گواہان کا باحتیاط اس خط کو دوسرے شہر کے قاضی یا مفتی کے پاس لانا۔

(۱۳) اس سر بمہر خط کو اس مفتی یا قاضی کی مجلس افتاء یا قضا میں دینا۔

(۱۴) شہادت دینا کہ آپ کے نام یہ فلاں بن فلاں قاضی یا مفتی فلاں شہر کا خط ہے۔ اس نے ہمیں اس کو سنایا اور اس پر ہمیں گواہ کیا اور ہمارے سامنے اس کو لفافہ میں بند کیا اور لفافہ کو سر بمہر کیا۔ یہ اسی کا خط ہے۔ اور یہ اسی کا مضمون ہے۔ ہم ان امور پر گواہی دیتے ہیں۔

(۱۵) اس قاضی یا مفتی کا اس خط کو پڑھ کر گواہان کی عدالت و تزکیہ کے بعد اپنے شہر کے لئے حکم دینا۔ یہ سب شرائط خط قاضی الی القاضی کے معتبر و مقبول ہونے کے لئے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۶) شریعت نے خط القاضی الی القاضی کو معتبر رکھا ہے اور خط کسی غیر قاضی یا مفتی کے نام ہو تو جب قاضی یا مفتی مکتوب الیہ نہیں ہے۔ تو اس کو قبول بھی نہیں کر سکتا۔ در مختار میں ہے:

لو جعل الخطاب للمکتوب الیه لیس لنائبه ان یقبله ۔

ردالمحتار میں ہے: قوله لنائبه ان یقبله لانه قد کتب الی غیر ه ولو جعل الخطاب الی النائب وسماه باسمه لیس للمنیب ان یقبله لانه لایقبل الکتاب الا المکتوب الیه۔

تو جب قاضی یا مفتی اس خط کا مکتوب الیہ ہی نہیں تو وہ خط اس قاضی یا مفتی کیلئے نا قابل قبول ہے ۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۷) اگر شہادت اور خط قاضی کے تمام شرائط موجود ہوں ۔ جب تو اس شہادت اور خط قاضی کا قبول کرنا اور اس پر حکم دینا ضروری ہے۔

درمختار میں ہے: حکمها (ای الشهادة) وجوب الحکم علی القاضی لموجبها بعد التزکیة۔

عالمگیری میں ہے:۔ انما یقبله (ای الخط) القاضی المکتوب الیه عند وجود شرائط ۔ اور ان کے جب شرائط ہی میں کمی اور خامی باقی ہو تو قاضی کو ان کے قبول کر لینے کا اختیار حاصل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۸) جب ایک جگہ سے دوسری جگہ طریق موجب خبر پہونچ جائے تو اس کے معتبر و مقبول ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ خبر بطریق موجب ہو شرعاً اس کیلئے میل مقدار متعین ۔ نہ کوئی حد مقرر ۔ یہاں تک کہ اہل مغرب کی رویت پر اہل مشرق کو عمل کرنا واجب ہے۔

مجمع الانہر میں ہے: لو رأی اهل المغرب هلال رمضان یجب برویتهم علی اهل المشرق اذا ثبت عندهم بطریق موجب۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(مجمع الانہر مصری جلد ا صفحہ ۱۳۸)

(۹) قاضی کے اعلان و حکم کا اتباع ضروری ہے اور اس کی مخالفت ممنوع ہے بخاری و مسلم شریف کی حدیث شریف میں ہے " من یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعص الامیر فقد عصانی" تو خلاف حکم واعلان قاضی کے عید وغیرہ منانا ممنوع ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۱۰) شرعاً اجماع کے یہ معنیٰ ہیں کہ مجتہدین اور علماء امت کا ایک زمانہ میں کسی حکم شرعی پر اتفاق

کرلینا۔

چنانچہ توضیح و مسلم الثبوت وغیرہ میں ہے " الاجماع هو اتفاق المجتهدين من امة محمد ﷺ فی عصر علی حکم شرع " اب رہے عوام تو وہ ان امور شرعیہ میں تو اجماع میں داخل ہیں جن میں رائے کی طرف احتیاج نہیں اور جن میں رائے کی طرف احتیاج ہے تو ان میں ان کا اجماع میں کوئی دخل نہیں۔

توضیح میں ہے: اما عامة الناس ففيما لا يحتاج الى الرائے كنقل القرآن وامهات الشرائع داخلون فی الاجماع كالمجتيهدين وفيما يحتاج لا عبرة لهم "

اور مخالف اجماع شرعا کافر ہے۔

توضیح میں ہے " ليس المراد انه لو لم يوافق العوام لم ينعقد الاجماع حتى لا يكفر منكر الاجماع بل لا يمكن لاحد من الخواص والعام المخالفة حتى لو خالف احد يكفر "مسلم الثبوت میں ہے " انكار حكم الاجماع القطعى كفر عند اكثر الحنفية "۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۱۱) جن مقامات میں اسلامی حکومت نہیں۔ وہاں مسلمان اپنے مذہبی امور کے لئے کسی مسلمان عاقل بالغ دیندار صاحب سمع و بصر کو قاضی بنالیں۔ بہتر یہ ہے کہ وہ صاحب فتویٰ ہو جو احکام شرع کو کتاب اللہ اور احادیث و کتب عقائد و فقہ سے خود نکال سکے تو یہ قاضی جمعہ و عید وغیرہ امور کو بھی قائم کرے۔ اور لوگوں کو دینی امور میں صحیح رہنمائی کرے۔

ردالمحتار میں ہے: فى بعض بلاد المسلمين غلب عليهم الكفار كقرطبة الا ن يجب على المسلمين ان يتفقوا على واحد منهم يجعلونه واليافيولى قاضيا ويكون هو الذى يقضى بينهم و كذا ينصبو اماما يصلى بهم الجمعة۔ (ردالمحتار مصری جلد ۴ صفحہ ۳۴۱)

عالمگیری میں ہے: ينبغى للقاضى ان يقضىٰ بما فى كتاب الله وان لم يجد فى كتاب الله تعالىٰ يقضىٰ بما جاء عن رسول الله ﷺ ويجب ان يعلم المتواتر والمشهور وما كان من اخبار الاحاد ويجب ان يعلم مراتب الرواة وان كانت حادثة لم يردفيها سنة رسول الله عليه الصلاة والسلام يقضىٰ فيها بما اجتمع عليه الصحابة رضى الله عنهم فان كان شىء لم يات فيه من الصحابة قول و كان فيه اجماع التابعين قضى به وان لم يجى

شيء من ذالك فان كان من اهل الاجتهاد اجتهاد برايه فيه ثم يقضي به برايه وان لم يكن من اهل الاجتهاد يستفتىٰ في ذالك فيا خذ بفتوى المفتىٰ ولا يقضي بغير علم ملخصاً۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

اگران نکاح خواں قاضیوں میں کوئی قاضی عالم دین ہو لیکن اس کا اپنے شہر پر اقتدار ہو اور اکثر اہل شہر اس کی بات مانتے ہوں تو وہ کسی مفتی دین سے فتوے حاصل کر کے اس فتوے کے موافق اعلان کر سکتا ہے عالمگیری میں ہے "لو قلد جاهل وقضى هذا الجاهل بفتوىٰ غيره يجوز"۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

ظاہر ہے کہ یہ وہ قاضی شرع تو ہے نہیں جس کا مقرر کرنا بادشاہ اسلام کا کام ہے بلکہ یہ نام کے قاضی اکثر خاندانی ہوتے ہیں اور بعض مقامات میں ایسے قاضی بھی ہیں جن کو اہل شہر نے قاضی مقرر کر لیا ہے تو ان قاضیوں کے وہ اختیارات نہیں جو قاضی شہر کے اختیارات ہوتے ہیں۔

عالمگیری میں ہے " اذا اجتمع اهل بلدة على رجل وجعلوه قاضيا يقضي فيما بينهم لا يصير قاضياً " تو جب ہمارے اس وقت کے قاضی حقیۃً وہ قاضی ہی نہیں تو ان کو اپنا نائب بنانے اور قضاۃ وہلال کمیٹیاں بنانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ کیونکہ جب بادشاہ کا بنایا ہوا قاضی بلا اجازت بادشاہ اسلام کے خود اپنا نائب کسی کو مقرر نہیں کر سکتا۔

چنانچہ عالمگیری میں ہے:۔ السلطان اذا قال الرجل جعلتك قاضيا ليس له ان يستخلف الا اذن له في ذالك صريحا او دلالة " درمختار میں ہے " ولا يستخلف قاضي نائبا الا اذا فوض اليه صريحا او دلالة " تو اہل شہر کا بنایا ہوا قاضی یا خاندانی قاضی خود کسی کو اپنا نائب یا خلیفہ کس طرح بنا سکتا ہے علاوہ بریں ان قضاۃ وہلال کمیٹیوں میں کس قدر غلطیاں ہے:۔

(۱) قاضی و نائب قاضی کیلئے مسلمان صحیح العقیدہ ہونا شرط ہے عالمگیری میں ہے " ولا تصح ولاية القاضي حتى يجتمع في المولىٰ شرائط الشهادة من الاسلام والتكليف والحرية الـــــخ " یہاں تک کہ پنچ اور ثالث کے لئے بھی وہی شرائط ہیں جو قضاۃ کیلئے ہیں ردالمحتار میں ہے " واما الحكم فشرطه اهلية القضاء " اور مرتد ہو جانے سے تو قاضی اپنے منصب قضا ہی سے خود معزول ہو جاتا ہے عالمگیری میں ہے۔ " اربع خصال اذا حصلت بالقاضي صار معزولا ذهاب البصر وذهاب السمع و ذهاب العقل والردة " تو مرتدین نہ مسلمانوں کے قاضی ہو سکتے ہیں نہ نائب

قاضی نہ حکم ہوسکتے ہیں نہ پنچ۔ان کا فیصلہ وحکم مسلمانوں کے لئے صحیح نہیں ردالمحتار میں ہے "لم یصح قضائه علی المسلم حال کفره"۔اوران قضاۃ وحلال کمیٹیوں میں گمراہ اہل ضلال بلکہ مرتدین بھی رکن وممبر ہوتے ہیں تو ایسے نااہلوں کو قاضی یانائب قاضی بنانا ان کی سب سے پہلی شرعی غلطی ہے:

(۲) فساق کو قاضی یانائب قاضی بنانا احتیاط قضا کے خلاف ہے۔عالمگیری میں ہے "لا ینبغی ان یقلد الفاسق کذافی البدائع"۔اوران قضاۃ وہلال کمیٹیوں میں فاسق بھی رکن وممبر ہوتے ہیں تو فاسقوں کا قاضی یانائب قاضی بنانا ان کی دوسری شرع غلطی ہے:

(۳) قاضی ونائب قاضی عالم احکام دین کو بنایا جائے فتاویٰ قاضی خاں میں ہے "ومع اهلية الشهادة لا بد ان یکون عالما ورعا الخ" تو جاہلوں ناواقفوں کو قاضی یانائب قاضی بنانا ان کی تیسری شرعی غلطی ہے:

(۴) مرتدین کی شہادت شرعاً غیر معتبر ونامقبول ہے۔

صاحب درمختار کی شرح ملتقیٰ میں ہے "کل من کفر (ای اهل الهواء) کالمجسمه والخوارج وغلاة الروافض والقائلین بخلق القرآن لاتقبل شهادتهم"

(شرح ملتقیٰ مصری جلد۲ صفحہ ۴۰۰)

اس عبارت سے ثابت ہوگیا کہ فرق مدعیان اسلام میں رافضیوں،خارجیوں ، وہابیوں ،قادیانیوں غیر مقلدوں وغیرہ مرتدین کی شہادت شرعاً غیر مقبول ہے اور یہ قضاۃ وہلال کمیٹیاں ان مرتدین کی شہادتوں کو مقبول ومعتبر قرار دیکر حکم صادر کردیتی ہیں تو ان کی یہ چوتھی شرعی غلطی ہے۔

(۵) فاسقوں کی شہادت بھی شرعاغیر مقبول ونامعتبر ہے۔

ہدایہ میں ہے "وتشترط العدالة لان قول الفاسق فی الدیانات غیر مقبول"۔

اس عبارت سے ثابت ہوگیا کہ فاسقوں کی شہادت شرعاً غیر معتبر ونامقبول ہے اور یہ قضاۃ وہلال کمیٹیاں فاسقوں کی شہادتوں کو معتبر ومقبول ٹھہرا کر حکم صادر کردیا کرتی ہیں تو ان کی یہ پانچویں شرعی غلطی ہے:

(۶) مستور الحال جس کے عدالت وفسق کا حکم معلوم نہ ہو اس کی شہادت بھی علاوہ ہلال رمضان کے اور چاندوں میں غیر مقبول ہے۔

صاحب درمختار شرح ملتقیٰ میں فرماتے ہیں "وقیل فی هلال الفطر وذی الحجه وبقیة الا

شهر التسعة شهادة حرين او حرا و حرتين بشرط العداله و لفظ الشهادة"

(شرح ملتقی جلد۲ صفحہ ۲۳۶)

ترجمہ عید الفطر اور ذی الحجہ اور بقیہ نو ماہ کے چاند میں "دو آزاد مردوں یا ایک آزاد مرد اور دو عورتوں کی شہادۃ بشرط عدالت اور لفظ اشہد کے قبول کی جائیگی اس عبارت سے ثابت ہوگیا کہ سوائے ہلال رمضان کے اور عید الفطر و عید الاضحیٰ وغیرہ تمام شہور کے چاندوں کے لئے گواہوں کا عادل ہونا شرط ہے۔ تو مستور الحال کے بلا تزکیہ و تحقیق احوال کے اس کی شہادت کب معتبر قرار پائی اور ان قضاۃ و ہلال کمیٹیوں کا ایسے مستور الحال کے بلا تزکیہ و تحقیق احوال کے اس کی شہادت کو معتبر قرار دیکر حکم صادر کر دینا ان کی چھٹی شرعی غلطی ہے:

(۷) ان قضاۃ و ہلال کمیٹیوں میں بوقت ادائے عینی شہادت اس کے علاوہ (۱۴) شرائط جو سوال نمبر۳ کے جواب میں مذکور ہوئے ملحوظ نہیں رکھا جاتا تو شرعاً وہ عینی شہادت ادا ہی نہیں ہوئی اور جب وہ ادا نہیں ہوتی تو اس پر حکم کس طرح صحیح ہو جاتا ہے تو یہ ان کمیٹیوں کی ساتویں شرعی غلطی ہے:

(۸) اسی طرح ان کمیٹیوں میں کبھی دوسرے شہر سے شہادت علی الشہادۃ حاصل کی جاتی ہے تو شہادت علی الشہادۃ کے وہ (۱۴) شرائط جو سوال نمبر۴ کے جواب میں مذکور ہوئے پورے طور پر نہیں پائے جائے تو شرعاً وہ شہادت علی الشہادۃ ہی روا نہیں ہوتی اور جب وہ ادا نہیں ہوتی تو اس پر حکم کا صادر کرنا کب صحیح ہوا تو ان کمیٹیوں کی یہ شرعی آٹھویں غلطی ہے:

(۹) کبھی ان کمیٹیوں میں دوسرے شہر سے خط قاضی حاصل کرتے ہیں لیکن خط قاضی کے وہ (۱۵) شرائط جو سوال نمبر۵ کے جواب میں لکھے گئے۔ وہ علی وجہ الکمال ادا نہیں کئے جاتے تو شرعاً وہ خط قاضی رویت ہلال کے لئے حجت نہیں ثابت ہوا تو ان قضاۃ و ہلال کمیٹیوں میں اس خط کو زبردستی حجت قرار دیکر اس پر حکم صادر کر دینا کس قدر غلط حکم بن جاتا ہے۔ تو ان کمیٹیوں کی یہ نویں شرعی غلطی ہے۔

(۱۰) شرعاً رکن شہادت یہ کہنا ہے کہ میں شہادت دیتا ہوں جو عربی کے لفظ اشہد کا ترجمہ اگر بوقت ادائے شہادت یہ الفاظ نہ کہے گئے تو وہ شہادت غیر مقبول ہے۔ قدوری میں ہے "فان لم یذکر الشاهد لفظة الشهادة و قال اعلم او یتقین لم تقبل شهادة" ۔ اور ان قضاۃ و ہلال کمیٹیوں میں ان الفاظ کا کہنا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ تو جس شہادت میں یہ الفاظ ادا نہ ہوئے ہوں تو ان کمیٹیوں کا ایسی شہادت کو قابل قبول سمجھنا ان کی دسویں شرعی غلطی ہے:

(۱۱) شریعت میں حکم وفیصلہ قول وفیصلہ صحیح اور مسلک صواب پر ہوگا آرا کی کثرت وقلت کا اصل لحاظ نہیں۔ چنانچہ اگر اکثر آرا غلط بات ناحق امر پر متفق ہوجائیں اور صرف ایک رائے صحیح وحق وصواب پر ہو تو کثرت رائے پر ہرگز ہرگز حکم وفیصلہ نہ دیا جائیگا بلکہ ایسی غلط کثرت آرا کے مقابلہ میں اس شخص واحد کے قول پر حکم وفیصلہ کیا جائیگا جو راہ حق وصواب پر ہے تو ایسی کثرت آرا جو غلطی اور ناحق اور خلاف شرع بات پر ہو وہ شرعاً غیر معتبر اور نامقبول ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے" وكذالك لا يعتبر كثرة العدد فالواحد قد يوفق للصواب ما لا توفق له الجماعة ينبغى ان يكون هذا قول ابى حنيفة رحمه الله "۔

اوران قضاۃ وہلال کمیٹیوں میں حکم وفیصلہ قول صحیح وراہ صواب پر نہیں ہوتا بلکہ وہ دنیا کے غلط اصول یعنی کثرت آرا پر حکم وفیصلہ کر دیا جاتا ہے اگر چہ قلت آرا طریق صحیح وراہ صواب ہی پر ہو۔ تو ان کمیٹیوں کا ایسی غلط بنیاد پر حکم دیدینا ان کی گیارہویں شرعی غلطی ہے:

(۱۲) شرعاً فقہاء وعلماء کرام اہل رائے ہیں۔ اور عوام جو فقہ سے بے خبر۔ احکام دین سے ناآشنا ہیں وہ اپنے امور میں اہل الرائے ہی نہیں ہیں۔ جیسا جواب سوال نمبر ۱۰ میں عبارات سے ثابت ہو چکا ہے۔ تو ایک عالم فقیہ کے مقابلہ میں عوام کی کثرت آراء دینی امور میں نہ حجت شرعی ہے نہ معتبر ومقبول ہے۔ تو ایسے عوام کی کثرت آراء پر حکم وفیصلہ کس قدر غلط وباطل ہوگا۔ ان قضاۃ وہلال کمیٹیوں میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر عالم فقیہ عوام کی کثرت آراء پر بمقابلہ ایک عالم فقیہ کی رائے کے فیصلہ دیدیا جاتا ہے یعنی اہل رائے کے مقابلہ میں غیر اہل رائے کی کثرت پر حکم کر دیا جاتا ہے۔ تو ان کمیٹیوں کی یہ بارہویں شرعی غلطی ہے:

(۱۳) جب اہل الرائے فقہاء وعلماء کرام میں اختلاف واقع ہو تو ان میں سے جس کا قول حق سے زیادہ قریب ہو تو قاضی اس اصح قول پر حکم دے گا یہ اس صورت میں ہے جب قاضی مجتہد ہوگا اور اگر قاضی مجتہد نہیں ہے تو اس کے نزدیک ان میں جو زیادہ فقیہ اور متقی ہو اس کے قول پر حکم دے۔

فتاوے عالمگیری میں ہے:

وان اختلفوا ايضا فيما بينهم نظر الى اقرب الاقوال عنده من الحق اذا كان من اهل الاجتهاد وان لم يكن القاضى من اهل الاجتهاد وفى هذه الصورة قدوقع الاختلاف بين اهل الفقه اخذ بقول من هو افقه واورع عنه" (عالمگیری جلد ۳ صفحہ ۱۴۴)

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ حق سے قریب تر قول پر یا زیادہ فقیہ و مفتی کی رائے پر بصورت اختلاف حکم کیا جائے گا۔ اور کثرت آرا پر فیصلہ نہ کیا جائے گا۔ اور یہ قضا و ہلال کمیٹیاں ایسے اختلاف علما کی صورت میں نہ حق سے قریب تر قول پر حکم کرتی ہیں نہ زیادہ فقیہ و مفتی کی رائے پر فیصلہ کرتی ہیں بلکہ ان کے خلاف کثرت آرا پر فیصلہ کرتی ہیں تو ان کی یہ تیرھویں شرعی غلطی ہے:

(۱۴) جب ایک شہر کے قاضی یا مفتی کا فیصلہ دوسرے شہر میں بطریق موجب نہیں پہونچا تو وہ دوسرے شہر کے لئے حجت شرعی نہیں ہے جیسے سوال نمبر ۸ کے جواب میں عبارت مجمع الانہر مذکور ہوئی اور قضاۃ و ہلال کمیٹیاں اس فیصلہ کو اگر چہ بطریق موجب نہیں پہونچا ہو اس دوسرے شہر کیلئے بھی حجت جانتی ہیں اسی بنا پر اپنے فیصلہ کو اخبار میں طبع کرا دیتی ہے تو یہ ان کمیٹیوں کی چودھویں شرعی غلطی ہے:

(۱۵) ریڈیو، تار، ٹیلی فون، وائرلیس، سے جو ہلال کمیٹی کا فیصلہ دیگر شہروں کو بھیجا جاتا ہے وہ بطریق موجب نہیں جیسا کہ جواب سوال نمبر ۲ سے ظاہر ہے۔ پھر ہلال کمیٹی کا اس فیصلہ کا نشر و اعلان کرنا ظاہر ہے کہ اسی لئے ہے کہ اور شہروں کے لوگ بھی ہلال کمیٹی کے اس فیصلہ پر عمل کریں تو ان کمیٹیوں کا دیگر مقامات کے لئے اس فیصلہ کو جو بطریق موجب نہیں پہونچا قابل عمل ٹھہرانا ان کی پندرھویں شرعی غلطی ہے۔

الحاصل جب ان قضاۃ و ہلال کمیٹیوں میں اس قدر صریح شرعی غلطیاں موجود ہیں تو ان کا فیصلہ و حکم کس قدر غلط و باطل ہو گا۔ تو ایسے غلط فیصلہ کا قاضی یا مفتی شہر شرعاً کس طرح اعلان کر سکتا ہے۔ اور اگر غلطی سے کسی مقام کے مفتی یا قاضی نے اسی غلط فیصلہ کی بنا پر اعلان بھی کر دیا تو وہ کب قابل عمل قرار پا سکتا ہے۔ مولیٰ تعالیٰ قبول حق کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۵ صفر المظفر ۶/ ۱۳۷ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۷۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

آج یعنی ۳۰ شعبان المعظم ۶/ ۱۳۷ھ کو ایک شخص اپنے کام سے کچھا گیا، وہاں سے آ کر اس نے کہا کہ کچھا میں سب کے روزے ہیں اور سونیری گاؤں میں بھی ایک مشرع شخص کا روزہ ہے۔ اس خبر پر یہاں گاؤں والوں نے بھی روزے رکھ لئے، کچھ دیر کے بعد اسی شخص سے پھر پوچھا، ایک دوسرے شخص

نے کہ کچھا میں چاند دیکھ کر روزہ رکھا گیا یا کسی خبر پر تو؟ اس نے کہا کہ وہاں ریڈیو سے خبر آئی تھی، دوسرے شخص نے اپنا روزہ توڑ ڈالا، وہ اس لئے کہ کچھا میں دکھائی دینے کی شہادت نہیں ہے، ریڈیو کے ذریعہ چاند کی خبر سن کر روزہ رکھا اور وہ شرع شریف میں غیر معتبر ہے۔ ایک اور دوسرے گاؤں سے بھی یہی خبر ملی کہ وہاں سب کے روزے ہیں۔ لیکن چاند دکھنے کی کوئی شہادت نہیں، اس صورت حال میں دوسرے شخص کے روزہ توڑنے سے کچھ اور لوگوں نے روزے توڑ دیئے اور کچھ نے اس لئے نہیں توڑے کہ کچھا والوں نے روزے رکھے ہیں، اس لئے ہم بھی رکھ رہے ہیں، میں یہ عرض کرنا بھول گیا کہ جن لوگوں نے یہاں روزے رکھے وہ دن کے دس گیارہ بجے کے درمیان نیت کر کے رکھے، جن میں کچھ چائے پی چکے تھے، کچھ کھانا کھا چکے تھے، اور کچھ محض پانی ہی پی چکے تھے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ جنہوں نے روزے توڑے وہ گنہگار ہوئے یا نہیں؟ اور جنہوں نے روزے نہیں توڑے خواہ نفلی ہو یا فرضی یا کیسا بھی نہیں مگر توڑنے والوں کو نہیں توڑنا چاہئے تھے۔ تو اب کیا شرع کا حکم ہے؟۔

۱۳ اپریل ر ۱۹۵ ء از نوگواں تحصیل کچھا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

یہ تو بالکل صحیح اور حق ہے کہ ریڈیو کی خبر شرعاً معتبر اور حجت نہیں، نہ تو اس کی بنا پر روزہ کا حکم دیا جائیگا نہ عید کی جائیگی۔

روزہ کی فرضیت رویت ہلال کے متحقق ہو جانے پر ہے پھر جب وہاں رویت ہلال ہی نہیں نہ دوسرے مقام کی شہادت شرعی گذری تو شرعا روزہ ہی فرض نہ ہوا اب رہی خبر کی خبر چاہے وہ ریڈیو ہی کی ہو تو اس سے شرعا نہ رویت ہلال ثابت ہو سکتا ہے نہ اس پر روزہ اور عید ہو سکتی ہے۔ لہذا جن لوگوں کو بالیقین یہ معلوم ہو گیا کہ کچھا میں نہ تو رویت ہلال ہوئی نہ کوئی شہادت باہر سے آئی۔ تو انہیں شرعا روزہ توڑ ہی دینا تھا کہ یہ یوم شک میں تھا اور یوم شک روزہ رکھنا مکروہ ہے تو ان کا تو روزہ کا توڑنا موافق شرع ہوا۔ اور جنہوں نے اس بات کے معلوم ہو جانے کے بعد بھی روزہ نہیں توڑا انہوں نے غلطی کی اور فعل مکروہ کے مرتکب ہوئے پھر ان کا نہ تو فرض روزہ ہوا کہ شرعا ان کے حق میں رمضان کی رویت ہلال ہی ثابت نہیں ہوئی اور نہ انکا نفل روزہ ہوا جو باعث اجر وثواب ہے کہ یوم شک کا روزہ رکھنا ہی مکروہ ہے۔ اور پھر جب ان میں سے کسی نے صبح چائے پی لی کسی نے کھانا کھالیا کسی نے پانی پی لیا ہے تو اس کے بعد

شرعاً روزہ کی نیت ہی نہیں ہو سکتی ہے۔ اور یہ روزہ ہی کب قرار پایا۔ مولیٰ تعالیٰ مسلمانوں میں وہ جذبہ پیدا کردے جس سے وہ احکام شرع سے واقف ہوں اور ان کی جہالت کو دور فرمادے اور انہیں مسائل دین سیکھنے کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۱۷ رمضان المبارک ۶/ ۷۶ء ۱۳ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۷۵)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

۲۹ رشعبان یوم دوشنبہ کو بیکانیر میں مطلع ابر آلودہ ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہیں آیا لیکن نو بجے دہلی اور پاکستان کے ریڈیو والوں نے چند جگہ چاند ہونا بتلایا اور دہلی کے جامع مسجد کے امام نے بھی ان شہادتوں کو منظور فرما کر یکم رمضان منگل کو قرار دیکر روزہ کا اعلان ریڈیو پر کرادیا آیا یہ ریڈیو تار ٹیلیفون کی شہادت قابل تسلیم ہے اور باوجود عینی شہادت نہ ہونے کے ریڈیو کی تواتر کی خبروں پر عمل کر کے ۲۷ رمضان یعنی شب قدر ۲۷ یک شنبہ کی رات کو قرار دیدی جائے اور ریڈیو کی خبروں سے ہم پر قضا روزہ واجب ہوگی یا نہیں صاف صاف بیان فرمائیں عنداللہ ماجور ہونگے۔ بینوا و توجروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جب بیکانیر میں ۲۹ رشعبان بروز پیر مطلع ابر آلود تھا جس کی بنا پر رویت ہلال نہ ہو سکی تو دوسر مقامات سے رویت ماہ رمضان کی جب کوئی دیندار متشرع شاہد عدل آکر شہادت دے اگر چہ وہ شخص واحد ہی ہو تو بلا شبہ اس کی شہادت لیکر ۲۷ تاریخ اور شب قدر کی شب یکشنبہ اور یکشنبہ کے اعلان کیا جا سکتا ہے اور اسی کے ساتھ ایک روزہ کی قضا کا بھی اعلان کر دیا جائے اور جن لوگوں نے اس یوم شک تیسویں شعبان منگل کو محض ریڈیو کی خبر کی بنا پر بالیقین رمضان ہی کا روزہ رکھا ہے تو وہ مرتکب مکروہ تحریمی کے ہوئے درمختار میں ہے " ولو جزم ان یکون عن رمضان کرہ تحریما " اور سخت گناہگار بھی ہوئے کہ یوم شک میں روزہ رکھنے کی ممانعت احادیث میں وارد ہے چنانچہ بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی، بیہقی، وغیر کتب حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " لا تقدموا رمضان بصوم یوم او یومین الا رجل کان یصوم صوما فلیصمہ " تم

رمضان کے ایک دن یا دو دن پہلے روزہ سے سبقت نہ کرو ہاں ان ایام میں نفلی روزہ کا عادی ہو تو وہ بہ نیت نفل روزہ رکھ سکتا ہے۔

ترمذی، ابوداؤد، بیہقی میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "من صام يوم الشك فقد عصى ابا القاسم ﷺ" جس نے یوم شک کا روزہ رکھا تو بیشک اس نے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کی نافرمانی کی۔

بیہقی شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:" ان النبي ﷺ نهى عن صيام قبل رمضان يوم و لا اضحى و الفطر و ايام التشريق ثلاثة ايام بعد يوم النحر"

بیشک نبی ﷺ نے اتنے روزوں سے منع فرمایا رمضان سے ایک دن پہلا عید الاضحیٰ عید الفطر عید اضحیٰ کے بعد تین دن ایام تشریق کے۔

اسی بیہقی شریف میں حضرت عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ان علیاً و عمر رضي الله عنهما كانا ينهيا ن عن صوم اليوم الذي شك فيه من رمضان " بے شک حضرت علی و عمر رضی اللہ عنہما رمضان کے یوم شک کے روزہ سے منع فرمایا کرتے تھے۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ جنہوں نے تیسوین شعبان یوم شک منگل کا روزہ رکھا وہ گنہگار بھی ہوئے کہ اس دن کا روزہ ممنوع تھا اور اگر بہ نیت رمضان رکھا ہے تو مرتکب مکروہ تحریمی بھی ہوئے تو اگر چہ ان پر روزہ کی قضا واجب نہ ہو لیکن احتیاط اور تقوی کا بھی مقتضی ہے کہ انہیں روزہ کی قضا کر لینی چاہئے کہ وہ روزہ مکروہ تحریمی قرار پایا ہے۔

اور رویت ہلال رمضان کا کوئی شاہد عدل متشرع دستیاب نہ ہو سکے تو پھر اہل بیکانیر کے لئے شب قدر اور ۲۷ تاریخ دوشنبہ اور اس کی شب یہ ہی ہے اور اگر انتیس روزے ان کے پورے ہو جاتے ہیں تو ان پر ایک روزہ کی قضا بھی واجب نہیں ہاں اس صورت میں اگر ان کے ۲۸ روزے ہو کر چاند کی رویت ہو جائے جب بھی ان کو ایک روزہ کی قضا کرنی ہوگی۔

بلاشک ریڈیو کی خبر سے نہ شرعاً رویت ہلال ثابت ہو سکتی ہے نہ اس کے اعلان پر عید کی جا سکتی ہے نہ روزہ کی فرضیت کا حکم دیا جا سکتا ہے ریڈیو کی خبر کو طریق موجب اور حجت شرعی مان لینا وہ حقیقی بدعت ضلالہ ہے جس کی اصل قرآن و حدیث سے ثابت نہیں کی جا سکتی اور جو اس کے اعلان و خبر کو طریق موجب اور حجت شرعی مانتے ہیں وہ بدعتی اور اہل بدعت ہیں مولیٰ تعالیٰ اہل اسلام کو احکام شرع پر عمل کر

نے کی توفیق دے۔ اور اندھی تقلید سے محفوظ رکھے۔ واللہ تعالیٰ بالصواب۔ ۵ رمضان المبارک ۶/ ۱۳۷۷ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۷۶)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

(۱) ثبوت رویت ہلال کے لئے شرعا طریق موجب کتنی صورتیں ہیں؟

(۲) کتاب قاضی الی القاضی میں جب تمام شرائط پائے جائیں تو شرعا طریق موجب ہے یا نہیں؟

(۳) جس شہر میں قاضی شرع یا ایسا مفتی دین موجود ہو جس کے فتووں پر لوگ عمل کرتے ہوں وہ شرعی طور پر رویت ہلال کا حکم دے اس کے حکم کی مخالفت بلا دلیل شرعی کے درست ہے یا نہیں؟

(۴) جو لوگ کسی شہر کے مفتی نہ ہوں اور ان کو مسائل شرع پر عبور بھی نہ ہو ان کو اس شہر کے مفتی کے حکم کے مقابلہ میں اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

(۵) خبر استفاضہ کی شرعا کتنی صورتیں ہیں خبر استفاضہ طریق موجب وحجت شرعی ہے یا نہیں؟

(۶) خبر استفاضہ شہادت شرعی سے افضل اور قوی تر ہے یا نہیں اور تواتر ویقین کا فائدہ دیتا ہے یا نہیں؟

(۷) مفتی شہر کے شرعی حکم سے جب اس شہر میں نماز عید ہو چکی تو ان مساجد اور عیدگاہ میں دوسرے دن نماز عید پڑھنا مکروہ ہے یا نہیں اور شرع اس کی اجازت دیتی ہے یا نہیں؟

(۸) بلا دلیل شرعی کے لوگوں کو پہلے دن کی نماز اور قربانی روکنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

(۹) حکایت اور افواہ اور اخبار اور خبر استفاضہ میں کیا فرق ہے ہر ایک کی مکمل تعریف بھی کیجئے؟

(۱۰) جو خبر استفاضہ کو خبر استفادہ لکھے وہ اصطلاح شرع سے جاہل ہے یا نہیں۔ ہر سوال کا جواب مکمل ومدلل بحوالہ کتب دیگر حکم شرع سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی منشی عبد الوحید ساکن محلہ دیپا سرائے سنبھل ۲۹ جون ۱۹۵۸ء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) شرعاً ثبوت رویت ہلال کے لئے طریق موجب کی چھ صورتیں ہیں۔ دو صورتیں شہادت علی الرویۃ کی اور دو صورتیں شہادت علی القضاء کی اور دو صورتیں استفاضہ کی جنکی مکمل تفصیل مع حوالہ کتب کے میرے رسالہ اجمل المقال میں موجود ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) جب کتاب القاضی الی القاضی کے تمام شرائط پائے جائیں تو وہ شرعاً ثبوت ہلال کے لئے یقیناً طریق موجب اور بالاجماع حجت شرعیہ ہے فتاوی عالمگیری جلد۳ صفحہ ۱۷۲ میں ہے "یجب ان یعلم ان کتاب القاضی الی القاضی صار حجة شرعا فی المعاملات ولکن جعلناه حجة بالاجماع ولکن انما یقبله القاضی المکتوب الیه عند وجود شرائطه ملخصا" واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳،۴) غیر اسلامی شہروں میں جب قاضی شرع نہ ہو تو ہر شہر کے مسلمانوں پر ضروری ہے کہ وہ اپنے شرعی امور خصوصا جمعہ وعیدین کی اقامت کے لئے ایک عالم دین کو قاضی والی یا مفتی شرع مقرر کر لیں ردالمحتار میں ہے "واما بلاد علیها ولاة کفار فیجوز للمسلمین اقامة الجمع والعیاد ویصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین" (ردالمحتار جلد۴ صفحہ ۳۲۱) اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ جس شہر میں قاضی یا مفتی شرع ہو تو جمعہ وعیدین کا قائم کرنا اس کے ذمہ پر ہے اور یہ حکم اپنی جگہ ثابت ہو چکا کہ حکم قاضی کا ماننا لوگوں پر لازم ہے اور اس کی مخالفت حکم شرع کی مخالفت ہے فتاوی عالمگیری میں ہے "قضاء القاضی ملزم فی حق الناس کافة توضیحه ان القاضی یقضی بامر الشرع وما یصیر مضافا الی الشرع فهو منزلة النص فلایترك ذلك بالرائی کما لا یترك النص بالاجتهاد

(فتاوی عالمگیری جلد۳ صفحہ ۱۶۱)

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ قاضی یا مفتی شہر کے حکم کی مخالفت درست نہیں اور خصوصا ایسے لوگ جو نہ مفتی ہوں نہ مسائل شرع پر عبور رکھتے ہوں ان کا قاضی یا مفتی شہر کے حکم کا مقابلہ کرنا گویا حکم شرع ونص کا مقابلہ کرنا ہے۔ پھر بلا دلیل شرعی کے محض اپنی رائے خاص سے حکم قاضی یا مفتی کے خلاف کرنا اہل اسلام میں تفریق کرنا ہے اور اپنی دلیری ظاہر کرتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۵،۶) شرعاً خبر استفاضہ کی دو صورتیں ہیں پہلی صورت یہ ہے کہ کسی دوسرے شہر سے متعدد جماعتیں آئیں اور وہ بالاتفاق یہ بیان کریں کہ فلاں شہر میں ہمارے سامنے عام طور پر لوگوں نے بیان کیا کہ ہم نے اپنی آنکھ سے چاند دیکھا ہے چنانچہ درمختار میں ہے "نعم لو استفاض الخبر فی البلدة

الاخری لزمهم علی الصحیح من المذهب " (ردالمحتار جلد۲ صفحہ ۹۷) دوسری صورت یہ ہے کہ جس شہر میں قاضی یا مفتی شرع موجود ہو تو اس شہر سے متعدد جماعتیں آئیں اور وہ بالاتفاق یہ کہیں کہ فلاں شہر میں فلاں دن عید ہوگئی یا فلاں ماہ کی رویت ہلال ثابت ہو چکی۔ چنانچہ ردالمحتار میں ہے:

" فی الذخیرة قال شمس الائمة الحلوانی الصحیح من مذهب اصحابنا ان الخبر اذا استفاض و تحقق فیما بین اهل البلدة الاخری یلزمهم حکم هذه البلدة اه و مثله فی الشرنبلالیة عن المغنی قلت وجه الاستدراك ان هذه الاستفاضة لیس فیها شهادة علی قضاء قاض ولا علی شهادة لکن لما کانت بمنزلة الخبرا لمتواتر وقد ثبت بها ان اهل تلك البلدة صاموایوم کذا لزم العمل بهالان البلدة لا تخلو عن الحاکم شرعی عادة فلا بد من ان یکون صومهم مبنیاعلی حکم حاکمهم الشرعی فکانت تلك الاستفاضة بمعنی نقل الحکم المذکور وهی اقوی من الشهادة " (وفیه ایضاً) قال الرحمتی معنی الاستفاضة ان تاتی من تلك البلدة جماعات متعد دون کل منهم یخبر عن اهل تلك البلدة انهم صاموا عن رویة " (ردالمحتار جلد۲ صفحہ ۹۷)

تو خبر استفاضہ کی یہ دو صورتیں ہیں جو ثبوت رویت ہلال کے لئے طریق موجب اور حجت شرعیہ ہیں۔ پھر یہ خبر استفاضہ شرعا شہادت شرعی سے افضل اور قوی تر ہے اور تواتر اور یقین کا فائدہ دیتا ہے جیسا کہ عبارت مذکور سے ثابت ہو گیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۷ جب ذالحجہ کو قاضی شرع یا مفتی شہر کے حکم سے نماز عید ہو چکی تو دوسرے دن کسی کو نماز عید پڑھنے کی شرعا اجازت نہیں۔

عالمگیری میں ہے " والامام لو صلاها مع الجماعة وفاتت بعض الناس لا یقضیها من فاتته خرج الوقت او لم یخرج " (عالمگیری جلد ا صفہ ۷۸)

اب باقی رہا نماز عید کا ان مساجد وعیدگاہ میں پڑھنا جن میں یوم اول نماز عید پڑھی جا چکی ہے تو شرعا ان میں دوسری بار نماز عید قائم کرنا نامشروع و بدعت ہے بلکہ کسی قرن میں بھی کسی مسجد میں دوبار نماز جمعہ نہیں پڑھی گئی تو جب ایک مسجد میں جمعہ کی تکرار جماعت نہیں ہوئی تو ایک مسجد میں نماز عید کی تکرار کس طرح ہو سکتی ہے کہ جمعہ و عید کے ایک ہی شرائط ہیں۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے " مناسبته للجمعة ظاهرة وهر انهما یو دیان بجمع عظیم

ویجھر فیھمابالقرائۃ ویشترط لاحدھما ما یشترط لا خر "

(ردالمحتار جلدا صفحہ ۵۷۹)

خاص کر جہالت ونادانی کہ دوسرے دن امام کا اسی محراب ومنبر پر ہیئت اولیٰ کے ساتھ دوبارہ جماعت پڑھی جانے کی کسی طرح شرع اجازت نہیں دی جاسکتی یہاں تک کہ فقہاء کرام نے پنجوقتہ نماز کی جماعت ایک ہی مسجد میں ہیئت اولیٰ پر قائم کرنے کو مکروہ تحریمی لکھا ہے۔

ردالمحتار میں ہے " عن ابی یوسف انہ اذالم تکن الجماعۃ علی الھیئہ الاولیٰ لا تکرہ وھو الصحیح وبالعدول عن المحراب تختلف الھیئۃ "

بالجملہ جن مساجد وعیدگاہ میں پہلے دن حکم شرعی کی بناپر نماز عید کی جماعت ادا کی جاچکی، ان میں دوسرے دن ہیئت اولیٰ پر نماز عید کی جماعت کا قائم کرنا نہ فقط مکروہ بلکہ ممنوع وبدعت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۸) ایام عید کے پہلے دن لوگوں کو بلا دلیل شرعی کے نماز وقربانی سے روکنا ظاہر ہے کہ گناہ عظیم ہے اور دینی مسائل میں خودرائی ہے اور مسلمانوں کی نمازوں کو مکروہ کرنا ہے اور انہیں فضیلت قربانی سے محروم کرنا ہے جو کسی مسلمان کے لئے کسی طرح لائق وروانہیں۔ پھر ایسے شخص کو کسی مسلمان کو نماز وقربانی سے شرعاً روکنے کا حق کیسے حاصل ہوسکتا ہے بلکہ بلا عذر شرعی کے دوسرے دن عید اضحیٰ کی نماز پڑھنا خلاف سنت ومکروہ واسائت ہے۔

چنانچہ فتاوی عالمگیری میں ہے " حتی لو اخروھا الی ثلثۃ ایام من غیر عذر اجازت الصلوۃ وقد اسائو " واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۹) حکایت کسی واقعہ کا بلاتحقیق کے بغیر لحاظ ثبوت شرعی کے صرف بیان کرنا خود صدق وکذب کا محتمل ہوتا ہے اگرچہ اس کی اصل واقعی طور پر موجود ہو۔ اور افواہ وہ ہے جس کی واقعی طور پر کوئی اصل نہ ہو بلکہ وہ لوگوں میں شائع ومشہور ہوجائے۔ اور خبر وہ ہے جو صدق وکذب دونوں پر مشتمل ہو اگرچہ اس کی اصل کا واقع میں وجود ہو۔ اور خبر استفاضہ متعدد جماعتوں کی وہ متواتر خبریں جن کے جھوٹ پر متفق ہو جانے کو عقل جائز نہ رکھے۔ جیسا کہ نمبر ۵، ۶ میں شامی کی عبارت میں مذکور ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۱۰) جو خبر استفاضہ کو خبر استفادہ لکھے ظاہر ہے کہ وہ اصطلاح شرع سے جاہل ہے کتب فقہ سے ناواقف ہے۔ احکام دینیہ سے لاعلم ہے تو پھر اس کا اس لاعلمی وناواقفی کی بناپر جو بھی حکم ہوگا وہ خلاف شرع

اور غلط ہے اور وہ حدیث "افتوا بغیر علم "کا مصداق قرار پاکر سخت گنہگار اور جری فی الدین ہوگا۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۱۳ ذی الحجہ ۷۷ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۷۷)

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

بتاریخ ۲۹ رشعبان المعظم کو بوجہ ابر کے چاند نظر نہیں آیا بعد کو معلوم ہوا کہ پاکستان ڈیڈیو نے بوقت ۸٫۳۰۔ میں اعلان کیا کہ چاند کراچی اور لاہور اور ڈہاکہ میں دیکھا گیا، اس کے بعد انڈیا ریڈیو نے ۹٫۱۵۔ میں اعلان کیا کہ لکھنو کے مولانا قطب الدین صاحب فرنگی محل نے اور بڑودہ کے امام مولانا فخر الدین صاحب نے چاند ہونے کا اعلان کیا، اس پر روزہ رکھا گیا ۔آیا کہ روزہ ماہ رمضان کے روزہ میں شمار کیا گیا یا مکروہ تحریمی میں۔ علاوہ بریں اس اعلان پر مسلمانان ٹیٹی اگڑھ نے بکثرت روزہ رکھا تھا لیکن تین شخصوں نے اس روزہ کو حرام قرار دیکر لوگوں سے افطار کرادیا۔ اس روزہ کی قضاء شرعا لازم ہے یا نہیں؟ اور ان تین شخصوں کے لئے شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے والسلام۔ امیر الحق پائے گڑھ۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

۲۹ شعبان بروز دوشنبہ کو جہاں بوجہ ابر کے رویت ہلال نہیں ہوئی اور کسی شہر سے ایسی خبر موصول ہوئی جو بہ تواتر ہو، یا بطرق موجب ہو، یا وہاں کی شہادت گزرے تو ان پر بھی وہی حکم لازم ہے۔

شامی میں ذخیرہ سے ناقل " الصحیح من مذهب اصحابنا ان الخبر اذا استفاض وتحقق فیما بین اهل البلد الاخری یلزمهم حکم هذا البلدة "

اور مجھے تو دوشنبہ کی رویت بشہادت شرعی ثابت ہوئی تو یہ شنبہ کا روزہ ضروری ہوا۔"

فیلزم اهل المشرق برویة اهل المغرب اذاثبت عند هم رویة اولئك بطریق موجب"

تو جن لوگوں نے شنبہ کا روزہ رکھ لیا ان کے ذمہ پر کچھ مطالبہ نہیں۔ اور جنہوں نے نہیں رکھا یا رکھ کر افطار کرلیا ان پر اس روزہ کی قضاء واجب۔ اور جن لوگوں نے افطار کرادیا اگر اس بنا پر کہ دوشنبہ کی بنا محض ریڈیو کی خبر پر ہے اور ریڈیو یا تار کی خبروں سے شرعی رویت ثابت نہیں ہوتی تو انکا یہ فعل شرعا حسن

محمود ہے، اور وہ مثاب وماجور ہوئے، اور اگر انکا یہ فعل شہادت شرعی گزرجانے یا رویت بطرق موجب ثابت ہوجانے کے بعد عمل نہیں آیا تو ان کی یہ جرأت ودلیری قابل ملامت اور لائق مذمت ہے اور وہ لوگ سخت مجرم وگنہگار ہوئے؛ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۷۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ ذیل میں کہ
ریڈیو، تار، خط، ٹیلیفون کو چاند دیکھنے کے لئے کیوں ناجائز قرار دیا؟ آخر دوسرے کام بھی ان کے ذریعہ دن رات ہوتے رہتے ہیں ان پر کیون اعتبار کیا جاتا ہے۔ اس کی نفی کی کیا دلیل ہے؟ اور اگر ریڈیو وغیرہ کی خبر پر عمل کیا جائے تو کیا نقص واقع ہوتا ہے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ایک مقام کی رویت ہلال دوسرے مقام کے لئے صرف شہادت علی الرویت یا شہادت علی القضایا استفاضہ سے ثابت ہوسکتی ہے جو عند الفقہاء معتبر ومقبول اور طریق موجب ہے۔ اوران کے علاوہ تار۔ ٹیلیفون۔ لاؤڈ سپیکر۔ ریڈیو۔ وایرلیس۔ خط۔ افواہ۔ اخباری خبریں۔ جنتریاں۔ قیاسات۔ نہ شہادت کا افادہ کریں نہ استفاضہ کا بلکہ ان سے صرف خبر وحکایت حاصل ہوتی جو شرعاً بھی غیر معتبر نامقبول ہے اور قانوناً بھی اس سے شہادت ثابت نہیں ہوتی ہے، ورنہ کچہریوں میں انہیں آلات کے ذریعہ سے دوسرے شہروں سے شہادت حاصل کرلی جاتی اور بلا شاہد کے حاضر کئے ہوئے انہیں آلات پر اعتماد کرکے کسی مقدمے کی ڈگری کردی جاتی۔ لھذا ان آلات کی خبروں کا شرعا قانونا کسی طرح اعتبار نہیں۔ میں نے اس مبحث میں ایک مبسوط ومفصل رسالہ لکھ دیا ہے جس میں ایک ایک کی پوری پوری بحث اور اس میں بکثرت عبارات منقول ہیں اس کی طرف رجوع کیا جائے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (٥٧٩)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

بذریعہ اخبار ۲۹/ذی القعدہ یوم جمعہ کو رویت ہلال کی خبر پاکر متولی جامع مسجد ٹاٹ شاہ نے قبل نماز جمعہ اعلان کیا اور تمام مسلمانوں کے مشورہ سے متفقہ طور پر طے کیا کہ مفتی صاحب فیض آباد قصبہ ٹانڈہ جاکر چاند کی تحقیق فرمائیں، چنانچہ امام صاحب تشریف لے گئے اور مفتی صاحب ٹانڈہ ضلع فیض آباد سے ملکر ۲۹ ذیقعدہ یوم جمعہ کو رویت ہلال کے متعلق تحریر حاصل کی اور چاند دیکھنے والوں سے مزید خود شہادت لی اور فیض آباد آکر فتوی دے دیا کہ عید دوشنبہ کو ہے اور اعلان کرادیا اب دریافت طلب یہ ہے۔

(۱) مفتی صاحب کا بغرض تحقیق رویت ہلال جانا از روئے شریعت جائز ہے یا ممنوع؟۔

(۲) کیا مفتی کے ساتھ ایک شاہد کا ہونا ضروری تھا اور مفتی کے حیثیت مثل شاہد کے تھی اس لئے دوسرے شاہد کی ضرورت تھی؟۔

(۳) جبکہ مفتی صاحب اپنے شہر کے مفتی ہیں اور شہر میں نہ کوئی دوسرا مفتی ہے نہ عالم۔ اگر ہے تو بدعقیدہ غیر متشرع اور مفتی صاحب کو دوسرے مفتی یا قاضی کے سامنے شہادت نہیں دینی تھی۔ بلکہ ثبوت شرعی لیکر خود فتوی دینا تھا ایسی صورت میں بھی شاہد کی ضرورت تھی، تو مفتی اور شاہد کیا عوام کے سامنے شہادت دیکر فتوی حاصل کرتے؟۔

(۴) مفتی کے لئے کیا شرائط ہیں اور مفتی کیسے بنتا ہے؟ کیا ہر عالم صاحب سند جو مسائل فقہ سے واقفیت رکھتا ہو مفتی ہو سکتا ہے؟۔

(۵) کچھ لوگوں نے ایک انجمن قائم کی ہے جس کا نصب العین یہ ہے کہ کسی کو برا نہ کہو۔ اس کا نام سیرۃ النبی رکھا ہے۔ اسکا صدر ایک ایسے مولوی کو بنایا ہے جو وہابیوں دیوبندیوں کے عقائد کفریہ سے واقف ہونے کے باوجود کہتا ہے میں ان لوگوں کو کافر نہیں کہہ سکتا۔ میرے اساتذہ ان لوگوں کو مسلمان مانتے ہیں۔ میں بھی ان کی اتباع میں دیوبندی مولویوں کو مسلمان ہی کہوں گا۔ بلکہ اس مولوی کے اساتذہ اشرفعلی تھانوی کے انتقال پر جلسہ فاتحہ وتعزیت منعقد کیا اس کے لئے ایصال ثواب کیا اس کے دینی خدمتوں کی تعریف کی اور کہا کہ اگر چہ اب مولوی اشرفعلی ہم میں موجود نہیں مگر ان کی تصنیفات اب بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ صدر مذکور دیوبندیوں سے میل جول رکھتا ہے بلکہ ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہے۔ ان سے مسائل شرعیہ دریافت کرتا ہے۔ اس انجمن کے ممبران شریعت کے پابند نہیں ہیں۔ خود

صدر انجمن باوجود مولوی ہونے کے حد شرعی سے کم داڑھی چھوٹی کتراتا ہے۔نماز کا پابند نہیں ہے۔بحکم شریعت مطہرہ انجمن مذکور میں شریک ہونا ممبر بننا اس کی امداد کرنا چندہ دینا کیسا ہے؟۔

المستفتی۔سید التجا حسین عرف لڈن فیض آباد

الجواب

نحمده ونصلي ونسلم على رسوله الكريم

(۱) ہمارے ملک میں مفتی شہر قاضی شرع کی طرح ہے۔کما حققنا فی فتاونا۔تو خود مفتی شہر کا دوسرے شہر میں بغرض تحقیق رویت ہلال جانا خلاف منصب اور غیر مناسب اور ممنوع ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: ان فی زماننا القاضی لایذهب بنفسه۔واللہ تعالیٰ اعلم

(۲) یہ مفتی صاحب دوسرے مقام پر پہنچ کر یا تو وہاں کے مفتی سے گفتگو کر کے محض رویت ہلال کی خبر لیکر واپس ہوں گے تو خبر سے یہاں کے لئے رویت ہلال نہیں ہوتی۔

ردالمحتار میں ہے: اذا اخبر ان اهل بلدة كذ اراوه لانه حكاية (فما ثبتت الروية بطريق موجب)

اور اگر وہاں کے مفتی کی تحریر لے کر آئے تو ظاہر ہے کہ اس تحریر میں شرائط کتاب القاضی الی القاضی مفقود ہیں۔

اس تحریر سے یہاں کیلئے رویت ثابت نہ ہوگی۔ھدایہ میں ہے:

و لا يقبل الكتاب الا بشهادة رجلين او رجل و امرتين لان الكتاب يشبه الكتاب فلا يثبت الا بحجة تامة وهذا لانه ملزم فلا بد من الحجة۔

یا شاہدین سے شہادت کی تحمیل وتوکیل کے بعد یہ مفتی بہ شاہد علی الشاہد قرار پائے تو پھر دوسرے شاہد کی ضرورت اور باقی رہے گی اور نصاب شہادت پورا نہیں ہوا۔

لہذا اس صورت میں بھی رویت ثابت نہیں ہوئی۔ردالمحتار میں ہے:

و شرط للفطر مع العلة و العدالة نصاب الشهادة و لفظ اشهد و هلال الاضحى و بقية الاشهر التسعة كالفطر على المذهب۔

مختصراً تو ان ہر سہ صور میں رویت ہلال ثابت نہ ہوسکی واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۳) جب صرف قاضی یا مفتی ہی نے خود چاند دیکھا تو یہ نہ عیدگاہ نماز کیلئے جا سکتا ہے اور نہ

لوگوں کو حکم دے سکتا ہے۔

عالمگیری میں ہے: ولو رای الامام وحدہ او القاضی وحدہ ہلال شوال لا یخرج الی المصلیٰ ولا یامر الناس بالخروج ولا لفطر لا سرا ولا جھرا کذا فی السراج۔

تو جب خود مفتی چاند دیکھ کر بھی رویت ہلال کا حکم نہیں کر سکتا تو صورت مسئولہ میں کس طرح رویت کا حکم دے سکتا ہے۔ بلکہ مفتی صاحب کیلئے مناسب یہ تھا کہ خود تو تشریف نہ لیجاتے اور دو شاہدین عادلین کو وہاں بھیجتے جو وہاں کے مفتی صاحب سے کتاب القاضی الی القاضی حاصل کرتے اور اس تحریر کو یہاں کے مفتی صاحب کے سامنے پیش کر کے اس پر شہادت دیتے۔ یا اصل شاہدوں سے شہادت کی تکمیل و توکیل کے بعد شاہد علی الشاہد بلکہ یہاں آکر ان مفتی صاحب کے روبرو شہادت دیتے پھر یہ مفتی صاحب رویت ھلال کا حکم دیتے۔ کما فصلناہ فی رسالتنا اجمل المقال لعلاف رویۃ الھلال۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۴) مفتی کے شرائط و آداب ردالمحتار، عالمگیری، فتاویٰ سراجیہ وغیرہا میں یہ ہیں۔ مسلمان ہونا، بالغ ہونا، عاقل ہونا، عادل ہونا، عالم ہونا، مذہب امام کا حافظ ہونا، اپنے اہل زمانہ سے واقف ہونا، اصول و قواعد امام سے واقف ہونا، اقوال فقہا پر مطلع ہونا، بیدار مغز و ہوشیار ہونا، بردبار ہونا، خلیق ہونا، خندہ رو ہونا، نرم مزاج ہونا، بوقت فتویٰ سخت غضبناک یا غمگین و مسرور نہ ہونا، فتاویٰ پر اجرت نہ لینا، اگر اپنی خطا پر مطلع ہو جائے تو رجوع کر لینا، جواب میں بلاوجہ تساہل نہ کرنا، خوش لباس ہونا، راہ میں چلتے ہوئے فتویٰ نہ دینا، مستفتیان میں اغنیا کو فقراء پر ترجیح نہ دینا، فتویٰ کی عزت کرنا، جواب کے آخر میں واللہ تعالیٰ اعلم لکھنا، اور فتویٰ کا کلام بلا سمجھے نہیں آتا محض سند حاصل کر لینے یا مسائل سے واقفیت پیدا کر لینے سے مفتی نہیں ہو جاتا اور نہ فاسق مفتی ہو سکتا، اور نہ اس کے فتوے پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

درمختار میں ہے: والفاسق لا یصلح مفتیا۔

ردالمحتار میں ہے: والحاصل انہ لا یعتمد علی فتویٰ المفتی الفاسق مطلقا۔

تو پھر مرتد و ضال بدرجہ اولیٰ نہ مفتی ہو سکتا ہے نہ اس کا فتویٰ قابل اعتماد ہو سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۵) اگر اس انجمن کا یہ ناپاک نصب العین ہے تو یہ نہایت گمراہ کن اور سخت کفریہ انجمن ہے اور

پھر اس پر مزید فریب یہ ہے کہ اسکا نام سیرۃ النبی رکھا ہے۔ اگر اس گمراہی وضلالت کا نام سیرت ہے تو نہ یہ قرآن کریم کے نازل ہونے کا کوئی فائدہ باقی رہا اور نہ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کارآمد رہی۔ کہ قرآن کریم اسی لئے نازل ہوا ہے کہ کفر واسلام میں فرق کرے۔ حق وباطل میں امتیاز پیدا کرے۔ حرام و حلال میں تمیز سکھائے، مسلمان وکافر کے فرق کو بتائے، نیک وبد کی معرفت کرائے، نبی کریم ﷺ کی بعثت شریفہ اسی کی تکمیل کیلئے ہے۔ حضور کی سیرت وخلق بالکل قران کریم کے موافق ہے۔

قرآن کریم فرماتا ہے: ما کان الله لیذر المو منین علی ما انتم علیه حتی یمیز الخبیث من الطیب۔ (سورہ آل عمران ۷۔ع ۱۸)

اللہ مسلمانوں کو اس حال پر چھوڑنے کا نہیں جس پر تم ہو جب تک جدا نہ کر دے گندے خبیث کو طیب ستھرے سے۔

یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی۔ تو آیت میں منافق کو خبیث فرمایا جو بظاہر کلمہ گو تھے اور نماز پڑھتے تھے اور جہاد کرتے تھے اور مومن کو طیب پاک فرمایا اور مومن وگمراہ میں امتیاز کرنا خلق الٰہی ثابت ہوا۔

اور حدیث شریف میں ہے: تخلقوا با خلا ق الله۔ اور حضور نبی کریم ﷺ جو کہ خلق الٰہی پر پیدا کئے گئے ہیں، چنانچہ حضور نے گمراہوں کو اتنا ممتاز فرمایا۔

حدیث میں ہے: الخوارج کلاب اهل النار۔

دوسری حدیث میں ہے: اتر عون عن ذکر الفاجر ان تذکروه متی یعرفه الناس فاذکروه یعرفه الناس۔

یعنی کیا فاجر کو برا کہنے سے پرہیز کرتے ہو۔ لوگ اسے کب پہچانینگے، فاجر کی برائی کا ذکر کرو۔

تو یہ سیرت النبی ہے کہ فاسق وفاجر کو برا کہا جائے اور یہ انجمن والے فاسق کا تو ذکر کیا گمراہ مرتد کو برا کہنے سے پرہیز کرتے ہیں تو یہ سیرۃ النبی ﷺ کے کتنے شدید دشمن اور مخالف ٹھہرے۔ پھر لوگوں کو محض فریب دینے کیلئے اس انجمن کا نام سیرۃ النبی رکھتے ہیں، اور یہ اس انجمن میں مکروکید اور دجل وفریب ہونا بھی چاہئے کہ جب اس کا صدر وہ ہے جو عقائد کفریہ کو ایمان جانتا ہے۔ مرتدین کو مسلمان کہتا ہے۔ گمراہ کن کتابوں کے مشعل ہدایت بتاتا ہے۔ بیدینیوں سے میل جول رکھتا ہے، ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہے۔ انہیں عالم دین اعتقاد کرتا ہے۔ تو یہ ضرور پکا وہابی دیوبندی ہے۔ اور مولوی اپنے آپ کو کہلواتا ہے

اوراس نے یہ مسئلہ نہ دیکھا کہ الرضا بالکفر کفر۔

لہذا اہل سنت و جماعت کا اس انجمن میں شریک ہونا، اس کا ممبر بننا، اسمیں چندہ دینا، اس کی کسی طرح کی امداد کرنا بلاشک اعانت علی المعصیت ہے اور حرام وممنوع ہے کہ حدیث شریف میں ہے: ایا کم و ایا ھم لا یضلو نکم و لا یفتنو نکم۔ اور دوسری حدیث میں ہے:و لا تجا لسو ھم۔ یعنی تم ایسے گمراہوں سے بچو۔ انہیں اپنے آپ سے بچاؤ کہ کہیں تمہیں گمراہ نہ کردیں اور فتنہ میں نہ ڈالدیں، انکے ساتھ نہ بیٹھو۔ یہ تمام احادیث سیوطی کی جامع صغیر میں ہیں۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ ۷ر جمادی الاخر ۲ ۱۳۷ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۸۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں
عید الفطر کے چاند کی خبر ریڈیو سے جائز ہے یا نہیں بدلیل بیان فرمائیں؟۔

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

عید الفطر کے لئے انتیس کا چاند رویت یا شہادت شرعی کی صور یا استفاضہ کی صور یعنی کل چھ طریق سے ثابت ہوتا ہے ان طریق کے علاوہ بیس طریق اور ہیں۔ حکایت۔ خبر۔ اخبار۔ جنتری۔ خط۔ تار۔ ریڈیو۔ ٹلیفون۔ وائرلیس۔ لاؤڈاسپیکر۔ ٹیلی ویزن۔ وقیاس وغیرہ سے ہرگز رویت ہلال ثابت نہیں ہوسکتا ہے۔ اس کی پوری تفصیل معہ دلائل و حوالجات کے میرے مطبوعہ رسالہ ''اجمل المقال لعارف رویۃ ہلال'' میں ہے جس کو تفصیلی بیان دیکھنا ہو وہ اس رسالہ کا مطالعہ کر کے دلائل پر مطلع ہو۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۸۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں کہ

ہمارے شہر میں شعبان المعظم کی ۲۹ رتاریخ کو آسمان ابر آلود ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہیں آیا لیکن دہلی۔ پٹنہ۔ الہ آباد۔ حیدر آباد۔ وغیرہ کے ریڈیو اسٹیشنوں سے وہاں سے چاند دیکھائی دینے کی خبر نشر کی گئی جسے یہاں بذریعہ ریڈیو سنا گیا۔ ہمارے صوبہ اڑیسہ اور کلکتہ وغیرہ سے کوئی خبر رویت ہلال پر نہیں ملی۔

(۱) ایسی حالت میں اسی رات کو تراویح پڑھنا اور اسکی صبح کو روزہ رکھنا کیسا ہے۔

(۲) یہ روزہ شعبان کی نفل روزے کی نیت سے رکھا گیا تو کیسا ہے؟۔

(۳) اور رمضان المبارک کی نیت سے روزہ رکھنا کیسا ہے؟۔

(۴) صورت مذکورہ بالا میں رمضان المبارک کی نیت سے روزہ رکھنے والا کیسا ہے؟۔

(۵) اور نفل کی نیت سے روزہ رکھنے والا کیسا ہے؟۔

(۶) کچھ لوگوں نے ۔ ۲۹ رشعبان کو ریڈیو کی خبر تسلیم کر کے اسی رات میں تراویح پڑھنا اور دن کو روزہ رکھنا یہ درست ہے یا نہیں؟ ایسے لوگوں کو کیا کہا جائے۔

(۷) کچھ لوگ اعلان کرتے ہیں کہ چاند نظر نہیں آیا۔ اور نہ چاند کی شہادت ہی ہوئی۔ صرف ریڈیو کی خبر پر شریعت مطہرہ نے عمل کرنے کو منع فرمایا ہے۔ اس لئے دوسرے روز تراویح پڑھا اور صبح روزہ رکھا یہ درست ہے یا نہیں؟۔

(۸) ایک شہر کا یہ دستور عرصہ سے تھا۔ کہ جب کسی وجہ سے چاند نہیں دکھائی دیا لوگ تار یا ریڈیو کی خبر سے رمضان شریف کی تراویح اور عید کی نماز ادا کیا کرتے تھے۔ اور اس دور میں جس قدر علمائے کرام بھی تشریف لائے کسی نے اس کو نہیں روکا۔ اور نہ کسی نے اسکے خلاف کوئی آواز اٹھائی۔ اب ایک جماعت ہے کہ چاند خود اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر یا عین شہادت بغیر رمضان یا عید نہیں مناتی۔ لہذا اس جماعت کا یہ فعل درست ہے؟۔ یا جو لوگ ریڈیو وغیرہ کی خبر پر رمضان یا عید مناتے ہیں یہ درست ہے؟۔

اسی وجہ سے ایک مرتبہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں ایک روز عید منائی گئی۔ اور اس شہر میں دوسرے روز منائی گئی۔ یعنی پورے تیس روزے کے بعد نماز عید ادا کی گئی، اس سے بعض لوگوں میں ایک ہیجان برپا ہے۔ کہ چاند ہم نہ دیکھیں تو کیا۔ قریب قریب سارے ہندوستان مین ایک دن عید منائی جارہی ہے لیکن ریڈیو کی بات نہ تسلیم کرنے پر ہم لوگ دوسرے دن عید منائیں یہ کہاں تک درست ہے۔

لہذا جب اکثر شہروں میں عید منائی جارہی ہے اور ہمیں ریڈیو سے صحیح خبر مل رہی ہے تو ہم کو بھی ریڈیو کی خبر صحیح تسلیم کر کے سب بھائیوں کے ساتھ ایک ہی تاریخ میں عید کی خوشی منانا چاہیے یا نہیں؟۔

اور ایسے لوگ جو ریڈیو کی خبر کو تسلیم کرتے ہیں اور دوسروں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ بھی اس خبر کو مان لیں ایسے لوگوں کے لئے شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟۔

(۹) جو لوگ صرف چاند کی رویت یا عین شہادت کے بغیر رمضان یا عید نہیں مناتے ایسے لوگوں کے لئے شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟۔ جواب بحوالہ کتب ونقل عبارت مرحمت فرمائیں فقط والسلام۔

محمد عبدالمنان میاں جی کٹک موکا۔ ۶ رمئی ۵۵ء

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

(۱) جب وہاں ۲۹ رشعبان کو نہ خود چاند دیکھا گیا نہ بطریقہ موجب کوئی شرعی شہادت دستیاب ہوئی تو انہیں شعبان کے ۳۰ ردن پورے کرنے تھے۔ حدیث شریف میں ہے "فان غم علیکم فاقدروا له ثلثین۔

نہ ۳۰ رشعبان کو روزہ رکھا جاتا ہے نہ اسکی شب میں نماز تراویح پڑھی جائے۔ اور ریڈیو کی خبر کی بنا یہ دونوں کام کرنے غلط اور خلاف شرع ہوئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب:۔

(۲) ایسے یوم شک ۳۰ رشعبان کو بہ نیت نفل روزہ رکھنا عوام کو مکروہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۳) جب شرعا رویت ہلال ہی ثابت نہیں ہوسکی تو رمضان کی نیت سے روزہ رکھنا مکروہ وممنوع ہے وللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۴۔۵) صورت مذکورہ میں بہ نیت فرض رمضان اور بہ نیت نفل روزہ رکھنے والا خطا کار اور مرتکب مکروہ تحریمی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۶) محض ریڈیو کی خبر پر تراویح وروزہ رکھنا نادرست اور ایسے لوگ دین سے بے خبر ہیں واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۷) جن لوگوں نے ریڈیو کی خبر کو معتبر نہیں جانا اور ۳۰ شعبان کو نہ روزہ رکھا نہ اسکی شب میں تراویح پڑھی تو انکا یہ فعل درست ہوا شرع کے موافق ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۸) جولوگ ریڈیو، تار، ٹیلیفون، خط وغیرہ کی خبروں پر رمضان وعید کرلیا کرتے ہیں وہ خلاف شرع کیا کرتے ہیں، اور وہ جو رویت ہلال یا اسکی شرعی شہادت بطریقہ موجب پر رمضان وعید کا حکم دیتے ہیں وہ شریعت کے موافق کرتے ہیں، شہری رواج اگر خلاف شرع جاری ہوجائے وہ ہرگز ماننے کے قابل نہیں، اور جولوگ ریڈیو کی خبر پر خود بھی عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی مجبور کرتے ہیں وہ خلاف شرع کرنے پر بہت جری و دلیر ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ ان کی حالت زار پر رحم فرمائے ان کی بات ہرگز ہرگز نہ مانی جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۹) ایسے لوگ شریعت مطہرہ کے ماننے والے احکام خداوندی کا اتباع کرنے والے ہیں، اس دور میں یہ بہت قابل قدر اور لائق پیروی ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۸۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین دربارۂ اس مسئلہ کے کہ

ہماری مسجد میں ایک پیش امام صاحب مبلغ ۲۰ روپیہ ماہوار ہیں اور فصل پر ان کے لئے غلہ بھی کر دیا جاتا ہے جو وہ بخوبی اپنے گھر کی گذر کرلیتے ہیں، ہمارے یہاں قصبہ میں اور اردگرد بہت سی جگہ نماز عیدالاضحیٰ جمعرات کو ہوئی، اور ہم سب قصبہ والوں نے نماز عیدالاضحیٰ جمعرات کو پڑھی لیکن صرف ہمارے محلے کے پیش امام صاحب اور چند لوگوں نے جو بہت کم تعداد میں تھے، نماز عیدالاضحیٰ بروز جمعہ کو پڑھنے کو کہا، لیکن ہم نے اکثریت زیادہ ہونے اور دوسرے بڑے شہروں میں نماز عیدالاضحیٰ جمعرات کو ہونے کے باعث نماز عیدالاضحیٰ دوسرے پیش امام صاحب کو بلا کر جمعرات کو پڑھی اور قربانیاں بھی کیں، جب ہم نے پیش امام صاحب سے نماز عیدالاضحیٰ پڑھانے کو کہا تھا تو انہوں نے جواب دیا کہ نماز عیدالاضحیٰ جمعہ کی ہے جمعرات کی نہیں ہے، اس لئے جمعرات کو نماز عیدالاضحیٰ پڑھانا جائز نہیں۔ اور انہوں نے چند محلہ کے آدمیوں کی نماز عیدالاضحیٰ جمعہ کو پڑھائی، لہذا ایسی صورت میں ان پیش امام صاحب کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں،۔ جواب سے مطلع کیجئے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

امام مسجد مذکور نے اگر نماز عید الاضحیٰ بروز جمعرات پڑھنے سے اس بنا پر انکار کیا کہ خود قصبہ میں تو انتیس کو رویت ہلال نہ ہوئی ہو اور باہر سے بھی کوئی خبر بطرق موجب شرعی نہ ملی ہو تو عام طور پر اس وقت جو ذرائع خبر ہیں جیسے کسی شہر کی رویت ہلال کی خبر بطور افواہ کے ہو، یا شہرت کے ہو۔ یا اخبار سے وہ خبر ہو۔ یا بذریعہ خط، اور لفافہ کے ہو۔ یا ٹیلی گرام سے ہو، یا ٹیلی فون سے ہو، یا ریڈیو سے ہو، یا وائرلیس سے ہو۔ یا لاؤڈ سپیکر سے ہو یا ٹیلی ویژن سے ہو یا جنتریوں یا قیاسات یا اختراعات کی بنا پر ہو تو یہ تمام ذرائع شرعا معتبر نہیں تو اس بنا پر امام کا جمعرات کے دن نماز عید الاضحیٰ پڑھانے سے انکار کرنا اواسکو ناجائز کہنا بالکل صحیح اور موافق شرع کے ہے۔ اور اگر قصبہ میں انتیس کو روہت ہلال ہوگئی تھی۔ چاند کے دیکھنے والے دو شاہدان عدل گواہی دیں۔ یا خود شاہدین نہ ہوں تو دو شاہد علی الشاہد گواہی دیں۔ یا وقت حکم قاضی کے دو گواہان شرعی گواہی دیں۔ یا حظ قاضی مع شرائط و گواہان کے آئے۔ یا بطور استفاضہ یعنی کسی شہر سے متعدد جماعتیں آئیں اور بالاتفاق یک زبان یہ کہیں کہ فلاں شہر میں فلاں دن رویت ہلال ہوئی ہے۔ عام طور پر لوگوں کا بیان ہے کہ ہم نے ابھی آنکھ سے چاند دیکھا ہے۔ تو یہ پانچ صورتوں ہیں جن سے دوسرے شہر کی رویت ثابت ہو جاتی ہے۔ تو اگر قصبہ میں ان پانچ صورتوں میں سے کوئی صورت متحقق ہوگئی تھی شرعا رویت ہلال کا ثبوت پایا گیا تھا اس کے باوجود امام مذکور کا جمعرات کو نماز عید الاضحیٰ پڑھانے سے انکار کرنا غلط تھا اگر چہ نماز عید ۱۱ ذی الحجہ کو بھی پڑھی جا سکتی ہے مگر ۱۰ کو پڑھنا افضل ہے۔ بہرصورت یہ امام جمعہ کے دن نماز عید الاضحیٰ پڑھکر کسی ایسے جرم شرعی کا مرتکب نہیں ہوا جس کی بنا پر اس کے پیچھے نماز پڑھنا درست نہیں ہو جائے۔ لہذا اس امام کے پیچھے نماز ہرگز ترک نہ کی جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۸۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

دہلی میں دہلی کے علماء رؤسا کی خواہش پر ایک رویت ہلال کمیٹی تقریبا پچاس سال قبل اس لئے بنی تھی کہ وہ متفقہ طور پر ماہ صیام اور عیدین کے چاند کے متعلق فیصلے کرے چنانچہ یہ کمیٹی ہمیشہ ہر طبقہ کے مشاہیر علماء کرام کی شرکت و اتفاق کے ساتھ فیصلہ کرتی رہی۔ اس سال بد قسمتی سے چند علماء نے علیحدہ ایک نئی کمیٹی بنالی اور ٹیلیفون کی خبر پر چاند ہونے کا فیصلہ کر دیا جس کو قدیم کمیٹی کے صدر اور دیگر علماء نے

نہیں مانا اور عدم رویت کا حکم دیدیا۔ اس پر جدید کمیٹی والوں نے نہایت درجہ مخالفت کی جس سے مسلمانوں میں سخت اختلاف واقع ہوگیا۔ جدید کمیٹی والوں کا اسی پر اصرار ہے کہ اب ریڈیو اور ٹیلیفون کی خبر پر اثبات رویت ہلال ہوا کرے گا اب سوال یہ ہے کہ کیا ان آلات کی خبریں معتبر ہوگئیں۔ آج سے تقریبا تیس پینتس سال قبل ایک رسالہ مسمی التلغراف شائع ہوا تھا اس میں بڑے بڑے علماء (جن میں مولٰنا مفتی کفایت اللہ صاحب بھی شامل ہیں) نے تار اور خطوط کے غیر معتبر ہونے پر فتوی دیا ہے اور مفتی صاحب ہمیشہ آخیر عمر تک قدیم کمیٹی سے وابستہ رہے۔ اور دنیاوی عدالت والے بھی ان آلات (ریڈیو ٹیلیفون تار) کو غیر معتبر مانتے ہیں اور شہادت کے لئے شاہد کی حاضری ضروری جانتے ہیں تو کیا شرعی شہادت کا معیار دنیاوی شہادت کے معیار سے کم ہے۔ اگر چہ خبریں معتبر ہیں تو اس کو دلائل سے ثابت کیا جائے اور اگر غیر معتبر ہیں تو بتلایا جائے کہ اس صورت میں مسلمانوں کا کیا فرض ہے۔ نئی کمیٹی کے کہنے پر چلیں یا بدستور قدیم پرانے علماء کے فتوؤں پر عمل کریں۔ بینوا توجروا۔

محمد معین۔ ۲۱۵۶ ریڈسٹون پلاٹنگ رود گران دھلی

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

شریعت نے اثبات رویت ہلال کے لئے صرف چھ طرق موجب معتبر قرار دیئے ہیں۔

پہلا: شہادت علی الرویۃ۔

دوسرا: شہادت علی الشہادۃ۔

تیسرا: شہادت علی القضا۔

چوتھا: شہادت علی خط القاضی۔ تو یہ چاروں صورتیں تو شہادت کے تحت میں داخل ہیں۔ تو ان میں رکن شہادت۔ محل شہادت۔ شرائط شہادت۔ شرائط شاہدان کا لحاظ عموما ضروری ہے اور خصوصا ادائے شہادت کے لئے مجلس قضا میں شاہدان کا قاضی کے سامنے حاضر ہونا اور شہادت علی الشہادت کی تحمیل وتوکیل کا ہونا اور شہادت علی القضاء میں شاہدان کا مجلس قضا میں بوقت قضا موجود ہونا۔ اور شہادت علی خط القاضی میں قاضی کاتب کا مجلس قضا ہی میں شاہدین کو خط سونپنا۔ اور پہلے انہیں خط پڑھ کر سنانا۔ پھر ان کے سامنے اس خط کو لفافہ میں رکھ کر سر بمہر کرنا اور مکتوب الیہ قاضی کا اس خط کو مجلس قضا میں سر بمہر دیکھ کر لینا اور شاہدین کا اس طرح شہادت ادا کرنا کہ یہ فلاں بن فلاں قاضی کا خط آپ کے نام ہے ہم نے اس کو

سنا ہمیں اس پر گواہ کیا ہمارے سامنے اس کو لفافہ میں بند کیا اور سر بمہر کیا۔ اس کا یہ مضمون ہے، ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ آلات تار۔ ٹیلیفون۔ لاؤڈ اسپیکر۔ ریڈیو۔ وائرلیس۔ ٹیلیویژن ان چاروں طرق موجب کی اہلیت نہیں رکھتے کہ ان میں نہ تحمل شہادت کی صلاحیت، نہ شرائط شاہدین کی قابلیت۔ تو ان چاروں طرق موجب میں ان آلات کی نا اہلیت ایسی نمایاں ہے جس کو نہ فقط تعلیم یافتہ شخص بلکہ ناخواندہ بھی تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہے۔

پانچواں: طریق موجب یہ ہے کہ کسی شہر سے جماعت کثیرہ پے در پے آئے اور وہ سب باتفاق بیان کریں کہ فلاں شہر میں ہمارے سامنے عام طور پر لوگ بیان کرتے تھے کہ ہم نے چاند دیکھا ہے۔

چھٹا: طریق موجب یہ ہے کہ جس شہر میں قاضی یا مفتی شرع ہو جس کے حکم یا فتوے پر احکام روزہ عیدین نافذ ہوتے ہیں تو اس شہر کی متعدد جماعتیں آئیں اور وہ باتفاق یک زبان یہ کہیں کہ فلاں شہر میں فلاں ماہ کے فلاں دن رویت ہوئی ہے اسی بنا پر فلاں دن پہلا روزہ تھا یا فلاں دن عید کی گئی تو یہ دونوں از قسم شہادت نہیں بلکہ از قسم اخبار ہیں اور خبر بھی وہ ہے جو حد تواتر تک پہونچ گئی ہے کہ اس شہر سے چند جماعتیں آئیں اور انہوں نے باتفاق یہ بیان کیا کہ وہاں رویت ہوئی تو یہ دونوں خبریں خبر استفاضہ کہلاتی ہے جو خبر متواتر کے حکم میں ہے اور یقین کا فائدہ کرتی ہے اور شہادت سے قوی تر ہے اور ظاہر ہے کہ ان آلات سے جس شہر سے جو خبر آتی ہو۔ وہ واحد کے حکم میں ہے اور خبر بھی ایسی جس کے صدق کا ظن غالب تک حاصل نہیں ہوتا کہ تار ٹیلیفون ریڈیو میں کوئی شرعی طور پر ذمہ داری کا اہتمام نہیں۔ آئے دن ان میں خلاف واقعہ اور جھوٹی خبریں آتی رہتی ہیں پھر اگر مثلاً ریڈیو سے چند مقامات کے اسٹیشنوں کی خبر متفق ہو جائے تو وہ ظن غالب اور تواتر کا افادہ نہیں کرتی۔

اولا: ریڈیو میں اس قدر خامیاں ہیں کہ وہ اس کی نشر کے شرعاً غیر معتبر ہونے کے لئے بہت کافی ہیں۔

ثانیا: ریڈیو سے اگر چہ کسی جماعت علماء کا فیصلہ ہو جب اس کو ایک شخص نشر کرے تو وہ ایک مقام کی خبر واحد ہی تو ہوگی۔

ثالثا: جب اختلاف مطالع کا قول لیا جائے تو چند مقامات کی خبروں کا اتفاق دوسرے مقامات کے لئے کیسے تواتر کا افادہ کریگا۔

رابعا: دو چار مقامات کا اتفاق حد تواتر تک کب پہونچتا ہے تو چند مقامات کی خبر کا اتفاق خبر استفاضہ نہیں جو خبر متواتر کے حکم میں ہو جائے۔

بالجملہ جب ان آلات سے نہ چاروں طرق شہادت متحقق ہو سکے نہ ہر دو طرق خبر استفاضہ قرار پا سکے تو اثبات رویت ہلال کے لئے جو شرعا چھ طرق موجب تھے وہ ان آلات سے حاصل نہ ہو سکے۔ ہاں ان آلات سے اتنی خبر معلوم ہو جاتی ہے کہ فلاں شہر میں چاند دیکھا ہے تو یہ صرف ایک خبر اور حکایت ہے اور شرعا ایسی خبر و حکایت دوسرے شہر میں رویت ہلال ثابت کرنے کے لئے معتبر نہیں۔

ردالمحتار اور طحطاوی میں ہے: اذا اخبر ان اھل بلد کذا راؤہ لانہ حکایۃ۔

تو جب ایک مسلمان عاقل بالغ عادل کی ایسی خبر و حکایت دوسرے شہر کے لئے رویت ہلال ثابت نہیں کرتی تو ان نوایجاد آلات کی مجہول در مجہول خبر دوسرے شہر کے لئے رویت ہلال کس طرح ثابت کر سکتی ہے۔

الحاصل یہ آلات کسی دلیل شرعی سے ثابت نہ ہو سکے اور جب یہ خود دلیل شرعی نہ ہوئے تو ان سے خلاف اصل دوسرا مہینہ شرعا ثابت نہیں ہو سکتا۔

ہدایہ میں ہے: ان الاصل بقاء الشھر فلاینقل عنہ الابدلیل۔

کون نہیں جانتا ہے کہ جب انتیسویں کو رویت ہلال نہیں ہوئی تو تیسویں تاریخ کو ماہ رواں کا موجود ہونا اصل و قطعی ہے تو جب تک اس کے خلاف دوسرے مہینہ کا ثابت کرنا خلاف اصل بلا دلیل کے ہوا۔ تو ماہ رواں کا باقی ہونا قطعی قرار پایا۔

ہاں ایک بات اور باقی رہی کہ بعض اپنی کم علمی کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ ان آلات سے نہ شہادت کا اثبات ہوتا ہے نہ خبر کو دلیل بنایا جاتا ہے بلکہ ان آلات سے شہادت کا اعلان کیا جاتا ہے۔ تو اس فریب کا ازالہ یوں ہے۔

اولاً: ریڈیو میں جس شہادت کا اعلان کیا جاتا ہے وہ شہادت خود قابل اطمینان اور لائق اعتماد ہو یہی تو محل کلام ہے کہ ہر عالم رکن محل شرائط شہادت پر پورے طور پر واقف نہیں ہوتا۔ اور اگر اس سے بھی قطع نظر کیجئے تو بوقت ادائے شہادت کے الفاظ شہادت کو ملحوظ نہیں رکھا۔ شرائط شاہد کا لحاظ نہیں کرتا کہ ان کی بدعقیدگی اور فسق و بدعملی کا تزکیہ کرتا۔ اور ایک عام بلا یہ ہے کہ ہلال رمضان کے علاوہ اور مہینوں میں مستور الحال کی شہادت پر رویت ہلال کا حکم دیدیتا ہے۔ تو جس شہادت میں اتنی غلطیاں خامیاں بکثرت

ہوتی ہوں تو شہادت شرعا کس طرح معتبر ہوسکتی ہے۔ پھر جب وہ شہادت اور اس کا حکم شرعا غیر معتبر تو اس کا ریڈیو پر اعلان کیسے معتبر اور قابل اطمینان ہوسکتا ہے۔

ثانیاً: اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ علماء نے چاند کی با قاعدہ شہادت لیکر چاند ہونے کا حکم کر دیا اور ایک مسلم معتمد متعین ہوکر اس فیصلہ وحکم کی خبر ریڈیو پر نشر کرتا ہے تو یہ اسی طرح ہوا کہ قاضی نے چاند کی باقاعدہ شہادت لیکر چاند ہونے کا حکم دیا اور ایک معتمد مسلمان کو قاصد بنا کر دوسرے شہر میں بھیجا اور اس قاصد نے دوسرے شہر میں قاضی کے حکم کی خبر دی تو اس قاصد کی خبر شرعا معتبر نہیں نہ اس خبر سے دوسرے شہر میں رویت ہلال ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ فتح القدیر میں ہے: الفرق بین رسول القاضی وبین کتابه حيث يقبل رسوله فلان غاية رسوله ان تكون نفسه وقدمنا انه نوى لوذكر ما فى كتابه لذلك القاضى بنفسه لايقبل وكان القياس فى كتابه كذلك الا انه اجيز باجماع التابعين على خلاف القياس فاقتصر عليه۔ (فتح القدیر کشوری ج ۳ ص ۲۶۶)

تو جب دوسرے شہر میں قاصد قاضی کی خبر شرعا معتبر نہیں اور اس سے رویت ہلال ثابت نہیں ہوتی تو اس حکم علماء کی ریڈیو پر نشر کرنے والے قاصد کی خبر کس طرح شرعا معتبر ہوگئی اور اس خبر سے دوسرے مقامات کے لئے رویت ہلال کی کیسے تائید ہوگئی۔

ثالثاً: عبارت فتح القدیر سے ثابت ہوگیا کہ قاضی کا اپنے حدود حکومت کے باہر کسی دوسرے مقامات پر جاکر یہ کہنا کہ میں نے فلاں ماہ کی شہادت لیکر ثبوت ہلال کا حکم دیا۔ اس دوسرے مقامات کے لئے معتبر اور مقبول نہیں تو ان علماء کے حکم کا ریڈیو پر کسی مسلم معتمد شخص کے واسطہ سے نشر کرنا یا خود مفتی کا ریڈیو پر آکر کہنا دوسرے مقامات پر رویت ہلال ثابت کرنے کے لئے کس دلیل شرعی سے معتبر ومقبول ہے۔

رابعاً: اسی عبارت سے ظاہر ہوگیا کہ جب ایک علاقہ کے قاضی کے اعلان وخبر رویت ہلال پر اس کے ماتحت علاقوں ومقاموں کے سوا کسی دوسرے علاقہ کے قاضی کے حدود میں عمل کرنا ضروری نہیں تو ایک مقام کے مفتی کے اعلان وخبر حکم رویت ہلال پر کسی دوسرے مقام کے مفتی کے حدود میں عمل کرنا دہ بھی نہ دس بیس شہر بلکہ تمام ہندوستان کے شہروں قصبوں بلکہ تمام پاکستان کے شہروں قصبوں میں کس دلیل سے ضروری قرار دیا۔

خامسا: مکہ مکرمہ میں چاند کی باقاعدہ شہادت لیکر چاند ہونے کا حکم کیا جاتا ہے اور حکومت نجد کے ذریعہ سے معتمد طور پر ریڈیو پر اس حکم کو نشر کیا جاتا ہے تو مکہ مکرمہ کے ریڈیو کا نشر کیا ہوا اعلان کیوں قابل عمل نہیں۔ ہندوستان و پاکستان میں اس اعلان پر عید اضحیٰ کیوں نہیں ہوتی۔ حالانکہ بقول مفتی بہ اختلاف مطالع غیر معتبر ہے۔

سادسا: ریڈیو کی آواز کی معرفت کو مقید قرار دینا شریعت کی مخالفت ہے اکثر کتب فقہ میں یہ تصریح موجود ہے النغمة تشبه النغمة تو کسی کی آواز کی معرفت تعین شخص کے لئے دلیل شرعی نہیں۔

سابعا: جن شرائط نے ریڈیو کی خبر کو معتبر قرار دیا اگر وہی شرائط تار کے لئے ضروری قرار دیدیئے جائیں تو تار کی خبر رویت ہلال کے لئے کیوں معتبر نہیں۔

ثامنا: قرون ثلثہ میں ایک مقام کی رویت کے صرف اعلان اور خبر پر کسی دور کے مقامات پر اگر عمل کیا گیا ہو تو معتبر و مستند کتاب سے ثابت کیا جائے۔

تاسعا: جو شرائط کتاب القاضی الی القاضی کے ہیں ظاہر ہے کہ ریڈیو کی خبر میں وہ شرائط موجود نہیں ہے تو ریڈیو کی خبر کس بنا پر خلاف قیاس معتبر ہے۔

عاشراً: صرف ایک مقام کے ریڈیو سے رویت ہلال کا اعلان ہو اور اکثر اسٹیشنوں سے یہ اعلان ہو کہ یہاں باوجود مطلع صاف ہونے کے رویت ہلال نہیں ہوئی تو اگر ایک مقام کے رویت کے اعلان کو غیر معتبر قرار دیا جاتا ہے تو کیوں جب وہاں علماء باقاعدہ شہادت لیکر حکم رویت کا کرتے ہیں اور معتمد مسلمان نے ریڈیو پر جا کر اس حکم کو نشر کیا ہے بعدہ اگر اس ایک کو معتبر قرار دیا جاتا ہے تو اکثر اسٹیشنوں کا اعلان کس بنا پر نامعتبر ہوگا۔

حاصل بحث یہ ہے کہ ان آلات کے اعلان اور خبر سے رویت ہلال کا ثابت کرنا احکام شرع کے خلاف ہے اور محض اپنی ناقص رائے پر عمل کرنا ہے اور اپنی عقل سے شرع میں دخل دینا ہے اور بحکم حدیث
-من احدث فی امرنا هذا مالیس منه فهورد۔

کے بدعت اور محدث فی الدین ہے تو اسکے ماننے والے اہل بدعت قرار پائے تو اہل اسلام ان کے قول پر ہرگز ہرگز عمل نہ کریں بلکہ ہر اس کمیٹی کے کہنے پر نہ چلیں جو ان آلات کی خبر پر رویت ہلال ثابت کرے یا جو شرائط شہادت کو مد نظر نہ رکھے یا جو شرائط شاہدین خصوصا ان کے اعتقاد و عملی احوال کا بغیر تزکیہ کئے ہوئے رویت ہلال کا حکم دیدے۔ یا جو بدعقیدہ و بدعمل گواہان کو شہادت کا اہل سمجھ کر اور معتبر

قرار دیکر رویت ہلال ثابت کردے لہذا ایسی کمیٹی کو فیصلہ کرنا شرعا نادرست وحرام ہے جس کو اس اجمالی فتوے کی تفصیل اور ہر چیز پر عبارات دیکھنے کا شوق ہو وہ ہمارے رسالہ ''اجمل المقال لعارف رویۃ الہلال'' کا مطالعہ کرے خصوصا طبع دوم کا جس میں ضروری ابحاث اور تحقیقات جدیدہ پیش کی گئیں ہیں۔ اور ہلال کمیٹیوں کی شرعی حیثیت اوران کی شرمناک غلطیاں دکھائی گئیں ہیں اور یہ طبع اول سے تقریبا ڈیوڑھا ہوگیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۵/ ذیقعدہ ۱۳۷۸ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

رسالہ اجمل المقال لعارف رویۃ الہلال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی جعل للقمر بروجا ومنازلا۔ والصلاۃ والسلام علی من رجع الشمس علی اشارتہ عاجلا۔ وشق القمر باصبعہ اذا صار کاملا۔ وعلیٰ الہ وصحبہ الذین ھم بدور لمن یکون لدینہ مستکملا وعلی الائمۃ والفقھاء الذین ھم نجوم لمن یکون فی الحوادث سائلا۔ وعلی کل من کان الی الدین مائلا۔

امابعد۔ آج اگر مسلمان اپنے دین کو جانتے۔ مذہب کو مانتے۔ عقائد سے واقف ہوتے مسائل سے آگاہ ہوتے۔ دینی تعلیم کا ذوق رکھتے۔ اعمال کا شوق رکھتے مدارس اسلامیہ کو عروج پر پہنچاتے۔ علمائے حق کی خدمت میں بکثرت آتے جاتے۔ تو ان میں نہ کوئی نیا مذہب ایجاد ہوتا نہ کوئی سلف وخلف کی مخالفت کی جرأت کرتا۔ نہ کوئی مغربی تعلیم کے اثر سے اس قدر دلیر ہو جاتا کہ مسائل دین میں محض اپنی رائے ناقص سے دخل دینے لگتا۔ اور جائز کو ناجائز اور حرام کو حلال ٹھہرا لیتا۔ اس وقت یہ جو کچھ مذہب سے آزادی اور دین سے بیزاری پھیلتی چلی جارہی ہے اور ہر جگہ فرقہ بندی اور اختلافات کا سیلاب امنڈتا جارہا ہے۔ یہ سب دین سے ناواقفی اور مذہب سے بے رغبتی کا ثمرہ ہے۔ یہ ایک بلائے عام ہے کہ احکام دین کو نہ خود جانتے ہیں۔ نہ جاننے والوں سے دریافت کرتے ہیں۔ جو اپنے خیال خام اور زعم ناقص میں آجاتا ہے۔ اسی کو حکم شریعت اور مسئلہ دین قرار دیدیتے ہیں۔ یہی ایک رویت ہلال کا مسئلہ ہے۔ اس میں ہر شخص آزاد ہے۔ ہر ایک کی نئی ایجاد ہے۔ خصوصاً عید کے چاند میں ہر کس وناکس اپنے آپ کو مفتی دین اور قاضی شرع سمجھتا ہے۔ اور ہر نامقبول اور نااہل کی خبر پر ثبوت ہلال کا قطعی طور پر حکم دیدیتا ہے۔ باجودیکہ عوام کا تو ذکر ہی کیا بعض خواص کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ وہ نہ شہادت کی صحیح تعریف جانیں۔ نہ تحمل واداکے فرق پہنچانیں۔ نہ انہیں شہادت کے رکن کا علم۔ نہ انہیں نفس شہادت کے شرائط پر اطلاع۔ نہ مشہود بہ کے شرائط کا پتہ۔ نہ انہیں یہ معلوم کہ کن کن شاہدوں کی شہادت معتبر ہے۔ اور کن کن گواہوں کی گواہی نامعتبر ہے۔ نہ انہیں یہ امتیاز حاصل ہے کہ احکام شرع کی بنا یقینیات پر ہے۔ یا ظنیات پر ہے۔ حتی کہ ان کی لاعلمی ہی نہیں بلکہ ان کی دلیری اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ رویت ہلال کے متعلق ادھر تو عوام نے

کچھ ایسے من گڑھت قواعد اور قیاسات بنا لئے ہیں جن کی دین میں کوئی اصل نہیں۔ ادھر مغربی ایجادات کے متوالوں نے تار۔ ٹیلی فون۔ لاؤڈ اسپیکر ریڈیو، وائرلیس، ٹیلیویژن وغیرہ کی خبروں کو رویت ہلال کے لئے مان لیا ہے۔ جن کی خبر شرعا غیر مقبول و نا معتبر ہے

بلکہ تعجب ہے کہ چند نام کے مولویوں نے فساق فجار کی نہ صرف شہادتوں بلکہ ان کی حکایات وخبروں پر عید کا حکم دیدینا شروع کر دیا ہے۔ یہ ان کی انتہائی جہالت اور لاعلمی ہے اور ان کا فاسق کی شہادت کو معتبر جاننا اور اس پر حکم دیدینا سراسر باطل اور بالکل غلط حکم ہے۔

میرے چند اہل علم احباب کا اصرار تھا کہ اس مسئلہ میں کوئی جامع اور مفصل اور نہایت مدلل رسالہ لکھدیا جائے۔ لیکن میں اپنی عدیم الفرصتی کا عذر کرتا رہا۔ اب ریاست جودھپور سے مولوی اشفاق حسین صاحب سلمہ نے چند سوالات بغرض جوابات بھیجے اور بہت زیادہ اصرار کیا کہ ان سوالات کے جوابات میں ایک مبسوط اور جامع رسالہ لکھدیا جائے تا کہ اس کو طبع کرا دیا جائے۔ اور اس کا فائدہ عام ہو۔

لہذا میں نے باوجود اپنی عدیم الفرصتی کے چند ضروری امور اس رسالہ میں جمع کر دیئے ہیں۔ اور ان کے سوالات کے جوابات ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس مسئلہ سے متعلق اور جتنے ضروری امور تھے ان سب کو جمع کر دیا ہے۔ تا کہ اس موضوع میں کسی مزید سوال کی ضرورت ہی پیش نہ آئے اسی بنا پر اس رسالہ کا تاریخی نام ”اجمل المقال لعارف رویۃ الهلال“ رکھدیا ہے۔

اس مسئلہ میں میرے مرشد شریعت وطریقت۔ مجدد دین وملت۔ امام اہل سنت۔ اعلیٰ حضرت مولانا مولوی مفتی الحاج الشاہ احمد رضا خانصاحب قدس سرہ کے دو رسالے میری نظر سے گذرے ایک کا نام ”ازکی الاہلال بابطال ما احدث الناس امر الهلال“ نصف جز کا اور دوسرا ”طرق اثبات ہلال“ جز کا ہے۔ ان میں اس مسئلہ کی نہایت کافی اور بہت نفیس تحقیق ہے لیکن ان میں ان جدید آلات کا حکم اور شرائط شہادت اور اوصاف شاہدین وغیرہ چند ضروری بحثوں کا بیان نہیں تھا۔ اگر چہ اہل علم وفہم کے لئے ان میں سب کچھ مذکور تھا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ رسالے جن سوالات کے جواب میں ہیں ان میں ان چیزوں کا ذکر ہی نہ تھا۔ اور ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ کہ اس زمانہ میں ان میں کے اکثر وجود ہی میں نہیں آئے تھے۔

لہذا ضرورت لاحق ہوئی کہ ان جدید آلات کے بھی مکمل ومفصل احکام لکھدیئے جائیں۔ اس رسالے میں میں نے اپنے مرشد برحق کے ہر دو رسالوں کے اقتباسات بھی درج کئے ہیں۔ اور عربی

عبارات کو مع قید صفحہ و مطبع کے اس لئے لکھا ہے کہ جو صاحب اصل عبارات کا مطالعہ کرنا چاہیں۔ وہ بآسانی دیکھ سکیں۔ اور عوام کے لئے ان عبارات کا اردو میں سامنے ترجمہ کر دیا۔ تا کہ یہ لوگ بھی کلام فقہا پر مطلع ہو جائیں۔ مسئلہ کے اظہار سے پہلے چند مقدمات پیش کئے گئے تا کہ ان کے مطالعہ کے بعد یہ مسئلہ کماحقہ سمجھ میں آجائے۔ اور ان کے محفوظ کر لینے کے بعد پھر کوئی ذی فہم اس قسم کی غلطیوں میں مبتلا نہ ہو سکے و باللہ التوفیق۔ خادم المسلمین محمد اجمل غفرلہ سنی حنفی قادری سنبھلی

سوالات

حضرت فقیہ معظم، وحید الزماں، مفتی ہند، جناب مولانا مولوی الحاج الشاہ محمد اجمل صاحب دام ظلہ العالی ------------------ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔ عرض خدمت والا میں یہ ہے کہ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام صورت ذیل میں کہ

دور حاضر کی نو ایجادات میں ریڈیو، ٹیلیویزن، ٹیلیفون، لاؤڈ اسپیکر، وائرلیس وغیرہ ایسی ایجادات ہوئی ہیں جن کے ذریعہ اعلان کرنے میں ایک قسم کی سہولت پیدا ہو گئی ہے جس سے اعلان و خبر دینے میں پہلے کافی وقت صرف ہوتا تھا، اب چند منٹ بلکہ سکنڈ میں وہ کام ہو جاتا ہے، آج جو کچھ بھی ان ایجادات سے دنیوی بلکہ بعض موقع پر دینی اعلان ہوتا ہے اس کو صحیح جانتے ہوئے اس پر عمل کرتے ہیں اور حکومت کا تو سارا نظام ہی اسی پر ہے۔ اس لئے امور ذیل دریافت طلب ہیں۔

امر اول۔ حاکم شرع بعد شہادت رویت ہلال کے ریڈیو۔ ٹیلیویزن وغیرہ سے عید وغیرہ کے لئے اعلان کرائے تو کیا اس اعلان پر عمل کرتے ہوئے عید وغیرہ کر سکتے ہیں یا نہیں۔

امر دوم۔ حاکم شرع بعد شہادت رویت ہلال کے اپنے نائب کو بذریعہ ٹیلیفون یا وائرلیس کے حکم دے کہ میں نے رویت ہلال کی شہادت لے لی ہے تم اعلان کرا دو کہ کل مثلاً عید وغیرہ ہو گی۔ تو کیا نائب ایسے موقع پر اس کام کے لئے ایسے آلہ کے ذریعہ سے اپنے حاکم اعلیٰ کے حکم پر عمل کر سکتا ہے یا نہیں۔ جب کہ وہ اس کی آواز کو بھی پہچانتا ہو اور اس اعلان پر عید منا سکتے ہیں یا نہیں۔

امر سوم۔ کیا ہر شہر کے لئے علیحدہ علیحدہ شہادت کی ضرورت ہے یا ایک جگہ کی شہادت سے چند جگہ عید منا سکتے ہیں جبکہ اعلان ہر جگہ شرعی قوانین کے تحت میں ہو۔

امر چہارم۔ نماز و خطبہ وغیرہ میں برائے رسانیدن صوت تکبیر امام کے قریب لاؤڈ اسپیکر

لگا سکتے ہیں یا نہیں۔ جب کہ اس سے صرف آواز کا مقتدیوں تک پہنچانا منظور ہو جیسا کہ مجالس خیر میں کرتے ہیں۔

امر پنجم۔ ٹیلی ویژن ایک ایسا تو ایجاد آلہ ہے جس کے اندر متکلم کا پورا نقشہ یہاں تک کہ اس کی پوری نقل وحرکت ایسی معلوم ہوتی ہے جیسا کہ وہ یہاں پر ہی کلام کر رہا ہے۔ درس وتدریس وغیرہ کا کام بھی اس سے لیا جاتا ہے۔ لہذا اگر ٹیلیویزن سے شہادت ہلال وغیرہ یا اعلان عید وغیرہ شرعی قوانین کے تحت میں کرایا جائے تو اس اعلان یا شہادت پر عمل کرتے ہوئے عید منا سکتے ہیں یا نہیں۔ جب کہ شاہد کے اندر شرعی نقطۂ نظر سے کوئی نقص نہ ہو۔ اگر اس صورت میں بھی شہادت یا اعلان قابل قبول نہ ہو تو پھر شہادت کی شرعی نقطۂ نظر سے کیا تعریف ہے؟۔

امر ششم۔ آیا ایجادات مذکورہ کے ذریعہ جو بھی اعلان ہو وہ شرعا قابل قبول ہے یا نہیں اور بعض میں ہے تو تخصیص کی کیا وجہ ہے؟۔

نوٹ:۔ ٹیلیگرام کے اندر تو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس میں ہاں، کا، نا اور نا، کا، ہاں ہو جاتا ہے۔ مگر آلات مذکورہ میں تو اس قسم کا شک وشبہ ہی نہیں اس میں تو متکلم جو کچھ بھی کہے گا وہی صاف آواز آئے گی۔ بلکہ اس کو دوسرے طریقے سے یوں سمجھا جائے کہ دور تک آواز پہنچانے اور پھیلانے کے آلے ہیں۔ اور صوت جو ایک معین جگہ پر تھی اس کو بہت سی جگہ پر پھیلا دیا یعنی متکلم جس وقت اپنی آواز کو نکالتا ہے تو اس کی آواز کو بذریعہ مشین کے ہوا کی لہر میں پہنچایا جاتا ہے جو لہر کہ ایک سکنڈ میں دنیا کے تین چکر لگاتی ہے۔ لہذا جب شرعی قوانین کے تحت میں ریڈیو، ٹیلیویزن وغیرہ سے اعلان کرایا جائے تو ایسے اعلان وغیرہ کو کیوں نہ معتبر مان لیا جائے۔ نیز بسا اوقات اعلان کرنے میں۔ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال کرتے ہیں اور پھر اس کو ہر طرح سے صحیح جان کر عمل کرتے ہیں تو اس طرح حاکم شرع اپنے انتظام سے ریڈیو وغیرہ سے اعلان کرائے تو اس کو بھی معتبر جان کر عمل کرنا چاہئے۔ اِس میں اور اُس میں تخصیص کیوں کی جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لاؤڈ اسپیکر میں ایک معین جگہ تک آواز جاتی ہے۔ اور اس میں ایک وقت میں بہت سی جگہ پہنچ جاتی ہے۔ جواب معہ دلائل کے مرحمت فرمایا جائے۔ بینوا توجروا الی یوم القیامۃ۔

المستفتی عبد المصطفی محمد اشفاق حسین نعیمی اجملی مراد آبادی

مدرس مدرسہ اسلامیہ حنفیہ محلہ خیرادیان جودھپور ۱۹؍ اگست ۱۹۵۰ء

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

جوابات سے قبل چند مقدمات پیش کئے جاتے ہیں جن سے جوابات کا سمجھنا آسان ہوجائے۔

مقدمہ اولیٰ۔احکام شریعت کے ثبوت کے لئے تین حجتیں ہیں۔علامہ خیرالدین رملی کے فتاوی خیریہ میں ہے۔

حجج الشرع الشريف ثلاث البينة والاقرار والنكول ۔ خیریہ مصری ج ۱ ص ۲۰۴ شرع شریف کی حجتیں تین ہیں بینہ اور اقرار اور نکول (یعنی مدعی علیہ کا قاضی کے حلف لینے کے بعد انکار یا سکوت کرنا)۔

علامہ محقق شیخ ابن نجیم الاشباہ والنظائر میں فرماتے ہیں: القاضی لا يقضى الابالحجة وهى البينة اوالاقرار والنكول ۔ (الاشباہ معہ حموی کشوری۔ص ۳۰۱)

قاضی حجت ہی پر حکم دے۔اور حجت بینہ اور اقرار اور نکول ہے۔

فقیہ النفس حضرت امام قاضی خاں کے فتاوی قاضی خاں میں ہے:

ان القاضى انما يقضى بالحجة والحجة هى البينة اوالاقرار واما الصك لايصلح حجة لان الخط يشبه الخط۔ (فتاوی قاضی خاں مصطفائی ص ۳۴۷)

بیشک قاضی تو حجت ہی پر حکم دیگا اور حجت بینہ اور اقرار ہے لیکن چک تو وہ حجت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی کہ خط خط کے مشابہہ ہوجاتا ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ قاضی کے لئے احکام شرع طے کرنے کے لئے تین حجتیں ہیں۔ایک اقرار۔دوسری نکول۔تیسری بینہ۔

اقرار۔یعنی کسی دوسرے کا حق اپنے ذمہ پر ثابت کرلینا۔لہذا جب مقر عاقل بالغ ہو اور بلاجبر واکراہ کے اقرار کرتا ہو تو جس چیز کا مقر نے اقرار کیا ہے قاضی اسی پر حکم دیگا اور وہ مقر پر لازم ہو جائے گی۔

نکول۔یعنی مجلس قضا میں مدعی علیہ کا بلا کسی وجہ کے قاضی کے تین مرتبہ حلف پیش کرنے پر حلف سے انکار کرنا یا سکوت کرنا۔تو قاضی مدعی علیہ کے اس انکار یا سکوت پر حکم کردیگا اور اس کے خلاف مدعی

کے حق میں فیصلہ کردیگا۔

بینہ۔ یعنی شہادت اور گواہوں سے دعوے کو ثابت کرنا حقوق عباد میں ان تینوں کی ترتیب یہ ہے کہ ہدایہ میں ہے۔

اذا صحت الدعوی سأل القاضی المدعی علیه عنها لینکشف وجه الحکم فان اعترف قضی علیه بها لان الاقرار موجب بنفسه فیامره بالخروج عنه وان انکر سأل المدعی البینة وان احضرها قضی بها وان عجز عن ذلك وطلب یمین خصمه استحلفه علیها واذا نکل المدعی علیه عن الیمین قضی علیه بالنکول والزمه ماادعی علیه ملخصا۔ ہدایہ مطبوعہ رشیدیہ ج ۳ ص ۱۸۶ و ۱۸۷

جب دعوی صحیح ہوجائے تو قاضی اس کے متعلق مدعی علیہ سے سوال کرے تاکہ حکم کی وجہ ظاہر ہوجائے پھر اگر وہ اعتراف کرے تو قاضی اس دعوے کی اس پر ڈگری کردے کہ اقرار خود حکم کا سبب ہے تو قاضی اسے اس سے خارج ہونے کا حکم کرے اور اگر مدعی علیہ انکار کرے تو قاضی مدعی سے بینہ طلب کرے اگر وہ بینہ پیش کردے تو اس پر حکم دیدے اور اگر مدعی بینہ سے عاجز ہو تو مدعی علیہ سے اس پر قسم پیش کرے اور جب مدعی علیہ قسم سے انکار کرے تو قاضی اس انکار پر حکم دے اور جو دعوے ہو اس کو لازم کردے۔

تو قاضی انہیں تین حجتوں کی بناء پر حکم کیا کرتا ہے۔ ہاں حقوق اللہ میں زیادہ بینہ پر حکم ہوتا ہے۔ تینوں میں فرق یہ ہے کہ کہ اقرار و نکول قاصرہ ہیں کہ اقرار مقر کے لئے اور نکول منکر کے لئے تو حجت ہے لیکن یہ دونوں اوروں کے لئے نہ موجب نہ ملزم۔ علامہ برہان الدین مرغینانی اقرار کے متعلق فرماتے ہیں۔

ہدایہ میں ہے: وهو "الاقرار" حجة قاصرة لقصور ولایة المقر عن غیره فیقتصر علیه

(ہدایہ مطبوعہ رشیدیہ ج ۳ ص ۲۱۵)

اقرار حجت قاصرہ ہے کہ مقر کی اپنے غیر پر قاصر ولایت ہے تو اقرار کا حکم صرف مقر ہی کے حق میں ہے۔ علامہ ابن عابدین نکول کے متعلق ردالمحتار میں فرماتے ہیں:

النکول اقرار وهو حجة قاصرة بخلاف البینة۔ (ردالمحتار ج ۴ ص ۴۴۲)

نکول بھی اقرار ہے اور حجت قاصرہ ہے بخلاف بینہ کے "کہ وہ حجت تامہ ہے"۔

تو اقرار و نکول ہر دو کا حجت قاصرہ ہونا ثابت ہوا۔ پھر نکول بھی حقیقۃً اقرار ہی ہے۔

ہدایہ میں ہے:النکول اقرار لانہ یدل علی کونہ کاذبا فی الانکار فکان اقرارا او بدلا عنہ۔ (ہدایہ مطبوعہ رشیدیہ ج ۳ ص ۱۸۸)

نکول اس لئے اقرار ہے کہ وہ انکار میں اس کے کاذب ہونے پر دلالت کرتا ہے تو نکول یا تو اقرار ہوا یا اس کا بدل۔

اسی بناء پر امام فقیہ النفس نے شرع کی حجتیں دو قرار دی ہیں۔ کہ نکول بھی اقرار ہی ہے۔ لہذا حجت کاملہ ان تینوں حجتوں میں صرف بینہ ہے۔ تو احکام شرع اکثر و بیشتر اسی بینہ سے ثابت کئے جاتے ہیں۔ اور قاضی بھی زیادہ فیصلے اسی بینہ پر صادر کرتا ہے۔ بالجملہ احکام شریعت کے ثابت ہونے کی صرف یہی تین حجتیں ہیں۔ اب ان کے سوا کسی اور چیز کو محض اپنی رائے سے حجت قرار دینا غلط اور باطل ہے۔ اور دین میں تصرف کرنا ہے۔

مقدمہ ثانیہ۔ مقدمہ اولی میں یہ چیز ثابت ہو چکی کہ اکثر احکام شرع کی بنا اسی بینہ اور شہادت پر ہے۔ تو شہادت کے رکن و شرائط کا سمجھنا بھی نہایت ضروری ہوا۔ لہذا رکن شہادت لفظ اشہد ہے۔ فتاوی عالمگیری میں ہے:اما رکنھا فلفظ اشھد بمعنی الخبر دون القسم۔

(عالمگیری مجیدی کانپور ج ۳ ص ۲۰۲)

شہادت کا رکن لفظ اشہد ہے یعنی میں شہادت دیتا ہوں جو خبر کے معنی میں ہے نہ کہ قسم کے معنی میں۔ حضرت امام اجل ابوالحسن قدوری مختصر قدوری میں فرماتے ہیں:فان لم یذکر الشاھد لفظ الشھادۃ وقال اعلم او اتیقن لم تقبل شھادتہ۔ (قدوری مجیدی ص ۲۷۷)

اگر گواہ نے شہادت کا لفظ ذکر نہیں کیا اور یہ کہا کہ میں جانتا ہوں یا یقین کرتا ہوں تو اس کی شہادت مقبول نہیں۔

محل شہادت۔ یعنی شہادت کا محل اور مکان قاضی کی مجلس ہے۔

علامہ ابن عابدین ردالمحتار میں فرماتے ہیں:قولہ شرائط مکانھا واحدای مجلس القضاء۔

(ردالمحتار مصری ج ۴ ص ۳۸۵)

شہادت کے مکان کی شرط صرف ایک مجلس قضا ہے۔

لہذا قاضی کی مجلس شہادت کے ادا کرنے کے لئے شرط ہے۔ اسی طرح مفتی شہر کی مجلس افتا

شہادت ادا کرنے کے لئے شرط ہے۔

تحمل شہادت۔ یعنی گواہ بننے کے لئے تین شرطیں ہیں ۔(۱) عاقل ہونا۔(۲) بینا ہونا، (۳) جس چیز کی گواہی دیجائے گی اس کا معائنہ کرنا۔

درمختار میں ہے: شرائط التحمل ثلثة العقل الكامل وقت التحمل والبصر ومعائنة المشهود به۔ (ردالمحتار مصری ج۴ص ۳۸۵)

تحمل شہادت کی تین شرطیں ہیں۔ بوقت تحمل عقل کامل ہونا۔ بینا ہونا۔ جس کی گواہی دی جائے اس کا معائنہ کرنا۔

شرائط شہادت۔ یعنی نفس شہادت کے لئے تین شرائط ہیں ۔(۱) دعوی کا ہونا۔(۲) اور جن چیزوں پر مرد بھی مطلع ہوتے ہیں ان میں دو مرد یا ایک مرد دو عورتوں کے عدد کا ملحوظ رکھنا۔(۳) ہر دو گواہوں کا بیان میں متفق ہونا۔

عالمگیری میں اور ردالمحتار میں ہے: منها مايرجع الى نفس الشهادة وهى الدعوى والعدد فى الشهادة فيما يطلع عليه الرجال واتفاق الشاهدين ملخصا۔

(عالمگیری مجیدی ج۳ص۲۰۲ وکذا فی الشامی)

شرائط شہادت سے جو نفس شہادت کی طرف راجع ہوں ۔ وہ دعوی کا ہونا۔ جس پر مرد مطلع ہو سکیں۔ شہادت میں عدد کا ملحوظ ہونا۔ ہر دو گواہوں کا متفق ہونا۔

شرائط مشہود بہ۔ یعنی جس کے ساتھ شہادت دی جائے گی۔ اس کی سات شرطیں ہیں۔

ردالمحتار میں ہے: الاسلام ان كان المشهود عليه مسلما والذكورة فى الشهادة فى الحد والقصاص وتقدم الدعوى فيما كان من حقوق العباد وموافقتها للدعوى وقيام الرائحة فى الشهادة على شرب الخمر ولم يكن سكران لا لبعد مسافة والاصالة فى الشهادة فى الحدود والقصاص وتعذر حضور الاصل فى الشهادة على الشهادة كذا فى البحر۔

(ردالمحتار مصری ج۴ص ۳۸۵)

جس کے خلاف شہادت ہو اگر وہ مسلمان ہے تو اس کا مسلمان ہونا حدود وقصاص کی شہادت میں مرد ہونا حقوق عباد میں جس کی شہادت دینا چاہتا ہے اس سے پہلے دعوی ہو جانا شہادت کا دعوی کے موافق ہونا شراب پینے کی شہادت میں جب وہ بیہوش نہ ہوا اور دور کی مسافت نہ ہو تو بو کا موجود

ہونا۔ حدود وقصاص کی شہادت علی الشہادۃ میں گواہان اصل کا شہادت دینا۔ شہادت علی الشہادت میں گواہان اصل کی حاضری کا دشوار ہونا۔

شرائط شاہدین۔ یعنی ادائے شہادت میں گواہوں کے لئے دس شرائط ہیں۔

ردالمحتار میں ہے: فھی الحریۃ والبصر والنطق والعدالۃ لکن ھی شرط وجوب القبول علی القاضی لاشرط جوازہ وان لا یکون محدودا فی قذف وان لایجرالشاھد الی نفسہ مغنما ولایدفع عن نفسہ مغرما فلاتقبل شھادۃ الفرع لاصلہ وعکسہ واحد الزوجین للاخر وان لا یکون خصما فلاتقبل شھادۃ الوصی للیتیم والوکیل لموکلہ وان یکون عالما بالمشھود بہ وقت الاداء ذاکرالہ۔　　(ردالمحتار مصری ج ۴ ص ۳۸۵)

شرائط شاہدین یہ ہیں۔ آزاد ہونا۔ بینا ہونا۔ بولنے والا ہونا۔ عادل ہونا۔ لیکن یہ شرائط وجوب قبول علی القاضی کے ہیں۔ نہ کہ جواز کے شرائط۔ اور اس کا تہمت کی حد مارا ہوا نہ ہونا۔ اور گواہ میں اپنے لئے کوئی نفع یا اپنے اوپر سے دفع ضرر مقصود نہ ہونا۔ تو فرع کی شہادت اصل کے لئے اور اصل کی فرع کے لئے اور زن وشوہر میں ایک کی دوسرے کے لئے مقبول نہیں۔ اور گواہ کا فریق مقدمہ نہ ہونا۔ پھر وصی کی شہادت یتیم کے لئے اور وکیل کی موکل کے لئے مقبول نہیں اور جس چیز کی شہادت دیتا ہو بوقت ادا اس کو جاننا اور اس کا یاد ہونا۔

حکم شہادت۔ قاضی کے لئے گواہوں کی عدالت ثابت ہونے اور تزکیہ ہو جانے کے بعد اس کے موافق حکم کرنا واجب ہے۔

درمختار میں ہے: حکمھا وجوب الحکم علی القاضی بموجبھا بعد التزکیۃ۔

(ردالمحتار مصری ج ۴ ص ۳۸۵)

شہادت کا حکم یہ ہے کہ قاضی پر تزکیہ کے بعد اس شہادت کے موافق حکم کا واجب ہونا۔

ادائے شہادت۔ حقوق اللہ میں بلاطلب مدعی کے بھی گواہی دینا واجب ہے۔

درمختار میں ہے: ویجب الاداء بلاطلب الشھادۃ فی حقوق اللہ تعالیٰ۔

(ردالمحتار مصری ج ۴ ص ۳۸۶)

حقوق اللہ میں بلاطلب مدعی کے گواہی دینا واجب ہے۔

اب باقی رہے شہادت کے اقسام ان کی تفاصیل کتب فقہ میں ہے لیکن گواہوں کا عادل ہونا تمام

اقسام میں شرط ہے۔

عینی شرح کنز الدقائق میں ہے: شرط للکل ایضا (العدالة) لانها هی المعینة للصدق قال الله تعالیٰ واشهد واذوی عدل منکم وقال الله تعالیٰ ممن ترضون من الشهداء والعدل هو المرضی وهی شرط لزوم العمل بالشهادة۔ (عینی مصری ج۲ص ۷۸)

تمام اقسام شہادت کے لئے عدالت شرط ہے کہ یہی صداقت کے لئے معین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم میں سے دو صاحب، عدل گواہی دیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: گواہوں میں سے ہوں کہ جو تمہارے پسندیدہ ہوں۔ اور عدالت ہی وصف پسندیدہ ہے تو یہی عدالت شہادت پر لزوم عمل کے لئے شرط ہے۔

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ شہادت کے لئے عدالت کا شرط ہونا قرآن کریم کی آیات سے ثابت ہے۔ اب فرمان خداوندی کے ہوتے ہوئے کسی اور دلیل کی حاجت ہی نہیں باقی رہتی۔ اور عدالت سے مراد فقہائے کرام کی یہ ہے۔

ردالمحتار میں ہے: قال فی الذخیرة واحسن ماقیل فی تفسیر العدالة ان یکون مجتنبا للکبائر ولا یکون مصرا علی الصغائر ویکون صلاحه اکثر من فساده وصوابه اکثر من خطئه۔ (ردالمحتار مصری ج۴ص ۳۸۷)

ذخیرہ میں کہا اور عدالت کی تفسیر میں بہترین قول یہ ہے کہ عادل کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرنے والا ہو اور صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرتا ہو اور اس کی صلاح فساد سے زائد ہو اور اس کا صواب خطا سے اکثر ہو۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: واحسن ماقیل فی تفسیر العدل مانقل عن ابی یوسف رحمه الله ان العدل فی الشهادة ان یکون مجتنبا عن الکبائر ولا یکون مصرا علی الصغائر ویکون صلاحه اکثر من فساده وصوابه اکثر من خطائه کذا فی النهایة۔

(عالمگیری مجیدی ص ۲۰۲)

اور عدل کی تفسیر میں عمدہ ترین وہ قول ہے جو حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے کہ شہادت میں عادل ہونا یہ ہے۔ کہ وہ کبیرہ گناہوں سے مجتنب ہو اور صغیرہ گناہوں پر مصر نہ ہو۔ اور اس کی صلاح اس کے فساد سے زیادہ ہو اور اس کا صواب اس کی خطا سے اکثر ہو اسی طرح نہایہ میں ہے۔

لہذا اب شہادت میں گواہ کے عادل ہونے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرتا ہو اور صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرتا ہو۔ اس کا صلاح وصواب اس کے فساد وخطا سے زائد ہو۔

الحاصل جب شہادت کا مکان اور اس کا رکن اور اس کے تمام چوبیس شرائط پائے جائیں تو وہ شہادت حجت ہوتی ہے اور اس پر حکم مرتب ہوتا ہے۔

مقدمہ ثالثہ۔ ہلال سے مہینہ کی ابتدائی تاریخوں کا چاند مراد ہوتا ہے۔ اور اکثر اہل لغت کے نزدیک ابتدائی دو راتوں کے چاند کو ہلال کہتے ہیں۔

چنانچہ تفسیر احکام القرآن میں ہے: قال الزجاج الاکثر یسمونه هلالا لابن لیلتین۔

(تفسیر احکام القرآن مصری ج ا ص ۲۹۹)

زجاج نے کہا کہ اکثر اہل عرب دو راتوں کے چاند کا نام ہلال رکھتے ہیں۔

رویت ہلال یعنی نیا چاند دیکھنے کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے مہینہ کی طول مدت کے لئے ابتدائے حد مقرر فرمایا۔

چنانچہ مسلم شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے۔

ان رسول الله ﷺ امده للرویة فهو للیلة رایتموه (وفی روایة) ان الله قد امده لرویته فان اغمی علیکم فاکملوا العدة۔ (مسلم شریف معہ نووی مطبوعہ مجتبائی دہلی ج ا ص ۳۴۸)

بیشک رسول اکرم ﷺ نے رویت کو مہینہ کی مدت قرار دیا تو وہ ہلال اسی رات کا ہے جس میں تم نے اسے دیکھا (اور ایک روایت میں یہ ہے) کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے چاند دیکھنے کو مدت ماہ کی درازی کی حد ٹھہرایا تو اگر تم پر مہینہ پوشیدہ ہو جائے تو عدت یعنی تیس دن پورے کرو۔

لہذا چاند کا دیکھنا بھی احکام شرع سے ایک حکم قرار پایا۔ بلکہ یہ تو وہ اہم حکم ہے۔ جس کا حکم قرآن کریم میں ہے:

یسئلونك عن الاهلة ط قل هی مواقیت للناس والحج ۔ (سورہ بقرہ ع ۲۴ ج ۲)

تم سے نئے چاند کو پوچھتے ہیں۔ تم فرما دو وہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں اور حج کے لئے۔

حضرت حجۃ الاسلام امام ابوبکر رازی تفسیر احکام القرآن میں آیۃ کریمہ کے تحت فرماتے ہیں:

تعلق الحکم فیه برویة الاهلة ولما کانت هذه عبادة تلزم الکافة۔

(احکام القرآن مصری ج ا ص ۲۳۶)

اس میں حکم رویت ہلال پر معلق کیا اور جب رویت ہلال عبادت ثابت ہوئی تو یہ سب کے لئے لازم ہوئی۔

نیز اسی احکام القرآن میں ہے: والناس مامورون لطلب الهلال۔

(احکام القرآن مصری ج ۱ ص ۲۳۷)

لوگ ہلال کے طلب کرنے کے لئے مامور ہیں۔

بخاری شریف و مسلم شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے۔

قال رسول الله ﷺ لاتصوموا حتی تروا الهلال ولا تفطروا حتی تروه فان غم عليكم فاقدروا له۔ (مشکوۃ شریف مجیدی ص ۱۷۴)

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تم روزہ مت رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو۔ اور افطار مت کرو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو پھر اگر مہینہ تم پر پوشیدہ ہو جائے تو اس کا اندازہ کرو یعنی تیس دن شمار کرلو۔

اس آیت و تفسیر اور حدیث شریف سے رویت ہلال کا حکم شرع اور عبادت ہونا ثابت ہوا تو اس کے اثبات کے لئے وہی چیز حجت قرار پائے گی۔ جس کو شریعت نے حجت ٹھہرایا۔ لہذا رویت ہلال کا اثبات حجت بینہ سے ہوگا۔ اور جب اس کا اثبات بینہ سے قرار پایا تو شہادت کا رکن اور چوبیس شرائط کا لحاظ اس رویت ہلال کے ثبوت میں ضروری ہوگا۔

اب رہی خبر و حکایت وغیرہ وہ شرعی حجت نہیں جن سے رویت ہلال کا اثبات نہیں ہوسکتا۔ ہاں جو خبر حد استفاضہ تک پہنچ جائے تو پھر وہ خبر متواتر کے حکم میں ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ رویت ہلال کا اثبات شہادت شرعی سے ہوگا۔ یا استفاضہ سے۔ خبر وافواہ سے نہیں ہوسکتا۔

مقدمہ رابعہ۔ رویت ہلال رمضان کے اثبات کے لئے نہ شہادت کی حاجت نہ استفاضہ کی ضرورت نہ اس میں مجلس قضا شرط نہ حکم حاکم شرط۔ نہ اس کے لئے دو مرد یا ایک مرد دو عورتوں کا شہادت دینا ضروری نہ یہ کہنا ضروری کہ میں گواہی دیتا ہوں۔ بلکہ جب مطلع پر ابر یا غبار ہو تو ایک مسلمان عاقل بالغ عادل ہو۔ یا مستور مرد ہو یا عورت۔ آزاد ہو یا غلام۔ اس کا یہ کہہ دینا کافی ہے۔ میں نے اپنی آنکھ سے اس رمضان کا چاند فلاں دن دیکھا۔

علامہ علاء الدین حصکفی درمختار میں فرماتے ہیں:

وقبل بلادعوی وبلا لفظ اشهد وبلا حکم ومجلس قضاء لانه خبر لا شهادة للصوم مع علة كغيم وغبار خبر عدل او مستور لافاسق ولو كان العدل قنا او انثى او محدود قذف تاب ۔ ملخصا۔ (ردالمحتار مصری ج۲ ص ۹۳)

اور بغیر دعوی کے اور بلا لفظ اشہد کے اور بلا حکم اور مجلس قضا کے بحالت ابر وغبار روزہ کے لئے ایک عادل یا مستور کی خبر قبول کرلی جائے گی۔ اگرچہ وہ عادل غلام ہو یا عورت ہو۔ یا تہمت کی حد لگا ہوا توبہ کرچکا ہو۔ اس لئے کہ یہ خبر ہے نہ کہ شہادت ہے۔ ہاں وہ خبر دینے والا فاسق نہ ہو۔

بلکہ ہلال رمضان میں مطلع صاف ہونے کی صورت میں اگر بیرون شہر یا شہر کے کسی بلند مقام سے چاند دیکھنا بیان کیا جاتا ہے۔ تو ایک عادل یا مستور ہی کا قول معتبر ہے۔ اور اگر بیرون شہر یا بلند مقام کی رویت نہیں بتائی جاتی۔ اور لوگ چاند دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ تو دو عادل یا مستور کا قول کافی ہے۔ ورنہ ایسی جماعت عظیمہ ہونی چاہئے۔ جو اپنی آنکھ سے چاند دیکھنے کی خبر دیں اور جن کے بیان پر غلبہ ظن حاصل ہو جائے۔ اور عقل اتنے لوگوں کا غلطی پر متفق ہونا محال جانے۔

درمختار میں ہے:

وقبل بلاعلة جمع عظيم يقع العلم الشرعى وهو غلبة الظن بخبرهم وهو مفوض الى رائ الامام من غير تقدير بعدد على المذهب وعن الامام انه يكتفى بشاهد واختاره فى البحر وصحح فى الاقضية الا كتفاء بواحدان جاء من خارج البلد او كان على مكان مرتفع واختاره ظهير الدين ۔ (ردالمحتار مصری ج۲ ص ۹۵)

اور بلا ابر وغبار کے ایسی بڑی جماعت کی شہادت قبول کی جائے گی۔ جس کی خبر سے علم شرعی اور ظن غالب واقع ہو۔ اور مذہب صحیح پر بغیر مقدار کسی عدد کے جماعت کا تعین امام کی رائے پر موقوف ہے۔ اور حضرت امام اعظم سے مروی ہے کہ دو گواہ کافی ہیں۔ اور بحر میں اسی کو مختار ٹھہرایا۔ اور اقضیہ میں تصحیح کی ایک بھی کافی ہے۔ اگر بیرون شہر سے آئے۔ یا کسی بلند مقام کو بتائے اسی کو ظہیر الدین نے مختار قرار دیا۔

بخلاف اور تمام چاندوں کے لئے کہ اگر مطلع پر ابر وغبار ہے تو ان کے لئے مجلس قضا بھی شرط ہے اور حکم حاکم بھی۔ اور نصاب شہادت دو مرد یا ایک مرد دو عورتوں کا ہونا بھی شرط ہے۔ اور ان کا عادل وآزاد ہونا بھی اور یہ بھی شرط ہے کہ وہ گواہ وقت شہادت یہ کہیں میں گواہی دیتا ہوں۔ اور مطلع صاف ہے تو جب تک اس قدر لوگ شہادت نہ دیں۔ جن کے لئے عقل محال جانے کہ اتنے لوگ جھوٹ پر جمع نہیں

ہوسکتے۔

درمختار میں ہے:

وشرط للفطر مع العلة والعدالة نصاب الشهادة ولفظ اشهد ولو كانوا ببلدة لاحاكم فيها صاموا بقول ثقة وافطروا باخبار عدلين مع العلة للضرورة وقبل بلاعلة جمع عظيم يقع العلم الشرعي وهو غلبة الظن بخبرهم وهلال الاضحى وبقية الاشهر التسعة كالفطر على المذهب مختصرا۔ (ملخصا از ردالمحتار مصری ص ۹۴،۹۵،۹۸)

اور ہلال فطر کے لئے بحالت ابروغبار مع عدالت کے شہادت کا نصاب اور یہ کہنا کہ میں گواہی دیتا ہوں شرط ہے۔ اوراگر کسی ایسے شہر میں ہوں جس میں کوئی حاکم نہ ہوتو ثقہ کے قول پر روزہ رکھیں۔ اور بحالت ابروغبار ضرورۃً دوعادل کے خبر دینے پر افطار کرلیں۔ اور بغیر ابروغبار کے ایسی بڑی جماعت کی شہادت قبول کرلی جائے گی جن کی خبر سے علم شرعی اور ظن غالب حاصل ہوجائے اور ہلال اضحیٰ اور باقی نوماہ کا ہلال مذہب صحیح پر مثل ہلالی فطر کے ہے۔

بالجملہ رمضان المبارک کے علاوہ عیدالفطر وعیداضحیٰ وغیرہ ہرماہ کی رویت ہلال کا اثبات شہادت کے ان تمام شرائط کے ساتھ ہوگا۔ جن کا مفصل ذکر مقدمہ ثانیہ میں مذکور ہوا۔

مقدمہ خامسہ۔ شرعاً مہینہ ۲۹ انتیس دن کا بھی ہوتا ہے۔ اورتیس ۳۰ دن کا بھی ہوتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے جس کو بخاری ومسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انا امة امية لانكتب ولانحسب الشهر هكذا وهكذا يعني مرة تسعا وعشرين ومرة ثلثين۔ (بخاری شریف مصطفائی ج۱ ص ۲۵۶)

ہم یعنی عرب امی گروہ ہیں کہ ہم حساب وکتاب نہیں جانتے ہیں مہینہ ایسے اور ایسے یعنی کبھی ماہ انتیس دن کا ہوتا ہے کبھی تیس دن کا ہوتا ہے۔

تواگر انتیس کو چاند کی رویت شہادت یا استفاضہ سے ثبوت کو پہنچ جائے تو مہینہ انتیس کا ہوگا اور اگران میں سے کسی چیز سے ثبوت نہ ہوسکے تو مہینہ یقیناً تیس کا ہوگا۔

مسلم شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا۔

فان اغمی علیکم فاقدروا له ثلثين۔ (مسلم شریف مجتبائی ج۱ ص ۳۴۷)

اگرماہ تم پر ابر کی وجہ سے پوشیدہ ہوجائے تو مہینہ تیس دن شمار کرلو۔

علامہ نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

حاصله ان الاعتبار بالهلال فقد يكون تاما ثلثين وقد يكون ناقصا تسعا وعشرين وقد لايرى الهلال فيجب اكمال العدد ثلاثين ۔ (مسلم شریف مجتبائی مع نووی ج ۲ ص ۳۴۷)

حاصل اس کا یہ ہے کہ اعتبار ہلال پر ہے تو کبھی رویت ہلال پورے تیس دن میں ہوتی ہے اور کبھی کم میں انتیس دن میں ہو جاتی ہے اور کبھی ہلال کی رویت ہی نہیں ہوتی تو پھر تیس کے عدد کا مکمل کرنا واجب ہے۔

لہذا یہ نتیجہ حاصل ہوا کہ اگر انتیس کو رویت ہلال کسی شرعی طریق سے ثابت ہو جائے جب تو مہینہ انتیس کا قرار پائے گا ورنہ تیس دن کا پورا کرنا واجب ہے تو تیسویں دن مطلع کے صاف ہونے یا اس پر ابر وغبار ہونے کا کوئی فرق نہیں ہے۔ کہ قمری مہینہ تیس دن سے زائد کا ہو نہیں سکتا۔ ہاں اس میں ایک ایسی صورت نکل سکتی ہے کہ رمضان شریف کا چاند ایک شخص کی شہادت پر مان لیا گیا تھا۔ اب اس کے حساب سے تیس دن پورے ہو جائیں۔ اور تیسویں دن مطلع بالکل صاف ہو اور ہلال عید کسی کو نظر نہیں آتا تو اگلے دن روزہ رکھا جائے گا۔ اور اس پہلی گواہی کو غلط قرار دیا جائے گا۔ اور روزے اکتیس ہو جائیں گے۔

صاحب درمختار شرح ملتقی میں فرماتے ہیں: ولو صاموا ثلثين يوما ولم يروه اى هلال الفطر حل الفطر ان صاموا بشهادة اثنين عدلين وان كان الصوم بشهادة واحد لايحل (اى لهم الفطر) ۔ (در المنتقی شرح ملتقی مصری ج ۱ ص ۲۳۷)

اگر لوگوں نے تیس دن روزے رکھ لئے اور عید کا چاند انہیں نہ دکھا تو فطر جب حلال ہے کہ انہوں نے دو عادلوں کی گواہی پر روزے رکھے ہوں، اور ایک کی گواہی پر روزہ شروع کیا ہو تو فطر حلال نہیں۔

اب باقی رہا انتیسویں تاریخ کو چاند دیکھنا تو شعبان و رمضان اور ذیقعدہ کی انتیسویں کو واجب ہے لیکن اس سے مراد واجب کفایہ ہے۔

چنانچہ مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں فرماتے ہیں:

ويجب على الناس وجوب كفاية التماس الهلال فى التاسع والعشرين من شعبان ومن رمضان وكذا ذوالقعدة لان الشهر قديكون تسعا وعشرين وكذا يجب على الحاكم

ان یامر الناس ولا اعتبار باختلاف المطالع حتی قالوا لورای اهل المغرب هلال رمضان یجب برویتهم علی اهل المشرق اذا ثبت عندهم بطریق موجب ۔

(مجمع الانہر مصری ج ا ص ۲۳۸)

اور لوگوں پر شعبان و رمضان اور اسی طرح ذیقعدہ کی انتیسویں کو چاند دیکھنا واجب کفایہ ہے۔ اس لئے کہ مہینہ کبھی انتیس دن کا بھی ہوتا ہے اور حاکم پر بھی یہ واجب ہے کہ لوگوں کو چاند دیکھنے کا حکم دے۔ اور جب کسی جگہ رویت ثابت ہو جائے تو سب جگہ کے لوگوں کے لئے لازم ہے۔ کہ اختلاف مطالع معتبر نہیں یہاں تک کہ فقہائے کرام نے فرمایا کہ اگر اہل مغرب نے رمضان کا چاند دیکھا تو ان کی رویت پر اہل مشرق کا عمل واجب ہے جب انہیں بطریق موجب ثابت ہو جائے۔

اس عبارت سے یہ ثابت ہو گیا کہ انتیس کو چاند دیکھا جائے ۔ اور جب کسی ایک جگہ رویت ثابت ہو جائے تو وہ تمام شہروں اور مواضعات کے لئے کافی ہے۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ انہیں رویت ہلال کا ثبوت بطریق موجب پہنچ جائے۔ ورنہ انہیں تیس دن کا پورا کرنا ضروری ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ مقدمات تو ختم ہو گئے۔

اب اس بات کا سمجھنا ضروری ہے کہ فقہا طریق موجب کسے کہتے ہیں اور طریق موجب کن کن صور میں پایا جاتا ہے اور اخبار و حکایات سے طریق موجب کا حصول ہو جاتا ہے۔ یا نہیں۔

علامہ طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح میں فرماتے ہیں:

قوله (لزم سائر الناس) فی سائر اقطار الدنیا اذا ثبت عندهم الرویة بطریق موجب کان یتحمل اثنان الشهادة او یشهدا علی حکم القاضی او یستفیض الخبر بخلاف ما اذا اخبر ان اهل بلدة کذا رأوه لانه حکایة۔ (طحطاوی مصری ۳۸۲)

تمام لوگوں کو تمام اقطار دنیا میں لازم ہے جب ان کے پاس رویت کا ثبوت بطریق موجب پہنچ جائے جیسے دو شخص شہادت کے حامل بنیں۔ یا دو شخص حکم قاضی پر گواہی دیں یا خبر مستفیض ہو بخلاف اس صورت کے جب کہ یہ خبر سنائی کہ فلاں شہر کے لوگوں نے چاند دیکھا ہے کہ یہ حکایت ہے۔

علامہ عبدالرحمٰن شیخ زادہ مجمع الانہر میں فرماتے ہیں:

اذا ثبت عندهم بطریق موجب کما لو شهدوا عند قاض لم یراهل بلده علی ان قاضی بلد کذا شهد عنده شاهدان برویة الهلال فی لیلة کذا وقضی القاضی بشهادتهما

جاز لهذا القاضی ان یقضی بشهادتهما لان قضاء القاضی حجة وقد شهدابه قال الحلوانی الصحیح من مذهب اصحابنا ان الخبر اذا استفاض فی بلدة اخری و تحقق یلزمهم حکم تلك البلدة ۔ (مجمع الانہر مصری ج ۱ ص ۲۳۹)

جب ان کے پاس ثبوت رویت بطریق موجب پہنچے جیسے اس قاضی کے پاس جس کے شہر میں چاند نہ دیکھا یہ شہادت گذری کہ فلاں شہر کے قاضی کے پاس دو گواہوں نے فلاں شب میں رویت ہلال کی شہادت دی اور اس قاضی نے ان کی شہادت پر حکم نافذ کیا تو اس قاضی کو بھی ان کی شہادت پر حکم دیدینا جائز ہے اس لئے کہ قاضی کا حکم حجت ہے اور انہوں نے اس کی گواہی دی اور امام حلوانی نے فرمایا کہ ہمارے فقہا کا صحیح مذہب یہ ہے کہ خبر جب دوسرے شہر میں مستفیض ہو جائے اور ثابت ہو جائے تو اس شہر کا حکم ان پر بھی لازم ہو جاتا ہے۔

ردالمحتار حاشیہ درمختار میں ہے:

قوله بطریق موجب کان یتحمل اثنان الشهادة او یشهدا علی حکم القاضی او یستفیض الخبر بخلافها اذا اخبرا ان اهل بلدة کذا رأوه لانه حکایة ۔

(ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۹)

بطریق موجب جیسے دو شخص شہادت کے حامل بنیں۔ یا قاضی کے حکم پر گواہی دیں۔ یا خبر بطور استفاضہ پہنچے۔ بخلاف اس کے جب کہ خبر سنائی کہ فلاں شہر کے لوگوں نے چاند دیکھا ہے کیونکہ یہ حکایت ہے۔

ان عبارات سے رویت ہلال کے ثبوت کے تین طریقے معلوم ہوئے جن کو فقہاء نے طریق موجب قرار دیا ہے ایک شہادت علی الرویۃ ۔ دوسرے شہادت علی القضا۔ تیسرے استفاضہ۔ اب ہر ایک کا مفصل ذکر کیا جاتا ہے۔

شہادت علی الرویۃ

شہادت علی الرویۃ کی دو صورتیں ہیں۔

پہلی یہ ہے کہ صرف رمضان مبارک کے چاند کے لئے ایک مسلمان عاقل بالغ عادل یا مستور کا یہ کہدینا کافی ہے کہ میں نے اپنی آنکھ سے اس رمضان کا چاند فلاں دن دیکھا۔ اور عید الفطر و عید اضحیٰ اور باقی نو ماہ کے چاند کے لئے دو مسلمان عاقل بالغ عادل مردوں یا ایک مرد دو عورتوں کا قاضی کی مجلس یا مفتی

شہر کی مجلس میں یہ کہدینا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ ہم نے اس سال کے فلاں ماہ کا چاند فلاں دن کی شام کو دیکھا۔

علامہ ابوالبرکات نسفی کنز الدقائق میں فرماتے ہیں:

وقیل بعلة خبر عدل ولو قنا او انثی لرمضان وحرین او حر وحرتین للفطر و الافجمع عظیم لها والاضحی کالفطر۔ (کنز الدقائق مجتبائی ص ۶۱)

اور ہلال رمضان کے لئے ایک عادل کی خبر اگر چہ وہ غلام یا عورت ہو اور ہلال فطر کے لئے دو آزاد مردوں یا ایک مرد دو عورتوں کی گواہی بحالت ابر وغبار قبول کی جائے ورنہ ہر دو کے لئے بڑی جماعت درکار اور ہلال اضحیٰ کا حکم مثل ہلال فطر کے ہے۔

علامہ حلبی ملتقی الابحر میں فرماتے ہیں:

وقبل فی هلال رمضان خبر عدل ولو عبدا او انثی او محدودا فی قذف تاب ولا یشترط لفظ الشهادة وفی هلال الفطر وذی الحجه شهادة حرین او حر وحرتین بشرط العدالة ولفظ الشهادة۔ (مجمع الانہر ج ۱ ص ۲۳۵)

اور ہلال رمضان میں ایک عادل کی خبر مقبول ہے اگر چہ وہ غلام یا عورت یا تہمت میں حد لگا ہوا ہو اور توبہ کر چکا ہو اور اس میں لفظ شہادت بھی شرط نہیں۔ اور ہلال فطر وذی الحجہ میں دو آزاد مردوں یا ایک مرد دو عورتوں کی شہادت بشرط عدالت اور لفظ شہادت کے مقبول ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ان دو شخصوں نے خود تو چاند نہیں دیکھا ہے لیکن ان کے سامنے چاند کے دیکھنے والے دو شخصوں نے گواہی دی اور انہیں اپنی گواہی پر گواہ کیا۔ لہذا یہ دونوں گواہان فرع اگر اس طرح گواہی دیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں نے ماہ فلاں اور سال فلاں اور دن فلاں کی شام کو انتیس کا چاند دیکھا اور ہر ایک نے ہمیں اپنی اپنی گواہی پر گواہ کیا۔ تو حقیقۃً ان گواہان فرع نے گواہان اصل کی گواہی کی گواہی دی۔ نہ کہ خود رویت ہلال کی گواہی دی لیکن اس سے بھی ثبوت ہلال بطریق موجب ثابت ہوتا ہے۔

تنویر الابصار ودر مختار میں ہے:

الشهادة علی الشهادة هی مقبولة وان کثرت استحسانا فی کل حق علی الصحیح الا فی حد وقود بشرط تعذر حضور الاصل بموت اومرض او سفر واکتفی الثانی

واستحسنه غير واحد وفي القهستاني والسراجية وعليه الفتوى واقره المصنف او كون المرأة مخدرة لاتخالط الرجال وان خرجت لحاجة و حمام عند الشهادة عند القاضي قيد للكل وبشرط شهادة عدد نصاب ولو رجلا وامرأتين عن كل اصل ولو امرأة لا تغاير فرعي هذا وذلك وكيفيتها ان يقول الاصل مخاطبا للفرع ولو ابنه اشهد على شهادتي انى اشهد بكذا ويقول الفرع اشهدان فلانا اشهدني على شهادته بكذا وقال لي اشهد على شهادتي بذلك مختصرا۔ (ردالمحتار مصری ج۴ص۴۰۹)

صحیح مذہب میں استحسانا ہر حق میں شہادة علی الشہادة اگر چہ طبقات فروع میں بکثرت ہو جائے مقبول ہے۔ لیکن حد وقضا میں مقبول نہیں۔ اور شرط یہ ہے کہ گواہان اصل کا موت یا بیماری یا سفر کی وجہ سے حاضر ہو جانا متعذر ہو جائے۔ اور امام ابو یوسف نے ان کی غیر حاضری کے لئے اتنی بات کافی قرار دی کہ انہیں اپنے اہل میں رات کو پہنچنا متعذر ہو۔ اسی قول کو فقہاء نے اچھا جانا اور قہستانی اور سراجیہ میں ہے کہ اسی قول پر فتوی ہے اور مصنف نے بھی اسی کو قرار رکھا یا اصل کے حضور کو تعذر یوں ہے کہ ایسی پردہ نشین عورت ہے۔ جو مردوں سے مخالطت نہیں کرتی ہو اگر چہ حاجت وحمام کے لئے نکلتی ہو یہ تعذر قاضی کے سامنے بوقت ادائے شہادت ہو یہ قید سب اعذار کے لئے ہے۔ بشرط نصاب شہادت کے اگر چہ ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔ ہر اصل کی شہادت سے اگر وہ عورت ہو نہ غیر ہونا اس اصل وفرع کا اور اس کی فروع کا اور شہادت علی الشہادة کا طریقہ یہ ہے کہ اصل فرع سے مخاطب ہو کر کہے اگر چہ وہ اس کا بیٹا ہو کہ تو میری اس شہادت پر شاہد ہو کہ میں ایسی شہادت دیتا ہوں۔ اور فرع کہے کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ فلاں شخص نے مجھ کو اپنی اس شہادت پر شاہد بنایا اور اس نے مجھ سے کہا کہ تو میری اس شہادت پر شاہد ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

وينبغي ان يذكر الفرع اسم الشاهد الاصل واسم ابيه وجده حتى لوترك ذلك فالقاضي لايقبل شهادتهما كذا في الذخيرة۔ (عالمگیری مجیدی ج۳ص۲۳۴)

اور لائق ہے کہ فرع اصل گواہ کا نام اور اس کے باپ دادا کا نام ذکر کرے یہاں تک کہ اگر اس نے یہ ذکر نہ کیا تو قاضی ان ہر دو شاہدوں کی شہادت قبول نہ کرے۔

شہادت علی القضا

شہادت علی القضا کی بھی دوصورتیں ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ کسی اسلامی شہر میں قاضی شرع کے سامنے رویت ہلال کی گواہیاں گذریں اور قاضی نے رویت ہلال کا حکم دیا اور دار القضا میں قاضی کے حکم کے وقت دو عادل موجود تھے۔ انہوں نے دوسرے شہر میں قاضی کے سامنے اگر قاضی نہ ہو تو مفتی شہر کے سامنے حاضر ہو کر کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں ہمارے سامنے فلاں شہر کے فلاں حاکم کے سامنے فلاں دن کی شام کو فلاں چاند کے دیکھنے کی شہادتیں دیں۔ اور اس حاکم نے ان گواہیوں کی بناپر ثبوت ہلال کا حکم دیا۔ تو اس شہر کے قاضی یا مفتی ان شہادتوں کی بناپر اپنے اس شہر میں بھی ثبوت ہلال کا حکم کر سکتا ہے۔

مجمع الانہر میں ہے:

قالوا لو رأى اهل المغرب هلال رمضان يجب برويتهم على اهل المشرق اذا ثبت عندهم بطريق موجب كمالوشهد وا عند قاض لم يراهل بلده على ان قاضى بلد كذا شهد عنده شاهدان برؤية الهلال فى ليلة كذا وقضى القاضى بشهادتهما جاز لهذا القاضى ان يقضى بشهادتهما لان قضاء القاضى حجة وقد شهدا به۔

(مجمع الانہر مصری ج ۱ ص ۲۳۹)

فقہا نے فرمایا اگر اہل مغرب نے رمضان کا چاند دیکھا تو ان کی رویت پر اہل مشرق کو عمل واجب ہے جب کہ انہیں بطریق موجب ثابت ہو جائے جس طرح اس قاضی کے پاس جس کے شہر میں چاند نہیں دیکھا یہ شہادت گذری کہ فلاں شہر کے قاضی کے پاس دو گواہوں نے فلاں شب میں رویت ہلال کی شہادت دی اور اس قاضی نے ان کی شہادت پر حکم نافذ کیا تو اس قاضی کو بھی ان کی شہادت پر حکم دیدینا جائز ہے اس لئے کہ قاضی کا حکم حجت ہے اور انہوں نے اسکی گواہی دی۔

لہذا یہ شہادت حقیقۃ شہادت علی القضا ہوئی اس سے بھی ثبوت ہلال بطریق موجب ثابت ہوتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی اسلامی شہر کے قاضی شرع کے سامنے رویت ہلال کی شہادتیں گذریں اور اس نے ثبوت ہلال کا حکم دیا پھر اس قاضی نے اپنا نام و پتہ لکھ کر دوسرے شہر کے قاضی کے نام و پتہ کو لکھا اور یہ خط تحریر کیا کہ میرے سامنے فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں نے فلاں دن فلاں شام

کو فلاں ماہ کے چاند دیکھنے کی شہادتیں گذریں جن کی بنا پر میں نے ثبوت ہلال کا حکم دیا۔ اور یہ خط دو عادلوں کو سنا کر خط کو لفافہ میں بند کرے اور ان کے سامنے ہی سر بمہر کر دے اور انہیں اس خط پر گواہ بنا کر ان سے کہے کہ میرا یہ خط فلاں شہر کے قاضی کے نام ہے وہ ہر دو عادل اس سر بمہر خط کو باحتیاط اس قاضی کے پاس لائیں اور اسے مجلس قضا میں سر بمہر ہی دیں اور یہ شہادت ادا کریں کہ آپ کے نام فلاں قاضی کا خط ہے اس نے ہمیں اس خط کو سنایا اور اس پر ہمیں گواہ کیا۔ اور ہمارے سامنے اس کو لفافہ میں بند کیا اور سر بمہر کیا یہ خط اسی کا ہے اور اس کا یہ مضمون ہے ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔

درمختار میں ہے:

القاضی یکتب الی القاضی بحکمه وان لم یحکم کتب الشهادة لیحکم المکتوب الیه بها علی رایه وقرأ الکتاب علیهم بمافیه وختم عندهم وسلم الیهم بعد کتابة عنوانه وهو ان یکتب فیه اسمه واسم المکتوب الیه وشهرتهما واکتفی الثانی بان یشهدهم انه کتابه وعلیه الفتوی مختصرا۔ (ردالمحتار مصری ج ۴ ص ۳۶۶)

قاضی دوسرے قاضی کی طرف اپنا حکم لکھے اور اگر حکم نہیں دیا تھا تو شہادت لکھے تاکہ مکتوب الیہ قاضی اس گواہی پر اپنی رائے سے حکم کرے۔ اور کاتب قاضی ان گواہوں کے سامنے وہ مکتوب پڑھے یا انہیں اس کے مضمون سے مطلع کرے اور اپنی مہر لگائے اور اس پر سرنامہ یعنی اپنا نام اور مکتوم الیہ کا نام اور مشہور خطابات لکھنے کے بعد گواہوں کو سپرد کرے۔ اور امام ابو یوسف نے اس قدر کافی قرار دیا کہ وہ قاضی گواہوں کو اس پر شاہد بنائے کہ وہ اسی کا مکتوب ہے اور اس پر فتوی ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

یجب ان یعلم ان کتاب القاضی الی القاضی صار حجة شرعا فی المعاملات لکن انما یقبله القاضی المکتوب الیه عند وجود شرائطه ومن جملة الشرائط البینة۔

(فتاوی عالمگیری مجیدی کانپور ج ۳ ص ۱۷۲)

یہ جاننا واجب ہے کہ قاضی کا مکتوب دوسرے قاضی کی طرف معاملات میں شرعا حجت ہے لیکن مکتوب الیہ قاضی اس کو جب قبول کرے جب کہ اس کے تمام شرائط پائے جائیں اور اس کے منجملہ شرائط کے بینہ ہے۔

لہذا یہ شہادت حقیقۃ شہادت بر خط قاضی ہے تو اس سے بھی ثبوت ہلال بطریق موجب ثابت

ہوتا ہے۔

استفاضہ

استفاضہ کی بھی دوصورتیں ہیں۔

ایک صورت یہ ہے کہ کسی شہر سے جماعت کثیرہ آئے اور وہ لوگ سب باتفاق بیان کریں کہ فلاں شہر میں ہمارے سامنے عام طور پر لوگ بیان کرتے تھے کہ ہم نے اپنی آنکھ سے چاند دیکھا ہے۔

مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں ہے:

قال الحلوانی الصحیح من مذهب اصحابنا ان الخبر اذا استفاض فی بلدة اخری وتحقق یلزمهم حکم تلك البلدة۔ (مجمع الانہر مصری ج ا ص ۲۳۹)

حلوانی نے فرمایا ہمارے اصحاب کا صحیح مذہب یہ ہے کہ خبر جب دوسرے شہر میں حد استفاضہ تک پہنچ جائے اور متحقق ہو جائے تو ان اہل شہر پر بھی اس شہر کا حکم لازم ہے۔

درمختار میں ہے: نعم لو استفاض الخبر فی البلدة الاخری لزمهم علی الصحیح من المذهب مجتبی وغیره۔ (ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۷)

ہاں اگر دوسرے شہر میں خبر مستفیض ہو جائے تو بنا بر صحیح مذہب کے ان اہل شہر پر بھی حکم لازم ہے۔ یہی مجتبی وغیرہ میں ہے۔

یہی استفاضہ ہے کہ اس میں نہ خود اپنی رویت کی شہادت ہے۔ نہ شہادۃ علی الشہادۃ ہے۔ نہ شہادت علی قضاء القاضی ہے۔ نہ شہادت علی کتاب القاضی ہے۔ بلکہ اس میں جماعتوں کا تواتر جماعت کے تواتر سے رویت ہلال کا ناقل ہے تو رویت فی نفسہا حجت شرعیہ ہے۔ اور تواتر قائم مقام شہادت کے۔ بلکہ یہ شہادت سے قوی تر ہے تو رویت ہلال اس سے بہ یقین ثابت ہوگئی۔ لہذا خبر استفاضہ سے بھی رویت ہلال بطریق موجب ثابت ہو سکتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جس اسلامی شہر میں قاضی شرع ہو اور وہ خود عالم ہو یا کسی معتمد عالم دین کے فتوی کا ملازم ہو یا جہاں ایسا قاضی نہ ہو تو ایسا محقق مفتی دین ہو جس کے فتوے ہی پر احکام روزہ وعیدین نافذ ہوتے ہوں تو اس شہر سے متعدد جماعتیں آئیں اور وہ باتفاق ایک زبان یہ کہیں کہ فلاں شہر میں فلاں دن فلاں ماہ کی رویت ہوئی اور اسی کی بنا پر فلاں دن پہلا روزہ ہوا یا فلاں دن عید کی گئی۔

ردالمحتار میں ہے:

فی الذخیرۃ قال الشمس الائمۃ الحلوانی الصحیح من مذہب اصحابنا ان الخبر اذا استفاض و تحقق فیما بین اھل البلدۃ الاخری یلزمھم حکم ھذہ البلدۃ اہ ومثلہ فی الشرنبلالیۃ عن المغنی قلت ووجہ الاستدراک ان ھذہ الاستفاضۃ لیس فیھا شھادۃ علی قضاء قاض ولا علی شھادۃ لکن لما کانت بمنزلۃ الخبر المتواتر وقد ثبت بھا ان اھل تلک البلدۃ صاموا یوم کذا لزم العمل بھا لان البلدۃ لاتخلوعن حاکم شرعی عادۃ فلابد من ان یکون صومھم مبنیا علی حکم حاکمھم الشرعی فکانت تلک الاستفاضۃ بمعنی نقل الحکم المذکور وھی اقوی من الشھادۃ (وفیہ ایضا) قال الرحمتی معنی الاستفاضۃ ان تاتی من تلک البلدۃ جماعات متعددون کل منھم یخبر عن اھل تلک البلدۃ انھم صاموا عن رویۃ۔ (ردالمحتار مصری ج۲ص۹۷)

ذخیرہ میں ہے کہ شمس الائمہ حلوانی نے فرمایا کہ ہمارے اصحاب کا صحیح مذہب یہ ہے کہ خبر جب مستفیض ہوجائے اور متحقق ہو جائے کسی دوسرے اہل شہر میں تو ان پر اس شہر کا حکم لازم ہے اور یہی حکم شرنبلالی میں مغنی سے منقول ہے۔ میں نے کہا کہ استدراک کی وجہ یہ ہے کہ اس استفاضہ میں نہ تو قضا کے قاضی پر ثبوت ہے نہ شہادت علی الشہادت ہے۔ لیکن جب استفاضہ بمنزلہ خبر متواتر کے ہے تو اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ اس شہر کے لوگوں نے فلاں دن روزہ رکھا تو اس سے اس لئے عمل لازم ہوا کہ شہر حاکم شرع کے حکم پر مبنی ہوگا تو یہ استفاضہ حکم مذکور کے نقل کی مانند ہوگیا اور وہ شہادت سے زیادہ قوی ہے۔

رحمتی نے استفاضہ کے معنی یہ بیان کئے کہ اس شہر سے چند جماعتیں آئیں اور ان میں سے ہر ایک اس شہر والوں کی یہ خبر دے کہ ان لوگوں نے چاند دیکھ کر روزے رکھے۔

اس عبارت سے ثابت ہوگیا کہ خبر استفاضہ خبر متواتر کے حکم میں ہے جو یقین کا افادہ کرتی ہے کہ اس سے قضائے قاضی کا ثبوت بتواتر ثابت ہوتا ہے جو حجت شرعیہ ہے۔ لہذا استفاضہ سے بھی ثبوت ہلال بطریق موجب ثابت ہوتا ہے۔

بالجملہ طریق موجب کی یہ چھ صورتیں ہیں جن سے انتیس (۲۹) کا چاند دوسرے شہر کی رویت سے ثابت کیا جاسکتا ہے ان کے علاوہ جو طریقے عوام میں رائج ہیں یا سوالات جن پر مشتمل ہے ان کا تفصیلی بیان یہ ہے۔

شہادت فاسق

فاسق وہ شخص ہے جو کبیرہ گناہ کرتا ہو یا صغیرہ گناہ پر اصرار کرتا ہو۔

علامہ ابن عابدین ردالمحتار میں بحر سے ناقل ہیں:

الفاسق من فعل کبیرة او اصر علی صغیرة ۔ (ردالمحتار مصری ج۴ ص ۳۹۹)

فاسق وہ ہے جو کبیرہ گناہ کرے یا صغیرہ گناہ پر اصرار کرے۔

تو اگر وہ فاسق کہیں سے آکر انتیس کے رویت ہلال کی شہادت دیں کہ فلاں شہر میں فلاں وفلاں شخصوں نے چاند دیکھا اور انہوں نے ہمیں شاہد بنایا۔ یا ہمارے سامنے دار القضا میں شہادتیں گذریں اور قاضی شہر نے اس پر حکم دیا۔ یا خود یہ شہادتیں دیں کہ ہم نے فلاں دن انتیس کا چاند دیکھا ہے تو ان کی یہ سب شہادتیں غیر معتبر ہیں۔

ہدایہ میں ہے: و تشترط العدالة لان قول الفاسق فی الدیانات غیر مقبول۔

(ہدایہ اولین مطبوعہ یوسفی لکھنؤ ص ۱۹۷)

شہادت کے لئے عدالت شرط ہے کیونکہ فاسق کا قول دیانات میں مقبول نہیں۔

علامہ طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح میں فرماتے ہیں:

وفی الدرایة لایقبل خبر الفاسق اتفاقا وفی البحر قول الفاسق فی الدیانات التی یمکن تلقیها من العدول غیر مقبول کالهلال ورواية الاخبار ولو تعدد کفاسقین فاکثر۔

(طحطاوی مصری ۳۸۰)

درایہ میں ہے کہ فاسق کی خبر بالاتفاق مقبول نہیں۔ اور بحر الرائق میں ہے کہ فاسق کا قول ان دیانتوں میں جو عادلوں سے بھی معلوم ہو سکیں مقبول نہیں جیسے رویت ہلال اور روایت اخبار اگرچہ متعدد ہو جائیں جیسے دو فاسق ہوں بلکہ زیادہ۔

لہذا جب فاسق کی شہادت غیر مقبول ہے تو یہ طریق موجب میں داخل نہیں تو اس کی شہادت سے رویت ہلال ثابت نہیں ہو سکتا۔

شہادت مستور

مستور وہ شخص ہے جو مجہول الحال ہو کہ اس کی عدالت وفسق کا اظہار نہ ہوتا ہو۔

مراقی الفلاح میں ہے: هو مجهول الحال لم يظهر له فسق ولا عدالة ـ

(طحطاوی ص ۳۸۰)

مستور وہ مجہول الحال ہے جس کی عدالت وفسق ظاہر نہ ہو۔

تو مستور کی شہادت صرف رمضان مبارک کے چاند میں جب مطلع پر ابر وغبار ہو شرعا معتبر ہے۔

درمختار میں ہے: قيل للصوم مع علة كغيم وغبار خبر عدل او مستور على ماصححه البزازي على خلاف ظاهر الرواية لا فاسق اتفاقا۔ (ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۳)

ابر وغبار کے ساتھ روزہ کے لئے ایک عادل یا مستور کی خبر قبول کر لی جائے گی۔ بزازی نے ظاہر الروایت کے خلاف اس کی تصحیح کی فاسق کی خبر بالاتفاق مقبول نہیں۔

اور رمضان مبارک کے سوا اور باقی چاندوں میں مستور کی شہادت نامقبول وغیر معتبر ہے۔

درمختار وردالمحتار میں ہے: قوله وهلال الاضحى وبقية الاشهر التسعة كالفطر فلايقبل فيها الاشهادة رجلين او رجل وامرأتين عدول احرار غير محدودين كما في سائر الاحكام۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۹۸)

اضحیٰ اور بقیہ نو ماہ کا ہلال ہلالِ فطر کی طرح ہے کہ ان میں دو مرد یا ایک مرد دو عورتوں عادلوں آزاد غیر محدودوں کی شہادت ہی مقبول ہوگی۔ جیسا کہ تمام احکام میں ہے۔

صاحب درمختار شرح ملتقی میں فرماتے ہیں: وقبل في هلال الفطر وذي الحجة وبقية الاشهر التسعة شهادة حرين وحر وحرتين بشرط العدالة ولفظ الشهادة۔

(درالمنتقی مصری ج ۱ ص ۲۳۶)

عید الفطر اور ذی الحجہ اور بقیہ نو ماہ کے چاند میں دو آزاد مردوں یا ایک آزاد مرد دو عورتوں کی شہادت بشرط عدالت اور لفظ شہادت کے قبول کی جائے گی۔

ان عبارات سے رمضان کے عید الفطر وعید اضحیٰ وغیرہ تمام چاندوں کے لئے شاہدین کا عادل ہونا شرط ثابت ہوا تو ان میں مستور کی شہادت غیر معتبر قرار پائی اور طریق موجب نہیں ٹھہری لہذا اس کی شہادت سے عیدین وغیرہ کی رویت ہلال ثابت نہیں ہوسکتی۔

شہادت کافر ومرتد

مرتد وہ شخص ہے جو دین اسلام سے پھر جائے اور ایمان لانے کے بعد کوئی کلمہ کفر زبان پر جاری

کرے۔ درمختار میں ہے:

المرتد لغة الراجع مطلقا و شرعا الراجع عن دين الاسلام و ركنها اجراء كلمة الكفر على اللسان بعد الايمان۔ (ردالمحتار ج ۳ ص ۲۹۱)

لغت میں مرتد کے معنی مطلق رجوع کرنے والے کے ہیں اور شرع میں دین اسلام سے رجوع کرنے والے کے ہیں اور اس کا رکن ایمان کے بعد زبان پر کفری کلمہ جاری کرنا ہے۔

اور کافر و مرتد کی شہادت نامقبول وغیر معتبر ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

لاتقبل شهادة الكافر على المسلم واما شهادة المرتد والمرتدة فقد اختلف المشائخ فيها فقال بعضهم تقبل على الكفار وقال بعضهم تقبل على مرتد مثله والا صح انها لاتقبل على كل حال هكذا فى المحيط مختصراً۔

(عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۲۳۱)

مسلمان پر کافر کی شہادت مقبول نہیں۔ لیکن مرتد مرد یا عورت کی شہادت اس میں مشائخ نے اختلاف کیا۔ بعض نے کہا کہ کافر کی گواہی کفار پر مقبول ہے۔ اور بعض نے فرمایا اپنے جیسے مرتد پر مقبول ہے اور صحیح مذہب یہ ہے کہ وہ کسی حال میں مقبول نہیں اسی طرح محیط میں ہے۔

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ کافر و مرتد کی شہادت غیر مقبول ہے۔ تو اب مدعیان اسلام میں جو فرقے حد کفر تک پہونچ گئے اور علماء حرمین شریفین وشام وہند نے جن کے ارتداد پر فتوے دیدیئے ان کی شہادت بھی کسی طرح مقبول نہیں ہو سکتی جیسے غالی، رافضی۔ قادیانی۔ چکڑالوی وغیرہ۔

چنانچہ صاحب درمختار ملتقی میں فرماتے ہیں۔

كل من كفر منهم (اى من اهل الاهواء) كالمجسمة والخوارج وغلاة الروافض والقائلين بخلق القران ولاتقبل شهادتهم۔ درالمنتقی مصری ج ۲ ص ۲۰۰

اہل اہوا سے جو کافر ہو گیا جیسے فرقہ مجسمہ اور خارجی اور غالی رافضی۔ اور خلق قرآن کے قائل، ان کی شہادت مقبول نہیں۔

لہذا کافر و مرتد کی شہادت جب طریق موجب سے نہیں تو ان کی شہادت سے بھی رویت ہلال

ثابت نہیں ہوسکتا۔

شہادت نساء

فقط ایک عورت عادلہ کی شہادت رمضان مبارک کے چاند میں ابر وغبار کی حالت میں معتبر ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

ان کان بالسماء علة فشهادة الواحد علی هلال رمضان مقبولة اذا کان عدلا مسلما عاقلا بالغا حرا کان او عبدا ذکرا کان او انثی۔

(عالمگیری مجیدی ج ۱ ص ۱۰۱)

اگر آسمان پر ابر وغبار ہو تو رمضان کے چاند میں ایک کی شہادت مقبول ہے جب وہ مسلمان عاقل بالغ عادل ہو آزاد ہو غلام مرد ہو یا عورت۔

لیکن ہلال رمضان کے علاوہ اور چاندوں میں بلا مرد کے صرف عورتوں کی شہادت نامقبول وغیر معتبر ہے۔ ہدایہ میں ہے: ولا تقبل شهادة الاربع منهن وحدهن۔ (ہدایہ جلد ۳ ص ۱۳۹)

صرف چار عورتوں کی گواہی مقبول نہیں۔

درمختار میں ہے: ولا تقبل شهادة اربع بلا رجل ۔(ردالمحتار ج ۴ ص ۳۸۷)

بغیر مرد کے چار عورتوں کی شہادت مقبول نہیں۔

لہذا صرف ایک عورت کی شہادت سے ہلال رمضان تو ثابت ہوسکتا ہے اور عیدین کا اور باقی مہینوں کا چند صرف عورتوں کی شہادت سے ثابت نہیں ہوسکتا بلکہ اگر دو عورتیں ہوں تو ان کے ساتھ ایک مرد کا ہونا ضروری ہے۔

شہادت علی الشہادت

شاہدین فرع کو اگر شاہدین اصل نے اپنی گواہی پر گواہ نہیں بنایا ہے تو شاہدین فرع کی شہادت بھی غیر معتبر ہے۔ اگرچہ انہوں نے ان کی شہادت کو اپنے کان ہی سے سنا ہو۔

درمختار میں ہے: (قوله و کیفیتها ان یقول الاصل مخاطبه للفرع ولو ابنه بحر اشهد علی شهادتی انی اشهد بکذا) قید بقوله اشهد لانه بدونه لایسعه ان یشهد علی شهادته وان سمعها منه لانه کالنائب عنه فلا بد من التحمیل والتوکیل ۔

(ردالمحتار ج ۴ ص ۴۱۰)

شہادت علی الشہادۃ کا طریقہ یہ ہے کہ گواہان اصل گواہان فرع کو مخاطب بنا کر یہ کہیں اگرچہ وہ اس کا بیٹا ہو کہ تو میری شہادت پر شاہد بن کہ میں ایسی شہادت دیتا ہوں۔ تو شاہدین کی قید اس لئے ہے کہ بغیر اس کے شاہد فرع شاہد اصل کی شہادت پر شہادت نہیں دے سکتا اگرچہ اس نے اس شہادت کو اس سے سنا ہو کیونکہ یہ اس کے نائب کی طرح ہے تو تحمیل وتوکیل ضروری ہے۔

بلکہ شاہدین فرع کو ادا شہادت کے وقت شاہدین اصل کی شہادت کے ذکر کے ساتھ تحمیل کا ذکر ضروری ہے۔ عالمگیری میں ہے:

یقول شاهد الفرع عندالاداء اشهد ان فلانا قال لی اشهد علی شهادتی بذلك لانه لابد من شهادته و ذكره شهادة الاصل و ذكره التحميل۔ (عالمگیری ج ۳ ص ۲۳۴)

شاہد فرع ادائے شہادت کے وقت کہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ مجھ سے فلاں نے کہا کہ میری شہادت پر تو گواہ ہو اس لئے کہ اس کی شہادت اور اس کا شہادت کا ذکر کرنا اور تحمیل کا ذکر ضروری ہے۔

لہذا قاضی یا مفتی کے سامنے شاہدین فرع نے شاہدین اصل کی رویت ہلال کی شہادت کا صرف سننا بیان کیا اور یہ ذکر نہیں کیا کہ شاہدین اصل نے ہمیں اپنی شہادت پر گواہ بنایا اور ہم سے یہ کہا کہ تم میری گواہی پر گواہ ہو جاؤ تو ان شاہدین فرع کی نہ یہ شہادت معتبر نہ یہ طریق موجب میں داخل۔ لہذا ایسی شہادت علی الشہادت سے رویت ہلال ثابت نہیں ہو سکتی۔

شہادت علی القضا

کسی شہر سے دو شخصوں نے آ کر قاضی یا مفتی کے سامنے یہ کہا کہ فلاں شہر میں قاضی کے روبرو رویت ہلال کی گواہیاں گذریں اور اس قاضی نے ان کی شہادت پر رویت ہلال کا حکم دیا لیکن ہم اس وقت مجلس قضا میں موجود نہ تھے تو ان کی یہ شہادت بھی غیر معتبر اور نامقبول ہے۔

درمختار میں ہے: نعم الشهادة بقضاء القاضی صحيحة وان لم يشهدهما القاضی عليه وقيده ابو يوسف بمجلس القضاء وهو الاحوط ذكره فی الخلاصة۔

(ردالمحتار مصری ج ۴ ص ۳۹۰)

ہاں حکم قاضی کی شہادت صحیح ہے اگرچہ قاضی نے ان گواہان کو اس پر شاہد نہ بنایا ہو حضرت امام ابو یوسف نے ان گواہوں کے مجلس قضا میں موجود ہونے کی قید لگائی۔ یہی مفتی بہ قول ہے۔ اس کو خلاصہ میں

ذکر کیا۔

لہذا اگر ان شاہدوں نے رویت ہلال کی اس شہر کے قاضی یا مفتی کے سامنے ایسی شہادت علی القضا گذاری اور خود اپنا مجلس قضا میں نہ ہونا بھی بیان کیا تو ان شاہدوں کی یہ شہادت غیر معتبر ہے نہ یہ طریق موجب نہ ایسی شہادت علی القضا سے رویت ہلال ثابت ہوسکتی ہے۔

شہادت علی کتاب القاضی

اگر یہاں کے قاضی کی مجلس میں ایک اسلامی شہر کے قاضی کا خط لیکر دو شاہد آئے اور انہوں نے یہ کہا کہ ہمیں یہ خط فلاں شہر کے فلاں بن فلاں قاضی نے ہمارے مکان پر سپرد کیا۔ یا اپنی مجلس قضا میں نہیں سونپا۔ یا اس پر ہمارے سامنے مہر نہیں لگائی۔ یا اس کو ہمیں پڑھکر نہیں سنایا۔ یا اس قاضی نے بلا شہود کے یہ خط ڈاک وغیرہ کے ذریعہ روانہ کیا۔ یا ان شاہدوں کا عادل ہونا اس قاضی کو ظاہر نہ ہوسکا۔ تو نہ وہ خط قاضی معتبر نہ ان شاہدوں کی شہادت مقبول۔

ردالمحتار میں ہے: لاشهادة بلاعلم المشهود به (فيه ايضا) فى الذخيرة وانما قال عندهم لانه لابد ان يشهدوا عنده ان الختم بحضرتهم (فيه ايضا) قوله سلم الكتاب اليهم اى فى مجلس يصح حكمه فيه فلو سلم فى غير ذلك المجلس لم يصح (فيه ايضا) ان شهدوا انه كتاب فلان القاضى سلمه الينا فى مجلس حكمه وقرأه علينا وختمه ففتحه القاضى وقرأه اذا ثبتت عدالتهم بان كان يعرفهم بها اووجد فى الكتاب عدالتهم او سأل من يعرفهم من الثقات فزكوا واما قبل ظهور عدالتهم فلايحكم به۔

(ردالمحتار ج۴ ص ۳۶۶)

بغیر مشہود بہ کے جانے ہوئے شہادت کا دینا صحیح نہیں۔ ذخیرہ میں ہے کہ یہ بات ضروری ہے کہ وہ گواہان قاضی کے سامنے یہ گواہی دیں کہ مہر ان کی موجودگی میں لگائی گئی۔ اور قاضی ان گواہوں کو وہ خط ایسی مجلس میں سونپے جس میں حکم دینا صحیح ہو تو اگر اس نے غیر مجلس قضا میں سونپا تو صحیح نہیں۔ اور اگر گواہان نے شہادت دی کہ یہ خط فلاں قاضی کا ہے۔ اس نے ہمیں اپنی مجلس قضا میں اس کو سونپا۔ اور اس کو ہمیں پڑھ کر سنایا اور اس پر مہر لگائی تو یہ قاضی اس کو کھولے اور پڑھے جب ان گواہان کی عدالت ثابت ہو جائے بایں طور کہ یا تو ان کی عدالت کو خود جانتا ہو یا خط میں ان کی عدالت موجود ہو۔ یا جاننے والے ثقہ سے ان کو دریافت کرے تو وہ ان کا تزکیہ بیان کریں لیکن ان کی عدالت کے ظاہر ہونے سے پہلے پس اس خط پر

حکم نہ دے۔

ہدایہ اخیرین میں ہے: ولا یقبل الکتاب الا بشهادة رجلین او رجل وامرأتین لان الکتاب یشبه الکتاب فلایثبت الا بحجة تامة وهذا لانه ملزم فلابد من الحجة۔

(ہدایہ اخرین مطبوعہ رشیدیہ ج۳ ص۱۲۲)

خط دو مرد یا ایک مرد دو عورتوں ہی کی شہادت پر قبول کیا جائے گا کیونکہ خط خط کے مشابہ ہوتا ہے۔ تو بغیر دلیل تام کے ثابت نہیں ہوسکتا۔ اور یہ اس لئے کہ وہ خط لازم کرنے والا ہے تو حجت ضروری ہے۔

لہذا قاضی کے ایسے خط اور شاہدوں کی شہادت سے بھی رویت ہلال ثابت نہیں ہوسکتی کہ یہ طریق موجب نہیں۔

حکایت

کسی شہر سے چند لوگ آئے اور انہوں نے یہ کہا کہ فلاں شہر میں تو انتیس (۲۹) کا چاند فلاں ماہ کا فلاں دن دو شخصوں نے دیکھا ہے اور ہم نے یہ بھی سنا ہے۔ کہ قاضی شہر یا مفتی شہر نے لوگوں کو روزہ رکھنے کا حکم بھی دیا ہے۔ انہوں نے نہ خود چاند دیکھا نہ دیکھنے والوں نے ان کے سامنے گواہی دی۔ تو ان کی یہ خبر صرف حکایت ہوئی جو طریق موجب نہیں تو ایسی حکایت سے رویت ہلال ثابت نہیں ہوتی۔

ردالمحتار میں ہے: لوشهدوا برؤية غيرهم وان قاضی تلك المصر امر الناس بصوم رمضان لانه حكاية لفعل القاضی ايضا وليس حجة۔ (ردالمحتار مصری ج۲ ص۹۷)

اگر گواہان نے دوسرے لوگوں کی رویت کی گواہی دی۔ اور اس شہر کے قاضی نے لوگوں کو رمضان کے روزے کا حکم دیا تو یہ حجت نہیں اس لئے کہ یہ فعل قاضی کی حکایت ہے۔

مجمع الانہر میں ہے: لوشهد ان اهل بلدة كذا رأوا الهلال قبلكم بيوم وهذا يوم الثلثين فلم يرالهلال فی تلك الليلة والسماء مصحية فلايباح الفطر غدا ولايترك التراويح لان هذه الجماعة لم يشهد وابالرؤية ولا علی شهادة غيرهم وانما حكم رؤية غيرهم۔

(مجمع الانہر مصری ج۱ ص۲۳۹ عالمگیری مجیدی ج۱ ص۱۰۲)

اگر گواہان نے شہادت دی کہ فلاں شہر والوں نے تم سے ایک دن پہلے چاند دیکھا اور وہ دوشنبہ کا دن ہے اور اس رات میں چاند نہیں دیکھا گیا کہ آسمان ابر وغبار آلود۔ ہے تو کل کو روزہ نہ رکھنا مباح نہیں

اور تراویح ترک نہ کریں اس لئے کہ ان گواہوں نے نہ خود اپنی رویت کی شہادت دی نہ اپنے غیر کی شہادت کی بلکہ انہوں نے دوسروں کی حکایت کی۔

افواہ

شہر میں یہ خبر اڑی کہ انتیس کا چاند ہوگیا لیکن جس سے دریافت کیا جاتا ہے تو وہ یہی کہتا ہے کہ میں نے سنا ہے لوگوں میں ذکر ہورہا ہے اور دیکھنے والے کا پتہ نہیں چلتا نہ وہاں کوئی ایسا قاضی یا مفتی ہے جس کے پاس شہادت گذاریں۔ یا مفتی تو ہے لیکن عوام ایسے نااہل وخودسر ہیں جو اس کی طرف رجوع نہیں کرتے بلکہ یہ عوام جب چاہتے ہیں عید ٹھہرا لیتے ہیں اور محض افواہ کی بنا پر ہی نقارہ بجانے لگتے ہیں یا بندوقیں اور پٹاخے چھوڑنے شروع کردیتے ہیں تو ایسی افواہ سے اور ایسے نقارہ بجانے یا بندوقیں چھوڑنے سے رویت ہلال ثابت نہیں ہوتی۔

علامہ ابن عابدین شامی میں فرماتے ہیں:

مجرد الشيوع من غير علم بمن اشاعه كما قد تشيع اخبار يتحدث بهاسائر اهل البلدة ولايعلم من اشاعها كما ورد ان فى آخر الزمان يجلس الشيطان بين الجماعة فيتكلم بالكلمة فيتحدثون بها ويقولون لاندرى من قالها فمثل هذا لا ينبغى فضلا عن ان يثبت به حكم۔ (ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۷)

اشاعت کرنے والے کے بغیر جانے ہوئے کسی بات کا محض مشہور ہوجانا جیسے بعض خبریں ایسی شائع ہوجاتی ہیں جس کو تمام اہل شہر بیان کرتے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ انہیں کس نے شائع کیا جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا کہ آخر زمانہ میں شیطان لوگوں میں بیٹھے گا اور ایک بات کہے گا تو لوگ اس کو بیان کریں گے اور کہیں گے کہ ہم نہیں جانتے کہ اس کو کس نے کہا۔ تو ایسی خبر سننے کے لائق نہیں چہ جائیکہ اس سے کوئی حکم ثابت ہو۔

اور اگر ایسی افواہ کو سنکر کچھ لوگ دوسرے کسی شہر میں پہونچکر خبر دیں کہ فلاں شہر میں یہ شہرت تھی کہ انتیس کا چاند ہوگیا تو یہ ہرگز ہرگز استفاضہ نہیں کہلایا جاسکتا کہ ایسی افواہ اور بازاری خبر سے رویت ہلال ثابت نہیں ہوسکتی نہ یہ استفاضہ کہلایا جاسکتا ہے۔

ردالمحتار میں ہے:

ان اهل تلك البلدة رأوا الهلال وصاموا الانها لاتفيد اليقين فلذا لم تقبل الا اذا كانت

علی الحکم او علی شهادة غیرهم لتکون شهادة معتبرة والا فهی مجرد اخبار بخلاف الاستفاضة فانها تفید الیقین فلاینا فی ماقبله۔

(ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۷)

اس اہل شہر نے چاند دیکھکر روزہ رکھا تو یہ خبر یقین کا فائدہ نہ دیتی تو اس بنا پر قبول نہیں کی جائے گی ۔ ہاں جب وہ شہادت حکم یا غیر کی شہادت پر ہو تو معتبر شہادت ہوگی ورنہ وہ فقط خبر ہے بخلاف استفاضہ کے کہ وہ تو یقین کا فائدہ کرتا ہے تو ماقبل کا منافی نہ ہوا۔

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے

قوله لزم سائر الناس فی سائر اقطار الدنیا اذا ثبتت عندهم الرویة بطریق موجب کان یتحمل اثنان الشهادة او یشهدا علی حکم القاضی او یستفیض الخبر بخلاف ما اذا اخبران اهل بلدة کذا رأوه لانه حکایة ۔ (طحطاوی مصری ص ۳۸۲)

تمام لوگوں کو تمام اقطار دنیا میں لازم ہے جب ان کے پاس رویت کا ثبوت بطریق موجب پہنچ جائے جیسے دو شخص شہادت کے حامل بنیں یا دو شخص حکم قاضی پر شہادت دیں، یا خبر مستفیض ہو بخلاف جبکہ یہ خبر سنائی کہ فلاں شہر کے لوگوں نے چاند دیکھا ہے کہ یہ حکایت ہے۔

لہذا نہ ایسی افواہ طریق موجب نہ اس سے رویت ہلال ثابت ہو سکے۔

اخباری خبر

اخبار میں کسی ماہ کی انتیس کے اعتبار سے تاریخیں لکھدینا یا صاف طور پر یہی لکھنا کہ ہمارے شہر میں یا فلاں شہر میں فلاں ماہ کا چاند انتیس کا ہوا۔ تو اخباروں کی بے اعتباری اور گپوں سے قطع نظر بھی کرلی جائے۔ اور اس کو مطابق واقع کے صحیح بھی فرض کرلیا جائے تو اس کو زائد سے زائد خبر کا مرتبہ حاصل ہوا۔ جس کا غیر معتبر ہونا اوپر کی عبارات سے ثابت ہو چکا۔

ردالمحتار میں ہے: فانهم لم یشهدوا بالرویة ولا علی شهادة غیرهم وانما حکوا رویة غیرهم (وفیه ایضا) اذا اخبر ان اهل بلدة کذا رؤاه لانه حکایة۔

(ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۶ و ج ۲ ص ۹۹)

کہ گواہوں نے نہ تو خود اپنی رویت کی شہادت دی نہ غیر کی شہادت پر گواہی دی بلکہ انہوں نے اپنے غیر کی رویت کی حکایت کی۔ اور جب یہ خبر دی کہ فلاں شہر والوں نے چاند دیکھا تو یہ حکایت ہے۔

لہذا اخبار کی خبر نہ طریق موجب نہ اس سے رویت ہلال ثابت ہو سکے۔

خطوط ولفافے

اگر کسی شہر سے خط آیا اور اس میں انتیس کے رویت ہلال کی خبر ہو چاہے کاتب کی طرز عبارت کی شناخت کرتا ہو اور اس کے رسم الخط کو پہچانتا ہو۔ لیکن فقہاء کرام نے امور شرعیہ میں خط کا اعتبار نہیں کیا۔

ہدایہ میں ہے: الخط یشبہ الخط فلم یحصل العلم۔

(ہدایہ مطبوعہ رشیدیہ ج ۳ ص ۴۲)

خط خط کے مشابہ ہوتا ہے تو اس سے یقین حاصل نہیں ہوتا۔

الاشباہ والنظائر میں ہے: لا یعتمد علی الخط و لا یعمل بہ۔

(الاشباہ والنظائر مع شرح حموی کشوری ص ۳۰۵)

خط پر نہ اعتماد کیا جائے نہ اس پر عمل کیا جائے۔

درمختار میں ہے: لا یعمل بالخط۔ (ردالمحتار مصری ج ۴ ص ۳۶۷)

خط پر عمل نہ کیا جائے۔

مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں ہے: الخط یشبہ الخط۔ (مجمع الانہر مصری ج ۲ ص ۱۹۲)

خط خط کے مشابہ ہوتا ہے۔

ردالمحتار میں ہے: لا یقضی القاضی بذالك عند المنازعة لان الخط مایزور ویفتعل۔

(ردالمحتار مصری ج ۴ ص ۳۶۷)

قاضی بوقت منازعت خط پر فیصلہ نہ کرے اس لئے کہ خط ان میں سے ہے جو بنایا جا سکتا ہے اور گڑھا جا سکتا ہے۔ عینی شرح کنز میں ہے: ان الخط یشبہ الخط فلا یلزم حجة لانہ یحتمل التزویر۔

(عینی مصری ج ۲ ص ۸۰)

خط خط کے مشابہ ہو جاتا ہے تو حجت ملزمہ نہیں ہوا کیونکہ وہ تزویر کا احتمال رکھتا ہے۔

فتاوی قاضی خاں میں ہے: القاضی انما یقضی بالحجة والحجة ھی البینة او الاقرار اما صك لا یصلح حجة لان الخط یشبہ الخط۔

(قاضی خاں مصطفائی ج ۴ ص ۳۲۷)

قاضی تو حجت پر حکم دے اور حجت وہ بینہ یا اقرار ہے لیکن چک وہ حجت ہونے کے لائق نہیں اس

لئے کہ خط خط کے مشابہ ہوتا ہے۔

فتاوی خیریہ میں ہے: والخط لا یعتمد علیه و لا یعمل به ۔(خیریہ مصری ج ۲ ص ۱۹)

اور خط پر نہ اعتماد کیا جائے نہ اس پر عمل کیا جائے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: الکتاب قد یفتعل و یزور و الخط یشبه الخط و الخاتم یشبه الخاتم۔ (فتاوی عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۱۷۲)

خط کبھی بنالیا جاتا ہے اور گڑھ لیا جاتا ہے۔ اور خط خط کے مشابہ ہوجاتا ہے۔ اور مہر مہر کے مشابہ ہوجاتی ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ خط نہ قابل اعتبار نہ لائق عمل نہ اس پر حکم دینا جائز اس لئے کہ خط خط کے مشابہ ہوجاتا ہے اور بن سکتا ہے اور ایک خط کا رسم دوسرے سے ملایا جاسکتا ہے۔ لہذا جس چیز میں مشابہ بنجائے اور تزویر کی قابلیت ہو اس پر شرعی احکام کی بنا کس طرح رکھی جاسکتی ہے۔ ابھی شہادت علی کتاب القاضی میں ہدایہ سے عبارت منقول ہوئی کہ حاکم کا دستخطی خط جو اس نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہو اور اس پر حکومت کی مہر بھی لگی ہوئی ہو تو وہ بلا دو گواہوں کی شہادت کے مقبول نہیں۔ لہذا یہ ڈاک کے ذریعہ سے آئے ہوئے خطوط ولفافے کس طرح قابل اعتبار اور لائق عمل ہوسکتے ہیں تو ان خطوط لفافوں سے ہرگز ہرگز رویت ہلال ثابت نہیں ہوسکتی۔

ٹیلی گرام تار

جب خط کا غیر معتبر ہونا اور نا قابل عمل ہونا ثابت ہوچکا تو تار کا تو یہ حال زار ہے۔

(۱) تار دینے کے لئے معزز لوگ خود تار گھر نہیں جاتے ہیں بلکہ تار دینے کے لئے کسی شخص کو بھیجدیتے ہیں تو پہلا واسطہ تو یہ شخص ہوا۔

(۲) تار کے لئے فارم کی حاجت ہوتی ہے۔ اس میں مضمون انگریزی میں لکھا جاتا ہے تو اگر اس کو انگریزی نہیں آتی ہے تو کسی انگریزی داں کی ضرورت ہے تو یہ انگریزی کا لکھنے والا دوسرا واسطہ ہوا۔

(۳) اس فارم کو تار بابو کو دیا تو یہ تار بابو تیسرا واسطہ ہوا۔

(۴) تار بابو نے تار کے کھٹکوں سے جن کے اطوار مختلفہ کو انہوں نے اپنی اصطلاح میں علامت حروف قرار دے رکھا ہے اس سے اشاروں اشاروں میں عبارت بنائی اور وہ جدا ہوگیا۔

(۵) یہاں کے تار بابو نے ان کھٹکوں پر غور کر کے اپنی فہم کے موافق اسکی عبارت بنا کر ایک پرچہ پر انگریزی میں لکھدیا تو یہ چوتھا واسطہ ہوا۔

(۶) پھر وہ کاغذ کا پرچہ کسی ہرکارہ کو دیا گیا وہ اس کو پہنچا کر چلتا بنا یہ پانچواں واسطہ ہوا۔

(۷) پھر اگر یہ شخص انگریزی داں نہیں ہے تو ایک مترجم کی حاجت پیش آئی تو یہ چھٹا واسطہ ہوا۔

(۸) پھر ترجمہ کے لئے اکثر بڑے لوگ مترجم کے پاس کسی شخص کو بھجد یتے ہیں تو یہ شخص ساتواں واسطہ ہوا۔

تو جس کے مضمون پر مطلع ہونے کے لئے اس قدر واسطے ہوں جن کی عدالت تک کا علم نہ ہو بلکہ بعض کا تو نام تک معلوم نہیں ہوتا اور اگر اس سے بھی قطع نظر کر لیجئے تو ان میں بعض کے مسلمان ہونے کا بھی پتہ نہیں ہوتا کہ تار بابو اور ہرکارے کافر بھی ہوتے ہیں۔ غرض یہ سلسلہ سند کیا عجیب ہے کہ اس میں مجہول بھی ہیں نامقبول بھی ہیں نااہل بھی ہیں پھر اس کو بھی جانے دید یجئے تو تار میں بھیجنے والے کا جو نام لکھا ہے اس کا کیا ثبوت ہے کہ واقعی اس کا بھیجا ہوا ہے۔ پھر اگر اس سے بھی قطع نظر کیجائے تو خود تار کے دینے والوں اور لینے والوں اور پڑھنے والوں سے اکثر غلطیاں ہوتی ہی رہتی ہیں جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تو آخر اس تار کی کونسی بات قابل اعتبار اور لائق اعتماد ہے اور اگر فرض کر لیجئے کہ تار بالکل صحیح طور پر پہونچ گیا تو یہ تار زائد سے زائد خبر کا افادہ کرے گا نہ کہ شہادت واستفاضہ کا اور خبر کا غیر معتبر ہونا اوپر کی کثیر عبارات سے ثابت ہو چکا۔ لہذا تار کے ایسے احوال کو مد نظر رکھتے ہوئے اس پر احکام شرع کی بنا کس طرح ممکن ہوسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تار نہ ملزم ہے نہ طریق موجب تو اس سے رویت ہلال کس طرح ثابت ہوسکتی ہے۔

ٹیلی فون

ٹیلی فون میں اگر چہ تار کی سی قباحتیں جہالتیں اور مجہول وسائط تو نہیں لیکن اس پر بولنے والا مجہول ہے اگر چہ وہ اپنا نام وولدیت اور پتہ بھی بتا دے کہ اس کا شرعی طور پر کوئی ثبوت نہیں کہ واقعی یہ وہی شخص معروف ہے پھر اگر یہ کہا جائے کہ اس کی آواز سے اس کی صحیح معرفت ہو جاتی۔ تو شریعت مطہرہ نے اس چیز کو معتبر نہیں قرار دیا۔

ہدایہ میں ہے: ولو سمع من وراء الحجاب لایجوز له ان یشهد ولو فسر القاضی

لا يقبله لان النغمة تشبه النغمة فلم يحصل العلم ۔ (ہدایہ مطبوعہ رشیدیہ ج ۳ ص ۱۴۲)

اگر پردہ سے کوئی آواز سنی تو اس کی شہادت دینا جائز نہیں اگرچہ قاضی سے ظاہر کردے تو وہ اس لئے قبول نہ کرے کہ نغمہ نغمہ کی مشابہ ہوجاتا ہے تو اس سے یقین نہیں حاصل ہوتا۔

تو جب نغمہ نغمہ کے مشابہ ہوجاتا ہے تو اس میں تزویر کی گنجائش خود اس کی بے اعتباری کے لئے نہایت کافی دلیل ہے ملاحظہ ہو کہ فقہائے کرام تو یہ تصریح فرماتے ہیں۔ جس کو۔

فتاوی عالمگیری میں نقل کیا:

يجب ان يعلم ان كتاب القاضى الى القاضى صار حجة شرعا فى المعاملات على خلاف القياس لان الكتاب قد يفتعل ويزور والخط يشبه الخط والخاتم يشبه الخاتم ولكن جعلناه حجة بالاجماع ولكن انما يقبله القاضى المكتوب اليه عند وجود شرائط ومن جملة الشرائط البينة حتى ان القاضى المكتوب اليه لايقبل كتاب القاضى مالم يثبت بالبينة انه كتاب القاضى۔ (عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۱۷۲)

یہ جاننا واجب ہے کہ قاضی کا خط دوسرے قاضی کی طرف معاملات میں خلاف قیاس حجت شرعی ہے کہ خط بنایا اور گڑھا جاسکتا ہے اور خط خط کے مشابہ ہوجاتا ہے اور مہر مہر کے مشابہ ہوجاتی ہے لیکن ہم نے اس کو اجماع سے حجت قرار دیا۔ مگر اس کو مکتوب الیہ قاضی اس کے تمام شرائط کے پائے جانے پر قبول کرے اور منجملہ شرائط کے بینہ ہے یہاں تک کہ قاضی مکتوب الیہ خط قاضی کو اس وقت تک قبول نہ کرے جب تک بینہ سے یہ نہ ثابت ہوجائے کہ وہ خط قاضی ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ قاضی کا وہ خط جس کو اس نے خود لکھا اور اسپر اپنے دستخط کرکے حکومت کی مہر لگادی ہو وہ تزویر کے احتمال کی بنا پر مقبول نہ ہوا لیکن اس پر اعتبار کرنے کے لئے باوجود اجماع کے بھی شہادت کو لازم قرار دیا۔ اور ثبوت بینہ کی بنا پر حجت مانا تو یہ ٹیلی فون جس کا بولنے والا مجہول پھر نہ اس کا قول نامہ قاضی کی برابر حیثیت رکھے نہ اس کے ساتھ کوئی شہادت موجود نہ بولنے والے کے صدق ہی پر کوئی دلیل لہذا اس کی بات شرعا کس بنا پر مقبول و معتبر ہو۔ پھر اگر ان سب امور سے بھی قطع نظر کرلی جائے تو ٹیلی فون پر جو بات کہی گئی وہ کس طرح شہادت واستفاضہ تو ہو نہیں سکتی۔ بلکہ خبر ہے اور خبر کا غیر مقبول و نامعتبر ہونا پہلے بدلائل ثابت کردیا گیا۔ بالجملہ اس ٹیلی فون سے کسی طرح رویت ہلال ثابت نہیں ہوسکتی۔

ریڈیو

ریڈیو بھی ٹیلی فون کیطرح ہے اس میں ریڈیو اسٹیشن سے بولنے والا شخص مجہول ہی ہے اگر وہ اس میں اپنا نام و پتہ بھی بیان کردے تو اس کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ واقعی یہ تمہارا وہی جانا پہچانا ہوا شخص ہے بلکہ یہ ٹیلی فون سے بھی کمتر ہے کہ ٹیلی فون میں تو مزید معلومات کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا اور ریڈیو میں یہ اختیار بھی نہیں اب باقی رہا نغمہ کا امتیاز تو شریعت نے اس کا اعتبار نہیں کیا۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

ولو سمع من وراء الحجاب لا یسعه ان یشهد لاحتمال ان یکون خبره اذ النغمة تشبه النغمة۔ (عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۲۰۳)

اگر پردہ میں سے آواز سنی تو اسے شہادت دینے کا حق حاصل نہیں کہ احتمال ہے کہ وہ کسی دوسرے کی آواز ہو کیونکہ نغمہ نغمہ سے مشابہ ہوتا ہے۔

تو جب نغمہ نغمہ کے مشابہ ہوسکتا ہے تو نغمہ کا اپنی ذات میں قابل تزویر ہونا ہی اس کی بے اعتمادی کو نہایت کافی ہے تو اب شرعی طور پر کوئی ثبوت نہیں کہ یہ آواز فلاں معروف شخص کی ہے۔ فقہاء کا کلام ابھی گذرا کہ قاضی کا مہری دستخطی خط اسی احتمال تزویر کی بنا پر بلا شہادت کے غیر معتبر تو نغمہ کے احتمال تزویر کی بنا پر ریڈیو کی خبر کس طرح معتبر و مقبول ہوسکتی ہے۔ پھر بالفرض اگر ریڈیو پر بولنے والا شخص متعین بھی ہوجائے تو اس کی عدالت پر کونسی دلیل قائم ہے اور اس کو بھی جانے دیجئے تو ایک شخص کی خبر ہے اور خبر کا غیر معتبر ہونا ثابت کردیا گیا لہذا ریڈیو سے رویت ہلال کا شرعی حکم جس کے لئے طریق موجب کا ہونا ضروری کس طرح ثابت ہوسکتا ہے۔

اب رہا بعض مفتیوں کا ریڈیو کا اثبات رویت ہلال میں توپ اور روشنی اور ڈھنڈورہ پر قیاس کرنا اور اس میں کچھ شرائط و قیود کا لگا دینا اور اس کی صرف آواز کو ثبوت رویت ہلال کے لئے کافی قرار دیدینا اور اس کے اعلان پر مسلمانوں کو عمل کرنے کی رغبت دینا یہ میری نظر میں صحیح نہیں ہے۔

اولا۔ ریڈیو حقیقۃ خبر رسانی کا آلہ ہے۔ جس طرح ٹیلیفون خبر رسانی کا ایک آلہ تھا۔ کسی مفتی اہلسنت اور کسی مفتی دیوبند و سہارنپور وغیرہ نے اس کی شہادت کو معتبر قرار دیا نہ اس کی خبر کو معتمد ٹھہرایا۔ نہ اس کو توپ اور روشنی اور ڈھنڈورہ پر قیاس کیا۔ نہ اس کی خبر کو ثبوت رویت ہلال میں کافی مانا۔ نہ اسکی آواز پر مسلمانوں کو عمل کرنے کا حکم دیا۔ باوجودیکہ جو شرائط و قیود آج ریڈیو کے لئے تحریر کئے جارہے ہیں یا

آئندہ کئے جائیں گے وہ ٹیلیفون کے لئے بھی کئے جاسکتے ہیں۔ تو اگر یہی شرائط وقیود ریڈیو کی خبر کو معتبر بنادیتے ہیں۔ تو ٹیلیفون کی خبر کو بھی معتبر بنادیں گے تو جب ریڈیو کی خبر کو ثبوت رویت ہلال میں قابل اعتبار قرار دیا تو ٹیلیفون کی خبر کو بھی رویت ہلال میں معتبر ماننا پڑیگا۔ اور اپنے پہلے سارے فتاوے کو غلط کہنا پڑے گا۔

ثانیاً۔ ٹیلیفون کی خبر ریڈیو کی خبر سے زیادہ معتبر ومعتمد ہونی چاہئے کہ ٹیلیفون کی خبر کو دوبارہ سہ بارہ دریافت کیا جاسکتا ہے۔ اس کے ہر اشتباہ کو دور کیا جاسکتا ہے۔ خبر دینے والے کا نام وپتہ معلوم ہوسکتا ہے۔ اس کی پوری طور پر معرفت کیجاسکتی ہے۔ اور ریڈیو کی خبر کا دوبارہ دریافت کرنا نہایت مشکل اس کے اشتباہ کا دور ہونا بہت دشوار اور اس نشر کرنے والے کا نہ نام وپتہ معلوم ہوسکتا ہے نہ اس کی کماحقہ معرفت کیجاسکے۔ علاوہ بریں ریڈیو کے اسٹیشن چند ہیں اس کی خبر صرف انہیں چند مقاموں سے نشر کیا جاسکتا ہے اور ٹیلیفون کے لئے نہ کسی اسٹیشن کی قید نہ کسی شہر کی پابندی۔ تو ٹیلیفون سے رویت ہلال کی خبر قصبات بلکہ بعض بڑے دیہات سے بھی دیجاسکتی ہے۔ لہذا یہ خصوصیت اعتماد واعتبار ٹیلیفون ہی کو دیا جاتا نہ کہ ریڈیو کو جو بہ نسبت اس کے چند نا قابل اعتبار امور پر مشتمل ہے۔ مگر حیرت یہ ہے کہ فتوی برعکس ہے۔

ثالثاً۔ ریڈیو پر رویت ہلال کی خبر نشر کرنے والا ہندوستان بھر کے لئے اگر صرف ایک ہی عالم مقرر کیا جائے تو وہ سب اہل ہند کا معتمد نہیں ہوسکتا کہ ہندوستان میں مذہبی اختلاف ہے اور یہ عالم آخر کسی ایک فرقہ کا ہوگا تو دوسرے اس کو کس طرح معتمد مان سکتے ہیں لہذا سارے ہندوستان کے لئے ایسا عالم جو معتمد مقتدا ہو متبع احکام ومرجع انام ہو مقرر نہیں کیا جاسکتا۔

رابعاً۔ اگر ہر عالم کو شہادت گذرنے کے بعد ریڈیو پر خبر شہادت نشر کرنے کا حق دیا جاتا ہے تو یہ بہت کثیر غلطیوں کا سبب ہوگا بطور نمونہ ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے کہ سنبھل میں ایک سال رمضان شریف میں تیسویں شب میں بعد عشا صبح کو عید کا اعلان سنایا جب وہ معلن میرے مکان کے سامنے اعلان کرتے ہوئے آئے میں نے دریافت کیا کہ آپ کا اعلان کس بنا پر ہورہا ہے یہاں تو رویت ہلال نہیں ہوئی تو کیا کوئی شہادت گذری ہے انہوں نے کہا کہ فلاں مشہور مولوی صاحب کے پاس باقاعدہ شہادتیں گذری ہیں اور انہوں نے ہمیں اعلان کرنے کے لئے مقرر کیا ہے میں نے فوراً ایک عالم صاحب کو ان مولوی صاحب کے پاس بھیجا اور دریافت کیا کہ کن کن شاہدوں نے شہادت دی ہے انہوں نے ان

کے نام اور پتے بتائے میں نے ان شاہدوں کو بلایا تو وہ ہر دو معلن فساق تھے۔ میں نے یہ صریح غلطی دیکھکر ان مولوی صاحب کے پاس یہ اطلاع بھیجی کہ آپنے معلن فاسقوں کی شہادت کا اعتبار کر کے کس لئے اعلان عید کا حکم دیا انہوں نے بے تکلف جواب دیا کہ شاہدان عدول کا لحاظ پہلے زمانہ میں تھا۔ اب فسق وفجور کا زمانہ ہے جب عادل نہیں ملتا تو فاسق کی شہادت ہی کو معتبر مانا جائے گا۔ تو جب ریڈیو پر خبر شہادت نشر کرنے کے لئے ہر نام نہاد عالم کو حق دیدیا گیا تو اسی طرح کی بہت سی غلطیاں ہوں گی۔ اور دین کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور ان غلطیوں کا کون ذمہ دار ہوگا۔ نیز وہ عالم پھر کسی فرقہ خاص کا ہوگا۔ اس کی خبر پر دوسرے فرقے کس طرح عمل کریں گے۔ تو جب ہر عالم کے متعلق نا قابل اعتبار اور غیر معتمد ہونے کے احتمالات موجود ہیں تو اس ریڈیو پر کسی عالم کے نشر کرنے کا کیا فائدہ ہے۔

خامسا۔ اس کی کونسی ذمہ داری ہے کہ ریڈیو پر نشر کرنے والا عالم محقق و معتمد متبع احکام ہی ہوگا جب رات دن یہ دیکھا جا رہا ہے کہ ریڈیو کے محکمہ میں ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں اور اکثر وہ ہیں جو مذہب سے ناواقف ہیں تو یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ نشر کرنے والا وہی محقق عالم ہے اور اگر انہیں نہ تسلیم کیا جائے تو ہمارے پاس اس وقت اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ یہی عالم دین ہیں۔

سادسا۔ جب ایک شہر کے قاضی پر دوسرے شہر کے قاضی کی قضا کا ماننا ضروری نہیں تو ایک عالم کی خبر شہادت پر تمام شہروں کے مسلمانوں کو عمل کرنا کس دلیل سے ضروری ہے۔

سابعا۔ ریڈیو پر انتہائی احتیاط یہ کیجا سکتی ہے کہ اس پر خود وہ عالم معتمد خبر شہادت کو نشر کرے تو اس شہر اور اس کے مضافات کے سوا اور شہروں کے لئے اسی عالم کا ریڈیو پر نشر کرنا کیونکر قابل قبول ہوگا کہ فتح القدیر میں ہے کہ ایک شہر کا قاضی کسی دوسرے شہر میں خود ہی جا کر یہ زبانی بیان دے کہ میرے سامنے دو گواہیاں گذریں تو اس کا خود زبانی بیان مقبول معتبر نہیں جس کی عبارت ٹیلیویزن کے ذکر میں منقول ہے۔

ثامنا۔ ریڈیو کی شہادت کے لئے جو شرائط مقرر کئے گئے ہیں ان کی پابندی کی کیا ذمہ داری ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ ابتدا میں تو ان شرائط کا کچھ لحاظ کر لیا جائے گا پھر بے احتیاطیاں ہوتے ہوتے یہ شرائط ختم ہو جائیں گے جیسا کہ پہلے مفتیان دیوبند نے تار کو توپ پر قیاس کر کے اس میں کچھ شرائط کی تقیید کی تھی اور تار کو ثبوت ہلال کے لئے معتبر مان لیا تھا لیکن ان شرائط کا لحاظ نہ کیا گیا تو پھر انہیں اپنے فتوے سے رجوع کرنا پڑا اور تار کو غیر معتبر قرار دینا پڑا ایہی نتیجہ اس ریڈیو کا ہوگا کہ ان مفتیوں کو اپنے فتوے سے رجوع کرنا پڑیگا اور ریڈیو کی شہادت کو غیر معتبر کہنا پڑے گا۔

تاسعا۔ کچہریوں میں جب تار ٹیلیفون ریڈیو وغیرہ کل خبر شہادت دوسرے شہروں سے معتبر نہیں مانی جاتی اور اس پر اعتماد کر کے کسی مقدمہ کی ڈگری نہیں کیجاتی تو دینیات میں اس کی ایسی کیا حاجت پیش آئی ہے کہ اس کو معتبر ہی مانا جائے۔

عاشرا۔ جب حدیث شریف میں ہمارے لئے صاف طور پر فرمادیا گیا ہے۔

فان غم علیکم فاکملوا العدة ثلثین۔

تو جب انتیس کو رویت ہلال بطریق موجب ثابت نہ ہوگی تو ہم مہینہ کے تیس دن کامل کرلیں گے اب ان آلات جدید سے متاثر ہوکر ہم اپنے لئے محض اپنی رائے سے کیوں فرائض کی ذمہ داری کو خطرہ میں ڈالیں۔ تو یہ مفتیان خوش فہم ان امور پر کافی غور کرلیں پھر اپنے لئے کوئی راہ تجویز کریں۔

وائرلیس

وائرلیس میں اگر ہوا کی لہروں پر حروف بنا کر عبارت بنا دیجاتی ہے تو یہ تار سے مشابہت رکھتا ہے اور اگر اس میں بے تکلف کلام کیا جاتا ہے تو یہ ٹیلی فون سے مشابہت رکھتا ہے بہر صورت اس کا خبر دینے والا بھی مجہول شخص ہوا اگر چہ وہ اپنا نام و پتہ پورا بتا دے کہ اسکے تعین پر کوئی ثبوت شرعی نہیں اور اس کی عدالت پر کوئی دلیل شرعی قائم نہیں اسی طرح آواز کا پہچاننا یہ بھی کوئی حجت نہیں کہ نغمہ نغمہ کے مشابہ ہوجاتا ہے۔ پھر اس وائرلیس سے جو اطلاع دیجائے گی وہ خبر ہوگی اور خبر نا قابل اعتبار ہونا ثابت ہوچکا فقہاء کرام تو یہ تصریح فرماتے ہیں کہ دوسرے شہر سے خبر شہادت دینا صرف اس قاضی شرع کیساتھ خاص ہے جس کو سلطان اسلام نے مقدمات کے فیصلہ کے لئے مقرر کیا ہو یہاں تک کہ حَکَم کا خط معتبر و مقبول نہیں۔

درمختار میں ہے: القاضی یکتب الی القاضی وھو نقل الشھادة حقیقة ولا یقبل من حکم بل من قاضی مولی من قبل الامام مختصراً۔ ملخصا۔

(ردالمحتار مصری ج ۴ ص ۳۶۵ و ۳۷۰)

قاضی قاضی کی طرف خط لکھے کہ یہ حقیقۃً شہادت کا نقل کرنا ہے اور حَکَم کا خط قبول نہ کیا جائے گا بلکہ اس قاضی کا جو امام کی طرف سے مقرر کیا ہوا ہو۔

فتح القدیر میں ہے: ھذا النقل بمنزلة القضاء ولھذا لا یصلح الا من القاضی۔

(فتح القدیر مصری ج ۵ ص ۴۸۴)

خط کا بھیجنا گویا قضا کا نقل کرنا ہے اسی لئے قاضی ہی اس کے لائق ہے۔

تو اب رویت ہلال کی خبر شہادت دینے کا اگر حق حاصل ہے تو صرف قاضی کو ہے۔ پھر ہر کس وناکس کا تار ٹیلیفون۔ ریڈیو، وائرلیس سے رویت ہلال کی خبر شہادت دینے کا کیا حق حاصل ہے۔

بالجملہ اس وائرلیس سے بھی رویت ہلال ثابت نہیں ہوسکتی کہ یہ طریق موجب نہیں۔

لاؤڈ اسپیکر

لاؤڈ اسپیکر پر بولنے والا بھی اگر سامنے نہ ہو تو مجہول شخص ہے اس کے تعین کے لئے ثبوت شرعی درکار ہے۔ اب رہی آواز کی معرفت تو اس کا حکم اوپر گذرا کہ نغمہ نغمہ کے مشابہ ہوتا ہے لہذا اس کا قابل تزویر ہونا خود اسکے غیر معتبر ہونے کے لئے کافی ہے۔ بالجملہ اس سے بھی دوسرے شہر میں رویت ہلال ثابت نہیں ہوسکتی۔

ہاں اگر لاؤڈ اسپیکر سے قاضی شرع یا مفتی شہر انتیس کی شام کو رویت ہلال کے شرعی ثبوت کے بعد اپنے اہل شہر کے لئے یا حوالی شہر کے دیہات کیواسطے اعلان کرتا ہے تو لاؤڈ اسپیکر کے اعلان سے رویت ہلال کی اشاعت کی جاسکتی ہے جیسے سرکاری طور پر توپ یا ڈھنڈورے یا منادی سے اعلان کیا جاتا ہے جو اہل شہر اور دیہات کے لئے قابل اعتبار اور لائق عمل ہوتا ہے۔

ردالمحتار میں فرمایا:

قلت والظاهر انه يلزم اهل القرى الصوم بسماع المدافع اورؤية القناديل من المصر لانه علامة ظاهرة تفيد غلبة الظن وغلبة الظن حجة موجبة للعمل كمامر جوابه واحتمال كون ذلك لغير رمضان بعيد اذلا يفعل مثل ذلك عادة في ليلة الشك الالثبوت رمضان۔

(ردالمحتار ج ۲ ص ۹۴)

میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہ ہے کہ شہر کی روشنی دیکھ کر یا توپ کی آواز سنکر گاؤں پر روزہ لازم ہو اس لئے کہ یہ وہ ظاہر علامت ہے جو غلبہ ظن کا فائدہ کرتی ہے۔ اور غلبہ ظن عمل کے لئے حجت موجبہ ہے جیسا کہ فقہاء نے اس کی تصریح کی۔ اور اس کا غیر رمضان کے لئے ہونا بعید احتمال ہے کہ ایسی عادت شک کی شب ہی میں ثبوت رمضان کے لئے جاری ہے۔

تو اس صورت میں لاؤڈ اسپیکر سے رویت ہلال ثابت نہیں کیجارہی ہے۔ بلکہ صرف اپنے اہل

شہر و دیہات کو رویت ہلال کے ثبوت گذر جانے پر حکم حاکم کا اعلان کیا جا رہا ہے۔

ٹیلیویزن

ٹیلیویزن یہ وہ جدید آلہ ہے جو غالبا ابھی تک ہندوستان کی سرزمین میں نہیں آیا ہے۔ اخبار وغیرہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بولنے والے کی تصویر بھی سامنے موجود ہو جاتی ہے۔ مگر مغربی تعلیم کے فدائیوں نے صرف اتنا سنکر شور مچانا شروع کر دیا ہے کہ وائرلیس۔ ریڈیو ٹیلیفون وغیرہ میں بولنے والا مجہول قرار دیا گیا تھا اس میں تو اب تصویر سامنے آجاتی ہے تو کیا اشتباہ باقی رہتا ہے۔ اب اس کی خبر کس بنا پر غیر معتبر و نا مقبول ہوگی۔ اس سے رویت ہلال کیوں نہ ثابت ہوگی لہذا ان نادانوں سے کہو کہ ہماری شریعت بحمدہ تعالیٰ نہایت مکمل ہے ہمیں نہ فقط ان جدید آلات بلکہ جو ابھی آئندہ تا قیامت ایجاد ہونے والے ہیں ان کے اگر صراحۃ نہیں تو تلویحاً یا تفریعاً یا تاصیلاً احکام موجود ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ عقل وفہم عطا فرمائے اقول یہ کہنا کہ وہ خبر دینے والا اس کے ذریعہ سے مجہول نہیں ہوتا یہ غلط اور باطل دعویٰ ہے۔ یہ ہم نے تسلیم کرلیا کہ بولنے والے کی تصویر سامنے موجود ہوگئی تو محض تصویر کا سامنے آجانا کیا اس کی عدالت ثابت ہونے کے لئے کافی دلیل ہے۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اس میں تو صرف تصویر ہی سامنے آئی ہے اور قاضی کے سامنے تو بوقت شہادت بذاتہ صاحب تصویر ایک نہیں بلکہ دو مرد موجود ہوتے ہیں جو مستور یعنی مجہول الحال ہوں تو ان کی شہادت غیر مقبول و نا معتبر ہے۔ جیسا کہ مستور کے بیان میں مذکور ہوا۔ بلکہ قاضی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اگر گواہوں کی عدالت کو وہ نہیں جانتا ہے تو ان گواہوں کی شہادت گذر جانے پر ان کے حال عدالت کی تحقیق ہو جانے کے بعد حکم دے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: لابد ان یسأل القاضی عن الشھود فی السر والعلانیۃ۔

(عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۲۳۶)

قاضی کا گواہوں کے متعلق پوشیدگی اور علانیہ طور پر سوال کرنا ضروری ہے۔

اسی عالمگیری میں ہے: ثم القاضی ان شاء یجمع بین تزکیۃ العلانیۃ وبین تزکیۃ السر وان شاء اکتفی بتزکیۃ السر وفی زماننا ترکوا تزکیۃ العلانیۃ واکتفوا بتزکیۃ السر۔

(عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۲۳۷)

پھر قاضی اگر چاہے تو تزکیہ علانیہ اور تزکیہ پوشیدہ دونوں کو جمع کرے اور اگر چاہے تو پوشیدہ تزکیہ

ہی پر اکتفا کرے اور ہمارے زمانہ میں تو تزکیہ علانیہ کو ترک کریں اور پوشیدہ تزکیہ پر اکتفا کریں۔

تو جب شاہدوں کا قاضی کے سامنے صرف موجود ہو جانا بلا تحقیق عدالت کے شہادت کے معتبر ہونے کے لئے کافی نہیں۔ تو ٹیلیویزن میں اس کی صرف تصویر کا سامنے آ جانا ہی کیا ذی صورت کا عادل ہونا ثابت کر دیگا۔ ہر گز نہیں۔ فقہاء کرام تو یہ تصریح فرماتے ہیں۔

جس کو فتاوی عالمگیری نے فتاوی قاضی خان اور محیط سے نقل کیا:

رجل غريب شهد عند القاضي فان القاضي يقول له من معارفك فان سماهم وهم يصلحون للمسألة منهم سأل منهم في السر فان عدلوا سأل عنهم في العلانية فان عدلوه قبل تعديلهم اذا كان القاضي يريد ان يجمع بين تزكية السر والعلانية وان يصلحوا توقف فيه ونسأل عن المعدل الذي في بلدته ان كان في ولاية هذا القاضي وان لم يكن كتب الى قاضي ولايته يتعرف عن حاله۔ (عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۲۳۷)

ایک مسافر شخص ہے جس نے قاضی کے پاس شہادت دی تو قاضی اس سے کہے تیرے پہچاننے والے کون ہیں اگر وہ ان کے نام بتائے اور وہ سوال کے قابل ہوں تو ان سے پوشیدگی میں سوال کرے تو اگر وہ ان کی تعدیل کریں تو قاضی ان سے علانیہ طور پر سوال کرے اگر وہ اس کی تعدیل کریں تو ان کی تعدیل قبول کر لیجائے جب قاضی پوشیدہ تزکیہ اور علانیہ تزکیہ کے جمع کرنے کا ارادہ رکھے۔ اور اگر وہ اس قابل نہ ہوں تو قاضی اس میں توقف کرے اور اس کے شہر کے تعدیل کرنے والے سے سوال کرے اگر وہ اس قاضی کی ولایت میں ہو اور اگر اس کی ولایت میں نہ ہو تو اس ولایت کے قاضی کی طرف لکھے اور اس کے حال کی معرفت حاصل کرے۔

لہذا جب مسافر کو خود قاضی کے سامنے موجود ہو کر شہادت دینا اس کی عدالت کے لئے کفایت نہیں کرتا بلکہ اس کے جاننے والے اگر اس قاضی کی حدود میں ہیں تو ان سے اس کی عدالت کی تحقیق کرے، ورنہ اس کی ولایت کے قاضی سے یہ قاضی اس کی عدالت کی تحقیق کرے بعد ثبوت عدالت کے اس کی شہادت پر حکم صادر کرے تو ٹیلیویزن میں محض تصویر کا آ جانا اس کی نہ عدالت ثابت کرتا ہے نہ اسکے مجہول ہونے کو باطل کرتا ہے۔ پھر اگر کوئی یہ کہے کہ ٹیلیویزن پر جو شخص بول رہا ہے وہ عادل ہے اس کی عدالت کو ہم خوب جانتے ہیں قاضی شہر کو بھی اس کی عدالت کا علم ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تم اس کو خوب جانتے پہچانتے تھے اور قاضی بھی جانتا تھا۔ لیکن آج وہ ٹیلیویزن پر بول رہا

ہے اس وقت اس کا کیا حال ہے آیا وہ اپنے پہلے ہی حال پر باقی ہے یا نہیں۔ اگر وہ اپنی پہلی ہی حالت عدالت پر باقی ہے تو اس کی شہادت معتبر اور اس کے مزکی بن سکتے ہیں۔ اور اگر وہ اپنی پہلی حالت عدالت پر باقی نہیں رہا یا چھ ماہ یا اس سے زائد کی مدت گذر چکی ہے تو پھر اس کی عدالت کی تحقیق جدید کی جائے گی۔

عالمگیری میں ہے: لو ثبت عدالة الشهود عند القاضي وقضى بشهادتهم ثم شهدوا عند القاضي في حادثة اخرى اذا كان العهد قريب لايشتغل بتعديلهم وان كان بعيدا يشتغل به واختلفوا في الحدالفاصل بينهما والصحيح فيه قولان احدهما انه مقدر بستة اشهر والثاني انه مفوض الى رأى القاضي كذا في محيط السرخسي۔

(عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۲۳۸)

اگر قاضی کے نزدیک گواہوں کی عدالت ثابت ہے تو ان کی شہادت پر حکم دے۔ پھر اسی قاضی کے سامنے انہوں نے کسی دوسرے واقعہ میں شہادت دی اور زمانہ قریب کا ہو تو ان کی تعدیل میں مشغول نہ ہو اور اگر زمانہ بعید کا گذرا تو مشغول ہو اور فقہاء نے حد فاصل میں اختلاف کیا ہے اس میں صحیح دو قول ہیں ایک تو یہ ہے کہ وہ چھ ماہ کی مقدار ہے دوسرا قول یہ ہے کہ وہ قاضی کی رائے پر موقوف ہے۔ اسی طرح محیط سرخسی میں ہے۔

تو اگر اسکی عدالت کی معرفت بھی ہو اب عرصہ بعید وہ اپنی اسی عدالت پر باقی ہے اس پر کونسی دلیل شرعی قائم ہے پھر یہ گفتگو تو اس بنا پر ہو سکتی ہے جب ٹیلیویزن کے قول کو شہادت فرض کیا جائے اور حقیقت یہ کہ اسکا قول شہادت نہیں ہے بلکہ خبر ہے اور جب خبر ہے تو وہ حجت شرعی نہیں کہ فقہا کرام تو یہ تصریح فرماتے ہیں۔

فتح القدیر میں ہے: الفرق بين رسول القاضي وبين كتابه حيث يقبل كتابه ولا يقبل رسوله فلان غاية رسوله ان يكون كنفسه وقدمنا انه لو ذكر مافي كتابه لذلك القاضي بنفسه لايقبل وكان القياس في كتابه كذلك الا انه اجيز باجماع التابعين على خلاف القياس فاقتصر عليه۔ فتح القدیر مصری ج ۵ ص ۴۸۱

قاضی کے قاصد اور اس کے خط میں یہ فرق ہے کہ اس کا خط تو قبول کیا جائے گا۔ اور اس کا قاصد اس لئے قبول نہیں کیا جاتا کہ اس کی غایت یہ ہے کہ وہ مثل قاضی کے ہوگا اور ہم نے پہلے ذکر کیا کہ یہی

قاضی خود اس مضمون کو جو اس کے خط میں ہے زبانی بیان کرے تو قبول نہ کیا جائے اور قیاس اس کے خط میں بھی ایسا ہی تھا لیکن خلاف قیاس اجماع تابعین کی وجہ سے اس میں اجازت دیدی گئی تو یہ اجازت خط ہی کے ساتھ خاص رہے گی۔

جب قاضی اگر اپنا قاصد بھیجے بلکہ بذات خود ہی آکر بیان دے کہ میرے سامنے گواہیاں گذریں تو وہ مقبول نہیں تو تار۔ ٹیلیفون، ریڈیو۔ وائرلیس ۔ لاؤڈ اسپیکر ٹیلیویزن کی خبریں کیا قابل ذکر اور ان سے رویت ہلال کس طرح ثابت ہوسکتی ہے۔

جنتریاں

جنتریوں کا یہ لکھنا کہ فلاں مہینہ انتیس کا ہوگا اور اس کی پہلی تاریخ فلاں دن ہے۔ ہمارے ائمہ کرام فرماتے ہیں کہ اہل توقیت اور منجمین کا یہ لکھدینا شرعاً قابل اعتبار نہیں نہ اس پر عمل جائز۔

درمختار میں ہے: لاعبرة بقول الموقتين ولو عدولا على المذهب۔

(ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۴)

مذہب صحیح کی بنا پر اہل توقیت کے قول کا اعتبار نہیں اگر چہ وہ عادل ہوں۔

ردالمحتار میں معراج سے ناقل ہیں: لا يعتبر قولهم بالاجماع ولا يجوز للمنجمين ان يعمل بحساب نفسه۔ (ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۴)

اہل توقیت کا قول بالاتفاق معتبر نہیں نہ اسکے لئے حساب پر عمل جائز ہے۔

اسی ردالمحتار میں ہے: لايلتفت الى قول المنجمين ۔ (ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۸)

منجموں کے قول کی طرف التفات نہ کیا جائے۔

مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں ہے: ماقال اهل التنجيم غير معتبر ۔

(مجمع الانہر مصری ج ۱ ص ۲۳۷)

اہل تنجیم نے جو کہا وہ غیر معتبر ہے۔

درالمنتقی شرح الملتقی میں ہے: قول اهل التنجيم غير معتبر فمن قال به فقد خالف الشرع۔ (درالمنتقی مصری ج ۱ ص ۲۳۸)

اہل تنجیم کا قول غیر معتبر ہے اور جو اس کو معتبر جانے وہ شریعت کی مخالفت کرتا ہے۔

مراقی الفلاح میں نظم ابن وہباں سے ناقل ہیں: وقول اهل التوقيت ليس ...

(طحطاوی مصری ۳۸۱)

اہل توقیت کا قول واجب کرنے والا نہیں ہے۔

اسی مراقی الفلاح میں ہے: اتفق اصحاب ابی حنیفة الا النادر و الشافعی انه لااعتماد علی قول المنجمین فی هذا۔ (طحطاوی مصری ۳۸۱)

بعض کے سوا اصحاب امام ابوحنیفہ اور امام شافعی نے اس پر اتفاق کیا کہ اہل تنجیم کے قول پر اعتماد نہیں۔ طحطاوی میں ہے: (قوله لیس بموجب) شرعا فطرا و لا صوما۔

(طحطاوی مصری ص ۳۸۱)

قول اہل توقیت کا روزے اور فطر کسی کو شرعا واجب کرنے والا نہیں۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: وهل یرجع الی قول اهل الخبرة العدول ممن یعرف علم النجوم الصحیح انه لایقبل کذا فی السراج۔ (عالمگیری میں ہے مجیدی ج ۱ ص ۱۰۱)

عادل اہل خبر جو علم نجوم کے ماہر ہیں کیا ان کے قول کی طرف رجوع کیا جائے صحیح ہے کہ ان کا قول قبول نہ کیا جائے جیسا کہ سراج میں ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ اہل توقیت اور اصحاب نجوم اگر مسلمان عاقل ثقہ بھی ہوں تو باتفاق فقہا ان کا قول رویت ہلال میں معتبر نہیں ان کی بات قابل التفات نہیں۔ ان کا بیان خلاف شرع ہے۔ ان کا لکھدینا طریق موجب نہیں ان کے قول پر عمل کرنا جائز نہیں۔ لہذا جب ان کا قول غیر معتبر اور نا قابل عمل ہے تو ہندوانی جنتریاں جو اکثر کفار کی ہیں اور مصرانی ہیئات کی بنا پر تیار کی جاتی ہیں ان کا غیر معتبر ہونا کتنے درجے بدتر ہونگی۔ تو ان سے رویت ہلال کس طرح ثابت ہو سکتی ہے۔ بلکہ مسلمان کا اس بارے میں انکا پیش کرنا ہی سراسر غلط و باطل ہے۔

قیاسات

عوام میں یہ باتیں بہت عام ہیں کہ جب چاند اٹھائیسویں کو نظر نہ آیا تو چاند انتیس کا ہوگا۔ اور جب چاند اٹھائیس کو نظر آ گیا تو چاند تیسویں کو دکھے گا۔ یا آج چاند بیٹھکر نکلا تو آج پندرہویں تاریخ ہے۔ یا چاند بڑا دیکھا یا دیر تک رہا تو نہایت جزم سے کہدیا یہ چاند کل کا ہے تو ان قیاسات کا کچھ اعتبار نہیں ان پر نہ شرعا حکم کرنا صحیح نہ عمل کرنا جائز۔

حدیث شریف میں وارد ہے جس کو طبرانی میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی کہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من اقتراب الساعة انتفاخ الاهلة ۔ (جامع صغیر مصری ج ۲ ص ۱۳۸)

علامات قرب قیامت سے چاندوں کا بڑا ہونا ہے۔

اسی طبرانی نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

من اقتراب الساعة ان یری الهلال قبلا فیقال لیلتین ۔

(جامع صغیر مصری للسیوطی ج ۲ ص ۱۳۸)

علامات قیامت سے ہے کہ چاند بے تکلف نظر آئے گا تو کہا جائے گا کہ یہ دو رات کا ہے۔
مسلم شریف میں حضرت ابوالبختری تابعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی:

قال خرجنا للعمرة فلما نزلنا ببطن نخلة رأینا الهلال فقال بعض القوم هو ابن ثلث وقال بعض القوم هو ابن لیلتین فلقینا ابن عباس فقلنا انا رأینا الهلال فقال بعض القوم هو ابن ثلث وقال بعض القوم هو ابن لیلتین فقال ای لیلة رایتموه قلنا لیلة کذا و کذا فقال ابن عباس قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ان الله تعالیٰ قدامده لرویته فان اغمی علیکم فاکملوا العدة ۔

(مشکوۃ شریف ص ۱۷۵)

انہوں نے کہا ہم عمرہ کو چلے جب بطن نخلہ میں اترے ہم نے چاند کو دیکھا کوئی بولا تین رات کا ہے۔ قوم میں سے بعض نے کہا کہ یہ دو رات کا ہے ہم حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ملے تو ہم نے عرض کیا کہ ہم نے چاند دیکھا۔ کوئی کہتا ہے کہ تین شب کا ہے کسی نے کہا دو شب کا ہے فرمایا تم نے اس کو کس رات دیکھا ہم نے کہا فلاں رات کو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے چاند دیکھنے کو مدت ماہ کی حد ٹھہرایا تو اگر تم پر مہینہ پوشیدہ ہو جائے تو عدت یعنی تیس دن پورے کرو۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ چاند کا بڑا ہونا اور بے تکلف نظر آ جانا علامات قیامت سے ہے اور لوگوں کا اس کو بڑا دیکھ کر یہ کہنا کہ یہ دو رات کا ہے یا تین رات کا ہے کوئی قابل اعتبار چیز نہیں ہے۔ ثبوت ہلال کا مدار رویت ہلال پر ہے اگر وہ انتیسویں کو نظر آیا تو انتیس کا ہے۔ اور تیسویں کو دیکھا تو تیس کا ہے۔ لہذا یہ عوام کی قیاسات شرعاً قابل التفات نہیں۔ مذہب ایسے قرائن کی کچھ وقعت نہیں رکھتا ہے۔ ان پر عمل کرنا ناواقفی اور جہالت ہے۔

اختراعات

عوام میں ایک یہ قاعدہ مشہور ہے کہ رجب کی چوتھی تاریخ جو دن ہے اسی دن رمضان کی پہلی تاریخ ہوتی ہے یا جس دن عید الفطر ہوتی ہے اسی دن محرم کی دسویں تاریخ ہوگی۔ یا تین مہینے پے در پے انتیس کے ہوئے ہیں یہ مہینہ ضرور تیس کا ہوگا یا چار مہینے برابر تیس کے ہوئے ہیں یہ مہینہ ضرور انتیس کا ہوگا۔ تو ان باتوں کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔ یہ وہ منگڑھت قاعدے ہیں جن پر کوئی دلیل شرعی نہیں میرے آقائے نعمت۔ امام اہلسنت مجدد دین وملت اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے وجیز امام کردری سے یہ عبارت نقل فرمائی۔

وما نقل عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان یوم اول الصوم یوم النحر لیس بتشریع کلی بل اخبار عن اتفاقی فی ھذہ السنۃ و کذا ماھو الرابع من رجب لایلزم ان یکون غرۃ رمضان بل قد یتفق۔

اور جو حضرت مولا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ پہلے روزہ کا دن یوم نحر ہوگا تو یہ قاعدہ شرعی کلی نہیں بلکہ ایک خبر ہے جو اتفاقا اس سال میں واقع ہوئی اسی طرح رجب کی چوتھی کا دن پہلی رمضان ہونا ضروری نہیں بلکہ کبھی اتفاقا ایسا ہو جاتا ہے۔

لہذا یہ اگر قواعد شرع سے ہوتے تو شریعت میں اس کی تصریح ہوتی اور اگر قواعد توقیت وتنجیم سے ہوتے تو اہل توقیت اس کو لکھتے۔ لہذا جب کسی نے ان کو نہیں لکھا تو معلوم ہوا کہ یہ قواعد مخترعہ ہیں جن کو عوام نے محض اس بنا پر گڑھ لیا ہے کہ کسی سال ایسا اتفاق ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ امام کردری نے تصریح فرمائی کہ یہ اتفاقی خبریں ہیں لہذا ثبوت ہلال پر انکا کچھ اثر نہیں۔

سوالات کے جوابات ان مباحث ہی سے حل ہو گئے۔ ضرورت تو نہیں کہ نمبر وار جواب دیا جائے لیکن مزید وضاحت کے لئے ہر سوال کا جواب مختصر الفاظ میں دیا جاتا ہے۔ عبارت وثبوت اوپر منقول ہوئے۔

جواب سوال اول: اگر ان سے حاکم صرف اپنے شہر یا حوالی شہر کے دیہات کے لئے شہادت شرعی گذر جانے کے بعد فقط اپنے حکم کا اعلان کرتا ہے تو اس میں کچھ حرج نہیں۔ جیسے منادی توپ وغیرہ سے حکام اعلان کرایا کرتے ہیں تو اس اعلان پر عمل کرتے ہوئے عید کر سکتے ہیں اب رہے دوسرے شہران کے لئے نہ اعلان کافی نہ اس پر عمل کرتے ہوئے عید کی جا سکتی ہے اس کے لئے رویت ہلال کا ثبوت بطریق موجب نہیں پایا گیا۔

جواب سوال دوم: نائب اگر دوسرے کسی شہر میں ہے تو ان آلات سے خبر سن کر اپنے حاکم اعلیٰ کے حکم پر نہ عمل کر سکتا ہے نہ عید منا سکتا ہے۔ اب رہا آواز کا پہچاننا اس کو شریعت نے معتبر نہیں مانا کہ نغمہ نغمہ کے مشابہ ہو سکتا ہے جو قابل تزویر ہو وہ کب لائق اعتماد ہو سکتا ہے

جواب سوال سوم: کسی شہر کی شہادت جب اور کسی دوسرے شہر میں بطریق موجب پہونچ جائے تو وہاں کے لوگ ضرور عید کریں اور شرعی قوانین وہی ہیں جو بطریق موجب ہو۔ رویت ہلال میں یہی مدار حکم ہے۔

جواب سوال چہارم: نماز وخطبہ میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال مکروہ ہے اس میں میرا مفصل فتوی ۔۱۹۴۰ء کا موجود ہے اور نماز خطبہ کو مجالس وعظ پر قیاس نہیں کر سکتے۔ اس میں بحث بھی ہے۔

جواب سوال پنجم: ٹیلیویزن سے دوسرے شہروں میں رویت ہلال ثابت نہیں ہو سکتی تو اس کی خبر پر عید بھی نہیں کر سکتے بولنے والے کی تصویر سامنے آجانا اس کے ثبوت عدالت کے لئے کافی نہیں ۔ٹیلیویزن سے شہادت ثابت نہیں ہو سکتی جو مقدمہ ثانیہ سے ظاہر ہے۔

جواب سوال ششم: احکام شرع کا ان آلات سے اثبات کرنا غیر معتبر و نامقبول ہے۔ شرعا تو ان سے شہادت ثابت ہی نہیں ہو سکتی۔ قانوناً بھی ان سے شہادت حاصل نہیں ہوتی ورنہ کچہریوں میں ان آلات کے ذریعہ سے دوسرے شہروں کی شہادت حاصل کر لی جاتی اور اسی پر اعتماد کر کے کسی مقدمہ کی ڈگری کر دی جاتی تو ان سائنس کے مقلدوں اور مغربی تعلیم کے دلدادوں نے پہلے مسائل شرع میں ان کا استعمال کیوں شروع کر دیا ہے مولیٰ تعالیٰ ان کو قبول حق کی توفیق عطا فرمائے اور اپنا سچا متبع دین بنادے۔

واخر دعوینا ان الحمد لله رب العلمين وصلى الله تعالىٰ علىٰ خير خلقه سيدنا ومولانا محمدو اله واصحابه اجمعين ـ

كتبه

المعتصم بذيل سيد كل نبى ومرسل

الفقير الى الله عزوجل العبد **محمد اجمل غفرله** الاول

المفتى فى بلدة سنبهل ۲۵ رمحرم الحرام ۱۳۷۰ھ

﴿۴۴﴾

باب مسائل الصوم

مسئلہ (۵۸۴)
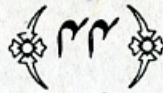
کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک امام صاحب ایک موضع میں خطیب تھے اور موضع کے کچھ بچے تعلیم بھی حاصل کرتے تھے لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی تھیں جن کو تعلیم اردو قرآن شریف حافظہ دیا کرتے تھے ایک عرصہ دراز تک سلسلہ تعلیم وامامت جاری رہا انہیں بچوں میں ایک چھوٹی لڑکی جس کی عمر تقریبا نو سال کی تھی چند کتابیں اردو کی اور کلام پاک کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد اسی لڑکی نے اپنے شوق میں حافظہ شروع کر دیا جو کہ تین پارے حافظہ کر چکی ہے۔ اور اس کے علاوہ اور سورتیں بھی سورہ یٰس وطٰہٰ وغیرہ بھی یاد کیں، اس کے بعد اس کی موت نے جلدی کی اور قضاء الٰہی سے دار فانی کو سدھار گئی اور اس کے مرنے کے بعد جو کیفیتیں ظاہر ہوئیں امام صاحب مذکور نے اس قصہ کو بنام حاجرہ میں شائع کیا جو کہ پیش نظر ہے برائے کرم قصہ حاجرہ کو بنظر عمیق ملاحظہ فرما کر جواب سے سرفراز فرمائے گا کہ ایسا قصہ حاجرہ عند الشرع جائز ہے اور عقل میں آتا ہے یا نہیں؟ تا کہ قسم قسم کے فتنہ نہ بڑھیں جو کہ بڑھ رہے ہیں اور بڑھ گئے ہیں، کوئی کہتا ہے جھوٹ ہے یہ ہونا امر محال ہے، کوئی کہتا ہے سچ ہے ایسا ہو سکتا ہے، اولیاء کے لئے کوئی مشکل نہیں، کوئی کہتا ہے کہ ولی نہیں تھی کیونکہ اگر وہ ولی ہوتی تو روزہ کے متعلق یہ نہ کہتی کہ روزہ ٹوٹ گیا جو کہ امام صاحب نے اس شعر میں بتائے ہیں کہ روزہ ٹوٹ گیا جب کہ منہ بھر کے قے ہوئی تھی، بہر حال کچھ بھی ہے، بنظر تعمق ملاحظہ فرما کر جواب سے جلد از جلد سرفراز فرمائیں عین نوازش ہوگی۔ بینوا توجروا۔

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

اس قصہ میں منہ بھر قے سے روزہ ٹوٹ جانے کا حکم تو غلط ہے باقی اس میں اور کوئی بات ایسی نہیں ہے جو شرعا قابل اعتراض ہو۔ اور اس صالحہ لڑکی کا ولی ہونا بھی کوئی حیرت انگیز بات نہیں کہ بعض بچے مادر زاد ولی ہوتے ہیں اور بعد موت کے قبر سے طٰہٰ اور یٰسین شریف کی آواز کا آنا اور خوشبو کا محسوس

ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے کہ قبر سے بعض صحابہ کرام نے سورۂ ملک کی آواز سنی ہے کہ مشکوۃ شریف میں اس مضمون کی حدیث وارد ہے۔ لیکن ان امام صاحب کو اس واقعہ سے اس قدر متاثر نہ ہونا چاہئے نہ وہاں کے لوگوں کو اس پر کسی طرح کا اختلاف کرنا چاہئے اہل اسلام کا عقیدہ ہی یہ ہے کہ کرامات اولیاء حق یعنی اولیاء کرام کی کرامتیں حق ہیں اور معجزہ و کرامت وہی ہے جو عقل میں نہ آوے۔ بالجملہ یہ کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا جس میں مسلمان فتنہ میں پڑیں یا کسی طرح کا اختلاف کریں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

۲۹ جمادی الاخریٰ ۷۶ھ/۱۳

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۸۵)

قبلہ حضرت مولانا محمد اجمل صاحب دامت برکاتہم العالیہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
بعد بصد آداب غلامانہ بجالا کر عرض ہے کہ جب ذیل مسائل کا جواب ارسال فرمایا جائے
روزے کی حالت میں انجکشن لگوانا جائز ہے یا نہیں؟۔ دیوبندیوں نے اپنے نقشہ افطار میں جائز لکھا ہے استدعا ہے کہ مدلل جواب تحریر فرمایا جاوے۔
آپ کا کفش بردار محمد عبداللہ رضوی کھیری محلہ ڈیہ پور ۱۶/ر رمضان المبارک ۷۸ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

حقیقت تو یہ ہے کہ دیوبندی قوم عقیدۃً تو غیر مقلد ہیں۔ پھر جب وہ باطنی طور پر غیر مقلد ہیں تو ان میں نہ فقاہت حاصل ہونی چاہئے۔ نہ وہ کتب فقہ کے ماہر ہونے چاہیں۔ لیکن وہ جب مدعی حنفیت ہیں تو انہیں بظاہر مقلد بننا پڑتا ہے۔ اور بجبوری کتب فقہ سے تعلق رکھنا پڑتا ہے۔ تو اب انہیں جن مسائل میں فقہ کی تصریحات اور جزئیات ملجاتے ہیں تو ان میں تو ان سے زیادہ صریح غلطیاں نہیں ہوتیں۔ اور جب ان کور فہموں کو نئے واقعات اور نادر حوادث سے واسطہ پڑتا ہے تو ان میں یہ ضرور غلطیاں کرتے ہیں۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ جیسے رویت ہلال میں ریڈیو کی خبر کا اعتبار۔ نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال وغیرہ انہیں میں روزہ میں انجکشن کا مسئلہ بھی ہے۔ چنانچہ انہوں نے انجکشن سے روزے کے فاسد ہونے کا حکم نہیں دیا۔ اس میں ان سے دو اصولی غلطیاں ہوگئیں۔

پہلی غلطی تو یہ ہے کہ دوا انجکشن سے دماغ یا جوف تک نہیں پہونچتی۔

چنانچہ فتاوی دیوبند میں ہے:

انجکشن کے ذریعہ دوا جوف عروق میں پہونچائی جاتی ہے اور خون کے ساتھ شرائین میں اس کا سریان ہوتا ہے۔ جوف دماغ یا جوف بطن میں دوا نہیں پہونچتی۔

اولاً: جب رگوں کا سلسلہ و تعلق دماغ اور جوف سے ہے تو عقل باور نہیں کرتی کہ بذریعہ انجکشن جب دوا رگوں کے اندر پہنچا دی گئی تو کیا خون کی حرکت اور اس کا سیلان اسکو دماغ یا جوف تک پہنچانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ پھر انجکشن کی حرکت قسریہ اس کو معین ثابت نہ ہوگی۔

ثانیاً: بیہوش کرنے کے لئے انجکشن کیا جاتا ہے تو اگر وہ دوا دماغ تک نہیں پہنچتی تو دماغ کو کس چیز نے ماؤف کیا۔

ثالثاً: درد معدہ یا درد قولنج وغیرہ کے لئے انجکشن کیا گیا تو اگر دوا جوف تک نہیں پہونچی تو اس درد کو کس چیز نے دفع کیا۔

رابعاً: غذا کا انجکشن بھی ہوتا ہے تو دوا جوف تک اگر نہیں پہونچی تو غذائیت کس چیز سے حاصل ہوئی۔

خامساً: پیاس کے دفع کرنے کے لئے بھی انجکشن ہوتا ہے تو وہ دوا جوف تک نہیں پہونچی تو پیاس کیسے دفع ہوئی اور سیراب کس چیز نے کر دیا۔

بالجملہ یہ وہ امور ہیں جن کا انکار مشاہدات و تجربیات کا انکار ہے۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر اور اطباء تو اس کا اقرار کرتے ہیں کہ انجکشن کی دوا جوف و دماغ تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اکابر مفتیان دیوبند کا اس سے انکار کرنا کیسی بیزار عقل چیز ہے۔

دوسری غلطی یہ ہے کسی چیز کا دماغ یا جوف تک پہنچنا مطلقا روزے کو فاسد نہیں کرتا بلکہ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ چیز منافذ اصلیہ کے ذریعہ سے پہنچے۔

چنانچہ فتاوی دیوبند میں ہے:

افساد صوم کے لئے مفطر کا جوف دماغ یا جوف بطن میں بذریعہ منفذ اصلی پہنچنا ضروری ہے۔

(فتاوی دیوبند ج ۲ ص ۴۷)

اولاً: کتب فقہ میں روزے کے فاسد کرنے کے لئے کسی چیز کا دماغ یا جوف تک پہنچ جانا کافی

سمجھا گیا ہے۔

مفاد ماذکر متناو شرحا وھو ان مادخل فی الجوف ان غاب فیہ فسد وھو المراد بالاستقرار وان لم یغب بل بقی طرف منہ فی الخارج او کان متصلابشی خارج لایفسد لعدم استقرارہ ۔ (شامی مصری ج ۲ ص ۱۰۴)

درمختار میں بدائع سے ناقل: ان الاستقرار الداخل فی الجوف شرط للفساد۔ (شامی ج ۲ ص ۱۰۲)

ردالمحتار میں خزانۃ الاکمل سے منقول ہے: ان العلۃ من الجانبین الوصول الی الجوف وعدمہ۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۱۰۳)

اسی ردالمحتار ص ۱۰۵ / میں ہے: قلت ولم یقیدوا الاحتقان والاستعاط والاقطار بالوصول الی الجوف لظھورہ فیھا والا فلا بدمنہ حتی لو بقی السعوط فی الانف ولم یصل الی الراس لایفطرو یمکن ان یکون الدواء راجعا الی الکل۔

علامہ شامی نہر سے ناقل ہیں: والذی ذکر المحققون ان معنی الفطر وصول مافیہ صلاح البدن الی الجوف اعم من کونہ غذاء او دواء ۔ (ج ۲ ص ۱۱۱)

ہدایہ میں ہے: من احتقن او اسقط او اقطرفی اذنہ افطر لقولہ ﷺ الفطر ممادخل ولوجود معنی الفطر وھو وصول مافیہ صلاح البدن الی الجوف ۔(ہدایہ ج ۱ ص ۲۰۰)

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ روزے کے فاسد ہوجانے کے لئے کسی مفطر چیز کا دماغ یاجوف تک پہنچ جانا ضروری ہے۔

ثانیا: اگر مفطر چیز کے دماغ یاجوف تک پہنچنے کے لئے منافذ اصلیہ کے ذریعہ سے پہنچنا ضروری اور شرط ہوتا تو متون وشروح اپنی عبارات میں اس شرط کا ذکر کرتے تو جب متون وشروح بلکہ فتاوی نے اس کو شرط قرار نہیں دیا تو چودھویں صدی میں ان اکابر دیوبند کا اس کو شرط اور ضروری قرار دینا کیا قابل التفات۔

ثالثا: یہ امر تو ضروری ہے کہ منافذ اصلیہ کے ذریعہ سے جو چیز دماغ یاجوف تک پہنچے وہ بالاتفاق روزہ کو فاسد کردیگی۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے اور خود فتاوی دیوبند میں خلاصۃ الفتاوی سے منقول ہے:

ماوصل الی الجوف والراس والبطن من الاذن والانف والدبر فهو مفطر بالاجماع۔

لیکن مفتی دیوبند کا س عبارت کا یہ مفہوم مخالف نکالنا (کہ جو چیز دماغ یا جوف تک بذریعہ منافذ اصلیہ کے نہ پہنچے وہ روزہ کو فاسد نہیں کرتی) کوئی حجت اور دلیل نہیں کہ عند الحنفیہ مفہوم مخالف معتبر نہیں ہے۔

رابعا: ہدایہ میں ہے: لوداوی ـ ائفة او آمة بدواء فوصل الی جوفه او دماغه افطر عند ابی حنفیة والذی یصل هو الرطب ۔ (ہدایہ ص ۲۰۰)

پیٹ کا ایسا زخم جو جوف تک ہو اس کو جائفہ کہتے ہیں اور سر کا ایسا زخم جو دماغ تک ہو اس کو آمہ کہتے ہیں۔

اگر ان میں تر دوا استعمال کی جو جوف و دماغ تک پہنچے گی تو روزہ فاسد ہو گیا اور مفتی دیوبند کے نزدیک اس صورت میں روزہ فاسد نہیں ہونا چاہئے کہ ان کی شرط نہیں پائی گئی یعنی یہ دوا جوف و دماغ تک منافذ اصلیہ کے ذریعہ سے نہیں پہنچی۔ تو کہیے مفتی صاحب آپ کا حکم صحیح ہے۔ یا ہدایہ جیسی معتبر و مستند کتاب کا۔ اور پھر ان کا قول مانا جائے یا حضرت امام اعظم علیہ الرحمہ کا۔

الحاصل ان دیوبندیوں مفتیوں کی یہ دو بنیادی غلطیاں ہیں جن پر کافی سوالات وارد کر دیئے گئے ہیں۔ تو جب ان کے فتوے کا غلط ہونا اور ماہرین انجکشن کے تجربوں کے خلاف ہونا ثابت ہو چکا تو اب مسئلہ خود ہی منقح ہو گیا لہذا اب مختصر طور پر حکم شرع ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ وباللہ التوفیق۔

انجکشن رقیق اور تر دوا کا کیا جاتا ہے اور ظن غالب یہ ہے کہ تر اور رقیق دوا بذریعہ رگوں کے خود خون کی حرکت اور اس کے سیلان سے اور مزید انجکشن کی حرکت قسریہ کی مدد سے دماغ یا جوف تک پہونچ جاتی ہے۔ مسلمان ڈاکٹروں سے تحقیق کی تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ انجکشن سے دوا دماغ یا جوف تک پہونچ جاتی ہے۔

ردالمحتار میں ظاہر الروایہ سے منقول ہے:

وقع فی ظاهر الروایة من تقیید الافساد وبالدواء الرطب مبنی علی العادة من انه یصلی والا فالمعتبر حقیقة الوصول حتی لوعلم وصول الیابس افسد (وفیه ایضا) فان کان

ممایصل عادۃ حکم بالفساد لانه متیقن ۔

اور یہ امور نا قابل انکار ہیں ۔ (۱) انجکشن فعل قصدی وارادی ہے (۲) اور دوا میں اصلاح بدن کا فائدہ موجود ہے ۔ (۳) وہ جوف میں پہنچ کر رہجاتی ہے اس کو خارج سے پھر کوئی تعلق نہیں رہتا ۔ اور روزے کے فساد کا مدار انہیں امور پر موقوف تھا ۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے: وحاصله ان الا فساد منوط بما اذا کان بفعله او فیه صلاح بدنه ویشترط ایضا استقراره داخل الجوف ۔

لہذا جب یہ امور اس انجکشن میں متحقق ہو گئے تو اس انجکشن سے روزہ فاسد ہو جائے گا ۔ اور اس کی قضا لازم ہوگی ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۔ ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۷۸ھ

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل ، الفقیر الی اللہ عزوجل ، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول ، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

کتاب الحج

﴿۴۵﴾
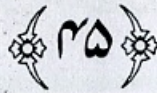
باب ارکان الحج

مسئلہ (۵۸۶)

(۱) کیا قانونی مجبوری سے حج فرض کے لئے فوٹو کھنچوا کر دینا جائز ہے؟۔

(۲) جب فرض وحرام کا تعارض ہو تو شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟۔

(۳) جب عوام وخواص یعنی محدث اعظم صاحب ودیگر علماء کرام بھی فوٹو لے کر حج کو جا رہے ہیں اور " لا تجتمع امتی علی الضلالۃ "صحیح ہے تو اس کو اجماع امت سمجھ کر جواز فوٹو کا حکم دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟۔

(۴) یہ خیال کر کے کہ حجر اسود چوم کر یا وقوف عرفات سے یا طواف بیت اللہ شریف کر کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے فوٹو کھنچوانے میں کیا مضائقہ ہے؟۔

(۵) فعل حرام کا ارتکاب فسق ہے اور یہ فسق مستور بھی نہیں ہے ایسی حالت میں جو حج سے فارغ ہو کر آئے وہ اس فسق کی وجہ سے احترام وتعظیم کے لائق نہیں مگر لوگ ان کو مکرم ومعظم ہی سمجھتے ہیں۔ یہ سمجھنا کیسا ہے؟۔

(۶) رہن دخلی حرام ہے یعنی شی مرہونہ سے انتفاع ناجائز ہے۔ اگر کسی نے مکان اس شرط پر خرید لیا کہ اگر تم سال ڈیڑھ سال میں خریدنا چاہو گے تو میں اسی قیمت میں تمہارے ہاتھ پر بیع کر دونگا اسی طرح وہ اتنی مدت خود رہا یا کرایہ پر اٹھایا تو یہ رقم اس کے لئے حلال ہوئی یا نہیں؟۔

(۷) نماز مغرب کے وقت تین شخص ٹخنوں سے نیچے پائچے پہنے ہوئے مسجد میں آئے ان سے کہا گیا کہ یہ شکل شرعا ممنوع ہے، تو ایک نے نیفہ ٹوم لیا، دوسرے نے پائچے الٹ لئے، تیسرے نے اسی حالت میں نماز پڑھی۔ ان تینوں کی نماز کا کیا حکم ہے؟۔

(۸) عند الناس تو صاحب کرامات اولیاء کا مرتبہ علماء حق سے افضل ہے مگر عند اللہ والرسول علماء واولیاء میں سے کون افضل ہے میرا گمان عوام کے خلاف ہے؟۔

المستفتی، مولوی محمد یوسف بمعرفت محمد فاروق صاحب سوداگر المونیم پیلی بھیت

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

(۱) اب سفر حج کیلئے فوٹو کا کھنچوانا ضروری ہوگیا ہے۔ جب یہ قانون زیر غور ہی تھا اس وقت بھی ہم نے اور دیگر مقامات سے علماء کرام نے اس کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور حکومت سے مطالبہ کیا تھا۔ حکومت نے اسکا جواب ہم کو یہ دیا کہ حکومت کو مجبوراً پاسپورٹ کے ساتھ فوٹو کو لازم کرنا پڑا ہے۔ تو فوٹو کا پاسپورٹ کے ساتھ ہونا بہر حال ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اب ہمیں ادھر تو یہ ملحوظ رکھنا ہے کہ فوٹو تصویر ہے اور اس کا کھنچوانا تصویر کا کھنچوانا ہے جو گناہ ہے۔ اور ادھر یہ مدنظر رکھنا ہے کہ حج فرض ہے جو بلا ادا کئے ادا نہیں ہوسکتا اور سال دو سال میں غیر مسلم حکومت سے یہ امید بھی نہیں ہے کہ حجاج سے یہ فوٹو کی قید اٹھائی جائے گی۔ اب وہ شخص جس کو حج فرض ادا کرنا ہے اور تمام شرائط حج مجتمع ہیں اور شرعی موانع سے کوئی مانع موجود نہیں ہے تو کیا اس کے لئے صرف فوٹو کا کھنچوانا شرعاً عذر ومانع قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اور بصورت عذر ومانع ہونے کے تاخیر حج کے گناہ بلکہ ترک فریضۂ حج کے عذاب کا سزاوار ہوگا یا نہیں۔ لھذا ہم جواب سے اپنے چند مقدمات پیش کرتے ہیں۔

مقدمہ اول:۔ ماں باپ کی اطاعت سے حج فرض ادا کرنا اولے ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: فی المنقطع حج الفرض اولے من طاعة الوالدین وطاعتهما اولے من حج النفل" (عالمگیری قیومی ص ۱۱۳ ج ۱)

ارشاد الساری حاشیہ المسلک المتقسط میں ہے:۔ "وفی المضمرات الاتیان بحج الفرض اولے من طاعة الوالدین" (ارشاد مصری ص ۳)

اسی طرح جب عورت کے ساتھ محرم ہو تو اسے حج فرض کے لئے بغیر اجازت شوہر کے جانا جائز ہے۔ فتاوی قاضی خاں میں ہے۔ "وعند وجود المحرم کان علیها ان تخرج حجة الاسلام وان لم یاذن زوجها وفی النافلة لاتخرج بغیر اذن الزوج"

(فتاوی قاضی خاں مصطفائیص ۱۳۵ ج ۱)

درمختار میں ہے:۔ "ولیس لزوجها منعها عن حجة الاسلام"

ردالمحتار میں ہے:۔ "ای اذا کان معها محرم والا فله منعها کما یمنعها عن غیر

حجۃ الاسلام" (ردالمحتار مصری ص ۱۵۰ ج ۲)

ان عبارات سے یہ ثابت ہوگیا کہ حج فرض کی اس قدر اہمیت ہے کہ اس کے مقابلہ میں اطاعت والدین اور اذن شوہر کا بھی لحاظ نہ رکھا گیا۔

مقدمۃ ثانیہ: پانی کی قلت۔ گرم ہوا کا چلنا۔ موت۔ قتل۔ چوری۔ بیماری کے محض خطرات حج کے لئے عذر مانع نہیں۔۔ ردالمحتار میں ہے:۔" ان مایحصل من الموت بقلۃ الماء وھیجان السموم اکثر ممایحصل بالقتل با ضعاف کثیرۃ فلو کان عذرا لزم ان لایجب الحج الاعلی القریب من مکۃ فی اوقات خاصۃ مع ان اللہ تعالی اوجبہ علی اھل الآفاق من کل فج عمیق مع العلم بان سفرہ لا یخلو عما یکون فی غیرہ من الاسفار من موت وقتل وسرقۃ

(ردالمحتار مصری ص ۱۴۹ ج ۲)

اس عبارت سے ظاہر ہوگیا کہ سفر قلت آب، بادسموم، موت، قتل، چوری کے خطرات سے خالی نہیں ہوتا ہے تو یہ چیزیں حج کے لئے عذر و مانع نہیں جب تک کہ یہ حد یقین یا ظن غالب کی حد تک نہ پہنچ جائیں۔

مقدمۃ ثالثہ: اگر مال حرام سے حج فرض ادا کر رہا ہے تو اگر چہ اس کا حج درجہ قبولیت تک نہ پہنچے اور ثواب کا مستحق نہ بنے لیکن وہ تارک حج کا عذاب نہ دیا جائے گا۔

ردالمحتار میں ہے:۔"ویجتھد فی تحصیل نفقۃ حلال فانہ لایقبل بالنفقۃ الحرام کما ورد فی الحدیث مع انہ یسقط الفریضۃ معھا ولاتنافی بین سقوطہ وعدم قبولہ فلا یثاب لعدم القبول ولایعاقب عقاب تارک الحج ای لان عدم الترک یبتنی علی الصحۃ وھی الاتیان بالشرائط والارکان والقبول المترتب علیہ الثواب یبتنی علی اشیاء کحل المال والاخلاص کمالوصلی مرائیا او صام و اغتاب فان الفعل صحیح لکنہ بلا ثواب"

(ردالمحتار مصری ص ۱۴۴ ج ۲)

اس عبارت سے ثابت ہوگیا کہ مال حرام سے حج کرنے میں فرض ادا ہو جاتا ہے اور فریضہ سر سے ساقط ہو جاتا ہے کہ جب اس نے حج کے شرائط وارکان ادا کیئے تو حج تو صحیح ہوگیا اور وہ ترک حج کے ثواب سے بچ جائے گا۔ اب باقی رہا حج کا ثواب تو وہ حج کے مقبول ہونے پر مرتب ہے اور قبولیت حج مال حلال اور اخلاص پر موقوف ہے۔ جیسے کہ کسی نے ریا کے لئے نماز پڑھی یا روزہ رکھا اور اس میں غیبت

کی تو وہ نماز و روزہ تو ادا ہو گیا مگر وہ ثواب کا حقدار نہ بنا۔ بالجملہ فریضہ کی صحت تو اسکے شرائط و ارکان کے ادا کرنے پر ہو جاتی ہے۔ اور خارجی امور کا اثر خود فعل پر نہیں پڑتا بلکہ ثواب پر ہے۔

مقدمۃ اربعۃ :۔ سفر حج میں اگر ظلم ظالم یا دفع شر یا حصول امن کے لئے رشوت دینی پڑے۔ یا چنگی ٹیکس بجبر لیا جاتا ہو اور یہ محض اسقاط فرض یا دفع مضرت مال کے لئے بضرورت دینے کے لئے مضطر ہو تو اس عازم حج پر کوئی محظور شرعی لازم نہیں آتا بلکہ گناہ لینے والے پر ہے اور یہ امور مذکورہ حج کے لئے عذر نہیں اور نہ منافی امن ہیں۔

درمختار میں ہے :۔" وهل مايو خذ فی الطريق من المكس والحقارة عذر قولان والمعتمد لا كمافی القنية والمجتبی"

علامہ علی قاری المسلک المتقسط میں تحریر فرماتے ہیں:" قا ل غيرالو بری يجب الحج وان اعلم يوخذمنه المكس قا ل صاحب القنية والمجتبی وعليه الاعتمادوفی المنها ج وعليه الفتوی وقال ابن الهمام حاصله ان الاثم فی مثله علی الآخر لاعلی المو طی فلايترك الفرض لمعصية عاص" (ارشاد الساری مصری ص ۳۶)

ردالمحتار میں ہے :۔ واعترضه ابن كما ل با شافی شرحه علی الهداية با ن ما ذكرفی القضاء ليس علی اطلاقه بل فيما اذا كان المعطی مضطر ابان لزمه الاعطاء ضرورة عن نفسه وما له ، اما اذا كان بالا لتزام منه فبالا عطاء ايضا يا ثم وما نحن فيه من هذ القبيل ۔ اه ۔ و اقره فی النهر واجاب السيد ابو السعود بانه هنا مضطر لا سقاط الفرض عن نفسه قلت ويؤيده مايا تی عن ا لقنية والمجتبی فان المكس والخفارة رشوة ونقل ح عن البحران الرشوة فی مثل هذا جائزةولم اره فيه۔ (ردالمحتار مصری ج ۔۲۔ ص ۱۲۹)

ابن کمال پاشا نے اپنی شرح ہدایہ میں اس پر اعتراض کیا کہ قضا میں مذکور ہوا اس کا حکم مطلق نہیں بلکہ اس صورت میں ہے کہ جب دینے والا مجبور ہو کہ اپنے نفس و مال کی ضرورت کی بنا پر اس کو دینا لازم ہو لیکن جب اس نے خود ہی اپنے اوپر لازم قرار دے دیا تو دینے پر گنہگار ہوگا۔ اور ہم جس پر گفتگو کر رہے ہیں وہ اسی قبیل سے ہے اسی کو نہر میں برقرار رکھا۔ اور سید ابو سعود نے جواب دیا کہ بلا شک حاجی یہاں پر اپنے نفس پر سے فریضہ حج کے ساقط کرنے کے لئے مجبور ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسی کی تائید کرتا ہے۔ جو قنیہ اور مجتبی میں لکھا ہے۔ کہ بیشک محصول اور ٹیکس رشوت ہے اور بحر الرائق سے منقول ہے کہ

بیشک اس جیسی جگہ میں رشوت جائز ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ ظلم ظالم، دفع شر، حصول امن، چنگی ٹیکس، کوئی عازم حج فرض محض اپنے اوپر سے فریضہ حج کے ادا کرنے یا اپنے مال سے دفع مضرت کرنے کے لئے بلحاظ ضرورت مجبورا رشوت دے تو ایسی رشوت جائز ہے۔ اس کا گناہ صرف لینے والے پر ہوگا۔ اس دینے والے پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اور یہ چیزیں نہ حج فرض کے لئے عذر و مانع ہیں نہ اس کے لئے منافی امن ہیں۔ لہذا ان چیزوں کی بنا پر حج فرض کو نہ چھوڑا جائے گا بلکہ جب اس کے لئے اور تمام شرائط حج پائے جائیں تو اسے حج فرض کے لئے جانا واجب ہے۔

مقدمۂ خامسہ: جس شخص کے لئے موانع حج مرتفع ہوں اور شرائط حج مجتمع ہوں تو اس کو اسی سال حج کرنا فرض ہے۔ وہ اگر دوسرے سال تک تاخیر کرے گا تو گنہگار ہوگا۔ اور اگر چند سال تک حج کے لئے تاخیر کرتا رہا تو فاسق ہے اور اس کی گواہی مردود ہے۔

درمختار میں ہے:

(فرض فی العمر مرة علی الفور) فی العام الاول عند الثانی واصح الروایتین عن الامام ومالك واحمد فیفسق وترد شهادته بتاخیره ای سنیناً لان تاخیره صغیرة وبارتکابه مرة لا یفسق الا بالاصرار۔ (ردالمحتار۔ ص ۱۴۴۔ ج۔ ۲)

اور حج ایک بار فوراً پہلے سال ہی میں فرض ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک اور امام مالک وامام احمد وامام اعظم کی اصح روایت میں تو چند سال تاخیر سے وہ فاسق ہو جائے گا اور اس کی گواہی مردود کر دی جائے گی۔ کیونکہ تاخیر حج صغیرہ گناہ ہے اور صغیرہ کے ایک بار کرنے سے فسق نہیں ہوتا۔ ہاں وہ اس تاخیر کے اصرار سے ضرور فاسق ہو جائے گا۔

درالمنتقی شرح الملتقی میں ہے:

(فرض فی العمر مرة علی الفور) عند الثانی لان الموت فی السنة غیر نادر وهو اصح الروایتین عن الامام ومالك واحمد کما فی عامة الکتب المعتبرات کالخانیة والاسرار و فی القنیة انه المختار فیفسق وترد شهادة بالتاخیر عن العام الاول بلا عذر۔

(درالمنتقی مصری۔ ج۔۱۔ ص ۲۵۹)

(حج) ایک مرتبہ عمر میں فوراً فرض کیا گیا امام ابو یوسف کے نزدیک کہ سال میں موت کا وجود

غیر نادر ہے اور یہ امام اعظم اور مالک اور احمد کی اصح روایت میں ہے جیسا کہ عام معتبر کتب مثل فتاوی قاضی خان اور اسرار میں ہے اور قنیہ میں ہے کہ یہی مختار قول ہے تو بلا عذر پہلے سال کی تاخیر سے فاسق ہو جائے گا۔ اور وہ مردود الشہادت ہو جائے گا۔

لباب المناسک اور اس کی شرح المسلک المتقسط فی المسلک المتوسط میں ہے:

(و اذا وجدت الشروط) ای شروط وجوب الحج و ادائه وجب (فالوجوب علی الفور) ای محمول علیه فی القول الاصح عند نا وهو اختیار ابی یوسف و اصح الروایتین عن ابی حنیفة کما نص علیه قاضی خان وصاحب الکافی و به قال مالك فی المشهور و احمد فی الاظهر والمازنی من الشافعیة (فیقدمه خائف العزوبة) ای من العنت (علی التزوج) لحق تعلق وجوب الحج وسبقه (ویاثم الموخر عن سنة الامکان) ای اول سنی الامکان وهذا طریق امام الهدی ابی منصور الماتریدی فی کل امر مطلق عن الوقت فانه یحمل علی الفور۔ (المسلک المتقسط۔ص ۴۴)

اور جب حج کے وجوب اور ادا کی شرطیں پائی گئیں اور وہ واجب ہو گیا تو اس کا وجوب ہمارے نزدیک صحیح ترین قول کی بنا پر علی الفور ہے۔ یہی امام ابو یوسف کا مختار قول ہے۔ اور امام اعظم کی اصح روایت ہے جیسا کہ اس پر قاضی خان اور صاحب کافی نے نص بیان کی اور یہی مشہور روایت میں امام مالک نے اور اظہر روایت میں امام احمد نے اور شافعیہ میں سے مازنی نے فرمایا۔ تو حج کو غیر شادی شدہ شخص جو زنا سے خائف ہے نکاح پر مقدم کرے کہ حج کا وجوب اور سبقت کا حق اس سے متعلق ہو چکا۔ اور قادر ہو جانے کے سالوں میں سے پہلے سال ہی سے تاخیر کرنے والا گنہگار ہو جائے گا۔ یہ امام ہدی امام ابو منصور ماتریدی کا طریقہ ہر اس امر میں ہے جو وقت سے مطلق ہو کہ وہ علی الفور ہی پر محمول ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ فرضیت حج کی اس قدر اہمیت ہے کہ اس کے مانع نہ ہوں اور تمام شرائط جمع ہوں تو اس کے مقابل طاعت والدین اور اذن شوہر کی بھی پروانہ کی جائے گی اور قلت آب، باد سموم، موت، قتل، چوری، بیماری کے خطرات بھی حج کے موانع نہیں ٹھریں گے یہاں تک کہ مال حرام سے حج فرض ادا ہو جاتا ہے اور فریضہ ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اور وہ ترک حج کے عذاب سے بچ جاتا ہے اگر چہ ایسا حج مقبول نہیں ہوتا، اور وہ ثواب کا مستحق نہیں بنتا لیکن باوجود اس کے مال حرام حج کے لئے عذر نہیں قرار پاتا۔ بلکہ حج فرض کی ضرورت کا اتنا لحاظ ہے کہ اس کے سفر میں ظلم طاہر و دفع شر و حصول امن کے

لئے رشوت دینے کی اجازت ہے۔ اور چنگی اور ٹیکس ادا کرنے پر کوئی مواخذہ شرعی نہیں ہے تو رشوت بھی حج کیلئے نہ عذر نہ مانع نہ منافی امن ہے۔ بالجملہ ان سب امور کو نہ تو حج فرض کے لئے عذر و مانع قرار دیا۔ نہ ان کی وجہ سے حج کو جانا گناہ و ناجائز ٹھہرایا۔ نہ ان کی بنا پر فریضۂ حج کا التوا کیا۔ تو فوٹو کا کھنچوانا بھی اگر چہ گناہ ہے مگر اس کو بلا کسی دلیل کے حج فرض کا عذر و مانع کس طرح قرار دیا جائے۔ اور محض اس فوٹو کی بنا پر حج فرض کے لئے جانا کس ثبوت سے گناہ و ناجائز ٹھہرایا جائے۔ اور صرف اس کی وجہ سے کس نص سے تاخیر حج کے گناہ و فسق بلکہ ترک حج کے عذاب کو اٹھا دیا جائے اور اس شخص کو فاسق و مردود شہادت ہونے سے بچالیا جائے۔

خلاصہ جواب یہ ہے کہ فوٹو کا کھنچوانا عازم حج فرض کے لئے محض اسقاط حج فرض کی ضرورت کے لئے مجبورا ہے۔ جیسا کہ مقدمہ ثالثہ میں ثابت ہو چکا ہے کہ مال حرام سے حج فرض ادا ہو جاتا ہے۔ اور فریضہ ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اور ترک حج کے عذاب سے بچ جاتا ہے۔ اور محض اسقاط فرض کی ضرورت کی بنا پر مجبوراً اسے حج ادا کرنے کی اجازت دی اور یہ بات بیان کی کہ یہ ایک خارجی چیز ہے اس کا اثر خود فعل حج پر نہیں پڑتا بلکہ ثواب پر اثر پڑیگا۔ تو مال حرام حج کیلئے عذر و مانع نہ بنایا باوجود کہ یہ ارکان حج کے اسباب میں اثر انداز ہے کہ اسی سے منی، مزدلفہ، عرفات، طواف زیارت کے لئے جا رہے ہیں۔ خود ارکان حج ادا کرنے والے کا خورد و نوش، طہارت، لباس، قربانی وغیرہ کثیر امور اسی مال حرام سے ہو رہے ہیں۔ تو اسی طرح فوٹو کے ہونے کے باوجود حج فرض ادا ہو جانا چاہیے۔ اور فریضہ ذمہ سے ساقط ہو جانا چاہئے۔ تو یہ فوٹو رکھنے والا شخص بھی ترک حج کے عذاب سے بچ جانا چاہئے۔ اور محض اسقاط فرض کی ضرورت کی بنا پر مجبوراً فوٹو کے ساتھ حج فرض کی اجازت دی جائے تو فوٹو بھی تو ایک خارجی ہی چیز ہے۔ اس کا اثر کسی رکن حج پر نہیں پڑتا۔ بلکہ اس کو تو چھپا کر صندوق میں رکھ دیا جائے گا۔ نہ اس کو منی، مزدلفہ، عرفات، صفا و مروہ، مسجد حرام میں لے جانے کی حاجت نہ کسی فعل کے ادا کرنے کے وقت اس کے دکھانے کی ضرورت تو فوٹو کو فرض حج کے لئے کس طرح عذر و مانع قرار دیا جا سکتا ہے۔

مقدمۂ رابعہ میں ثابت کیا گیا کہ رشوت جس کی حرمت منصوص ہے اس کی محض اسقاط فرض کی ضرورت کو مد نظر رکھ کر اجازت دی گئی اور اس کی حرمت کو حج فرض کیلئے عذر و مانع قرار نہیں دیا گیا اسی طرح فوٹو کو بھی محض اسقاط فرض کی ضرورت کی بنا پر جائز قرار دیا جائے اور اس کی حرمت کو حج فرض کے لئے عذر و مانع نہ ٹھہرایا جائے۔ پھر رشوت کی مجبوری تو کبھی اتفاقاً پیش آجاتی ہے۔ اسی طرح مال حرام کے

صرف کرنے میں تو کوئی شخص خاص ہی مبتلا ہو جاتا ہے۔لیکن فوٹو کی ایسی قانونی مجبوری ہے جس کے اٹھ جانے کی اب کوئی امید باقی نہیں رہی ہے۔ پھر اس میں ایسا ابتلاء عام وعموم بلوی ہے جس سے کسی شخص کا اس سے مستثنی ہو جانا نہایت مشکل امر ہے۔تو ان مجبوریوں، ضرورتوں کو کتب فقہ کی نظروں کی بنا پر حج فرض کے ادا کرنے کے لئے فوٹو کی اجازت دی جاتی ہے۔اور قول فقہائے کرام ''الضرورات تبیح المحظورات'' (ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں) پر عمل ہو جاتا ہے۔اور اس قانون کے اٹھ جانے یا اس سے مستثنی ہو جانے کی موہومی امیدوں پر التوائے حج یا تاخیر حج بلکہ ترک حج کے گناہ وفسق سے اہل اسلام کو بچالیا جائے گا۔ یہ حکم فرض حج کیلئے ہے۔باقی رہا حج نفل اس کے لئے فوٹو کی اجازت نہیں دی جاتی۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۲) جہاں فرض وحرام میں ایسا تعارض وتقابل ہو کہ اس حرام کے ارتکاب سے ترک فرض لازم آئے جیسے حج فرض ہے اور ترک حج حرام ہے تو اس تعارض وتقابل میں فرض ہی کو ادا کیا جائیگا۔تو اس سے حرام خود ہی ترک ہو جائیگا اور جہاں فرض وحرام میں ایسا تعارض وتقابل نہ ہو جیسے کسی شخص پر حج فرض ہے لیکن اس فریضہ کی ادائیگی میں رشوت دینی پڑتی ہے اور رشوت حرام ہے۔تو اس صورت میں حج فرض کو ادا کیا جائیگا اور رشوت محض اسقاط فرض کی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے دی جائیگی بلکہ اس کو بخوف ترک فرض اختیار کیا جائیگا تو حقیقۃ اس میں تقابل حرام کا حرام سے ہوسکتا ہے صورت مسئولہ میں حج کیلئے فوٹو کھچوانا بھی حرام۔ اور اس کی بنا پر ترک حج کا ہو جانا بھی حرام ہے تو بمقتضائے حدیث کہ'' جب تو دو بلاؤں میں مبتلا ہو فاختر اھو نهما تو آسان بلا کو اختیار کر'' تو اس میں ترک فرض کی بلا تو اہم تر ہے۔ اور فوٹو محض اسقاط فرض بلکہ ترک فرض کے عذاب سے بچنے کے لئے اختیار کیا گیا۔تو اس کی حرمت اسکے مقابلہ میں ضرور کمتر وایسر ہوئی تو اس کو اختیار کر کے ترک فریضہ حج کی حرمت سے اجتناب ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) ہمارے خواص علمائے کرام نے مجھ سے گفتگو کے بعد اور بعض نے میرے اس فتوے کے دیکھ لینے کے بعد حج کا عزم کیا ہے۔حج فرض میں جواز فوٹو کیلئے یہ میرا فتویٰ ہی بہت کافی ہے اس کے لئے زبردستی اجماع کو دلیل بنانے کی حاجت نہیں۔ پھر جب حضرت مفتی اعظم صاحب قبلہ کو ابھی تک اس میں کلام ہے تو اجماع ہوا بھی نہیں۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۴) جب فوٹو کا جواز محض اسقاط فرض کی ضرورت۔اور خوف ترک فرض کی بنا پر ہے تو حدیث

شریف میں ہے" الاعمال بالنیات "لہذا اس نیت خاص کی بنا پر جب عازم حج مقامات پر دعا کریگا تو اس گناہ کے معاف ہوجانے کی بھی امید ہے۔" ان اللہ لا یغفر ان یشرك به ویغفر مادون ذالك لمن یشاء"۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۵) جب بوقت ضرورت شرعی کے کسی فعل حرام کو مجبوراً کیا جارہا ہے تو اسکا مرتکب فاسق ہی قرار نہیں پایا تو اس بنا پر لوگوں کا اسکو مکرم و معظم سمجھنا غلط قرار نہیں پاتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۶) بلاشبہ شئی مرہونہ سے مرتہن کو انتفاع ناجائز ہے۔ ردالمحتار میں ہے:

لا یحله ان ینتفع بشئی منه بوجه من الوجوه وان اذن له الراهن لانه اذن له فی الربا لانه یستوفی دینه کاملا فتبقی له المنفعة فضلا فیکون ربا۔ (ردالمحتار جلد ۵ صفحہ ۳۲۰)

باقی رہا مکان کا اس شرط پر خریدنا کہ وہ اسکوان ڈیڑھ سال تک اسی قیمت پر بائع کو بیع کردیگا۔ اس کو لوگ بیع الوفاء کہتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بیع نہیں ہے بلکہ رہن ہی ہے اور اس کا حکم رہن کا حکم ہے۔

ردالمحتار میں جواہر الفتاویٰ سے ناقل ہیں:

اذ یقول بعت منك علی ان تبیعه منی متی جئت بالثمن فهذا البیع باطل وهو رهن وحکمه حکم الرهن وهوا الصحیح"

فتاوے سے ناقل ہیں" والذی علیه الاکثر انه رهن لا یفترق عن الرهن فی حکم من الاحکام"۔

اسی میں جامع الفصولین سے ناقل ہیں'

' البیع الذی تعارفه اهل زماننا احتیا لا للربا وسموه بیع الوفاء هو رهن فی الحقیقة"

(ردالمحتار جلد ۲ صفحہ ۲۷)

اب جب اس کا رہن ہونا ثابت ہوگیا تو مشتری کو اس سے نہ انتفاع جائز ہے نہ اس کے کرایہ کی رقم حلال ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

****

مسئلہ (۵۸۷)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

حجاج کے لئے فوٹو کی پابندی امن طریق کے منافی ہے یا نہیں؟۔ بر تقدیر ثانی سوال یہ ہے کہ امن طریق صرف جان ومال کی حفاظت کا نام ہے یا دین کا امان بھی اس میں داخل ہے؟۔

ظاہر ہے کہ جس راہ میں کسی معصیت پر مجبور کیا جاتا ہو اس راہ کو پر امن نہیں کہا جا سکتا اگر امن طریق میں امن دین بھی داخل ہے یعنی عدم ارتکاب حرام شرط ہے تو فوٹو حرام ہے اس کی پابندی امن طریق کے منافی ہونی چاہئے۔ اور اگر امنِ طریق کے لئے عدم ارتکاب حرام شرط نہیں بلکہ ارتکاب حرام کے باوجود بھی حج کرنا ضروری ہے تو سوال یہ ہے کہ عورت کو عدت میں اور بغیر محرم کے حج کرنے سے کیوں روکا گیا ہے۔ نیز فوٹو کی طرح دوسرے محرمات شرعیہ (مثلاً زنا، لواطت شرب خمر وغیرہ) بھی اگر حجاج کے لئے لازم قرار دیدئے جائیں تو کیا ان محرمات شرعیہ کی پابندی کے باوجود بھی حج کرنا ضروری ہوگا یا نہیں اگر نہیں تو وجہ فرق کیا ہے۔ بینوا توجروا المستفتی، خریدار سنی

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

ردالمحتار میں بحر سے ناقل ہیں:

ویجتهد فی تحصیل نفقة حلال فانه لا یقبل بالنفقة الحرام کما ورد فی الحدیث مع انه یسقط الفرض عنه معها ولا تنافی بین سقوطه وعدم قبوله فلا یثاب لعدم القبول ولا یعاقب عقاب تارك الحج۔ (ردالمحتار مصری جلد۲ صفحہ ۱۴۴)

علامہ علی قاری المسک المتقسط میں تحریر فرماتے ہیں:

یجب الحج وان علم انه یوخذ منه المکس قال صاحب القنیه والمجتبی وعلیه الاعتماد وفی المنهاج وعلیه الفتویٰ وقال ابن الهمام ما حاصله ان الاثم فی مثله علی الأخذ لا علی المعطی فلا یترك الفرض لمعصیة عاصٍ۔ (ارشاد الساری مصری صفحہ ۳۷)

ردالمحتار میں ہے:

فان المکس والخفارة رشوة ونقل عن البحر ان الرشوة فی مثل هذا جائزة۔

ان عبارات سے ثابت ہوگیا کہ جس طرح مال حرام اور رشوت سے حج فرض ذمہ پر سے ساقط ہو

جاتا ہے اور ترک حج کے عذاب اور گناہ سے بچ جاتا ہے اسی طرح فوٹو کی بھی محض اسقاط فرض حج کی بنیاد پر اجازت دی جائے اور اس کی حرمت کو حج فرض کے لئے عذر اور مانع قرار نہ دیا جائے۔ باوجودیکہ مال حرام ارکان حج کے اسباب میں اثر انداز ہے کہ اسی سے منیٰ، مزدلفہ، عرفات، طواف زیارت کا سفر کیا جائیگا۔ بلکہ اس مبارک سفر میں خود عازم حج کے خورد نوش۔ طہارت۔ لباس۔ قربانی وغیرہ امور میں یہی مال حرام صرف ہوگا۔ پھر مال میں کوئی خاص شخص مبتلا ہوگا۔ اسی طرح رشوت کی مجبوری بھی ایک اتفاقی چیز ہے۔ لیکن فوٹو تو ایک ایسی خارجی چیز ہے جس کا اثر ارکان حج بلکہ اسباب ارکان پر نہیں پڑتا۔ کہ اس کو صندوق میں چھپا کر رکھا جا سکتا ہے نہ اسے منیٰ، مزدلفہ، عرفات، صفا، مروۃ، مسجد حرام میں لے جانے کی کوئی حاجت نہ کسی رکن حج کرنے کے وقت اس کے دکھانے یا پاس ہونے کی کوئی ضرورت۔ علاوہ بریں اس فوٹو کی ایسی قانونی مجبوری ہے جس کے ہندوستان میں اُٹھ جانے کی اب کوئی امید باقی نہیں رہی۔ پھر اس میں ایسا ابتلائے عام و عموم بلوی ہے جس سے کسی شخص کا مستثنیٰ ہونا دشوار ہے۔ تو ان مجبوریوں ضرورتوں، کتب فقہ کی نظیروں، کی بنا پر صرف حج فرض ادا کرنے کے لئے فوٹو کی اجازت دی جاتی ہے اور قول فقہاء "الضرورات تبیح المحظورات" پر عمل کیا جاتا ہے، اور اس قانون کے اٹھ جانے یا اس سے مستثنیٰ ہو جانے کی موہومی امیدوں پر التوائے حج یا تاخیر حج بلکہ ترک حج کے گناہ عظیم اور فسق سے اہل اسلام کو بچایا جاتا ہے۔

اس مسئلہ میں ایک مبسوط اور مدلل فتویٰ ہے جو فتاویٰ اجملیہ میں درج ہے لہٰذا فوٹو کی پابندی میرے نزدیک امن طریق کے منافی نہیں جیسے بہ تصریح فقہاء کرام مال حرام اور رشوت امن طریق کے منافی نہیں۔ پھر اگر فوٹو کی معصیت سے بچایا جاتا ہے تو تاخیر حج بلکہ ترک حج کی معصیت لازم آئی جاتی ہے۔ تو معصیت میں مبتلا ہونا بہر صورت لازم آتا ہے۔ دیکھئے رشوت او مال حرام سے حج کرنے میں کیا ارتکاب حرام لازم نہیں آتا ہے لیکن ان امور محرمہ کی ضرورۃً اسقاط فریضۂ حج کی وجہ سے فقہاء کرام نے اجازت دی اسی طرح فوٹو کا حکم سمجھئے۔ اب باقی رہا زنا لواطت شرب خمر وغیرہ ان امور محرمہ کا یہاں پیش کر دینا تو ان کے لئے نہ تو کوئی شرعی مجبوری ہے نہ کوئی قانونی پابندی۔ نہ عموم بلوی کا وجود ہے تو ان میں سے کسی بات کی اجازت کتب فقہ سے کیسے مستفاد ہو سکتی ہے تو ان محرمات کا فوٹو پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے تو فوٹو اور ان محرمات میں یہ کھلی ہوئی وجہ فرق موجود ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۲۵ رجب المرجب ۱۳۷۶ھ **کتبہ** : الفقیر الی اللہ عز و جل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ (۵۸۸)

جناب مفتی صاحب دامت برکاتہم جناب کی خدمت میں ایک لفافہ دیا جاتا ہے اس میں دو تین فتوی طلب کرتے ہیں آپ برائے مہربانی انکا بہت جلدی جواب عنایت فرمائیں۔

(۱) کیا لکھتے ہیں علماء دین شرع متین ایک شخص صاحب استطاعت ہے اس کی بیوی اور اس کا لڑکا حج پڑھنے بھیجنے کے لئے تیار ہے لیکن وہ تیار نہیں ہوتا، اس لئے اس کو چھوڑ کر اس کی بیوی اور لڑکا حج پڑھنے جاسکتا ہے یا نہیں؟۔

(۲) ایک شخص والدہ کو لیکر ایک دفعہ حج پڑھ آیا ہے اور اب پھر ارادہ ہے تو اس کی والدہ کو چھوڑ کر جاسکتا ہے یا نہیں؟۔

(۳) ایک شخص کی والدہ ثانی ہے اور اپنے شوہر کے ساتھ الگ رہتی ہے اور رقم بھی الگ ہے تو کیا وہ اپنے والد کے ساتھ اپنی ثانی والدہ کو چھوڑ کر حج پڑھنے جاسکتا ہے یا نہیں؟۔

اس کا جواب جلدی عنایت فرمائیں کیونکہ فارم آنے والے ہیں یہاں سے پندرہ بیس آدمی حج کو جانے کے لئے تیار ہو رہے ہیں آپ بھی ان کے حق میں دعا فرمائیں والسلام

پیش امام صاحب واسکی پالٹی کا بہت بہت سلام معلوم ہو

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) جب ان ماں اور بیٹے کے ذموں پر حج فرض ہے تو ان دونوں پر بغیر اس کی اجازت کے بھی حج کے لئے جانا فرض ہے، پھر اگر امسال اس کے نہ جانے کی وجہ سے حج کے لئے نہیں جائینگے تو تاخیر حج کے مرتکب ہونگے۔

(۲) والدہ کی اجازت سے دوسری مرتبہ بغیر ان کو ساتھ لئے ہوئے حج کو یقیناً جاسکتا ہے۔

(۳) اس صورت میں بلا شبہ یہ اپنے والد کے ساتھ حج کے لئے جاسکتا ہے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

•••••••••••••••••

متعلقہ ادائے فریضہ حج وزیارت پر حکومت حجاز کا جابرانہ ٹیکس

الجواب

الحمد لله الذى جعل الكعبة مثا بة للناس وامنا ـ ومنح لهم من مقام ابراهيم مصلىٰ ـ وجعل الحرام امنا ـ وبعث فيهم رسو لا كريما ـ يتلو عليهم ايا ته ويز كيهم ويطهرهم تطهير ا ـ فصلوات الله تعالىٰ وسلا مه عليه و على اله واصحابه دائما ابدا ـ

(۱) هذ ه الضريبة بدعة شنيعة قبيحة حرم للآخذو حكم بغير ما انزل الله تعالى ـ قال النبى صلى الله تعالىٰ عليه وسلم لا يدخل الجنة صاحب مكس يعنى الذى يعشر النا س (رواه احمد وابو داؤ د والدارمى) والمراد اخذ المزيد من العشر قهرا فهو ظلم ـ

وعن عائذ بن عمر وقال: سمعت رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم يقول: ان شرالرعا ء الحطمة (رواه مسلم) والحطمة المظلمة ـ وروى البيهقى عن حرة الرقاشى عن عمه قال قال رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم الا لا تظلموا الا لا يحل ما ل امرى الا بطيب نفس منه واخذ ما ل المسلم قهر ايسمى نهبة (كذا فى مجمع بحا ر الانوا ر) وهى ممنو عة محرمة وردت فى ذمها احاديث كثيرة ـ هذا اذا كا ن الاخذمر ة ـ

قال رسو ل الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم :يا تى على النا س زما ن لا يبا لى المرء ما اخذ منه أمن الحلا ل ام من الحرام ـ ومنع الحاج من الدخول فى البلد الحرام وصدهم عن الحج لهذا الطمع الفاسد قهر وظلم ومخالفة لكتاب الله تعالى حيث قال ومن اظلم ممن منع مساجد الله ان يذكر فيه اسمه وسعى فى خرابها الآ ية وصدالمو من ومنعه من الحج والدخول فى المسجد الحرام سنة مشركى مكة كا نوا منعوا رسول لله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم واصحابه عن ان يصلوا فيه فى ابتداء الاسلام ومنعوهم من حجه والصلوة فيه عام الحديبة واذا منعوا من يعمر ه بذكر الله تعالى وصلو ته فيه فقد سعوا فى خرابه (ما فى تفسير لبا ب التاويل)فمن يقتفى آثارهم يكو ن معهم ولا فرق بينه وبين من يبعث الجند على ابواب المساجد يو م الجمعةلمنع المصلين من الصلوة [illegible]ير اداء ضريبة

بحیلة حراسة المسجد واصلاحه بل هذا اشرمنه ـ وحاشا ان یوجد مثل ذلک فی زمن اسلاف الصلحین غیر انه کان عمل المشرکین ـ قال الله تعالیٰ ان الذین کفروا ویصدون عن سبیل الله والمسجدالحرام الذی جعلناه للناس سواء العاکف فیه والباد ومن یرد فیه بالحاد بظلم نذقه من عذاب الیم ـ

عن حبیر بن مطعم ان النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم قال: یا بنی عبد مناف! لا تمنعوا احد اطاف بهذا البیت وصلی ایة ساعة شاء من لیل ونهار اخرجه الترمذی وابو داؤد والنسائی)

(۲) لا یجوز فانه داخل تحت حکم ومن اظلم الآیة فی مدارک التنزیل هو حکم عام لجنس مساجد الله وان مانعها من ذکر الله مفرط فی الظلم ـ فاین الجواز ؟وهذا المکوس الغالیة اقبح واشد علی الناس واضرلهم من غارات قطاع الطرایق ـ

(۳) لا یجوز لان الرشوة حرام ـ

(٤) لا یجوز اصلا لان الناس کلهم عباد الله تعالی ومنع الطائفین عن الطواف واخراجهم عن المطاف ظلم وسعی فی تخریب المسجد والاخلال فی عبادات الخلق لتعظیم الامیر امر شدید شنیع ـ

(٥) لا یجوز لانه سبب تعطیل السعی وموجب زوال خشوع اهل السعی وخصوعهم ویجدون منه ضیفا وفی قلوبهم تشو یشا والله سبحانه وتعالی اعلم ـ

کتبه العبد المعتصم بحبله المتین محمد نعیم الدین شرفه الله بمزید العلم والیقین آمین ـ الا جوابة کلها صحیحة محمد عمر ـ

احمد محمودا او محمدا ـ واسلم علی اکرم العالم سرمدا ـ اما بعد فان الحکومة النجدیة تدعی انها تحکم بما انزل الله فی آیاته الکریمة وبما وردت فیها الاحادیث الشریفة ـ ولا تامر بالامور البدعیة ـ وتجری الاحکام الشرعیة ـ وتحفظ اموال المسلمین ـ وتحرس علی الحجاج الزائرین لکن هٰذا ادعاء باطل مع کذب زائل ـ بل حکامها حتی السلطان ـ یحکمون بغیر ما انزل فی القران یخالفون الاحادیث الصحیحة ـ ویفعلون الامور المحدثة ـ ویبدعون البدع الشنیعة ویحرفون السنن السنیة ـ ویاخذون

امو ال المسلمین قهرا ۔وینتهبو ن علی الحجاج جبرا ۔ویقررون الضریبة علی العبادات ۔ویحلون الرشوة علی امو رالخیرات ۔ویصدون المسلمین عن اداء الفریضة ویمنعون الزائرین عن المقامات المتبرکة ۔فما افتی العلامة صدرالافاضل ۔فخر الاماثل ۔سلطان المحدثین ۔اما م المفسرین واستاذ العلماء وسندالفضلاء الحافظ الحاج المولوی محمد نعیم الدین المرادبادی ناظم الجمهوریة الاسلامیة ۔ومو سس الجامعة النعیمیةمتع الله المسلمین بطول بقائه فهو حق وصحیح وصواب ۔ومدلل بالاحادیث والکتاب ۔فلا ریب ان ضرب الضریبة بدعة سیئة ومخالف للسنة السنیة ۔وظلم وحرام ۔وصد اهل الا سلام عن الحج والدخول فی البلد الحرام ۔وهذا الفعل لم یثبت من القرون الثلثة وائمة المجتهدین۔ ولا من الفقهاء والصالحین ۔ولم یا خذ احد من السلاطین ۔فهی ظلم واتباع عمل المشرکین والله سبحانه وتعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

مسئلہ (۵۸۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) ایک آدمی مالدار غریب کو اپنے ساتھ حج کو لے جارہا ہے تو حج کا ثواب لیجانے والے کو ملے گا یا کہ جانے والے کو؟۔

(۲) ایک شخص مرحوم کے بدلے ایک آدمی کو حج کو لیجارہا ہے ایسا بوڑھا جو حج کو جانے کی طاقت نہیں رکھتا تو وہ دوسرے آدمی کو حج کو بھیج رہا ہے تو ان دونوں شخص جانے والوں کو حج کا ثواب ملے گا یا نہیں؟۔ براہ کرم جواب سے مطلع فرمائیں یعنی ماہنامہ سنی میں شائع کرانے کی زحمت فرمائیں خریدار نمبر ۳۳۷۲۶ جونہ بازار بھوساول، مشرقی فاؤنڈیشن سید سردار علی خلیفہ پیر جیلانی میاں قادری

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

(۱) جو مالدار کسی غریب کو حج کو اپنے ساتھ لے جائے تو اس حج کا ثواب اس غریب کو تو اپنے ارکان حج ادا کرنے کی بنا پر ہوگا اس مالدار کو اسکے لیجانے اور اس کے تمام اخراجات اٹھانے کی بنا پر ہوگا۔

لہذا ان میں ثواب سے کوئی بھی محروم نہیں ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۲) حج بدل میں فریضہ حج تو اس کا ادا ہوگا جس کی طرف سے روپیہ دیا گیا اور جس کی نیت سے ارکان حج ادا کئے گئے ہیں اور ثواب اس جانے والے کو بھی ملے گا۔ درمختار ردالمختار میں ہے: ویقع الحج المفروض عن الآمر علی الظاهر ولا یخلو المامور من الثواب۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ : المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنبھل

اسرار خطابت جلد اول خطبات 13	فضائل اہلبیت از قرآن کریم۔فضائل اہلبیت از حدیث پاک۔فلسفہ شہادت دو خطبات۔قافلہ کی واپسی شان ولایت۔فوز عظیم۔اعلی حضرت۔حیات اولیاء۔ثبوت میلاد۔میلاد شریف۔ولادت رسولؐ۔خلیفۃ اللہ الاعظم
اسرار خطابت جلد دوم خطبات	اچھی نسبت ۔ سرکار غوث اعظم ۔ وسیلہ ۔ برکات تبرکات ۔ صراط مستقیم ۔ توحید کی دلیل ناطق سراپا معجزہ ۔ شان صحابہؓ ۔ حضرت بلالؓ ۔ اولیت صدیق اکبرؓ ۔ خلیل الہی ۔ محسن رسول
اسرار خطابت جلد سوم خطبات 12	تفسیر آیت اسریٰ۔فلسفہ معراج النبیؐ۔مسجد اقصیٰ تک۔مسجد اقصیٰ سے آگے۔محدث اعظم پاکستان۔شب برات کی برکات حضرت امام اعظم۔فضائل ماہ رمضان۔ماہ صیام کی برکات۔فضائل مخدومہ کونین۔غزوۂ بدر۔مولائے کائنات
اسرار خطابت جلد چہارم خطبات 13	عظمت بلد الحبیب۔فلاح کا راستہ۔بے مثال بشر۔عظمت مصطفےٰؐ۔حسن بے مثال۔حاضر و ناظر رسول حدیث جبرائیل۔دستگیر عالمین۔عظمت والدین۔بنی صدیق۔ذبح عظیم۔حضرت عثمان غنیؓ۔حضرت فاروق اعظمؓ
اسرار خطابت جلد پنجم خطبات 12	مودت اہلبیت ۔ محبت رسولؐ ۔ حیات النبیؐ ۔ فضائل درود شریف ۔ روضۃ من ریاض الجنہ ۔ حق چار یار ذائقۃ الموت ۔ نور مبین ۔ صدیق اکبر سراپا حسنات ۔ ایصال ثواب ۔ سیدہ عائشہ صدیقہؓ ۔ لیلۃ القدر
اسرار خطابت جلد ششم	مخدومۂ کائنات حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا کی سوانح طیبہ جس سے علماء محققین اور واعظین و مقررین بیک وقت مستفید ہوسکتے ہیں فصاحت و بلاغت اور مستند حوالہ جات سے مزین خوبصورت تحفہ
اسرار خطابت جلد ہفتم	حضرت مولائے کائنات سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی سوانح طیبہ علماء و خطباء کے لیے یکساں مفید لاجواب کتاب

شبیر برادرز ۴۰۔اردو بازار۔زبیدہ سنٹر لاہور